

مَعَالِمُ الدِّينِ

مترجم از امام غزالی
محقق: علامہ محمد رفیع صاحب

مَعَالِمُ الدِّينِ

(Organic Studies Publishers)

فہرست مضامین "معارف القرآن" جلد پنجم

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
			سُورَةُ يُوسُفَ
۲۱	تقدیر کے اسباب خفیہ سے مربوط ہوتا ہے	۱۴	تاریخ و قصص میں قرآن کا خاص انداز
۲۱	آیات ۲۱ تا ۲۳	۱۶	خواب کی حقیقت اور درجہ اور اس کی قسمیں
۲۲	یوسفؑ کا ورودِ مصر اور تقدیری انتظامات	۱۸	خواب کے جزء نبوت ہونے کے معنی
۲۵	گناہ سے بچنے کا قوی ذریعہ اللہ سے پناہ مانگنا ہے	۲۰	قادیانی دجال کے ایک مغالطہ کی تردید
۲۶	غیر اللہ کو رب کہنا	۲۱	کبھی فاسق بلکہ کافر کا خواب بھی سچا ہو سکتا ہے
۲۷	واقعہ زلیخا اور عصمت پیغمبرانہ کا مفصل واقعہ	۲۲	خواب ہر شخص سے بیان کرنا درست نہیں
۵۱	اور شبہات کا جواب	۲۳	خواب کے تابع تعبیر ہونے کا مطلب
۵۲	آیات ۲۵ تا ۲۹	۲۴	یوسفؑ کے خواب سے متعلق اہم مسائل
۵۳	برأتِ یوسفؑ کا تقدیری انتظام	۲۹	آیات نمبر ۷ تا نمبر ۲۰
۵۵	واقعہ مذکورہ سے حاصل شدہ اہم مسائل	۳۱	یہودیوں کے بتلائے ہوئے چند سوالات
۵۹	آیات ۳۰ تا ۳۵	۳۲	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے
۶۲	یوسفؑ کا رجوع الی اللہ	۳۳	انخوانِ یوسفؑ انبیاء نہیں تھے، مگر ان کی
۶۳	آیات ۳۶ تا ۴۲	۳۴	خطائیں معاف ہو گئیں
۶۷	یوسفؑ کے قصہ میں عبرتیں اور ہدایات	۳۵	خدمت عامہ اور امدادِ باہمی کا اسلامی اصول
۶۸	فائدہ عجیبہ	۳۶	جائز تفریحات اور کھیل کود کی اجازت
۶۹	پیغمبرانہ شفقت کی عجیب مثال	۳۷	تفریح کے لئے جانے کا تفصیلی واقعہ
۷۰	واقعہ سے حاصل شدہ مسائل و احکام	۳۸	بچپن میں یوسف علیہ السلام پر وحی کی حقیقت
۷۲	آیات ۴۳ تا ۵۰	۳۹	مصر پہنچنے پر بھی والد کو اپنے حالات کی اطلاع
۷۵	تعبیر خواب کے متعلق تحقیق	۴۰	نہ دینے بلکہ چھپانے کے اہتمام کی حکمت
۷۸	آیات ۵۱ تا ۵۲	۴۱	مسابقت اور گھوڑ دوڑ کا حکم شرعی
۸۳	آیات ۵۳ تا ۵۷	۴۲	پیراہنِ یوسفؑ کی چند کرامات
۸۵	اپنی پاکبازی کا اظہار بضرورت جائز ہے	۴۸	جس چیز کو عرفاً اتفاقی امر کہا جاتا ہے وہ بھی
۸۶	نفسِ امارہ کی تحقیق		
۸۷	یوسف علیہ السلام شاہی دربار میں		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۲۶	آیات ۸۳ تا ۸۷	۸۹	یوسف علیہ السلام سے زلیخا کا نکاح
۱۲۹	یوسفؑ کے ساتھ حضرت یعقوبؑ کی زیادہ	۹۰	واقعہ مذکورہ سے حاصل شدہ احکام و مسائل
	محبت و شفقت کی وجہ		حکومت کا کوئی عہدہ خود طلب کرنا
۱۳۲	احکام و مسائل	۹۱	حضرت یوسف علیہ السلام کا طلبِ عہدہ
	آیات ۸۸ تا ۹۲		خاص حکمت پر مبنی تھا
۱۳۶	یعقوبؑ کا خط عزیز مصر کے نام		کافر حکومت کا عہدہ قبول کرنا
۱۳۷	متعلقہ احکام و ہدایات	۹۲	آیات ۵۸ تا ۶۲
۱۳۸	صبر و تقویٰ ہر مصیبت کا علاج ہے	۹۶	یوسف علیہ السلام تختِ سلطنت پر اور غذائی انتظامات
۱۳۹	آیات ۹۳ تا ۱۰۰	۹۹	حکومت کا غذائی کنٹرول
۱۴۲	پیراہنِ یوسفؑ کی خصوصیات		حکومت پر آنے کے بعد بھی یوسف علیہ السلام کا
۱۴۵	احکام و مسائل		والد کو اپنے حال سے اطلاع نہ دینا بامرِ الہی تھا
۱۴۷	زمانہ مفارقت کے حالات کے اظہار میں پیغمبرؐ شکرگذاری	۱۰۰	آیات ۶۳ تا ۶۶
۱۴۸	آیت ۱۰۱	۱۰۳	برادرانِ یوسف کی مصر سے واپسی
۱۴۹	والدین سے اظہارِ حال کے بعد بارگاہِ الہی	۱۰۴	متعلقہ ہدایات و مسائل
	میں دعا و التجا پر قصہ کا اختتام		خطا کار اولاد سے قطع تعلق نہ کرنا
۱۵۱	متعلقہ ہدایات اور احکام	۱۰۵	بقیہ ہدایات
۱۵۲	آیات ۱۰۲ تا ۱۰۹	۱۰۶	آیات ۶۷ تا ۶۹
۱۵۸	علمِ غیب اور اخبارِ غیب میں فرق	۱۰۹	نظرِ بد کا اثر حق ہے
۱۵۹	کوئی عورت رسول و نبی نہیں ہوئی	۱۱۲	آیات مذکورہ سے متعلق چند مسائل
۱۶۰	آیات ۱۱۰ تا ۱۱۱	۱۱۳	آیات ۷۰ تا ۷۶
۱۶۵	سُورَةُ رَعْدٍ	۱۱۶	یوسف علیہ السلام کی طرف سے بھائیوں پر
۱۶۵	آیات ۱ تا ۴		جھوٹے الزام و غیرہ کاراز
۱۶۶	حدیثِ رسول بھی قرآن کی طرح وحیِ الہی ہے	۱۱۸	متعلقہ مسائل
۱۶۷	کیا آسمان کا جرم آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہے؟	۱۱۹	آیات ۷۷ تا ۸۲
۱۶۸	ہر کام میں اصلی تدبیر اللہ کی ہے	۱۲۲	یوسفؑ پر چوری کے الزام کی حقیقت
۱۷۱	آیات ۵ تا ۸	۱۲۵	چند مسائل متعلقہ

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۲۲	ہر رسول کا اپنی قوم کی زبان کے ساتھ آنا	۱۷۳	مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کا ثبوت
۲۲۵	قرآن کریم عربی زبان میں کیوں ہے	۱۷۶	کیا ہر قوم اور ملک میں نبی آنا ضروری ہے؟
۲۲۶	عربی زبان کی کچھ خصوصیات	۱۷۷	آیات ۱۵ تا ۹
۲۲۹	آیات ۸ تا ۵	۱۸۱	انسان کے محافظ فرشتے
۲۳۱	ایک نکتہ	۱۸۴	آیات ۱۶ تا ۱۷
"	ایام اللہ	۱۸۶	معارف و مسائل
۲۳۲	صبر کے بعض فضائل	۱۸۷	آیات ۱۸ تا ۲۴
۲۳۳	شکر اور ناشکری کے نتائج	۱۸۹	اللہ والوں کی خاص صفات
۲۳۴	آیات ۱۵ تا ۹	۱۹۳	آیات ۲۵ تا ۳۰
۲۳۶	خلاصہ تفسیر	۱۹۶	معارف و مسائل
۲۳۸	آیات ۱۶ تا ۱۷ مع خلاصہ تفسیر	۱۹۷	احکام و ہدایات
۲۳۹	آیات ۱۸ تا ۲۲	۲۰۰	آیات ۳۱ تا ۳۳
۲۴۲	آیات ۲۳ تا ۲۵	۲۰۳	معارف و مسائل
۲۴۴	آیات ۲۶ تا ۲۹	۲۰۶	ایک بستی پر عذاب قریبی بستیوں کیلئے تنبیہ ہوتی ہے
۲۴۵	معارف و مسائل	۲۰۷	آیات ۳۴ تا ۳۷
۲۴۶	شجرہ طیبہ سے کیا مراد ہے	۲۰۹	آیات ۳۸ تا ۴۳
۲۴۷	کفار کی مثال	۲۱۳	انبیاء عموماً بیوی بچوں والے ہوئے ہیں
"	ایمان کا خاص اثر	۲۱۴	تقدیر مہرم و معلق
۲۴۸	قبر کا عذاب و ثواب از قرآن و سنت	۲۱۷	سُورَةُ اِبْرٰهِيْمَ
۲۵۰	احکام و ہدایات	"	آیات ۱ تا ۳
"	آیات ۳۰ تا ۳۴	۲۱۸	مضامین سورۃ
۲۵۱	تفسیر و شرح	۲۱۹	احکام و ہدایات
۲۵۲	احکام و ہدایات	۲۲۰	قرآن کریم کی تلاوت مستقل مقصد ہے
۲۵۵	تسخیر شمس و قمر کا مطلب	۲۲۱	خلاصہ مفہوم
۲۵۶	آیات ۳۵ تا ۴۱	۲۲۲	قرآن فہمی میں بعض غلطیوں کی اصلاح
۲۵۹	ابراہیم کی دعا، اولاد کو بت پرستی سے بچائی اور عرب کی بت پرستی	۲۲۳	آیت نمبر ۴

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۹۴	آیات ۲۶ تا ۴۴	۲۶۱	احکام و ہدایات
۲۹۷	بدن انسانی میں نفع و روح اور اس کو مسجود ملائکہ بنائے کی مختصر تحقیق	"	دعائے ابراہیمی کی عجیب جامعیت و حکمت
۲۹۸	روح اور نفس کے متعلق قاضی شہارشر کی تحقیق	۲۶۴	دعائے ابراہیم کے اسرار و حکم
۲۹۹	فرشتوں کو حکم سجدہ میں ابلیس نے عدا داخل تھا	۲۶۸	بعض آدابِ دعا
۳۰۰	اللہ کے خاص بندوں پر شیطان کے تسلط نہ ہونے کی معنی	"	آیات ۴۲ تا ۵۲
"	جہنم کے سات دروازے	۲۷۱	معارف و مسائل
"	آیات ۴۵ تا ۵۰	۲۷۳	قیامت میں زمین و آسمان کی تبدیلی
۳۰۱	معارف و مسائل	۲۷۶	ایک اطلاع اور یادداشت
۳۰۲	آیات ۵۱ تا ۷۷	۲۷۸	سُورَةُ حَجَر
۳۰۷	معارف و مسائل	۲۷۸	آیات ۱ تا ۵
"	رسول کریم کا خصوصی اعزاز و اکرام	۲۸۰	طولِ اہل کے متعلق ابوالدرداءؓ کی نصیحت
"	غیر اللہ کی قسم کھانا	"	آیات ۶ تا ۸
۳۰۸	جن بستیوں پر عذاب آیا ان سے عبرت	۲۸۱	خلیفہ ناموں رشید کے دربار کا ایک خاص واقعہ
۳۰۹	آیات ۷۸ تا ۸۶ مع خلاصہ تفسیر	۲۸۳	حفاظتِ قرآن کا وعدہ اور اسمیں حفاظتِ حدیث
"	قصہ اصحابِ ایکہ و اصحابِ حجر	"	کا بھی داخل ہونا
۳۱۱	آیات ۸۷ تا ۹۹ مع خلاصہ تفسیر	۲۸۴	مطلقاً احادیث کو غیر محفوظ کہنے والا
۳۱۳	سورۃ فاتحہ پورے قرآن کا خلاصہ اور متن ہے	"	آیات ۱۰ تا ۱۵
"	محشر میں سوال کس چیز کا ہوگا	۲۸۵	آیت ۱۶
۳۱۴	تبلیغ و ارشاد میں تدبیر بقدر استطاعت	۲۸۶	آسمان میں بروج کے معنی
"	ایذا و دشمن سے تنگدلی کا علاج	"	آیات ۱۷ و ۱۸
۳۱۵	سُورَةُ نَجَل	۲۸۷	شہابِ ثاقب کیا چیز ہے؟
۳۱۵	آیات ۱ و ۲ مع خلاصہ تفسیر	۲۸۹	آیات ۱۹ تا ۲۵
۳۱۶	سورت کا شروع و عید شدید سے	۲۹۰	ضروریات میں موزونیت کی رعایت
۳۱۷	آیات ۳ تا ۸	۲۹۱	تمام مخلوق کے لئے آبِ رسانی اور آبِ پاشی
۳۱۸	معارف و مسائل	"	کا عجیب و غریب نظامِ الہی
۳۱۹	قرآن میں ریل، موٹر، جہاز کا ذکر	۲۹۳	نیک کاموں میں آگے پیچھے رہنے کا فرق

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۲۱	دنیا کا عذاب بھی ایک طرح کی رحمت ہے	۳۲۱	جمال اور زرینت کا جواز
۳۵۲	آیات ۲۸ تا ۵۷ مع خلاصہ تفسیر	۳۲۲	آیت نمبر ۹
۳۵۲	آیات ۵۸ تا ۶۰ مع خلاصہ تفسیر	۳۲۲	معارف و مسائل
۳۵۵	معارف و مسائل	۳۲۳	آیات ۱۰ تا ۱۶
۳۵۶	آیات ۶۱ تا ۶۵	۳۲۴	معارف و مسائل
۳۵۸	آیت ۶۶ مع خلاصہ تفسیر	۳۲۵	آیات ۱۷ تا ۲۳
۳۵۹	معارف و مسائل	۳۲۶	معارف و مسائل
۳۶۰	آیت ۶۷ مع خلاصہ تفسیر	۳۲۷	آیات ۲۴ تا ۲۹
۳۶۱	شراب کی حرمت پہلے بھی اسکی برائی کی طرف اشارہ	۳۲۸	معارف و مسائل
۳۶۱	آیات ۶۸ تا ۶۹	۳۲۹	آیات ۳۰ تا ۳۴ مع خلاصہ تفسیر
۳۶۲	معارف و مسائل	۳۳۰	آیات ۳۵ تا ۴۰
۳۶۳	شہد کی بکھو کی خصوصیات اور احکام	۳۳۱	معارف و مسائل
۳۶۴	شہد کا شفا ہونا	۳۳۲	کیا ہندوستان و پاکستان میں بھی کوئی رسول آیا ہے
۳۶۶	فوائد	۳۳۳	آیات ۴۱ و ۴۲
۳۶۸	آیت ۷۰ مع خلاصہ تفسیر	۳۳۴	معارف و مسائل
۳۶۹	ارذل عمر کی تفسیر	۳۳۵	ہجرت دنیا میں بھی فراخی عیش کا سبب ہو سکتی ہے
۳۷۰	آیت ۷۱ معارف و مسائل	۳۳۶	ہجرت کی مختلف قسمیں اور ان کے احکام
۳۷۱	معاش میں اختلاف درجات رحمت ہے	۳۳۷	آیات ۴۳ تا ۴۴
۳۷۲	ارتکاز دولت کے انسداد کا قرآنی نظام	۳۳۸	معارف و مسائل
۳۷۳	آیات ۷۲ تا ۷۶	۳۳۹	ائمہ مجتہدین کی تقلید غیر مجتہد پر واجب ہے
۳۷۴	معارف و مسائل	۳۴۰	قرآن فہمی کیلئے حدیث فہمی ضروری ہے، حدیث
۳۷۵	آیات ۷۷ تا ۸۳	۳۴۱	کا انکار قرآن کا انکار ہے
۳۷۶	معارف و مسائل	۳۴۲	آیات ۴۵ تا ۴۷
۳۷۷	گھربنانے کا اصلی مقصد قلب و جسم کا سکون ہے	۳۴۳	معارف و مسائل
۳۷۸	آیات ۸۴ تا ۸۹	۳۴۴	قرآن فہمی کیلئے معمولی عربی دانی کافی نہیں
۳۷۹	معارف و مسائل	۳۴۵	اشعار جاہلیت کی تعلیم قرآن فہمی کی غرض سے

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۱۶	معارف و مسائل	۳۸۷	آیت ۹۰
۳۱۷	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ملت ابراہیمی	=	قرآن کی جامع ترین آیت اور اس کی تشریح
"	آیات ۱۲۵ تا ۱۲۸	۳۸۹	تین چیزوں کا حکم، تین کی ممانعت
۳۱۹	معارف و مسائل	۳۹۲	آیات ۹۱ تا ۹۶
"	دعوت و تبلیغ کے اصول اور مکمل نصاب	۳۹۵	عہد شکنی حرام ہے
۳۲۱	دعوت کے اصول و آداب	۳۹۶	دھوکہ دینے کیلئے قسم کھانا ایمان کا خطرہ ہے
۳۲۲	دعوت الی اللہ کے سچے پیغمبرانہ آداب کی تفصیل	"	رشوت لینا اللہ سے عہد شکنی اور حرام ہے
۳۳۰	مروجہ مجادلات کی دینی اور دنیوی مضمرات	۳۹۷	رشوت کی جامع تعریف
۳۳۳	داعی حق کو ایذا کا انتقام لینا جائز مگر صبر بہتر ہے	"	دنیا کی راحت و کلفت دوستی و دشمنی سب فانی ہیں
"	آیات مذکورہ متعلقہ دعوت کا شان نزول	۳۹۸	آیت ۹۷ مع معارف و مسائل
۳۳۷	سُورَةُ بَنِي إِسْرَءِیْل	"	حیاتِ طیبہ کیا چیز ہے؟
"	آیت ۱ مع خلاصہ تفسیر	۳۹۹	آیت ۹۸ تا ۱۰۰ مع خلاصہ تفسیر
۳۳۸	معارف و مسائل	۴۰۰	معارف و مسائل
"	معراج کے جسمانی ہونے پر قرآن و سنت کے دلائل اور اجماع	۴۰۲	اللہ پر ایمان و توکل تسلطِ شیطانی کا علاج ہے
۴۴۰	مختصر واقعہ معراج بروایت ابن کثیر	"	آیات ۱۰۱ تا ۱۰۵
۴۴۱	واقعہ معراج کے متعلق ایک غیر مسلم کی شہادت	۴۰۳	نبوت پر کفار کے شبہات کا جواب
۴۴۲	اسرار و معراج کی تاریخ	۴۰۵	آیات ۱۰۶ تا ۱۰۹
۴۴۳	مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ	۴۰۶	معارف و مسائل
"	مسجد اقصیٰ اور ملک شام کی برکات	۴۰۷	اکراہ کی تعریف
۴۴۴	آیات ۲، ۳، ۴ تا ۸	۴۰۹	آیات ۱۱۰ تا ۱۱۳
۴۴۶	بنی اسرائیل کے چند واقعات	۴۱۱	معارف و مسائل
۴۴۹	معارف و مسائل	"	آیات ۱۱۴ تا ۱۱۹
۴۵۰	بنی اسرائیل کے واقعات آجکل کے حالات	۴۱۲	معارف و مسائل
"	میں مسلمانوں کے لئے عبرت ہیں	"	محرمات مذکورہ میں حصر
۴۵۱	ایک عجیب معاملہ	"	توبہ سے گناہ کی معافی
"	کافر بھی اللہ کے بندے مگر مقبول نہیں	"	آیات ۱۲۰ تا ۱۲۴

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۴۶۹	معارف و مسائل	۴۵۲	آیات ۹ تا ۱۱
"	عام رشتہ داروں کے حقوق	۴۵۳	معارف و مسائل ، معتدل راستہ
۴۷۰	تبذیر یعنی فضول خرچی کی ممانعت	۴۵۴	آیات ۱۲ تا ۱۵
۴۷۱	آیت ۲۸ مع خلاصہ تفسیر	۴۵۵	معارف و مسائل
"	معارف و مسائل	۴۵۶	نامہ اعمال نگلے کا ہار ہونے کا مطلب
۴۷۲	آیت ۲۹ تا ۳۰	"	بعثت رسل کے بغیر عذاب نہ ہونیکی تشریح
"	معارف و مسائل	۴۵۷	اولاد مشرکین نابالغ کو عذاب نہ ہوگا
"	خرچ میں اعتدال کی ہدایت	"	آیات ۱۶ تا ۱۸
۴۷۳	الشہ کی راہ میں خرچ کرنے میں بھی اعتدال	۴۵۸	معارف و مسائل
"	خرچ میں بد نظمی ممنوع ہے	"	ایک شبہ اور جواب
۴۷۴	آیت ۳۱	۴۵۹	مالداروں کا قوم پر اثر ہونا طبعی امر ہے
"	معارف و مسائل	"	آیات ۱۸ تا ۲۱
۴۷۵	آیت ۳۲ لا تقربوا الزنا	۴۶۰	معارف و مسائل
"	معارف و مسائل	۴۶۱	بدعت اور خود رانی کا عمل کتنا ہی اچھا نظر آئے
۴۷۶	آیت ۳۳	"	مقبول نہیں
۴۷۷	قتل ناحق کی تفسیر	"	آیات ۲۲ تا ۲۵
"	قصاص لینے کا حق کس کو ہے ؟	۴۶۲	معارف و مسائل
"	ظلم کا جواب ظلم نہیں انصاف ہے	۴۶۳	والدین کے احترام و اطاعت کی اہمیت
۴۷۸	یاد رکھنے کے قابل ایک حکایت	"	اطاعت والدین کے فضائل و برکات
"	آیات ۳۴ و ۳۵	۴۶۴	والدین کی حق تلفی کی سزا اکثر دنیا میں بھی ملتی ہے
۴۷۹	معارف و مسائل	"	والدین کی اطاعت کس حالت میں واجب نہیں
"	یتیموں کے مال میں احتیاط	"	والدین کی خدمت و حسن سلوک کیلئے ان کا مسلمان
"	معاہدات کی پابندی کا حکم	"	ہونا ضروری نہیں
۴۸۰	ناپ تول میں کمی حرام ہے	۴۶۶	والدین کے ادب کی رعایت خصوصاً بڑھاپے میں
۴۸۱	آیات ۳۶ تا ۳۸	۴۶۷	ایک عجیب واقعہ
"	معارف و مسائل	۴۶۹	آیات ۲۶ تا ۲۷ مع خلاصہ تفسیر

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۵۰۹	آیات ۷۳ تا ۷۷	۴۸۲	کان آنکھ اور دل کے متعلق قیامت میں سوال
۵۱۰	معارف و مسائل	۴۸۴	یہ پندرہ آیتیں پوری تورات کا خلاصہ ہیں
۵۱۲	آیات ۷۸ تا ۸۲	۴۸۵	آیات ۳۹ تا ۴۴
۵۱۴	معارف و مسائل	۴۸۶	معارف و مسائل
"	دشمنوں کے شر کا بہترین علاج نماز ہے	۴۸۷	زمین و آسمان وغیرہ کی تسبیح کا مطلب
"	نماز پنجگانہ	۴۸۹	آیات ۴۵ تا ۴۸
۵۱۵	نماز تہجد کا وقت اور مسائل	۴۹۰	معارف و مسائل، پیغمبروں پر جادو کا اثر
۵۱۶	نماز تہجد فرض ہے یا نفل	۴۹۱	دشمنوں کی نظر سے مستور رہنے کا ایک عمل مجرب
۵۱۷	نماز تہجد نفل ہے یا سنت مؤکدہ	۴۹۲	آیات ۴۹ تا ۵۲
۵۱۸	تعداد رکعات تہجد	۴۹۴	معارف و مسائل
"	نماز تہجد کی کیفیت	"	محشر میں کفار بھی اللہ کی حمد کرتے اٹھیں گے
"	مقام محمود	۴۹۵	آیات ۵۳ تا ۵۵
۵۱۹	انبیاء و صلحاء امت کی شفاعت مقبول ہے	۴۹۶	معارف و مسائل
"	ایک سوال و جواب	"	بدزبانی کفار کے ساتھ بھی جائز نہیں
"	فائدہ	۴۹۷	آیات ۵۶ تا ۵۸
۵۲۰	تہجد کا خاص دخل مقام شفاعت میں	۴۹۸	معارف و مسائل
۵۲۱	اہم مقاصد کے لئے مقبول دعا	۴۹۹	آیات ۵۹ و ۶۰
"	رسوم کفر و باطل کا مٹانا واجب ہے	۵۰۰	معارف و مسائل
۵۲۲	آیات ۸۳ و ۸۴	۵۰۱	آیات ۶۱ تا ۶۵
۵۲۳	معارف و مسائل	۵۰۲	معارف و مسائل
"	آیات ۸۵ تا ۸۹ یسٹلونک عن الروح	۵۰۳	آیات ۶۶ تا ۷۰
۵۲۵	معارف و مسائل	"	معارف و مسائل
"	روح سے کیا مراد ہے	۵۰۵	تکرمیم بنی آدم کی حکمت
۵۲۶	روح کے سوال کا واقعہ مکہ میں ہوا یا مدینہ میں	۵۰۷	آیات ۷۱ تا ۷۲
۵۲۷	سوال روح کا جواب	۵۰۸	معارف و مسائل
"	ہر سوال کا مطلوب جواب بیاضوری نہیں	"	نامہ اعمال

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۵۵۷	جدید مؤرخین کی تحقیق	۵۲۷	سائل کی دینی مصلحت کی رعایت ضروری ہے
۵۵۸	واقعہ اصحاب کہف کا زمانہ اور غار میں جانے کے اسباب	۵۲۸	روح کی حقیقت کا علم کسی کو ہو سکتا ہے یا نہیں
۵۵۹	قومیت اور اجتماعیت کی اصل بنیاد		سوال روح کا مفصل واقعہ
۵۶۱	کیا اصحاب کہف اب بھی زندہ ہیں	۹۵ تا ۹۰	آیات
۵۶۲	آیات ۱۳ تا ۱۶		معارف و مسائل
۵۶۳	معارف و مسائل		معاندانہ سوالات کا پیغمبرانہ جواب
	آیات ۱۷ تا ۱۸ مع خلاصہ تفسیر	۵۳۳	رسول انسان ہی ہو سکتا ہے فرشتہ نہیں
۵۶۷	اصحاب کہف کی طویل نیند	۵۳۴	آیات ۹۶ تا ۱۰۰
	ان کا گناہ اور نیک صحبت سے اس کا اعزاز	۵۳۶	معارف و مسائل
۵۶۸	نیک صحبت کے برکات	۵۳۷	آیات ۱۰۱ تا ۱۰۹
	اصحاب کہف کا رعب و جلال	۵۳۹	معارف و مسائل
۵۶۹	آیات ۱۹ تا ۲۰ مع خلاصہ تفسیر	۵۴۰	موسیٰ علیہ السلام کے نو معجزات
۵۷۳	چند مسائل	۵۴۱	آیات ۱۱۰ تا ۱۱۱
	آیت ۲۱	۵۴۲	معارف و مسائل، سورت کا شان نزول
۵۷۴	اصحاب کہف کی خبر شہر میں پھیل گئی	۵۴۳	ختم سورہ بنی اسرائیل و عرض مؤلف
۵۷۶	ان کی وفات کے بعد لوگوں میں اختلاف	۵۴۵	سورۃ کہف
۵۷۷	آیات ۲۲ مع خلاصہ تفسیر		آیات ۸ تا ۱
۵۷۸	اختلافی بحثوں میں گفتگو کے آداب	۵۴۶	سورہ کہف کی خصوصیات اور فضائل
۵۷۹	اسماء اصحاب کہف		شان نزول
	اختلافی معاملات میں طویل بحث	۵۴۸	خلاصہ تفسیر
۵۸۰	آیات ۲۳ تا ۲۶	۵۴۹	معارف و مسائل
۵۸۲	آئندہ کام کرنے پر انشاء اللہ کہنا		آیات ۹ تا ۱۲
۵۸۴	آیات ۲۷ تا ۳۱	۵۵۰	معارف و مسائل
۵۸۶	دعوت و تبلیغ کے خاص آداب		قصہ اصحاب کہف و رقیم
۵۸۷	اہل جنت کے لئے زیور	۵۵۳	غار اصحاب کہف جیسے غار دنیا میں متعدد ہیں
۵۸۸	آیات ۳۲ تا ۴۴		اصحاب کہف کی جگہ اور ان کا زمانہ

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۶۲۱	والدین کی نیکی کا فائدہ اولاد تک	۵۹۲	آیات ۴۵ تا ۴۹
۶۲۲	اشد والوں کا وجود پورے شہر کیلئے امان ہے	۵۹۶	قیامت میں قبروں سے اٹھنے کے وقت
۶۲۳	پیغمبرانہ بلاغت اور رعایت ادب	۵۹۷	جزائر عین عمل ہے
۶۲۴	خضر علیہ السلام زندہ ہیں یا وفات ہو گئی	۵۹۸	آیات ۵۰ تا ۵۹
۶۲۶	آیات ۸۳ تا ۸۸	۶۰۱	ابلیس کی اولاد اور ذریت بھی ہے
۶۲۸	ذوالقرنین کی تعریف اور تاریخ و وطن	۶۰۲	آیات ۶۰ تا ۷۰
۶۳۵	آیات ۸۹ تا ۹۱ و ۹۲ تا ۹۸	۶۰۵	اسلام میں نوکروں کا بھی ادب ہے
۶۳۸	یاجوج و ماجوج کون، کہاں ہیں، اور سید	۶۰۶	حضرت موسیٰ و خضر علیہما السلام کا قصہ
۶۳۹	ذوالقرنین کہاں ہے؟	۶۰۹	سفر کے بعض آداب اور پیغمبرانہ عزم کا نمونہ
۶۴۶	یاجوج ماجوج کے متعلق روایات حدیث	۶۱۱	موسیٰ علیہ السلام کی افضلیت خضر علیہ السلام پر
۶۵۰	اور ان کے حالات و واقعات	۶۱۲	حضرت خضر علیہ السلام نبی تھے یا نہیں
۶۵۲	روایات حدیث سے حاصل شدہ نتائج	۶۱۳	کسی ولی کو ظاہر شریعت کی خلاف ورزی
۶۵۵	محدث عصر حضرت شاہ صاحب کشمیری کی تحقیق	۶۱۵	حلال نہیں
۶۵۹	سید ذوالقرنین اس وقت تک موجود ہے	۶۱۸	شاگرد کے لئے استاد کا اتباع
۶۶۰	آیات ۹۹ تا ۱۰۱ و ۱۰۲ تا ۱۰۸	۶۲۰	عالم شریعت کو خلاف شرع امر پر صبر
۶۶۱	قیامت میں اعمال کا اعتبار وزن سے ہوگا	۶۲۱	جائز نہیں
۶۶۲	تعداد یا پیمائش سے نہیں	۶۲۲	علم موسوی و خضریٰ میں بنیادی فرق
۶۶۳	آیات ۱۰۹ تا ۱۱۰	۶۲۳	آیات ۷۱ تا ۷۸
۶۶۴	اخلاص عمل اور ریاکاری	۶۲۴	آیات ۷۹ تا ۸۲
۶۶۵	ریاکاری کے نتائج بد	۶۲۵	مسکین کی تعریف
۶۶۶	سورہ کہف کے بعض فضائل اور خواص	۶۲۶	بعض ظاہری خرابی حقیقی اصلاح ہوتی ہے
۶۶۷	ایک اہم نصیحت	۶۲۷	ایک قدیم نصیحت نامہ



سورۃ یوسف

مَكِّيَّةٌ وَهِيَ مَبْدُوءُ الرَّحْمٰنِ وَاجْزَى عَشْرَةِ آيَةٍ وَاثْنَا عَشَرَ مَرَّةً كُتِبَتْ

سورۃ یوسف مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ایک سو گیارہ آیتیں اور بارہ رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

الْوَاقِعَاتِ ۚ اِنَّ الْكِتٰبَ الْمُبِیْنِ ۝۱ اِذَا اَنْزَلْنٰهُ قَرِءْهُ نَاعَرِبَیْۤا

یہ آیتیں ہیں واضح کتاب کی ، ہم نے اس کو اتارا ہے قرآن عربی زبان

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝۲ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ

کا تاکہ تم سمجھ لو ، ہم بیان کرتے ہیں تیرے پاس بہت اچھا بیان اس

بِمَا اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ ۚ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهِ

واسطے کہ بھیجا ہم نے تیری طرف یہ قرآن ، اور تو تھا اس سے پہلے

لَمِنَ الْغٰفِلِیْنَ ۝۳ اِذْ قَالَ یُوْسُفُ لِاَبِیْهِ یَا اَبَتِ اِنِّیْ رَاَیْتُ

البتہ بے خبروں میں ، جس وقت کہا یوسف نے اپنے باپ سے اے باپ میں نے دیکھا

اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ رَاَیْتُهُمْ لِيْ سَاجِدِیْنَ ۝۴

خواب میں گیارہ ستاروں کو اور سورج کو اور چاند کو دیکھا میں نے ان کو اپنے واسطے سجدہ کرتے ہوئے

قَالَ یٰبُنٰی لَا تَقْصُصْ رُءُیَاكَ عَلٰی اِخْوَتِكَ فَيَكِيدُوْا لَكَ كَيْدًا ۚ

کہا نے بیٹے مت بیان کرنا خواب اپنا اپنے بھائیوں کے آگے پھر وہ بنائیں گے تیرے واسطے کچھ فریب

اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَیْلٰی لِنَاسٍ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ۝۵ وَكَذٰلِكَ یَجْتَبِیْكَ

البتہ شیطان ہے انسان کا صریح دشمن ، اور اسی طرح برگزیدہ کرے گا تجھ کو

رَبِّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ

تیرا رب اور سکھائے گا تجھ کو ٹھکانے پر لگانا باتوں کا اور پورا کرے گا اپنا انعام تجھ پر

وَعَلَىٰ آلِ يَعْقُوبَ كَمَا أَتَمَّهَا عَلَىٰ أَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلِ إِبْرَاهِيمَ

اور یعقوب کے گھر پر جیسا پورا کیا ہو تیرے باپ دادوں پر اس سے پہلے ابراہیم

وَإِسْحَاقَ إِنَّ رَبَّكَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ⑥

اور اسحاق البتہ تیرا رب خبردار ہے حکمت والا

خلاصہ تفسیر

الکوا، (اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ آیتیں ہیں ایک واضح کتاب کی (جس کے الفاظ اور معانی اولیہ بہت صاف ہیں) ہم نے اس کو اتارا ہے قرآن عربی زبان کا تاکہ تم (اہل زبان ہونے کی وجہ سے دوسروں سے پہلے) سمجھو (پھر تمہارے واسطے سے دوسرے لوگ سمجھیں)۔ ہم نے جو یہ قرآن آپ کے پاس بھیجا ہے اس کے ذریعہ سے ہم آپ سے ایک بڑا عمدہ قصہ بیان کرتے ہیں اور اس سے پہلے آپ (اس قصہ سے) بالکل بے خبر تھے (کیونکہ نہ آپ نے کوئی کتاب پڑھی تھی، نہ کسی معلم سے کچھ سیکھا تھا، اور قصہ کی شہرت بھی ایسی نہیں تھی کہ عوام جانتے ہو)۔ آغاز قصہ (وہ وقت قابل ذکر ہے جبکہ یوسف (علیہ السلام) نے اپنے والد یعقوب علیہ السلام سے کہا کہ ابائیں نے (خواب میں) گیارہ ستارے اور سورج اور چاند دیکھے ہیں ان کو اپنے سامنے سجدہ کرتے ہوئے دیکھا ہے، انھوں نے (جواب میں) فرمایا کہ بیٹا اپنے اس خواب کو اپنے بھائیوں کے سامنے بیان نہ کرنا (کیونکہ وہ خاندان نبوت میں سے ہونے کی وجہ سے اس خواب کی تعبیر جانتے ہیں کہ گیارہ ستارے گیارہ بھائی اور سورج والد اور چاند ماں ہے، اور سجدہ کرنے سے مراد ان سب کا تمہارے لئے مطیع و فرمانبردار ہونا ہے) تو وہ تمہارے (ایذا رسانی کے) لئے کوئی خاص تدبیر کریں گے (یعنی بھائیوں میں سے اکثر، کیونکہ دن بھائی علاتی تھے، ان سے خطرہ تھا، صرف ایک بھائی حقیقی بنیامین تھے جن سے کسی خلاف کا تو اندیشہ نہ تھا، مگر یہ احتمال تھا کہ انکے منہ سے بات نکل جائے) بلاشبہ شیطان آدمی کا کھلا دشمن ہے (اس لئے بھائیوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالے گا) اور (بسطرح اللہ تعالیٰ تم کو یہ عزت دے گا کہ سب تمہارے تابع و مطیع ہوں گے) اس بطرح تمہارا رب تمکو (دوسری عزت نبوت کیلئے بھی) منتخب کریگا اور تمکو خواہو بخواہی تعبیر کا علم دیگا اور (دوسری نعمتیں دیکر بھی) تم پر اور اولاد یعقوب پر اپنا انعام کامل کریگا جیسا کہ اس سے پہلے تمہارے دادا ابراہیم و اسحاق (علیہما السلام) پر اپنا انعام کامل کر چکا ہے واقعی تمہارا رب بڑا علم والا بڑی حکمت والا ہے۔

معارف و مسائل

سورۃ یوسف چار آیتوں کے سوا پوری مکی سورۃ ہے، اس سورۃ میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ تسلسل اور ترتیب کے ساتھ بیان ہوا ہے، اور یہ قصہ صرف اسی سورۃ میں آیا ہے، پورے قرآن میں دو بار اس کا کہیں ذکر نہیں، یہ خصوصیت صرف قصہ یوسف علیہ السلام ہی کی ہے ورنہ تمام انبیاء علیہم السلام کے قصص و واقعات پورے قرآن میں خاص حکمت کے تحت اجزاء اجزاء کر کے لائے گئے ہیں اور بار بار لاتے گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ عالم اور ماضی کے تجربات میں انسان کی آئندہ زندگی کے لئے بڑی سبق ہوتے ہیں جن کی قدرتی تاثیر کا رنگ انسان کے قلب و دماغ پر عام تعلیمات سے بہت زیادہ گہرا اور بے محنت ہوتا ہے، اسی لئے قرآن کریم جو تمام اقوام عالم کے لئے آخری ہدایت نامہ کی حیثیت سے بھیجا گیا ہے، اس میں پوری اقوام عالم کی تاریخ کا وہ منتخب حصہ لے لیا گیا ہے، جو انسان کے حال اور مآل کی اصلاح کے لئے نسخہ کیمیا ہے، مگر قرآن کریم نے تاریخ عالم کے اس حصہ کو بھی اپنے مخصوص دہے مثال انداز میں اس طرح لیا ہے کہ اس کا پڑھنے والا یسوس نہیں کر سکتا کہ یہ کوئی تاریخ کی کتاب ہے بلکہ ہر مقام پر جس قصہ کا کوئی نکتہ عبرت و موعظت کیلئے ضروری سمجھا گیا ہے اتنا ہی حصہ وہاں بیان کیا گیا، اور پھر کسی دوسرے موقع پر اس حصہ کی ضرورت سمجھی گئی تو پھر اس کا اعادہ کر دیا گیا، اسی لئے ان قصوں کے بیان میں واقعاتی ترتیب کی رعایت نہیں کی گئی، بعض جگہ قصہ کا ابتدائی حصہ بعد میں اور آخری حصہ پہلے ذکر کر دیا گیا ہے، اس خاص اسلوب قرآنی میں یہ مستقل ہدایت ہے، کہ دنیا کی تاریخ اور اس کے گزشتہ واقعات کا پڑھنا یاد رکھنا خود کوئی مقصد نہیں، بلکہ انسان کا مقصد ہر قصہ و خبر سے کوئی عبرت و نصیحت حاصل کرنا ہونا چاہئے۔

اسی لئے بعض اہل تحقیق نے فرمایا کہ انسان کے کلام کی جو دو قسمیں خبر اور انشاء مشہور ہیں، ان دونوں قسموں میں سے مقصود اصلی انشاء ہی ہے، خبر بحیثیت خبر کبھی مقصود نہیں ہوتی، بلکہ دانشمند انسان کا مقصد ہر خبر اور واقعہ کو سننے اور دیکھنے سے صرف اپنے حال اور عمل کی اصلاح ہونی چاہئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کو ترتیب کے ساتھ بیان کرنے کی ایک حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ تاریخ نگاری بھی ایک مستقل فن ہے، اس میں اس فن والوں کے لئے خاص ہدایات ہیں، کہ بیان میں نہ اتنا اختصار ہونا چاہئے جس سے بات ہی پوری نہ سمجھی جاسکے

اور نہ اتنا طویل ہونا چاہئے کہ اس کا پڑھنا اور یاد رکھنا مشکل ہو جائے جیسا کہ اس قصہ کے قرآنی بیان سے واضح ہوتا ہے۔

دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بعض روایات میں ہے کہ یہود نے آزمائش کیلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ اگر آپ سچے نبی ہیں تو ہمیں بتلائیے کہ آل یعقوب ملک شام سے مصر کیوں منتقل ہوئے، اور یوسف علیہ السلام کا واقعہ کیا تھا؟ ان کے جواب میں بذریعہ وحی یہ پورا قصہ نازل کیا گیا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ اور آپ کی نبوت کا بڑا شاہد تھا، آپ امی محض تھے اور عمر سب کے میں مقیم رہے، کسی سے تعلیم حاصل نہیں کی اور نہ کوئی کتاب پڑھی، پھر وہ تمام واقعات جو تورات میں مذکور تھے، صحیح صحیح بتلا دیئے، بلکہ بعض وہ چیزیں بھی بتلا دیں جن کا ذکر تورات میں نہ تھا، اور اس کے ضمن میں بہت سے احکام اور ہدایات ہیں جو آگے بیان ہوں گی۔

سب سے پہلی آیت میں حروف التامیز مقطعات قرآنیہ میں سے ہیں، جن کے متعلق جہود سلف صحابہ و تابعین کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ متکلم اور مخاطب امی اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک راز ہے جس کو کوئی تیسرا آدمی نہیں سمجھ سکتا، اور نہ اس کے لئے مناسب ہے کہ اس کی تحقیق کے درپے ہو۔

تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْمُبِينِ، یعنی یہ ہیں آیتیں اس کتاب کی جو احکام حلال و حرام اور ہر کام کی حدود و قیود بتلا کر انسان کو ہر شعبہ زندگی میں ایک معتدل سیدھا نظام حیات بخشتی ہیں جن کے نازل کرنے کا وعدہ تورات میں پایا جاتا ہے، اور یہود اس سے واقف ہیں۔
إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ، یعنی ہم نے نازل کیا اس کو قرآن عربی بنا کر کہ شاید تم سمجھ لو جھوٹ نہ کہو۔

اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ قصہ یوسف علیہ السلام کا سوال کرنے والے عرب کے یہودی تھے، اللہ تعالیٰ نے انہی کی زبان میں یہ قصہ نازل فرما دیا تاکہ وہ غور کریں، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق و حقانیت پر ایمان لائیں اور اس قصہ میں جو احکام و ہدایات ہیں ان کو اپنے لئے مشعل راہ بنائیں۔

اس لئے اس جگہ لفظ لَعَلَّ بمعنی شاید لایا گیا ہے، کیونکہ ان مخاطبوں کا حال معلوم تھا کہ ایسے واضح آیات و بینات سامنے آنے کے بعد بھی ان سے قبول حق کی توقع مشکوک تھی۔

ثُمَّ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِينَ بِمَثَلٍ تِلْكَ هَذِهِ الْقُرْآنُ وَإِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الْخَافِلِينَ، یعنی ہم بیان کرتے ہیں آپ کے لئے بہترین قصہ اس قرآن کو بذریعہ وحی آپ پر نازل کر کے بیشک آپ اس سے پہلے ان تمام واقعات ناواقف تھے۔

اس میں پہرہ کو تنبیہ ہے کہ تم نے جس طرح ہمارے رسولؐ کی آزمائش کرنا چاہی اس میں بھی رسولؐ کا کمال واضح ہو گیا، کیونکہ وہ پہلے سے اُختی اور تائید عالم سے ناواقف تھے، اب اس واقفیت کا کوئی ذریعہ بحسن تعلیم الہی اور وحی نبوت کے نہیں ہو سکتا۔

اِذْ قَالَ يُوسُفُ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَالشَّمْسَ
وَالْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ لِي سَاجِدِينَ ۚ یعنی یوسف علیہ السلام نے اپنے والد سے کہا کہ ابا جان
میں نے خواب میں گیارہ ستارے اور سورج اور چاند کو دیکھا ہے اور یہ دیکھا ہے کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔
یہ حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب تھا جس کی تعبیر کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباسؓ
نے فرمایا کہ گیارہ ستاروں سے مراد یوسف علیہ السلام کے گیارہ بھائی اور سورج اور چاند سے
مراد ماں باپ تھے۔

قرطبی میں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی والدہ اگرچہ اس واقعہ سے پہلے وفات
پا چکی تھیں، مگر ان کی خالہ والدہ ماجدہ کے نکاح میں آگئی تھیں، خالہ خود بھی ماں کے قائم مقام
سمجھی جاتی ہے، خصوصاً جبکہ وہ والد کی زوجیت میں آجائے تو عرفاً اس کو ماں ہی کہا جائے گا۔
قَالَ يُبْنَىٰ لَا تَقْصُصْ رُجُوكَ عَلَىٰ إِخْوَتِكَ فَيَكِيدُوا لَكَ كَيْدًا ۚ إِنَّ الشَّيْطَانَ
لِإِنْسَانٍ عَدُوٌّ مُّبِينٌ، یعنی بیٹا تم اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں سے نہ کہنا،
ایسا نہ ہو کہ وہ یہ خواب سن کر تمہاری عظمتِ شان معلوم کر کے تمہیں ہلاک کرنے کی کوئی تدبیر
کریں، کیونکہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے، وہ دنیا کے جاہ و مال کی خاطر انسان کو ایسے کاموں میں
بمٹلا کر دیتا ہے۔

ان آیات میں چند مسائل قابل ذکر ہیں :-

خواب کی حقیقت اور درجہ | سب سے اول خواب کی حقیقت اور اس سے معلوم ہونے والے
اور اس کی قسمیں ؛ واقعات و اخبار کا درجہ اور مقام ہے، تفسیر منظری میں حضرت
قاضی ثناء اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حقیقت خواب کی یہ ہے کہ نفسِ انسان جس وقت نیند
یا بیہوشی کے سبب ظاہر بدن کی تدبیر سے فارغ ہو جاتا ہے تو اس کو اس کی قوتِ خیالیہ کی
راد سے کچھ صورتیں دکھائی دیتی ہیں، اسی کا نام خواب ہے، پھر اس کی تین قسمیں ہیں جن میں سے
رد بالکل باطل ہیں، جن کی کوئی حقیقت اور اصلیت نہیں ہوتی، اور ایک اپنی ذات کے اعتبار
سے صحیح و صادق ہے، مگر اس صحیح قسم میں بھی کبھی کبھی عوارض شامل ہو کر اس کو فاسد و ناقابل اعتبار
کر دیتے ہیں۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ خواب میں جو انسان مختلف صورتیں اور واقعات رکھتا ہے

کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ بیداری کی حالت میں جو صورتیں انسان دیکھتا رہتا ہے وہی خواب میں مشکل ہو کر نظر آجاتی ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ شیطان کچھ صورتیں اور واقعات اس کے ذہن میں ڈالتا ہے، کبھی خوش کرنے والے اور کبھی ڈرانے والے یہ دونوں قسمیں باطل ہیں جن کی نہ کوئی حقیقت و اصلیت ہے نہ اس کی کوئی واقعی تعبیر ہو سکتی ہے، ان میں پہلی قسم کو حدیث النفس اور دوسری کو تسوکل شیطانی کہا جاتا ہے۔

تیسری قسم جو صحیح اور حق ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک قسم کا اہام ہے جو اپنے بندہ کو متنبہ کرنے یا خوش خبری دینے کے لئے کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے خزانہ غیب سے بعض چیزیں اس کے قلب و دماغ میں ڈال دیتے ہیں۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، کہ مومن کا خواب ایک کلام ہے جس میں وہ اپنے رب سے شرف گفتگو حاصل کرتا ہے، یہ حدیث طبرانی نے بسند صحیح روایت کی ہے (مظہری)۔

اس کی تحقیق صوفیائے کرام کے بیان کے مطابق یہ ہے کہ عالم میں جتنی چیزیں وجود میں آنے والی ہیں، اس وجود سے پہلے ہر چیز کی ایک خاص شکل عالم مثال میں ہوتی ہے، اور اس عالم مثال میں جس طرح جو اہر اور حقائق ثابتہ کی صورتیں نکلیں ہوتی ہیں، اسی طرح معانی اور اعراض کی بھی خاص شکلیں ہوتی ہیں، خواب میں جب نفس انسانی ظاہر بدن کی تدبیر سے فانی ہوتا ہے تو بعض اوقات اس کا تعلق عالم مثال سے ہو جاتا ہے اور جو کائنات کی شکلیں ہیں وہ اس کو نظر آجاتی ہیں، پھر یہ صورتیں عالم غیب کے دکھائی جاتی ہیں، بعض اوقات ان میں بھی کچھ عوارض ایسے پیدا ہو جاتے ہیں کہ اصل حقیقت کے ساتھ کچھ تخیلات باطلہ شامل ہو جاتے ہیں، اس لئے اہل تعبیر کو بھی اس کی تعبیر سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے، اور بعض اوقات وہ تمام عوارض سے پاک صاف رہتی ہیں تو وہ اصل حقیقت ہوتی ہیں، مگر ان میں بھی بعض خواب محتاج تعبیر ہوتے ہیں، کیونکہ ان میں حقیقت واقعہ واضح نہیں ہوتی، ایسی صورت میں بھی اگر تعبیر غلط ہو جائے تو واقعہ مختلف ہو جاتا ہے، اس لئے صرف وہ خواب صحیح طور پر اہام من اللہ اور حقیقت ثابتہ ہوگی جو اللہ کی طرف سے ہوا اور اس میں کچھ عوارض بھی شامل نہ ہوں، اور تعبیر بھی صحیح دی گئی ہو۔

انبیاء علیہم السلام کے سب خواب ایسے ہی ہوتے ہیں، اسی لئے ان کے خواب بھی وحی کا درجہ رکھتے ہیں، عام مسلمانوں کے خواب میں ہر طرح کے احتمال رہتے ہیں، اس لئے وہ کسی کے لئے حجت اور دلیل نہیں ہوتے، ان کے خوابوں میں بعض اوقات طبعی اور نفسانی صورتوں کی آمیزش ہو جاتی ہے، اور بعض اوقات گناہوں کی ظلمت و کدورت صحیح خواب پر چھا کر اس کو

ناقابل اعتماد بنادیتی ہے، بعض اوقات تعبیر صحیح سمجھ میں نہیں آتی۔

خواب کی یہ تین قسمیں جو ذکر کی گئی ہیں یہی تفصیل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو آپ نے فرمایا کہ خواب کی تین قسمیں ہیں، ایک قسم شیطانی ہے جس میں شیطان کی طرف سے کچھ صورتیں ذہن میں آتی ہیں، دوسری وہ جو آدمی اپنی بیداری میں دیکھتا رہتا ہے وہی صورتیں خواب میں سامنے آجاتی ہیں، تیسری قسم جو صحیح اور حق ہے وہ نبوت کے اجزاء میں سے چھالیسواں جز ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام ہے۔

خواب میں جز نبوت ہونے کے | یہ قسم جو حق اور صحیح ہے اور صحیح احادیث نبویہ میں نبوت کا ایک معنی اور اس کی تشریح | جز قرار دی گئی ہے، اس میں روایات حدیث مختلف ہیں بعض

میں چالیسواں جز اور بعض میں چھالیسواں جز بتلایا، اور بعض روایات میں انچاس اور پچاس اور ستر واں جز ہونا بھی منقول ہے، یہ سب روایتیں تفسیر قرطبی میں جمع کر کے ابن عبد البر کی تحقیق یہ نقل کی ہے کہ ان میں کوئی تضاد و تخالف نہیں، بلکہ ہر ایک روایت اپنی جگہ صحیح و درست ہے، اور تعدد اجزاء کا یہ اختلاف خواب دیکھنے والوں کے مختلف حالات کی بناء پر ہے، جو شخص سچائی، امانت، دیانت اور کمال ایمان کے ساتھ متصف ہے اس کا خواب نبوت کا چالیسواں جز ہوگا، اور جو ان اوصاف میں کچھ کم ہے اس کا چھالیسواں یا پچاسواں جز ہوگا، اور جو اور کم ہے اس کا خواب نبوت کا ستر واں جز ہوگا۔

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ سچے خواب کے جز نبوت ہونے سے کیا مراد ہے، تفسیر منظر میں اس کی توجیہ یہ بیان کی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نبوت کا سلسلہ تینیس سال جاری رہا، ان میں سے پہلی ششماہی میں یہ وحی الہی خوابوں کی صورت میں آتی رہی، باقی پینتالیس ششماہیوں میں جبرئیل امین کی پیغام رسانی کی صورت میں آتی، اس حساب سے سچی خوابیں وحی نبوت کا چھالیسواں جز ہوا، اور جن روایات میں کم و بیش عدد مذکور ہیں ان میں یا تقریبی کلام کیا گیا ہے یا وہ سند کے اعتبار سے ساقط ہیں۔

اور امام قرطبی نے فرمایا کہ اس کے جز نبوت ہونے سے مراد یہ ہے کہ خواب میں بعض اوقات انسان ایسی چیزیں دیکھتا ہے جو اس کی قدرت میں نہیں، مثلاً یہ دیکھے کہ وہ آسمان پر اڑ رہا ہے، یا غیب کی ایسی چیزیں دیکھے جن کا علم حاصل کرنا اس کی قدرت میں نہ تھا، تو اس کا ذریعہ بجز امداد و الہام خداوندی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا، جو اصل میں خاصہ نبوت ہے اس لئے اس کو ایک جز نبوت قرار دیا گیا۔

قادیانی دجال کے ایک مغالطہ کی تردید | یہاں کچھ لوگوں کو ایک عجیب مغالطہ لگا ہے کہ اس جز نبوت

کے دنیا میں باقی رہنے اور جاری رہنے سے نبوت کا باقی اور جاری رہنا سمجھ بیٹھے جو قرآن مجید کی نصوص قطعیہ اور بے شمار احادیث صحیحہ کے خلاف اور پوری امت کے اجماعی عقیدہ ختم نبوت کے منافی ہے، اور یہ نہ سمجھے کہ کسی چیز کا ایک جز موجود ہونے سے اس چیز کا موجود ہونا لازم نہیں آتا، اگر کسی شخص کا ایک ناخن یا ایک بال کہیں موجود ہو تو کوئی انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہاں وہ شخص موجود ہے، مثیلین کے بہت سے گل پرزوں میں اگر کسی کے پاس ایک پرزہ یا ایک سکر موجود ہو اور وہ کہنے لگے کہ میرے پاس فلاں مشین موجود ہے تو دنیا بھر کے انسان اس کو یا جھوٹا سمجھیں گے یا بیوقوف۔

سچے خواب حسب تصریح حدیث بلاشبہ جز نبوت ہیں مگر نبوت نہیں، نبوت تو ختم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکی ہے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **لَا تَمَيَّنُوا مِنَ النَّبُوءَاتِ إِلَّا الْمُبَشِّرَاتِ**، یعنی آئندہ نبوت کا کوئی جز بجز مبشرات کے باقی نہ رہے گا، صحابہ کرام نے عرض کیا کہ مبشرات سے کیا مراد ہے؟ تو فرمایا کہ ”سچے خواب“، جس سے ثابت ہوا کہ نبوت کسی قسم یا کسی صورت سے باقی نہیں، صرف اس کا چھوٹا جز باقی ہے جس کو مبشرات یا سچے خواب کہا جاتا ہے۔

کبھی کبھی فاسق آدمی کا خواب | اور یہ بات بھی قرآن و حدیث سے ثابت اور تجربات سے معلوم ہے کہ سچے خواب بعض اوقات فاسق فاجر بلکہ کافر کو بھی آسکتے ہیں۔

سورہ یوسف ہی میں حضرت یوسف علیہ السلام کے جیل کے دو ساتھیوں کے خواب اور ان کا سچا ہونا، اسی طرح بادشاہ مصر کا خواب اور اس کا سچا ہونا قرآن میں مذکور ہے، حالانکہ یہ تینوں مسلمان نہ تھے، حدیث میں کسریٰ کا خواب مذکور ہے، جو اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے متعلق دیکھا تھا، وہ خواب صحیح ہوا حالانکہ کسریٰ مسلمان نہ تھا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بھوپلی عاتکہ نے بحالت کفر آپ کے بارے میں سچا خواب دیکھا تھا نیز کافر بادشاہ بخت نصر کے جس خواب کی تعبیر حضرت دانیال علیہ السلام نے دی وہ خواب سچا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ محض اتنی بات کہ کسی کو کوئی سچا خواب نظر آجائے اور واقعہ اس کے مطابق ہو جائے، اس کے نیک صالح بلکہ مسلمان ہونے کی بھی دلیل نہیں ہو سکتی، ہاں یہ صحیح ہے کہ عام عادۃ اللہ یہی ہے کہ سچے اور نیک لوگوں کے خواب عموماً سچے ہوتے ہیں، فاسق و فجار کے عموماً حدیث النفس یا تسویل شیطانی کی قسم باطل سے ہوا کرتے ہیں، مگر کبھی اس کے خلاف بھی ہو جاتا ہے۔

بہر حال پختہ خواب عام امت کے لئے حسب تصریح حدیث ایک بشارت یا تنبیہ سے زائد کوئی مقام نہیں رکھتے، نہ خود اس کے لئے کسی معاملہ میں حجت ہیں نہ دوسروں کے لئے، بعض نادان لوگ ایسے خواب دیکھ کر طرح طرح کے دس دس میں مبتلا ہو جاتے ہیں، کوئی ان کو اپنی ولایت کی علامت سمجھنے لگتا ہے، کوئی ان سے حاصل ہونے والی باتوں کو شرعی احکام کا درجہ دینے لگتا ہے یہ سب چیزیں بے بنیاد ہیں، خصوصاً جب کہ یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ سچے خوابوں میں بھی بکثرت نفسانی یا شیطانی یادوں قسم کے تصورات کی آمیزش کا احتمال ہے۔

خواب ہر شخص سے بیان | مسئلہ: - آیت قَالَ یٰٰیٰہٰی الزّٰہِیّٰ حضرت یعقوب علیہ السلام نے یوسف کرنا درست نہیں | علیہ السلام کو اپنا خواب بھائیوں کے سامنے بیان کرنے سے منع فرمایا،

اس سے معلوم ہوا کہ خواب ایسے شخص کے سامنے بیان نہ کرنا چاہئے جو اس کا خیر خواہ اور بہرہ نہ ہو، اور نہ ایسے شخص کے سامنے جو تعبیر خواب میں ماہر نہ ہو۔

جامع ترمذی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سچا خواب نبوت کے چالیس اجزاء میں سے ایک جزء ہے، اور خواب معلق رہتا ہے جب تک کسی سے بیان نہ کیا جائے جب بیان کر دیا گیا اور سننے والے نے کوئی تعبیر دیدی، تو تعبیر کے مطابق واقع ہو جاتا ہے اس لئے چاہئے کہ خواب کسی سے بیان نہ کرے، بجز اس شخص کے کہ جو عالم و عاقل ہو یا کم از کم اس کا دوست اور خیر خواہ ہو۔

نیز ترمذی اور ابن ماجہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خواب تین قسم کا ہوتا ہے، ایک اللہ کی طرف سے بشارت، دوسرے نفسانی خیالات، تیسرے شیطانی تصورات، اس لئے جو شخص کوئی خواب دیکھے اور اسے بھلا معلوم ہو تو اس کو اگر چاہے لوگوں سے بیان کر دے، اور اگر اس میں کوئی بُری بات نظر آئے تو کسی سے نہ کہے، بلکہ اٹھ کر نماز پڑھ لے، اور صحیح مسلم کی حدیث میں یہ بھی ہے کہ بُرے خواب دیکھے تو بائیں طرف تین مرتبہ تھوک دے اور اللہ سے اس کی بُرائی سے پناہ مانگے، اور کسی سے ذکر نہ کرے، تو یہ خواب اس کو کوئی نقصان نہ دے گا، وجہ یہ ہے کہ بعض خواب تو شیطانی تصورات ہوتے ہیں وہ اس عمل سے دفع ہو چکے اور اگر سچا خواب ہو تو اس عمل کے ذریعہ اس کی بُرائی دور ہو جانے کی بھی امید ہے۔

مسئلہ: - خواب کی تعبیر خواب پر موقوف رہنے کا مطلب تفسیر مغہری میں یہ بیان فرمایا ہے کہ بعض تقدیری امور تقدیر مہرم یعنی قطعی نہیں ہوتے، بلکہ معلق ہوتے ہیں کہ فلاں کام ہو گیا تو یہ مصیبت ٹل جائے گی، اور نہ ہوا تو پڑ جائے گی، جس کو قصائے معلق کہا جاتا ہے، ایسی صورت میں بُری تعبیر دینے سے معاملہ بُرا اور اچھی تعبیر سے اچھا ہو جاتا ہے، اسی لئے

ترمذی کی حدیث مذکور میں ایسے شخص سے خواب بیان کرنے کی ممانعت کی گئی ہے جو عقلمند نہ ہو یا اس کا خیر خواہ و ہمدرد نہ ہو، اور یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ خواب کی کوئی بُری تعبیر سُکر انسان کے دل میں یہی خیال جمتا ہے کہ اب مجھ پر مصیبت آنے والی ہے، اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِي يَتِي، یعنی بندہ میرے متعلق جیسا گمان کرتا ہو میں اس کے حق میں دیا ہی ہو جاتا ہوں۔ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مصیبت آنے پر یقین کر بیٹھا تو اس عادت اللہ کے مطابق اس پر مصیبت آنا ضرور ہو گیا۔

مَسْئَلہ ۱:- اس آیت سے جو یہ معلوم ہوا کہ جس خواب میں کوئی بات تکلیف و مصیبت کی نظر آئے وہ کسی سے بیان نہ کرے روایات حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ممانعت محض شفقت اور ہمدردی کی بناء پر ہے، شرعی حرام نہیں، اس لئے اگر کسی سے بیان کر دے تو کوئی گناہ نہیں، کیونکہ احادیث صحیحہ میں ہے کہ غزوۃ اُحد کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میری تلوار ذوالفقار ٹوٹ گئی، اور دیکھا کہ کچھ بچہ زنج ہو رہی ہیں، جس کی تعبیر حضرت حمزہؓ کی شہادت اور بہت سے مسلمانوں کی شہادت تھی جو بڑا حادثہ ہے، مگر آپ نے اس خواب کو صحابہ سے بیان فرمادیا تھا۔ (قرطبی)

مَسْئَلہ ۲:- اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمان کو دوسرے کے شر سے بچانے کے لئے اُس کی کسی بُری خصلت یا نیت کا اظہار کر دیتا جائز ہے، یہ غیبت میں داخل نہیں، مثلاً کسی شخص کو معلوم ہو جائے کہ فلاں آدمی کسی دوسرے آدمی کے گھر میں چوری کرنے یا اس کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہے تو اس کو چاہئے کہ اس شخص کو باخبر کر دے، یہ غیبت حرام میں داخل نہیں، جیسا کہ یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام سے اس کا اظہار کر دیا کہ بھائیوں سے ان کی جان کا خطرہ ہے۔

مَسْئَلہ ۳:- اسی آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس شخص کے متعلق یہ احتمال ہو کہ ہماری خوش حالی اور نعمت کا ذکر سنے گا تو اس کو حسد ہوگا، اور نقصان پہونچانے کی فکر کرے گا تو اس کے سامنے اپنی نعمت، دولت و عزت وغیرہ کا ذکر نہ کرے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

”اپنے مقاصد کو کامیاب بنانے کے لئے ان کو راز میں رکھنے سے مدد حاصل

کر، کیونکہ دنیا میں ہر صاحبِ نعمت سے حسد کیا جاتا ہے۔“

مَسْئَلہ ۴:- اس آیت اور بعد کی آیات سے جن میں حضرت یوسف علیہ السلام کو قتل کرنے یا کنویں میں ڈالنے کا مشورہ اور اس پر عمل مذکور ہے، یہ بھی واضح ہو گیا کہ

یوسف علیہ السلام کے بھائی اللہ کے نبی اور پیغمبر نہ تھے، ورنہ قتل یوسف کا مشورہ اور پھر ان کو
ضائع کرنے کی تدبیر اور باپ کی نافرمانی کا عمل ان سے نہ ہوتا، کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا
سب گناہوں سے پاک ہونا اور محصور ہونا ضروری ہے، کتاب طبری میں جو ان کو انبیاء کہا گیا
ہے وہ صحیح نہیں (قرطبی)

پچھی آیت میں اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام سے چند انعامات عطا کرنے کا وعدہ
فرمایا ہے اول كَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے انعامات و احسانات کے لئے
آپ کا انتخاب فرمائیں گے، جس کا ظہور ملک مصر میں حکومت اور عزت و دولت ملنے سے ہوا،
دوسرے وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ، اس میں احادیث سے مراد لوگوں کے خواب
ہیں، معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو تعبیر خواب کا علم سکھادیں گے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ
تعبیر خواب ایک مستقل فن ہے، جو اللہ تعالیٰ کسی کسی کو عطا فرمادیتے ہیں، ہر شخص اس کا اہل نہیں۔
مَسْئَلَةٌ۔ تعبیر قرطبی میں ہے کہ عبد اللہ بن شداد بن الہاد نے فرمایا کہ یوسف علیہ السلام
کے اس خواب کی تعبیر چالیس سال بعد ظاہر ہوئی، اس سے معلوم ہوا کہ تعبیر کا فوراً ظاہر ہونا
کوئی ضروری نہیں۔

تیسرا وعدہ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ یعنی اللہ تعالیٰ آپ پر اپنی نعمت پوری فرمادیں گے
اس میں عطا نبوت کی طرف اشارہ ہے، اور اسی کی طرف اشارہ بعد کے جملوں میں ہے كَمَا اَنْتَ خَا
عَلٰى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلِ اِبْرٰهِيْمَ وَاسْحٰقَ، یعنی جس طرح ہم اپنی نعمت نبوت
تمہارے باپ دادا ابراہیم اور اسحاق علیہم السلام پر آپ سے پہلے پوری کر چکے ہیں، اس میں اس طرف
بھی اشارہ ہو گیا کہ تعبیر خواب کا فن جیسا کہ یوسف علیہ السلام کو دیا گیا، اسی طرح ابراہیم و اسحاق
علیہم السلام کو بھی سکھایا گیا تھا۔

آخر آیت میں فرمایا اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ یعنی تمہارا پروردگار بڑا علم والا بڑی
حکمت والا ہے، نہ اس کے لئے کسی کو کوئی فن سکھانا مشکل ہے، اور نہ از روئے حکمت وہ یہ
فن ہر شخص کو سکھاتا ہے، بلکہ اپنی حکمت کے ماتحت انتخاب کر کے کسی کو یہ ہنر دیدیتا ہے۔

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَ اَخْوَتِهٖ اٰيٰتٍ لِّلْاَسٰفِيْنَ ۝۱۰ اِذْ قَالُوْا

البتہ ہیں یوسف کے قصہ میں اور اس کے بھائیوں کے قصہ میں نشانیاں پوچھنے والوں کیلئے، جب کہنے لگے

لِيُوْسُفَ وَ اَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰى اٰبِنَا مِنْ نَّحْنُ عَصِيْبَةٌ اِنْ

البتہ یوسف اور اس کا بھائی زیادہ پیارا ہی ہمارے باپ کو ہم سے اور ہم ان کی زیادہ قوت والے لوگ ہیں، البتہ

آبَا نَالِقِ ضَلِّلِ مُبِينٍ ⑧ اِقْتُلُوا يَوْسُفَ وَاطْرَحُوهُ اَرْضًا يَخْلُ

ہمارا باپ صریح خطا پر ہے، مار ڈالو یوسف کو یا پھینک دو کسی ملک میں کہ غافل رہے

لَكُمْ وَجْهٌ اَبْيَكُمْ وَتَكُونُوا مِنْ اٰبَعْدِهِ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ ⑨

تم پر تو جہ تمھارے باپ کی، اور ہو رہنا اس کے بعد نیک لوگ

قَالَ قَائِلٌ مِنْهُمْ لَا تَقْتُلُوا يَوْسُفَ وَالْقُوَّةُ فِيْ غَيْبَتِ الْجُبِّ

بولا ایک بولنے والا ان میں مت مار ڈالو یوسف کو اور ڈال دو اس کو گنہگار کنویں میں

يَلْتَقِطُهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ⑩ قَالُوا يَا بٰنَا

کہ اٹھالے جائے اس کو کوئی مسافر اگر تم کو کرنا ہے، بولے اے باپ

مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يَوْسُفَ وَاِنَّا لَنَصِحُوْنَ ⑪ اَرْسِلْهُ

کیا بات ہو کہ تو اعتبار نہیں کرتا ہمارا یوسف پر اور ہم تو اس کے خیر خواہ ہیں، بھیج اس کو

مَعَنَا غَدًا يَّرْتَمِعْ وَيَلْعَبْ وَاِنَّا لَنَحْفِظُوْنَ ⑫ قَالَ اِنِّیْ

ہمارے ساتھ کل کو خوب کھائے اور کھیلے اور ہم تو اس کے نگہبان ہیں، بولا مجھ کو

لَيَحْزَنُنِیْ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَاَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَ

غم ہوتا ہے اس سے کہ تم اس کو لے جاؤ اور ڈرتا ہوں اس سے کہ کھا جائے اس کو بھیڑیا اور

اَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ⑬ قَالُوا لَیْنِ اَکْلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ

تم اس سے بے خبر رہو، بولے اگر کھا گیا اس کو بھیڑیا اور ہم ایک

عَصَبَةٌ اِنَّا اِذَا الْخِیْرُ وُنَّ ⑭ فَلَمَّآ ذْهَبُوْا بِهٖ وَاَجْمَعُوْا

جماعت ہیں قوت ور تو تو ہم نے سب کچھ گنوا دیا، پھر جب لیکر چلے اس کو اور متفق ہوئے

اَنْ یَّجْعَلُوْهُ فِیْ غَيْبَتِ الْجُبِّ وَاَوْحٰیْنَا اِلَیْہِ لَنَسْبِدَنَّہُمْ

کہ ڈالیں اس کو گنہگار کنویں میں، اور ہم نے اشارہ کر دیا اس کو کہ تو جتائے گا ان کو

بَا مَرِّہِمْ هٰذَا وَہُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ⑮ وَجَآءُ وَاَبَاہُمْ عِشَآءٌ

ان کا یہ کام اور وہ تجھ کو نہ جانیں گے، اور آئے اپنے باپ کے پاس اندھیرا پڑ کر

یَبْکُوْنَ ⑯ قَالُوا يَا بٰنَا اِنَّا ذٰہِبُنَا نَسْتَبِقُ وَتَرٰکُنَا یَوْسُفَ

روتے ہوئے، کہنے لگے اے باپ ہم گئے دوڑنے آگے نکلنے کو اور چھوڑا یوسف کو،

عِنْدَ مَا عَزَا فَاَكَلَهُ الَّذِي نَبَا وَمَا اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا

اپنے اسباب کے پاس پھر اس کو کھا گیا بھیڑیا، اور تو باور نہ کریگا ہمارا کہنا اور اگرچہ ہم

صَبِرْنَا ۝۱۷ وَجَاءُوا عَلَىٰ قَمِيصِهِ بِدَمٍ كَذِبٍ ۚ قَالَ بَلْ

چھ ہوں، اور ملائے اس کے کرتے پر لہو لگا کر جھوٹ، بولا یہ ہرگز نہیں

سَوَّلْتُ لَكُمْ اَنْفُسَكُمْ اَمْ رَاٰ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۖ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ

بلکہ بنا دی ہر تم کو تمہارے جیوں نے ایک بات، اب صبر ہی بہتر ہے، اور اللہ ہی سے پڑھتا ہوں

عَلٰی مَا تَصِفُوْنَ ۝۱۸ وَجَاءَتْ سَيَّاسَةٌ ۙ فَاَسْرَسُوْا وَاٰرَادُوْا

اس باپ پر جو تم ظاہر کرتے ہو، اور آیا ایک قافلہ پھر بھیجا اپنا پانی بھرنے والا، اس نے

فَاَدْلٰی دَلُوْهُ ۖ قَالَ يٰٓاِبْنُ شَرِيْ هٰذَا غُلْمٌ ۙ وَاَسْرُوْهُ بِضَاعَتٌ

لٹکا دیا اپنا ڈول کہنے لگا کیا خوشی کی بات ہے یہ ہر ایک لڑکا، اور چھپا لیا اس کو تجارت کا مال سمجھ کر

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۹ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ

اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں، اور بیچ آئے اسکو بھائی ناقص قیمت کو گنتی کی

مَعْدُوْدَةٍ ۚ وَكَانُوْا فِیْہِ مِنَ الشَّرِّ ۙ هٰذَا ۝۲۰

چونیاں، اور ہو رہے تھے اس سے بیزار۔

خلاصہ تفسیر

یوسف (علیہ السلام) کے اور ان کے (علاقائی) بھائیوں کے قصہ میں (خدا کی قدرت اور آپ کی نبوت کے) دلائل موجود ہیں ان لوگوں کے لئے جو آپ سے ان کا قصہ پوچھتے ہیں، رکیونکہ یوسف علیہ السلام کو ایسی بے گسی اور بے بسی سے سلطنت و حکومت تک پہنچا دینا یہ خدا ہی کا کام تھا جس سے مسلمانوں کے لئے عبرت اور قوت ایمان حاصل ہوگی، اور یہود جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آزمائش کے لئے یہ قصہ پوچھا تھا ان کے لئے اس میں دلیل نبوت مل سکتی ہے) وہ وقت قابل ذکر ہے جبکہ ان (علاقائی) بھائیوں نے (باہمی مشورہ کے طور پر) یہ گفتگو کی کہ (یہ کیا بات ہو کہ) یوسف اور ان کا (حقیقی) بھائی (بنیامین) ہمارے باپ کو زیادہ پیارے ہیں حالانکہ (وہ دونوں کم عمری کی وجہ سے ان کی خدمت کے قابل بھی نہیں اور ہم ایک جماعت کی جماعت ہیں، کہ اپنی قوت و کثرت کی وجہ سے ان کی ہر طرح

کی خدمت بھی کرتے ہیں، واقعی ہمارے باپ کھلی غلطی میں ہیں اس لئے تدبیر یہ کرنی چاہئے کہ ان دونوں میں بھی زیادہ پیار یوسف سے ہے اس کو کسی طرح ان کے پاس سے ہٹانا چاہئے جسکی صورت یہ ہے کہ (یا تو یوسف کو قتل کر ڈالو، یا اس کو کسی (دور دراز) سرزمین میں ڈال دو تو (پھر تمھارے باپ کا رخ غاص تمھاری طرف ہو جاوے گا اور تمھارے سب کام بن جاویں گے، انہی میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ یوسف کو قتل نہ کرو ورنہ وہ بڑا جرم ہے) اور ان کو کسی اندھیرے کنویں میں ڈال دو (جس میں اتنا پانی نہ ہو جس میں ڈوبنے کا خطرہ ہو کیونکہ وہ تو قتل ہی کی ایک صورت ہے، البتہ بستی اور رہگذر سے بہت دور بھی نہ ہو) تاکہ ان کو کوئی راہ چلتا مسافر نکال لے جائے، اگر تم کو (یہ کام) کرنا ہی ہے (تو اس طرح کرو، اس پر سب کی رائے متفق ہو گئی اور) سب نے (مل کر باپ سے) کہا کہ ابا اس کی کیا وجہ ہے کہ یوسف کے بارے میں آپ ہمارا اعتبار نہیں کرتے کہ کہیں کہیں ہمارے ساتھ نہیں بھیجتے) حالانکہ ہم اس کے (دل و جان سے) خیر خواہ ہیں (ایسا نہ چاہتے بلکہ آپ اس کو نکل ہمارے ساتھ (جنگل) بھیجئے، کہ ذرا دھکا دیں کھیلیں اور ہم ان کی پوری حفاظت رکھیں گے، یعقوب (علیہ السلام) نے فرمایا کہ (مجھے ساتھ بھیجنے سے دو چیزیں مانع ہیں ایک حزن اور ایک خوف، حزن تو یہ کہ مجھ کو یہ بات غم میں ڈالتی ہے کہ اس کو تم (میری نظروں کے سامنے سے) لے جاؤ اور (خوف یہ کہ) میں یہ اندیشہ کرتا ہوں کہ اس کو کوئی بھیڑ یا کھا جاوے اور تم (اپنے مشاغل میں) اس سے بے خبر رہو (کیونکہ اس جنگل میں بھیڑیے بہت تھے) وہ بولے اگر اس کو بھیڑ یا کھا لے اور ہم ایک جماعت کی جماعت (موجود) ہوں تو ہم بالکل ہی گمراہ ہوئے (غرض کہہ سنکر یعقوب علیہ السلام سے یہ ان کو لے کر چلے) تو جب ان کو (اپنے ساتھ جنگل) لے گئے اور (قرارداد سابق کے مطابق) سب نے پختہ ارادہ کر لیا کہ ان کو کسی اندھیرے کنویں میں ڈال دیں (پھر اپنی تجویز پر عمل بھی کر لیا) اور اس وقت یوسف کی تسلی کے لئے، ہم نے ان کے پاس وحی بھیجی کہ (تم مغموں نہ ہو ہم تم کو یہاں سے خلاصی دے کر بڑے رتبہ پر پہنچا دیں گے اور ایک دن وہ ہو گا کہ) تم ان لوگوں کو یہ بات جتلاؤ گے اور وہ تم کو (اس وجہ سے کہ غیر متوقع طور پر شاہانہ صورت میں دیکھیں گے) پہچانیں گے بھی نہیں (چنانچہ واقعہ اسی طرح پیش آیا کہ بھائی مصر پہنچے اور آخر کار یوسف علیہ السلام نے ان کو جتلا یا اہل علم تم تا فعلیم یوسف، یوسف علیہ السلام کا تو یہ قصہ ہوا) اور (ادھر) وہ لوگ اپنے باپ کے پاس عشاء کے وقت روتے ہوئے پہنچے (اور جب باپ نے رونے کا سبب پوچھا تو) کہنے لگے ابا ہم سب تو آپس میں دوڑ لگانے میں (کہ کون آگے نکلے) لگ گئے اور یوسف کو ہم نے (ایسی جگہ جہاں بھیڑ یا آنے کا گمان نہ تھا) اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا، بس (اتفاقاً) ایک بھیڑ یا

آیا اور ان کو کھا گیا اور آپ تو ہمارا کاہن گئے گو ہم کیسے ہی چتے ہوں اور رجب یعقوب علیہ السلام کے پاس آنے لگے تھے تو یوسف کی قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون بھی لگا لائے تھے کہ کسی جانور کا خون ان کی قمیص پر ڈال کر اپنی قول کی سند کے لئے پیش کیا (یعنی) تو کرتا کہیں سے پھٹا نہیں تھا، کما رواہ الطبری عن ابن عباس، تو فرمایا یوسف کو بھیڑیے نے ہرگز نہیں کھایا، بلکہ تم نے اپنے دل سے ایک بات بنالی ہے، سو میں صبر ہی کروں گا جس میں شکایت کا نام نہ ہوگا (صبر جمیل کی یہ تفسیر کہ اس کے ساتھ کوئی حرف شکایت نہ ہو طبری نے مرفوع حدیث کے حوالہ سے بیان کی ہے) اور جو باتیں تم بتاتے ہو ان میں اللہ ہی مدد کرے (کہ اس وقت مجھے اپنے صبر آجائے اور آئندہ تمہارا جھوٹ کھل جائے، بہر حال حضرت یعقوب صبر کر کے بیٹھ رہے) اور یوسف علیہ السلام کا یہ قصہ ہوا کہ اتفاق سے اُدھر ایک قافلہ آنکلا (جو مصر کو جا رہا تھا) اور انھوں نے اپنا آدمی پانی لانے کے واسطے (یہاں کنویں پر) بھیجا اور اس نے اپنا ڈول ڈالا یوسف علیہ السلام نے ڈول کو پکڑ لیا، جب ڈول باہر آیا اور یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو خوش ہو کر کہنے لگا بڑی خوشی کی بات ہے یہ تو بڑا اچھا لڑکا نکل آیا (قافلہ والوں کو خبر ہوئی تو وہ بھی خوش ہوئے) اور ان کو مال (تجارت) قرار دے کر اس خیال سے (بچا لیا) کہ کوئی دعویدار نہ کھڑا ہو جائے تو پھر اس کو مصر لے جا کر بڑی قیمت پر فروخت کریں گے) اور اللہ کو ان سب کی کارگزاریاں معلوم تھیں (ادھر وہ بھائی بھی آس پاس لگے رہتے، اور کنویں میں یوسف کی خبر گیری کرتے کچھ کھانا بھی پہنچاتے جس سے مقصد یہ تھا کہ یہ ہلاک بھی نہ ہوں اور کوئی آکر انھیں کسی دوسرے ملک میں لے جائے اور یعقوب علیہ السلام کو خبر نہ ہو، اس روز جب یوسف کو کنویں میں نہ دیکھا اور پاس ایک قافلہ بڑا دیکھا تو تلاش کرتے ہوئے وہاں پہنچے، یوسف علیہ السلام کا پتہ لگ گیا تو قافلہ والوں سے کہا کہ ہمارا غلام ہے بھاگ کر آگیا تھا اور اب ہم اس کو رکھنا نہیں چاہتے) اور (یہ بات بنا کر) ان کو بہت ہی کم قیمت پر (قافلہ والوں کے ہاتھ) بیچ ڈالا یعنی گنتی کے چند درہم کے بدلے میں اور (وجہ یہ تھی کہ) یہ لوگ کچھ ان کے قدردان تو تھے ہی نہیں (کہ ان کو عمدہ مال سمجھ کر بڑی قیمت سے جیتے، بلکہ ان کا مقصد تو ان کو یہاں سے الٹا تھا) :

معارف و مسائل

سورۃ یوسف کی مذکورہ بالا آیتوں میں سے پہلی آیت میں اس پر متنبہ کیا گیا ہے کہ اس سورۃ میں آنے والے قصہ یوسف علیہ السلام کو محض ایک قصہ نہ سمجھو، بلکہ اس میں سوال کرنے والوں اور تحقیق کرنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی بڑی نشانیاں اور ہدایتیں ہیں۔

اس سے مراد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جن یہودیوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آزمائش کے لئے یہ قصہ آپ سے پوچھا تھا ان کے لئے اس میں بڑی نشانیاں ہیں، روایت یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ میں تشریف فرما تھے، اور آپ کی خبر مدینہ طیبہ میں پہونچی، تو یہاں کے یہودیوں نے اپنے چند آدمی اس کام کے لئے مکہ معظمہ بھیجے کہ وہ جا کر آپ کی آزمائش کریں، اسی لئے یہ سوال ایک مبہم انداز میں اس طرح کیا کہ اگر آپ خدا کے سچے نبی ہیں تو یہ بتلائیے کہ وہ کونسا پیغمبر ہے جس کا ایک بیٹا ملک شام سے مقررے جایا گیا اور باپ اس کے غم میں روتے روتے تابینا ہو گئے۔

یہ واقعہ یہودیوں نے اس لئے انتخاب کیا تھا کہ نہ اس کی کوئی عام شہرت تھی، نہ مکہ میں کوئی اس واقعہ سے واقف تھا، اور اس وقت مکہ میں اہل کتاب میں سے بھی کوئی نہ تھا جس سے بحوالہ تورات و انجیل اس قصہ کا کوئی جز معلوم ہو سکتا، ان کے اس سوال پر ہی سورۃ یوسف نازل ہوئی جس میں حضرت یعقوب اور یوسف علیہما السلام کا پورا قصہ مذکور ہے، اور اتنی تفصیل سے مذکور ہے کہ تورات و انجیل میں بھی اتنی تفصیل نہیں، اس لئے اس کا بیان کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کھلا ہوا معجزہ تھا۔

اور اس آیت کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ قطع نظر سوال یہود کے خود یہ واقعہ ایسے امور پر مشتمل ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی بڑی نشانیاں اور تحقیق کرنے والوں کے لئے بڑی ہدایتیں اور احکام و مسائل موجود ہیں، کہ جس بچہ کو بھائیوں نے ہلاکت کے غار میں ڈال دیا تھا اللہ تعالیٰ کی قدرت نے اس کو کہاں سے کہاں پہونچایا، اور کس طرح اس کی حفاظت کی، اور اپنے خاص بندوں کو اپنے احکام کی پابندی کا کس قدر گہرا رنگ عطا فرمایا، کہ نوجوانی کے زمانے میں تعیش کا بہترین موقع ملتا ہے، مگر وہ خدا تعالیٰ کے خوف سے نفس کی خواہشات پر کیسا قابو پاتے ہیں کہ صاف اس بلا سے نکل جاتے ہیں، اور یہ کہ جو شخص نیکی اور تقویٰ اختیار کرے اللہ تعالیٰ اس کو اپنے مخالفین کے مقابلہ میں کیسی عزت دیتے ہیں، اور مخالفین کو اس کے قدموں میں لا ڈالتے ہیں، یہ سب عبرتیں اور نصیحتیں اور قدرت الہیہ کی عظیم نشانیاں ہیں، جو ہر تحقیق کرنے والے اور غور کرنے والے کو معلوم ہو سکتی ہیں (قرطبی و مظہری)

اس آیت میں یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا ذکر ہے، اُن کا واقعہ یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے یوسف علیہ السلام سمیت بارہ لڑکے تھے، ان میں سے ہر لڑکے کا صاحب لڑکا ہوا، سب کے خاندان پھیلے، چونکہ یعقوب علیہ السلام کا لقب اسرائیل تھا، اس لئے یہ سب بارہ خاندان بنی اسرائیل کہلاتے۔

ان بارہ لڑکوں میں دس بڑے لڑکے حضرت یعقوب علیہ السلام کی پہلی زوجہ محترمہ

حضرت لیانا بنت لیان کے بطن سے تھے، ان کی وفات کے بعد یعقوب علیہ السلام نے لیا کی بہن راحیل سے نکاح کر لیا، ان کے بطن سے دو لڑکے یوسف علیہ السلام اور بنیامین پیدا ہوئے، اس لئے یوسف علیہ السلام کے حقیقی بھائی صرف بنیامین تھے، باقی دس بھائی علاقائی یعنی باپ شریک تھے، یوسف علیہ السلام کی والدہ راحیل کا انتقال بھی ان کے بچپن ہی میں بنیامین کی ولادت کے تھا ہو گیا تھا (قرطبی) دوسری آیت میں یوسف علیہ السلام کا قصہ شروع ہوتا ہے، کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے والد یعقوب علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ یوسف علیہ السلام سے غیر معمولی محبت رکھتے ہیں جو ان کے بڑے بھائیوں کو حاصل نہیں، اس لئے ان پر حسد ہوا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی طاع ان کو یوسف علیہ السلام کا خواب بھی معلوم ہو گیا ہو جس سے انھوں نے یہ محسوس کیا ہو کہ ان کی بڑی شان ہونے والی ہے اس سے حسد پیدا ہوا، اور آپس میں گفتگو کی کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے والد کو بہ نسبت ہمارے یوسف اور اس کے حقیقی بھائی بنیامین سے زیادہ محبت ہے، حالانکہ ہم دس ہیں اور ان سے بڑے ہیں، مگر کے کام کا راج سنبھالنے کی قوت رکھتے ہیں، اور یہ دونوں چھوٹے بچے ہیں جو کچھ کام نہیں کر سکتے، ہمارے والد کو اس کا خیال کرنا اور ہم سے زیادہ محبت کرنا چاہئے تھا، مگر انھوں نے کھلی ہوئی بے انصافی کر رکھی ہے، اس لئے یا تو تم یوسف کو قتل کر ڈالو، یا پھر کسی دوزخ میں پھینک دو جہاں سے واپس نہ آ سکے۔

اس آیت میں ان بھائیوں نے اپنے متعلق لفظ عُصْبَة استعمال کیا ہے، یہ لفظ عربی زبان میں پانچ سے لے کر دس تک کی جماعت کے لئے بولا جاتا ہے، اور اپنے والد کے بارے میں جو یہ کہا کہ اِنَّ اَبَانَا لَفِي ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ، اس میں لفظ ضَلٰل کے لغوی معنی گمراہی کے ہیں، مگر یہاں گمراہی سے مراد دینی گمراہی نہیں، ورنہ ایسا خیال کرنے سے یہ سب کے سب کافر ہو جاتے، کیونکہ یعقوب علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبر اور نبی ہیں، ان کی شان میں ایسا خیال قطعاً کفر ہے۔

اور یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے متعلق خود قرآن کریم میں مذکور ہے کہ بعد میں انھوں نے اپنے جرم کا اعتراف کر کے والد سے دعا، مغفرت کی درخواست کی، جس کو ان کے والد نے قبول کیا، جس سے ظاہر یہ ہے کہ ان سب کی خطا معاف ہوئی، یہ سب اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ یہ سب مسلمان ہوں، ورنہ کافر کے حق میں دعا، مغفرت جائز نہیں، اسی لئے ان بھائیوں کے انبیاء ہونے میں تو علماء کا اختلاف ہے، مگر مسلمان ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ لفظ ضَلٰل اس جگہ صرف اس معنی میں بولا گیا ہے کہ بھائیوں کے حقوق میں برابری نہیں کرتے۔

تیسری آیت میں یہ بیان ہے کہ ان بھائیوں میں مشورہ ہوا، بعض نے یہ رائے دی کہ یوسف

کو قتل کر ڈالو، بعض نے کہا کہ کسی غیر آباد کنویں کی گہرائی میں ڈال دو، تاکہ یہ کانٹا درمیان سے بھل جاسکے اور تمھارے باپ کی پوری توجہ تمھاری ہی طرف ہو جائے، رہا یہ گناہ جو اس کے قتل یا کنویں میں ڈالنے سے ہو گا سو بعد میں توبہ کر کے تم نیک ہو سکتے ہو، آیت کے جملہ وَتَكُونُوا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ قَوْمًا صَالِحِينَ کے یہ معنی بھی بیان کئے گئے ہیں، اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ یوسف کے قتل کے بعد تمھارے حالات درست ہو جائیں گے، کیونکہ باپ کی توجہ کا یہ مرکز ختم ہو جائے گا، یا کہ قتل کے بعد باپ سے عذر معذرت کر کے تم پھر دیے ہی ہو جاؤ گے۔

یہ دلیل ہے اس بات کی کہ یوسف علیہ السلام کے یہ بھائی انبیاء نہیں تھے، کیونکہ انھوں نے اس واقعہ میں بہت سے کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کیا، ایک بے گناہ کے قتل کا ارادہ، باپ کی نافرمانی اور ایذا رسانی، معاہدہ کی خلاف ورزی، پھر چھوٹی سازش وغیرہ، انبیاء علیہم السلام سے قبل نبوت بھی جمہور کے عقیدہ کے مطابق ایسے گناہ سرزد نہیں ہو سکتے۔

جو تھی آیت میں ہے کہ انہی بھائیوں میں سے ایک نے یہ ساری گفتگو سن کر کہا کہ یوسف کو قتل نہ کرو، اگر کچھ کرنا ہی ہے تو کنویں کی گہرائی میں ایسی جگہ ڈال دو جہاں یہ زندہ رہے، اور راہِ ردِ مسافر جب اس کنویں پر آئیں تو وہ اس کو اٹھا کر لے جائیں، اس طرح تمھارا مقصد بھی پورا ہو جائے گا اور اس کو لے کر تمہیں خود کسی دور مقام پر جانا بھی نہ پڑے گا، کوئی قافلہ آئے گا وہ خود اس کو اپنے ساتھ کسی دور مقام پر پہنچا دے گا۔

یہ رائے دینے والا ان کا سب سے بڑا بھائی یہود تھا، اور بعض روایات میں ہے کہ روبیل سب سے بڑا تھا، اسی نے یہ رائے دی، اور یہ وہ شخص ہے جس کا ذکر آگے آتا ہے کہ جب مصر میں یوسف علیہ السلام کے چھوٹے بھائی بنیامین کو روک لیا گیا تو اس نے کہا کہ میں جا کر باپ کو کیا منہ دکھاؤں گا، اس لئے میں واپس کنعان نہیں جاتا۔

اس آیت میں لفظ غِيَابَةِ الْجُبِّ، فرمایا ہے، غیابہ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی چیز کو چھپالے اور غائب کر دے، اسی لئے قبر کو بھی غیابہ کہا جاتا ہے، اور جُب ایسے کنویں کو کہتے ہیں جس کی تن بنی ہوئی نہ ہو۔

يَكْتُمُونَ بِالْغَيْبِ، لفظ التَّقَاطُ لِقَطْعَةٍ سے بنا ہے، لفظ اس گہری پٹری چیز کو کہتے ہیں جو کسی کو بغیر طلبِ میل جائے، غیر جانِ دار چیز ہو تو اس کو لفظ اور جانِ دار کو فقہاء کی اصطلاح میں لقیط کہا جاتا ہے، انسان کو لقیط اسی وقت کہا جائے گا جبکہ وہ بچہ ہو، عاقل بالغ نہ ہو، قرطبی نے اسی لفظ سے استدلال کیا ہے کہ جس وقت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالا گیا تھا اس وقت وہ نابالغ بچہ تھا، نیز یعقوب علیہ السلام کا یہ فرمانا بھی ان کے

بچہ ہونے کی طرف اشارہ ہے، کہ مجھے خوف ہے کہ اس کو بھیڑ یا کھا جائے، کیونکہ بھیڑیے کا کھا جانا بچوں ہی کے معاملہ میں متصور ہے، ابن جریر ابن المنذر ابن ابی شیبہ کی روایت میں ہے کہ اس وقت یوسف علیہ السلام کی عمر سات سال تھی۔ (مظہری)

امام شریعت نے اس جگہ نقطہ اور لفظ کے شرعی احکام کی تفصیل دی ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں، البتہ اس کے متعلق ایک اصولی بات یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اسلامی نظام میں عام لوگوں کے جان و مال کی حفاظت، راستوں اور سڑکوں کی صفائی وغیرہ کو صرف حکومت کے محکموں کی ذمہ داری نہیں بنایا، بلکہ ہر شخص کو اس کا مکلف بنایا ہے، راستوں اور سڑکوں میں کھڑے ہو کر یا اپنا کوئی سامان ڈال کر چلنے والوں کے لئے تنگی پیدا کرنے پر حدیث میں سخت وعید آئی ہے، فرمایا کہ جو شخص مسلمانوں کا راستہ تنگ کر دے اس کا جہاد مقبول نہیں، اسی طرح اگر راستہ میں کوئی ایسی چیز پڑی ہے جس سے دوسروں کو تکلیف پہنچ جانے کا خطرہ ہے جیسے کانٹے یا کاچ کے ٹکڑے یا پتھر وغیرہ ان کو راستہ سے ہٹانا صرف میونسپل بورڈ کی ذمہ داری نہیں بنایا بلکہ ہر مسلمان کو تربیعی انداز میں اس کا ذمہ دار بنایا ہے، اور ایسا کرنے والوں کے لئے بڑے اجر و ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے۔

اسی اصول پر کسی شخص کا گم شدہ مال کسی کو مل جائے تو اس کی شرعی ذمہ داری صرف اتنی ہی نہیں کہ اس کو پھرائے نہیں، بلکہ یہ بھی اس کے ذمہ ہے کہ اس کو حفاظت سے اٹھا کر رکھے اور اعلان کر کے مالک کی تلاش کرے وہ مل جائے اور علامات وغیرہ بیان کرنے سے یہ اطمینان ہو جائے کہ یہ مال اسی کا ہے تو اس کو دیدے، اور اعلان و تلاش کے باوجود مالک کا پتہ نہ چلے اور مال کی حیثیت کے مطابق یہ اندازہ ہو جائے کہ اب مالک اس کی تلاش نہ کرے گا اس وقت اگر خود غریب مفلس ہے تو اپنے صرف میں لے آئے ورنہ مساکین پر صدقہ کر دے، اور بہرہ و صورت یہ مالک کی طرف سے صدقہ قرار دیا جائے گا، اس کا ثواب اس کو ملے گا، گویا آسمانی بیت المال میں اس کے نام پر جمع کر دیا گیا۔

یہ ہیں خدمتِ عامہ اور امدادِ باہمی کے وہ اصول جن کی ذمہ داری اسلامی معاشرہ کے ہر فرد پر عائد کی گئی ہے، کاشت مسلمان اپنے دین کو بھیجیں اور اس پر عمل کرنے لگیں تو دنیا کی آنکھیں کھل جائیں، کہ حکومت کے بڑے بڑے محکمے کروڑوں روپیہ کے خرچ سے جو کام انجام نہیں دے سکتے، وہ اس آسانی کے ساتھ کس شان سے پورا ہو جاتا ہے۔

پانچویں اور چھٹی آیت میں ہے کہ ان بھائیوں نے والد کے سامنے درخواست ان لفظوں میں پیش کر دی کہ ابا جان! یہ کیا بات ہے کہ آپ کو یوسف کے بارے میں ہم پر اطمینان نہیں، حالانکہ ہم

اس کے پورے خیر خواہ اور ہمدرد ہیں، کل اس کو آپ ہمارے ساتھ (سیر و تفریح کے لئے) بھیج دیجئے کہ وہ بھی آزادی کے ساتھ کھائے پیئے اور کھیلے، اور ہم سب اس کی پوری حفاظت کریں گے۔ بھائیوں کی اس درخواست سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کبھی اس سے پہلے بھی ایسی درخواست کر چکے تھے، جس کو والد بزرگوار نے قبول نہ کیا تھا، اس لئے اس مرتبہ ذرا تاکید اور اصرار کے ساتھ والد کو اطمینان دلانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس آیت میں حضرت یعقوب علیہ السلام سے سیر و تفریح اور آزادی سے کھانے پینے کھیلنے کودنے کی اجازت مانگی گئی ہے، حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کو اس کی کوئی ممانعت نہیں فرمائی، صرف یوسف علیہ السلام کو ساتھ بھیجنے میں تردد کا اظہار کیا، جو اگلی آیت میں آئیگا اس سے معلوم ہوا کہ سیر و تفریح کھیل کود جائز حدود کے اندر جائز و مباح ہیں، احادیث صحیحہ سے بھی اس کا جواز معلوم ہوتا ہے، مگر یہ شرط ہے کہ اس کھیل کود میں شرعی حدود سے تجاوز نہ ہو اور کسی ناجائز فعل کی اس میں آمیزش نہ ہو (قرطبی وغیرہ)

یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے جب والد سے یہ درخواست کی کہ یوسف کو کل ہمارے ساتھ تفریح کے لئے بھیج دیجئے، تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ ان کو بھیجنا دو وجہ سے پسند نہیں کرتا، اول تو مجھے اس نور نظر کے بغیر چین نہیں آتا، دوسرے یہ خطرہ ہو کہ جنگل میں کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری غفلت کے وقت اس کو بھیڑ یا کھا جائے۔

یعقوب علیہ السلام کو بھیڑیے کا خطرہ یا تو اس وجہ سے ہوا کہ کنعان میں بھیڑیوں کی کثرت تھی، اور یا اس وجہ سے کہ انھوں نے خواب میں دیکھا تھا کہ وہ کسی پہاڑی کے اوپر ہیں، اور یوسف علیہ السلام اس کے دامن میں نیچے ہیں، اچانک دشمن بھیڑیوں نے ان کو گھیر لیا اور ان پر حملہ کرنا چاہا، مگر ایک بھیڑیے ہی نے مداخلت کر کے ٹھہرا دیا، پھر یوسف علیہ السلام زمین کے اندر چھپ گئے۔

جس کی تعبیر بعد میں اس طرح ظاہر ہوئی کہ دشمن بھیڑیے یہ دشمن بھائی تھے اور جس بھیڑیے نے مداخلت کر کے ان کو ہلاکت سے بچا یا وہ بڑے بھائی یہوداہ تھے، اور زمین میں چھپ جانا کنوئیں کی گہرائی سے تعبیر تھی۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک روایت میں منقول ہے کہ یعقوب علیہ السلام کو اس خواب کی بناء پر خود ان بھائیوں سے خطرہ تھا انہی کو بھیڑیا کہا تھا، مگر بمصاحبت پوری بات ظاہر نہیں فرمائی (قرطبی)

بھائیوں نے یعقوب علیہ السلام کی یہ بات سن کر کہا کہ آپ کا یہ خوف و خطر عجیب ہے

ہم دس آدمیوں کی قوی جماعت اس کی حفاظت کے لئے موجود ہے، اگر ہم سب کے ہوتے ہوئے اسکو بھیڑ یا کھا جائے تو ہمارا تو وجود ہی بے کار ہو گیا، اور پھر ہم سے کسی کام کی کیا امید کی جاسکتی ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی پیغمبرانہ شان سے اولاد کے سامنے اس بات کو نہیں کھولا کہ مجھے خطرہ خود تم ہی سے ہے کہ اول تو اس سے سب اولاد کی دل شکنی تھی، دوسرے باپ کے ایسا اپنے کے بعد خطرہ یہ تھا کہ بھائیوں کی دشمنی اور بڑھ جائے گی، اور اس وقت چھوڑ بھی دیا تو دوسرے کسی وقت کسی بہانہ سے قتل کر دیں گے، اس لئے اجازت دیری، مگر بھائیوں سے مکمل عہد و پیمان لیا کہ اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچنے دیں گے، اور بڑے بھائی ردھیل یا یہودا کو خصوصیت سے سپرد کیا کہ تم ان کی بھوک پیاس اور دوسری ضرورتوں کی پوری طرح خیبر گیری کرنا اور جلد واپس لانا، بھائیوں نے والد کے سامنے یوسف علیہ السلام کو اپنے مونڈھوں پر اٹھالیا، اور باہمی باری سب اٹھاتے رہے، کچھ دور تک حضرت یعقوب علیہ السلام بھی ان کو نصرت کرنے کے لئے باہر گئے۔

قرطبی نے تاریخی روایات کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ جب یہ لوگ حضرت یعقوب علیہ السلام کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تو اس وقت یوسف علیہ السلام جس بھائی کے مونڈھے پر تھے اس نے ان کو زمین پر ٹپک دیا، یوسف علیہ السلام پیدل چلنے لگے، مگر کم عمر تھے ان کے ساتھ دوڑنے سے عاجز ہوتے تو دوسرے بھائی کی پناہ لی، اس نے بھی کوئی ہمدردی نہ کی تو تیسرے چوتھے ہر بھائی سے امداد کو کہا مگر سب نے یہ جواب دیا کہ تو نے جو گیارہ ستارے اور چاند سورج اپنے آپ کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھے تھے ان کو پکارا، وہی تیری مدد کریں گے۔

قرطبی نے اسی وجہ سے فرمایا کہ اس سے معلوم ہوا کہ بھائیوں کو کسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب معلوم ہو گیا تھا وہ خواب ہی ان کی شدت غیظ و غضب کا سبب بنا۔ آخر میں یوسف علیہ السلام نے یہودا سے کہا کہ آپ بڑے ہیں آپ میری کمزوری اور غریبی اور اپنے والدین کی حالت پر رحم کریں، اور اس عہد کو یاد کریں جو جو والد سے آپ نے کئے ہیں، آپ کے کتنی جلدی اس عہد و پیمان کو بھلا دیا، یہ سن کر یہودا کو رحم آیا اور ان سے کہا کہ جب تک میں زندہ ہوں یہ بھائی تجھے کوئی تکلیف نہ پہنچا سکیں گے۔

یہودا کے دل میں اللہ تعالیٰ نے رحمت اور صحیح عمل کی توفیق ڈال دی، تو یہودا نے اپنے دوسرے بھائیوں کو خطاب کیا کہ بے گناہ کا قتل انتہائی جرم عظیم ہے، خدا سے ڈرو، اور اس بچہ کو اس کے والد کے پاس پہنچا دو، البتہ اس سے یہ عہد لے لو کہ باپ سے تمہاری کوئی شکایت نہ کرے۔ بھائیوں نے جواب دیا کہ ہم جانتے ہیں تمہارا کیا مطلب ہے، تم یہ چاہتے ہو کہ باپ کے دل میں اپنا مرتبہ سب سے زیادہ کر لو، اس لئے جس لوگ اگر تم نے ہمارے ارادہ میں مزاحمت کی تو ہم تمہیں

قتل کر دیں گے، یہود نے دیکھا کہ نو بھائیوں کے مقابلہ میں تنہا کچھ نہیں کر سکتے تو کہا کہ اچھا اگر تم ہی ملے کر چکے ہو کہ اس بچہ کو ضائع کرو تو میری بات سنو، یہاں قریب ہی ایک پیرانا کنواں ہے جس میں بہت سے جھاڑ نکل آتے ہیں، سانپ، بچھو اور طرح طرح کے موذی جانور اس میں رہتے ہیں، تم اس کو کنویں میں ڈال دو، اگر اس کو کسی سانپ وغیرہ نے ڈس کر ختم کر دیا تو تمہاری مراد حاصل ہے، اور تم اپنے ہاتھ سے اس کا خون بہانے سے بری رہو، اور اگر یہ زندہ رہا تو کوئی قافلہ شاید یہاں آئے اور پانی کے لئے کنویں میں ڈال ڈالے اور یہ نکل آئے، تو وہ اس کو اپنے ساتھ کسی دوسرے ملک میں پہنچا دے گا، اس صورت میں بھی تمہارا مقصد حاصل ہو جائے گا۔

اس بات پر سب بھائیوں کا اتفاق ہو گیا، جس کا بیان آیات مذکورہ میں سے تیسری آیت میں اس طرح آیا ہے، فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهٖ وَاجْتَمَعُوا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غِيْبَتِ الْجُبِّ وَاَوْحَيْنَا اِلَيْهٖ لَنُكَلِّمَنَّهُمْ بِاَمْرِ هٰمِمْ هٰذَا وَاَوْهَمُوْهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ، یعنی جب یہ بھائی یوسف علیہ السلام کو جنگل میں لے گئے، اور اس پر سب متفق ہو گئے کہ اس کو کنویں کی گہرائی میں ڈال دیں تو اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو بذریعہ وحی اطلاع دی کہ ایک دن ایسا آئے گا جب تم اپنے بھائیوں کو ان کے اس کر توت پر تنبیہ کر دو گے اور وہ کچھ نہ جانتے ہوں گے۔

یہاں لفظ وَاَوْحَيْنَا، فَلَمَّا ذَهَبُوا کی جزاء اور جواب ہے، حرف وَاو اس جگہ زائد ہو (قرطبی) مطلب یہ ہو کہ بھائیوں نے مل کر کنویں میں ڈالنے کا عزم کر ہی لیا، تو اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کی تسلی کے لئے وحی بھیج دی، جس میں کسی آئندہ زمانے میں بھائیوں سے ملاقات کی اور اس کی خوش خبری دی گئی ہے کہ اُس وقت آپ ان بھائیوں سے مستغنی اور بالادست ہوں گے، جس کی وجہ سے ان کے اس ظلم و ستم پر مواخذہ کریں گے، اور وہ اس سارے معاملہ سے بچ رہیں گے۔ اہم قرطبی نے فرمایا کہ اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ یہ وحی ان کو کنویں میں ڈالنے کے بعد ان کی تسلی اور یہاں سے نجات کی خوش خبری دینے کے لئے آئی ہو، دوسرے یہ کہ کنویں میں ڈالنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو پیش آنے والے حالات و واقعات سے بذریعہ وحی باخبر کر دیا، جس میں یہ بھی بتلادیا کہ آپ اس ہلاکت سے سلامت رہیں گے، اور ایسے حالات پیش آئیں گے کہ آپ کو ان بھائیوں پر سرزنش کرنے کا موقع ملے گا جب کہ وہ آپ کو پہچانیں گے بھی نہیں، کہ ان کے بھائی یوسف ہیں۔

یہ وحی جو حضرت یوسف علیہ السلام پر زمانہ طفولیت میں نازل ہوئی، تفسیر منطہری میں ہو کہ یہ وحی نبوت نہ تھی، کیونکہ وہ چالیس سال کی عمر میں عطا ہوتی ہے، بلکہ یہ وحی ایسی ہی تھی جیسے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو بذریعہ وحی مطلع کیا گیا، یوسف علیہ السلام پر وحی نبوت کا سلسلہ

مصر پہنچے اور جوان ہونے کے بعد شروع ہوا، جیسا کہ ارشاد ہے: **وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا** اور ابن جریر ابن ابی حاتم وغیرہ نے اس کو استثنائی طور پر وحی نبوت ہی قرار دیا ہے، جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو بچپن میں نبوت عطا کی گئی (منظہری)۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ مصر پہنچنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو بذریعہ وحی اس بات سے منع کر دیا تھا کہ وہ اپنے حال کی خبر اپنے گھر بھیس (قربلی) میں وجہ تھی کہ یوسف علیہ السلام جیسے پیغمبر خدائے جیل سے رہائی اور ملک مصر کی حکومت ملنے کے بعد بھی کوئی ایسی صورت نہیں نکالی جس کے ذریعہ والد ضعیف کو اپنی سلامتی کی خبر دے کر مطمئن کر دیتے۔

اللہ جل شانہ کی حکمتوں کو کون جان سکتا ہے جو اس طرز میں مخفی تھیں، شاید یہ بھی منظور ہو کہ یعقوب علیہ السلام کو غیر اللہ کے ساتھ اتنی محبت کے ناپسند ہونے پر متنبہ کیا جائے، اور یہ کہ بھائیوں کا حاکم بن کر یوسف علیہ السلام کے سامنے پیش کر کے ان کے عمل کی کچھ سزا تو ان کو بھی دینا مقصود ہو۔

امام قرطبی وغیرہ مفسرین نے اس جگہ یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالنے کا واقعہ یہ بیان کیا ہے کہ جب ان کو ڈالنے لگے تو وہ کنویں کی من سے چمٹ گئے، بھائیوں نے ان کا گرتے نکال کر اس سے ہاتھ باندھے، اُس وقت پھر یوسف علیہ السلام نے بھائیوں سے رحم کی درخواست کی، مگر وہی جواب ملا کہ گیارہ ستارے جو تجھے سجدہ کرتے ہیں ان کو بلا نہ ہی تیری مدد کریں گے، پھر ایک ڈول میں رکھ کر کنویں میں لٹکایا، جب نصف تک پہنچے، تو اس کی رستی کاٹ دی، اللہ تعالیٰ نے اپنے یوسف کی حفاظت فرمائی، پانی میں گرنے کی وجہ سے کوئی چوٹ نہ آئی، اور قریب ہی ایک پتھر کی چٹان نکلی ہوئی نظر آئی، صبح سالم اس پر بیٹھ گئے، بعض روایات میں ہے کہ جبرئیل علیہ السلام کو حکم ہوا، انھوں نے چٹان پر بٹھا دیا۔

یوسف علیہ السلام تین روز اس کنویں میں رہے، ان کا بھائی یہوداد دوسرے بھائیوں کے چھپ کر روزانہ ان کے لئے کھانا پانی لاتا اور ڈول کے ذریعہ ان تک پہنچا دیتا تھا۔

وَجَاءُوا أَبَاهُمْ عِشَاءً يَبْكُونَ، یعنی عشاء کے وقت یہ بھائی روتے ہوئے اپنے باپ کے پاس پہنچے، حضرت یعقوب علیہ السلام ان کے رونے کی آواز سن کر باہر آئے پوچھا کیا حادثہ ہے، کیا تمھاری بکریوں کے گلہ پر کسی نے حملہ کیا ہے؟ اور یوسف کہاں ہے؟ تو بھائیوں نے کہا:-

يَا أَبَانَا إِنَّا ذُكِّرْنَا بِفِتْنَةٍ عِنْدَ رَبِّنَا فَكَلَّمْنَا الذِّئْبَ وَمَا أَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا هِلْدَقَ قُلُوبٍ، یعنی ہم نے آپس میں دوڑ لگائی اور یوسف کو اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا اس درمیان میں یوسف کو بھڑپا کھا گیا، اور ہم کتنے ہی سچے ہوں آپکو ہمارا یقین تو آئے گا نہیں۔

ابن عربی نے احکامِ عسراں میں فرمایا کہ باہمی مسابقت (دوڑ) شریعت میں مشروع اور ابھی خصلت ہی جو جنگ و جہاد میں کام آتی ہے، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بنفس نفیس خود بھی مسابقت کرنا احادیث صحیحہ میں ثابت ہے، اور گھوڑوں کی مسابقت کرنا (یعنی گھوڑ دوڑ) بھی ثابت ہے، صحابہ کرام میں سے سلمہ بن اکوع نے ایک شخص کے ساتھ دوڑ میں مسابقت کی تو سلمہ غالب آگئے۔

آیت مذکورہ اور ان روایات سے اصل گھوڑ دوڑ کا جائز ہونا ثابت ہے اور گھوڑ دوڑ کے علاوہ دوڑ میں تیر اندازی کے نشانے وغیرہ میں بھی باہمی مقابلہ اور مسابقت جائز ہے، اور اس مسابقت میں غالب آنے والے فریق کو کسی تیسرے کی طرف سے انعام دیدینا بھی جائز ہے، لیکن آپس میں ہارجیت کی کوئی رقم بطور شرط ٹھہرانا جوا اور قمار ہے، جس کو قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے، آجکل جتنی صورتیں گھوڑ دوڑ کی رائج ہیں وہ کوئی بھی جوئے اور قمار سے خالی نہیں، اس لئے سب حرام و ناجائز ہیں۔

پہلی آیتوں میں مذکور تھا کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے آپس کی گفت و شنید کے بعد بالآخر ان کو ایک غیر آباد کنویں میں ڈال دیا اور والد کو آکر یہ بتایا کہ ان کو بھیڑیا کھا گیا، یہ مذکور الصدر آیات میں اگلا قصہ اس طرح ذکر کیا گیا ہے۔

وَجَاءَ عَلَى قَمِيصِهِ بِدَمٍ كَذِبٍ، یعنی یوسف علیہ السلام کے بھائی یوسف کے کرتے پر جھوٹا خون لگا کر لائے تھے تاکہ والد کو بھیڑیے کے کھانے کا یقین دلائیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اُن کا جھوٹ ظاہر کرنے کے لئے ان کو اس سے غافل کر دیا، کہ کرتے پر خون لگانے کے ساتھ اس کو بچاڑ بھی دیتے ہیں، جس سے بھیڑیے کا کھانا ثابت ہوتا، انھوں نے صبحِ صبح کرتے پر بکری کے بچے کا خون لگا کر باپ کو دھوکہ میں ڈالنا چاہا، یعقوب علیہ السلام نے کرتا صبحِ صبح دیکھ کر فرمایا، میرے بیٹو! یہ بھیڑیا کیسا حکیم اور عقلمند تھا کہ یوسف کو اس طرح کھایا کہ کرتے کہیں سے نہیں پھٹا۔

اس طرح حضرت یعقوب علیہ السلام پر ان کی جعل سازی کا راز فاش ہو گیا، اور فرمایا بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْراً فَصَبْرٌ جَمِيلٌ، وَاللَّهُ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ، یعنی یوسف کو بھیڑیے نے نہیں کھایا، بلکہ تمھارے ہی نفوس نے ایک بات بنائی ہے، اب میرے لئے بہتر یہی ہے کہ صبر کروں اور جو کچھ تم کہتے ہو اس پر اللہ سے مدد مانگوں۔

مسئلہ:۔ یعقوب علیہ السلام نے کرتے صبحِ صبح سالم ہونے سے برادرانِ یوسف کے جھوٹ پر استدلال کیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ قاضی یا حاکم کو فریقین کے دعوے اور دلائل کی

حالات اور قرائن پر بھی نظر کرنا چاہئے (قرطبی)

بار دردی نے فرمایا کہ پیراہن یوسف بھی عجائب روزگار میں سے ہے، تین عظیم الشان قانع اسی پیراہن یعنی کرتے سے وابستہ ہیں۔

پہلا واقعہ: بخون آلود کر کے والد کو دھوکہ دینے اور گرتے کی شہادت سے جھوٹ ثابت ہونے کا ہے۔ دوسرا واقعہ: زلیخا کا کہ اس میں بھی یوسف علیہ السلام کا گرتہ ہی شہادت میں پیش ہوا ہے۔ تیسرا واقعہ: یعقوب علیہ السلام کی بینائی واپس آنے کا، اس میں بھی اُن کا گرتہ ہی اعجاز کا منظر ثابت ہوا ہے۔

مسئلہ :- بعض علماء نے فرمایا کہ یعقوب علیہ السلام نے جو بات اپنے صاحبزادوں سے اُس وقت کہی تھی کہ **بَنَسَوْتُمْ لُكُمۡ اَنْفُسُكُمۡ اَمْرًا**، یعنی تمہارے نفوس نے ایک بات بنائی ہے، یہی بات اس وقت بھی کہی جبکہ مصر میں یوسف علیہ السلام کے حقیقی بھائی بنیامین ایک چوری کے الزام میں پکڑ لئے گئے اور ان کے بھائیوں نے یعقوب علیہ السلام کو اس کی خبر کی تو فرمایا **بَلۡ سَوَّيْتُ لَكُمۡ اَنْفُسُكُمۡ**، یہاں غور کرنے کا مقام ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ دونوں باتیں اپنی رائے سے کہی تھیں ان میں سے پہلی بات صحیح نکلی دوسری صحیح نہیں تھی، کیونکہ اس میں بھائیوں کا قصور نہ تھا اس سے معلوم ہوا کہ رائے کی غلطی پیغمبروں سے بھی ابتداء ہو سکتی ہے، اگرچہ بعد میں ان کو بوجہ الہی غلطی پر قائم رہنے نہیں دیا جاتا۔

نیز قرطبی میں ہے کہ اس سے ثابت ہوا کہ رائے کی غلطی بڑے بڑوں سے ہو سکتی ہے، اس لئے ہر صاحب رائے کو چاہئے کہ اپنی رائے کو متہم سمجھے اس پر ایسا جمود نہ کرے کہ دوسروں کی بات سننے ماننے کو تیار نہ ہو۔

وَجَاءَتْ سَيَّارَةٌ فَأَرْسَلُوا وَارِدَهُمْ فَأَدْلَى دَلْوَهُ، سیارہ کے معنی قافلہ، وارید سے مراد وہ لوگ ہیں جو قافلہ سے آگے رہتے ہیں، قافلہ کی ضروریات پانی وغیرہ مہیا کرنا ان کی ذمہ داری ہوتی ہے، اِدْلَء کے معنی کنویں میں ڈول ڈالنے کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ اتفاقاً ایک قافلہ اس سرزمین پر آنکلا، تفسیر قرطبی میں ہے کہ یہ قافلہ ملک شام سے مقرر جا رہا تھا، راستہ بھول کر اس غیر آباد جنگل میں پہنچ گیا، اور پانی لانے والوں کو کنویں پر بھیجا۔

لوگوں کی نظر میں یہ اتفاقی واقعہ تھا کہ شامی قافلہ رستہ بھول کر یہاں پہنچا، اور اس غیر آباد کنویں سے سابقہ پڑا، لیکن راز کائنات کا جاننے والا جانتا ہے کہ یہ سب واقعات ایک مربوط اور مستحکم نظام کی ملی ہوئی کڑیاں ہیں، یوسف کا پیدا کرنے والا اور اس کی حفاظت کرنے والا ہی قافلہ کو رستہ سے ہٹا کر یہاں لاتا ہے، اور اس کے آدمیوں کو اس غیر آباد کنویں پر بھیجتا ہے، یہی حال ہر

ان تمام حالات و واقعات کا جن کو عام انسان اتفاقی حوادث سمجھتے ہیں، اور فلسفہ والے ان کو بخت و اتفاق کہا کرتے ہیں، جو درحقیقت نظام کائنات سے ناواقفیت پر مبنی ہوتا ہے، ورنہ سلسلہ تکوین میں کوئی بخت و اتفاق نہیں، حق سبحانہ و تعالیٰ جن کی شان **فَعَالٌ لِّمَتَا يُرِيدُ** ہے مصلی حکمتوں کے تحت ایسے حالات پیدا کر دیتے ہیں کہ ظاہری وقائع سے ان کا جوڑ سمجھ میں نہیں آتا، تو انسان ان کو اتفاقی حوادث قرار دیتا ہے۔

بہر حال ان کا آدمی جس کا نام مالک بن زعیر بتلایا جاتا ہے اس کنویں پر پہنچا، ڈول ڈالا یوسف علیہ السلام نے قدرت کی امداد کا مشاہدہ کیا، اس ڈول کی رسی پکڑ لی، پانی کے بجائے ڈول کے ساتھ ایک ایسی ہستی کا چہرہ سامنے آ گیا جس کی آمد ہونے والے عظمتِ شان سے بھی قطع نظر کی جاتے تو موجودہ حالت میں بھی اپنے حسن و جمال اور جنوی کمالات کے درخشاں نشانات ان کی عظمت کے لئے کچھ کم نہ تھے، ایک عجیب انداز سے کنویں کی گہرائی سے برآمد ہونے والے، اس کم سن حسین اور ہونہار بچہ کو دیکھ کر پکار اٹھا، **يَبْنَؤُا هٰذَا غُلَامٌ**، ارے بڑی خوشی کی بات ہے، یہ تو بڑا اچھا لڑکا نکلی آیا ہے، صبح مسلم میں شبِ معراج کی حدیث میں ہر کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں یوسف علیہ السلام سے ملا تو دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے پورے عالم کے حسن و جمال میں آدھا ان کو عطا فرمایا ہے، اور باقی آدھا مائے جہان میں تقسیم ہوا ہے۔

وَأَسْرَوْهُ بِضَاعَةً، یعنی چسپا لیا اس کو ایک مال تجارت سمجھ کر، مطلب یہ ہر کہ شروع میں تو مالک بن زعیر یہ لڑکا دیکھ کر تعجب سے پکارا اٹھا، مگر پھر معاملہ پر غور کر کے یہ قرار دیا کہ اس کا چرچا نہ کیا جائے، اس کو چھپا کر رکھے، تاکہ اس کو فروخت کر کے رقم وصول کرے، اگر پورے قافلہ میں اس کا چرچا ہو گیا تو سارا قافلہ اس میں شریک ہو جائے گا۔

اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے حقیقتِ واقعہ کو چھپا کر ان کو ایک مال تجارت بنا لیا، جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ یہ برادرِ وزانہ یوسف علیہ السلام کو کنویں میں کھانا پہنچانے کے لئے جاتے تھے، تیسرے روز جب ان کو کنویں میں نہ پایا تو واپس آ کر بھائیوں کے واقعہ بیان کیا، یہ سب بھائی جمع ہو کر وہاں پہنچے، تحقیق کرنے پر قافلہ والوں کے پاس یوسف علیہ السلام برآمد ہوئے، تو ان سے کہا کہ یہ لڑکا ہمارا غلام ہے، بھاگ کر یہاں آ گیا ہے، تم نے بہت بُرا کیا، کہ اس کو اپنے قبضہ میں رکھا، مالک بن زعیر اور ان کے ساتھی سہم گئے کہ ہم چور سمجھے جاتیں گے، اس لئے بھائیوں سے ان کے خریدنے کی بات چیت ہونے لگی۔

نو آیت کے معنی یہ ہوئے کہ برادرانِ یوسف نے خود ہی یوسف کو ایک مال تجارت بنا لیا اور فروخت کر دیا، **وَاللّٰهُ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ**، یعنی اللہ تعالیٰ کو ان کی سب کارگزاریاں معلوم تھیں

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ کو سب معلوم تھا کہ برادرانِ یوسف کیا کریں گے، اور ان سے خریدنے والا قافلہ کیا کرے گا، اور وہ اس پر پوری قدرت رکھتے تھے کہ ان سب کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیں، لیکن ان کو یہ حکمتوں کے تحت اللہ تعالیٰ نے ان منصوبوں کو چلنے دیا۔

ابن کثیر نے فرمایا کہ اس جملہ میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی یہ ہدایت ہے کہ آپ کی قوم جو کچھ آپ کے ساتھ کر رہی ہے یا کرے گی وہ سب ہمارے علم و قدرت سے باہر نہیں، اگر ہم چاہیں تو ایک آن میں سب کو بدل ڈالیں، لیکن تقاضائے حکمت یہی ہے کہ ان لوگوں کو اس وقت اپنی قوت آزمائی کرنے دی جائے، اور انجام کار آپ کو ان پر غالب کر کے حق کو غالب کیا جائے گا، جیسا یوسف علیہ السلام کے ساتھ کیا گیا۔

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ، لفظ شرا عربی زبان میں خریدنے اور فروخت کرنے دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، یہاں بھی دونوں معنی کا احتمال ہے، منہر اگر برادرانِ یوسف کی طرف عائد کی جائے تو فروخت کرنے کے معنی ہوں گے، اور قافلہ والوں کی طرف عائد کی جائے تو خریدنے کے معنی ہوں گے، مطلب یہ ہے کہ بیچ ڈالنا برادرانِ یوسف نے یا خرید لیا قافلہ والوں نے یوسف علیہ السلام کو بہت تھوڑی قیمت یعنی گنتی کے چند دراہم کے معاوضہ میں۔

قرطبی نے فرمایا کہ عرب تجارت کی عادت یہ تھی کہ بڑی رقموں کے معاملات وزن سے کیا کرتے تھے، اور چھوٹی رقمیں جو چالیس سے زیادہ نہ ہوں ان کے معاملات گنتی سے کیا کرتے تھے، اس لئے دراہم کے ساتھ محدودہ کے لفظ نے یہ بتلادیا کہ دراہم کی مقدار چالیس سے کم تھی، ابن کثیر نے بروایت عبد اللہ بن مسعود لکھا ہے کہ منیس درہم کے بدلہ میں سودا ہوا اور دس بھائیوں نے دودھ درہم آپس میں تقسیم کر لئے، تعداد درہم میں بائیس اور چالیس درہم کی بھی مختلف روایتیں منقول ہیں۔ (ابن کثیر)

وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الْفَاسِقِينَ، زاہدین، زاہد کی جمع ہے، جو زہد سے مشتق ہے، زہد کے لفظی معنی بے رغبتی اور بے توجہی کے آتے ہیں، محاورات میں دنیا کی مال و دولت کے بے رغبتی اور اعراض کو کہا جاتا ہے، معنی آیت کے یہ ہیں کہ برادرانِ یوسف اس معاملہ میں دراصل مال کے خواہش مند نہ تھے، ان کا اصل مقصد تو یوسف علیہ السلام کو باپ سے جدا کرنا تھا، اس لئے تھوڑے سے دراہم میں معاملہ کر لیا۔

وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِنْ مِصْرَ لَا مِرَّآئِيهِ أَكْرَمِي مَثْوَاهُ عَسَىٰ

اور کہا جس شخص نے خرید کیا اس کو مصر سے اپنی عورت کو آبرو سے رکھ اس کو شاید

أَنْ يَنْفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَ وَكْدًا وَكَذَلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي

ہمارے کام آئے یا ہم کر لیں اس کو بیٹا اور اسی طرح جگہ دی ہم نے یوسف کو

الْأَرْضِ مِنْ دُونِ عِلْمِهِ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ وَاللَّهُ غَالِبٌ

اس ملک میں، اور اس واسطے کہ اس کو سکھائیں کچھ ٹھکانے پر بٹھانا باتوں کا اور اللہ زور آور رہتا ہے

عَلَىٰ أَمْرِهِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۲۱﴾ وَلَمَّا بَلَغَ

اپنے کام میں و لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے، اور جب پہنچ گیا

أَشُدُّكَ أَيَّامُكَ فَكَلَّمَا وَعِلْمًا وَكَذَلِكَ نَجِّي الْمُحْسِنِينَ ﴿۲۲﴾

اپنی قوت کو دیا ہم نے اس کو حکم اور علم اور ایسا ہی بدل دیتے ہیں ہم نیکی والوں کو

وَسَرَّاءُ وَكَذَلِكَ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَنْ نَفْسِهِ وَغَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ

اور چھپلایا اس کو اس عورت نے جس کے گھر میں تھا اپنا ہی تھا منہ سے اور بند کر دیئے دروازے

وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ

اور بولی سنبالی کر، کہا خدا کی پناہ وہ عزیز ملک ہو میرا ابھی طرح رکھا ہے مجھ کو،

إِنَّهُ لَا يَفْلَحُ الظَّالِمُونَ ﴿۲۳﴾

بیشک بھلائی نہیں پاتے جو لوگ کہ بے انصاف ہوں۔

خلاصہ تفسیر

د قافلہ والے یوسف علیہ السلام کو بھائیوں سے خرید کر مصر لے گئے، وہاں عزیز مصر کے ہاتھ ذبح کر دیا اور جس شخص نے مصر میں ان کو خرید رکھا (یعنی عزیز) اس نے ان کو اپنے گھر لاکر اپنی بیوی کے سپرد کیا اور اپنی بیوی سے کہا کہ میں کو خاطر سے رکھا کیا عجب ہو کہ (بڑا ہو کر) ہمارے کام آئے یا ہم اس کو بیٹا بنالیں (مشہور یہ ہے کہ یہ اس لئے کہا کہ ان کے اولاد نہ تھی) اور ہم نے (جس طرح یوسف علیہ السلام کو اپنی خاص عنایت سے اس اندھیرے کنویں سے نجات دی) اسی طرح یوسف کو اس سرزمین (مصر) میں خوب قوت دی (مراد اس سے سلطنت ہو) اور (یہ نجات دینا اس غرض سے بھی تھا) تاکہ ہم ان کو خوابوں کی تعبیر دینا بتلا دیں (مطلب یہ تھا کہ نجات دینے کا مقصد

ان کو ظاہری اور باطنی دولت سے مالا مال کرنا تھا، اور اللہ تعالیٰ اپنے (چاہے ہوتے) کام پر غالب (اور قادر) ہے (جو چاہے کر دے) لیکن اکثر آدمی جانتے نہیں (کیونکہ اہل ایمان و یقین کم ہی ہوتے ہیں) یہ مضمون قصہ کے درمیان بطور جملہ محترمہ کے اس لئے لایا گیا ہے کہ یوسف علیہ السلام کی موجودہ حالت اپنی غلام بن کر رہنا بظاہر کوئی اچھی حالت نہ تھی، مگر حق تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ حالت چند روزہ بطور ذریعہ کے ہے، اصل مقصد ان کو اونچا مقام عطا فرمانا ہے اور اس کا ذریعہ عزیز مصر کو اور اس کے گھر میں پرورش پانے کو بنایا گیا، کیونکہ امراء کے گھر میں پرورش پانے سے سلیقہ و تجربہ بڑھتا ہے، اور سلطنت کا علم ہوتا ہے، اسی کا اہقہ آگے یہ ہے) اور جب وہ اپنی جوانی یعنی سن بلوغ یا کمال شباب (کو پہنچے ہم نے ان کو حکمت اور علم عطا کیا) مراد اس سے علم نبوت کا عطا کرنا ہے، اور کنوئیں میں ڈالنے کے وقت جو ان کی طرف وحی بھیجے گا ذکر پہلے آچکا ہے وہ وحی نبوت نہیں تھی، بلکہ ایسی وحی تھی جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو وحی بھیجی گئی تھی) اور ہم نیک لوگوں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں (جو قصہ یوسف علیہ السلام پر تہمت لگانے کا آگے بیان ہوگا، اس سے پہلے ان جملوں میں بتلادیا گیا ہے کہ وہ سراسر تہمت اور جھوٹ ہوگا، کیونکہ جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم و حکمت عطا ہو اس سے ایسے کام صادر ہوسکتے ہیں کہ اس تہمت کے قصہ کا بیان ہے کہ یوسف علیہ السلام عزیز مصر کے گھر میں آرام و راحت کے ساتھ رہنے لگے) اور (اسی درمیان میں یہ ابتلاء پیش آیا کہ) جس عورت کے گھر میں یوسف رہتے تھے وہ (ان پر غفلت ہو گئی اور) ان سے اپنا مطلب حاصل کرنے کے لئے ان کو پھسلانے لگی اور (گھر کے) سالیے دروازے بند کر دیئے اور (ان سے) کہنے لگی آجاؤ تم ہی سے کہتی ہوں، یوسف (علیہ السلام) نے کہا کہ اول تو یہ خود بڑا بھاری گناہ ہے) اللہ بچائے (دوسرے) وہ (یعنی تیرا شوہر) میرا غریبی (اور محسن) ہے کہ مجھے کو کیسی اچھی طرح رکھا (تو کیا میں اس کے ناموس میں نفل اندازی کروں) ایسے حق فراموشوں کو فلاح نہیں ہوا کرتی (بلکہ اکثر تو دنیا ہی میں ذلیل اور پریشان ہوتے ہیں ورنہ آخرت میں تو عذاب یقینی ہے)۔

معارف و مسائل

پہلی آیتوں میں حضرت یوسف علیہ السلام کی ابتدائی سرگزشت بیان ہو چکی ہے کہ قافلہ والوں نے جب ان کو کنوئیں سے نکال لیا تو برادران یوسف نے ان کو اپنا غلام گرجتے بتا کر تھوڑے درہموں میں ان کا سودا کر لیا، اول تو اس لڑکے کو اس بزرگ مہستی کی قدر معلوم

نہ تھی، دوسرے اس لئے کہ ان کا اصل مقصد ان سے پیسہ کمانا نہیں بلکہ باپ سے دور کر دینا تھا، اس لئے صرف فروخت کر دینے پر بس نہیں کی، کیونکہ یہ خطرہ تھا کہ کہیں قافلہ والے ان کو یہیں نہ چھوڑ جائیں اور یہ پتھر کسی طرح وال کے پاس پہنچ کر ہماری سازش کا راز فاش کر دے، اس لئے امام تفسیر مجاہد کی روایت کے مطابق یہ لوگ اس انتظار میں رہے کہ یہ قافلہ ان کو لے کر مصر کے لئے روانہ ہو جائے اور جب قافلہ روانہ ہوا تو کچھ دیر تک قافلہ کے ساتھ چلے، اور ان لوگوں سے کہا کہ دیکھو اس کو جگہ جانے کی عادت ہے، کھلا نہ چھوڑو، بلکہ باز رہ کر رکھو، اس ڈر شہوار کی قدر و قیمت سے ناواقف قافلہ والے ان کو اسی طرح مصر تک لے گئے (تفسیر ابن کثیر)

آیات مذکورہ میں اس کے بعد کا قصہ اس طرح مذکور ہے، اور قرآنی ایجاز کے ساتھ قصہ کے جتنے اجزاء خود بخود سمجھ میں آسکتے ہیں ان کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی، مثلاً قافلہ کا محتلف منزلوں سے گزر کر مصر تک پہنچنا، اور وہاں جا کر یوسف علیہ السلام کو فروخت کرنا وغیرہ، سب کو چھوڑ کر یہاں سے بیان ہوتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِنْ مِصْرَ لَا مِرَّةٍ أَكْرَمُ مِثْلَهُ، یعنی کہا اس شخص نے جس نے

یوسف علیہ السلام کو مصر میں خریدا اپنی بیوی سے کہ یوسف کے ٹھہرانے کا اچھا انتظام کرو۔ مطلب یہ ہے کہ قافلہ والوں نے ان کو مصر لے جا کر فروخت کرنے کا اعلان کیا تو تفسیر طبری میں ہے کہ لوگوں نے بڑھ بڑھ کر قیمتیں لگانا شروع کیا، یہاں تک کہ یوسف علیہ السلام کے وزن کی برابر سونا اور اسی کی برابر خشک اور اسی وزن کے ریشمی کپڑے قیمت لگ گئی۔ یہ دولت اللہ تعالیٰ نے عزیز مصر کے لئے مقدر کی تھی اس لئے یہ سب چیزیں قیمت میں ادا کر کے یوسف علیہ السلام کو خرید لیا۔

جیسا کہ پہلے ارشاد قرآنی سے معلوم ہو چکا ہے کہ یہ سب کچھ کوئی اتفاقی واقعہ نہیں بلکہ رب العزت کی بنائی ہوئی مستحکم تدبیر کے اجزاء ہیں، مصر میں یوسف کی خریداری کے لئے اس ملک کے سب سے بڑے عزت والے شخص کو معتمد فرمایا، ابن کثیر نے فرمایا کہ یہ شخص جس نے مصر میں یوسف علیہ السلام کو خریدا وہ ملک مصر کا وزیر خزانہ تھا، جس کا نام قطفیر یا اطفیر بتلایا جاتا ہے، اور بادشاہ مصر اس زمانہ میں قوم عمالک کا ایک شخص ریان بن اسید تھا، (جو بعد میں حضرت یوسف علیہ السلام کے ہاتھ پر اسلام لایا اور سلطان ہو کر یوسف علیہ السلام کی زندگی میں انتقال کر گیا) (منظہری) اور عزیز مصر جس نے خریدا تھا اس کی بیوی کا نام راعیل یا زلیخا بتلایا گیا ہے، عزیز مصر قطفیر نے یوسف علیہ السلام کے متعلق اپنی بیوی کو یہ ہدایت کی کہ ان کو اچھا ٹھکانا دے، عام غلاموں کی طرح نہ رکھے، ان کی ضروریات کا اچھا انتظام کرے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ دنیا میں تین آدمی بڑے عقلمند اور قیافہ شناس ثابت ہوئے، اول عزیز مصر جس نے ان کے کمالات کو اپنے قیافہ سے معلوم کر کے بیوی کو یہ ہدایت دی، دوسرے شعیب علیہ السلام کی وہ صاحبزادی جس نے موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اپنے والد سے کہا یا بَتِ اسْتَأْجِرْکَ اِنَّ خَیْرَ مِّنْ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِیُّ اِلَّا مِیْمُنٌ، یعنی اباجان! ان کو ملازم رکھ لیجئے، اس لئے کہ بہترین ملازم وہ شخص ہے جو قوی بھی ہو اور امانت دار بھی، تیسرے حضرت صدیق اکبرؓ ہیں جنہوں نے اپنے بعد وفاروق عظمیٰؓ کو خلافت کے لئے منتخب فرمایا (ابن کثیر)

وَکَذَٰلِكَ مَثَلُ یُوسُفَ فِی الدُّنْیَا، یعنی اس طرح حکومت دیدی ہم نے یوسف کو زمین کی، اس میں آئندہ آنے والے واقعہ کی بشارت یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام جو عزیز مصر کے گھر میں اس وقت بحیثیت غلام داخل ہوئے ہیں عنقریب یہ ملک مصر کے سب سے بڑے آدمی ہوں گے، اور حکومت کا اقتدار ان کو ملے گا۔

وَلِنُعَلِّمَهُ مِمَّا نَافِلٍ اِلٰی حَادِیْثٍ یہاں شروع میں حرف واؤ کو اگر عطف کیلئے مانا جائے تو ایک جملہ اس معنی کا محذوف مانا جائے گا، کہ ہم نے یوسف علیہ السلام کو زمین کی حکومت اس لئے دی کہ وہ دنیا میں عدل و انصاف کے ذریعہ امن و امان قائم کریں، اور باشندگان ملک کی راحت کا انتظام کریں، اور اس لئے کہ ہم ان کو باتوں کا ٹھکانے لگانا سکھادیں، باتوں کا ٹھکانے لگانا ایک ایسا عام مفہوم ہے جس میں وحی الہی کا سمجھنا اور اس کو بروئے کار لانا بھی داخل ہے، اور تمام ضروری علوم کا حاصل ہونا بھی اور خیالوں کی تعبیر صحیح بھی۔

وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰی اَمْرِہٖ، یعنی اللہ تعالیٰ غالب اور قادر ہے اپنے کام پر جو اس کا ارادہ ہوتا ہے تمام عالم کے اسباب ظاہرہ اس کے مطابق ہوتے چلے جاتے ہیں، جیسا ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کام کا ارادہ فرماتے ہیں تو دنیا کے سارے اسباب اس کے لئے تیار کر دیتے ہیں، وَلٰکِنْ اَکْثَرُ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ، لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے، اور اسباب ظاہرہ ہی کو سب کچھ سمجھ کر انہی کی فکر میں لگے رہتے ہیں، اسباب الاسباب اور قادر مطلق کی طرف دھیان نہیں دیتے وَلَمَّا بَلَغَ اَشَدَّ سِنَّہٗ اٰتٰیْنٰہُ حُکْمًا وَّ عَلَیْمًا، یعنی جب پہنچ گئے یوسف

علیہ السلام اپنی پوری قوت اور جوانی پر تو دیدی ہم نے ان کو حکمت اور علم، یہ قوت اور جوانی کس عمر میں حاصل ہوئی، اس میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں، حضرت ابن عباسؓ، مجاہدؓ، قتادہؓ نے فرمایا کہ ۳۳ سال عمر تھی، ضحاکؓ نے بیس سال اور جن بصریؓ

نے پچیس سال بتلائی ہر، اس پر سب کا اتفاق ہر کہ حکمت اور علم عطا کرنے سے مراد اس جگہ عطاء نبوت ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یوسف علیہ السلام کو نبوت منحصر ہو پہنچنے کے بھی کافی غوصہ ملی ہے، اور کنز میں گہرائی میں جو دسی ان کو بھی گئی وہ وحی نبوت نہ تھی، بلکہ لغوی دسی تھی جو غیر انبیاء کو بھی بھیجی جاسکتی ہے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اور حضرت مریم کے بارے میں وارد ہوا ہے۔

وَكُنْ لَكَ تَجَرِي الْمَحْسِنِينَ، ”اور ہم اسی طرح برہ دیا کرتے ہیں نیک کام کرنے والوں کو،“ مطلب یہ ہے کہ ہلاکت سے نجات دلا کر حکومت و عزت تک پہنچانا یوسف علیہ السلام کی نیک چلنی، خداترسی اور اعمال صالحہ کا نتیجہ تھا، یہ ان کے ساتھ مخصوص نہیں، جو بھی ایسے عمل کرے گا ہمارے انعامات اسی طرح پائے گا۔

وَرَأَوْا دَنَّهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَنْ نَفْسِهِ وَخَلَعَتِ الْآبُوبَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ، ”پہلی جس عورت کے گھر میں یوسف علیہ السلام رہتے تھے وہ ان پر مفتوح ہو گئی، اور ان سے اپنا مطلب حاصل کرنے کے لئے ان کو پھسلانے لگی، اور گھر کے سارے دروازے بند کر دیئے، اور ان سے کہنے لگی کہ جلد آجاؤ تمہیں سے کہتی ہوں،“

پہلی آیت میں معلوم ہو چکا ہے کہ یہ عورت عزیز مصر کی بیوی تھی، مگر اس جگہ قرآن کریم نے زوجہ عزیز کا مختصر لفظ چھوڑ کر الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا کے الفاظ اختیار کئے، اس میں اشارہ اس کی طرف ہر کہ یوسف علیہ السلام کے گناہ سے بچنے کی مشکلات میں اس بات نے اور بھی اضافہ کر دیا تھا کہ وہ اسی عورت کے گھر میں اسی کی پناہ میں رہتے تھے، اس کے کہنے کو نظر انداز کرنا آسان نہ تھا۔

گناہ سے بچنے کا قوی ذریعہ | اور اس کا ظاہری سبب یہ ہوا کہ یوسف علیہ السلام نے جب اپنے خود اللہ سے پناہ مانگنا ہی | آپ کو سب طرف سے گھرا ہوا پایا تو پیغمبرانہ انداز پر سب پہلے خدا کی پناہ مانگی قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ، محض اپنے عزم و ارادہ پر بھروسہ نہیں کیا، اور یہ ظاہر ہر کہ جب کو خدا کی پناہ مل جائے اس کو کون سیج راستہ سے ہٹا سکتا ہے، اس کے بعد پیغمبرانہ حکمت و موعظت کے ساتھ خود زینب کو نصیحت کرنا شروع کیا، کہ وہ بھی خدا سے ڈرے اور اپنے ارادہ سے باز آجائے، فرمایا:

إِنَّ رَبِّيَ أَحْسَنُ مَشْوَايَ، إِنَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ، ”وہ میرا پالنے والا ہے اس نے مجھے آرام کی جگہ دی، خوب سمجھ لو کہ ظلم کرنے والوں کو فلاح نہیں ہوتی،“

بظاہر مراد یہ ہے کہ تیرے شوہر عزیز مصر نے میری پرورش کی اور مجھے اچھا ٹھکانا دیا،

میرا من ہی میں اس کے حرم پر دست اندازی کروں؟ یہ بڑا ظلم ہے اور ظلم کرنے والے کبھی فلاح نہیں پاتے اس کے ضمن میں خود ذرا لٹکا کو بھی یہ سبق دیدیا کہ جب میں اس کی چند روزہ پرورش کا اتنا حق پہنچاتا ہوں تو تجھے مجھ سے زیادہ پہنچانا چاہیے۔

اس جگہ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر کو اپنا رب فرمایا، حالانکہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کے لئے استعمال کرنا جائز نہیں، وجہ یہ ہے کہ ایسے الفاظ موہم شرک اور مشرکین کے ساتھ مشابہت پیدا کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں، اسی لئے شریعت محکمہ میں ایسے الفاظ استعمال کرنا ہی ممنوع کر دیا گیا صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ کوئی غلام اپنے آقا کو اپنا رب نہ کہے، اور کوئی آقا اپنے غلام کو اپنا بندہ نہ کہے، مگر یہ خصوصیت شریعت محکمہ کی ہے جس میں شرک کی ممانعت کے ساتھ ایسی چیزوں کی بھی ممانعت کر دی گئی ہے جن میں ذریعہ شرک بننے کا احتمال ہو، انبیاء سابقین کی شریعتوں میں شرک سے توسعتی کے ساتھ روکا گیا ہے، مگر اسباب و ذرائع پر کوئی پابندی نہ تھی، اس وجہ سے پہلی شریعتوں میں تصویر سازی ممنوع نہ تھی، مگر شریعت محکمہ کی چونکہ قیامت تک کے لئے آئی ہے، اس کو شرک سے پوری طرح محفوظ کرنے کے لئے ذرائع شرک، تصویر اور ایسے الفاظ سے بھی روک دیا گیا جو موہم شرک ہو سکیں، بہر حال یوسف علیہ السلام کا اِنَّ رَبِّيْ فَرَمَانًا اپنی جگہ درست تھا۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اِنَّ کی تفسیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہو، اسی کو اپنا رب فرمایا اور اچھا لٹکا نا بھی درحقیقت اسی نے دیا، اس کی نافرمانی سب سے بڑا ظلم ہے، اور ظلم کرنے والوں کو فلاح نہیں۔

بعض مفتخرین ساری اور ابن اسحق وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ اس خلوت میں زلیخا نے یوسف علیہ السلام کو مائل کرنے کے لئے ان کے حسن و جمال کی تعریف شروع کی، کہا کہ تمھارے بال کس قدر حسین ہیں، یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ بال موت کے بعد سب سے پہلے میرے جسم سے غسوارہ ہو جائیں گے، پھر کہا تمھاری آنکھیں کتنی حسین ہیں تو فرمایا موت کے بعد یہ سب پانی ہو کر میرے چہرے پر بہ جائیں گی، پھر کہا تمھارا چہرہ کتنا حسین ہے تو فرمایا کہ یہ سب مٹی کی غذا ہے، اللہ تعالیٰ نے فکرِ آخرت آپ پر اس طرح مسلط کر دی کہ نوجوانی کے عالم میں دنیا کی ساری لذتیں ان کے سامنے گرد ہو گئیں، صیح ہے کہ فکرِ آخرت ہی وہ چیز ہے جو انسان کو ہر جگہ ہر شے سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔

اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا اِيَّاهُ

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا اَنْ رَّا بُرْهَانَ رَبِّهٖ كَذٰلِكَ

اور البتہ عورت نے فکر کیا اس کا اور اس نے فکر کیا عورت کا اگر نہ ہوتا یہ کہ دیکھے قدرت اظہار کی برہانی ہوا

لِنَصْرِفَ عَنْهٗ السُّوْءَ وَالْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِ الرَّحْمٰنِ ۝۲۱

تاکہ ہٹائیں ہم اس سے بُرائی اور بے حیائی البتہ وہ ہو ہمارے برگزیدہ بندوں میں۔

خلاصہ تفسیر

اور اس عورت کے دل میں ان کا خیال (عزم کے درجہ میں) جم ہی رہا تھا اور ان کو بھی اس عورت کا کچھ کچھ خیال (امر طبعی کے درجہ میں) ہو چلا تھا (جو کہ خستیار سے باہر ہے جیسے گرمی کے روزہ میں پانی کی طرف میلان طبعی ہوتا ہے مگر روزہ توڑنے کا وسوسہ تک بھی نہیں آتا، البتہ اگر اپنے رب کی دلیل کو (یعنی اس فعل کے گناہ ہونے کی دلیل کو جو کہ حکیم شرعی ہے) انہوں نے نہ دیکھا ہوتا (یعنی اُن کو شہادت کا علم مع قوت عملیہ کے حاصل نہ ہوتا) تو زیادہ خیال ہو جانا عجیب نہ تھا کیونکہ اس کے دواغی اور اسباب سب قوی جمع تھے مگر ہم نے اسی طرح ان کو علم دیا تاکہ ہم ان سے صغیرہ اور کبیرہ گناہ کو دور رکھیں (یعنی ارادہ سے بھی بچالیا اور فعل سے بھی، کیونکہ وہ ہمارے برگزیدہ بندوں میں سے تھے۔

معارف و مسائل

پچھلے آیت میں حضرت یوسف علیہ السلام کا عظیم ابتلاء و امتحان مذکور تھا کہ عزیز مصر کی عورت نے گھر کے دروازے بند کر کے ان کو گناہ کی طرف بلانے کی کوشش کی، اور اپنی طرف راغب کرنے اور مبتلا کرنے کے سارے ہی اسباب جمع کر دیئے، مگر رب العزت نے اس نوجوان صالح کو ایسے شدید ابتلاء میں ثابت قدم رکھا، اس کی مزید تفصیل اس آیت میں ہے کہ زلیخا تو گناہ کے خیال میں لگی ہوئی تھی ہی، یوسف علیہ السلام کے دل میں بھی انسانی فطرت کے تقاضے سے کچھ کچھ غیر خستیار سی میلان پیدا ہونے لگا، مگر اللہ تعالیٰ نے عین اُس وقت میں اپنی حجت و برہان یوسف علیہ السلام کے سامنے کر دی، جس کی وجہ سے وہ غیر اختیار سی میلان آگے بڑھنے کے بجائے بالکل ختم ہو گیا، اور وہ پیچھا چھڑا کر بھاگے۔

اس آیت میں لفظ ہَمَّتْ بمعنی خیال زلیخا اور حضرت یوسف علیہ السلام دونوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا، اور یہ معلوم ہے کہ زلیخا کا ہَمُّ بمعنی خیال گناہ

کاتھا، اس سے یوسف علیہ السلام کے متعلق بھی ایسے ہی خیال کا وہم ہو سکتا تھا، اور یہ باجماع امت شان نبوت و رسالت کے خلاف ہے، کیونکہ جمہور امت اس پر متفق ہے کہ انبیاء علیہم السلام صغیرہ اور کبیرہ ہر طرح کے گناہ سے معصوم ہوتے ہیں، کبیرہ گناہ تو نہ قصداً ہو سکتا ہے نہ سہوہ خطا کی راہ سے ہو سکتا ہے، البتہ صغیرہ گناہ سہوہ و خطا کے طور پر سرزد ہو جانے کا امکان ہے مگر اس پر بھی انبیاء علیہم السلام کو قائم نہیں رہنے دیا جاتا، بلکہ متنبہ کر کے اس سے ہٹا دیا جاتا ہے (مسلم) اور یہ مسئلہ حضرت قرآن و سنت سے ثابت ہونے کے علاوہ عقلاً بھی اس لئے ضروری ہو کہ اگر انبیاء علیہم السلام سے گناہ سرزد ہو جانے کا امکان و احتمال رہے تو ان کے لئے ہوئے دین اور وحی پر اعتماد کا کوئی راستہ نہیں رہتا، اور ان کی بعثت اور ان پر کتاب نازل کرنیکا کوئی فائدہ باقی نہیں رہتا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر پیغمبر کو ہر گناہ سے معصوم رکھا ہے۔ اس لئے اجمالی طور پر یہ تو متعین ہو گیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو جو خیال پیدا ہوا وہ گناہ کے درجہ کا خیال نہ تھا، تفصیل اس کی یہ ہے کہ عربی زبان میں لفظ ہمّ دو معنی کے لئے بولا جاتا ہے، ایک کسی کام کا قصد و ارادہ اور عزم کر لینا دوسرے محض دل میں وسوسہ اور غیر ختمیاری خیال پیدا ہو جانا، پہلی صورت گناہ میں داخل اور قابل مواخذہ ہے، ہاں اگر قصد و ارادہ کے بعد خالص اللہ تعالیٰ کے ثبوت سے کوئی شخص اس گناہ کو با اختیار خود چھوڑ دے تو حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے گناہ کی جگہ اس کے نامہ اعمال میں ایک نیکی درج فرمادے گی ہیں اور دوسری صورت کہ محض وسوسہ اور غیر اختیار خیال آجائے، اور فعل کا ارادہ بالکل نہ ہو جیسے گرمی کے روزہ میں ٹھنڈے پانی کی طرف طبعی میلان غیر اختیار سے سب کو ہو جاتا ہے حالانکہ روزہ میں پینے کا ارادہ بالکل نہیں ہوتا، اس قسم کا خیال نہ انسان کے اختیار میں ہے نہ اس پر کوئی مواخذہ اور گناہ ہے۔

صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت کے لئے گناہ کے وسوسہ اور خیال کو معاف کر دیا ہے جبکہ وہ اس پر عمل نہ کرے (قرطبی) اور صحیحین میں بروایت ابو ہریرہؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں فرماتے ہیں کہ میرا بندہ جب کسی نیکی کا ارادہ کرے تو صرف ارادہ کرنے سے اس کے نامہ اعمال میں ایک نیکی لکھ دو، اور جب وہ یہ نیک عمل کرے تو دس نیکیاں لکھو، اور اگر بندہ کسی گناہ کا ارادہ کرے مگر پھر خدا کے ثبوت سے چھوڑ دے تو گناہ کے بجائے اس کے نامہ اعمال میں ایک نیکی لکھ دو، اور اگر وہ گناہ کر ہی گزرے تو صرف ایک ہی گناہ لکھو (ابن کثیر)

تفسیر قرطبی میں لفظ ہمّ کا ان دونوں معنی کے لئے استعمال عرب کے محاورات اور

اشعار کی شہادتوں سے ثابت کیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگرچہ آیت میں لفظ ہم زلیخا اور حضرت یوسف علیہ السلام دونوں کے لئے بولا گیا، مگر ان دونوں کے ہم یعنی خیال میں بڑا فرق ہے، پہلا گناہ میں داخل ہے اور دوسرا غیر اختیار سی وسوسہ کی حیثیت رکھتا ہے، جو گناہ میں داخل نہیں، قرآن کریم کا اسلوب بیان بھی خود اس پر شاہد ہے، کیونکہ دونوں کا ہم و خیال اگر ایک ہی طرح کا ہوتا تو اس جگہ بصیغہ تثنیہ وَلَقَدْ هَمَّتْ کہہ دیا جاتا، جو مختصر بھی تھا، اس کو چھوڑ کر دونوں کے ہم و خیال کا بیان الگ الگ فرمایا هَمَّتْ بِرَمَا، اور زلیخا کے ہم و خیال کے ساتھ تاکید کے الفاظ لَفَتْ کا اضافہ کیا، یوسف علیہ السلام کے ہم کے ساتھ لام اور قَدْ کی تاکید نہیں ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تعبیر خاص کے ذریعے یہی جتان ہے کہ زلیخا کا ہم کسی اور طرح کا تھا اور یوسف علیہ السلام کا دوسری طرح کا۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ جس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ ابتلا پیش آیا تو فرشتوں نے اللہ جل شانہ سے عرض کی کہ آپ کا یہ غلام بندہ گناہ کے خیال میں ہے، حالانکہ وہ اس کے وبال کو خوب جانتا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انتظار کرو، اگر وہ یہ گناہ کر لے تو جیسا کیا ہو وہ اس کے نامہ اعمال میں لکھ دو، اور اگر وہ اس کو چھوڑ دے تو گناہ کی بجائے اس کے نامہ اعمال میں نیکی درج کرو، کیونکہ اس نے صرف میرے خوف سے اپنی خواہش کو چھوڑا ہے، (جو بہت بڑی نیکی ہے) (قرطبی)

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں جو خیال یا میلان پیدا ہوا وہ محض غیر اختیار سی وسوسہ کے درجہ میں تھا، جو گناہ میں داخل نہیں، پھر اس وسوسہ کے خلاف عمل کرنے سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کا درجہ اور زیادہ بلند ہو گیا۔

اور بعض حضرات مفسرین نے اس جگہ یہ بھی فرمایا ہے کہ کلام میں تقدیم و تاخیر واقع ہوئی ہے فَوَلَّىٰ آدَامُ بَرَّهَانَ رَبِّهٖ جو بعد میں مذکور ہو رہا وہ اصل میں مقدم ہے، اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ یوسف علیہ السلام کو بھی خیال پیدا ہو جاتا اگر اللہ کی حجت و برہان کو نہ دیکھ لیتے، لیکن برہان رب کو دیکھنے کی وجہ سے وہ اس ہم و خیال سے بھی بچ گئے، مضمون یہ بھی درست ہے مگر بعض حضرات نے اس تقدیم و تاخیر کو قواعد زبان کے خلاف قرار دیا ہے، اور اس لحاظ سے بھی پہلی ہی تفسیر راجح ہے کہ اس میں حضرت یوسف علیہ السلام کی شان تقویٰ و طہارت اور زیادہ بلند ہو جاتی ہے، کہ طبعی اور بشری تقاضے کے باوجود وہ گناہ سے محفوظ رہے۔

اس کے بعد جو یہ ارشاد فرمایا فَوَلَّىٰ آدَامُ بَرَّهَانَ رَبِّهٖ اس کی جزا محذوف ہے، اور معنی یہ ہیں کہ اگر وہ اپنے رب کی برہان اور حجت کو نہ دیکھتے تو اس خیال میں مبتلا رہتے مگر

برہان رب دیکھ لینے کی وجہ سے وہ غیر خستہ کاری خیال اور وسوسہ بھی قلب سے نکل گیا۔

قرآن کریم نے یہ واضح نہیں فرمایا کہ وہ برہان ربی جو یوسف علیہ السلام کے سامنے آئی، کیا چیز تھی؟ اس لئے اس میں حضرات مفسرین کے اقوال مختلف ہیں، حضرت عبداللہ بن عباسؓ مجاہد، سعید بن جبیر، محمد بن سیرین، حسن بصری وغیرہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بطور معجزہ اس خلوت گاہ میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی صورت اس طرح ان کے سامنے کر دی کہ وہ اپنی انگلی دانتوں میں دبائے ہوئے ان کو متنبہ کر رہے ہیں، اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ عزیز مصر کی صورت ان کے سامنے کر دی گئی، بعض نے فرمایا کہ یوسف علیہ السلام کی نظر چھت کی طرف اٹھی تو اس میں یہ آیت قرآن لکھی ہوئی دیکھی، لَا تَقْرَبُوا الزَّيْنٰی اِنَّہَا کَانَ قَاحِشَةً وَّ سَآءَ سَبِيْلًا، یعنی زنا کے پاس نہ جاؤ، کیونکہ وہ بڑی بے حیائی (اور فہر خداوندی کا سبب) اور (معاشروہ کے لئے) بہت برار راستہ ہے، بعض مفسرین نے فرمایا کہ زینا کے مکان میں ایک جت تھا، اس نے اس جت پر پرہ و ڈالا تو یوسف علیہ السلام نے وجہ پوچھی، اس نے کہا کہ یہ میرا معبود ہے، اس کے سامنے گناہ کرنے کی ہرأت نہیں، یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ میرا معبود اس سے زیادہ حیا رکھتا ہے، اس کی نظر کو کوئی پردہ نہیں روک سکتا، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یوسف علیہ السلام کی نبوت اور معرفت الہیہ خود ہی برہان رب تھی۔

اہم تفسیر ابن جریر نے ان تمام اقوال کو نقل کرنے کے بعد جو بات فرمائی ہے وہ سب اہل تحقیق کے نزدیک نہایت پسندیدہ اور بے غبار ہے، وہ یہ ہے کہ جتنی بات قرآن کریم نے بتلا دی ہے وہ اسی پر اکتفا کیا جائے، یعنی یہ کہ یوسف علیہ السلام نے کوئی ایسی چیز دیکھی جس سے وسوسہ ان کے دل سے جاتا رہا، اس چیز کی تمہین میں وہ سب احتمال ہو سکتے ہیں جو حضرات مفسرین نے ذکر کئے ہیں، لیکن قطعی طور پر اس کو تمہین نہیں کیا جاسکتا، (ابن کثیر)

گَدٰی لَکَ لِتَنْصُرَکَ عَنْهُ السُّوْءَ وَ تَنْفَحْکَ عَنْہُ اِنَّکَ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ
یعنی ہم نے یوسف علیہ السلام کو یہ برہان اس لئے دکھائی کہ ان سے بُرائی اور بے حیائی کو مٹا دیا
بُرائی سے مراد صغیرہ گناہ اور بے حیائی سے کبیرہ گناہ ہے (منظہری)

یہاں یہ بات قابلِ نظر ہے کہ بُرائی اور بے حیائی کو یوسف علیہ السلام سے ہٹا دینے کا ذکر فرمایا ہے، یوسف علیہ السلام کو بُرائی اور بے حیائی سے ہٹانا نہیں فرمایا، جن میں اشارہ ہے کہ یوسف علیہ السلام تو اپنی شانِ نبوت کی وجہ سے اس گناہ سے خود ہی ہٹے ہوئے تھے، مگر بُرائی اور بے حیائی نے اُن کو گمیر لیا تھا، ہم نے اس کے جال کو توڑ دیا، قرآن کریم کے یہ الفاظ بھی اس پر شاہد ہیں کہ یوسف علیہ السلام کسی ادنیٰ گناہ میں بھی مبتلا نہیں ہوئے، اور ان کے

دل میں جو خیال پیدا ہوا تھا وہ گناہ میں داخل نہ تھا اور نہ یہاں تعبیر اس طرح ہوتی کہ ہم نے یوسف علیہ السلام کو گناہ سے بچا دیا نہ یہ کہ گناہ کو ان سے ہٹا دیا۔

کیونکہ یوسف علیہ السلام ہماری برگزیدہ بندوں میں سے ہیں، لفظ مُخْلِصِينَ اس جگہ بفتح لام مخلص کی جمع ہے، جس کے معنی منتزب کے ہیں، مراد یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام اللہ کے ان بندوں میں سے ہیں، جن کو خود حق تعالیٰ نے اپنے کارِ رسالت اور اصلاحِ خلق کے لئے انتخاب فرمایا ہے، ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظتی پہرہ ہوتا ہے، کہ وہ کسی بُرائی میں مبتلا نہ ہو سکیں، خود شیطان نے بھی اپنے بیان میں اس کا اقرار کیا کہ اللہ کے منتخب بندوں پر اس کا بس نہیں چلتا، اس نے کہا فَيَحْزَنُ يَتْلُو تِلْكَ لَكُمُ غَوِيَّتَهُمْ أَجْمَعِينَ إِلَّا عِبَادَكَ مِن دُنَاهُمْ اَلَّذِينَ يَخْلَفُونَ، یعنی قسم ہر تیری عزت و قوت کی کہ میں ان سب انسانوں کو گمراہ کر دوں گا بجز ان بندوں کے جن کو آپ نے منتخب فرمایا ہے۔

اور بعض مترجموں میں یہ لفظ بکسر لام مُخْلِصِينَ بھی آیا ہے، اور مخلص کے معنی یہ ہیں کہ جو اللہ تعالیٰ کی عبادت و فرمانبرداری اخلاص کے ساتھ کرے، اس میں کسی دنیاوی اور نفسانی غرض و شہرت و جاہ وغیرہ کا دخل نہ ہو، اس صورت میں مراد اس آیت کی یہ ہوگی کہ جو شخص بھی اپنے عمل اور عبادت میں مخلص ہو اللہ تعالیٰ گناہوں سے بچنے میں اس کی امداد فرماتے ہیں۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے دو لفظ سوء اور فحشاء کے استعمال فرمائے ہیں، سوء کے لفظی معنی بُرائی کے ہیں، اور مراد اس سے صغیرہ گناہ ہے، اور فحشاء کے معنی بے حیائی کے ہیں، اس سے مراد کبیرہ گناہ ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کبیرہ اور صغیرہ دونوں قسم کے گناہوں سے محفوظ رکھا۔

اسی سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف قرآن میں جس ہتہم یعنی خیال کو منسوب کیا ہے وہ محض غیر خستہ کاری و سوسہ کے درجہ کا ہتہم تھا جو نہ کبیرہ گناہ میں داخل ہو نہ صغیرہ میں، بلکہ معاف ہے۔

وَأَسْبَقَ الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيصَهُ مِنْ دُبُرٍ وَأَلْفَيَا سَيِّدَهَا

اور دونوں دوڑے دروازہ کو اور عورت نے چیر ڈالا اس کا کرتہ پیچھے سے اور دونوں مل گئے عورت کا ہاتھ

لَدَا الْبَابِ قَالَتْ مَا جَزَاءُ مَنْ أَرَادَ بِأَهْلِكَ سُوءًا إِلَّا أَنْ

دروازہ کے پاس، بولی اور کچھ سزا نہیں ایسے شخص کی جو چاہے تیرے گھر میں بُرائی، مگر یہی کہ

يُسَبِّحَنَّ أَوْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝۴۵ قَالَ هِيَ رَأُودَ قَتْنِي عَنْ نَفْسِي وَشَرِّهِ

قید میں ڈالا جائے یا عذاب دردناک ، یوسف بولا اسی نے خواہش کی تھی کہ نہ تماموں کی طرح کراؤ

شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا إِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَ

گواہی دی ایک گواہ نے عورت کے لوگوں میں سے، اگر ہے اس کا کرتہ پھٹا آگے سے تو عورت سچی ہے اور

هُوَ مِنَ الْكَاذِبِينَ ۝۴۶ وَإِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَّابَتْ

وہ بڑھوٹا، اور اگر ہے کرتہ اس کا پھٹا پیچھے سے تو یہ جھوٹی ہے

وَهُوَ مِنَ الصَّادِقِينَ ۝۴۷ فَلَمَّا رَأَىٰ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ

اور وہ سچا ہے ، پھر جب دیکھا عزیز نے کرتہ اس کا پھٹا پیچھے سے کہ

إِنَّهُ مِنْ كَيْدِ كُنَّ إِنَّ كَيْدَ كُنَّ عَظِيمٌ ۝۴۸ يُوَسِّفُ أَخْرَضَ

بیشک یہ ایک فریب برقم عورتوں کا، البتہ تمہارا فریب بڑا ہے ، یوسف جانے دے اس

عَنْ هُنَّ أَسَدٌ وَاسْتَغْفِرِي لِزَنِّكِ إِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخَاطِئِينَ ۝۴۹

ذکر کرو، اور عورت تو بخشو اپنا گناہ ، بیشک تو ہی گنہگار تھی ۔

خلاصہ تفسیر

(اور جب اس عورت نے پھر وہی اصرار کیا تو یوسف علیہ السلام وہاں سے جان بچا کر بھاگے اور وہ ان کو پکڑنے کے لئے ان کے پیچھے چلی، اور وہ دونوں آگے پیچھے دروازہ کی طرف دوڑے اور دوڑنے میں جو ان کو پکڑنا چاہا تو اس عورت نے ان کا کرتہ پیچھے سے پھاڑ ڈالا یعنی اس نے کرتہ پکڑ کر کھینچنا چاہا اور یوسف علیہ السلام آگے کی طرف دوڑے تو کرتہ پھٹ گیا، مگر یوسف علیہ السلام دروازے سے باہر نکل گئے، اور عورت بھی ساتھ تھی تو دونوں نے اتفاقاً اس عورت کے شوہر کو دروازے کے پاس دھکڑا پایا، عورت (خاندن کو دیکھ کر سٹ پٹائی اور فوراً بات بننا کر) بولی کہ جو شخص تیری بی بی کے ساتھ بدکاری کا ارادہ کرے اس کی سزا بجز اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ جیل خانے بھیجا جائے یا اور کوئی دردناک سزا ہو (جیسے ضرب جسمانی) یوسف (علیہ السلام) نے کہا کہ یہ جو میری طرف الزام کا اشارہ کرتی ہے بالکل جھوٹی ہے، بلکہ معاملہ برعکس ہے، یہی مجھ سے اپنا مطلب نکالنے کے لئے مجھ کو پھسلاتی تھی اور (اس موقع پر) اس عورت کے خاندان میں سے ایک گواہ نے (جو کہ شیرخوار بچہ تھا اور یوسف علیہ السلام کے معجزے

سے بول پڑا اور آپ کی برائیت پر (شہادت دی) اس بچہ کا بولنا ہی حضرت یوسف علیہ السلام کا ایک معجزہ تھا، اس پر دوسرا معجزہ یہ ہوا کہ اس شیر خوار بچہ نے ایک معقول علامت بتا کر عاقلانہ فیصلہ بھی کیا اور کہا کہ ان کا کرتہ (دیکھو کہاں سے پھٹا ہے) اگر آگے سے پھٹا ہے تو عورت چلی ہو اور یہ بھوٹے اور اگر وہ کرتہ پیچھے سے پھٹا ہے تو عورت جھوٹی ہے اور یہ سچے ہیں، سو جب (عزیز نے) اُن کا کرتہ پیچھے سے پھٹا ہوا دیکھا (عورت سے) کہنے لگا کہ یہ تم عورتوں کی چالاکی ہے، بیشک تمہاری چالاکیاں بھی غضب کی ہوتی ہیں (پھر یوسف علیہ السلام کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا) اے یوسف اس بات کو جانے دو (یعنی اس کا چرچا یا خیال مت کرو) اور (عورت سے کہا کہ) اے عورت تو (یوسف سے) اپنے تصور کی معافی مانگ بیشک ستر تو ہی قصور دار ہے۔

معارف و مسائل

پچھلی آیات میں یہ بیان آیا ہے کہ جس وقت عزیز مصر کی بیوی حضرت یوسف علیہ السلام کو گناہ میں مبتلا کرنے کی کوشش میں مشغول تھی، اور یوسف علیہ السلام اس سے بچ رہے تھے مگر فطری اور غیر خستیا ری خیال کی کشمکش بھی تھی، تو حق تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ پیغمبر کی اعانت کیلئے بطور معجزہ کے کوئی ایسی چیز سامنے کر دی جس نے دل سے وہ غیر خستیا ری خیال بھی نکال ڈالا خواہ وہ چیز اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کی صورت ہو یا وحی الہی کی کوئی آیت۔

آیت مذکورہ میں یہ بتلایا ہے کہ یوسف علیہ السلام اس خلوت گاہ میں اس برہانِ باری کا مشاہدہ کرتے ہی وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے، اور باہر نکلنے کے لئے دروازہ کی طرف دوڑ کر عزیز کی بیوی اُن کو پکڑنے کے لئے پیچھے دوڑی، اور یوسف علیہ السلام کا کرتہ پکڑ کر ان کو باہر جانے سے روکنا چاہا، وہ عزم کے مطابق نہڑ کے تو کرتہ پیچھے سے پھٹ گیا، مگر یوسف علیہ السلام دروازہ سے باہر نکل آئے، اور ان کے پیچھے زلیخا بھی، تاریخی روایتوں میں مذکور ہے کہ دروازہ پر قفل لگا دیا تھا، جب یوسف علیہ السلام دوڑ کر دروازہ پر پہنچے تو خود بخود یہ قفل کھل کر گر گیا۔

جب یہ دونوں دروازے سے باہر آئے تو دیکھا کہ عزیز مصر سامنے کھڑے ہیں، انکی بیوی سہم گئی اور بات یوں بنائی کہ الزام اور تہمت یوسف علیہ السلام پر ڈالنے کے لئے کہا کہ جو شخص آپ کی بیوی کے ساتھ بڑے کام کا ارادہ کرے اس کی سزا اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ اس کو قید میں ڈالا جائے، یا کوئی دوسری جسمانی سخت سزا دی جائے۔

حضرت یوسف علیہ السلام اپنی پیغمبرانہ شرافت کی بناء پر غالباً اس کا راز فاش نہ فرماتے مگر جب اس نے پیش قدمی کر کے یوسف علیہ السلام پر تہمت رکھنے کا اشارہ کیا تو مجبور ہو کر انھوں نے

حقیقت کا اظہار کیا کر ہی کر اود تَنفِي عَنْ نَفْسِي یعنی یہی ہے اپنا مطلب نکالنے کے لئے مجھے پھسلا رہی تھی۔

معاملہ بڑا نازک اور عزیزِ مصر کے لئے اس کا فیصلہ سخت دشوار تھا کہ ان میں سے کسے سچا سمجھے، شہادت اور ثبوت کا کوئی موقع نہ تھا، مگر اللہ جل شانہ جس طرح اپنے برگزیدہ بندوں کو گناہ سے بچا لیتے ہیں اور ان کو محسوس و محفوظ رکھتے ہیں، اسی طرح دنیا میں بھی ان کو رسوائی سے بچانے کا انتظام معجزانہ انداز سے فرمادیتے ہیں، اور عموماً ایسے مواقع پر ایسے چھوٹے بچوں سے کام لیا گیا ہے جو عادتاً بولنے بات کرنے کے قابل نہیں ہوتے، مگر بطور معجزہ ان کو گویائی عطا فرما کر اپنے مقبول بندوں کی برابرت کا اظہار فرمادیتے ہیں، جیسے حضرت مریمؑ پر جب لوگ ہمت باندھنے لگے تو صدف ایمن اور راج قول کے مطابق چالیس کے بچے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے گویائی عطا فرما کر انہی زبان سے والد کی پاکی ظاہر فرمادی، اور قدرت خداوندی کا ایک خاص مظہر سامنے کر دیا، بنی اسرائیل کے ایک بزرگ جسے ریح پر اسی طرح کی ایک ہمت ایک بڑی سازش کے ساتھ باندھی گئی تو نوزائید بچہ نے ان کی برابرت کے لئے شہادت دی، حضرت موسیٰ علیہ السلام پر فرعون کو مشتبہ پیدا ہوا تو فرعون کی بیوی کے بال سنوارنے والی عورت کی چھوٹی بچی کو گویائی عطا ہوئی، اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بچپن میں فرعون کے ہاتھ سے بچایا۔

ٹھیک اسی طرح یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کے مطابق ایک چھوٹے بچہ کو حق تعالیٰ نے گویائی عطا فرمادی، اور وہ بھی نہایت عاقلانہ اور سیکانہ انداز کی، یہ چھوٹا بچہ اسی گھر میں گہوارہ کے اندر پڑا تھا کہ جس کو گمان ہو سکتا تھا کہ وہ ان حرکتوں کو دیکھے اور سمجھے گا، اور پھر اس کو کسی انداز سے بیان بھی کر دے گا، مگر قادرِ مطلق اپنی اطاعت میں مجاہدہ کرنے والوں کی شان ظاہر کرنے کے لئے دنیا کو دکھلا دیتا ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی خفیہ پولیس (سی آئی ڈی) ہے، جو مجرم کو خوب پہچانتی اور اس کے جرائم کا ریکارڈ رکھتی ہے، اور ضرورت کے وقت اس کا اظہار کر دیتی ہے، میدانِ حشر میں حساب کتاب کے وقت انسان اپنی دنیا کی قدیم عادت کی بناء پر جب اپنے جرائم کا اقبال کرنے سے انکار کرے گا تو اسی کے ہاتھ پاؤں اور رکھال اور در و دیوار کو اس کے خلاف گواہ بنا کر کھڑا کر دیا جائے گا، وہ اس کی ایک ایک حرکت کو محشر کے عظیم الشان مجمع کے سامنے کھول کر رکھ دے گا، اُس وقت انسان کو پتہ لگے گا کہ ہاتھ پاؤں اور گھر کے در و دیوار اور حفاظتی انتظامات میں سے کوئی بھی میرا نہ تھا، بلکہ یہ سب رب العزت کے ننھیہ کا زندے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ چھوٹا بچہ جو گہوارہ میں بظاہر اس دنیا کی ہر چیز سے غافل ذلے خبر پڑا تھا وہ

یوسف علیہ السلام کے معجزہ کے طور پر عین اس وقت بول اٹھا جب کہ عزیز مصر اس واقعہ سے کشمکش میں مبتلا تھا۔

پھر یہ بچہ اگر صرف اتنا ہی کہہ دیتا کہ یوسف علیہ السلام بری ہیں زلیخا کا قصور ہو تو وہ بھی ایک معجزہ کی حیثیت سے حضرت یوسف علیہ السلام کے حق میں برائت کی بڑی شہادت ہوتی، مگر اللہ تعالیٰ نے اس بچہ کی زبان پر ایک کیمانہ بات کہلوائی، کہ یوسف علیہ السلام کے کرتے کو دیکھو اگر وہ آگے سے پھٹا ہے تب تو زلیخا کا کہنا سچا اور یوسف علیہ السلام جھوٹے ہو سکتے ہیں، اور اگر وہ پیچھے سے پھٹا ہے تو اس میں اس کے سوا کوئی دوسرا احتمال ہی نہیں کہ یوسف علیہ السلام بھاگ رہے تھے اور زلیخا ان کو روکنا چاہتی تھی۔

یہ ایک ایسی بات تھی کہ بچہ کی گویائی کے اعجاز کے علاوہ خود بھی ہر ایک کی سمجھ میں آسکتی تھی، اور جب بتلائی ہوئی علامت کے مطابق گرتے کا پیچھے سے شق ہونا مشاہدہ کیا گیا تو یوسف علیہ السلام کی برائت ظاہری علامات سے بھی ظاہر ہو گئی۔

شاہد یوسف کی جو تفسیر ہم نے بیان کی ہے کہ وہ ایک چھوٹا بچہ تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے بطور معجزہ گویائی عطا فرمادی، یہ ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو جس کو امام احمد نے اپنے مسند میں اور ابن حبان نے اپنی کتاب صحیح میں اور حاکم نے مستدرک میں نقل کر کے حدیث صحیح قرار دیا ہے، اس حدیث میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چار بچوں کو گہوارہ میں گویائی عطا فرمائی ہے، یہ چاروں وہی ہیں جو ابھی ذکر کئے گئے ہیں، (مظہری) اور بعض روایات میں شاہد کی دوسری تفسیریں بھی نقل کی گئی ہیں، مگر ابن جریر، ابن کثیر وغیرہ ائمہ تفسیر نے پہلی ہی تفسیر کو رائج قرار دیا ہے۔

احکام و مسائل آیات مذکورہ سے چند اہم مسائل اور احکام نکلتے ہیں :-

اول :- آیت **وَأَسْتَبْقَى الْبَابَ** سے یہ معلوم ہوا کہ جس جگہ گناہ میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو، اس جگہ ہی کو چھوڑ دینا چاہئے، جیسا یوسف علیہ السلام نے وہاں سے بھاگ کر اس کا ثبوت دیا۔

دوسرا مسئلہ :- یہ کہ احکام الہیہ کی اطاعت میں انسان پر لازم ہے کہ اپنی مقدور کوشش میں کمی نہ کرے خواہ اس کا نتیجہ بظاہر کچھ برآمد ہوتا نظر نہ آئے، نتائج اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں انسان کا کام اپنی محنت اور مقدور کو اللہ کی راہ میں صرف کر کے اپنی بندگی کا ثبوت دینا ہے، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے دروازے سب بند ہونے اور تاریخی روایت کے مطابق مقفل ہونے کے باوجود دروازہ کی طرف دوڑنے میں اپنی پوری قوت خرچ فرمادی

ایسی صورت میں اللہ جل شانہ کی طرف سے امداد و اعانت کا بھی اکثر مشاہدہ ہوتا ہے کہ بندہ جب اپنی کوشش پوری کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کامیابی کے اسباب بھی مہیا فرما دیتے ہیں، مولانا رومیؒ نے اسی مضمون پر ارشاد فرمایا ہے ۵

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید ۶ خیرہ یوسف وارمی باید دید
ایسی صورت میں اگر ظاہری کامیابی بھی حاصل نہ ہو تو بندہ کے لئے یہ ناکامی بھی کامیابی سے کم نہیں ۵

گر مرادت را مذاق شکرست ۶ نامرادی نے مراد دلبرست
ایک بزرگ عالم جیل میں تھے جبکہ کے روز اپنی قدرت کے مطابق غسل کرتے اور اپنے کپڑے دھو لیتے اور پھر حجہ کے لئے تیار ہو کر جیل خانہ کے دروازے تک جاتے وہاں پہنچ کر عرض کرتے کہ یا اللہ میری قدرت میں اتنا ہی تھا آگے آپ کے اختیار میں ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت عامہ سے کچھ بعید نہ تھا کہ ان کی کرامت سے جیل کا دروازہ کھل جاتا، اور یہ نماز جمعہ ادا کر لیتے، لیکن اس نے اپنی حکمت سے اس بزرگ کو وہ مقام عالی عطا فرمایا جس پر ہزاروں گناہی قربان ہیں کہ ان کے اس عمل کی وجہ سے جیل کا دروازہ نہ کھلا، مگر اس کے باوجود انہوں نے اپنے کام میں ہمت نہیں ہاری، ہر حجہ کو مسلسل یہی عمل جاری رکھا، یہی وہ استقامت ہے، جس کو اکابر صوفیاء نے کرامت سے بالا تر فرمایا ہے۔

تیسرا مسئلہ :- اس سے یہ ثابت ہوا کہ کسی شخص پر کوئی غلط اہمت باندھو تو اپنی صفائی پیش کرنا سنتِ انبیاء ہے، یہ کوئی توکل یا بزرگی نہیں کہ اس وقت خاموش رہ کر اپنے آپ کو مجرم قرار دیدے۔

چوتھا مسئلہ :- اس میں شاہد کا ہے، یہ لفظ جب عام فقہی معاملات اور مقدمات میں بولا جاتا ہے، تو اس سے وہ شخص مراد ہوتا ہے جو زیر نزاع معاملہ کے متعلق اپنا چشم دید کوئی واقعہ بیان کرے، اس آیت میں جبکہ شاہد کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، اس نے کوئی واقعہ یا اس کے متعلق اپنا کوئی مشاہدہ بیان نہیں کیا، بلکہ فیصلہ کرنے کی ایک صورت کی طرف اشارہ کیا ہے، اس کو اصطلاحی طور پر شاہد نہیں کہا جاسکتا۔

مگر ظاہر ہے کہ یہ اصطلاحات سب بعد کے علماء و فقہاء نے افہام و تفہیم کے لئے اختیار کر لی ہیں، قرآن حکیم کی نہ یہ اصطلاحیں ہیں نہ وہ ان کا پابند ہے، قرآن کریم نے یہاں اس شخص کو شاہد اس معنی کے اعتبار سے فرمایا ہے کہ جس طرح شاہد کے بیان سے معاملہ کا تصفیہ آسان ہو جاتا ہے، اور کسی ایک فریق کا حق پر ہونا ثابت ہو جاتا ہے اس بچہ کے

بیان سے بھی یہی فائدہ حاصل ہو گیا، کہ اصل تو اس کی معجزانہ گویائی ہی حضرت یوسف علیہ السلام کی برائے
کے لئے شاہد تھی اور پھر اس نے جو علامات بتلائیں ان کا حاصل بھی انجام کار یوسف علیہ السلام ہی کی
برائے ثابت ہو گیا ہے، اس لئے یہ کہنا صحیح ہو گیا کہ اس نے یوسف علیہ السلام کے حق میں گواہی
دی، حالانکہ اس نے یوسف علیہ السلام کو سچا نہیں کہا، بلکہ دونوں احتمالوں کا ذکر کر دیا تھا،
اور زلیخا کے سچے ہونے کو ایک ایسی صورت میں بھی فرضی طور پر تسلیم کر لیا تھا، جس میں ان کا
سچا ہونا یقینی نہ تھا، بلکہ دوسرا بھی احتمال موجود تھا، کیونکہ کرتے کا سامنے سے پھٹنا دونوں
صورتوں میں ممکن ہے، اور یوسف علیہ السلام کے سچے ہونے کو صرف ایسی صورت میں
تسلیم کیا تھا، جس میں اس کے سوا کوئی دوسرا احتمال ہی نہیں ہو سکتا، لیکن انجام کار نتیجہ
اس حکمت عملی کا یہی تھا کہ یوسف علیہ السلام کا بری ہونا ثابت ہو۔

پانچواں مسئلہ: اس میں یہ ہے کہ مقدمات اور خصوصیات کے فیصلوں میں قرآن
اور علامات سے کام لیا جاسکتا ہے جیسا کہ اس شاہد نے کرتے کے پیچھے سے پھٹنے کو اس کی
علامت قرار دیا کہ یوسف علیہ السلام بھاگ رہے تھے، زلیخا پکڑ رہی تھی، اس معاملہ میں
اتنی بات پر تو سب فقہاء کا اتفاق ہے کہ معاملات کی حقیقت پہچاننے میں علامات اور
قرائن سے ضرور کام لیا جائے جیسا کہ یہاں کیا گیا، لیکن محض علامات و قرائن کو کافی ثبوت
کا درجہ نہیں دیا جاسکتا، واقعہ یوسف علیہ السلام میں بھی درحقیقت برائے ثابت ہو تو
اس سچے کی معجزانہ انداز سے گویائی ہے، علامات و قرائن جن کا ذکر کیا گیا ہے ان سے اس معاملہ
کی تائید ہو گئی۔

بہر حال یہاں تک یہ ثابت ہوا کہ جب زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام پر تہمت
والزام لگایا تو اللہ تعالیٰ نے ایک چھوٹے بچے کو خلاف عادت گویائی دے کر اس کی زبان سے
یہ کیا کہ فیصلہ صادر فرمایا کہ یوسف علیہ السلام کے کرتے کو دیکھو، اگر وہ پیچھے سے پھٹا ہو
تو یہ اس کی عفاف علامت ہے کہ وہ بھاگ رہے تھے، اور زلیخا پکڑ رہی تھی، یوسف علیہ السلام
بے قصور ہیں۔

مذکورہ آیات میں سے آخری دو آیتوں میں یہ بیان ہوا ہے کہ عزیز مصر بچے کے اس طرح
بولنے ہی سے یہ سمجھ چکا تھا کہ یوسف علیہ السلام کی برائے ثابت ظاہر کرنے کے لئے یہ مافوق العاد
صورت پیش آئی ہے، پھر اس کے کہنے کے مطابق جب یہ دیکھا کہ یوسف علیہ السلام کا
کرتہ بھی پیچھے سے ہی پھٹا ہے تو یقین ہو گیا کہ قصور زلیخا کا ہے، یوسف علیہ السلام بری
ہیں، تو اس نے پہلے تو زلیخا کو خطاب کر کے کہا اِنَّكَ كُنْتَ تَتَمَارَكُنْ فِرْعَوْنَ، یعنی یہ سب تمہارا کفر حیلہ ہے،

کہ اپنی خطا دوسرے کے سر ڈالنا چاہتی ہو، پھر کہا کہ عورتوں کا مکر و حیلہ بہت بڑا ہے، کہ اس کو سمجھنا اور اس سے نکلنا آسان نہیں ہوتا، کیونکہ ظاہر ان کا نرم و نازک اور ضعیف ہوتا ہے، دیکھنے والے کو ان کی بات کا یقین جلد آ جاتا ہے، مگر عقل و دیانت کی کمی کے سبب بسا اوقات وہ فریب ہوتا ہے۔ (منظری)

تفسیر قرطبی میں بروایت ابو ہریرہؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورتوں کا کید اور مکر شیطان کے کید و مکر سے بڑھا ہوا ہے، کیونکہ حق تعالیٰ نے شیطان کے کید کے متعلق تو یہ فرمایا ہے کہ وہ ضعیف ہر اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا اور عورتوں کے کید کے متعلق یہ فرمایا کہ اِنَّ كَيْدَ كُنَّ عَظِيْمًا یعنی تمہارا کید بہت بڑا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ اس سے مراد سب عورتیں نہیں بلکہ وہ ہی ہے جو اس طرح کے مکر و حیلہ میں مبتلا ہوں، عزیز مصر نے زلیخا کو اس کی خطابت لانے کے بعد یوسف علیہ السلام سے کہا اِنَّكَ اَعْرَضَ عَنْ هٰذَا یعنی اے یوسف تم اس واقعہ کو نظر انداز کرو، اور کسی سے نہ کہو، تاکہ رسوائی نہ ہو، پھر زلیخا کو خطاب کر کے کہا وَاسْتَغْفِرْ لِيْ اِنَّ نُبُكَ اِنَّكَ كُنْتَ مِنَ الْخٰطِئِيْنَ، یعنی خطا سزا سزا تمہاری ہے، تم اپنی غلطی کی معافی مانگو، اس سے بظاہر یہ مراد ہے کہ وہ اپنے شوہر کی معافی مانگے، اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام سے معافی مانگے، کہ خود خطا کی اور تہمت ان کے سر ڈالی۔

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ شوہر کے سامنے اپنی بیوی کی ایسی خیانت اور جیاتی **فائدہ** ثابت ہو جانے پر اس کا شتعل نہ ہونا اور پورے سکون و اطمینان سے باتیں کرنا انسانی فطرت سے بہت قابل تعجب ہے، اہم قرطبی نے فرمایا کہ یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ عزیز مصر کوئی بے غیرت آدمی ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ حق تعالیٰ نے جس طرح یوسف علیہ السلام کو گناہ سے بچر رسوائی سے بچانے کا فوق العادت انتظام فرمایا، اسی انتظام کا ایک جزو یہ بھی تھا کہ عزیز مصر کو غصہ سے مشتعل نہیں ہونے دیا، ورنہ عام عادت کے مطابق ایسے موقع پر انسان تحقیق و تفتیش کے بغیر ہی ہاتھ چھوڑ بیٹھتا ہے اور زبان سے گالی گلوچ تو معمولی بات ہے، اگر عام انسانی عادت کے مطابق عزیز مصر کو شتعل ہو جاتا تو ممکن ہو کہ اس کے ہاتھ سے یازان سے یوسف علیہ السلام کی شان کے خلاف کوئی بات سرزد ہو جاتی، یہ قدرت حق کے کرشمہ ہیں کہ اطاعت حق پر قائم رہنے والے کی قدم قدم پر کس طرح حفاظت کی جاتی ہے، فتبارک اللہ **حسن الخالقین۔**

بعد کی آیتوں میں اور واقعہ ذکر کیا گیا ہے جو پچھلے قصہ سے ہی وابستہ ہے،

وہ یہ کہ یہ واقعہ چھپانے کے باوجود درباری لوگوں کی عورتوں میں پھیل گیا، ان عورتوں نے عزیز کی بیوی کو لعن تلحٰن کرنا شروع کیا، بعض غیبیہ نے فرمایا کہ یہ پانچ عورتیں عزیز مصر کے قسریٰ افسروں کی بیویاں تھیں۔ (قرطبی، منہری)

یہ عورتیں آپس میں کہنے لگیں کہ دیکھو کیسی ہیرت اور افسوس کی بات ہے کہ عزیز مصر کی بیوی اتنے بڑے مرتبہ پر ہوتے ہوئے اپنے نوجوان غلام پر فریفتہ ہو کر اس سے اپنی مطلب آری چاہتی ہے، ہم تو اس کو بڑی گمراہی پر سمجھتے ہیں، آیت میں لفظ فُتَاہَا فرمایا ہے، فتا کے معنی نوجوان کے ہیں، عرف میں ملوک غلام جب چھوٹا ہو تو اس کو غلام کہتے ہیں، جوان ہو تو لڑکے کو فتّا اور لڑکی کو فتّاء کہا جاتا ہے، اس میں یوسف علیہ السلام کو زلیخا کا غلام یا تو اس وجہ سے کہا گیا کہ شوہر کی چیز کو بھی عادت ہوئی کی چیز کہا جاتا ہے، اور یا اس لئے کہ زلیخا نے یوسف علیہ السلام کو اپنے شوہر سے بطور بہرہ اور تحفہ لے لیا تھا (قرطبی)

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتَاهَا عَنْ

اور کہنے لگیں عورتیں اس شہر میں عزیز کی عورت خواہش کرتی ہو اپنے غلام سے اس کے جی

نَفْسِهِ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا إِنَّا لَنَرَاهَا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿۳۰﴾ فَلَمَّا

کو، فریفتہ ہو گیا اس کا دل اس کی محبت میں ہم تو دیکھتے ہیں اس کو صریح خطا پر پھر جب

سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ أَرْسَلَتْ إِلَيْهِنَّ وَأَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَأً وَ

سنا اس نے ان کا فریب بلوا بھیجا ان کو اور تیار کی ان کے واسطے ایک مجلس اور

أَنْتَ كُلِّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّينًا وَقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ فَلَمَّا

دی ان کو ہر ایک کے ہاتھ میں ایک پتھری اور بولی یوسف محل آ ان کے سامنے، پس جب

رَأَيْنَهُ أَكْبَرْنَهُ وَقَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا هَذَا

دیکھا ان کو ششدر رہ گئیں اور کاٹ ڈالے اپنے ہاتھ اور کہنے لگیں حاشا للہ! نہیں یہ شخص

بَشَرًا إِنَّ هَذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ ﴿۳۱﴾ قَالَتْ فَذَلِكُنَّ الَّذِينَ

آدمی یہ تو کوئی منرشتہ ہے بزرگ، بولی یہ وہی ہے کہ طعنہ دیا تھا تم نے

لَمَسْتَنِي فِيهِ وَلَقَدْ رَاودَنِي عَنْ نَفْسِهِ فاسْتَعْصَمَ وَلَئِن لَّمْ

مجھ کو اس کے واسطے، اور میں نے لینا چاہا تھا اس سے اس کا جی بچھا اس نے تھا اور بیشک اگر

يَفْعَلْ مَا أُمِرَ لَا يَسْجَنَنَّ وَلَيْكُنَّا مِنَ الصَّغِيرِينَ ۝۳۲ قَالَ رَبِّ

نہ کرے گا جو میں اس کو کہتی ہوں تو قید میں پڑ گیا اور ہو گا بے عزت ، یوسف بولا اور

السَّجَنُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ وَإِلَّا تَصْرِفْ عَنِّي

مجھ کو قید پسند ہے اس بات سے جس کی طرف مجھ کو بلاتی ہیں ، اور اگر دفع نہ کرے گا مجھ سے

كَيْدَ هَٰؤُلَاءِ أَصَبَ الْيَمِينَ ۖ وَآكُنُّ مِنَ الْجَاهِلِينَ ۝۳۳ فَاسْتَجَابَ

ان کا فریب تو مائل ہو جاؤں گا ان کی طرف اور ہو جاؤں گا بے عقل ، سو مستبول کر لی

لَهُ رَبُّهُ فَصَرَافَ عَنْهُ كَيْدَهُمْ ۚ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝۳۴

اس کی دعا اس کے رب نے پھر دفع کیا اس سے ان کا فریب ، البتہ وہی ہر سننے والا خبر دار ،

ثُمَّ بَدَّ لَهُم مِّن بَعْدِ مَا رَأَوُا آيَاتِ لَيْسَ جَنَّةُ حَتَّىٰ حِينٍ ۝۳۵

پھر یوں سمجھ میں آیا لوگوں کی ان نشانیوں کے دیکھنے پر کہ قید رکھیں اس کو ایک مدت ۔

خلاصہ تفسیر

اور چند عورتوں نے جو کہ شہر میں رہتی تھیں یہ بات کہی کہ عزیز کی بی بی اپنے غلام کو اس سے اپنا (نا جائز) مطلب حاصل کرنے کے لئے پھسلاتی ہے کیسی کمینہ حرکت ہو کہ غلام پر گرتی ہے ، اس غلام کا عشق اس کے دل میں جگہ پکڑ گیا ہے ۔ ہم تو اس کو صریح غلطی میں دیکھتے ہیں سو جب اس عورت نے ان عورتوں کی بد گوئی (کی خبر) سنی تو کسی کے ہاتھ ان کو بلا بھیجا (کہ تمھاری دعوت ہے) اور ان کے واسطے مسند تکلیہ لگایا اور (جب وہ آئیں اور ان کے سامنے مختلف قسم کے کھانے اور پھل حاضر کئے جن میں بعض چیزیں چاقو سے تراش کر کھانے کی تھیں اس لئے) ہر ایک کو ان میں سے ایک ایک چاقو (بھی) دیدیا (جو ظاہر میں تو پھل تراشنے کا بہانہ تھا ، اور اصل مقصد وہ تھا جو آگے آتا ہو کہ یہ جو اس باختم ہو کر اپنے ہاتھوں کو زخمی کر لیں گی) اور یہ سب سامان درست کر کے یوسف علیہ السلام کو جو کسی دوسرے مکان میں تھے ، کہا کہ ذرا ان کے سامنے تو آ جاؤ (یوسف علیہ السلام یہ سمجھ کر کہ کوئی صیغہ غرض ہو گی یا ہر آگئے) سو عورتوں نے جب ان کو دیکھا تو ان کے جمال سے حیران رہ گئیں اور اس حیرت میں اپنے ہاتھ کاٹ لے (چاقو سے پھل تراش رہی تھیں) یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر ایسی بدحواسی چھائی کہ چاقو ہاتھ پر چل گیا ، اور کہنے لگیں حاش ! یہ شخص آدمی ہرگز نہیں یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے ، وہ عورت بولی تو (دیکھ لو) وہ شخص

یہی ہے جس کے بارے میں تم مجھ کو بُرا بھلا کہتی تھیں کہ اپنے غلام کو چاہتی ہے، اور واقعی میرے
 اس سے اپنا مطلب حاصل کرنے کی خواہش کی تھی مگر یہ پاک صاف رہا اور پھر یوسف علیہ السلام
 کے دھمکانے اور سنانے کو کہا کہ اگر آئندہ میرا کہنا نہ مانے گا (جیسا کہ اب تک نہیں مانا) تو
 بیشک جیل خانہ بھیج دیا جاوے گا اور بے عزت بھی ہوگا (وہ عورتیں بھی یوسف علیہ السلام سے
 کہنے لگیں کہ تم کو اپنی محسن عورت سے ایسی اعتدائی متاں نہیں جو یہ کہے اس کو ماننا چاہتا ہو) یوسف
 (علیہ السلام) نے (یہ باتیں سنی کہ یہ تو سب کی سب اسی کی موافقت کرنے لگیں تو حق تعالیٰ سے)
 دعا کی کہ اے میرے رب جس (ناجائز) کام کی طرف یہ عورتیں مجھے بلا رہی ہیں، اس سے توجیلنا
 میں جانا ہی مجھ کو زیادہ پسند ہے، اور اگر آپ ان کے دائرے کو مجھ سے دفع نہ کریں گے تو میں ان کی
 طرف مائل ہو جاؤں گا، اور نادانی کا کام کر بیٹھوں گا، سو ان کی دعا ان کے رب نے قبول کی
 اور ان عورتوں کے دائرے کو ان سے دور رکھا، بیشک وہ (دعاؤں کا) بڑا سننے والا اور ان کے
 احوال کا خوب جاننے والا ہے (پھر یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی کی مختلف نشانیاں
 دیکھنے کے بعد) جن سے خود تو اس کا پورا یقین ہو گیا، مگر عوام میں چرچا ہو گیا تھا اس کو قطع
 کرنے کی غرض سے، ان لوگوں کو (یعنی عزیز اور اس کے متعلقین کو) یہی مصلحت معلوم ہوئی
 کہ ان کو ایک وقت تک قید میں رکھیں۔

معارف و مسائل

فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ أَرْسَلَتْ إِلَيْهِنَّ، یعنی جب زلیخانے ان عورتوں
 کے مکر کا حال سنا تو ان کو ایک کھانے کی دعوت پر بلا بھیجا۔
 یہاں ان عورتوں کے تذکرہ کرنے کو زلیخانے مکر کہا ہے، حالانکہ بظاہر انہوں نے
 کوئی مکر نہیں کیا تھا، مگر چونکہ خفیہ خفیہ اس کی بدگوئی کرتی تھیں، اس لئے اس کو مکر سے
 تعبیر کیا۔

وَأَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكًا، یعنی ان کے لئے مسند، ٹکیوں سے مجلس آراستہ کی،
 وَأَنْتَ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سَكِينًا، یعنی جب یہ عورتیں آگیاں اور ان کے سامنے
 مختلف قسم کے کھانے اور پھل حاضر کئے جن میں بعض چیسز، چاقو سے تراش کر
 کھانے کی تھیں اس لئے ہر ایک کو ایک ایک تیز چاقو بھی دیا، جس کا ظاہری مقصد تو پھل
 تراشنا تھا، مگر دل میں وہ بات پوشیدہ تھی جو آگے آتی ہے، کہ یہ عورتیں یوسف علیہ السلام
 کو دیکھ کر جو اس باختمہ ہو جائیں گی اور چاقو سے اپنے ہاتھ زخمی کر لیں گی۔

وَقَالَتْ أَخْرِجْ عَلَيَّ فِتْنًا، یعنی یہ سب سامان درست کرنے کے بعد یوسف علیہ السلام سے جو کسی دوسرے مکان میں تھے لے لیا جانے کہا کہ ذرا باہر آ جاؤ، یوسف علیہ السلام کو چونکہ اس کی غرض فاسد معلوم نہ تھی اس لئے باہر اس مجالس میں تشریف لے آئے۔

فَلَمَّا رَأَيْنَهُ أَكْبَرْنَهُ وَقَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا هَذَا بَشَرًا إِنْ هَذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ، یعنی ان عورتوں نے جب یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو ان کے جمال سے حیران رہ گئیں، اور اپنے ہاتھ کاٹ لئے، یعنی پھل تراشے وقت جب یہ حیرت انگیز واقعہ سامنے آیا تو چاقو ہاتھ پر چل گیا، جیسا کہ دوسری طرف خیال بٹ جانے سے اکثر ایسا اتفاق ہو جاتا ہے اور کہنے لگیں کہ خدا کی پناہ یہ شخص آدمی ہرگز نہیں، یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے، مطلب یہ تھا کہ ایسا ذرا نی تو فرشتہ ہی ہو سکتا ہے۔

قَالَتْ فَلْيَنْكِحْنِ الْكَافِرَ لِمَسْتَصْنِئِينَ فِيهِ وَلَقَدْ رَاوَدَتْهُ عَنْ نَفْسِهِ فاسْتَعْصَمَ وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مِمَّا أُمِّرُوا لَنَسِبْنَهُ كَيْدًا مُبِينًا وَالصَّغِيرَاتِ، وہ عورت بولی کہ دیکھو وہ شخص یہی ہے جس کے بارے میں تم مجھے برا بھلا کہتی تھیں، اور واقعی میں نے اس سے اپنا مطلب حاصل کرنے کی خواہش کی تھی، مگر یہ پاک صاف رہا، اور آئندہ یہ میرا کہنا نہ مانے گا تو بیشک جیلخانے بھیجا جائے گا، اور بے عزت بھی ہوگا۔

اس عورت نے جب یہ دیکھا کہ میرا راز ان عورتوں پر فاش تو ہو ہی چکا ہے، اس لئے ان کے سامنے ہی یوسف علیہ السلام کو ڈرانے دھمکانے لگی، بعض مفسرین نے بیان کیا ہے کہ اس وقت یہ سب عورتیں بھی یوسف علیہ السلام کو کہنے لگیں کہ یہ عورت تمہاری محسن ہے اس کی مخالفت نہیں کرنا چاہئے۔

اور قرآن کریم کے بعض الفاظ جو آگے آتے ہیں ان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے مثلاً يَدْعُوْنَہُ اور كَيْدًا مُبِينًا، جن میں چند عورتوں کا قول بصیغہ جمع ذکر کیا گیا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ یہ عورتیں بھی اس کی موافقت اور تائید کر رہی ہیں، اور ان کے مکر و کید سے بچنے کی ظاہری کوئی تدبیر نہ رہی تو پھر اللہ جل شانہ کی طرف ہی رجوع فرمایا اور بارگاہ رب العزت میں عرض کیا رَبِّ السَّجْنِ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ وَإِلَّا تَصْرِفْ عَنِّي كَيْدَهُنَّ أَصْبَبُ إِلَيْهِنَّ وَأَكُنْ مِنَ الْخَاسِرِينَ، یعنی اے میرے پالنے والے یہ عورتیں مجھے جس کام کی طرف دعوت دیتی ہیں اس سے تو مجھے جیل خانہ زیادہ پسند ہے اور اگر آپ ہی ان کے داؤ بیچا کر مجھ سے دفع نہ کریں تو ممکن ہے کہ میں ان کی طرف تل ہو جاؤں، اور نادانی کا کام کر بیٹھوں، یوسف علیہ السلام کا یہ فرمانا کہ جیل خانہ مجھے پسند ہے

کوئی قید و بند کی طلب یا خواہش نہیں بلکہ گناہ کے مقابلہ میں اس دنیوی مصیبت کو آسان سمجھنے کا اظہار ہے، اور بعض روایات میں ہے کہ جب یوسف علیہ السلام قید میں ڈالے گئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آئی کہ آپ نے قید میں اپنے آپ کو خود ڈالا ہے، کیونکہ آپ نے کہا تھا اَلَيْسَ جَنِّیْ اَحَبُّ اِلَیَّ یعنی اس کی نسبت مجھ کو جیل خانہ زیادہ پسند ہے، اور اگر آپ عافیت مانگتے تو آپ کو مکمل عافیت مل جاتی، اس سے معلوم ہوا کہ کسی بڑی مصیبت سے بچنے کے لئے دعا میں یہ کہنا کہ اس سے تو یہ بہتر ہو کہ فلاں چھوٹی مصیبت میں مجھے مبتلا کر دے مناسب نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ سے ہر مصیبت اور بلا کے وقت عافیت ہی مانگنی چاہئے، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صبر کی دعا مانگنے سے ایک شخص کو منع فرمایا کہ صبر تو بلا و مصیبت پر ہوتا ہے تو اللہ سے صبر کی دعا مانگنے کے بجائے عافیت کی دعا مانگو (ترمذی) اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ نے عرض کیا کہ مجھے کوئی دعا تلقین فرمادیجئے، تو آپؐ نے فرمایا کہ اپنے رب کی عافیت کی دعا مانگا کر س، حضرت عباسؓ فرماتے ہیں کہ کچھ عرصہ کے بعد پھر میں نے آپؐ سے تلقین دعا کا سوال کیا، تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے دنیا و آخرت کی عافیت مانگا کر س (منظری طبرانی) اور یہ فرمانا کہ اگر آپؐ ان کے مکر و کید کو دفع نہ کریں گے تو ممکن ہو کہ میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں یہ عصمت نبوت کے خلاف نہیں، کیونکہ عصمت کا تو حاصل ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو گناہ سے بچانے کا تکوینی طور پر انتظام فرما کر اس کو گناہ سے بچالیں، اور گو بمقتضا نبوت یہ مقصد پہلے ہی سے حاصل تھا، مگر پھر بھی غایت خوفِ ادب کی دعا کرنے پر مجبور ہو گئے، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کوئی شخص بغیر خدا تعالیٰ کی امداد و اعانت کے گناہ سے نہیں بچ سکتا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر گناہ کا کام جہالت سے ہوتا ہے، علم کا تقاضا گناہوں کا اجتناب ہے (قرنی) فَاَسْتَجَابَ لَهُ رَبُّهُ فَصَدَّقَهُ بِالْحَقِّ فَبَدَّ لَهُمْ وَكَانَ ثَوْبُهُ حَزَقًا لِّهٖمُ اِنَّهُ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ، یعنی ان کی دعا ان کے رب نے قبول فرمائی، اور ان عورتوں کے مکر و خیال کو ان سے دور رکھا، بیشک وہ بڑا سننے والا اور بڑا جاننے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کے جال سے بچانے کے لئے یہ سامان فرمادیا کہ عزیز مصر اور اس کے دوستوں کو اگرچہ یوسف علیہ السلام کی بزرگی اور تقویٰ و طہارت کی کھلی نشانیاں دکھ کر ان کی پاکی کا یقین ہو چکا تھا، مگر شہر میں اس واقعہ کا چرچا ہونے لگا، اس کو ختم کرنے کے لئے ان کو مصلحت اس میں نظر آئی کہ کچھ عرصہ کے لئے یوسف علیہ السلام کو جیل میں بند کر دیا جائے، تاکہ اپنے گھر میں ان شبہات کا کوئی موقع بھی باقی نہ رہے، اور لوگوں کی زبانوں سے اس کا یہ چرچا ختم ہو جائے، ثُمَّ بَدَأَ لَهُمْ مِنْ اٰیٰتِہٖ مَا رَاَوْا اَلَا یَتُوبُ عَلٰی سَیِّئٰتِہٖمْ یٰحٰیثُ ۙ یعنی پھر

عزیز اور اس کے مشیروں نے مصیبت اس میں سمجھی کہ کچھ عرصہ کے لئے یوسف علیہ السلام کو قید میں رکھا جائے، چنانچہ جیل خانہ میں بھیج دیئے گئے۔

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيْنِ قَالَ أَحَدُهُمَا إِنِّي أَرَانِي أَعْصِرُ

اور داخل ہوتے قید خانہ میں اس کے ساتھ دو جوان، کہنے لگا ان میں سے ایک میں دیکھتا ہوں کہ میں پھڑپھڑاتا ہوں

خَمْرًا هُوَ قَالَ الْآخَرُ إِنِّي أَرَانِي أَعْصِرُ فَوْقَ رَأْسِي خُبْزًا تَأْكُلُ

شراب اور دوسرے نے کہا کہ میں دیکھتا ہوں کہ اٹھارہا ہوں اپنے سر پر روٹی کہ بالور کھاتے

الطَّيْرُ مِنْهُ نَبَأْتُ ابْنَأَ وَبِئْسَ الْكَاذِبُ مِنَ الْمُحْسِنِينَ ۝۳۶ قَالَ

ہیں اس میں سے، بے گناہم کو اس کی تعبیر، ہم دیکھتے ہیں تجھ کو نیکی والا، بولا

لَا يَأْتِيَكُمُ طَعَامٌ تُرْزَقُونَ فِيهِ إِلَّا نَبَأُكُمْ بَأْسًا وَيَلِيقُ بَلَّ أَنْ

نہ آنے پاسے تجھ کو کھانا نہ ہر روز تم کو ملتا ہے مگر بتا چکوں گا تم کو اس کی تعبیر اس کے آنے سے

يَأْتِيَكُمُ طَعَامٌ ذَلِكُمُ مَّا عَذَّبْنِي بِهِ لَوْلَا أَنِّي تُرَكِّتُ مِلَّةَ قَوْمٍ

پہلے یہ علم ہے کہ تجھ کو سکھایا میرے رب نے، میں نے چھوڑا دین اس قوم کا کہ

لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ۝۳۷ وَاتَّبَعَتْ

ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور آخرت سے وہ لوگ منکر ہیں، اور پکڑا میں نے

مِلَّةَ آبَائِي إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ مَا كَانَ لَنَا أَنْ

دین اپنے باپ دادوں کا ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کا، ہمارا کام نہیں کہ شریک

تَشْرِكُ بِاللَّهِ مِنْ شَيْءٍ ذَلِكَ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ عَلَيْنَا وَعَلَى

کریں اللہ کا جس چیز کو یہ فضل ہو اللہ کا ہم پر اور سب لوگوں

النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ۝۳۸ يٰصَاحِبِ

پر لیکن بہت لوگ احسان نہیں مانتے، اے رفیق،

السِّجْنِ ۚ أَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝۳۹

قید خانہ کے، بھلا کئی معبود جدا جدا بہتر یا اللہ اکیلا زبردست،

مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءُ سَمِيُمُوا أَنْتُمْ وَأَبَاؤُكُمْ

کچھ نہیں پوجتے ہو سوائے اس کے مگر نام ہیں جو رکھ لے ہیں تم نے اور تمھارے باپ دادوں نے

مَا أَنزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ إِنْ الْاَلَهُ اَمْرًا اَلَّا تَعْبُدُوْا

ہمیں اتاری اللہ نے کئی کوئی سند، حکومت نہیں تو کسی کی سوائے اللہ کے اس نے فرمادیا کہ نہ پوجو

اَلَّا اٰیٰۤاٰطَ ذٰلِكَ الَّذِیْنَ اَلْقِیْمُوْا لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۴۰﴾

مگر اسی کو یہی ہر رستہ سیدھا، پر بہت لوگ نہیں جانتے،

لِیَصْلَحَی السَّجْنَ اَمَّا اَحَدٌ كَمَا فِیْ سَقِی رِبِّیْۤهٖ خَمْرًا وَاَمَّا الْاٰخَرُ

لے رفیقو! قید خانہ کے، ایک جو ہم دو دنوں میں سو پائے گا اپنے مالک کو شراب اور دوسرا جو ہے سو

فِیْ صَلْبٍ فَمَا كَلَّ الطَّیْرُ مِنْ رَّأْسِیْہٖ فُضِیَ اَلَا مَرُّ الَّذِیْ فِیْہٖ

سولی دیا جائے گا پھر کھائیں گے جانور اس کے سر میں سے، فیصل ہوا وہ کام جس کی تحقیق

تَسْتَفْتِیْنَ ﴿۴۱﴾ وَقَالَ الَّذِیْ خُنَّ اَنَّهُ نَاجٍ مِّنْهُمَا اِذْ كُرُنِیْ

تم چاہتے تھے، اور کہہ دیا یوسف نے اس کو جس کو گمان کیا تھا کہ بچے گا ان دونوں میں میرا ذکر کرنا

عِنْدَ رَبِّكَ ذَا نَسَمَ الشَّیْطٰنُ ذِکْرَ رَبِّیْۤہٗ فَلَبِثَ فِی السَّجَنِ

اپنے مالک کے پاس، سو بھلا دیا اس کو شیطان نے ذکر کرنا اپنے مالک سے پھر رہا قید میں

لِیَضَعَ سِنَیْنَ ﴿۴۲﴾

کئی برس -

خلاصہ تفسیر

اور یوسف (علیہ السلام) کے ساتھ (یعنی اسی زمانے میں) اور بھی دو غلام (بادشاہ کے) جیل خانے میں داخل ہوئے (جن میں ایک ساتھی تھا، دوسرا دوٹی پکانے والا باورچی، اور ان کی قید کا سبب یہ شبہ تھا کہ انھوں نے کھانے میں اور شراب میں زہر ملا کر بادشاہ کو دیا ہے، ان کا مقدمہ زیر تحقیق تھا، اس لئے قید کر دیئے گئے، انھوں نے جو حضرت یوسف علیہ السلام میں بزرگی کے آثار پائے تو، ان میں سے ایک نے (حضرت یوسف علیہ السلام سے) کہا کہ میں اپنے آپ کو خواب میں دیکھتا ہوں کہ (جیسے) شراب (بنانے کے لئے) انگور کا شیرہ، پھول رہا ہوں (اور بادشاہ کو وہ شراب پلا رہا ہوں) اور دوسرے نے کہا کہ میں اپنے آپ کو اس طرح دیکھتا ہوں کہ (جیسے) اپنے سر پر دو ٹیاں لٹے جاتا ہوں (اور) اس میں سے پرندے (نوح نوح کر) نکلتے ہیں، تم کو اس خواب کی (جو ہم دونوں نے دیکھا ہے) تعبیر بتلائیے، آپ ہم کو نیک آدمی معلوم ہوئے ہیں یوسف (علیہ السلام) نے (جب

یہ دیکھا کہ یہ لوگ اعتقاد کے ساتھ میری طرف مائل ہوئے ہیں تو چاہا کہ ان کو سب سے پہلے ایمان کی دعوت دی جائے، اس لئے اول اپنا نبی ہونا ایک معجزہ سے ثابت کرنے کے لئے (فرمایا کہ) (دیکھو) جو کھانا تمھارے پاس آتا ہے جو کہ تم کو کھانے کے لئے (جیل خانے میں) ملتا ہے، میں اس کے آنے سے پہلے اس کی حقیقت تم کو بتلا دیا کرتا ہوں (کہ فلاں چیز آوے گی اور ایسی ایسی ہوگی اور) یہ بتلا دینا اس علم کی بدولت ہے جو مجھ کو میرے رب نے تعلیم فرمایا ہے (یعنی مجھ کو وحی سے معلوم ہو جاتا ہے، تو یہ ایک معجزہ ہے جو دلیل نبوت ہے اور اس وقت یہ معجزہ خاص طور پر اس لئے مناسب تھا کہ جس واقعہ میں قیدیوں نے تعبیر کے لئے ان کی طرف رجوع کیا، وہ واقعہ بھی کھانے ہی سے متعلق تھا، اثبات نبوت کے بعد آگے اثبات توحید کا مضمون بیان فرمایا کہ) میں نے تو ان لوگوں کا مذہب (پہلے ہی سے) چھوڑ رکھا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں لائے اور وہ لوگ آخرت کے بھی مستکر ہیں اور میں نے اپنے ان (بزرگوار) باپ دادوں کا مذہب خستیار کر رکھا ہے ابراہیمؑ کا اور اسحاقؑ کا اور یعقوبؑ کا (علیہم السلام اور اس مذہب کا رکن عظیم یہ ہے کہ) ہم کو کسی طرح زیبا نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی شے کو شریک (عبادت) قرار دیں، یہ (عقیدہ توحید) ہم پر اور (دوسرے) لوگوں پر (بھی) خدا تعالیٰ کا ایک فعل ہے (کہ اس کی بدولت دنیا و آخرت کی فلاح ہے) لیکن اکثر لوگ (اس نعمت کا) شکر (ادا) نہیں کرتے (یعنی توحید کو خستیار نہیں کرتے) اے قید خانہ کے رفیقو! (ذرا سوچ کر بتلاؤ کہ عبادت کے واسطے) متفرق معبود اچھے ہیں یا ایک معبود برحق جو سب سے زبردست ہے وہ اچھا، تم لوگ تو خدا کو چھوڑ کر صرف چند بے حقیقت ناموں کی عبادت کرتے ہو، جن کو تم نے اور تمھارے باپ دادوں نے (آپ ہی) ٹھہرایا ہے، خدا تعالیٰ نے تو ان (کے معبود ہونے) کی کوئی دلیل (غفلتی یا نقلی) بھیجی نہیں (اور) حکم خدا ہی کا ہے، اس نے یہ حکم دیا ہے کہ بجز اس کے اور کسی کی عبادت مت کرو یہی (توحید اور عبادت صرف حق تعالیٰ کے لئے مخصوص کرنا) سیدہ حاطہؓ لائقہ ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے، ایمان کی دعوت و تبلیغ کے بعد اب ان کے خواب کی تعبیر بتاتے ہیں کہ) اے قید خانہ کے رفیقو! تم میں ایک تو (جرم سے بری ہو کر) اپنے آقا کو (بدستور) شراب پلایا کرے گا، اور دوسرا (مجرم قرار پا کر) سولی دیا جائے گا اور اس کے سر کو پرندے (نوح نوح کر) کھا دیں گے، اور جس باپ سے تم پوچھتے تھے وہ اسی طرح مقدر ہو چکا (چنانچہ مقدمہ کی منہج کے بعد اسی طرح ہوا کہ ایک بری ثابت ہوا اور دوسرا مجرم، دونوں جیل خانہ سے بلائے گئے، ایک رہائی کیلئے دوسرا سزا کے لئے) اور (جب وہ لوگ جیل خانہ سے جانے لگے تو) جس شخص پر رہائی کا گمان تھا اس سے یوسف (علیہ السلام) نے فرمایا کہ اپنے آقا کے سامنے میرا بھی تذکرہ کرنا (کہ ایک

شخص بے تصور قید میں ہو، اس نے دعرہ کر لیا، پھر اس کو اپنے آقا سے (یوسف علیہ السلام) کا تذکرہ کرنا شیطان نے بھلا دیا تو اس وجہ سے، قید خانہ میں اور بھی چند سال ان کا رہنا ہوا:

معارف و مسائل

مذکورہ آیات میں حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کا ایک ذیلی واقعہ مذکور ہے، یہ بات آپ بار بار معلوم کر چکے ہیں کہ قرآن حکیم نہ کوئی تاریخی کتاب ہے، نہ قصہ کہانی کی، اس میں جو تاریخی واقعہ یا قصہ ذکر کیا جاتا ہے اس سے مقصود صرف انسان کو عبرت و موعظت اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کے متعلق اہم ہدایات ہوتی ہیں، پورے قرآن اور بے شمار انبیاء علیہم السلام کے واقعات میں صرف ایک ہی قصہ یوسف علیہ السلام ایسا ہے جس کو قرآن نے مسلسل بیان کیا ہے، ورنہ ہر مقام کے مناسب تاریخی واقعہ کا کوئی ضروری جز ذکر کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔

قصہ یوسف علیہ السلام کو اول سے آخر تک دیکھتے تو اس میں سینکڑوں عبرت و موعظت کے مواقع اور انسانی زندگی کے مختلف ادوار کے لئے اہم ہدایتیں ہیں، یہ ذیلی قصہ بھی بہت سی ہدایات اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔

واقعہ یہ ہوا کہ جب یوسف علیہ السلام کی براءت اور پاکی بالکل واضح ہو جانے کے باوجود عزیز مصر اور اس کی بیوی نے بدنامی کا چرچا ختم کرنے کے لئے کچھ عرصہ کے لئے یوسف علیہ السلام کو جیل میں بھیج دینے کا فیصلہ کر لیا، جو درحقیقت یوسف علیہ السلام کی دعا اور خواہش کی تکمیل تھی، کیونکہ عزیز مصر کے گھر میں رہ کر عصمت بچانا ایک سخت مشکل معاملہ ہو گیا تھا۔

یوسف علیہ السلام جیل میں پہنچے تو ساتھ دو مجرم قیدی اور بھی داخل ہوئے، ان میں سے ایک بادشاہ کا ساتھی اور دوسرا باورچی تھا، ابن کثیر نے بحوالہ ائمہ تفسیر لکھا ہے کہ یہ دونوں اس الزام میں گرفتار ہوئے تھے کہ انھوں نے بادشاہ کو کھانے وغیرہ میں زہر دینے کی کوشش کی تھی، مقدمہ زیر تحقیق تھا، اس لئے ان دونوں کو جیل میں رکھا گیا۔

یوسف علیہ السلام جیل میں داخل ہوئے تو اپنے پیغمبرانہ اخلاق اور رحمت و شفقت کے سبب سب قیدیوں کی دلداری اور خبر گیری کرتے تھے، جو بیمار ہو گیا اس کی عیادت اور خدمت کرتے، جس کو غم میں پریشان پایا اس کو تسلی دیتے، صبر کی تلقین اور رہائی کی امید سے اس کا دل بڑھاتے تھے، خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو آرام دینے کی فکر کرتے، اور رات بھر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہتے تھے، اُن کے یہ حالات دیکھ کر جیل کے سب قیدی

آپ کی بزرگی کے متقد ہو گئے، جیل کا افسر بھی متاثر ہوا، اس نے کہا کہ اگر میرے ہتھیار میں ہوتا تو میں آپ کو چھوڑ دیتا، اب اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ آپ کو یہاں کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

جیل کے افسر نے یا قیدیوں میں سے بعض نے حضرت یوسف علیہ السلام سے **وَاِنَّهُ عَجِیْبٌ** اپنی عنایت و محبت کا اظہار کیا، کہ ہمیں آپ سے بہت محبت ہے، تو یوسف

علیہ السلام نے فرمایا کہ خدا کے لئے مجھ سے محبت نہ کرو، کیونکہ جب کسی نے مجھ سے محبت کی ہے تو مجھ پر آفت آتی ہے، بچپن میں میری بھوپنی کو مجھ سے محبت تھی اس کے نتیجہ میں مجھ پر چوری کا الزام لگا، پھر میرے والد نے مجھ سے محبت کی تو بھائیوں کے ہاتھوں کنوئیں کی قید پھر غلامی اور جلا وطنی میں مبتلا ہوا، عزیز کی بیوی نے مجھ سے محبت کی تو اس جیل میں پڑ پڑا (ابن کثیر، منظری)

یہ دو قیدی جو یوسف علیہ السلام کے ساتھ جیل میں گئے تھے ایک روز انہوں نے کہا کہ آپ ہمیں ایک صالح بزرگ معلوم ہوتے ہیں، اس لئے آپ سے ہم اپنی خواب کی تعبیر دریافت کرنا چاہتے ہیں، حضرت ابن عباسؓ اور بعض دوسرے ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ یہ خواب انہوں نے حقیقت دیکھے تھے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ خواب کچھ نہ تھا، محسن یوسف علیہ السلام کی بزرگی اور سچائی کی آزمائش کے لئے خواب بنایا تھا۔

بہر حال ان میں سے ایک یعنی شاہی ساتی نے تو یہ کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں انگور سے شراب نکال رہا ہوں، اور دوسرے یعنی باورچی نے کہا کہ میں نے دیکھا کہ میرے سر پر دوٹیوں کا کوئی ٹوکرا ہے، اس میں سے جانور نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں، اور درخوست کی کہ ہمیں ان دونوں خوابوں کی تعبیر بتلائیے۔

حضرت یوسف علیہ السلام سے خوابوں کی تعبیر دریافت کی جاتی ہے، مگر وہ پیغمبرانہ انداز پر اس سوال کے جواب سے پہلے تبلیغ و دعوتِ ایمان کا کام شروع فرماتے ہیں اور اصولِ دعوت کے ماتحت حکمت و دانشمندی سے کام لے کر سب سے پہلے ان لوگوں کے قلوب میں اپنا اعتماد پیدا کرنے کے لئے اپنے اس معجزے کا ذکر کیا کہ تمہارے لئے جو کھانا تمہارے گھروں سے یا کسی دوسری جگہ سے آتا ہے اس کے آنے سے پہلے ہی میں تمہیں بتلا دیتا ہوں کہ کس قسم کا کھانا اور کیسا اور کتنا اور کس وقت آئے گا، اور وہ ٹھیک اسی طرح نکلتا ہے، **ذٰلِکُمْ مِمَّا عَلَّمَنِی رَبِّیْ**، اور یہ کوئی رمل، جفر، کافن یا کہانت وغیرہ کا شعبہ نہیں، بلکہ میرا رب بذریعہ وحی مجھے بتلا دیتا ہے، میں اس کی اطلاع دیدیتا ہوں، اور یہ ایک کھلا معجزہ تھا جو دلیلِ نبوت اور اعتماد کا بہت بڑا سبب ہے، اس کے بعد اول کفر کی بُرائی اور ملتِ کفر سے اپنی بیزاری بیان کی، اور پھر یہ بھی بتلا دیا کہ میں خاندانِ نبوت ہی کا ایک فرد اور انہی کی

ملت حق کا پابند ہوں، میرے آباء و اجداد ابراہیم واسحاق و یعقوب ہیں، یہ خاندانی شرافت بھی عادتاً انسان کا اعتماد پیدا کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے، اس کے بعد بتلایا کہ ہمارے لئے کسی طرح جائز نہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو اس کی خدائی صفات میں شریک سمجھیں، پھر فرمایا کہ یہ دین حق کی توفیق ہم پر اور سب لوگوں پر اللہ تعالیٰ ہی کا فضل ہے کہ اس نے سلامت فہم عطا فرما کر قبول حق ہمارے لئے آسان کر دیا، مگر بہت سے لوگ اس نعمت کی قدر اور شکر نہیں کرتے، پھر انہی قیصریوں سے سوال کیا کہ اچھا تم ہی بتلاؤ کہ انسان بہت سے پروردگاروں کا پوتا ہو یہ بہتر ہو یا یہ کہ صرف ایک اللہ کا بندہ بنے، جس کا ہر وقت سب پر غالب ہے، پھر بت پرستی کی بُرائی ایک دوسرے طریقہ سے یہ بتلائی کہ تم نے اور تمہارے باپ داداؤں نے کچھ بتوں کو اپنا پروردگار سمجھا ہوا ہے، یہ تو صرف نام ہی نام کے ہیں جو تم نے گھڑ لئے ہیں، نہ ان میں ذاتی صفات اس قابل ہیں کہ ان کو کسی ادنیٰ قوت و طاقت کا مالک سمجھا جائے، کیونکہ وہ سب جس حرکت میں ہیں، یہ بات تو آنکھوں سے مشاہدہ کی ہے، دوسرا راستہ ان کے معبود حق ہونے کا یہ ہو سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی پرستش کے لئے احکام نازل فرمائے، تو اگرچہ مشاہدہ اور ظاہر عقل ان کی خدائی کو تسلیم نہ کرتے، مگر حکم خداوندی کی وجہ سے ہم اپنے مشاہدہ کو چھوڑ کر اللہ کے حکم کی اطاعت کرتے، مگر یہاں وہ بھی نہیں، کیونکہ حق تعالیٰ نے ان کی عبادت کیلئے کوئی حجت و دلیل نازل نہیں فرمائی، بلکہ اس نے یہی بتلایا کہ حکم اور حکومت سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کا حق نہیں اور حکم یہ دیا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، یہی وہ دین قیم ہے جو میرے آباء و اجداد کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا، مگر اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔

یوسف علیہ السلام اپنی تبلیغ و دعوت کے بعد ان لوگوں کے خوابوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ تم میں سے ایک تو رہا ہو جائے گا، اور پھر اپنی ملازمت پر بھی برقرار رہ کر بادشاہ کو شراب پلائے گا، اور دوسرے پر جرم ثابت ہو کر اس کو سولی دی جائے گی، اور جانور اس کا گوشت فوج فوج کر کھائیں گے۔

پیغمبرانہ شفقت | ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ اگرچہ ان دونوں کے خواب الگ الگ تھے اور ہر ایک کی عجیب مثال کی تعبیر متعین تھی، اور یہ بھی متعین تھا کہ شاہی ساقی بری ہو کر اپنی ملازمت پر پھر فائز ہوگا، اور بادشاہ کو سولی دی جائے گی، مگر پیغمبرانہ شفقت و رافت کی وجہ سے متعین کر کے نہیں بتلایا کہ تم میں سے فلاں کو سولی دی جائے گی، تاکہ وہ ابھی سے غم میں نہ گھلے، بلکہ اجمالی طور پر یوں فرمایا کہ تم میں سے ایک رہا ہو جائے گا، اور دوسرے کو سولی دی جائے گی۔ آخر میں فرمایا کہ میں نے تمہارے خوابوں کی تعبیر جو دی ہے محسن الکل اور تمہید سے نہیں

بلکہ یہ خدائی فیصلہ ہو جو مثل نہیں سکتا، جن حضرات مفسرین نے ان لوگوں کے خوابوں کو غلط اور بناوٹی کہا ہے انھوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جب یوسف علیہ السلام نے خوابوں کی تعبیر بتلائی تو وہ دونوں بول اٹھے کہ ہم نے تو کوئی خواب دیکھا نہیں محض بات بنائی تھی، اس پر حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا قَضَىٰ الْأَمْرُ الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتِينَ، چاہے تم نے یہ خواب دیکھا یا نہیں دیکھا اب واقعہ یوں ہی ہوگا، جو بیان کیا گیا ہے، مقصد یہ ہے کہ جھوٹا خواب بنانے کے گناہ کا جو ارتکاب تم نے کیا تھا اب اس کی سزا یہی ہے جو تعبیر خواب میں بیان ہوئی۔

پھر جس شخص کے متعلق یوسف علیہ السلام تعبیر خواب کے ذریعہ یہ سمجھے تھے کہ وہ رہا ہوگا اس سے کہا کہ جب تم آزاد ہو کر جیل سے باہر جاؤ اور شاہی دربار میں رسائی ہو تو اپنے بادشاہ سے میرا بھی ذکر کر دینا کہ وہ بے گناہ قید میں پڑا ہوا ہے، مگر اس شخص کو آزاد ہونے کے بعد یوسف علیہ السلام کی یہ بات یاد نہ رہی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یوسف علیہ السلام کی آزادی کو اور دیر لگی، اور اس واقعہ کے بعد چند سال مزید قید میں رہے، یہاں قرآن میں لفظ **يَضُمُّ** **يَسْنِينَ** آیا ہے، یہ لفظ تین سے لے کر نو تک صادق آتا ہے، بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس واقعہ کے بعد سات سال مزید قید میں رہنے کا اتفاق ہوا۔

احکام و مسائل آیات مذکورہ سے بہت سے احکام و مسائل اور فوائد و ہدایات حاصل ہوتے ہیں، ان میں غور کیجئے۔

پہلا مسئلہ۔ یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام جیل میں بھیجے گئے جو مجرموں اور بد معاشرین کی بستی ہوتی ہے، مگر یوسف علیہ السلام نے ان کے ساتھ بھی حسن اخلاق، حسن معاشرت کا وہ معاملہ کیا جس سے یہ سب گرویدہ ہو گئے، جس سے معلوم ہوا کہ مصلحین کے لئے لازم ہے کہ مجرموں، خطاکاروں سے شفقت و ہمدردی کا معاملہ کر کے ان کو اپنے سے مانوس و مربوط کریں کسی قدم پر منافرت کا اظہار نہ ہونے دیں۔

دوسرا مسئلہ۔ آیت کے جملے **إِنَّا نُرِيكَ مِنَ الْمُسْتَفْتِينَ** سے یہ معلوم ہوا کہ تعبیر خواب ایسے ہی لوگوں سے دریافت کرنا چاہئے جن کے نیک، صالح اور ہمدرد ہونے پر اعتماد ہو۔

تیسرا مسئلہ۔ یہ معلوم ہوا کہ حق کی دعوت دینے والوں اور اصلاح خلق کی خدمت کرنے والوں کا طرز عمل یہ ہونا چاہئے کہ پہلے اپنے حسن اخلاق اور علمی و عملی کمالات کے ذریعہ خلق اللہ پر اپنا اعتماد قائم کریں، خواہ اس میں اُن کو کچھ اپنے کمالات کا اظہار بھی کرنا پڑے، جیسا یوسف علیہ السلام نے اس موقع پر اپنا معجزہ بھی ذکر کیا اور اپنا خاندان نبوت کا ایک فرد ہونا بھی ظاہر کیا

یہ اظہارِ کمال اگر اصلاحِ خلق کی نیت سے ہو اپنی ذاتی بڑائی ثابت کرنے کے لئے نہ ہو تو یہ وہ تزکیۃ نفس نہیں جسکی ممانعت قرآن کریم میں آئی ہے، فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ، یعنی اپنی پاک نفسی کا اظہار نہ کرو (تفسیر منظہری)

چوتھا مسئلہ۔ تبلیغ و ارشاد کا ایک اہم اصول یہ بتلایا گیا ہے کہ داعی اور مصلح کافر صحت ہو کہ ہر وقت ہر حال میں اپنے وظیفہ دعوت و تبلیغ کو سب کاموں سے مقدم رکھے، کوئی اس کے پاس کسی کام کے لئے آئے وہ اپنے اصلی کام کو نہ بھٹولے، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس یہ قیدی تعبیرِ خواب دریافت کرنے کے لئے آئے تو یوسف علیہ السلام نے تعبیرِ خواب کے جواب کے پہلے دعوت و تبلیغ کے ذریعہ ان کو ارشاد و ہدایت کا تحفہ عطا فرمایا، یہ نہ سمجھے کہ دعوت و تبلیغ کسی جلسہ کسی منبر یا اسٹیج ہی پر ہوا کرتی ہے، شخصی ملاقاتوں اور نجی مذاکروں کے ذریعہ یہ کام اس سے زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔

پانچواں مسئلہ۔ بھی اسی ارشاد و اصلاح سے متعلق ہے کہ حکمت کے ساتھ وہ بات کہی جائے جو مخاطب کے دلنشین ہو سکے، جیسا یوسف علیہ السلام نے ان کو یہ دکھلایا کہ مجھے جو کوئی کمال حاصل ہوا وہ اس کا نتیجہ ہے کہ میں نے ملتِ کفر کو چھوڑ کر ملتِ اسلام کو اختیار کیا، اور پھر کفر و شرک کی خرابیاں و لنشیں انداز میں بیان فرمائیں۔

چھٹا مسئلہ۔ یہ اس سے یہ ثابت ہوا کہ جو معاملہ مخاطب کے لئے تکلیف دہ اور ناگوار ہو اور اس کا اظہار ضروری ہو تو مخاطب کے سامنے جہاں تک ممکن ہو ایسے انداز سے ذکر کیا جائے کہ اس کو تکلیف کم سے کم پہنچے، جیسے تعبیرِ خواب میں ایک شخص کی ہلاکت متعین تھی مگر یوسف علیہ السلام نے اس کو مبہم رکھا، یہ متعین کر کے نہیں کہا کہ تم سولی چڑھائے جاؤ گے (ابن کثیر، منظرہری)

ساتواں مسئلہ۔ یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام نے جیل سے رہائی کے لئے اس قیدی سے کہا کہ جب بادشاہ کے پاس جاؤ تو میرا بھی ذکر کرنا کہ وہ بے تصور جیل میں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ کسی مصیبت سے خلاصی کے لئے کسی شخص کو کوشش کا واسطہ بنانا توکل کے خلاف نہیں۔

آٹھواں مسئلہ۔ یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کو اپنے برگزیدہ پیغمبروں کے لئے ہر جائز کوشش بھی پسند نہیں، کہ کسی انسان کو اپنی خلاصی کا ذریعہ بنائیں، ان کے اور حق تعالیٰ کے درمیان کوئی واسطہ نہ ہونا ہی انبیاء کا اصلی مقام ہے، شاید اسی لئے یہ قیدی یوسف علیہ السلام کے اس کہنے کو بھول گیا اور انکو مزید کئی سال جیل میں رہنا پڑا، ایک حدیث میں بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرف اشارہ فرمایا ہے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّي أَرَى سَبْعَ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلْنَ سَبْعَ عِجَافٍ

اور کہا بادشاہ نے میں خواب میں دیکھتا ہوں سات گائیں موی ان کو کھاتی ہیں سات گائیں ذیلی

وَسَبْعٌ مِثْلُ خَضِرٍ وَأَخْرَيْتُ يَأْكُلْنَ أَلْفًا ثَمَرًا

اور سات بالیں ہری اور دوسری سوکھی، اسے دربار والو! تعبیر کہو مجھ سے میرے

رَبِّ يَا أَيُّهَا الْمَلِكُ إِنِّي أَرَى سَبْعَ عِجَافٍ يَأْكُلْنَ سَبْعَ عِجَافٍ

خواب کی اگر ہو ستم خواب کی تعبیر دینے والے، بولے یہ خیالی خواب ہیں،

وَمَا تَحْنُ بِتَأْوِيلِ الْأَحْلَامِ بِغُلَامَيْنِ ۖ وَقَالَ الَّذِي نَسَبَا

اور ہم کو ایسے خوابوں کی تعبیر معلوم نہیں، اور بولا وہ جو بچا تھا ان دونوں

مِنْهُمْ سَاءَ مَا كَرَبْنَا مِمَّنْ كَفَرُوا ۖ تَتْلُوا بَعْضُكُم مِّمَّا تَكْفُرُ ۚ

میں سے اور یاد آگیا اس کو مدت کے بعد میں بتاؤں تم کو اس کی تعبیر سو ستم مجھ کو بھیجو،

يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ أَفْتِنَا فِي سَبْعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلْنَ

جا کر کہا اے یوسف اے سچے! حکم دے ہم کو اس خواب میں سات گائیں موی ان کو کھائیں

سَبْعَ عِجَافٍ وَسَبْعٌ مِثْلُ خَضِرٍ وَأَخْرَيْتُ يَأْكُلْنَ أَلْفًا ثَمَرًا

سات ذیلی اور سات بالیں ہری اور دوسری سوکھی، تاکہ

أَرْجِعَ إِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُونَ ۚ قَالَ تَزِرْ وَرَاءَ ظَهْرِكَ

یجاؤں میں لوگوں کے پاس شاید ان کو معلوم ہو، کہا تم کھیتی کرو گے سات

سِنِينَ دَابَّاجٍ فَمَا حَصَدْتُمْ فَذُرُّهُ فِي سُبُلٍ إِلَّا قَلِيلًا

برس جم کر سو جو کاٹو اس کو چھوڑ دو اس کی بال میں مگر کھوڑا سا

مِمَّا تَأْكُلُونَ ۚ ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَأْكُلْنَ

جو ستم کھاؤ، پھر آئیں گے اس کے بعد سات برس سختی کے کھا جائیں گے جو

مَا قَدَّمْتُمْ لَهُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّا تَحْصِنُونَ ۚ ثُمَّ يَأْتِي

رکھا تم نے ان کے واسطے مگر کھوڑا سا جو روک رکھو گے بچ کے واسطے، پھر آئے گا اس کے

مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ عَامٌ فِيهِ يُغَاثُّ النَّاسُ وَفِيهِ يَعْصَرُونَ ۚ

پھر ایک برس اس میں میٹھ برسے گا لوگوں پر اور اس میں رس پھوڑیں گے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ اَنْتَوْنِي بِئِهٖ فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ اَرْجِعْ اِلٰى

اور کہا بادشاہ نے اے آؤ اس کو میرے پاس، پھر جب پہنچا اس کے پاس بھیجا ہوا آدمی کہا لوٹ جا

رَبِّكَ فَسَّأَلَهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الَّتِي قُطِعْنَ اَيْدِيَهُنَّ اِنَّ

اپنے خاوند کے پاس اور پوچھا اس سے کیا حقیقت ہر ان عورتوں کی جنھوں نے کاٹے تھے ہاتھ اپنی، میرا

رَبِّيْ يَكْذِبُ عَلَيَّ ۝۵

رب تو ان کا فریب سب جانتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

اور بادشاہ مصر نے بھی ایک خواب دیکھا اور ارکانِ دولت کو جمع کر کے ان سے کہا کہ

میں (خواب میں کیا) دیکھتا ہوں کہ سات گائیں فرسہ ہیں جن کو سات لاغر گائیں کھا گئیں، اور

سات بالیں سبز ہیں اور ان کے علاوہ سات اور ہیں جو کہ خشک ہیں (اور خشک بالوں نے اسی

طرح ان سات سبز پر لپٹ کر ان کو خشک کر دیا) اے دربار والو اگر تم (خواب کی) تعبیر دیکھتے

ہو تو میرے اس خواب کے بارے میں مجھ کو جواب دو وہ لوگ کہنے لگے کہ (اول تو یہ کوئی خواب

ہی نہیں جس سے آپ فکر میں پڑیں) یونہی پریشان خیالات ہیں اور (دوسرے) ہم لوگ رکہ امور

سلطنت میں ماہر ہیں (خوابوں کی تعبیر کا علم بھی نہیں رکھتے) دو جواب اس لئے دیئے کہ اول جواب

سے بادشاہ کے قلب پریشانی اور دسوا اس دور کرنا ہے، اور دوسرے جواب سے اپنا عذر

ظاہر کرنا ہے، خلاصہ یہ کہ اول تو ایسی خواب قابلِ تعبیر نہیں دوسرے ہم اس فن سے واقف

نہیں) اور ان (مذکورہ) رد قیدیوں میں سے جو رہا ہو گیا تھا (وہ مجلس میں حاضر تھا) اس نے کہا

اور مدت کے بعد اس کو (یوسفؑ کی وصیت کا) خیال آیا میں اس کی تعبیر کی خبر لائے دیتا ہوں،

آپ لوگ مجھ کو ذرا جانے کی اجازت دیجئے (چنانچہ دربار سے اجازت ہوئی اور وہ قید خانہ

میں یوسفؑ کے پاس پہنچا اور جا کر کہا) اے یوسف اے صدق مجسم آپ ہم لوگوں کو اس (خواب)

کا جواب (یعنی تعبیر) دیجئے کہ سات گائیں موتی ہیں ان کو سات دُبی گائیں کھا گئیں اور سات

بالیں ہری ہیں اور اس کے علاوہ (سات) خشک بھی ہیں (کہ ان خشک کے لپٹنے سے وہ ہری

بھی خشک ہو گئیں آپ تعبیر بتلائیے) تاکہ میں (جنھوں نے مجھ کو بھیجا ہے) ان لوگوں کے پاس

لوٹ کر جاؤں (اور بیان کروں) تاکہ اس کی تعبیر اور اس سے آپ کا حال) ان کو بھی معلوم ہو جائے

(تعبیر کے موافق عمل راہ کریں اور آپ کی خلاصی کی کوئی صورت نکلے) آپ نے فرمایا کہ (ان سات

فریہ گایوں اور سات سبز بالوں سے مراد پیداوار اور بارش کے سال ہیں (تھ سات سال متواتر خوب غلہ بونا پھر جو فصل کاٹو اس کو بالوں ہی میں رہنے دینا تاکہ گھن نہ لگ جاوے) ہاں مگر تھوڑا سا جو تھارے کھانے میں آوے (وہ بالوں میں سے نکالا ہی جاوے گا) پھر اس (سات برس) کے بعد سات برس ایسے سخت (اور قحط کے) آویں گے جو کہ اس (تھامتر) ذخیرہ کو کھا جاویں گے جس کو تم نے ان برسوں کے واسطے جمع کر کے رکھا ہوگا، ہاں مگر تھوڑا سا جو (بچ کے واسطے) رکھ چھوڑ دے (وہ البتہ بچ جاوے گا، اور ان خشک بالوں اور ڈبلی گایوں سے اشارہ ان سات سال کی طرف ہے) پھر اس (سات برس) کے بعد ایک برس ایسا آوے گا جس میں لوگوں کے لئے خوب بارش ہوگی اور اس میں رواج اس کے کہ انگور کثرت سے پھلیں گے، شیرہ بھی پھوڑیں گے (اور شرابیں پیئیں گے) غرض، وہ شخص تعبیر لیکر دربار میں پہنچا، اور (جا کر بیان کیا) بادشاہ نے (جو سنا تو آپ کے علم و فضل کا محقق ہوا اور) حکم دیا کہ ان کو میرے پاس لاؤ (چنانچہ یہاں سے قاصد چلا) پھر جب ان کے پاس قاصد پہنچا (اور پیغام دیا تو) آپ نے فرمایا کہ (جب تک میرا اس تھمت سے بری ہونا اور بے قصور ہونا ثابت نہ ہو جائے گا میں نہ آؤں گا) تو اپنی سرکار کے پاس لوٹ جا پھر اس سے دریافت کر کہ (کچھ تم کو خبر ہے) ان عورتوں کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے (مطلب یہ تھا کہ ان کو بلا کر اس واقعہ کی جس میں مجھ کو قید کی گئی تفتیش و تحقیق کی جاوے، اور عورتوں کے حال سے مراد ان کا واقف یا ناواقف ہونا ہے حال یوسف سے اور ان عورتوں کی تخصیص شاید اس لئے کی ہو کہ ان کے سامنے زلیخانے اقرار کیا تھا، وَ لَقَدْ زَاوَدْتُهُمْ عَنْ أَنْفُسِهِمْ فَاِشْتَعَصَمُوا مِنْهُمْ فَمِنْ حَوْلِهَا عَمَلٌ غُلَبَاتٌ يَحْكُمُ مِنْهُمْ وَ قَدْ كُنَّا أَكْثَرًا مُّحْسِنِينَ) ان عورتوں کے فرقہ کے فریب کو خوب جانتا ہے (یعنی اللہ کو تو معلوم ہی ہے کہ زلیخانہ کا بھج پر تھمت لگانا کیڈ تھا، مگر عند الناس بھی اس کی تہنق ہو جانا مناسب ہے چنانچہ بادشاہ نے ان عورتوں کو حاضر کیا) :

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں یہ بیان ہے کہ پھر حق تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کی رہائی کے لئے پردہ غیب سے ایک صورت یہ پیدا فرمائی کہ بادشاہ مصر نے ایک خواب دیکھا جس سے پریشان ہوا، اپنی مملکت کے تعبیر دینے والے اہل علم اور کاہنوں کو جمع کر کے تعبیر خواب دریافت کی، وہ خواب کسی کی سمجھ میں نہ آیا سب نے یہ جواب دیدیا کہ اَضْغَاثُ أَحْلَامٍ وَمَا نَحْنُ بِتَأْوِيلِ الْأَحْلَامِ بِعِلْمَيْنِ، اضغاث، ضغث کی جمع ہے، جو ایسی گٹھڑی کو کہا جاتا ہے جس میں مختلف قسم کے خس و خاشاک گھاس پھوس جمع ہوں، محض یہ تھے کہ یہ خواب کچھ ملی جلی ہے،

جس میں خیالات وغیرہ شامل ہیں، اور ہم ایسے خوابوں کی تعبیر نہیں جانتے، کوئی صحیح خواب ہوتا تو تعبیر بیان کر دیتے۔

اس واقعہ کو دیکھ کر مدت مدید کے بعد اس رہا شدہ قیدی کو یوسف علیہ السلام کی بات یاد آئی اور اس نے آگے بڑھ کر کہا کہ میں آپ کو اس خواب کی تعبیر بتلا سکوں گا، اس وقت اس نے یوسف علیہ السلام کے کمالات اور تعبیر خواب میں مہارت اور پھر مظلوم ہو کر قید میں گرفتار ہونے کا ذکر کر کے یہ چاہا کہ مجھے جیل خانہ میں ان سے ملنے کی اجازت دی جائے، بادشاہ نے اس کا انتظام کیا وہ یوسف علیہ السلام کے پاس حاضر ہوا، قرآن کریم نے اس تمام واقعہ کو صرف ایک لفظ **فَاذْكُرْ** فرما کر بیان کیا ہے، جس کے معنی ہیں مجھے بھیج دو، یوسف علیہ السلام کا تذکرہ پھر سرکاری منظوری اور پھر جیل خانہ تک پہنچنا یہ واقعات خود ضمنی طور پر سمجھ میں آجاتے ہیں، اس لئے ان کی تصریح کی ضرورت نہیں تھی بلکہ یہ بیان شروع کیا:

يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ، یعنی اس شخص نے جیل خانہ پہنچ کر حضرت یوسف علیہ السلام سے واقعہ کا اظہار اس طرح شروع کیا کہ پہلے یوسف علیہ السلام کے صدیق یعنی قول و فعل میں سچا ہونے کا اقرار کیا، پھر درخواست کی کہ مجھے ایک خواب کی تعبیر بتلائیے، خواب یہ ہے کہ بادشاہ نے یہ دیکھا ہے کہ سات بیل فرہ تندرست ہیں جن کو دوسرے سات بیل کھا رہے ہیں اور یہ کھانے والے بیل لاغر و کمزور ہیں، نیز یہ دیکھا کہ سات خوشے گندم کے سر سبز رہے بھوٹے ہیں اور سات خشک ہیں۔

اس شخص نے خواب بیان کرنے کے بعد کہا، **لَعَلِّي آسَجِمْ إِلَى النَّاسِ كَعَلَّمْتُمْ** **يَعْلَمُونَ**، یعنی آپ تعبیر بتلا دیں گے تو ممکن ہو کہ میں ان لوگوں کے پاس جاؤں اور ان کو تعبیر بتلاؤں اور ممکن ہے کہ وہ اس طرح آپ کے فضل و کمال سے واقف ہو جائیں۔

تفسیر منہری میں ہے کہ واقعات کی جو صورتیں عالم مثال میں ہوتی ہیں وہی انسان کو خواب میں نظر آتی ہیں، اس عالم میں ان صورتوں کے خاص معنی ہوتے ہیں، فن تعبیر خواب کا سارا مدار اس کے جاننے پر ہے کہ فلاں صورت مثالی سے اس عالم میں کیا مراد ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ فن مکمل عطا فرمایا تھا، آپ نے خواب سن کر سمجھ لیا کہ سات بیل فرہ اور سات خوشے ہرے بھرے سے مراد سات سال ہیں جن میں پیداوار حسب دستور خوب ہوگی، کیونکہ بیل کو زمین کے ہموار کرنے اور غلہ اگھانے میں خاص دخل ہے، اسی طرح سات بیل لاغر کمزور اور سات خشک خوشوں سے مراد یہ ہو کہ پہلے سات سال کے بعد سات سال سخت قحط کے آئیں گے، اور کمزور سات بیلوں کے فرہ بیلوں کے کھالینے سے یہ مراد ہے کہ پہلے

سات سال میں جو ذخیرہ غلہ وغیرہ کا جمع ہوگا وہ سب ان قحط کے سالوں میں خرچ ہو جائے گا ہر بیج کے لئے کچھ غلہ بچے گا۔

بادشاہ کے خواب میں تو بظاہر اتنا ہی معلوم ہوا تھا کہ سات سال اچھی پیداوار کے ہونگے پھر سات سال قحط کے، مگر حضرت یوسف علیہ السلام نے اس پر ایک اضافہ یہ بھی بیان فرمایا کہ قحط کے سال کے بعد پھر ایک سال خوب بارش اور پیداوار کا ہوگا، اس کا علم یوسف علیہ السلام کو یا تو اس سے ہوا کہ جب قحط کے سال مکمل سات ہی ہیں تو عادتہ اللہ کے مطابق آٹھواں سال بارش اور پیداوار کا ہوگا، اور حضرت قتادہؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی یوسف علیہ السلام کو اس پر مطلع کر دیا تاکہ تعبیر خواب سے بھی کچھ زیادہ خبر ان کو پہنچے، جس سے یوسف علیہ السلام کا فضل و کمال ظاہر ہو کر ان کی رہائی کا سبب بنے، اور اس پر مزید یہ ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے صرف تعبیر خواب ہی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اس کے ساتھ ایک حکیمانہ اور بہرہ ورانہ مشورہ بھی دیا، وہ یہ کہ پہلے سات سال میں جو زیادہ پیداوار ہو اس کو گندم کے خوشوں ہی میں محفوظ رکھنا، تاکہ گندم کو پُرانا ہونے کے بعد کھڑا نہ لگ جائے، یہ تجربہ کی بات ہے کہ جب تک غلہ خوشہ کے اندر رہتا ہے غلہ کو کھڑا نہیں لگتا۔

ثُمَّ يَأْتِي سَبْعٌ مِّنْ أَشْيَا يَأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ، یعنی پہلے سات سال کے بعد پھر سات سال سخت خشک سالی اور قحط کے آئیں گے، جو پچھلے جمع کئے ہوئے ذخیرہ کو کھا جائیں گے خواب میں چونکہ یہ دیکھا تھا کہ ضعیف کمزور بیلوں نے فریاد اور قوی بیلوں کو کھالیا، اس لئے تعبیر خواب میں اس کے مناسب یہی فرمایا کہ قحط کے سال پچھلے سالوں کے جمع کردہ ذخیرہ کو کھا جائیں گے، اگرچہ سال تو کوئی کھانے والی چیز نہیں، مراد یہی ہے کہ انسان اور جانور قحط کے سالوں میں پچھلے ذخیرہ کو کھالیں گے۔

قصہ کے سیاق سے ظاہر ہے کہ یہ شخص تعبیر خواب یوسف علیہ السلام سے معلوم کر کے لوٹا اور بادشاہ کو خبر دی وہ اس سے مطمئن اور حضرت یوسف علیہ السلام کے فضل و کمال کا مستعد ہو گیا، مگر قرآن کریم نے ان سب چیزوں کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی، کیونکہ یہ خود بخود مفہوم ہو سکتی ہیں، اس کے بعد کا واقعہ اس طرح بیان فرمایا،

وَقَالَ الْمَلِكُ اَتَأْتُوْنِي بِهٖ، یعنی بادشاہ نے حکم دیا کہ یوسف علیہ السلام کو جیل خانہ سے نکالا جائے، اور دربار میں لایا جائے، چنانچہ بادشاہ کا کوئی قاصد بادشاہ کا یہ پیغام لے کر جیل خانہ پہنچا۔

موقع بظاہر اس کا تھا کہ یوسف علیہ السلام جیل خانہ کی طویل مدت سے عاجز آرہے تھے

اور خلاصی چاہتے تھے، جب بادشاہ کا پیغام بلانے کے لئے پہنچا تو فوراً تیار ہو کر ساتھ چل ریتے، مگر اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو جو مقام بلند عطا فرماتے ہیں اس کو دوسرے لوگ سمجھ بھی نہیں سکتے، اس قاصد کو جواب یہ دیا:

قَالَ ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَسَأَلَ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الَّتِي تَقْلَعْنَ أَيْدِيَهُنَّ إِنَّ رَبِّي بِبُكْيِهِنَّ عَلِيمٌ ۚ یعنی یوسف علیہ السلام نے قاصد سے کہا کہ تم اپنے بادشاہ کے پاس واپس جا کر پہلے یہ دریافت کرو کہ آپ کے نزدیک ان عورتوں کا معاملہ کس طرح ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے، کیا اس واقعہ میں وہ مجھے مشتبہ سمجھتے ہیں اور میرا کوئی قصور قرار دیتے ہیں یہاں یہ بات بھی غور طلب ہو کہ اس وقت یوسف علیہ السلام نے ان عورتوں کا ذکر فرمایا جنہوں نے ہاتھ کاٹ لئے تھے، عزیز کی بیوی کا نام نہیں لیا، جو اصل سبب تھی، اس میں اس حق کی رعایت تھی جو عزیز کے گھر میں پرورش پانے سے فطرۃ شریف انسان کے لئے قابل لحاظ ہوتا ہے (قرطبی)

اور ایک بات یہ بھی ہو کہ اصل مقصود اپنی برائت کا ثبوت تھا، وہ ان عورتوں سے بھی ہو سکتا تھا، اور اس میں عورتوں کی بھی کوئی زیادہ رسوائی نہ تھی، اگر وہ سچی بات کا اقرار بھی کر لیتیں تو صرف مشورہ ہی کی مجرم ٹھہرتیں، بخلاف عزیز کی بیوی کے کہ اس کو تحقیقات کا ہدف بنایا جانا، تو اس کی رسوائی زیادہ تھی، اور اس کے ساتھ ہی یوسف علیہ السلام نے فرمایا اِنَّ رَبِّي بِبُكْيِهِنَّ عَلِيمٌ ۚ، یعنی میرا پروردگار تو ان کے جھوٹ اور مکر و فریب کو جانتا ہی ہو میں چاہتا ہوں کہ بادشاہ بھی حقیقت واقعہ سے واقف ہو جائیں، جس میں ایک لطیف انداز سے اپنی برائت کا اظہار بھی ہے۔

اس موقع پر صحیح بخاری اور جامع ترمذی میں بروایت حضرت ابو ہریرہؓ ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ اگر میں اتنی مدت جیل میں رہتا جتنا یوسف علیہ السلام رہے ہیں اور پھر مجھے رہائی کے لئے بلایا جاتا تو فوراً قبول کر لیتا۔

اور امام طبرسیؒ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ یوسفؑ کا صبر و تحمل اور مکارم اخلاق قابل تعجب ہیں، جب اُن سے جیل میں بادشاہ کے خواب کی تفسیر دریافت کی گئی اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو تعبیر بتلانے میں یہ شرط لگاتا کہ پہلے جیل سے نکال دو پھر تعبیر بتلاؤں گا، پھر جب قاصد رہائی کا پیغام لایا اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو فوراً جیل کے دروازے کی طرف چل دیتا (قرطبی) اس حدیث میں یہ بات قابل غور ہو کہ منشاء حدیث کا یوسف علیہ السلام کے صبر و تحمل اور مکارم اخلاق کی تعریف و مدح کرنا ہے، مگر اس کے بالمقابل جس صورت حال کو

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف منسوب کر کے فرمایا کہ میں ہوتا تو دیر نہ کرتا، اگر اس کا مطلب یہ ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت یوسف علیہ السلام کے اس ہرزعل کو افضل فرما رہے ہیں اور اپنی شان میں فرماتے ہیں کہ میں ہوتا تو اس افضل پر عمل نہ کرتا، بلکہ اس کے مقابلہ میں مفضول کو اختیار کر لیتا، جو بظاہر فضل الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے شایان شان نہیں، تو اس کے جواب میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ تمام انبیاء میں افضل ہیں، مگر کسی جزوی عمل میں کسی دوسرے پیغمبر کی افضلیت اس کے منافی نہیں۔

اس کے علاوہ جیسا تفسیر قرطبی میں فرمایا گیا ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کے طریق کار میں ان کے صبر و تحمل اور مکارم اخلاق کا عظیم نشان ثبوت ہے، اور وہ اپنی حسیہ قابل تعریف ہے، لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طریق کار کو اپنی طرف منسوب فرمایا تعلیم امت اور خیر خواہی عوام کے لئے وہی مناسب اور افضل ہے، کیونکہ بادشاہوں کے مزاج کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا، ایسے موقع پر شرطیں لگانا یادیر کرنا عام لوگوں کے لئے مناسب نہیں ہوتا، احتمال ہے کہ بادشاہ کی رائے بدل جاتے اور پھر یہ جیل کی مصیبت بدستور قائم رہے، یوسف علیہ السلام کو تو بوجہ رسول خدا ہونے کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ علم بھی ہو سکتا ہے کہ اس تاخیر سے کچھ نقصان نہیں ہوگا، لیکن دوسروں کو تو یہ درجہ حاصل نہیں، رحمتہ للعالمین کے مزاج و مذاق میں عامۃ خلایق کی بہبود کی اہمیت زیادہ تھی، اس لئے فرمایا کہ مجھے یہ موقع ملتا تو دیر نہ کرتا۔ واللہ اعلم۔

قَالَ مَا خَطْبُكَ إِذْ رَأَوْدُشَنَّ يَوْسُفَ عَنْ نَفْسِهِ قُلْنَ حَاشَ

کہا بادشاہ نے عورتوں کو کیا حقیقت ہو متحاری جب تم نے پھسلایا یوسف کو اس کے نفس کی حفاظت، بولیں

لِللّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْءٍ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيزِ اَلَسْ

حاشا للہ ہم کو معلوم نہیں اس پر کچھ بُرائی، بولی عورت عزیز کی اب کھٹ گئی تھی

حَصَّصَ الْخَوْنَ زَانَا رَاوْدَتْهُ عَنْ نَفْسِهِ وَاِنَّهٗ لَمِنَ

بات، میں نے پھسلایا تھا اس کو اس کے جی سے اور وہ

الصِّدِّقِیْنَ ۝ ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّیْ لَمْ اَخْنَهُ بِالْغِیْبِ وَاَنَّ

سچا ہے، یوسف نے کہا یہ اس واسطے کہ عزیز معلوم کر لے کہ میں نے اس کی چوری نہیں کی

اَللّٰهُ لَا يَهْدِیْ كَيْدَ النَّاعِمِیْنَ ۝۵۲

پھلکا دے کہ اللہ نہیں چلاتا فریب دغا بازوں کا۔

خلاصہ تفسیر

کہا کہ تمہارا کیا واقعہ ہے جب تم نے یوسف (علیہ السلام) سے اپنے مطلب کی خواہش کی یعنی ایک نے خواہش کی اور بقیہ نے اس کی مدد کی، کہ اعانتِ فعل بھی مثل فعل کے ہی، اس وقت تم کو کیا تحقیق ہوا، شاید بادشاہ نے اس طور پر اس لئے پوچھا ہو کہ مجرم سن لے کہ بادشاہ کو اتنی بات معلوم ہے کہ کسی عورت نے ان سے اپنا مطلب پورا کرنے کی بات کی تھی، شاید اس کا نام بھی معلوم ہو، اس حالت میں انکار نہ چل سکے گا، پس اس طرح شاید خود اقرار کر لے، عورتوں نے جواب دیا کہ عائشہ لشر ہم کو ان میں ذرا بھی تو بُرائی کی بات نہیں معلوم ہوئی ردہ بالکل پاک صاف ہیں، شاید عورتوں نے زلیخا کا وہ اقرار اس لئے ظاہر نہ کیا ہو کہ مقصود یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی کا ثبوت تھا اور وہ حاصل ہو گیا، یا زلیخا کے رد برد ہونے سے حیا مانع ہوئی کہ اس کا نام لیں، عزیز کی بی بی (جو کہ حاضر تھی) کہنے لگی کہ اب تو سچی بات (سب سے) ظاہر ہو رہی تھی (اب اخفاء بیکار ہی سچ یہی ہے) میں نے ان سے اپنے مطلب کی خواہش کی تھی (نہ کہ انہوں نے جیسا میں نے الزام لگا دیا تھا، ماجرا من الخ) اور بیشک وہی سچے ہیں (اور غالباً ایسے امر کا اقرار کر لینا بھوری کی حالت میں زلیخا کو پیش آیا، غرض تمام صورت مقدمہ اور اظہارات اور یوسف علیہ السلام کی برارت کا ثبوت ان کے پاس کہلا کر بھیجا اس وقت) یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ تمام اہتمام (جو میں نے کیا) محض اس وجہ سے تھا تاکہ عزیز کو (زائد) یقین کے ساتھ معلوم ہو جاوے کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں اس کی آبرو میں دست اندازی نہیں کی اور (بھی معلوم ہو جائے) کہ اللہ خیانت کرنے والوں کے فریب کو چلنے نہیں دیتا (چنانچہ زلیخا نے عزیز کی حرمت میں خیانت کی تھی کہ دوسرے پر نگاہ کی، خدا نے اس کی قلعی کھول دی، پس میری غرض یہ تھی) :

معارف و مسائل

حضرت یوسف علیہ السلام کو جب شاہی قاصد رہائی کا پیغام دے کر بلانے کے لئے آیا اور انہوں نے قاصد کو یہ جواب دیا کہ پہلے ان عورتوں سے میرے معاملہ کی تحقیق کر لو جنہوں نے ہاتھ کاٹ لئے تھے، اس میں بہت سی حکمتیں مضمر تھیں، اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کو جیسے دین کامل عطا فرماتے ہیں ایسے ہی عقل کامل اور معاملات و حالات کی پوری بصیرت بھی عطا فرماتے ہیں، یوسف علیہ السلام نے شاہی پیغام سے یہ اندازہ کر لیا کہ اب جیل سے رہائی کے بعد بادشاہ مصر مجھے کوئی

اعزاز دیں گے، اس وقت دشمنی کا تقاضا یہ تھا کہ جس عیب کی تہمت ان پر لگائی گئی تھی اور جس کی وجہ سے جیل میں ڈالا گیا تھا اس کی حقیقت بادشاہ اور سب لوگوں پر پوری طرح واضح ہو اور ان کی براہت میں کسی کو شبہ نہ رہے، ورنہ اس کا انجام یہ ہو گا کہ شاہی اعزاز سے لوگوں کی زبانیں تو بند ہو جائیں گی، مگر ان کے دلوں میں یہ خیالات کھٹکتے رہیں گے کہ یہ وہی شخص ہے جس نے اپنے آقا کی بیوی پر دست درازی کی تھی، اور ایسے حالات کا پیدا ہو جانا بھی شاہی درباروں میں کچھ بعید نہیں کہ کسی وقت بادشاہ بھی لوگوں کے ایسے خیالات سے متاثر ہو جائے، اس لئے رہائی سے پہلے اس معاملہ کی صفائی اور تحقیق کو ضروری سمجھا، اور مذکورہ صدر روایتوں میں سے دوسری آیت میں خود یوسف علیہ السلام نے اپنے اس عمل اور رہائی میں تاخیر کرنے کی دو حکمتیں بیان فرمائی ہیں۔

اول یہ کہ ذَلِكَ لِيَعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنِّهُ بِالْغَيْبِ، یعنی یہ تاخیر میں نے اس لئے کی کہ عزیز مصر کو یقین ہو جائے کہ میں نے اس کی غیر موجودگی میں اس کے جس میں کوئی خیانت نہیں کی۔ عزیز مصر کی یقین دہانی کی زیادہ فکر اس لئے ہوئی کہ یہ بہت بُری صورت ہوگی کہ عزیز مصر کے دل میں میری طرف سے شبہات رہیں، اور پھر شاہی اعزاز کی وجہ سے وہ کچھ نہ کہہ سکیں، تو ان کو میرا اعزاز بھی سخت ناگوار ہوگا، اور اس پر سکوت ان کے لئے اور زیادہ تکلیف دہ ہوگا وہ چونکہ ایک زمانہ تک آقا کی حیثیت میں رہ چکا تھا، اس لئے یوسف علیہ السلام کی شرافت نفس نے اس کی اذیت کو گوارا نہ کیا، اور یہ بھی ظاہر تھا کہ جب عزیز مصر کو برائت کا یقین ہو جائے تو دوسرے لوگوں کی زبانیں خود بند ہو جائیں گی۔

دوسری حکمت یہ ارشاد فرمائی وَأَنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْغَافِلِينَ، یعنی یہ تحقیقات اس لئے کرائی کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے، کہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کے قریب کو چلنے نہیں دیتا۔

اس کے رد مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ تحقیقات کے ذریعہ خیانت کرنے والوں کی خیانت ظاہر ہو کر سب لوگ متنبہ ہو جائیں کہ خیانت کرنے والوں کا انجام آخر کار رسوائی ہوتا ہے، تاکہ آئندہ سب لوگ ایسے کاموں سے بچنے کا اہتمام کریں، دوسرے یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ اگر اسی اشتباہ کی حالت میں یوسف علیہ السلام کو شاہی اعزاز مل جاتا تو دیکھنے والوں کو یہ خیال ہو سکتا تھا کہ ایسی خیانت کرنے والوں کو بڑے بڑے رتبے مل سکتے ہیں اس سے ان کے اعتقاد میں فرق آتا، اور خیانت کی بُرائی دلوں سے نکل جاتی، بہر حال مذکورہ بالا حکمتوں کے پیش نظر یوسف علیہ السلام رہائی کا پیغام پا ہی فوراً نکل جانا پسند نہیں کیا، بلکہ شاہی انداز تحقیقات کا مطالبہ کیا۔

مذکور الصدر پہلی آیت میں اس تحقیقات کا خلاصہ مذکور ہے، قَالَ مَا تَخْتَبِرُونَ إِذْ رَأَوُكُمُ يُوسُفَ عَنْ نَفْسِهِ، یعنی بادشاہ نے اُن عورتوں کو جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے حاضر کر کے سوال کیا، کہ کیا واقعہ یہ ہے جب تم نے یوسف سے اپنے مطلب کی خواہش کی، بادشاہ کے اس سوال سے معلوم ہوا کہ اس کو اپنی جگہ یہ یقین ہو گیا تھا کہ قصور یوسف علیہ السلام کا نہیں، ان عورتوں ہی کا ہے، اسی لئے یہ کہا تم نے ان سے اپنے مطلب کی خواہش کی، اس کے بعد عورتوں کا جواب یہ مذکور ہے:-

قُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوءٍ قَالَتِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ النَّسِیْ حَصْحَصَ الْحَقِّ أَنَا رَأَوْتُهُ عَنْ نَفْسِهِ وَإِنَّهُ لَمِنَ الصّٰدِقِیْنَ ۝۵، یعنی سب عورتوں نے کہا کہ حاش للہ! ہمیں ان میں ذرا بھی کوئی بُرائی کی بات نہیں معلوم ہوئی، عزیز کی بیوی کہنے لگی کہ اب تو حق بات ظاہر ہو رہی گئی، میں نے ان سے اپنے مطلب کی خواہش کی تھی، اور بیشک وہی سچے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے تحقیقات میں عزیز مصر کی بیوی کا نام نہ لیا تھا مگر اللہ جل شانہ جب کسی کو عزت عطا فرماتے ہیں تو خود بخود لوگوں کی زبانیں ان کے صدق و صفاتی کے لئے کھل جاتی ہیں، اس موقع پر عزیز کی بیوی نے ہمت کر کے اظہار حق کا اعلان خود کر دیا، یہاں تک جو حالات و واقعات یوسف علیہ السلام کے آپ نے سنے ہیں، ان میں بہت سے فوائد اور مسائل اور انسانی زندگی کے لئے اہم ہدایتیں پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے آٹھ مسائل پہلے بیان ہو چکے ہیں، مذکور الصدر آیات سے متعلق مزید مسائل اور ہدایات یہ ہیں:-

نواں مسئلہ:- یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مخصوص اور مقبول بندوں کے مقصد پورا کرنے کے لئے خود ہی غیبی تدابیر سے انتظام فرماتے ہیں، ان کو کسی مخلوق کا ممنونِ حسن کرنا پسند نہیں فرماتے، یہی وجہ ہوئی کہ یوسف علیہ السلام نے جو رہا ہونے والے قیدی سے کہا تھا کہ بادشاہ سے میرا ذکر کرنا اس کو تو بھلا دیا گیا، اور پھر پردہ غیب کے ایک تدبیر ایسی کی گئی جس میں یوسف علیہ السلام کسی کے ممنون بھی نہ ہوں، اور پوری عزت و شان کے ساتھ جیل کی رہائی کا مقصد بھی پورا ہو جائے۔

اس کا یہ سامان کیا کہ بادشاہ مصر کو ایک پریشان کن خواب دکھلایا، جس کی تعبیر سے اس کے درباری اہل علم و فن عاجز ہوئے، اس طرح ضرور متمرد ہو کر یوسف علیہ السلام کی طرف رجوع کرنا پڑا (ابن کثیر)

دسواں مسئلہ: اس میں حنلاق حسنہ کی تعلیم ہو، کہ رہا ہونے والے قیدی نے یوسف علیہ السلام کا اتنا کام نہ کیا کہ بادشاہ سے ذکر کر دیتا اور ان کو مزید سات سال قید کی مصیبت میں گزارنے پڑے، اب سات سال کے بعد جب وہ اپنا مطلب تعبیر خواب کالے کر حاضر ہوا تو عام انسانی عادت کا تقاضا تھا کہ اس کو ملامت کرتے اس پر خفا ہوتے کہ تجھ سے اتنا کام نہ ہو سکا مگر یوسف علیہ السلام نے اپنے پیغمبرانہ اخلاق کا اظہار فرمایا، کہ اس کو ملامت تو کیا اس قصہ کا ذکر تک بھی نہیں کیا (ابن کثیر و قرطبی)

گیارہواں مسئلہ: اس میں یہ ہے کہ جس طرح انبیاء علیہم السلام اور علماء اہل امت کا یہ فریضہ ہو کہ وہ لوگوں کی آخرت درست کرنے کی فکر کریں ان کو ایسے کاموں سے بچائیں جو آخرت میں عذاب بنیں گے، اسی طرح ان کو مسلمانوں کے معاشی حالات پر بھی نظر رکھنا چاہیے کہ وہ پریشان نہ ہوں، جیسے یوسف علیہ السلام نے اس موقع پر صرف تعبیر خواب بتا دینے کو کافی نہیں سمجھا، بلکہ یہ حکیمانہ اور خیر خواہانہ مشورہ بھی دیا، کہ پیداوار کے تمام گیموں کو خوشیوں کے اندر رہنے دیں، اور بقدر ضرورت صاف کر کے غلہ نکالیں، تاکہ آخر سالوں تک خراب نہ ہو جاوے۔

بارہواں مسئلہ: یہ ہے کہ عالم مقتدار کو اس کی بھی فکر رہنی چاہئے کہ اس کی طرف سے لوگوں میں بدگمانی پیدا نہ ہو، اگرچہ وہ بدگمانی سراسر غلط ہی کیوں نہ ہو، اس سے بھی بچنے کی تدبیر کرنا چاہئے، کیونکہ بدگمانی خواہ کسی جہالت یا کم فہمی ہی کے سبب ہو بہر حال ان کی دعوت و ارشاد کے کام میں خلل انداز ہوتی ہے، لوگوں میں اس کی بات کا وزن نہیں رہتا، (قرطبی)، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تمہمت کے مواقع سے بھی بچو، یعنی ایسے حالات اور مواقع سے بھی اپنے آپ کو بچاؤ جن میں کسی کو آپ پر تمہمت لگانے کا موقع ہا تھا آئے، یہ حکم تو عام مسلمانوں کے لئے ہے، خواص اور عوام کو اس میں وہی احتیاط لازم ہے، خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو تمام عیوب اور گناہوں سے معصوم ہیں، آپ نے بھی اس کا اہتمام فرمایا ایک مرتبہ ازواج مطہرات میں سے ایک بی بی آپ کے ساتھ درینہ کی ایک گلی سے گذر رہی تھیں کوئی صحابی سامنے آگئے، تو آپ نے دُور سے بتلا دیا کہ میرے ساتھ فلاں بی بی ہیں۔ یہ اس لئے کیا کہ کہیں دیکھنے والے کو کسی اجنبی عورت کا شبہ نہ ہو جائے، اس موقع پر حضرت یوسف علیہ السلام نے جیل سے رہائی اور شاہی دعوت کا پیغام ملنے کے باوجود رہائی سے پہلے اس کی کوشش فرمائی کہ لوگوں کے شبہات دور ہو جائیں۔

تیسرا سوال مسئلہ: اس میں یہ ہے کہ جس شخص کے حقوق کسی کے ذمہ ہوں اور اس حیثیت سے وہ واجب الاحترام ہو، اگر ناگزیر حالات میں اس کے خلاف کوئی کارروائی کرنی بھی پڑے

تو اس میں بھی معتد و رہبر حقوق و احترام کی رعایت کرنا شرافت کا تقاضا ہے جیسے یوسف علیہ السلام نے اپنی برائت کے لئے معاملہ کی تحقیقات کے واسطے عزیز یا اس کی بیوی کا نام لینے کے بجائے ان عورتوں کا ذکر کیا جنہوں نے ہاتھ کاٹ لئے تھے، (قرطبی) کیونکہ مقصد اس سے بھی حاصل ہو سکتا تھا۔ چودہ ہواں مسئلہ: مکارم اخلاق کی تعلیم ہے، کہ جن لوگوں کے ہاتھوں سات سال یا بارہ سال جیل خانہ کی تکلیف برداشت کرنی پڑی تھی، رہائی کے وقت اُن سے کوئی انتقام لینا تو کیا اس کو بھی برداشت نہ کیا کہ ان کو کوئی ادنیٰ تکلیف ان سے پہونچے جیسے آیت لِيَعْلَمَ آتِيَ كَمْ أَخَذْتُ بِالْغَيْبِ میں اس کا اہتمام کیا گیا ہے۔

وَمَا أَبْرِئُ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا

اور میں پاک نہیں کہتا اپنے جی کو، بیشک جی تو سکھاتا ہی میرا

مَا سَجِمَ رَبِّي أَنِّي غَفُورٌ رَحِيمٌ ۵۳ وَقَالَ الْمَلِكُ لَتَبَوِّنَّ

جو رحم کر دیا میرے رب نے بیشک میرا رب بخشنے والا ہے مہربان اور کہا بادشاہ نے اے آؤ اس کو میرے

بِأَنِّي أَسْتَغْلِصُّ لِنَفْسِي فَلَمَّا كَلَّمَهُ قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدِينَا

پاس میں غالص کر رکھوں اس کو اپنے کالمیں پھر جب بات چیت کی اس سے کہا واقعی تو نے آج سے ہمارے پاس

مَكِينٌ أَمِينٌ ۵۴ قَالَ اجْعَلْنِي عَلَى خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي

جگہ پائی معتبر ہو کر، یوسف نے کہا مجھ کو معتبر کر ملک کے خزانوں پر میں نگہبان

حَفِيفٌ عَلِيمٌ ۵۵ وَكَذَلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ يَتَّبِعُوا

ہوں خوب جاننے والا، اور یوں قدرت دی ہم نے یوسف کو اس زمین میں جگہ پکڑتا تھا

مِمَّا حَيْثُ يَشَاءُ نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَشَاءُ وَلَا نُضِيعُ

اس میں جہاں چاہتا، پہنچا دیتے ہیں ہم رحمت اپنی جس کو چاہیں، اور ضائع نہیں کرتے ہم

أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ۵۶ وَلَا جُرْأُولَ خَيْرٌ لِلَّذِينَ آمَنُوا

بدل بھلائی والوں کا، اور ثواب آخرت کا بہتر ہی ان کو جو ایمان لائے

وَكَانُوا يَتَّقُونَ ۵۷

اور رہے پرہیزگاری میں۔

خلاصہ تفسیر

اور میں اپنے نفس کو (بھی بالذات) بری (اور پاک) نہیں بتلاتا (کیونکہ) نفس تو درہر ایک (بری ہی بات بتلاتا ہے بجز اس (نفس) کے جس پر میرا رب رحم کرے) اور اس (برائی) کا مادہ نہ رکھے جیسا انبیاء علیہم السلام کے نفوس ہوتے ہیں، مطلقاً جن میں یوسف علیہ السلام کا نفس بھی داخل ہے، خلاصہ مطلب یہ ہوا کہ میری نزہت و خصمت میرے نفس کا ذاتی کمال نہیں، بلکہ راست و عنایت الہیہ کا اثر ہے، اس لئے میرا نفس برائی کا حکم نہیں کرتا، ورنہ جیسے اوروں کے نفوس ہیں ویسا ہی میرا ہوتا، بد شبہ میرا رب بڑی مغفرت والا بڑی رحمت والا ہے، یعنی اوپر جو نفس کی دو قسمیں معلوم ہوتی ہیں، امارہ اور مطمئنہ، سو امارہ اگر توبہ کر لے تو اس کی مغفرت فرمائی جاتی ہے، اور مرتبہ توبہ میں وہ توبہ کھاتا ہے، اور جو مطمئنہ ہے کمال اس کا لازم ذات نہیں، بلکہ عنایت و رحمت کا اثر ہے، پس امارہ کے توبہ ہونے پر صفت غفور کا ظہور ہوتا ہے، اور مطمئنہ میں صفت رحیم کا۔

یہ تمام تر مضمون ہوا یوسفؑ کی تقریر کا باقی یہ امر کہ یہ صورت اثبات نزہت کی بعد رہائی کے بھی تو ممکن تھی پھر رہائی پر اس کو مستعد کیوں رکھا، اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہو کہ جتنا یقین اس ترتیب میں ہو سکتا ہے اس کے خلاف میں نہیں ہو سکتا، کیونکہ دلائل کی دلالت تو مشترک ہی لیکن اس صورت مجبوزہ میں یہ امر زائد ہے کہ بادشاہ اور عزیز سمجھ سکتے ہیں کہ جب بد و ن تبریہ کے یہ رہا ہونا نہیں چاہتے، حالانکہ ایسی حالت میں رہائی قیدی کی انتہائی قننا ہوتی ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اپنی نزہت و برت کا کامل یقین ہو اس لئے اس کے ثابت ہو جانے کا پورا اطمینان ہو، اور ظاہر ہے کہ ایسا کامل یقین بری ہی ہو سکتا ہے نہ کہ ملوث کو، یہ ساری باتیں بادشاہ نے سنیں، اور (یہ سن کر اس) بادشاہ نے کہا کہ ان کو میرے پاس لاؤ میں ان کو خاص اپنے کام کے لئے رکھوں گا اور عزیز سے ان کو لیلوں گا کہ اس کے ماتحت نہ رہیں گے چنانچہ لوگ ان کو بادشاہ کے پاس لئے، پس جب بادشاہ نے ان سے باتیں کیں (اور باتوں سے زیادہ فضل و کمال آپ کا ظاہر ہوا) تو بادشاہ نے (ان سے) کہا کہ تم ہمارے نزدیک آج (سے) بڑے محرز اور معتبر ہو (بعد اس کے اس خواب کی تعبیر کا ذکر آیا اور بادشاہ نے کہا کہ اتنے بڑے قحط کا انتظام بڑا بھاری کام ہے، یہ انتظام کس کے سپرد کیا جاوے) یوسف (علیہ السلام) نے فرمایا کہ ملکی خزانوں پر مجھ کو مامور کر دو، میں (ان کی) حفاظت (بھی) رکھوں گا اور آمد و خرچ کے انتظام اور اس کے حساب کتاب کے طریقہ سے بھی (خوب واقف ہوں) چنانچہ تجا اس کے

کہ ان کو کوئی خاص منصب دیتا مثل اپنے پورے اختیارات ہر قسم کے دیدیے، گویا حقیقت میں بادشاہ ہی ہو گئے، گو برائے نام وہ بادشاہ رہا، اور یہ عزیز کے عہدہ سے مشہور ہو گئے، چنانچہ ارشاد ہے) اور ہم نے ایسے (عجیب) طور پر یوسف (علیہ السلام) کو ملک (مصر) میں باختیار بنادیا، کہ اس میں جہاں چاہیں رہیں، جیسا کہ بادشاہوں کو آزادی ہوتی ہے، یعنی یا تو وہ وقت تھا کہ کنز میں نبوس تھے، پھر عزیز کی ماتحتی میں مقید رہے، اور یا آج یہ خود مختاری اور آزادی عنایت ہوئی، بات یہ ہے کہ ہم جس پر چاہیں اپنی عنایت متوجہ کر دیں اور ہم نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے، یعنی دنیا میں بھی نیکی کا اجر ملتا ہے، کہ حیات طیبہ عطا فرماتے ہیں، خواہ مالدار بنا کر جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے لئے تھا، اور خواہ بغیر مالدار کے قناعت و رضا عطا کر کے جس سے عیش لذت میسر ہو تا ہے یہ تو آج دنیا میں ہوا) اور آخرت کا اجر کہیں زیادہ بڑھ کر ہو ایمان اور تقویٰ والوں کے لئے ۛ

معارف و مسائل

اپنی پاکبازی بیان کرنا درست | اس سے پہلی آیت میں حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ قول مذکور تھا کہ جو الزام مجھ پر عائد کیا تھا اس کی صفائی اور معاملہ کی مکمل تحقیق سے پہلے میں قید سے رہائی کو اس لئے پسند نہیں کرتا کہ عزیز اور بادشاہ مصر کو پورا یعتیں ہو جائے کہ میں نے کوئی خیانت نہیں کی تھی، بلکہ الزام سراسر جھوٹا تھا، اس میں چونکہ اپنی برائت اور پاکبازی کا ذکر ایک ناگزیر ضرورت سے ہو رہا تھا جو بظاہر اپنے نفس کے تزکیہ اور پاکی کا اظہار ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسند نہیں، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ مَزَّكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ بِاللّٰهِ یَزِیُّوْنَ مَنْ یَّشَآءُ یعنی کیا آپ نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جو اپنے آپ کو پاکیزہ کہتے ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے کہ وہ جس کو چاہیں پاک قرار دیں۔ اور سورۃ بقرہ میں بھی اسی مضمون

کی ایک آیت ہے: فَلَا تَزِیُّوْا اَنْفُسَکُمْ هٰذَا اَعْلَمُ بِبَیِّنَاتٍ - یعنی تم اپنے نفس کی پاکی کے مدعی نہ بنو، اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتے ہیں کہ کون واقعی پرہیزگار و متقی ہے؟

اس لئے آیت مذکورہ میں حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی برائت کے اظہار کے ساتھ ہی اس حقیقت کا بھی اظہار کر دیا کہ میرا یہ کہنا کچھ اپنے تعویٰ اور پاکبازی کا جھٹلانا نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کا نفس جس کا خمیر چار عنصر آگ، پانی، مٹی اور ہوا سے بنا ہے وہ تو اپنی فطرت سے ہر شخص کو بُرے ہی کاموں کی طرف مائل کرتا رہتا ہے، مجسّر اس کے جس پر میرا رب اپنی رحمت فرما کر اس کے نفس کو بُرے تقاضوں سے پاک

کردے جیسے انبیاء علیہم السلام کے نفوس ہوتے ہیں اور ایسے ہی نفوس کو قرآن میں نفس مطمئنہ کا لقب دیا گیا ہے، حاصل یہ ہے کہ ایسے ابتلا و عظیم کے وقت میرا گناہ سے بچ جانا یہ کوئی مسیرا ذاتی کمال نہیں تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کی رحمت اور دستگیری کا نتیجہ تھا، اگر وہ میرے نفس سے رذیل خواہشات کو نہ نکال دیتے تو میں بھی ایسا ہی ہو جاتا جیسے عام انسان ہوتے ہیں کہ خواہشات نفسانی سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔

بعض روایات میں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ جملہ اس لئے فرمایا کہ ایک قسم کا خیال تو بہر حال ان کے دل میں بھی پیدا ہو ہی گیا تھا، گو وہ غیر خستہ کاری و سو سے کی حد تک تھا، مگر شان نبوت کے سامنے وہ بھی ایک لغزش اور بُرائی ہی تھی، اس لئے اس کا اظہار فرمایا کہ میں اپنے نفس کو بھی بالکل ہی بری اور پاک نہیں سمجھتا۔

نفسِ انسانی کی تین حالتیں | اس آیت میں یہ مسئلہ غور طلب ہے کہ اس میں ہر نفسِ انسانی کو آمارۃٌ بالسوء یعنی بُرے کاموں کا حکم کرنے والا فرمایا ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے ایک سوال فرمایا کہ ایسے رفیق کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے جس کا حال یہ ہو کہ اگر تم اس کا اعزاز و اکرام کرو، کھانا کھلاؤ، کپڑے پہناؤ تو وہ تمہیں بلاء اور مصیبت میں ڈال دے، اور اگر تم اس کی توہین کرو، بھوکا نہ کھاؤ تو تمہارے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرے؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اس سے زیادہ بُرا تو دنیا میں کوئی ساتھی ہو ہی نہیں سکتا، آپؐ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ تمہارا نفس جو تمہارے پہلو میں ہے وہ ایسا ہی ساتھی ہے (قرطبی) اور ایک حدیث میں ہے کہ تمہارا سب سے بڑا دشمن خود تمہارا نفس ہے جو تمہیں بُرے کاموں میں مبتلا کر کے ذلیل و خوار بھی کرتا ہے اور طرح طرح کی مصیبتوں میں بھی گرفتار کر دیتا ہے۔

بہر حال آیت مذکورہ اور ان روایات حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نفسِ انسانی بُری ہی کاموں کا تقاضا کرتا ہے، لیکن سورہ قیامت میں اسی نفسِ انسانی کو لو آئمہ کا لقب دے کر اس کو یہ اعزاز بخشا ہے کہ رب العزت نے اس کی قسم کھائی ہے لَا أُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیَمَةِ وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ الْوَاطِنَةِ، اور سورہ الحج میں اسی نفسِ انسانی کو نفسِ مطمئنہ کا لقب دے کر جنت کی بشارت دی ہے، يَا بَتُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ، اس طرح نفسِ انسانی کو ایک جگہ آمارۃٌ بالسوء کہا گیا، دوسری جگہ لو آئمہ، تیسری جگہ مطمئنہ۔

توضیح اس کی یہ ہے کہ ہر نفسِ انسانی اپنی ذات میں تو آمارۃٌ بالسوء یعنی بُرے کاموں کا

تقاضا کرنے والا ہے، لیکن جب انسان خدا و آخرت کے خوف سے اس کے تقاضے کو پورا نہ کرے تو اس کا نفس تو ائمہ بن جاتا ہے، یعنی بُرے کاموں پر ملامت کرنے والا اور ان سے توبہ کرنا والا جیسے ہم صلحاً اُمت کے نفوس ہیں اور جب کوئی انسان نفس کے خلاف مجاہدہ کرتے کرتے اپنے نفس کو اس حالت میں پہنچا دے کہ بُرے کاموں کا تقاضا ہی اس میں نہ رہے، تو وہ نفس مطمئنہ ہو جاتا ہے، صلحاً اُمت کو یہ حال مجاہدہ و ریاضت سے حاصل ہو سکتا ہے، اور پھر بھی اس حالت کا ہمیشہ قائم رہنا یقینی نہیں ہوتا اور انبیاء علیہم السلام کو خود بخود عطا ہوا وہی ہے ایسا ہی نفس مطمئنہ بغیر کسی سابقہ مجاہدہ کے نصیب ہوتا ہے، اور وہ ہمیشہ اسی حالت پر رہتا ہے، اس طرح نفس کی تین حالتوں کے اعتبار سے تین طرح کے افعال اس کی طرف منسوب کئے گئے ہیں

إِن رَّبِّيَ لَغَفُورٌ رَحِيمٌ، آخر آیت میں فرمایا کہ میرا رب بڑا مغفرت کرنے والا اور رحمت کرنے والا ہے، لفظ غفور میں اس طرف اشارہ ہے کہ نفس امارۃ بالسوء جب اپنی خطا پر نادام ہو کر توبہ کرے، اور نفس نوائیہ بن جائے، تو اللہ تعالیٰ کی مغفرت بڑی ہے، وہ معاف فرمادیں گے اور لفظ رحیم میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے، کہ جس شخص کو نفس مطمئنہ نصیب ہو وہ بھی اللہ کی رحمت ہی کا نتیجہ ہے۔

وَقَالَ السِّلَاطُ الْمَتُونِي الْخ یعنی بادشاہ مصر نے جب یوسف علیہ السلام کے فرمانے کے مطابق عورتوں سے واقعہ کی تحقیق فرمائی اور لیٹھا اور دوسری سب عورتوں نے حقیقت واقعہ کا اقرار کر لیا تو بادشاہ نے حکم دیا کہ یوسف علیہ السلام کو میرے پاس لایا جائے تاکہ میں اُن کو اپنا مشیر خاص بنالوں، حکم کے مطابق یوسف علیہ السلام کو اعزاز کے ساتھ جیلخانے سے دربار میں لایا گیا، اور باہمی گفتگو سے یوسف علیہ السلام کی صلاحیتوں کا پورا اندازہ ہو گیا، تو بادشاہ نے کہا کہ آپ آج ہمارے نزدیک بڑے معزز اور محترم ہیں۔

امام بغویؒ نے نقل کیا ہے کہ جب بادشاہ کا قاصد جیل میں یوسف علیہ السلام کے پاس دوبارہ پہنچا، اور بادشاہ کی دعوت پہنچائی تو یوسف علیہ السلام نے سب جیل والوں کے لئے دعا کی، اور غسل کر کے نئے کپڑے پہنے، جب دربار شاہی پر پہنچے تو یہ دعا کی

حَسْبِيَ رَبِّي مِنْ دُنْيَايَ وَحَسْبِيَ رَبِّي مِنْ خَلْقِهِ عَزَّ جَارُكَ وَجَلَّ ثَنَّاؤُهُ وَلَا إِلَهَ عِندَكَ - یعنی میری دنیا کے لئے میرا رب مجھے کافی ہے، اور ساری مخلوق کے بدلے میرا رب میرے لئے کافی ہے، جو اسکی پناہ میں آگیا وہ بالکل محفوظ ہے، اور اسکی بڑی تعریف ہے اور اسکی سو کوئی معبود نہیں،

جب دربار میں پہنچے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو کر اسی طرح دعا کی اور عربی زبان میں سلام کیا، أَسَلَامٌ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللَّهِ اور بادشاہ کیلئے دعا عبرانی زبان میں کی

بادشاہ اگرچہ بہت سی زبانیں جانتا تھا، مگر عربی اور عبرانی زبانوں سے واقف نہ تھا، یوسف علیہ السلام نے بتلایا کہ سلام تو عربی زبان میں کیا گیا ہے اور دعا، عبرانی زبان میں۔

اس روایت میں یہ بھی ہے کہ بادشاہ نے یوسف علیہ السلام سے مختلف زبانوں میں باتیں کی، یوسف علیہ السلام نے اس کو اسی زبان میں جواب دیا، اور عربی اور عبرانی کی دو زبانیں زید سنائیں، جن سے بادشاہ واقف نہ تھا، اس واقعہ نے بادشاہ کے دل میں یوسف علیہ السلام کی غیر معمولی وقعت قائم کر دی۔

پھر شاہ مصر نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ میں آپ سے اپنے خواب کی تعبیر بلا واسطہ سنوں یوسف علیہ السلام نے پہلے اس کے خواب کی ایسی تفصیلات بتلائیں جو اب تک بادشاہ نے بھی کسی سے ذکر نہیں کی تھیں، پھر تعبیر بتلائی۔

شاہ مصر نے کہا کہ مجھے تعبیر سے زیادہ اس پر حیرت ہے کہ یہ تفصیلات آپ کو کیسے معلوم ہوئیں، اس کے بعد شاہ مصر نے مشورہ طلب کیا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے، تو یوسف علیہ السلام نے مشورہ دیا کہ پہلے سات سال جن میں خوب بارشیں ہونے والی ہیں ان میں آپ زیادہ سے زیادہ کاشت کر اگر غلہ آگاہے کا انتظام کریں، اور سب لوگوں کو ہدایت کریں کہ اپنی اپنی زمینوں میں زیادہ سے زیادہ کاشت کریں، اور جتنا غلہ حاصل ہو اس میں سے پانچواں حصہ اپنے پاس ذخیرہ کرتے رہیں۔

اس طرح اہل مصر کے پاس قحط کے سات سال کے لئے بھی ذخیرہ جمع ہو جائے گا اور آپ ان کی طرف سے بے فکر ہوں گے، حکومت کو جس قدر غلہ سرکاری محصل سے یا سرکاری زمینوں سے حاصل ہو اس کو باہر کے لوگوں کے لئے جمع رکھیں، کیونکہ یہ قحط دور دراز تک پھیلے گا باہر کے لوگ اُس وقت آپ کے محتاج ہوں گے اس وقت آپ غلہ دے کر خلق خدا کی امداد کریں اور معمولی قیمت بھی رکھیں گے تو سرکاری خزانہ میں اتنا مال جمع ہو جائے گا، جو اس کے پہلے کبھی نہیں ہوا، شاہ مصر اس مشورہ سے بچہ سرور و مطمئن ہوا، مگر کہنے لگا، کہ اس عظیم منصوبہ کا انتظام کیسے ہو اور کون کرے، اس پر یوسف علیہ السلام نے فرمایا:

إِنِّي خَشِيتُ أَنِّي لَا أَرْضِي رَٰبِي حَفِيفٌ عَلَيَّ، یعنی ملک کے خزانے (جن میں زمین کی پیداوار بھی شامل ہے) آپ میرے سپرد کر دیں میں ان کی حفاظت بھی پوری کر سکتا ہوں، اور خرچ کرنے کے مواقع اور مقدار خرچ کے اندازہ سے بھی پورا واقف ہوں (قرطبی و ظہری) ان دو لفظوں میں حضرت یوسف علیہ السلام نے ان تمام اوصاف کو جمع کر دیا، جو ایک وزیر خزانہ میں ہونے چاہئیں، کیونکہ پہلی ضرورت تو این خزانہ کے لئے اس کی ہے کہ

وہ سرکاری اموال کو ضائع نہ ہونے دے، بلکہ پوری حفاظت سے جمع کرے، پھر غیر مستحق لوگوں اور غلط قسم کے مصارف میں خرچ نہ ہونے دے اور دوسری ضرورت اس کی ہے کہ جہاں جتن قدر خرچ کرنا ضروری ہے، اس میں نہ کوتاہی کرے اور نہ مقدار ضرورت سے زائد خرچ کرے، لفظ ”حفیظ“ پہلی ضرورت کی پوری ضمانت ہے اور لفظ ”علیم“ دوسری ضرورت کی۔

شاہ مصر اگرچہ یوسف علیہ السلام کے کمالات کا گردیدہ اور ان کی دیانت اور عقل کامل کا پورا محقق ہو چکا تھا، مگر بالفصل وزارت خزانہ کا منصب ان کو سپرد نہیں کیا، بلکہ ایک سال تک ایک معزز مہمان کی طرح رکھا۔

سال بھر پورا ہونے کے بعد نہ صرف وزارت خزانہ بلکہ پورے امور مملکت ان کے سپرد کر دیے، شاید مقصد یہ تھا کہ جب تک گھر میں رکھ کر ان کے اخلاق و عادات کا پورا تجربہ نہ ہو جائے اتنا بڑا منصب سپرد کرنا مناسب نہیں، جیسا کہ سعدی شیرازیؒ نے فرمایا ہے ۷

چو یوسف کے در صلاح و تمیز و بیک سال باید کہ گردد عسزیز
بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اسی زمانہ میں زلیخا کے شوہر قطفیر کا انتقال ہو گیا تو شاہ مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام سے ان کی شادی کر دی، اس وقت یوسف علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ کیا یہ صورت اس سے بہتر نہیں ہے جو تم چاہتی تھیں، زلیخا نے اعترافِ قصور کے ساتھ اپنا عذر بیان کیا۔

اللہ تعالیٰ جل شانہ نے بڑی عزت و شان کے ساتھ ان کی مراد پوری فرمائی، اور عیش و نشاط کے ساتھ زندگی گذری، تاریخی روایات کے مطابق دوا لڑ کے بھی پیدا ہوئے، جن کا نام افرائیم اور منشا تھا۔

بعض روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شادی کے بعد یوسف علیہ السلام کے دل میں زلیخا کی محبت اس سے زیادہ پیدا کر دی جتنی زلیخا کو یوسف علیہ السلام سے تھی، یہاں تک کہ ایک مرتبہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان سے شکایت کی کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ تم مجھ سے اب اتنی محبت نہیں رکھتیں جتنی پہلے تھی، زلیخا نے عرض کیا کہ آپ کے وسیلہ سے مجھے اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل ہو گئی، اس کے سامنے سب تعلقات اور خیالات منجمل ہو گئے، یہ واقعہ بعض دوسری تفصیلات کے ساتھ تفسیر قرطبی اور منہری میں بیان ہوا ہے۔

قصہ یوسف علیہ السلام کے ضمن میں جو عام انسانوں کی صلاح و فلاح کے لئے بہت سی ہدایات اور تعلیمات آئی ہیں، ان کا ذکر کچھ پہلے ہو چکا ہے، مذکورہ صدر آیات میں مزید مسائل اور ہدایات حسب ذیل ہیں:

پھر لا مسئلہ :- حضرت یوسف علیہ السلام کے قول وَمَا أَكْبَرُ عَنِّي نَفْسِي مِن يَدَيْكَ اور متقی پرہیزگار بندوں کے لئے یہ ہدایت ہو کہ جب ان کو کسی گناہ سے بچنے کی توفیق ہو جائے تو اس پر ناز نہ کریں، اور اس کے بالمقابل گناہ نگاروں کو حقیر نہ سمجھیں، بلکہ ارشاد یوسفی کے مطابق اس بات کو اپنے دل میں جاتیں کہ یہ ہمارا کوئی ذاتی کمال نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہو کہ اس نے نفسِ امارہ کو ہم پر غالب نہیں آنے دیا، ورنہ ہر انسان کا نفس اس کو طبعی طور پر بُرے ہی کاموں کی طرف کھینچتا ہے۔

دوسرا مسئلہ :- اَلْجَحَلِيْنَ عَلَى الْخَزَائِنِ الْاَمْرَ مِنْ سِوَايَ مَعْلُوم ہوا کہ کسی سرکاری عہدہ اور منصب کو طلب کرنا خاص صورتوں میں جائز ہے، جیسے یوسف علیہ السلام نے خزانہ سے اجازت ہے

ارض کا انتظام اور ذمہ داری طلب فرمائی۔

مگر اس میں یہ تفصیل ہو کہ جب کسی خاص عہدہ کے متعلق یہ معلوم ہو کہ کوئی دوسرا آدمی اس کا اچھا انتظام نہیں کر سکے گا اور اپنے بارہ میں یہ اندازہ ہو کہ عہدہ کے کام کو اچھا انجام دے سکے گا، اور کسی گناہ میں مبتلا ہونے کا خطرہ نہ ہو، ایسی حالت میں عہدہ کا خود طلب کر لینا بھی جائز ہے، بشرطیکہ حُرَّتِ جاہ و مال اس کا سبب نہ ہو، بلکہ خلق اللہ کی صحیح خدمت اور انصاف کے ساتھ ان کے حقوق پہنچانا مقصود ہو جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے صرف یہی مقصد تھا، اور جہاں یہ صورت نہ ہو تو حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت کا کوئی عہدہ خود طلب کرنے سے منع فرمایا ہے، اور جس نے خود کسی عہدہ کی درخواست کی اس کو عہدہ نہیں دیا۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبدالرحمن بن سمرقہ سے فرمایا کہ کبھی کوئی امارت طلب نہ کرے، کیونکہ تم نے خود سوال کر کے عہدہ امارت حاصل بھی کر لیا تو اللہ تعالیٰ کی تائید نہیں ہوگی جس کے ذریعہ تم لغزشوں اور خطاؤں سے بچ سکو، اور اگر بغیر درخواست اور طلب کے تمہیں کوئی عہدہ مل گیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید و اعانت ہوگی جس کی وجہ سے تم اس عہدے کے پورے حقوق ادا کر سکو گے۔

اسی طرح صحیح مسلم کی ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی عہدہ کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا اِنَّا لَنُتَّعِیْلُ عَلٰی عَمَلِنَا مَنْ اَسَادَہُ، یعنی ہم اپنا عہدہ کسی ایسے شخص کو نہیں دیا کرتے جو خود اس کا طالب ہو۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا طلب | مگر حضرت یوسف علیہ السلام کا معاملہ اس سے مختلف ہی کیونکہ
عہدہ خاص حکمت پر مبنی تھا | وہ جانتے تھے کہ بادشاہ مصر کا فرہے، اس کا عملہ بھی ایسا ہی ہو

اور ملک پر ایک طوفانی قحط آنے والا ہے، اس وقت خود غرض لوگ عام خلق اللہ پر رحم نہ کھائیں گے
اور لاکھوں انسان بھوک سے مرجائیں گے، کوئی دوسرا آدمی ایسا موجود نہ تھا جو غریبوں کے حقوق
میں انصاف کر سکے، اس لئے خود اس عہدہ کی درخواست کی، اگرچہ اس کے ساتھ کچھ اپنے کمالات
کا اظہار بھی بصورت کرنا پڑا، تاکہ بادشاہ مطمئن ہو کر عہدہ ان کو سپرد کر دے۔

اگر آج بھی کوئی شخص یہ محسوس کرے کہ کوئی عہدہ حکومت کا ایسا ہی جس کے فرائض کو
کوئی دوسرا آدمی صحیح طور پر انجام دینے والا موجود نہیں، اور خود اس کو یہ انداز ہو کہ میں صحیح انجام
دے سکتا ہوں، تو اس کے لئے جائز ہی بلکہ واجب ہے کہ اس عہدہ کی خود درخواست کرے، مگر اپنے جاؤ
مال کے لئے نہیں بلکہ خدمتِ خلق کے لئے، جس کا تعلق قلبی نیت اور ارادہ سے ہے، جو اللہ تعالیٰ
پر خوب روشن ہے (قرطبی)

حضرات خلفائے راشدین کا خلافت کی ذمہ داری اٹھالینا اسی وجہ سے تھا کہ وہ جانتے
تھے کہ کوئی دوسرا اس وقت اس ذمہ داری کو صحیح انجام نہ دے سکے گا، صحابہ کرام حضرت علی اور
معاویہ و حضرت حسین اور عبداللہ ابن زبیر وغیرہم کے جو اختلافات پیش آئے وہ سب اسی
پر مبنی تھے، کہ ان میں سے ہر ایک یہ خیال کرتا تھا کہ اس وقت فرائضِ خلافت کو میں اپنے مقابل
سے زیادہ حکمت و قوت کے ساتھ پورا کر سکوں گا، جاہ و مال کی طلب کسی کا مقصد صلی نہ تھا۔
کیا کسی کا فر حکومت کا عہدہ | فیستراہ مسئلہ: یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ مصر
قبول کرنا جائز ہے | کی ملازمت قبول فرمائی، حالانکہ وہ کافر تھا، جس سے معلوم ہوا کہ
کافر یا فاسق حکمران کی حکومت کا عہدہ قبول کرنا خاص حالات میں جائز ہے۔

لیکن امام جصاص نے آیت کریمہ فَذَلِكُنَّ أَكْثَرُ غَافِلِينَ اَللّٰهُمَّ جَرِّمِلْنِیْ کے تحت
لکھا ہے کہ اس آیت کی رو سے ظالموں کافروں کی اعانت کرنا جائز نہیں، اور ظاہر ہے اکی حکومت
کا عہدہ قبول کرنا ان کے عمل میں شریک ہونا اور اعانت کرنا ہے، اور ایسی اعانت کو قرآن کریم
کی بہت سی آیتوں میں حرام قرار دیا گیا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے جو اس ملازمت کو نہ صرف قبول فرمایا بلکہ درخواست
کر کے حاصل کیا، اس کی خاص وجہ امام تفسیر مجاہد نے تو یہ قرار دی ہے کہ بادشاہ مصر اس وقت
مسلمان ہو چکا تھا، مگر چونکہ قرآن و سنت میں اس کی کوئی دلیل موجود نہیں، اس لئے عام
مفسرین نے اس کی وجہ یہ قرار دی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام بادشاہ مصر کے معاملہ

سے یہ معلوم کر چکے تھے کہ وہ ان کے کام میں دخل نہ دے گا، اور کسی خلافِ شرع قانون جاری کرنے پر ان کو مجبور نہ کرے گا، بلکہ ان کو مکمل اختیار دے گا، جس کے ذریعہ وہ اپنی صوابدید اور قانونِ حق پر عمل کر سکیں گے، ایسے مکمل اختیار کے ساتھ کہ کسی خلافِ شرع قانون پر مجبور نہ ہو کوئی کافر یا ظالم کی ملازمت اختیار کر لے تو اگرچہ اس کا فرظالم کے ساتھ تعاون کرنے کی قباحت پھر بھی موجود ہو، مگر جن حالات میں اس کو اقتدار سے ہٹانا قدرت میں نہ ہو اور اس کا عہدہ قبول کرنے کی صورت میں خلق اللہ کے حقوق ضائع ہونے یا ظلم و جور کا اندیشہ قوی ہو تو مجبوری اتنے تعاون کی گنجائش حضرت یوسف علیہ السلام کے عمل سے ثابت ہو جاتی ہے، جس میں خود کسی خلافِ شرع امر کا ارتکاب نہ کرنا پڑے، کیونکہ درحقیقت یہ اس کے گناہ میں اعانت نہیں ہوگی، مگر سبب بعید کے طور پر اس سے بھی اس کی اعانت کا فائدہ حاصل ہو جائے، اعانت کے ایسے اسباب بعیدہ کے بارے میں بحالات مذکورہ شرعی گنجائش ہے، جس کی تفصیل حضرات فقہاء نے بیان فرمائی ہے، سلف صالحین صحابہ و تابعین میں بہت حضرات کا ایسے ہی حالات میں ظالم و جابر حکمرانوں کا عہدہ قبول کر لینا ثابت ہے (قرطبی و مظہری) علامہ مالدی نے سیاستِ شرعیہ سے متعلق اپنی کتاب میں نقل کیا ہے کہ بعض حضرات نے یوسف علیہ السلام کے اس عمل کی بناء پر کافر اور ظالم حکمرانوں کا عہدہ قبول کرنا اس شرط کے ساتھ جائز رکھا ہے کہ خود اس کو کوئی کام خلافِ شرع نہ کرنا پڑے، اور بعض حضرات نے اس شرط کے ساتھ بھی اس کو اس لئے جائز نہیں رکھا کہ اس میں بھی اہل ظلم و جور کی تقویت اور تائید ہوتی ہے، یہ حضرات یوسف علیہ السلام کے فعل کی مختلف توجیہات بیان کرتے ہیں، جن کا حاصل یہ ہے کہ یہ عمل حضرت یوسف علیہ السلام کی ذات یا ان کی شریعت کے ساتھ مخصوص تھا، اب دوسروں کے لئے جائز نہیں، مگر جمہور علماء فقہاء نے پہلے ہی قول کو اختیار فرما کر جائز قرار دیا ہے۔ (مستطبی)

تفسیر مجاہد میں ہے کہ جہاں یہ معلوم ہو کہ علماء صلحاء اگر یہ عہدہ قبول نہ کریں گے تو لوگوں کے حقوق ضائع ہو جائیں گے، انصاف نہ ہو سکے گا، وہاں ایسا عہدہ قبول کر لینا جائز بلکہ ثواب ہے، بشرطیکہ اس عہدہ میں خود اس کو خلافِ شرع امور کے ارتکاب پر مجبوری پیش نہ آئے۔

چوتھا مسئلہ: حضرت یوسف علیہ السلام کے قول اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلَیْکُمْ سے یہ ثابت ہوا کہ ضرورت کے موقع پر اپنے کسی کمال یا فضیلت کا ذکر کر دینا تزکیۃ نفس یعنی پاکبازی جتنانے میں داخل نہیں، جس کی قرآن کریم میں ممانعت آئی ہے، بشرطیکہ

اس کا ذکر کرنا کبر و غرور اور فخر و تعلیٰ کی وجہ سے نہ ہو۔

وَكَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ مِمَّا يَشَاءُ ۚ وَمِنْ ذُنُوبِهِ يَتُوبُ ۚ وَنُصِيعُكَ أَجْرَ الْحَسَنِ ۚ ۝
یعنی جس طرح ہم نے یوسفؑ کو بادشاہ مصر کے دربار میں عزت و منزلت عطا کی اسی طرح ہم ان کو پورے ملک مصر پر اقتدار عطا کر دیا، کہ اس کی زمین میں جس طرح چاہیں احکام جاری کریں، ہم جس کو چاہتے ہیں اپنی رحمت و نعمت سے یوں ہی نواز کرتے ہیں، اور ہم نیک کام کرنے والوں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتے۔
تفصیل اس کی یہ ہے کہ بادشاہ مصر نے ایک سال تجربہ کرنے کے بعد دربار میں ایک جشن منایا، جس میں تمام عمال دولت اور سرسبز زمین حکومت کو جمع کیا، اور یوسف علیہ السلام کے سر پر تاج رکھ کر اس مجلس میں لایا گیا، اور صرف خزانہ کی ذمہ داری نہیں بلکہ پورے امور مملکت کو عملاً ان کے سپرد کر کے خود گوشہ نشین ہو گیا (قرطبی و منہجی وغیرہ)۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے امور سلطنت کو ایسا سنبھالا کہ کسی کو کوئی شکایت باقی نہ رہی، سارا ملک آپ کا گردیدہ ہو گیا، اور پورے ملک میں امن اور خوش حالی عام ہو گئی، خود حضرت یوسف علیہ السلام کو بھی حکومت کی اس تمام ذمہ داری میں کوئی دشواری یا بوجھ و تکلیف پیش نہیں آتی۔

امام تفسیر مجاہدؒ نے فرمایا کہ یوسف علیہ السلام کے پیش نظر چونکہ اس سارے جاہ و جلال سے صرف اللہ تعالیٰ کے احکام کا رواج اور اس کے دین کی اقامت تھی، اس لئے وہ کسی وقت بھی اس سے غافل نہیں ہوتے، کہ شاہ مصر کو اسلام و ایمان کی دعوت دیں، یہاں تک کہ مسلسل دعوت و کوشش کا یہ نتیجہ ظاہر ہوا کہ بادشاہ مصر بھی مسلمان ہو گیا۔

وَ لَا جُورَ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ آمَنُوا وَ كَانُوا يُسْقُونَ ۖ ۝
یعنی اور آخرت کا اجر و ثواب اس دنیا کی نعمت سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے، ان لوگوں کے لئے جو مومن ہوئے، اور جنہوں نے تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کی۔

مطلب یہ ہے کہ دنیا کی دولت و سلطنت اور مثالی حکومت تو عطا ہوتی ہی سکتی، اس کے ساتھ آخرت کے درجات عالیہ بھی ان کے لئے تیار ہیں، اس کے ساتھ یہ بھی بتلا دیا کہ یہ درجات دنیا و آخرت یوسف علیہ السلام کی خصوصیت نہیں، بلکہ سلاتے عام ہے ہر انسان جس کے لئے ہوا ایمان اور تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کر لے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے زمانہ حکومت میں عوام کی راحت رسانی کے وہ کام کئے جن کی نظیر ملنا مشکل ہے، جب تعبیر خواب کے مطابق سات سال خوش حالی کے

گذرگذا اور قحط شروع ہوا تو یوسف علیہ السلام نے پیٹ بھر کر کھانا چھوڑ دیا، لوگوں نے کہا کہ ملک مصر کے سارے خزانے آپ کے قبضہ میں ہیں اور آپ بھوکے رہتے ہیں، تو فرمایا کہ میں یہ اس لئے کرتا ہوں تاکہ عام لوگوں کی بھوک کا احساس میرے دل سے غائب نہ ہو، اور شاہی باورچیوں کو بھی حکم دیدیا کہ دن میں صرف ایک مرتبہ دو سپر کو کھانا پکا کرے تاکہ شاہی محل کے سب افراد بھی عوام کی بھوک میں کچھ حصہ لے سکیں۔

وَجَاءَ أَخُوهُ يُوسُفَ فَقَدْ خَلُوا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَمْ

اور آئے بھائی یوسف کے پھر داخل ہوئے اس کے پاس تو اس نے پہچان لیا ان کو اور وہ

مُنكَرُونَ ﴿۵۸﴾ وَلَمَّا كَمَرَ هُمْ بَجَبَازِهِمْ قَالَ ائْتُونِي بِآخِ تَكْمُرِ

نہیں پہچانتے، اور جب تیار کر دیا ان کو ان کا اسباب، کہا لے آئیو میرے پاس ایک بھائی جو

مِّنْ آبَائِكُمْ أَلا تَتَرَوْنَ آتِيَ أَوْنِي الْكَيْلِ وَأَنَا خَيْرُ

تمہارا ہی باپ کی طرف سے، تم نہیں دیکھتے ہر کہ میں پورا دیتا ہوں ناپ اور خوب طرح اتارتا ہوں

الْمَنْزِلِينَ ﴿۵۹﴾ فَإِن لَّمْ تَأْتُونِي بِهِ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِي

ہمانوں کو، پھر اگر اسکو نہ لائے میرے پاس تو تمھارے لئے بھرتی نہیں میرے نزدیک

وَلَا تَقْرَبُونِ ﴿۶۰﴾ قَالُوا سُبْحَانَكَ أَبَاهُ وَإِنَّا لَفَاعِلُونَ ﴿۶۱﴾

اور میرے پاس نہ آئیو، بولے ہم خواہش کریں گے اس کے باپ اور ہم کو یہ کام کرنا ہے،

وَقَالَ لِفَتَاهِهِ اجْعَلُوا بَضَاعَتَهُمْ فِي رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ

اور کہہ دیا اپنے خدمتگاروں کو رکھ دو ان کی پونجی ان کے اسباب میں شاید

يَعْرِفُوهُمْ إِذَا انْقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿۶۲﴾

اس کو پہچانیں جب پھر کر پہنچیں اپنے گھر شاید وہ پھر آجائیں۔

خلاصہ تفسیر

دغرض یوسف علیہ السلام نے باختیار ہو کر غلہ کاشت کرانا اور جمع کرانا شروع کیا اور سات برس کے بعد قحط شروع ہوا، یہاں تک کہ دور دور سے یہ خبر سن کر کہ مصر میں سلطنت کی طرف سے غلہ فروخت ہوتا ہے جوقی جو قی لوگ آنا شروع ہوئے، اور رکنان میں بھی قحط ہوا، یوسف علیہ السلام کے بھائی (بھی بجز بنیامین کے غلہ لینے مصر میں)

آئے پھر یوسف (علیہ السلام) کے پاس پہنچے سو یوسف (علیہ السلام) نے رتو، اُن کو پہچان لیا اور انھوں نے یوسف (علیہ السلام) کو نہیں پہچانا (کیونکہ ان میں تغیر کم ہوا تھا، نیز یوسف علیہ السلام کو ان کے آنے کا خیال اور قوی احتمال بھی تھا، پھر نو وار سے پوچھ بھی لیتے ہیں کہ آپ کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں، اور شناسا لوگوں کو متھوڑے پتہ سے اکثر پہچان بھی لیتے ہیں بخلاف یوسف علیہ السلام کے کہ ان میں (چونکہ مفارقت کے وقت بہت کم مرتھے) تغیر بھی زیادہ ہو گیا تھا اور ان کو یوسف علیہ السلام کے ہونے کا احتمال بھی نہ تھا، پھر حکام سے کوئی پوچھ بھی نہیں سکتا، کہ آپ کون ہیں؟ یوسف علیہ السلام کا معمول تھا کہ ہر شخص کے ہاتھ غلہ بہت در حاجت فروخت کرتے تھے، چنانچہ ان کو بھی جب فی آدمی ایک ایک اونٹ غلہ قیمت دے کر ملنے لگا تو انھوں نے کہا کہ ہمارا ایک علاقہ بھائی اور ہے، اس کو باپ نے اس وجہ سے کہ ان کا ایک بیٹا گم ہو گیا تھا اپنی تسلی کے لئے رکھ لیا ہے، اس کے حصہ کا بھی ایک اونٹ غلہ زیادہ دیدیا جائے، یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ قانون کے خلاف ہے، اگر اس کا حصہ لینا ہو تو وہ خود آکر لے جائے، غرض اُن کے حصہ کا غلہ اُن کو دلوادیا، اور جب یوسف (علیہ السلام) نے ان کا سامان (غلہ کا) تیار کر دیا تو (چلتے وقت) فرمادیا کہ (اگر یہ غلہ خرچ کر کے اب کے آنے کا ارادہ کرو تو) اپنے علاقہ بھائی کو بھی (ساتھ) لانا (تاکہ اس کا حصہ بھی دیا جاسکے) تم دیکھتے نہیں ہو کہ میں پورا ناپ کر دیتا ہوں اور میں سب زیادہ مہمان نوازی کرتا ہوں (پس اگر تمہارا وہ بھائی آئے گا اس کو بھی پورا حصہ دوں گا، اور اس کی خوب خاطر داشت کروں گا جیسا تم نے اپنے ساتھ دیکھا، غرض اُن نے میں تو نفع ہی نفع ہے) اور اگر تم (دوبارہ آئے اور) اس کو میرے پاس نہ لائے تو (میں سمجھوں گا کہ تم مجھ کو دھوکہ دے کر غلہ زیادہ لینا چاہتے تھے تو اس کی سزا میں) نہ میرے پاس تمہارے نام کا غلہ ہوگا، اور نہ تم میرے پاس آنا (پس اس کے نہ لانے میں یہ نقصان ہوگا کہ تمہارے حصہ کا غلہ بھی سوخت ہو جاوے گا) وہ بولے (دیکھتے) ہم (اپنی حرامکان تک تو) اس کے باپ سے اس کو مانگیں گے اور ہم اس کا کو (یعنی کوشش اور درخواست) ضرور کریں گے (آگے باپ کے اختیار میں ہے) اور (جب وہاں سے بالکل چلنے لگے تو) یوسف (علیہ السلام) نے اپنے نوکروں سے کہدیا کہ ان کی جمع پونجی (جس کے عوض انھوں نے غلہ مول لیا ہے) ان (ہی) کے اسباب میں (چھپا کر) رکھ دو تاکہ جب اپنے گھر جائیں تو اس کو (جب وہ اسباب میں سے نکلے) پہچانیں، شاید (یہ احسان و کرم دیکھ کر) پھر دوبارہ آئیں (چونکہ یوسف علیہ السلام کو ان کا دوبارہ آنا اور ان کے بھائی کا لانا منظور تھا اس لئے کسی طرح سے اس کی

تربیر کی اول وعدہ کیا کہ اگر اس کو لاؤ گے تو اس کا بھی حصہ ملے گا، دوسرے وعید سنائی کہ اگر نہ لاؤ گے تو اپنا حصہ بھی نہ پاؤ گے، تیسرے دام جو کہ نقد کے علاوہ کوئی اور چیز تھی واپس کر دی، دو خیال سے ایک یہ کہ اس سے احسان و کرم پر استدلال کر کے پھر آئیں گے، دوسرا اس لئے کہ شاید ان کے پاس اور دام نہ ہوں اور اس لئے پھر نہ آسکیں، اور جب یہ دام ہوں گے انہی کو لیکر پھر آسکتے ہیں) :

معارف و مسائل

پہلی آیتوں میں حضرت یوسف علیہ السلام کو ملک مصر کا کامل اقتدار اللہ تعالیٰ کے فضل سے حاصل ہو جانے کا بیان تھا، مذکورہ آیات میں برادرانِ یوسف کا غلہ لینے کے لئے مصر آنا بیان ہوا ہے، اور یہ بھی ضمناً آگیا کہ دش بھائی مصر آئے تھے، یوسف علیہ السلام کے حقیقی چھوٹے بھائی ساتھ نہ تھے۔

درمیانِ قصہ کی تفصیل قرآن نے اس لئے نہیں دی کہ پہلے واقعات سے وہ خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے۔

ابن کثیرؒ نے ائمہ تفسیر میں سے سدی اور محمد ابن اسحق وغیرہ کے حوالہ سے جو تفصیل بیان کی ہو وہ اگر تاریخی اور اسرائیلی روایات سے بھی لی گئی ہو تو اس لئے کچھ قابلِ قبول ہے کہ نسقِ قرآنی میں خود اس کی طرف اشارے موجود ہیں۔

ان حضرات نے فرمایا کہ یوسف علیہ السلام کو ملک مصر کی وزارت حاصل ہونے کے بعد ابتدائی سات سال تعبیرِ خواب کے مطابق پورے ملک کیلئے بڑی خوش حالی اور رفاهیت کے آئے، پیداوارِ خوب ہوئی، اور زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے اور جمع کرنے کی کوشش کی، اس کے بعد اسی خواب کا دوسرا جز سامنے آیا کہ قحط شدید پڑا، جو سات سال تک جاری رہا اس وقت یوسف علیہ السلام چونکہ پہلے سے باخبر تھے کہ یہ قحط سات سال تک مسلسل رہے گا اس لئے قحط کے ابتدائی سال میں ملک کے موجودہ ذخیرہ کو بڑی احتیاط سے جمع کر لیا، اور پوری حفاظت سے رکھا۔

مصر کے باشندوں کے پاس بقدران کی ضرورت کے پہلے سے جمع کر دیا گیا، اب قحط عام ہوا اور اطراف و اکناف سے لوگ سمٹ کر مصر آنے لگے تو یوسف علیہ السلام نے ایک خاص انداز سے غلہ فروخت کرنا شروع کیا، کہ ایک شخص کو ایک اونٹ کے بوجھ سے زیادہ نہ دیتے تھے جس کی مقدار قبطی نے ایک دسوق یعنی ساٹھ صاع لکھی ہو جو ہمارے وزن کے اعتبار سے دو سو دس سیر یعنی پانچ من سے کچھ زیادہ ہوتی ہے۔

اور اس کام کا اتنا اہتمام کیا کہ غلہ کی فروخت خود اپنی نگرانی میں کراتے تھے، یہ قحط صرف ملک مصر ہی میں نہ تھا بلکہ دور در کے علاقوں تک پھیلا ہوا تھا، ارض کنعان جو فلسطین کا ایک حصہ ہے، اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا وطن ہے اور آج بھی اس کا شہر بنام خلیل ایک پر رونق شہر کی صورت میں موجود ہے، یہیں حضرت ابراہیم واسحق اور یعقوب و یوسف علیہم السلام کے مزارات معروف ہیں، یہ خطہ بھی اس قحط کی زد سے نہ بچا، اور یعقوب علیہ السلام کے خاندان میں بے چینی پیدا ہوئی، ساتھ ہی ساتھ مصر کی یہ شہرت عام ہو گئی تھی کہ وہاں غلہ قیٹا بل جاتا ہے، حضرت یعقوب علیہ السلام تک بھی یہ خبر پہنچی کہ مصر کا بادشاہ کوئی صالح رحم دل آدمی ہے وہ سب خلق خدا کو غلہ دیتا ہے تو اپنے صاحبزادوں سے کہا کہ تم بھی جاؤ، مصر سے غلہ لے کر آؤ۔

اور چونکہ یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ ایک آدمی کو ایک اونٹ کے بار سے زیادہ غلہ نہیں دیا جاتا، اس لئے سب ہی صاحبزادوں کو بھیجنے کی تجویز ہوئی، مگر سب چھوٹے بھائی بنیامین جو یوسف علیہ السلام کے حقیقی بھائی تھے، اور یوسف علیہ السلام کی گم شدگی کے بعد سے حضرت یعقوب علیہ السلام کی محبت و شفقت ان کے ساتھ زیادہ متعلق ہو گئی تھی، ان کو اپنے پاس اپنی تسلی اور خبر گیری کے لئے روک لیا۔

دش بھائی کنعان سے سفر کر کے مصر پہنچے، یوسف علیہ السلام شاہی لباس میں شاہانہ تخت و تاج کے مالک ہو لے کی حیثیت میں سامنے آئے، اور بھائیوں نے ان کو بچپن کی سات سالہ عمر میں قافلہ والوں کے ہاتھ بیچا تھا جس کو اس وقت حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق پچیس سال ہو چکے تھے (قرطبی، مظہری)۔

ظاہر ہے کہ اتنے عرصہ میں انسان کا حلیہ بھی کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے، اور ان کا یہ وہم و خیال بھی نہ ہو سکتا تھا کہ جس بچہ کو غلام بنا کر بیچا گیا تھا، وہ کسی ملک کا وزیر یا بادشاہ ہو سکتا ہے اس لئے بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو نہ پہچانا، مگر یوسف علیہ السلام نے پہچان لیا آیت مذکورہ میں فَحَسَّ فَهْمَهُمْ وَهَمُّوْا لَهٗ مِمَّنْ كَرُوْا کے یہی معنی ہیں، عربی زبان میں انکا کے اصل معنی اجنبی سمجھنے ہی کے آتے ہیں، اس لئے مَمَّنْ كَرُوْا کے معنی ناواقف اور انجان کے ہو گئے۔

یوسف علیہ السلام کے پہچان لینے کے متعلق ابن کثیر نے بحوالہ سدی یہ بھی بیان کیا ہے کہ جب یہ دش بھائی دربار میں پہنچے تو یوسف علیہ السلام نے مزید اطمینان کے لئے ان سے ایسے سوالات کئے، جیسے مشتبہ لوگوں سے کئے جاتے ہیں، تاکہ وہ پوری حقیقت واضح

کر کے بیان کر دیں، اول تو ان سے پوچھا کہ آپ لوگ مصر کے رہنے والے نہیں آپ کی زبان بھی عبرانی ہے، آپ یہاں کیسے پہنچے، انھوں نے عرض کیا کہ ہمارے ملک میں قحط عظیم ہے، اور ہم نے آپ کی تعریف سنی، اس لئے غلہ حاصل کرنے کے لئے آئے ہیں، یوسف علیہ السلام نے پھر پوچھا کہ ہمیں یہ کیسے اطمینان ہو کہ تم سچ کہہ رہے ہو، اور تم کسی دشمن کے جاسوس نہیں ہو، تو ان سب بھائیوں نے عرض کیا کہ معاذ اللہ ہم سے ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ہم تو اللہ کے رسول یعقوب علیہ السلام کے بیٹے ہیں جو کنعان میں رہتے ہیں۔

یوسف علیہ السلام کا ان سوالات سے مقصد ہی یہ تھا کہ یہ ذرا کھل کر پورے واقعات بیان کر دیں، تب یوسف علیہ السلام نے دریافت کیا کہ تمہارے والد کے اور بھی کوئی اولاد تمہارے سوا ہے، تو انھوں نے بتلایا کہ ہم بارہ بھائی تھے جن میں سے ایک چھوٹا بھائی جنگل میں گم ہو گیا، اور ہمارے والد کو سب سے زیادہ اسی سے محبت تھی، اس کے بعد سے اس کے چھوٹے حقیقی بھائی کے ساتھ زیادہ محبت کرنے لگے، اور اسی لئے اس وقت بھی اس کو سفر میں ہمارے ساتھ نہیں بھیجا، تاکہ وہ اس کی تسلی کا سبب بنے۔

یوسف علیہ السلام نے یہ سب باتیں سن کر حکم دیا کہ ان کو شاہی مہمان کی حیثیت سے ٹھہرائیں، اور قاعدہ کے موافق غلہ دیدیں۔

تقسیم غلہ میں یوسف علیہ السلام نے ضابطہ کار یہ بنایا تھا کہ ایک مرتبہ میں کسی ایک شخص کو ایک اونٹ کے بار سے زیادہ نہ دیتے، مگر جب حساب کے موافق وہ ختم ہو جائے تو پھر دوبارہ دیدیتے تھے۔

بھائیوں سے ساری تفصیلات معلوم کر لینے کے بعد ان کے دل میں یہ خیال آنا طبعی امر تھا کہ یہ پھر دوبارہ بھی آئیں، اس کے لئے ایک انتظام تو ظاہر آیا کہ خود ان بھائیوں

سے کہا اَنْتُوْنِیْ بِاَیِّہِ تَکْمُرُوْنَ اَبِیْکُمْ اَلَا تَرَوْنَ اَنِیْ اَوْفِی الْکَیْلَ وَاَنْخَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ، ”یعنی جب تم دوبارہ آؤ تو اپنے سوتیلے بھائی باپ شریک کو بھی لے کر آنا، تم دیکھ رہے ہو کہ میں کس طرح پورا پورا غلہ دیتا ہوں اور کس طرح مہمانی کرتا ہوں“

اور پھر ایک دھمکی بھی دیدی اَنْ لَکُمْ تَاْوِیْنِیْ بِہِ فَلَا کَیْلَ لَکُمْ عِنْدِیْ وَلَا تَقْصُرُوْا، ”یعنی اگر تم اپنے اس بھائی کو ساتھ نہ لاؤ گے تو پھر میں تم میں سے کسی کو بھی غلہ نہ دوں گا، کیونکہ میں سمجھوں گا کہ تم نے مجھ سے جھوٹ بولا ہے، اس طرح تم میرے پاس نہ آنا۔“

دوسرا انتظام خفیہ یہ کیا کہ جو نقد یا زیور وغیرہ ان بھائیوں نے غلہ کی قیمت کے طور پر

اداکیا تھا اس کے متعلق کارندوں کو حکم دیدیا کہ اس کو چھپا کر انہی کے سامان میں اس طرح باندھ دو کہ انکو اس وقت پتہ نہ لگے تاکہ جب گھر پہنچ کر سامان کمبلیں اور اپنا نقد زریور بھی انکو واپس تو یہ پھر دوبارہ لینے کیلئے آسکیں۔

ابن کثیر نے یوسف علیہ السلام کے اس عمل میں کتنی احتمال بیان کئے ہیں، ایک یہ کہ یوسف علیہ السلام کو یہ خیال آیا کہ شاید ان کے پاس اس نقد زریور وغیرہ کے سوا اور کچھ موجود ہی نہ ہو تو پھر دوبارہ غلہ لینے کے لئے نہیں آسکیں گے، اور دوسرے یہ بھی احتمال ہے کہ اپنے والد اور بھائیوں سے کھانے کی قیمت لینا گوارا نہ ہو، اس لئے شاہی خزانہ میں اپنے پاس سے جمع کر دیا ان کی رقم ان کو واپس کر دی، اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ وہ جانتے تھے کہ جب ان کا سامان ان کے پاس واپس پہنچ جائے گا اور والد ماجد کو علم ہوگا تو وہ اللہ کے رسول ہیں، اس واسطے سامان کو مصری خزانہ کی امانت سمجھ کر ضرور واپس بھیجیں گے، اس لئے بھائیوں کا دوبارہ آنا اور یقینی ہو جائے گا۔

بہر حال یوسف علیہ السلام نے یہ سب انتظامات اس لئے کئے کہ آئندہ بھی بھائیوں کے آنے کا سلسلہ جاری رہے اور چھوٹے حقیقی بھائی سے ملاقات بھی ہو جائے۔

مسائل و فوائد | یوسف علیہ السلام کے اس واقعہ سے اس کا جواز معلوم ہوا کہ جب کسی ملک میں اقتصادی حالات ایسے خراب ہو جائیں کہ اگر حکومت نظم قائم نہ کرے تو بہت سے لوگ اپنی ضروریات زندگی سے محروم ہو جائیں تو حکومت ایسی چیزوں کو اپنے نظم اور کنٹرول میں لے سکتی ہے، اور غلہ کی مناسب قیمت مقرر کر سکتی ہے، حضرات فقہاء اہل سنت نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔

یوسف علیہ السلام کا اپنے حالات سے والد کو اطلاع نہ دینا بامراہی تھا | یوسف علیہ السلام کے اس واقعہ میں ایک بات انتہائی حیرت انگیز ہے کہ ایک طرف تو ان کے والد ماجد پیغمبر خدا یعقوب علیہ السلام ان کی مفارقت سے اتنے متاثر کہ روتے روتے نابینا ہو گئے،

اور دوسری طرف یوسف علیہ السلام جو خود بھی نبی و رسول ہیں، باپ سے فطری اور طبعی محبت کے علاوہ ان کے حقوق سے بھی پوری طرح باخبر ہیں، لیکن چالیس سال کے طویل زمانہ میں ایک مرتبہ بھی کسی یہ خیال نہ آیا کہ میرے والد میری جدائی سے بے چین ہیں اپنی خیریت کی خبر کسی ذریعہ سے ان تک پہنچا دوں، خبر پہنچا دینا تو اس حالت میں بھی کچھ بعید نہ تھا جب وہ غلامی کی صورت میں مصر پہنچ گئے تھے، پھر عزیز مہر کے گھر میں تو ہر طرح کی آزادی اور آسائش کے سامان بھی تھے، اس وقت کسی ذریعہ سے گھر تک خطا خبر پہنچا دینا کچھ مشکل نہ تھا، اسی طرح جیل کی زندگی میں دنیا جانتی ہے کہ سب خبریں ادھر

کی ادھر پہنچتی ہی رہتی ہیں، خصوصاً جب اللہ تعالیٰ نے عزت کے ساتھ جیل سے رہا فرمایا اور ملک مصر کا اقتدار ہاتھ میں آیا اس وقت تو خود چل کر والد کی خدمت میں حاضر ہونا سب سے پہلا کام ہونا چاہتے تھا، اور یہ کسی وجہ سے مصلحت کے خلاف نہ ہوتا تو کم از کم قاصد بھیج کر والد کو مطمئن کر دینا تو معمولی بات تھی۔

لیکن پیغمبر خدا یوسف علیہ السلام سے کہیں منقول نہیں کہ اس کا ارادہ بھی کیا ہو اور خود کیا ارادہ کرتے جب بھائی غلہ لینے کے لئے آئے تو ان کو بھی اصل واقعہ کے انہماک کے بغیر رخصت کر دیا۔

یہ تمام حالات کسی ادنیٰ انسان سے بھی متصور نہیں ہو سکتے، اللہ کے برگزیدہ رسول سے یہ صورت کیسے برداشت ہوئی۔

اس حیرت انگیز خاموشی کا ہمیشہ یہی جواب مل میں آیا کرتا تھا کہ غالباً اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ کے ماتحت یوسف علیہ السلام کو اپنے اظہار سے روک دیا ہو گا، تفسیر قرطبی میں اس کی تصریح مل گئی کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی حضرت یوسف علیہ السلام کو روک دیا تھا کہ اپنے گھر اپنے متعلق کوئی خبر نہ بھیجیں۔

اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کو ہی جانتے ہیں، انسان ان کا کیا احاطہ کر سکتا ہے، کبھی کوئی چیز کسی کے سمجھ میں بھی آجاتی ہے، یہاں بظاہر اس کی اصل حکمت اس امتحان کی تکمیل تھی جو یعقوب علیہ السلام کا لیا جارا ہوا تھا، اور یہی وجہ تھی کہ اس واقعہ کی ابتداء ہی میں جب یعقوب علیہ السلام کو یہ انداز ہو چکا تھا کہ یوسف کو بھیڑنے نے نہیں کھایا، بلکہ بھائیوں کی کوئی شرارت ہی، تو اس کا طبعی اقتضایہ تھا کہ اسی وقت جگہ پر پہنچتے، تحقیق کرتے، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کا ذہیان اس طرف نہ جانے دیا، اور پھر مدتوں کے بعد انھوں نے بھائیوں سے یہ بھی فرمایا کہ ”جادو یوسف اور اس کے بھائی کو تلاش کرو“ جب اللہ تعالیٰ کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو اس کے سب اسباب اسی طرح جمع فرمادیتے ہیں۔

فَلَمَّا رَجَعُوا إِلَىٰ أَبِيهِمْ قَالُوا يَا أَبَانَا مَنَّا الْكَافِرُ

پھر جب پہنچے اپنے باپ کے پاس بولے اے باپ روک دی گئی ہم سے بھرتی،

فَأَرْسِلْ مَعَنَا آخَنَانَا ذَكَرْ لَكَ لِحَفِظُونَا ۖ قَالَ هَلْ

سو بھیج ہم سے ساتھ ہمارے بھائی کو کہ بھرتی لے آئیں اور ہم اس کے نگہبان ہیں، کہا میں کیا

اَمْنُكُمْ عَلَيَّ اِلَّا كَمَا اَمَنْتُكُمْ عَلٰى اَنْحِيْهِ مِنْ قَبْلُ ۚ وَاللّٰهُ خَيْرٌ

اعتبار کروں تمہارا اس پر مگر وہی جیسا اعتبار کیا تھا اس کے بھائی ہراس سے پہلے سو اللہ بہتر

حِفْظًا مَّوَدُّوْا رَحْمَۃَ الرَّحِيْمِيْنَ ۝۶۴ وَلَمَّا فَتَحُوا مَتَاعَهُمْ

ہر گھسان اور وہی ہر سب ہر بانوں سے ہریان ، اور جب کھولی اپنی چیز بست

وَجَدُوْا اِبْضَاعَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ۚ قَالُوْا اَيَّا بَا نَا مَا نَبْغِيْ ط

پائی اپنی پو پئی کہ پھیر دی گئی آن کی طرف ، بولے اسے باپ ہم کو اور کیا چاہتے ،

هٰلِكًا ۚ اِبْضَاعُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ وَنَمِيْرُ اَهْلِنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا

یہ پو پئی ہماری پھیر دی ہے ہم کو ، اب جائیں تو رسد لائیں ہم اپنے گھر کو اور خیر داری کریں گے اپنی

وَنَزِدُّ اَدْكِيْلًا بَعِيْرٌ ۚ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ ۝۶۵ قَالَ لَنْ اُرْسِلَ

بھائی کی اور زیادہ لیویں بھرتی ایک اونٹ کی وہ بھرتی آسان ہی ، کہا ہر گز نہ بھیجوں گا اس کو

مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْا نَوْۡنًا مَّوْتِقًا مِّنْ اِلٰهٍ لَّتَأْتِيْنِيْ بِهٖ ۚ اِلَّا اَنْ

تمہارے ساتھ یہاں تک کہ دو مجھ کو عہد خدا کا البتہ پہنچا دو گے اس کو میرے پاس مگر یہ کہ ۶۶

يَحٰطَ بِكُمْ فَلَمَّا اَتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِیْلٌ

گھیرے جاؤ تم ب ، پھر جب آیا اس کو سب نے عہد بولا اللہ ہماری باتوں پر نگہبان ہے ۔

حُلاصۂ تفسیر

غرض جب ٹوٹ کر اپنے باپ (یعقوب علیہ السلام) کے پاس پہنچے کہنے لگے اے آبا (ہماری بڑی خاطر ہوئی اور غلہ بھی ملا مگر بنیامین کا حصہ نہیں ملا بلکہ بدوین بنیامین کے ساتھ لے جائے ہوئے آئندہ بھی) ہمارے لئے (مطلقاً) غلہ کی بندش کر دی گئی سو (اس وقت میں ضروری ہو کہ) آپ ہمارے بھائی (بنیامین) کو ہمارے ساتھ بھیج دیجئے تاکہ زود بارہ عندہ لانے سے جو امر مانع ہو وہ مرتفع ہو جاوے اور ہم (بچے) غلہ لاسکیں اور اگر ان کے بھیجنے سے آپ کو کوئی اندیشہ ہی مانع ہے تو اس کے متعلق یہ عرض ہو کہ ہم ان کی پوری حفاظت رکھیں گے، یعقوب (علیہ السلام) نے فرمایا کہ بس (رہنے دو) میں اس کے بارے میں بھی نہیں دیکھا دیکھا ہی اعتبار کرتا ہوں جیسا اس سے پہلے اس کے بھائی (یوسف) کے بارے میں تمہارا اعتبار کر چکا ہوں (یعنی دل تو یہ اگر اسی دیتا نہیں مگر تم کہتے ہو کہ بدوین اس کے گئے ہوئے آئندہ

غلہ نہ ملے گا، اور عادیۃ زندگی کا مدار غلہ ہی پر ہے اور جان بچانا فرض ہے (سو خیر اگر لے ہی جاؤ گے تو اللہ کے سپرد وہی) سب سے بڑھ کر نگہبان ہے میری نگہبانی سے کیا ہوتا ہے) اور وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے (میری محبت اور شفقت سے کیا ہوتا ہے) اور (اس گفتگو کے بعد) جب انہوں نے اپنا اسباب کھولا تو (اس میں) ان کی جمع بد بختی (بھی) ملی کہ ان ہی کو داس کر دی گئی، کہنے لگے کہ اے ابا (بیٹے) اور ہم کو کیا چاہئے یہ ہماری جمع بد بختی بھی تو ہم ہی کو لوٹا دی گئی (ایسا کریم بادشاہ ہے) اور اس سے زیادہ کس عنایت کا انتظار کریں، یہ عنایت بس ہے اس کا مقتضی بھی یہی ہے کہ ایسے کریم بادشاہ کے پاس پھر جاتیں، اور وہ موقوف ہے بھائی کے ساتھ لیجائے پھر اس لئے اجازت ہی دیدیجئے ان کو ساتھ لے جائیں گے) اور اپنے گھر والوں کیواسطے (اور) رسل لائیں گے اور اپنے بھائی کی خوب حفاظت رکھیں گے، اور ایک اونٹ کا بوجھ غلہ اور زیادہ لائیں گے، (کیونکہ جس قدر اس وقت لائے ہیں) یہ تو تھوڑا سا غلہ ہے (جلدی ختم ہو جائے گا، پھر اور ضرورت ہوگی، اور اسکا ملنا موقوف ہے انکے لیجانے پر) یعقوب (علیہ السلام) نے فرمایا کہ (خیر) اس حالت میں بھیجنے سے انکار نہیں، لیکن، اس وقت تک ہرگز اسکو تمہارے ہمراہ نہ بھیجوں گا جب تک کہ اللہ کی قسم کھا کر مجھ کو پکا قول نہ دے کہ تم اسکو ضرور لے ہی آؤ گے ہاں اگر کہیں گھر ہی جاؤ تو مجبوری ہے چنانچہ سب نے اس پر قسم کھالی) سو جب وہ قسم کھا کر اپنے باپ کو قول دے چکے تو انہوں نے فرمایا کہ ہم لوگ جو بات چیت کر رہے ہیں یہ سب اللہ کے حوالے ہے (یعنی وہی ہمارے قول و اقرار کا گواہ ہے، کہ سن رہا ہے اور وہی اس قول کو پورا کر سکتا ہے، پس اس کہنے سے دو غرض ہوئیں، اول انکو اپنے قول کے خیال رکھنے کی ترغیب اور تنبیہ کہ اللہ کو حاضر و ناظر سمجھنے سے یہ بات ہنرتی ہے اور دوسرے اس تدبیر کا منہ ہنسی تقدیر کو قرار دینا کہ توکل کا حاصل ہے، اور اس کے بعد بنیامین کو ہمراہ جانے کی اجازت دیدی غرض دوبارہ مصر کے سفر کو مع بنیامین سب تیار ہو گئے) :

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں واقعہ کا بقیہ حصہ اس طرح مذکور ہے کہ جب برادران یوسف علیہ السلام مصر سے غلہ لے کر گھر واپس آئے تو مصر کے معاملہ کا تذکرہ والد ماجد سے کرتے ہوئے یہ بھی بتلایا کہ عزیز مصر نے آئندہ کے لئے ہمیں غلہ دینے کے لئے یہ شرط کر دی ہے کہ اپنے چھوٹے بھائی کو ساتھ لاؤ گے تو ملے گا ورنہ نہیں، اس لئے آپ آئندہ بنیامین کو بھی ہمارے ساتھ بھیج دیا تاکہ ہمیں آئندہ بھی غلہ مل سکے، اور ہم اس بھائی کی توپوری حفاظت کرنے والے ہیں، ان کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی۔

والد ماجد نے فرمایا کہ کیا ان کے بارے میں تم پر ایسا ہی اطمینان کروں جیسا اس سے پہلے ان کے بھائی یوسف کے بارے میں کیا تھا، مطلب ظاہر ہے کہ اب تمہاری بات کا اعتبار کیا ہے، ایک مرتبہ تم پر اطمینان کر کے مصیبت اٹھا چکا ہوں تم نے یہی الفاظ حفاظت کرنے کے اس وقت بھی بولے تھے یہ تو ان کی بات کا جواب تھا، مگر پھر خاندان کی ضرورت کے پیش نظر پیغمبرانہ توکل اور اس حقیقت کو اصل قرار دیا کہ کوئی نفع نقصان کسی بندہ کے ہاتھ میں نہیں جب تک اللہ تعالیٰ اسی کی مشیت و ارادہ نہ ہو، اور جب ان کا ارادہ ہو جائے تو پھر اس کو کوئی ٹال نہیں سکتا، اس لئے مخلوق پر بھروسہ بھی غلط ہے، اور ان کی شکایات پر معاملہ کا مدار رکھنا بھی نامناسب ہے۔

اس لئے فرمایا فَاللّٰهُ خَيْرٌ حَافِظًا، یعنی تمہاری حفاظت کا نتیجہ تو پہلے دیکھ چکا ہوں، اب تو میں اللہ تعالیٰ ہی کی حفاظت پر بھروسہ کرتا ہوں وَهُوَ اَرْحَمُ الرَّحِیْمِیْنَ، اور وہ سب سے زیادہ رحمت کرنے والا ہے، اسی سے امید ہے کہ وہ میری ضعیفی اور موجودہ غم و اندوہ پر نظر فرما کر مجھ پر دوسرے صدمے نہ ڈالے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے ظاہری حالات اور اپنی اولاد کے عہد و پیمان پر بھروسہ نہ کیا، مگر اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر چھوٹے بیٹے کو بھی ساتھ بھیجنے کے لئے تیار ہو گئے۔
وَلَمَّا فَتَحُوا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ قَالُوا يَا بَانَا مَا نَبْغِي هٰذِهِ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا وَتَمِیْرُ اَهْلِنَا وَتَحْفَظُ اَخَانَا وَنَزَدًا دَکِیْلَ بَعِیْرٍ ذٰلِكَ کَیْلٌ یَّسِیْرٌ

یعنی اب تک تو برادرانِ یوسف علیہ السلام کی یہ ابتدائی گفتگو حالاتِ سفر بیان کرنے کے دوران میں ہو رہی تھی، اب بھی سامان کھولا نہ تھا، اس کے بعد جب سامان کھولا اور دیکھا کہ ان کی وہ پونجی جو غلہ کی قیمت میں ادا کر کے آئے تھے وہ بھی سامان کے اندر موجود ہو تو اس وقت انہوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ کام سہوا نہیں ہوا بلکہ قسداً ہماری پونجی ہمیں واپس کر دی گئی ہے، اسی لئے رُدَّتْ اِلَیْنَا کہا، یعنی یہ پونجی ہمیں واپس کر دی گئی ہے، اور پھر والد محترم سے عرض کیا مَا نَبْغِي یعنی ہمیں اور کیا چاہیے کہ غلہ بھی آگیا اور اس کی قیمت بھی واپس مل گئی، اب تو ہمیں ضرور دوبارہ اپنے بھائی کو ساتھ لے کر اطمینان سے جانا چاہیے، کیونکہ اس معاملہ سے معلوم ہوا کہ عزیزِ مہر ہم پر بہت ہرمان ہے، اس لئے کوئی اندیشہ نہیں۔ ہم اپنے خاندان کے لئے غلہ لائیں اور بھائی کو بھی حفاظت سے رکھیں، اور بھائی کے حصہ کا غلہ مزید مل جائے، کیونکہ ہم جو کچھ لائے ہیں یہ تو ہمارے اخراجات کے مقابلہ میں بہت تھوڑا ہے، چند روز میں ختم ہو جائے گا۔

برادرانِ یوسف نے جو یہ جملہ مآتبغیٰ کہا اُس کا ایک مفہوم تو وہی ہے جو ابھی بتلایا گیا کہ ہمیں اس سے زیادہ کیا چاہئے، اور اس جملہ میں حرف مآ کو نفی کے معنی میں لیا جائے تو یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ اولادِ یعقوب علیہ السلام نے اپنے والد سے عرض کیا کہ اب تو ہمارے پاس غلہ لانے کے لئے قیمت موجود ہے ہم آپ سے کچھ نہیں مانگتے، آپ صرف بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دیں۔ والدِ محترم نے یہ سب باتیں سن کر جواب دیا، لَنْ أَرْسِلَكَ مَعَهُمْ حَتَّى تَوْتُوا بِمَوْتِ ثِقَاءٍ مِّنْ أَهْلِ كَلْبَئِیْنِ، یعنی میں بنیامین کو تمہارے ساتھ اُس وقت تک بھیجوں گا جب تک تم اللہ تعالیٰ کی قسم اور یہ عہد و پیمان مجھے نہ دیدو کہ تم اس کو ضرور اپنی ساتھ واپس لاؤ گے۔ مگر چونکہ حقیقت میں نفروں سے یہ بات کسی وقت غائب نہیں ہوتی کہ انسان ہمارے ظاہری قوت و قدرت کتنی ہی رکھتا ہو پھر بھی ہر چیز میں مجبور اور قدرتِ ہی جل شانہ کے سامنے عاجز ہو وہ کسی شخص کو حفاظت کے ساتھ واپس لانے کا عہد و پیمان ہی کیا کر سکتا ہے، کیونکہ وہ اس کے مکمل قدرت نہیں رکھتا، اس لئے اس عہد و پیمان کے ساتھ ایک ہتھیار بھی لگا دیا: إِلَّا أَنْ يُبَاطِلَ یُكْمِرُ، یعنی بجز اس صورت کے کہ تم سب کسی گھیرے میں آ جاؤ، امام تفسیر مجاہد نے اس کا مطلب یہ بیان کیا کہ تم سب ہلاک ہو جاؤ، اور قتادہ نے فرمایا کہ مطلب یہ ہے کہ تم بالکل عاجز اور مغلوب ہو جاؤ۔

فَلَمَّا آتَوْهُ مَوْتِیْقَهُمْ قَالَ اَللّٰهُ عَلٰی مَا نَقُولُ وَكِیْلٌ، یعنی جب صاحبزادوں نے مطلوبہ طریقہ پر عہد و پیمان کر لیا، یعنی سب نے قسمیں کھائیں اور والد کو اطمینان دلانے کیلئے بڑی شدت سے حلف کئے، تو یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ بنیامین کی حفاظت کے لئے حلف دینے اور حلف اٹھانے کا جو کام ہم کر رہے ہیں اس سب معاملہ کا بھروسہ اللہ تعالیٰ ہی پر ہے اسی کی توفیق سے کوئی کسی کی حفاظت کر سکتا ہے، اور اپنے عہد کو پورا کر سکتا ہے، ورنہ انسان بے بس ہے، اس کے ذاتی قبضہ قدرت میں کچھ نہیں۔

مذکورہ آیات میں انسان کے لئے بہت سی ہدایات اور احکام ہدایات و مسائل ہیں ان کو یاد رکھئے:

اولاد سے گناہ و خطا ہو جاتے تو قطع تعلق کے بجائے انکی اصلاح کی فکر کرنا چاہئے	پہلی ہدایت: برادرانِ یوسف علیہ السلام سے جو خطا اس سے پہلے سرزد ہوئی وہ بہت سے کبیرہ اور شدید گناہوں پر مشتمل تھی، مثلاً اول: جھوٹ بول کر والد کو اس پر آمادہ کرنا کہ وہ یوسف علیہ السلام کو ان کے ساتھ تفریق کے لئے بھیج دیں، دوسرے والد سے عہد کر کے اس کی خلاف ورزی، تیسرے چھوٹے محصنِ برائی سے بے رحمی اور شدت کا برتاؤ، چوتھے ضعیف
---	---

والد کی انتہائی دل آزاری کی پروانہ کرنا، پانچویں ایک بے گناہ انسان کو قتل کرنے کا منصوبہ بنانا
چھٹے ایک آزاد انسان کو جبراً اور ظلماً فروخت کر دینا۔

یہ ایسے انتہائی اور شدید جرائم تھے کہ جب یعقوب علیہ السلام پر یہ واضح ہو گیا کہ انھوں
نے جھوٹ بولا ہے اور دیدہ و دانستہ یوسف علیہ السلام کو ضائع کیا ہے تو اس کا مقتضی ایسا
یہ تھا کہ وہ ان صاحبزادوں سے قطع تعلق کر لیتے، یا ان کو نکال دیتے، مگر حضرت یعقوب علیہ السلام
نے ایسا نہیں کیا، بلکہ وہ بدستور والد کی خدمت میں رہی، یہاں تک کہ انھیں کو مصر سے غلہ لانے
کے لئے بھیجا، اور اس پر مزید یہ کہ دوبارہ پھر ان کو چھوٹے بھائی کے متعلق والد سے عرض معروض
کرنے کا موقع ملا اور بالآخر ان کی بات مان کر چھوٹے صاحبزادہ کو بھی ان کے حوالہ کر دیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اولاد سے کوئی گناہ و خطا سرزد ہو جائے تو باپ کو چاہئے کہ تربیت
کر کے ان کی اصلاح کی فکر کرے، اور جب تک اصلاح کی امید ہو قطع تعلق نہ کرے، جیسا کہ
حضرت یعقوب علیہ السلام نے ایسا ہی کیا، اور بالآخر وہ سب اپنی خطاؤں پر نادم اور
گناہوں سے تائب ہوئے، ہاں اگر اصلاح سے مایوسی ہو جائے اور ان کے ساتھ تعلق قائم
رکھنے میں دوسروں کے دین کا ضرر محسوس ہو تو پھر قطع تعلق کر لینا انسب ہے۔

دوسری ہدایت: اس حسن معاملہ اور حسن خلق کی ہے جو یہاں حضرت یعقوب علیہ السلام
سے ظاہر ہوا، کہ صاحبزادوں کے لئے شدید جرائم کے باوجود ان کا معاملہ ایسا رہا کہ دوبارہ چھوٹے
بھائی کو ساتھ لے جانے کی درخواست کرنے کی جرأت کر سکے۔

تیسری ہدایت یہ بھی ہے کہ ایسی صورت میں بغرض اصلاح خطا کار کو مبتلا دینا بھی
مناسب ہے کہ تمھارے معاملہ کا تقاضا تو یہ تھا کہ تمھاری بات نہ مانی جاتی، مگر ہم اس سے درگزر کرتے
ہیں، تاکہ وہ آئندہ شرمندہ ہو کر اس سے کلی طور پر تائب ہو جائے، جیسا کہ یعقوب علیہ السلام نے
اول مبتلایا، کہ کیا بنیامین کے معاملہ میں بھی تم پر ایسا ہی اطمینان کروں جیسا یوسف کے معاملہ
میں کیا تھا، مگر مبتلانے کے بعد غالب احوال سے ان کا تائب ہونا معلوم کر کے اللہ پر توکل
کیا، اور چھوٹے صاحبزادے کو ان کے حوالہ کر دیا۔

چوتھی ہدایت یہ ہے کہ کسی انسان کے وعدہ اور حفاظت پر حقیقی طور سے بھروسہ
کرنا غلطی ہے، اصل بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ پر ہونا چاہئے، وہی حقیقی کارساز اور مسبب اسباب
ہے، اسباب کو مہیا کرنا پھر ان میں تاثیر دینا سب انہی کی قدرت میں ہے، اسی لئے یعقوب
علیہ السلام نے فرمایا **فَاللّٰهُ خَيْرٌ حَافِظًا**۔

کعب احبار کا قول ہے کہ اس مرتبہ چونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے صرف اولاد کے

کہنے پر بھروسہ نہیں کیا، بلکہ معاملہ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کیا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قسم ہو میری عزت و جلال کی کہ اب میں آپ کے دونوں بیٹوں کو آپ کے پاس واپس بھیجوں گا۔

سوال مسئلہ اس میں یہ ہے کہ اگر دوسرے شخص کا مال یا کوئی چیز اپنے سامان میں بھلے اور قرآن قویہ اس پر شاہد ہوں کہ اس نے بالقصد ہمیں دینے ہی کے لئے ہمارے سامان میں باندھ دیا ہے، تو اس کو اپنے لئے رکھنا اور اس میں تصرف کرنا جائز ہے، جیسے یہ پونجی جو برادرانِ یوسف کے سامان سے برآمد ہوئی، اور قرآن قویہ اس پر شاہد تھے کہ کسی بھٹول یا نسیان سے ایسا نہیں ہوا بلکہ قصداً اس کو واپس دیدیا گیا ہے، اس لئے حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس قسم کی واپسی کی ہدایت نہیں فرمائی، لیکن جہاں یہ اشتباہ موجود ہو کہ شاید بھولے سے ہمارے پاس آگئی وہاں مالک سے تحقیق اور دریافت کئے بغیر اس کا استعمال کرنا جائز نہیں۔

چھٹا مسئلہ اس میں یہ ہے کہ کسی شخص کو ایسی قسم دینا نہیں چاہئے جس کا پورا کرنا بالکل اس کے قبضہ میں نہ ہو، جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام نے بنیامین کو صحیح ہالم واپس لانے کی قسم دی تو اس میں سے اس حالت کو مستثنیٰ کر دیا کہ یہ بالکل عاجز و مجبور ہو جائیں یا خود بھی سب ہلاکت میں پڑ جائیں۔

اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اپنی اطاعت کا عہد لیا تو خود اس میں استطاعت کی قید لگا دی، یعنی جہاں تک ہماری قدرت و استطاعت میں داخل ہے ہم آپ کی پوری اطاعت کریں گے۔

سوال مسئلہ اس میں یہ ہے کہ برادرانِ یوسف سے عہد و پیمان لینا کہ وہ بنیامین کو واپس لائیں گے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفالت بنفس جائز ہے، یعنی کسی مقدمہ میں ماخوذ انسان کو مقدمہ کی تالیخ پر حاضر کرنے کی ضمانت کر لینا درست ہے۔

اس مسئلہ میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا اختلاف ہے، وہ صرف مالی ضمانت کو جائز رکھتے ہیں، نفس انسانی کی ضمانت کو جائز نہیں رکھتے۔

وَقَالَ يَبْنِي لَا تَدْخُلُوا مِنْ بَابٍ وَاحِدٍ وَاذْخُلُوا مِنْ

اور کہائے بیٹو! نہ داخل ہونا ایک دروازے سے اور داخل ہونا کئی دروازوں

أَبْوَابٍ مُتَفَرِّقَةٍ وَمَا أُغْنِي عَنْكُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ

سے جدا جدا، اور میں نہیں بچا سکتا تم کو اللہ کی کسی بات سے،

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ

حکم کسی کا نہیں سوائے اللہ کے اسی پر بھروسہ کرو اور اسی پر بھروسہ چاہئے۔ بھروسہ

الْمُتَوَكِّلُونَ ﴿٦٨﴾ وَلَمَّا دَخَلُوا مِنْ حَيْثُ أَمَرَهُمْ أَبُوهُمْ

کرنے والوں کو ، اور جب داخل ہوئے جہاں سے کہا تھا ان کے باپ نے

مَا كَانَ يُغْنِي عَنْهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا حَاجَةً فِي نَفْسِ

کچھ نہیں بچا سکتا تھا ان کو اللہ کی کسی بات سے مگر ایک خواہش تھی یعقوب کے

يَعْقُوبَ قَضَاهَا وَرَأَىٰ لَكُمُ اللَّيْمَ عَلَيْهِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ

جی میں سو پوری کر چکا ، اور وہ تو خبردار تھا جو کچھ ہم نے سکھایا اس کو لیکن بہت لوگوں کو

النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٦٩﴾ وَلَمَّا دَخَلُوا عَلَىٰ يُوسُفَ أَوَىٰ

خبر نہیں ، اور جب داخل ہوئے یوسف کے پاس اپنے پاس

إِلَيْهِ أَخَاهُ قَالَ إِنِّي أَنَا خَوْلِكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا

رکھا اپنے بھائی کو ، کہا تحقیق میں ہوں بھائی تیرا سو غمگین مت ہو ان کاموں سے

يَعْمَلُونَ ﴿٧٠﴾

جو انھوں نے کئے ہیں۔

حُلاصہ تفسیر

اور رچلتے وقت (یعقوب علیہ السلام) نے (ان سے) فرمایا کہ اے میرے بیٹو !

رجب مصر میں پہنچو تو سب کے سب ایک ہی دروازہ سے مت جانا بلکہ علیحدہ علیحدہ دروازوں

سے جانا اور (یہ فصل ایک تدبیر ظاہری ہے بعض کردہات مثل نظر بد وغیرہ سے بچنے کی باقی)

خدا کے حکم کو تم پر سے میں ٹال نہیں سکتا ، حکم تو بس اللہ ہی کا (چلتا) ہے (باد جو اس تدبیر

ظاہری کے دل سے) اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی پر بھروسہ رکھنے والوں کو بھروسہ

رکھنا چاہئے ، (یعنی تم بھی اسی پر بھروسہ رکھنا تدبیر پر نظر مت کرنا ، غرض سب رخصت ہو کر

چلے) اور جب (مصر پہنچ کر) جس طرح ان کے باپ نے کہا تھا (اسی طرح شہر کے اندر داخل ہوؤ تو

باپ کا ارمان پورا ہو گیا) (باقی) ان کے باپ کو ان سے (یہ تدبیر بتلا کر) خدا کا حکم ٹالنا مقصود نہ تھا (تاکہ ان پر کسی قسم کا اعتراض

تدبیر کے نافع نہ ہونے سے آپز شبہ لازم آئے چنانچہ خود انھوں ہی فرمادیا تھا مَا أُغْنِي عَنْكُمْ إِنِّي لَيْكِن يٰعِصْرُوبَ (علیہ السلام) کے جی میں

(درجہ تدبیر میں) ایک ارباب (آیا) تھا جسکو انھوں نے ظاہر کر دیا اور وہ بلاشبہ بڑے عالم تھے با ایں وجہ کہ ہم نے انکو علم دیا تھا (وہ علم کے خلاف تدبیر کو اعتقاد امونثر حقیقی کب سمجھ سکتے تھے، صرف ان کے اس قول کی وجہ وہی علم ایک تدبیر کا ارتکاب تھا جو کہ مشروع و محمود ہے) لیکن اکثر لوگ اس کا علم نہیں رکھتے (بلکہ جہل سے تدبیر کو مونثر حقیقی اعتقاد کر لیتے ہیں) اور جب یہ لوگ (یعنی برادران یوسف) یوسف (علیہ السلام) کے پاس پہنچے (اور بنیامین کو پیش کر کے کہا کہ ہم آپ کے حکم کے موافق ان کو لاتے ہیں) انھوں نے اپنے بھائی کو اپنے ساتھ ملا لیا (اور تنہائی میں ان سے) کہا کہ میں تیرا بھائی (یوسف) ہوں سو یہ لوگ جو کچھ (بدسلوکی) کرتے رہے ہیں اس کا بیخ مت کرنا (کیونکہ اب تو اللہ نے ہم کو ملا دیا اب سب غم بھلا دینا چاہئے) یوسف علیہ السلام کے ساتھ بدسلوکی تو ظاہر اور مشہور ہے، رہا بنیامین کے ساتھ، سو یا تو ان کو بھی کچھ تکلیف دی ہو، ورنہ یوسف علیہ السلام کی جدائی کیا ان کے حق میں کچھ کم تکلیف تھی، پھر دونوں بھائیوں نے مشورہ کیا کہ کوئی ایسی صورت ہو کہ بنیامین یوسف علیہ السلام کے پاس رہیں کیونکہ ایسے رہیں تو اور بھائیوں کا بوجہ عہد سوگند کے اصرار ہو گا نا ہی جھگڑا ہو گا، اور پھر اگر وجہ بھی ظاہر ہو گئی تو راز کھلا، اور اگر مخفی رہی تو یعقوب علیہ السلام کا بیخ بڑھے گا، کہ بلا سبب کیوں رکھے گئے، یا کیوں رہی، یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ تدبیر تو ہے مگر ذرا تمھاری بدنامی ہے، بنیامین نے کہا کچھ پردہ نہیں، غرض ان میں یہ امر قرار پا گیا، اور ادھر سب کو غلہ دے کر ان کی رخصت کا سامان درست کیا گیا) :

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں برادران کا یوسف علیہ السلام کے چھوٹے بھائی کو ساتھ لے کر دوسری مرتبہ سفر مصر کا ذکر ہے، اس وقت حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کو شہر مصر میں داخل ہونے کے لئے ایک خاص وصیت یہ فرمائی کہ اب تم گیارہ بھائی وہاں جا رہے ہو تو شہر کے ایک ہی دروازہ سے سب داخل نہ ہونا، بلکہ شہر نیاہ کے پاس پہنچ کر متفرق ہو جانا اور شہر کے مختلف دروازوں سے داخل ہونا۔

سبب اس وصیت کا یہ اندیشہ تھا کہ یہ سب نوجوان اور ماشاء اللہ صحت مند قداور صاحب جمال و صاحب دجاہت ہیں، ایسا نہ ہو کہ جب لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ یہ سب ایک ہی باپ کی اولاد اور بھائی بھائی ہیں تو کسی بد نظر کی نظر لگ جائے، جس سے ان کو کوئی تکلیف پہنچے، یا اجتماعی طور سے داخل ہونے کی وجہ سے کچھ لوگ حسد کرنے لگیں، اور تکلیف پہنچائیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کو یہ وصیت پہلی مرتبہ نہیں کی، اس دوسرے سفر کے موقع پر فرمائی، اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ پہلی مرتبہ تو یہ لوگ مصر میں مسافرانہ اور شکستہ حالت میں داخل ہوئے تھے نہ کوئی ان کو پہچانتا تھا نہ کسی سے ان کے حال پر زیادہ توجہ دینے کا خطرہ تھا، مگر پہلے ہی سفر میں ملک مصر نے ان کا غیر معمولی اکرام کیا، جس سے عام ارکانِ دولت اور شہر کے لوگوں میں تعارف ہو گیا، تو اب یہ خطرہ قوی ہو گیا کہ کسی کی نظر لگ جائے، یا سب کو ایک باشوکت جماعت سمجھ کر کچھ لوگ حسد کرنے لگیں، نیز اس مرتبہ بنیامین چھوٹے بیٹے کا ساتھ ہونا بھی والد کے لئے اور زیادہ توجہ دینے کا سبب ہوا۔

نظر بد کا اثر حق ہے | اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی نظر لگ جانا اور اس سے کسی دوسرے انسان یا جانور وغیرہ کو تکلیف ہو جانا یا نقصان پہنچ جانا حق ہے، محض جاہلانہ وہم و خیال نہیں، اسی لئے حضرت یعقوب علیہ السلام کو اس کی فکر ہوئی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی تصدیق فرمائی ہے، ایک حدیث میں ہے کہ نظر بد ایک انسان کو قبر میں اور اونٹ کو ہنڈیا میں داخل کر دیتی ہے، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چیزوں سے پناہ مانگی، اور اُمت کو پناہ مانگنے کی تلقین فرمائی ہے، ان میں من کل عین لامة بھی مذکور ہے، یعنی میں پناہ مانگتا ہوں نظر بد سے (قرطبی)

صحابہ کرام میں سہل بن حنیف کا واقعہ معروف ہے کہ انھوں نے ایک موقع پر غسل کرنے کے لئے کپڑے اتارے تو ان کے سفید رنگ تندرست بدن پر عامر بن ربیعہ کی نظر پڑ گئی، اور ان کی زبان سے نکلا کہ میں نے تو آج تک اتنا حسین بدن کسی کا نہیں دیکھا، یہ کہنا تھا کہ فوراً سہل بن حنیف کو سخت بخار چڑھ گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے یہ علاج تجویز کیا کہ عامر بن ربیعہ کو حکم دیا کہ وہ وضو کریں اور وضو کا پانی کسی برتن میں جمع کریں، یہ پانی سہل بن حنیف کے بدن پر ڈالا جائے، ایسا ہی کیا گیا، تو فوراً بخار اتر گیا، اور وہ بالکل تندرست ہو کر جس مہم پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا رہے تھے اس پر روانہ ہو گئے، اس واقعہ میں آپ نے عامر بن ربیعہ کو یہ تنبیہ بھی فرمائی:

علام یقتل احدکم انحاء
الا بترکت ان العین حق،
”کوئی شخص اپنے بھائی کو کیوں قتل
کرتا ہے، مگر نے ایسا کیوں نہ کیا کہ جب

ان کا بدن تمہیں خوب نظر آیا تو برکت کی دعا کر لیتے، نظر کا اثر ہو جانا حق ہے۔“

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب کسی شخص کو کسی دوسرے کی جان و مال میں کوئی اچھی بات تعجب انگیز نظر آئے تو اس کو چاہئے کہ اس کے واسطے یہ دعا کرے کہ

اللہ تعالیٰ اس میں برکت عطا فرماویں، بعض روایات میں ہے کہ مَا شَاءَ اللَّهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ، کہے، اس سے نظر بد کا اثر جاتا رہتا ہے، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی کی نظر بد کسی کو لگ جائے تو نظر لگانے والے کے ہاتھ پاؤں اور چہرہ کا غسل اس کے بدن پر ڈالنا نظر بد کے اثر کو زائل کر دیتا ہے۔

قرطبی نے فرمایا کہ تمام علماء امت اہل سنت والجماعت کا اس پر اتفاق ہے کہ نظر بد لگ جانا اور اس سے نقصان پہنچ جانا حق ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے ایک طرف تو نظر بد یا حسد کے اندیشہ سے اولاد کو یہ وصیت فرمائی کہ سب مل کر ایک دروازہ سے شہر میں داخل نہ ہوں، دوسری طرف ایک حقیقت کا اظہار بھی ضروری سمجھا، جس سے غفلت کی بنا پر ایسے معاملات میں بہت سے عوام جاہلانہ خیالات و ادہام کے شکار ہو جاتے ہیں، وہ یہ کہ نظر بد کی تاثیر کسی انسان کے جان و مال میں ایک قسم کا مسمومیت ہے، اور وہ ایسا ہی ہے جیسے مضر دوا یا غذا انسان کو بیمار کر دیتی ہے، گرمی، سردی کی شدت سے امراض پیدا ہو جاتے ہیں، اسی طرح نظر بد یا مسمومیت کے تصرفات بھی اپنی سبب عادیہ میں سے ہیں کہ نظر یا خیال کی قوت سے اس کے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں، ان میں خود کوئی تاثیر حقیقی نہیں ہوتی، بلکہ سب اسباب عالم حق جل شانہ کی قدرت کاملہ اور مشیت دارادہ کے تابع ہیں، تقدیر خداوندی کے مقابلہ میں نہ کوئی مفید تدبیر مفید ہو سکتی ہے، نہ مضر تدبیر کی مضریت اثر انداز ہو سکتی ہے اس لئے ارشاد فرمایا:

وَمَا أَغْنَىٰ عَنْكَ مِثْرُ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمٌ قَدِيرٌ
وَعَلَيْكَ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ
یعنی نظر بد سے بچنے کی جو تدبیریں نے بتلائی ہو
میں جانتا ہوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت دارادہ کو نہیں ٹال سکتی، حکم تو صرف اللہ ہی کا
چلتا ہے، البتہ انسان کو ظاہری تدبیر کرنے کا حکم ہے، اس لئے یہ وصیت کی گئی، مگر میرا بھروسہ
اس تدبیر پر نہیں بلکہ اللہ ہی پر اعتماد ہو اور ہر شخص کو یہی لازم ہے کہ اسی پر اعتماد اور بھروسہ
کرے، ظاہری اور مادی تدبیروں پر بھروسہ نہ کرے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے جس حقیقت کا اظہار فرمایا، اتفاقاً ہوا بھی کچھ ایسا
ہی کہ اس سفر میں بھی بنیامین کو حفاظت کے ساتھ واپس لانے کی ساری تدبیریں محمل
کر لینے کے باوجود سب چیزیں ناکام ہو گئیں، اور بنیامین کو مصر میں روک لیا گیا، جس کے نتیجہ
میں حضرت یعقوب علیہ السلام کو ایک دوسرا شدید صدمہ پہنچا، ان کی تدبیر کا ناکام
ہونا جو اگلی آیت میں منصوص ہے اس کا مقصد یہی ہے کہ اصل مقصد کے لحاظ سے تدبیر کا

ہو گئی، اگرچہ نظر بد یا حسد وغیرہ سے بچنے کی تدبیر کامیاب ہوئی، کیونکہ اس سفر میں ایسا واقعہ پیش نہیں آیا، مگر بتقریر اتنی جو حادثہ پیش آنے والا تھا اس طرف یعقوب علیہ السلام کی نظر نہ گئی اور نہ اس کے لئے کوئی تدبیر کر سکتے، مگر اس ظاہری ناکامی کے باوجود ان کے توکل کی برکت سے یہ دوسرا صدمہ پہلے صدمہ کا بھی علاج ثابت ہوا، اور بڑی عافیت و عزت کے ساتھ یوسف اور بنیامین دونوں سے ملاقات انجام کار نصیب ہوئی۔

اسی مضمون کا بیان اس کے بعد کی آیت میں اس طرح آیا کہ صاحبزادوں نے والد کے حکم کی تعمیل کی، شہر کے متفرق دروازوں سے مصر میں داخل ہوئے، تو باپ کا ارمان پورا ہو گیا، ان کی یہ تدبیر اللہ کے کسی حکم کو ٹال نہ سکتی تھی، مگر یعقوب علیہ السلام کی پدرانہ شفقت و محبت کا تقاضا تھا جو انھوں نے پورا کر لیا۔

اس آیت کے آخر میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی مدح ان الفاظ میں کی گئی ہے
وَأَنَّا كُنَّا نَعْلَمُ لِمَا عَمِلْتُمْ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ، یعنی یعقوب علیہ السلام بڑے علم والے تھے، کیونکہ ان کو ہم نے علم دیا تھا، مطلب یہ ہے کہ عام لوگوں کی طرح ان کا علم کتابی اور اکتسابی نہیں بلکہ بلا واسطہ عطاءِ خداوندی اور وہی علم تھا، اسی لئے انھوں نے ظاہری تدبیر جو شرعاً مشروع اور محمود ہو رہی تو کر لی، مگر اس پر بھروسہ نہیں کیا، مگر بہت لوگ اس بات کی حقیقت کو نہیں جانتے اور ناواقفیت سے یعقوب علیہ السلام کے بارے میں ایسے شبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں، کہ یہ تدبیریں پیغمبر کی شان کے شایاں نہ تھیں۔ بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ پہلے لفظ علم سے مراد علم کے مقتضی پر عمل کرنا ہے اور مطلب یہ ہے کہ ہم نے جو علم ان کو عطا کیا وہ اس پر عامل اور اس کے پابند تھے، اسی لئے ظاہری تدبیروں پر بھروسہ نہیں فرمایا، بلکہ اعتماد اور بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ ہی پر فرمایا۔

وَلَمَّا دَخَلُوا عَلَى يُوسُفَ أَوَّلَىٰ إِلَيْهِ أَخَاهُ قَالَ إِنِّي أَنَا أَخُوكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ، یعنی جب شہر مصر پہنچنے کے بعد یہ سب بھائی یوسف علیہ السلام کے دربار میں حاضر ہوئے اور انھوں نے دیکھا کہ یہ وعدہ کے مطابق ان کے حقیقی بھائی کو بھی ساتھ لے آئے ہیں تو یوسف علیہ السلام نے اپنے حقیقی بھائی بنیامین کو خاص اپنے ساتھ ٹھہرایا، امام تفسیر قتادہؒ نے فرمایا کہ ان سب بھائیوں کے قیام کا یوسف علیہ السلام نے یہ انتظام فرمایا تھا کہ دو دو کو ایک کمرہ میں ٹھہرایا، تو بنیامین تنہا رہ گئے، ان کو اپنے ساتھ ٹھہرنے کے لئے فرمایا، جب تنہائی کا موقع آیا تو یوسف علیہ السلام

نے حقیقی بھائی پر راز فاش کر دیا، اور بتلا دیا کہ میں ہی تمہارا حقیقی بھائی یوسف ہوں، اب تم کوئی فکر نہ کرو، اور جو کچھ ان بھائیوں نے اب تک کیا ہے اس سے پریشان نہ ہو۔

نذکرہ دو آیتوں سے چند مسائل اور احکام معلوم ہوئے:

احکام و مسائل | اول یہ کہ نظر بد کا لگ جانا حق ہے، اس سے بچنے کی تدبیر کرنا

اسی طرح مشروع اور محمود ہر جس طرح مضر غذاؤں اور مضر افعال سے بچنے کی تدبیر کرنا۔
دوسرے یہ کہ لوگوں کے حسد سے بچنے کے لئے اپنی مخصوص نعمتوں اور اوصاف کا لوگوں سے چھپانا درست ہے۔

تیسرے یہ کہ مضر آثار سے بچنے کے لئے ظاہری اور مادی تدبیریں کرنا توکل اور شانِ انبیاء کے خلاف نہیں۔

چوتھے یہ کہ جب ایک شخص کو کسی دوسرے شخص کے بارہ میں کسی تکلیف کے پہنچ جانے کا اندیشہ ہو تو بہتر یہ ہو کہ اس کو آگاہ کر دے، اور اندیشہ سے بچنے کی ممکن تدبیر بتلا دے جیسے یعقوب علیہ السلام نے کیا۔

پانچویں یہ کہ جب کسی شخص کو دوسرے شخص کا کوئی کمال یا نعمت تعجب انگیز معلوم ہو اور خطرہ ہو کہ اس کو نظر بد لگ جائے گی تو اس پر واجب ہو کہ اس کو دیکھ کر بَارَكَ اللہ یا ماشاء اللہ کہہ لے، تاکہ دوسرے کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

چھٹے یہ کہ نظر بد سے بچنے کے لئے ہر ممکن تدبیر کرنا جائز ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہو کہ کسی دعا، اور تعویذ وغیرہ سے علاج کیا جائے جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفر بن ابی طالب کے دو لڑکوں کو کمزور دیکھ کر اس کی اجازت دی کہ تعویذ وغیرہ کے ذریعہ ان کا علاج کیا جائے۔

ساتھویں یہ کہ دانشمند مسلمان کا کام یہ ہے کہ ہر کام میں اصل بھروسہ تو اللہ تعالیٰ پر رکھے، مگر ظاہری اور مادی اسباب کو بھی نظر انداز نہ کرے، جس قدر جائز اسباب اپنے مقصد کے حصول کے لئے اس کے اختیار میں ہوں ان کو بردے کا رولانے میں کوتاہی نہ کرے، جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام نے کیا، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی تعلیم فرمائی ہو داناتے روم نے فرمایا: "بَرُّ تَوَكُّلٍ زَانُو سَے اسْتَرْبَہ بِنْد"۔

یہی پیغمبرانہ توکل اور سنتِ رسول ہے۔

آٹھویں یہ کہ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہو کہ یوسف علیہ السلام نے اپنے چھوٹے بھائی کو تو بلانے کے لئے بھی کوشش اور تاکید کی، اور پھر جب وہ آگئے تو ان پر اپنا راز بھی

ظاہر کر دیا، مگر والدِ محترم کے نہ بلانے کی فکر فرمائی اور نہ اُن کو اپنے خیریت سے مطلع کرنے کا کوئی اقدام کیا، اس کی وجہ وہی ہے جو پہلے بیان کی گئی ہے کہ اس پورے چالیس سال کے عرصہ میں بہت سے مواقع تھے کہ والدِ ماجد کو اپنے حال اور خیریت کی اطلاع دیتے، لیکن یہ جو کچھ ہوا وہ بھگم قنڈار و قدر باشاراتِ وحی ہوا، ابھی تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی اجازت نہ ملی ہوگی کہ والدِ محترم کو حالات سے باخبر کیا جائے، کیونکہ ابھی ان کا ایک اور امتحان بنیامین کی مفارقت کے ذریعہ بھی ہونے والا تھا، اس کی تکمیل ہی کے لئے یہ سب صورتیں پیدا کی گئیں۔

فَلَمَّا جَاهَزَهُمْ بَعْرَمَازِهِمْ جَعَلَ السَّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ

پھر جب تیار کر دیا ان کے واسطے اسباب ان کا رکھ دیا اپنے کا پیالہ اسباب میں اپنے بھائی کے

ثُمَّ آذَنَ مُوْذِنٌ مِّنْ أَيْتِنَا الْعِيرَ انْظُرْ لَّسِرْقُونَ ﴿٤٠﴾ قَالُوا وَ

پھر بجلا اچکارنے والے نے اے قافلہ والو تم تو البتہ چور ہو، کہنے لگے مٹھ

أَقْبِلُوا عَلَيْهِمْ مَاذَا تَفْقِدُونَ ﴿٤١﴾ قَالُوا تَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ

کر کے ان کی طرف تھلائی کیا چیز گم ہو گئی، بولے ہم نہیں پاتے بادشاہ کا پیالہ

وَلَمِنْ جَاءَ بِهِ حِمْلُ يَئِيرٍ وَأَنَا بِهِ زَعِيمٌ ﴿٤٢﴾ قَالُوا نَالَهُ

اور جو کوئی اس کو لئے اس کو لے ایک بوجھ اونٹ کا اور میں ہوں اس کا ضامن، بولے قسم اللہ کی

لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفِيسَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كُنَّا سِرْقِينَ ﴿٤٣﴾

تم کو معلوم ہو ہم شرارت کرنے کو نہیں آتے ملک میں اور نہ ہم کبھی چور تھے،

قَالُوا اقْسِمُوا بِآؤَةٍ إِن كُنْتُمْ كَاذِبِينَ ﴿٤٤﴾ قَالُوا اجْزَاؤُهُ

بولے پھر کیا سزا ہے اس کی اگر تم نکلے بھوٹے، کہنے لگے اس کی سزا یہ ہے

مَنْ وَجِدَ فِي رَحْلِهِ فَهُوَ جَزَاؤُهُ كَذَلِكَ نَجْزِي

کہ جس کے اسباب میں سے ہاتھ آئے وہی اس کے بدلے میں جائے، ہم یہی سزا دیتے ہیں

الظَّالِمِينَ ﴿٤٥﴾ فَبَدَأَ بِأَوْعِيَّتِهِمْ قَبْلَ وِعَاءِ أَخِيهِ ثُمَّ

ظالموں کو، پھر شروع کی یوسفؑ نے انکی شرعیاں دیکھنی اپنے بھائی کی خربج سے پہلے آخر کو وہ

اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِعَاءِ أَخِيهِ طَغَا لَكَ كَذَنَّا لِيُوسُفَ ط

برتن نکالا اپنے بھائی کی خربج سے، یوں دانا بتایا ہم نے یوسفؑ کو،

مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ

وہ ہرگز نہ لے سکتا تھا اپنے بھائی کو دین میں اس بادشاہ کے، مگر جو چاہے اللہ

ذَرَفَعُ دَرَجَاتٍ مِّنْ نَّشَأِهِ وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ ﴿٧٦﴾

ہم درجے بلند کرتے ہیں جس کے چاہیں اور ہر جاننے والے سے اوپر ہے ایک جانتے والا۔

خلاصہ تفسیر

پھر جب یوسف (علیہ السلام) نے ان کا سامان (غلہ اور روانگی کا) تیار کر دیا تو خود دیا کسی محترم کی معرفت (پانی پینے کا برتن) کہ وہی پیانہ غلہ دینے کا بھی تھا (اپنے بھائی کے اسباب میں رکھ دیا پھر جب یہ لاد پہنچا کر چیلے تو یوسف علیہ السلام کے حکم سے پیچھے سے) ایک پھالنے والے نے پکارا کہ اے قافلہ والو تم ضرور چور ہو وہ ان (تلاش کرنے والوں) کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے کہ تمہاری کیا چیز گم ہو گئی ہے (جس کی چوری کا ہم پر شبہ ہوا) انھوں نے کہا کہ ہم کو بادشاہی پیانہ نہیں ملتا (وہ غائب ہی) اور جو شخص اس کو (لا کر) حاضر کرے اس کو ایک بار شتر غلہ (بطور انعام کے خزانہ سے) ملے گا اور یا یہ مطلب ہو کہ اگر خود چور بھی مال دیکھ تو عفو کے بعد انعام پائے گا) اور میں اس (کے دلوانے) کا ذمہ دار ہوں (غالباً یہ ندا اور یہ وعدہ انعام بحکم یوسف علیہ السلام ہو گا) یہ لوگ کہنے لگے کہ بخدا تم کو خوب معلوم ہے کہ ہم ملک میں فساد پھیلانے (جس میں چوری بھی داخل ہے) نہیں آئے اور ہم لوگ چوری کرنے والے نہیں (یعنی ہمارا یہ شیوہ نہیں ہے) ان (ڈھونڈنے والے) لوگوں نے کہا اچھا اگر تم جھوٹے بکھے (اور تم میں سے کسی پر سرفقہ ثابت ہو گیا) تو اس (چور) کی کیا سزا ہو انھوں نے (موافق شریعت یعقوب علیہ السلام کے) جواب دیا کہ اس کی سزا یہ ہے کہ وہ جس شخص کے اسباب میں ملے پس وہی اپنی سزا اپنے (یعنی چوری کی عوض میں خود اس کی داغ بوب کو صاحب مال اپنا غلام بنالے) ہم لوگ ظالموں (یعنی چوروں) کو ایسی سزا دیا کرتے ہیں (یعنی ہماری شریعت میں یہی مسئلہ اور عمل ہے) غرض یہ امور باہم ٹھہرنے کے بعد اسباب اتر دیا گیا (پھر (تلاشی کے وقت) یوسف علیہ السلام نے) (خود یا کسی محترم کی معرفت) اپنے بھائی کے (اسباب کے) تھیلے سے قبل تلاشی کی ابتدا (اول دو سہرے بھائیوں کے (اسباب کے) تھیلوں سے) کی پھر (اخیر میں) اس (برتن) کو اپنے بھائی کے (اسباب کے) تھیلے سے برآمد کیا، ہم نے یوسف علیہ السلام کی خاطر سے اس طرح (بنیامین کے رکھنے کی) تدبیر فرمائی (وجہ اس تدبیر کی یہ ہوتی کہ) یوسف اپنے بھائی کو اس بادشاہ (مصر)

کے قانون کی رُو سے نہیں لے سکتے تھے کیونکہ اس کے قانون میں کچھ تادیب و جرمانہ تھا (روای الطبرانی عن محمد والادل فی روح المعانی) مگر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کو منظور تھا (اس لئے یوسف علیہ السلام کے دل میں یہ تدبیر آئی، اور ان لوگوں کے مُنہ سے یہ فتویٰ نکلا، اور اس مجموعہ سے تدبیر راست آگئی اور چونکہ یہ حقیقت غلام بنانا نہ تھا بلکہ بنیامین کی خوشی سے صورت غلامی کی اختیار کی تھی، اس لئے استرقاقِ بحر کا مشبہ لازم نہیں آیا، اور گو یوسف علیہ السلام بڑے عالم و قابل تھے، مگر کچھ بھی ہماری تدبیر سکھانے کے محتاج تھے، بلکہ ہم جسکو چاہتے ہیں (علم میں) خاص درجوں تک بڑھا دیتے ہیں، اور تمام علم والوں سے بڑھ کر ایک بڑا علم والا ہے، (یعنی اللہ تعالیٰ) جب مخلوق کا علم ناقص ٹھہرا اور علم خالق کا ملق لا محالہ ہر مخلوق اپنے علم میں اور تدبیر میں محتاج ہوگی خالق کی، اس لئے کہنا اور اَلَا اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ کہا گیا، حاصل یہ کہ جب اُن کے اسبابِ دہ برتن برآمد ہو گیا اور بنیامین روک لئے گئے تو وہ سب بڑے شرمندہ ہوئے)۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں اس کا بیان ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے حقیقی بھائی بنیامین کو اپنے پاس روک لینے کے لئے یہ حیلہ اور تدبیر اختیار کی کہ جب سب بھائیوں کو قافلہ کے موافق غلہ دیا گیا تو ہر بھائی کا غلہ ایک مستقل اونٹ پر علیحدہ علیحدہ نام بنام بار کیا گیا۔ بنیامین کے لئے جو غلہ اونٹ پر لاد ا گیا اس میں ایک برتن چھپا دیا گیا، اس برتن کو قرآن کریم نے ایک جگہ بلغظ سقایہ اور دوسری جگہ صَوَاعِ الْمَلِكِ کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے، سقایہ کے معنی پانی پینے کا برتن اور صَوَاعِ بھی اسی طرح کے برتن کو کہتے ہیں، اس کو ملک کی طرف منسوب کرنے سے اتنی بات اور معلوم ہوئی کہ یہ برتن کوئی خاص قیمت اور حیثیت رکھتا تھا، بعض روایات میں ہے کہ زبرد کا بنا ہوا تھا، بعض نے سونے کا بعض نے چاندی کا بتلایا ہے، بہر حال یہ برتن جو بنیامین کے سامان میں چھپا دیا گیا تھا خاصہ قیمتی برتن ہونے کے علاوہ ملک مصر سے کوئی اختصاص بھی رکھتا تھا، خواہ یہ کہ وہ خود اس کو استعمال کرتے تھے یا یہ کہ ملک نے بامرئ خود اس برتن کو غلہ ناپنے کا پیمانہ بنا دیا تھا۔

ثُمَّ اٰذَنَ مُوْسٰی اَيْتَرُمَا الْعِيْدَ اِنَّكُمْ لَسَرِحَوْنَ، یعنی کچھ دیر کے بعد ایک منادی

کرنے والے نے پکارا کہ اے قافلہ والو تم چور ہو۔

یہاں لفظ شتم سے محذوم ہوتا ہے کہ یہ منادی فوراً ہی نہیں کی گئی، بلکہ کچھ مہلت دی گئی

یہاں تک کہ قافلہ روانہ ہو گیا، اس کے بعد یہ منادی کی گئی تاکہ کسی کو جلسازی کا شبہ نہ ہو جائے

بہر حال اس منادی کرنے والے نے برادرانِ یوسف کے قافلہ کو چور قرار دیدیا۔

قَالُوا اَوْ اَقْبَلُوا عَلَيْنَا مَاذَا لَنَا فَقُلْ وَاَنْتَ لَیْسَ بِرَبٍّ عَلِيمٍ، یعنی برادرانِ یوسف منادی کرنے والوں کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے کہ تم ہمیں چور بنا رہے ہو، یہ تو کہو کہ تمہاری کیا چیز گم ہو گئی ہے؟
قَالُوا لَنْفَقِدَ صُرُوعًا نَسِيلًا لِّوَلَدِنَا جَاءَ بِهِ حِمْلًا بَعِيرًا وَاَنَّا بِهٖ زَعِيمٌ، منادی کرنے والوں نے کہا بادشاہ کا صُرُوع یعنی برتن گم ہو گیا ہے اور جو شخص اس کو کہیں سے برآمد کرے گا اس کو ایک اونٹ بھرغلہ انعام میں ملے گا، اور میں اس کا ذمہ دار ہوں۔

یہاں ایک سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بنیامین کو اپنے پاس روکنے کا یہ حیلہ بھی کیوں کیا، جبکہ ان کو معلوم تھا کہ والد ماجد پر خود ان کی مفارقت کا صدمہ ناقابلِ برداشت تھا، اب دوسرے بھائی کو روک کر ان کو دوسرا صدمہ دینا کیسے گوارا کیا؟
دوسرا سوال اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ بے گناہ بھائیوں پر چوری کا الزام لگانا اور اس کے لئے یہ مجلسازی کہ ان کے سامان میں خفیہ طور سے کوئی چیز رکھ دی، اور پھر علانیہ ان کی رسوائی ظاہر ہو، یہ سب کام ناجائز ہیں، اللہ کے نبی یوسف علیہ السلام نے ان کو کیسے گوارا کیا؟

بعض مفسرین قرطبی وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ جب بنیامین نے یوسف علیہ السلام کو پہچان لیا اور وہ مطمئن ہو گئے، تو بھائی سے یہ درخواست کی کہ اب آپ مجھے ان بھائیوں کے ساتھ واپس نہ بھیجئے، مجھے اپنے پاس رکھئے، یوسف علیہ السلام نے اول یہی غدر کیا، کہ اگر تم یہاں رُک گئے تو والد کو صدمہ شدید ہوگا، دوسرے تمہیں اپنے پاس روکنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ میں تم پر چوری کا الزام لگاؤں، اور اس الزام میں گرفتار کر کے اپنے پاس رکھ لوں، بنیامین ان بھائیوں کی معاشرت سے کچھ ایسے دل تنگ تھے کہ ان سب باتوں کے لئے تیار ہو گئے۔

لیکن یہ واقعہ صحیح بھی ہو تو والد کی دل آزاری اور سب بھائیوں کی رسوائی اور ان کو چور کہنا صرف بنیامین کے راضی ہو جانے سے تو جائز نہیں ہو سکتا، اور بعض حضرات کی یہ توجیہ کہ منادی کا ان کو چور کہنا یوسف علیہ السلام کے علم و اجازت سے نہ ہوگا، ایک بے دلیل دعویٰ اور صورت واقعہ کے لحاظ سے بے جوڑ بات ہے، اسی طرح یہ تاویل کہ ان بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو والد سے چرایا اور فروخت کیا تھا اس لئے ان کو چور کہا گیا، یہ بھی ایک تاویل ہی، اس لئے ان سب سوالوں کا صحیح جواب وہی ہے جو قرطبی اور مظہری وغیرہ نے دیا ہے، کہ اس واقعہ میں جو کچھ کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے وہ نہ بنیامین کی خواہش کا نتیجہ تھا،

یوسف علیہ السلام کی اپنی تجویز کا، بلکہ یہ سب کام بامراہی اسی کی حکمت بالغہ کے مظاہر تھے، جن میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے ابتلا و امتحان کی تکمیل ہو رہی تھی، اس جواب کی طرف خود قرآن کی اس آیت میں اشارہ موجود ہے كَذَلِكَ نَكْتُبُ يُسُفَ یعنی ہم نے اسی طرح تدبیر کی یوسف کے لئے اپنے بھائی کو روکنے کی۔

اس آیت میں واضح طور پر اس حیلہ و تدبیر کو حق تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے، کہ یہ سب کام جب کہ بامر خداوندی ہوتے تو ان کو ناجائز کہنے کے کوئی معنی نہیں رہتے، ان کی مثال ایسی ہی ہو گی جیسے حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے واقعہ میں کشتی توڑنا، لڑکے کو قتل کرنا وغیرہ، جو بظاہر گناہ تھے، اسی لڑکے موسیٰ علیہ السلام نے ان پر نکیر کیا، مگر خضر علیہ السلام یہ سب کام باذن خداوندی خاص مصالح کے تحت کر رہے تھے، اس لئے ان کا کوئی گناہ نہ تھا، قَالُوا اتَّاعُوا اللَّهَ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جُنَا یعنی انھوں نے کہا کہ ارکان دولت بھی خود ہمارے حالات سے واقف ہیں کہ ہم کوئی فساد کرنے یہاں نہیں آئے اور نہ ہم چور ہیں۔

قَالُوا اخَذَ اجْرًا وَاُولَٰئِكَ كُنتُمْ فِي سُلٰسِلٍ، یعنی شاہی ملازمین نے کہا کہ اگر تمہارا جھوٹ ثابت ہو جائے تو بتلاؤ کہ چور کی کیا سزا ہے۔ قَالُوا اجْرًا وَاُولَٰئِكَ كُنتُمْ فِي سُلٰسِلٍ کہو ججز آؤ گے كَذَلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ، یعنی برادران یوسف نے کہا کہ جس شخص کے سامان میں مال مسروقہ برآمد ہو وہ شخص خود ہی اس کی جزا ہی، ہم چوروں کو اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ شریعت یعقوب علیہ السلام میں چور کی سزا یہ ہے کہ جس شخص کا مال چرایا ہے وہ شخص اس چور کو اپنا غلام بنا کر رکھے، سرکاری ملازمین نے اس طرح خود برادران یوسف سے چور کی سزا شریعت یعقوبی کے مطابق معلوم کر کے ان کو اس کا پابند کر دیا کہ بنیامین کے سامان میں مال مسروقہ برآمد ہو تو وہ اپنے ہی فیصلہ کے مطابق بنیامین کو یوسف علیہ السلام کے سپرد کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

فَبَدَّلَ بِهَا يَاقُوتَ بَعْدَ وَهْمٍ، یعنی سرکاری تفتیش کرنے والوں نے اصل سازش پر پردہ ڈالنے کے لئے پہلے سب بھائیوں کے سامان کی تلاشی لی، پہلے ہی بنیامین کا سامان نہیں کھولا تاکہ ان کو شبہ نہ ہو جائے۔

ثُمَّ اسْتَفْجَوْا بِهَا مِن رَّبِّهَا، یعنی آخر میں بنیامین کا سامان کھولا گیا تو اس میں سے صواع الملک کو برآمد کر دیا، اس وقت تو سب بھائیوں کی گردنیں شرم سے جھک گئیں، اور بنیامین کو سخت مسخت کہنے لگے کہ تو نے ہمارا منہ کالا کر دیا۔

کَذٰلِكَ يَدْرُسُكَ مَا كَانَ لِيَاخُنَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ
 اللّٰهُ۔ یعنی اس طرح ہم نے تربیہ کی یوسف کے لئے، وہ اپنے بھائی کو شاہ مصر کے قانون کے
 ماتحت گرفتار نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ مصر کا قانون چور کے متعلق یہ تھا کہ چور کو مار پیٹ کی سزا دی جائے گی
 اور مال مسروقہ سے دو گنی قیمت وصول کر کے چھوڑ دیا جائے گا، مگر انہوں نے یہاں برادرانِ یوسف ہی سے چور
 کا حکم شریعتِ یعقوبی کے مطابق دریافت کر لیا تھا، اس کی رُو سے بنیامین کو اپنے پاس روک لیا
 صحیح ہو گیا، اس طرح اللہ تعالیٰ کی حکمت و مشیت سے یوسف علیہ السلام کی یہ مراد بھی پوری ہو گئی
 نَزَّ فَتَمَّ ذَرَجَتٍ مِّنْ نَّشَأِهِ وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلَيْهِمْ ۖ یعنی ہم جس کے چاہیں
 درجات بلند کر دیتے ہیں، جیسا اس واقعہ میں یوسف علیہ السلام کے درجات ان کے بھائیوں
 کے مقابلہ میں بلند کر دیئے گئے، اور ہر علم والے کے اوپر اس سے زیادہ علم والا موجود ہے،
 مطلب یہ ہے کہ مخلوق میں ہم نے علم کے اعتبار سے بعض کو بعض پر فوقیت دی ہے،
 بڑے سے بڑے عالم کے مقابلہ میں کوئی اس سے زیادہ علم رکھنے والا ہوتا ہے، اور اگر کوئی شخص
 ایسا ہو کہ پوری مخلوقات میں کوئی اس سے زیادہ عِلم نہیں رکھتا تو پھر رب العزت جل شانہ
 کا علم تو سبک بالا تر ہے ہی۔

آیات مذکورہ سے چند احکام و مسائل حاصل ہوئے:

احکام و مسائل

اَوَّلُ بآیۃ وَ لَیْسَ بِہِ حِجَابٌ بَعِیْرٌ سَے ثابت ہوا کہ کسی عین
 کام کے کرنے پر کوئی اجرت یا انعام مقرر کر کے اعلان عام کر دینا کہ جو شخص یہ کام کرے گا اس کو اس قدر
 انعام یا اجرت ملے گی، جیسے شہنشاہی مجرموں کے گرفتار کرنے پر یا گمشدہ چیزوں کی واپسی پر اس طرح
 کے انعامی اعلانات کا عام طور پر رواج ہے، اگرچہ اس صورتِ معاملہ پر فقہی اجارہ کی تعریف صادق
 نہیں آتی، مگر اس آیت کی رُو سے اس کا بھی جواز ثابت ہو گیا (قرطبی)

دوئم ۱۲: ۷۶ سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی طرف سے
 حق مالی کا ضامن بن سکتا ہے، اور اس صورت کا حکم جمہور فقہائے امت کے نزدیک یہ ہے کہ
 صاحب حق کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنا مال اصل مدیون سے یا ضامن سے جس سے بھی پابند وصول
 کر سکتا ہے، ہاں اگر ضامن سے وصول کیا گیا تو ضامن کو حق ہو گا کہ جس قدر مال اس سے لیا گیا
 وہ اصل مدیون سے وصول کرے (قرطبی خلافاً لما لک)

تیسرے کَذٰلِكَ یَدْرُسُكَ سَے معلوم ہوا کہ ہر شرعی صلیحت کی بنا پر معاملہ کی
 صورت میں کوئی ایسی تبدیلی اختیار کرنا جس سے احکام بدل جائیں جس کو فقہاء کی اصطلاح میں
 حیلہ شرعیہ کہا جاتا ہے، یہ شرعاً جائز ہے، بشرط یہ ہے کہ اس سے شرعی احکام کا ابطال لازم

نہ آتا ہوا ورنہ ایسے حیلے باتفاق فقہاء حرام ہیں جیسے زکوٰۃ سے بچنے کے لئے کوئی حیلہ کرنا یا رمضان سے پہلے کوئی غیر ضروری سفر صرف اس لئے اختیار کرنا کہ روزہ نہ رکھنے کی گنجائش تکل آسے یہ باتفاق حرام ہے، ایسے ہی حیلے کرنے پر بعض اقوام پر عذاب الہی آیا ہے، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے حیلوں سے منع فرمایا ہے، اور باتفاق امت حرام ہیں، ان پر عمل کرنے سے کوئی کام جائز نہیں ہو جاتا بلکہ وہ ہر گناہ لازم آتا ہے، ایک اصل ناجائز کام کا دوسرے یہ ناجائز حیلہ جو ایک حیثیت سے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ چال بازی کا مراد ہے، اسی طرح کے حیلوں کے ناجائز ہونے کو امام بخاریؒ نے کتاب الحیل میں ثابت کیا ہے۔

قَالُوا اِنْ يَسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخَاهُ مِنْ قَبْلُ ۚ فَاسْرِهُمَا يَوْمَئِذٍ

کہنے لگے اگر اس نے چوریا تو چوری کی تھی اس کے ایک بھائی نے بھی اس سے پہلے تب آہستہ سے کہا یوسف

فِي نَفْسِهِ وَلَمْ يُبَيِّدْهَا لَهُمْ ۚ قَالَ اَنْتُمْ شَرُّ مَكَانًا ۚ وَاللّٰهُ

نے اپنے جی میں اور ان کو نہ بتایا، کہا جی میں کہ تم بدتر ہو درجہ میں، اور اللہ

اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُونَ ﴿۸۵﴾ قَالُوا يَا اَيُّهَا الْعَزِيزُ اِنَّ لَكَ اَبًا سَيِّئًا

خوب جانتا ہو جو تم بیان کرتے ہو، کہنے لگے اے عزیز اس کا ایک باپ ہو بہت بوڑھا

كَبِيرًا فَخُذْ أَحَدًا مَّكَانَهُ ۚ اِنَّا نُرِيكَ مِنَ الْمُنْشِينَ ﴿۸۶﴾

بڑی عمر کا، سو رکھ لے ایک کو تم میں سے اس کی جگہ، ہم دیکھتے ہیں تو ہے احسان کرنے والا،

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّأْخُذَ اِلًا مِّنْ وَجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَ اٰلٍ

بولا اللہ پناہ دے کہ ہم کسی کو پٹریں مگر جس کے پاس پائی ہم نے اپنی چیز

اِنَّا اِذَا الظَّالِمُونَ ﴿۸۷﴾ فَلَمَّا اسْتَيْسَسُوا مِنْهُ خَلَصُوا نَجِيًّا ۖ

تو تو ہم ضرور بے انصاف ہوتے، پھر جب ناامید ہوئے اس سے اکیلے ہو بیٹھے مشورہ کرنے کو،

قَالَ كَبِيرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْا اَنْ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْتَقًا

بولا ان میں کا بڑا کیا تم کو معلوم نہیں کہ تمہارے باپ نے لیا ہے تم سے عہد

مِّنَ اللّٰهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُمْ فِيْ يُوسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ

اللہ کا اور پہلے جو قصور کر چکے ہو یوسف کے حق میں سو میں تو ہرگز نہ سرکوں گا

الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِّيْ اَبْنٰى اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ

اس ملک جب تک کہ حکم دے مجھ کو میرا باپ یا قضیہ چکائے اللہ میری طرف اور وہ سب بہتر

الْعٰیكِيْنَ ۝۸۰ اِرجِعُوْا اِلٰی اٰبِیْکُمْ فَقَوْلُوْا یٰۤاَبَانَا اِنَّا ابْنٰکَ

چکانے والا ، پھر جاؤ اپنے باپ کے پاس اور کہو اے باپ تیرے بیٹے نے تو

سَرَقَ ۚ وَ مَا شَهِدْنَا اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَ مَا کُنَّا لِلْغَیْبِ حٰفِظِیْنَ ۝۸۱

چوری کی ، اور ہم نے وہی کہا تھا جو ہم کو خبر تھی اور ہم کو غیب کی بات کا دھیان نہ تھا

وَسَّئِلَ الْقَرْیَۃَ الَّتِیْ کُنَّا فِیْہَا وَالْعِیْرَ الَّتِیْ اَقْبَلْنَا فِیْہَا

اور پوچھ لے اس بستی سے جس میں ہم تھے اور اس قافلہ سے جس میں ہم آئے ہیں ،

وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝۸۲

اور ہم بیک سچ کہتے ہیں ۔

حُلاصۃ تفسیر

کہنے لگے کہ (صاحب) اگر اس نے چوری کی تو (تجربہ نہیں کیونکہ) اس کا ایک بھائی
(متساوی) بھی (اسی طرح) اس کے پہلے چوری کر چکا ہے (جس کا قصہ درمنثور میں اس طرح لکھا
ہے کہ یوسف علیہ السلام کی ان کی بھوپھی پرورش کرتی تھیں، جب ہوشیار ہوئے تو یعقوب علیہ السلام
نے لینا چاہا، وہ ان کو چاہتی بہت تھیں، انھوں نے ان کو رکھنا چاہا، اس لئے انھوں نے ان کی مگر
میں ایک پٹکا کپڑوں کے اندر باندھ کر مشہور کر دیا کہ پٹکا گم ہو گیا، اور سب کی تلاشی لی تو ان کی
مگر میں نکلا، اور اس شریعت کے قانون کے موافق ان کو بھوپھی کے قبضہ میں رہنا پڑا، یہاں تک کہ
ان کی بھوپھی نے وفات پائی، پھر یعقوب علیہ السلام کے پاس آگئے، اور ممکن ہو یہ صورت
استرقاق کی بھی یوسفؑ کی رضامندی سے ہوتی ہو، اس لئے یہاں بھی آزاد کا غلام بنانا لازم نہیں آیا اور
ہر چیز کہ قرآن و اخلاق یوسفیہ میں ذرا تامل کرنے سے آپ کی برأت اس فعل سے یقیناً معلوم
تھی مگر بنیامین پر جو بھائیوں کو غصہ تھا اس میں یہ بات بھی کہہ دی، پس یوسف (علیہ السلام)
نے اس بات کو (جو آگے آتی ہے) اپنے دل میں پوشیدہ رکھا اور اس کو ان کے سامنے (زبان سے)
ظاہر نہیں کیا یعنی (دل میں) یوں کہا کہ اس (چوری کے) درجہ میں تم تو اور بھی زیادہ برکت
ہو (یعنی ہم دونوں بھائیوں سے تو حقیقت سرقہ صادر نہیں ہوا، اور تم نے تو اتنا بڑا کام
کیا کہ کوئی مال غائب کرتا ہے تم نے آدمی غائب کر دیا، کہ مجھ کو باپ سے بچھڑا دیا، اور ظاہر ہے
کہ آدمی کی چوری مال کی چوری سے زیادہ سخت جرم ہے) اور جو کچھ تم (ہم دونوں بھائیوں

کے متعلق) بیان کر رہے ہو (کہ ہم چور ہیں) اس (کی حقیقت) کا اللہ ہی کو خوب علم ہے اور
چور نہیں ہیں، جب بھائیوں نے دیکھا کہ انہوں نے بنیامین کو مانگو ذکر لیا اور اس پر زہل ہو گیا تو
براہین و شواہد کہنے لگے اے عزیز اس (بنیامین) کا ایک بہت بوڑھا باپ ہے اور اس کی بہت
چاہتا ہے، اس کے غم میں خدا جانے کیا حال ہو، اور ہم سے اس قدر محبت نہیں کرتے کہ اسے
کیجے کہ اس کی جگہ ہم میں سے ایک کو رکھ لیجئے، (اور اپنا ملوک بنا لیجئے) ہم یہ کہہ کر
دیکھتے ہیں (امید ہے کہ اس درخواست کو منظور فرمالیں گے) یوسف (علیہ السلام) نے ان سے
بے انصافی کی، بات سے خدا بچائے کہ جس کے پاس ہم نے اپنی چیز پائی ہو اس کے سوا اور نہ کو
شخص کو کچھ کر رکھ لیں (اگر ہم ایسا کریں تو) اس حالت میں تو ہم بڑے بے انصاف بن جائیں گے
اُسی آزاد آدمی کو غلام بنالینا اور غلاموں کا معاملہ کرنا اس کی رضا مندی سے بھی حرام ہے،
پھر یہاں ان کو یوسف (علیہ السلام) سے تو ان کے صاف جواب کے سبب) بالکل امید ہے
(کہ بنیامین کو دیں گے) تو اس جگہ سے) علیحدہ ہو کر باہم مشورہ کرنے لگے (کہ کیا کرنا چاہئے، پھر
زیادہ کی باتیں ہوئی کہ مجبوری ہے سب کو واپس چلنا چاہئے، مگر ان سب میں جو بڑا اہم
نے کہا کہ (تم جو سب کے سب واپس چلنے کی صلاح کر رہے ہو تو) کیا تم کو معلوم نہیں کہ تمہارے
باپ تم سے خراکی قسم کھلا کر بچا قول لے چکے ہیں کہ تم اس کو اپنے ہمراہ لانا، لیکن اگر گھر جاؤ تو مجبوری ہو سو ہم سب کو تو گھر
نہیں کہتے میری کنجاش نہ رہتی، اس لئے حتی الامکان کچھ تدبیر کرنا چاہئے) اور اس سے پہلے یوسف کے باپ نے اس قدر
کوئی ایسا کر چکے ہو کہ ان کیساتھ جو کچھ بڑاؤ ہو اس باپ کے حقوق بالکل ضائع ہوئے سو وہ پرانی ہی شرمندگی یا کم ہو جو یکایک شرمندگی
نہیں جانتیں) سوئی امن میں رہتا نہیں، تاوقتیکہ میرے باپ مجھ کو (حاضری کی) اجازت نہ دیں، یا نہ رخصت
اس مشکل کو سلجھائے اور وہی خوب سلجھانے والا ہے لیکن کسی تدبیر سے بنیامین چھوٹ جائے
غرض میں یا اس کو لے کر جاؤں گا یا بلایا ہوا جاؤں گا، سو مجھ کو تو یہاں چھوڑ دو اور تم واپس اپنے
باپ کے پاس جاؤ اور (جا کر ان سے) کہو کہ اے ابا آپ کے صاحبزادے (بنیامین) نے چوری
کی (اس لئے گرفتار ہوئے) اور ہم تو وہی بیان کرتے ہیں جو ہم کو (مشاہدہ سے) معلوم ہوا ہے
اور ہم (قول و قرار دینے کے وقت) غیب کی باتوں کے تو حافظ تھے نہیں کہ یہ چوری کرے گا
ورنہ ہم کبھی قول نہ دیتے) اور (اگر ہمارے کہنے کا یقین نہ ہو تو) اس بستی (یعنی مصر) والوں سے
اکسی اپنے مستند کی معرفت) پوچھ لیجئے جہاں ہم (اس وقت) موجود تھے، (جب چوری برآمد
ہوتی ہے) اور اس قافلہ والوں سے پوچھ لیجئے جن میں ہم شامل ہو کر (یہاں) آئے ہیں
(معلوم ہوتا ہے) اور بھی کنعان کے یا اس پاس کے لوگ غلہ لینے گئے ہوں گے) اور انہیں جانتے ہم
بالکل سچ کہتے ہیں (چنانچہ سب بڑے کو وہاں چھوڑا اور خود آکر سارا بیان کیا) :

معارف و مسائل

ان سے پہلی آیات میں مذکور تھا کہ مصر میں یوسف علیہ السلام کے حقیقی بھائی بنیامین کے سامان میں ایک شاہی برتن چھپا کر اور پھر ان کے سامان سے تدبیر کے ساتھ برآمد کر کے ان پر چوری کا جبرم عائد کر دیا گیا تھا۔

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں یہ ہے کہ جب برادرانِ یوسف کے سامنے بنیامین کے سامان سے مال مسروقہ برآمد ہو گیا اور شرم سے ان کی آنکھیں جھک گئیں تو جھنجھلا کر کہنے لگے: إِنَّا نَسْرِقُ فَقَدْ سَرَقَ أَخٌ لَّهُ مِنْ قَبْلُ، یعنی اگر اس نے چوری کر لی تو کچھ زیادہ تعجب نہیں اس کا ایک بھائی تھا اُس نے بھی اسی طرح اس سے پہلے چوری کی تھی، مطلب یہ تھا کہ یہ ہمارا حقیقی بھائی نہیں، علاتی ہے، اس کا ایک حقیقی بھائی تھا اس نے بھی چوری کی تھی۔ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اس وقت خود یوسف علیہ السلام پر بھی چوری کا الزام لگا دیا، جس میں ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام کے بچپن میں پیش آیا تھا، جس میں ٹھیک اسی طرح جیسے یہاں بنیامین پر چوری کا الزام لگانے کی سازش کی گئی ہے، اس وقت یوسف علیہ السلام پر ان کی بے خبری میں ایسی ہی سازش کی گئی تھی، اور یہ سب بھائیوں کو پوری طرح معلوم تھا کہ یوسف علیہ السلام اس الزام سے بالکل بری ہیں، مگر اس وقت بنیامین پر غصہ کی وجہ سے اُس واقعہ کو بھی چوری کا قرار دے کر اس کا الزام ان کے بھائی یوسف پر لگا دیا ہے۔

وہ واقعہ کیا تھا اس میں روایات مختلف ہیں، ابن کثیرؒ نے بحوالہ محمد بن اسحاق مجاہدؒ امام تفسیر سے نقل کیا ہے کہ یوسف علیہ السلام کی ولادت کے تھوڑے ہی عرصہ بعد بنیامین پیدا ہوئے تو یہ ولادت ہی والدہ کی موت کا سبب بن گئی، یوسف اور بنیامین دونوں بھائی بخیر ماں کے رہ گئے، تو ان کی تربیت و حضانت ان کی پھوپھی کی گود میں ہوئی، اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو بچپن سے ہی کچھ ایسی شان عطا فرمائی تھی کہ جو دیکھتا ان سے بے حد محبت کرنے لگتا تھا، پھوپھی کا بھی یہی حال تھا کہ کسی وقت ان کو نظروں سے غائب کرنے پر قادر نہ تھیں، دوسری طرف والد بزرگوار حضرت یعقوب علیہ السلام کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا، مگر بہت چھوٹا ہونے کی بنا پر ضرورت اس کی تھی کہ کسی عورت کی نگرانی میں رکھا جائے، اس لئے پھوپھی کے حوالے کر دیا تھا، اب جبکہ وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے تو یعقوب علیہ السلام کا ارادہ ہوا کہ یوسف علیہ السلام کو اپنے ساتھ رکھیں، پھوپھی سے کہا تو انھوں نے عذر کیا، پھر زیادہ اصرار پر مجبور ہو کر یوسف علیہ السلام کو ان کے

والد کے حوالے تو کر دیا مگر ایک تدبیر ان کو واپس لینے کی یہ کر دی کہ چھوپی کے پاس ایک پٹکا تھا، جو حضرت اسحاق علیہ السلام کی طرف سے ان کو پہنچا تھا اور اس کی بڑی قدر و قیمت سمجھی جاتی تھی، یہ پٹکا چھوپی نے یوسف علیہ السلام کے کپڑوں کے نیچے مکر پر باندھ دیا۔

یوسف علیہ السلام کے جانے کے بعد یہ شہرت دی کہ میرا پٹکا چوری ہو گیا، پھر تلاشی لگئی تو وہ یوسف کے پاس نکلا، شریعت یعقوب علیہ السلام کے حکم کے مطابق اب چھوپی کو یہ حق ہو گیا کہ یوسف علیہ السلام کو اپنا مملوک بنا کر رکھیں، یعقوب علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ شرعی حکم کے اعتبار سے چھوپی یوسف کی مالک بن گئی، تو ان کے حوالے کر دیا، اور جب تک چھوپی زندہ رہیں یوسف علیہ السلام انہی کی تربیت میں رہے۔

یہ واقعہ تھا جس میں چوری کا الزام حضرت یوسف علیہ السلام پر لگتا، اور پھر ہر شخص پر حقیقت حال روشن ہو گئی، کہ یوسف علیہ السلام چوری کے ادنیٰ شبہ سے بھی بری ہیں، چھوپی کی محبت نے ان سے یہ سازش کا جال پھیلوایا تھا، بھائیوں کو بھی یہ حقیقت معلوم تھی، اس کی بناء پر کسی طرح زبیا نہ تھا کہ ان کی طرف چوری کو منسوب کرتے، مگر ان کے حق میں بھائیوں کی جو زیادتی اور بے راہ روی اب تک ہوتی چلی آئی تھی یہ بھی اسی کا ایک آخری جُز تھا۔

فَاسْتَرْهَاهُ يَوْسُفُ فِي نَفْسِهِ وَلَمْ يُبَيِّنْهَا لَهُمْ "یعنی یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کی یہ بات سن کر اپنے دل میں رکھی، کہ یہ لوگ اب تک بھی میرے درپے ہیں کہ چوری کا الزام لگاتے ہیں، مگر اس کا اظہار بھائیوں پر نہیں ہونے دیا کہ یوسف علیہ السلام نے ان کی یہ بات سنی ہے اور اس سے کچھ اثر لیا ہے۔

قَالَ اَنْتُمْ شَرُّ مَكَانًا وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ، "یوسف علیہ السلام نے اپنے دل میں کہا کہ تم لوگ ہی بُرے درجہ اور بُرے حال میں ہو کہ بھائی پر چوری کی تہمت جان بوجھ کر لگاتے ہو، اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہی زیادہ جاننے والے ہیں، کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ صحیح ہے یا غلط، پہلا جملہ تو دل میں کہا گیا ہے، یہ دوسرا جملہ ممکن ہے کہ بھائیوں کے جواب میں اعلانا کہہ دیا ہو۔

قَالُوا يَا اَحْمَدُ الْعَزِيزُ اِنَّ لَكَ اَبًا شَيْخًا كَبِيرًا فَخُذْ اَحَدَ نَا مَكَانَكَ اِنَّا خَافُكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ، برداران یوسف نے جب دیکھا کہ کوئی بات چلتی نہیں اور بنیامین کو یہاں چھوڑنے کے سوا چارہ نہیں تو عزیز مصر کی خوشامد شروع کی، اور یہ درخواست کی کہ اس کے والد بہت بوڑھے ہیں اور ضعیف ہیں (اس کی مفارقت ان سے برداشت نہ ہوگی) اس لئے آپ اس کے بدلے میں ہم سے کسی کو گرفتار کر لیں، یہ درخواست آپ سے ہم اس امید پر

کر رہے ہیں کہ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ آپ بہت احساس کرنے والے ہیں، یا یہ کہ آپ نے اس سے پہلے بھی ہمارے ساتھ احسان کا سلوک فرمایا ہے۔

یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کی درخواست کا جواب مضابطہ کے مطابق یہ دیا کہ یہ بات تو ہمارے اختیار میں نہیں کہ جب کو چاہیں پکڑ لیں، بلکہ جس کے پاس مال مسروقہ برآمد ہوا اگر اس کے سوا کسی دوسرے کو پکڑ لیں تو ہم تمہارے ہی فتوے اور فیصلے کے مطابق ظالم ہو جائیں گے، کیونکہ تم نے ہی یہ کہا ہے کہ جس کے پاس مال مسروقہ برآمد ہو وہ ہی اس کی جزاء ہے۔

ہی یہ کہا ہو کہ جس کے پاس مال مسروقہ برآمد ہو وہ ہی اس کی بھڑا ہے۔
فَلَمَّا اسْتَيْسَرَ اَمْنًا خَلَصُوا نَجِيًّا، یعنی جب برادرانِ یوسف بنیامین کی رہائی
 سے مایوس ہو گئے تو باہم مشورہ کے لئے کسی علیحدہ جگہ میں جمع ہو گئے۔

سے مایوس ہوئے تو باہم مشورہ کے لئے کسی متحدہ جگہ پر گئے۔
 قَالَ كَبِيرُهُمْ اِنَّ اَنْ كے بڑے بھائی نے کہا کہ تمہیں یہ معلوم نہیں کہ تمہارے باپ نے
 تم سے بنیامین کے واپس لانے کا پختہ عہد لیا تھا، اور یہ کہ تم اس سے پہلے بھی یوسفؑ کے معاملہ
 میں ایک کوتاہی اور غلطی کر چکے ہو، اس لئے میں تو اب مصر کی زمین کو اس وقت تک نہ چھوڑ دوں گا
 جب تک میرے والد خود ہی مجھے یہاں سے واپس آنے کا حکم نہ دیں، یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے بزرگی
 وحی مجھے یہاں سے نکلنے کا حکم ہو، اور اللہ تعالیٰ ہی بہترین حکم کرنے والے ہیں۔

یہ بڑے بھائی جن کا کلام بیان ہوا ہے بعض نے فرمایا کہ یہود ہیں، اور اگرچہ عمر میں سب بڑے نہیں مگر علم و فضل میں بڑے تھے، اور بعض مفسرین نے کہا کہ ردبیل ہیں جو عمر میں سب بڑے ہیں، اور یوسف علیہ السلام کے قتل نہ کرنے کا مشورہ انہوں نے ہی دیا تھا، اور بعض نے کہا کہ یہ بڑے بھائی شمعون ہیں جو جاہ و رتبہ کے اعتبار سے سب بھائیوں میں بڑے سمجھے جاتے تھے۔

اَرْجِعُوْا اِلٰى اٰبِیْنٰکُمْ، یعنی بڑے بھائی نے کہا کہ میں تو یہیں رہوں گا، آپ سب لوگ اپنے والد کے پاس واپس جائیں اور ان کو بتلائیں کہ آپ کے صاحبزادہ نے چوری کی، اور ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ اپنے چشم دید حالات ہیں کہ مال مسروقہ ان کے سامان میں سے ہمارے سامنے برآمد ہوا۔

وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حَافِظِينَ، یعنی ہم نے جو آپ سے عہد کیا تھا کہ ہم بنیامین کو ضرور واپس لائیں گے یہ عہد ظاہری حالات کے اعتبار سے تھا، غیب کا حال تو ہم نہ جانتے تھے کہ یہ پوری کر کے گرفتار اور بہ بیجور ہو جائیں گے، اور اس جملے کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم نے اپنی ساری دنیا کی بوجہ خدا عزوجل کی کہ کوئی ایسا کام ان سے نہ ہو جائے جس کے باعث وہ تکلیف

میں پڑیں، مگر ہماری یہ کوشش ظاہری احوال ہی کی حد تک ہو سکتی تھی، ہماری نظروں سے غائب لائے علی میں ان سے یہ کام ہو جائے گا ہم کو اس کا کوئی علم نہ تھا۔

چونکہ برادرانِ یوسف اس سے پہلے ایک فریب اپنے والد کو دے چکے تھے اور یہ جانتے تھے کہ ہمارے مذکور الصدر بیان سے والد کا ہرگز اطمینان نہ ہوگا، اور وہ ہماری بات پر یقین نہ کرینگے اس لئے مزید تاکید کے لئے کہا کہ آپ کو ہمارا یقین نہ آئے تو آپ اس شہر کے لوگوں سے تحقیق کر لیں جس میں ہم تھے، یعنی شہر مصر، اور آپ اس قافلہ سے بھی تحقیق کر سکتے ہیں جو ہمارے ساتھ ہی مصر سے کنعان آیا ہے، اور ہم اس بات میں بالکل سچے ہیں۔

تفسیر منطہری میں اس جگہ اس سوال کا اعادہ کیا گیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے والد کے ساتھ اس قدر بے رحمی کا معاملہ کیسے گوارا کر لیا، کہ خود اپنے حالات سے بھی اطلاع نہیں دی، پھر پھر بھائی کو بھی روک لیا، جبکہ بار بار یہ بھائی مصر آتے رہے، نہ ان کو اپنا راز بتایا نہ والد کے پاس اطلاع بھیجی، ان سب باتوں کا جواب تفسیر منطہری نے یہی دیا ہے: **إِنَّهُ عَمِلَ ذَلِكَ بِأَمْرِ اللَّهِ تَعَالَى لِيُزَيِّنَ فِي بَلَاءٍ يَعْقُوبَ**، یعنی یوسف علیہ السلام نے یہ ساری کام اللہ تعالیٰ کے حکم سے کئے جن کا منشاء حضرت یعقوب علیہ السلام کے امتحان اور ابتلا کی تکمیل تھی۔

أَحْكَامٌ وَمَسْأَلٌ | وَمَا شَرِهُنَّ قَاتِلًا إِلَّا بِمَا عَمِلْنَ مَا سَئَلَتْ عَنْهُ جِبْرَائِيلُ

معاملہ اور معاہدہ کرتا ہو تو وہ ظاہری حالات ہی پر محمول ہوتا ہے، ایسی چیزوں پر حاوی نہیں ہوتا جو کسی کے علم میں نہیں، برادرانِ یوسف نے والد سے جو بھائی کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا وہ اپنے اختیاری امور کے متعلق تھا، اور یہ معاملہ کہ ان پر چوری کا الزام آگیا اور اس میں پکڑے گئے اس معاہدہ پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔

دوسرا مسئلہ تفسیر قرطبی میں اس آیت سے یہ نکالا گیا ہے کہ اس جملہ سے ثابت ہوا کہ شہادت کا مدار علم پر ہے، علم خواہ کسی طریق سے حاصل ہو، اس کے مطابق شہادت دی جاسکتی ہے اس لئے کسی واقعہ کی شہادت جس طرح اس کو بخشم خود دیکھ کر دی جاسکتی ہے اسی طرح کسی متر ثقہ سے سنکر بھی دی جاسکتی ہے، شرط یہ ہے کہ اصل معاملہ کو چھپائے نہیں، بیان کر دے، کہ یہ واقعہ خود نہیں دیکھا، فلاں ثقہ آدمی سے سنا ہے، اسی اصول کی بناء پر فقہاء مالکیہ نے نابینا کی شہادت کو بھی جائز قرار دیا ہے۔

مسئلہ: آیات مذکورہ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اگر کوئی شخص حق اور راستی پر ہو مگر مروج ایسا ہے کہ دیکھنے والوں کو ناحق یا گناہ کا شبہ ہو سکتا ہے، تو اس کو چاہئے کہ اس شبہ کو دور کر دے تاکہ دیکھنے والے بدگمانی کے گناہ میں مبتلا نہ ہوں، جیسے اس واقعہ بیابین میں

پھلے واقعہ یوسف علیہ السلام کی بنا پر موقع ہمت اور شبہ کا پیدا ہو گیا تھا، اس لئے اسکی صفائی
کے لئے اہل بستی کی گواہی اور قافلہ والوں کی گواہی پیش کی گئی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے بھی اس کی تاکید فرمائی ہے، جبکہ آپ حضرت
صفیہ ام المؤمنین کے ساتھ مسجد سے ایک کوچہ میں تشریف لے جا رہے تھے تو اس کوچہ کے سرے پر
دو شخص نظر پڑے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دور ہی سے فرما دیا کہ میرے ساتھ صفیہ
بنت حنی ہیں، ان دو حضرات نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا آپ کے پاس میں کسی کو کوئی بدگمانی
ہو سکتی ہے؟ تو فرمایا کہ ہاں شیطان انسان کی رگ رگ میں سرایت کرتا ہے، ہو سکتا ہے کہ کسی
دل میں شبہ ڈال دے (بخاری، مسلم)

(مترجم)

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْراً فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ط عَسَى اللَّهُ أَنْ

بولا کوئی نہیں بنالی ہو تمھارے جی نے ایک بات ابھر رہی بہتر ہو، شاید اللہ اے

يَا تَبْنِي بِهِمْ جَمِيعاً إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ۝۸۳ وَتَوَلَّى عَنْهُمْ وَ

میرے پاس ان سب کو، وہی ہر خبردار حکمتوں والا، اور الٹا پھرا ان کے پاس سے

قَالَ يَا سَفِي عَلَى يَوْسُفَ وَأَبْيَضَتْ عَيْنُهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيمٌ ۝۸۴

اور بولا اے افسوس یوسف پر اور سفید ہو گئیں آنکھیں اس کی غم سے، سرودہ آپکو گھونٹ رہا تھا،

قَالُوا اتَّانَ اللَّهُ تَفْتُوْا تَنْ كُرِيْوْ سَفَ حَتَّى تَكُوْنَ حَرَضًا أَوْ تَكُوْنَ

کہنے لگے قسم ہر اللہ کی تونہ چھوڑیگا یوسف کی یاد کو جب تک کہ گھل جائے یا ہو جائے

مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ۝۸۵ قَالَ إِنَّمَا أَشْكُو بَثِّي وَحُزْنِي إِلَى اللَّهِ وَ

مردہ، بولا میں تو کھولتا ہوں اپنا اضطراب اور غم اللہ کے سامنے اور

أَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝۸۶ يُبْنِي أَذْهَبُوا فَتَحَسَّوْا مِّنْ

جانتا ہوں اللہ کی طرف سے جو تم نہیں جانتے، اے بیٹرا جاؤ اور تلاش کرو

يُوسُفَ وَأَخِيَّ وَلَا تَأْيِسُوا مِّنْ رَّبِّ اللَّهِ إِنَّهُ لَا يُأْيِسُ

یوسف کی، اور اس کے بھائی کی اور نا امید مت ہو اللہ کے فیض سے بیشک نا امید نہیں

مِن رُّوحِ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمَ الْكَافِرُونَ ﴿۸۷﴾

ہوتے اللہ کے فیض سے مگر وہی لوگ جو کافر ہیں۔

خلاصہ تفسیر

یعقوب (علیہ السلام) یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں ان سب سے غیر مطمئن ہو چکے تھے۔
سابق پر قیاس کر کے فرمانے لگے کہ بنیامین چوری میں ماخوذ نہیں ہوا، بلکہ تم نے اپنے دل سے
ایک بات بنائی ہے سو (خیر مثل سابق) صبر ہی کروں گا، جس میں شکایت کا نام نہ ہو گا (مجھ کو)
اللہ سے امید ہے کہ ان سب کو (یعنی یوسفؑ اور بنیامین اور جو بڑا بھائی اب مصر میں رہ گیا ہوا ان
تینوں کو) مجھ تک پہنچا دے گا (کیونکہ وہ حقیقت حال سے) خوب واقف ہو رہا اس لئے اس کو سب
کی خبر ہے کہ کہاں کہاں اور کس کس حال میں ہیں اور وہ (بڑی حکمت والا ہے) جب ملانا چاہے گا تو
ہزاروں اسباب و تدابیر درست کر دے گا) اور (یہ جواب دے کر بوجہ اس کے کہ ان سے بچ پہنچا تھا)
ان سے دوسری طرف رخ کر لیا اور (بوجہ اس کے کہ اس نے غم سے وہ پُرانا غم اور تازہ ہو گیا،
یوسفؑ کو یاد کر کے) کہنے لگے ہا یوسف افسوس! اور غم سے (روتے روتے) ان کی آنکھیں سفید
پڑ گئیں (کیونکہ زیادہ رونے سے سیاہی آنکھوں کی کم ہو جاتی ہے اور آنکھیں بے رونق یا
بالکل بے نور ہو جاتی ہیں) اور وہ (غم سے جی ہی جی میں) گھٹا کرتے تھے (کیونکہ شدت غم کے
ساتھ جب شدت ضبط ہو گا جیسا کہ صابریں کی شان ہے تو کظم کی کیفیت پیدا ہوگی) بلیے کہتے
لگے بخدا (معلوم ہوتا ہے) تم ہمیشہ ہمیشہ یوسف کی یادگاری میں لگے رہو گے، یہاں تک کہ
گھل گھل جاؤں بہ لب ہو جاؤ گے، یا یہ کہ بالکل مر ہی جاؤ گے (تو اتنے غم سے فائدہ کیا) یعقوب
(علیہ السلام) نے فرمایا کہ (تم کو میرے رونے سے کیا بحث) میں تو اپنے رنج و غم کی صرف اللہ
سے شکایت کرتا ہوں (تم سے تو کچھ نہیں کہتا) اور اللہ کی باتوں کو جتنا میں حسانتا ہوں تم نہیں
جانتے (باتوں سے مراد یا تو لطف و کرم و رحمت اتم ہے اور یا مراد الہام ہے ان سب کے ملنے کا جو بلا واسطہ ہو
یا بلا واسطہ خواب یوسفؑ کے جس کی تعبیر اب تک واقع نہیں ہوتی تھی، اور واقع ہونا اس کا ضرور
ہو، اے میرے بیٹو! انہما غم تو صرف اللہ کی جناب میں کرتا ہوں، سبب الاسباب وہی ہے، لیکن ظاہری تدبیر
تم بھی کرو کہ ایک بار پھر سفر میں) جاؤ اور یوسفؑ اور ان کے بھائی کی تلاش کرو (یعنی اس فکر و تدبیر کی
جستجو کرو جس سے یوسفؑ کا نشان ملے، اور بنیامین کو رہائی ہو) اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید
مت ہو بیشک اللہ کی رحمت سے وہی لوگ ناامید ہوتے ہیں جو کافر ہیں۔

معارف و مسائل

یعقوب علیہ السلام کے چھوٹے صاحبزادے بنیامین کی مصر میں گرفتاری کے بعد ان کے بھائی یوسف آپس آئے اور یعقوب علیہ السلام کو یہ ماجرا سنایا، اور یقین دلانا چاہا کہ ہم اس واقعہ میں بالکل سچے ہیں، آپ اس بات کی تصدیق مصر کے لوگوں سے بھی کر سکتے ہیں، اور جو قافلہ ہمارے ساتھ مصر سے کنعان آیا ہے اس سے بھی معلوم کر سکتے ہیں کہ بنیامین کی چوری پکڑا ہی گئی، اس لئے وہ گرفتار ہو گئے، یعقوب علیہ السلام کو چونکہ یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں ان صاحبزادوں کا جھوٹ ثابت ہو چکا تھا، اس لئے اس مرتبہ بھی یقین نہیں آیا، اگرچہ فی الواقع اس وقت انھوں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا، اس لئے اس موقع پر بھی وہی کلمات فرمائے جو یوسف علیہ السلام کی گمشدگی کے وقت فرمائے تھے: بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْراً، فَصَبْرٌ جَمِیلٌ، یعنی یہ بات جو تم کہہ رہے ہو صحیح نہیں، تم نے خود بات بنائی ہے، مگر میں اب بھی صبر کرتا ہوں، وہی میرے لئے بہتر ہے۔

قرطبی نے اسی سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مجتہد جو بات اپنے اجتہاد سے کہتا ہے اس میں غلطی بھی ہو سکتی ہے، یہاں تک کہ پیغمبر بھی جو بات اپنے اجتہاد سے کہیں اس میں ابتداء غلطی ہو جانا ممکن ہو جیسے اس معاملہ میں پیش آیا، کہ بیٹوں کے سچ کو جھوٹ قرار دیدیا، مگر انبیاء کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کو منجانب اللہ غلطی پر متنبہ کر کے اس سے ہٹا دیا جاتا ہے، اور انجام کار وہ حق کو پالیتے ہیں۔

یہاں یہ بھی نکتہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے ذہن میں بات بنانے سے مراد وہ بات بنانا ہو جو مصر میں بنائی گئی کہ ایک خاص غرض کے ماتحت جعلی چوری دکھا کر بنیامین کو گرفتار کیا گیا، جس کا انجام آئندہ بہترین صورت میں کھل جانے والا تھا، اس آیت کے اگلے جملے سے اس طرف اشارہ بھی ہو سکتا ہے جس میں فرمایا عَسَى اللَّهُ أَنْ يَأْتِيَنِي بِهِمْ جَمِيعًا، یعنی قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو مجھ سے ملا دے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس مرتبہ جو صاحبزادوں کی بات کو تسلیم نہیں کیا، اس کا حاصل یہ تھا کہ درحقیقت نہ کوئی چوری ہوئی ہے اور نہ بنیامین گرفتار ہوئے ہیں، بات کچھ اور ہے، یہ اپنی جگہ صحیح تھا، مگر صاحبزادوں نے اپنی دانست کے مطابق جو کچھ کہا تھا وہ بھی غلط نہ تھا۔

وَتَوَلَّى عَنْهُمْ وَقَالَ يَا سَعْدُ عَلَى يَدَيْكَ يَوْسُفُ وَابْنُصَتْ عَيْنُهُ مِنَ الْحَزَنِ

فَہُوَ کَظِیْمٌ ۖ یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام اس دوسرے صدمے کے بعد عاجز اردوں سے اس معاملہ میں گفتگو کو چھوڑ کر اپنے رب کے سامنے فریاد شروع کی، اور فرمایا کہ مجھے سخت رنج و غم ہو یوسف پر اور اس رنج و غم میں روتے روتے ان کی آنکھیں سفید ہو گئیں، یعنی بینائی جاتی رہی یا بہت ضعیف ہو گئی، مقاتل امام تفسیر نے فرمایا کہ یہ کیفیت یعقوب علیہ السلام کی چھ سال رہی کہ بینائی تقریباً جاتی رہی تھی، فہُوَ کَظِیْمٌ یعنی یہ وہ خاموش ہو گئے، کسی سے اپنا دکھ نہ کہتے تھے کَظِیْمٌ کَظِیْمٌ سے بنا ہے جس کے معنی بند ہو جانے اور بھرنے کے ہیں، مراد یہ ہے کہ غم و اندوہ سے ان کا دل بھر گیا، اور زبان بند ہو گئی، کہ کسی سے اپنا رنج و غم بیان نہ کرتے تھے۔

اسی لئے کَظِیْمٌ کے معنی غصہ کو پی جانے کے آتے ہیں کہ غصہ دل میں بھرے ہوئے ہونے کے باوجود زبان یا ہاتھ سے کوئی چیز غصہ کے مقتضی کے مطابق سرزد نہ ہو، حدیث میں ہے وَمَنْ يَكْظِمُ الْخَطِيئَةَ يَأْجُرْهُ اللَّهُ یعنی جو شخص اپنے غصہ کو پی جائے اور اس کے تقاضے پر باوجود قدرت کے عمل نہ کرے، اللہ تعالیٰ اس کو بڑا اجر دیں گے۔

ایک حدیث میں ہے کہ حشر کے دن اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو جمع عام کے سامنے لا کر جنت کی نعمتوں میں خستیاں دیں گے جو چاہیں لیں۔

امام ابن جریر نے اس جگہ ایک حدیث نقل کی ہے کہ مصیبت کے وقت اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ، پڑھنے کی تلقین اس امت کی خصوصیات میں سے ہے اور یہ کلمہ انسان کو رنج و غم کی تکلیف سے نجات دینے میں بڑا موثر ہے، خصوصیت امت محمدیہ کی اس سے معلوم ہوتی کہ اس شدید غم و صدمہ کے وقت حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس کلمہ کے بجائے یَا تَسْفٰی عَلٰی یُوسُفَ فرمایا، یہی نے شعب الایمان میں بھی یہ حدیث ابن عباسؓ کی روایت نقل کی کہ

حضرت یعقوب علیہ السلام کا شغف محبت اس مقام پر حضرت یعقوب علیہ السلام کی یوسف علیہ السلام یوسف علیہ السلام کے ساتھ کیوں تھا کے ساتھ غیر معمولی محبت اور اُن کے گم ہونے پر اتنا اثر

کہ اس مفارقت کی ساری مدت میں جو بعض روایات کی بناء پر چالیس سال اور بعض کی بناء پر اسی سال بتلائی جاتی ہے مسلسل روتے رہنا، یہاں تک کہ بینائی جاتی رہی بظاہر ان کی پیغمبرانہ شان کے شایان نہیں، کہ اولاد سے اتنی محبت کریں، جب کہ قرآن کریم نے اولاد کو فتنہ قرار دیا ہے ارشاد ہے: اِنَّمَا آمَوَ الْکُفَرُ وَاَوْلَادُ الْکُفَرِ فِتْنَةٌ، یعنی تمہارے مال اور اولاد فتنہ اور آزمائش ہیں، اور انبیاء علیہم السلام کی شان قرآن کریم نے یہ بتلائی ہے کہ اِنَّا اَخْلَصْنٰہُمْ بِخَالِصَتِ ذِکْرِی الْاَدْرِ، یعنی ہم نے انبیاء علیہم السلام کو ایک خاص صفت کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے، وہ صفت ہر دیر آخرت کی یاد، مالک بن دینار نے اس کے معنی یہ بیان فرمائے ہیں کہ

ہم نے ان کے دلوں سے دنیا کی محبت نکال دی اور صرف آخرت کی محبت سے ان کے قلوب کو معمور کر دیا، ان کا طبع نظر کسی چیز کے لینے یا چھوڑنے میں صرف آخرت ہوتی ہے۔

اس مجموعہ سے یہ اشکال قوی ہو کر سامنے آتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا اولاد کی محبت میں ایسا مشغول ہونا کس طرح صحیح ہوا؟

حضرت قاضی شہداء اللہ ربانی پی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر مظہری میں اس اشکال کو ذکر کر کے حضرت محبت دالہ ثانی کی ایک خاص تحقیق نقل فرمائی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بلاشبہ دنیا اور متاع دنیا کی محبت مذموم ہے، قرآن و حدیث کی نصوص بے شمار اس پر شاہد ہیں، مگر دنیا میں جو چیزیں آخرت سے متعلق ہیں ان کی محبت درحقیقت آخرت ہی کی محبت میں داخل ہے، یوسف علیہ السلام کے کمالات صرف حسن صورت ہی نہیں، بلکہ پیغمبرانہ عفت اور حسن سیرت بھی ہیں، اس مجموعہ کی وجہ سے ان کی محبت کسی دنیاوی سامان کی محبت نہ تھی، بلکہ درحقیقت آخرت ہی کی محبت تھی، انتہی۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ یہ محبت اگرچہ درحقیقت دنیا کی محبت نہ تھی مگر ہر حال اس میں ایک حیثیت دنیوی بھی تھی، اسی وجہ سے یہ محبت حضرت یعقوب علیہ السلام کے ابتلاء اور امتحان کا ذریعہ بنی، اور چنانچہ سال کی مفارقت کا ناقابلِ برداشت صدمہ برداشت کرنا پڑا، اور اس واقعہ کے اجزاء اول سے آخر تک اس پر شاہد ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے کچھ ایسی صورتیں بنتی چلی گئیں کہ یہ صدمہ طویل سے طویل ہوتا چلا گیا ورنہ واقعہ کے شروع میں اتنی شدید محبت والے باپ سے یہ ممکن نہ ہوتا کہ وہ بیٹوں کی بات سن کر گھر میں بیٹھ رہتے، بلکہ موقع پر پہنچ کر تفتیش و تلاش کرتے تو اسی وقت پتہ چل جاتا، مگر اللہ ہی کی طرف سے ایسی صورتیں بن گئیں کہ اُس وقت یہ رہبان نہ آیا، پھر یوسف علیہ السلام کو بذریعہ وحی اس سے روک دیا گیا کہ وہ اپنے حال کی اپنے والد کو خبر بھیجیں، یہاں تک کہ مصر کی حکومت و اقتدار ملنے کے بعد بھی انھوں نے کوئی ایسا اقدام نہیں فرمایا، اور اس سے بھی زیادہ صبر آزما وہ واقعات تھے جو بار بار ان کے بھائیوں کے مصر جانے کے متعلق پیش آتے رہے، اس وقت بھی نہ بھائیوں پر اظہار فرمایا نہ والد کو خبر بھیجنے کی کوشش فرمائی، بلکہ دوسرے بھائی کو بھی اپنے پاس ایک تدبیر کے ذریعہ روک کر والد کے صدمہ کو دہرا کر دیا، یہ سب چیزیں یوسف علیہ السلام جیسے برگزیدہ پیغمبر سے اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اُن کو بذریعہ وحی اس سے نہ روک دیا گیا ہو، اسی لئے قرطبی وغیرہ مفسرین نے یوسف علیہ السلام کے اس سارے عمل کو وحی خداوندی کی تلقین قرار دیا ہے، اور کُنْ لَکَ کُنْ تَالِیُوسُفَ کے

قرآنی ارشاد میں بھی اس طرف اشارہ موجود ہے، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

قَالُوا اقْتُلُوا يُسُفًا نَّكَرًا يُوَسِّفُ، یعنی صاحبزادے والد کے اس شدید غم و اندوہ اور اس پر صبر جمیل دیکھ کر کہنے لگے کہ بھلا آپ تو یوسفؑ کو ہمیشہ یاد ہی کرتے رہیں گے یہاں تک کہ آپ بیمار پڑ جائیں اور ہلاک ہونے والوں میں داخل ہو جائیں، (آخر ہر صدمہ اور غم کی کوئی انتہا ہوتی ہے، مردِ رایام سے انسان اس کو بھٹول جاتا ہے، مگر آپ اتنا طویل عرصہ گزرنے کے بعد بھی اسی روزِ اوّل میں ہیں، اور آپ کا غم اُسی طرح تازہ ہے)۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے صاحبزادوں کی بات سن کر فرمایا اِنَّمَا اَشْكُو ابْنِي وَحُزْنِي اِلَىٰ اِلٰهِ، یعنی میں تو اپنی فریاد اور رنج و غم کا اظہار تم سے یا کسی دوسرے سے نہیں کرتا، بلکہ اللہ جل شانہ کی ذات سے کرتا ہوں، اس لئے مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، اور ساتھ ہی یہ بھی ظاہر فرمایا کہ میرا یہ یاد کرنا خالی نہ جائے گا، میں اپنے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ چیز جانتا ہوں جس کی تم کو خبر نہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہوا ہے کہ وہ پھر مجھے ان سبک ملائیں گے۔
يٰۤاِبْنِي اَذْهَبْ اَفْتَحْ حَسَنًا مِنْ يُّوسُفَ وَ اَخِيهِ، یعنی اے میرے بیٹو جاؤ، یوسف اور اس کے بھائی کو تلاش کرو، اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، کیونکہ اس کی رحمت سے مجسز کافروں کے کوئی مایوس نہیں ہوتا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے اتنے عرصہ کے بعد صاحبزادوں کو یہ حکم دیا کہ جاؤ یوسف اور ان کے بھائی کو تلاش کرو، اور ان کے ملنے سے مایوس نہ ہو، اس سے پہلے کبھی اس طرح کا حکم نہ دیا تھا، یہ سب چیزیں تقدیرِ الہی کے تالچ تھیں، اس سے پہلے ملنا مقدر نہ تھا، اس لئے ایسا کوئی کام بھی نہیں کیا گیا، اور اب ملاقات کا وقت آچکا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے مناسب تدبیرِ دل میں ڈالی۔

اور دونوں کی تلاش کا رخ مصر ہی کی طرف قرار دیا، جو بنیامین کے حق میں تو معلوم اور متعین تھا، مگر یوسف علیہ السلام کو مصر میں تلاش کرنے کی ظاہر حال کے اعتبار سے کوئی وجہ نہ تھی، لیکن اللہ تعالیٰ جب کسی کام کا ارادہ فرماتے ہیں اس کے مناسب اسباب جمع فرمادیتے ہیں، اس لئے اس مرتبہ تلاش و تفتیش کے لئے پھر صاحبزادوں کو مصر جانے کی ہدایت فرمائی۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ یعقوب علیہ السلام کو پہلی مرتبہ عزیز مصر کے اس معاملہ سے کہ انکی پونجی بھی ان کے سامان میں واپس کر دی اس طرف خیال ہو گیا تھا کہ یہ عزیز کوئی بہت ہی شریف کریم ہو شاید یوسف ہی ہوں۔

احکام و مسائل

امام قرطبی نے فرمایا کہ واقعہ یعقوب علیہ السلام سے ثابت ہوا کہ ہر مسلمان پر واجب ہے کہ جب اس کو کوئی مصیبت اور تکلیف اپنی جان یا اولاد یا مال کے بارے میں پیش آئے تو اس کا علاج صبر جمیل اور اللہ تعالیٰ کی قضاء پر راضی ہونے سے کرے، اور یعقوب علیہ السلام اور دوسرے انبیاء کی اقتدار کرے۔

حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انسان جس قدر گھونٹ پیتا ہے ان سب میں دو گھونٹ زیادہ محبوب ہیں، ایک مصیبت پر صبر اور دوسرے غصہ کو پی جانا۔ اور حدیث میں بروایت حضرت ابو ہریرہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: مَنْ بَثَّ لَمْ يَصْبِرْ، یعنی جو شخص اپنی مصیبت سب کے سامنے بیان کرتا پھرے اس نے صبر نہیں کیا۔

اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو اس صبر پر شہیدوں کا ثواب عطا فرمایا، اور اس امت میں بھی جو شخص مصیبت پر صبر کرے گا اس کو ایسا ہی اجر ملے گا۔

امام قرطبی نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس شدید ابتلا و امتحان کی ایک وجہ یہ بیان کی ہے جو بعض روایات میں آئی ہے کہ ایک روز حضرت یعقوب علیہ السلام نماز تہجد پڑھ رہے تھے، اور یوسف علیہ السلام ان کے سامنے سو رہے تھے، اچانک یوسف علیہ السلام سے کچھ خیر اٹنے کی آواز نکلی، تو ان کی توجہ یوسف علیہ السلام کی طرف چلی گئی، پھر دوسری اور تیسری مرتبہ ایسا ہی ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں سے فرمایا دیکھو یہ میرا دوست اور مقبول بندہ مجھ سے خطاب اور عرض معروض کرنے کے درمیان میرے غیر کی طرف توجہ کرتا ہے، قسم ہے میری عزت و جلال کہ میں ان کی یہ دونوں آنکھیں نکال لوں گا جن سے میرے غیر کی طرف توجہ کی ہے، اور جس کی طرف توجہ کی ہے اس کو ان سے مدت دراز کے لئے جدا کر دوں گا۔

اسی لئے بخاری کی حدیث میں بروایت عائشہ رضی اللہ عنہا ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ نماز میں کسی دوسری طرف دیکھنا کیسا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ اس کے ذریعہ شیطان بندہ کی نماز کو اچک لیتا ہے، والعیاذ باللہ سبحانہ و تعالیٰ۔

فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَيْهِ قَالُوا يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ مَسَّنَا وَأَهْلَنَا الضُّرُّ

پھر جب داخل ہوئے اس کے پاس بولے اے عزیز پرہیزگار ہم پر اور ہمارے گھر پر سختی اور

جَنَّا بِضَاعَةٍ مُّزْجِيَةٍ فَأَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا إِنَّ

لکے ہیں ہم بوجہ ناقص سو پوری دے ہم کو بھرتی اور خیرات کر ہم پر ، اللہ

اللَّهُ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِينَ ﴿٨٨﴾ قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ

بدلہ دیتا ہو خیرات کرنے والوں کو ، کہا کچھ تم کو خبر ہے کہ کیا کیا تم نے یوسف سے

وَأَخِيهِ إِذْ أَنْتُمْ جَاهِلُونَ ﴿٨٩﴾ قَالُوا إِنَّكَ لَأَنْتَ يُوسُفُ قَالَ

اور اس کے بھائی سے جب تم کو سمجھ نہ تھی ، بولے کیا سچ تو ہی ہے یوسف ، کہا

أَنَا يُوسُفُ وَهَذَا أَخِي زَكَرِيَّا قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَ

میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی اللہ نے احسان کیا ہم پر البتہ جو کوئی ڈرتا ہے اور

يَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَضِيْعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٩٠﴾ قَالُوا تَاللَّهِ

صبر کرتا ہو تو اللہ ضائع نہیں کرتا حق نیکی والوں کا ، بولے قسم اللہ کی

لَقَدْ أَشْرَكَ اللَّهُ عَلَيْنَا وَإِنْ كُنَّا لَخِطِيئِينَ ﴿٩١﴾ قَالَ لَا تَثْرِيْبَ

البتہ پسند کر لیا تجھ کو اللہ نے ہم سے اور ہم تجھے پچھنے والے ، کہا کچھ الزام نہیں

عَلَيْكُمْ الْيَوْمَ طَيِّعُوا اللَّهَ لَكُمْ زَوْجٌ وَهُوَ أَحْمَرُ الرُّحْمَيْنِ ﴿٩٢﴾

تم پر آج ، بچنے اللہ تم کو اور وہ ہے سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ۔

خلاصہ تفسیر

پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کے حکم کے موافق کہ انھوں نے فرمایا تھا تَحَسُّوْا مِنْ يُّوسُفَ وَآخِيهِ ، مصر کو چلے ، کیونکہ بنیامین کو مصر ہی میں چھوڑا تھا ، یہ خیال ہوا ہو گا کہ جس کا نشان معلوم ہو پہلے اس کے لانے کی تدبیر کرنا چاہئے ، کہ بادشاہ سے مانگیں ، پھر یوسف علیہ السلام کے نشان کو ڈھونڈیں گے ، مغرض مصر پہنچ کر (جب یوسف کے پاس (جس کو عزیز سمجھ رہے تھے) پہنچے اور غلہ کی بھی حاجت تھی ، پس یہ خیال ہوا کہ غلہ کے یہاں سے عزیز کے پاس چلیں ، اور اس کی خرید کے ضمن میں خوشامد کی باتیں کریں ، جب اس کی طبیعت میں نرمی دیکھیں ، اور مزاج خوش پائیں تو بنیامین کی درخواست کریں ، اس لئے اڈل غلہ لینے کے متعلق گفتگو شروع کی اور کہنے لگے اے عزیز! ہم کو اور ہمارے گھر والوں کو (قسط کی وجہ سے) بڑی تکلیف پہنچ رہی ہے اور چونکہ ہم کو ناداری نے

گھیر رکھا ہے اس لئے خرید غلہ کے واسطے کھرے دام بھی میسر نہیں ہوئے) ہم کچھ نہ کھتی چیز لائے ہیں، سو آپ (اس کے کچھ ہونے سے قلع نظر کر کے) پورا غلہ دیدیجئے (اور اس کچھ ہونے سے غلہ کی مقدار میں کمی نہ کیجئے) اور (ہمارا کچھ استحقاق نہیں) ہم کو خیرات (سمجھ کر) دیدیجئے بیشک اللہ تعالیٰ خیرات دینے والوں کو (خواہ حقیقتہً خیرات دیں خواہ سہولت و رعایت کریں کہ وہ بھی مثل خیرات کے ہے) جزا (سے خیر) دیتا ہے (اگر مومن ہے تو آخرت میں بھی ورنہ دنیا ہی میں) یوسف (علیہ السلام) نے (جو اُن کے یہ مسکنات آمیز الفاظ سنے تو رہانہ گیا اور بے اختیار چاہا کہ اب اُن سے کھل جاؤں، اور عجب نہیں کہ نور قلب سے معلوم ہو گیا ہو کہ اب کی بار اُن کو تجسس بھی مقصود ہے اور یہ بھی منکشف ہو گیا ہو کہ اب زمانہ مفارقت کا ختم ہو چکا، پس تمہید تعارف کے طور پر) فرمایا (کہو) وہ بھی تم کو یاد رہے جو کچھ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ (برتاؤ) کیا تھا جب کہ تمہاری چہالت کا زمانہ تھا (اور بُرے بھلے کی سوچ نہ تھی یہ سن کر پہلے تو چکرا کر عزیز مصر کو یوسف کے قصہ سے کیا واسطہ اور اس شروع زمانہ کے خواب سے غالب احتمال تھا ہی کہ شاید یوسف کسی بڑے رتبہ کو پہنچیں کہ ہم سب کو ان کے سامنے گردن جھکانا پڑے اس لئے اس کلام سے شبہ ہوا اور غور کیا تو کچھ کچھ پہچانا اور مزید تحقیق کیلئے کہنے لگے کیا سچ تم ہی یوسف ہو انھوں نے فرمایا (ہاں) میں یوسف ہوں اور یہ (دنیا میں) میرا (حقیقی) بھائی ہے (یہ اس لئے بڑھا دیا کہ اپنے یوسف ہونے کی اور تاکید ہو جاوے یا انکے تجسس کی کامیابی کی بشارت ہو کہ جن کو تم ڈھونڈنے نکلے ہو ہم دونوں ایک جگہ جمع ہیں) ہم پر اللہ تعالیٰ نے احسان کیا کہ ہم دونوں کو اول توفیق صبر و تقویٰ کی عطا فرمائی پھر اُس کی برکت سے ہماری تکلیف کو راحت سے اور افتراق کو اجتماع سے اور قلت مال و جاہ کو کثرت مال و جاہ سے مبتدل فرما دیا) واقعی جو شخص گناہوں سے بچتا ہے اور (مصائب پر) صبر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایسے نیک کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کیا کرتا وہ (تمام گزشتہ قصوں کو یاد کر کے نادام ہو کر اور محذرت کے طور پر) کہنے لگے کہ بخدا کچھ شک نہیں، تم کو اللہ تعالیٰ نے ہم پر فضیلت عطا فرمائی، (اور تم اسی لائق تھے) اور (ہم نے جو کچھ کیا) بیشک ہم (اس میں) خطا دار تھے (اللہ معاف کر دو) یوسف (علیہ السلام) نے فرمایا کہ نہیں تم پر آج (میری طرف سے) کوئی الزام نہیں (بے فکر ہو میرا دل صاف ہو گیا) اللہ تعالیٰ تمہارا قصور معاف کرے اور وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے (تائب کا قصور معاف کر ہی دیتا ہے، اسی دعا سے یہ بھی مفہوم ہو گیا کہ میں نے بھی معاف کر دیا) :

فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَيْهِ قَالُوا الْآيَةُ لِي فِي جِبِّكَ فَإِذَا فِي يَدَيْهِ مِصْرَاعٌ مِثْلُ الْقَرْنِ فَنَادَىٰ فِي صَوْتٍ عَظِيمٍ فَبِئْسَ الْكَاذِبُ فَوَيْلٌ لِلْكَافِرِينَ

پہونچے اور عزیز مصر سے ملے تو خوشامد کی گفتگو شروع کی، اپنی محتاجی اور بیکیسی کا اظہار کیا کہ اے عزیز ہم کو اور ہمارے گھر والوں کو قحط کی وجہ سے سخت تکلیف پہونچ رہی ہے، یہاں تک کہ اب ہمارے پاس غلہ خریدنے کے لئے بھی کوئی مناسب قیمت موجود نہیں۔ ہم مجبور ہو کر کچھ نکمی چیزیں عند خریدنے کے لئے لے آئے ہیں، آپ اپنے کریمانہ حشلاق سے انہی نکمی چیزوں کو قبول کر لیں، اور ان کے بدلے میں غلہ پورا اتنا ہی دیدیں جتنا اچھی قیمتی چیزوں کے بالمقابل دیا جاتا ہے، یہ ظاہر ہی کہ ہمارا کوئی استحقاق نہیں آپ ہم کو خیرات سمجھ کر دیدیجئے، بیشک اللہ تعالیٰ خیرات دینے والوں کو جزائے خیر دیتا ہے۔

یہ نگہی چیزیں کیا تھیں؟ قرآن و حدیث میں انکی کوئی تصریح نہیں، مفسرین کے اقوال مختلف ہیں، بعض نے کہا کہ کھڑے دراہم تھے جو بازار میں نہ چل سکتے تھے، بعض نے کہا کہ کچھ گھریلو سامان تھا، یہ لفظ من جلتہ کا ترجمہ ہے اس کے اصل معنی ایسی چیز کے ہیں جو خود نہ چلے بلکہ اس کو زبردستی چلایا جائے۔ یوسف علیہ السلام نے جب بھائیوں کے یہ مسکنت آمیز الفاظ سنے اور شکستہ حالت دیکھی تو طبعی طور پر اب حقیقت حال ظاہر کر دینے پر مجبور ہو رہے تھے اور واقعات کی رفتار کا انداز یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام پر جو اظہارِ حال کی پابندی منجانب اللہ تھی اب اس کے خاتمہ کا وقت بھی آچکا تھا، اور تفسیر قرطبی و مظہری میں بروایت ابن عباسؓ نقل کیا ہے کہ اس موقع پر یعقوب علیہ السلام نے عزیز مصر کے نام ایک خط لکھ کر دیا تھا جس کا مضمون یہ تھا:-

15

ایسے نیک کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کیا کرتے ہیں۔

اب تو برادرانِ یوسف کے پاس بجز جرم و خطا کے اعتراف اور یوسف علیہ السلام کے فضل و کمال کے اقرار کے چارہ نہ تھا، سب نے یک زبان ہو کر کہا ثُمَّ قَالَ اللَّهُ لَقَدْ أَتَوْتُمْ عَلَيْنَا وَأَنْ كُنَّا لَخَطِئِينَ، بخدا اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہم سب پر فضیلت اور برتری عطا فرمائی اور آپ اسی کے مستحق تھے، اور ہم نے جو کچھ کیا بے شک ہم اس میں خطا وار تھے، اللہ معاف کر دیجئے، یوسف علیہ السلام نے جواب میں اپنی پیغمبرانہ شان کے مطابق فرمایا:

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمْ، یعنی میں تم سے تمہارے مظالم کا انتقام تو کیا لیتا، آج تم پر کوئی ملامت بھی نہیں کرتا، یہ تو اپنی طرف سے معافی کی خوش خبری سنادی، پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کی: يَغْفِرُ اللَّهُ ذُنُوبَكُمْ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ، یعنی اللہ تعالیٰ تمہاری خطاؤں کو معاف فرمادیں، وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہیں،

پھر فرمایا إِذْ هَبُوا بَقِيَّتَ صِصِي هَذَا فَإِنَّا نَقْوُهُ عَلَىٰ وَجْهِ أَبِي يَأْتِ بَصِيرًا، وَأَتُونِي بِأَهْلِكُمْ أَجْمَعِينَ، یعنی میرا یہ کر دے جاؤ اور اس کو میرے والد کے چہرے پر ڈال دو اس سے ان کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی، جس سے وہ یہاں تشریف لاسکیں گے اور اپنی باقی گھر والوں کو بھی سب کو میرے پاس لے آؤ تاکہ سب ملیں اور خوش ہوں، اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں سے فائدہ اٹھائیں اور شکر گزار ہوں۔

احکام و ہدایات | آیات مذکورہ سے بہت سے احکام و مسائل اور انسانی زندگی کے لئے اہم ہدایات حاصل ہوتیں:

اول لفظ تَصَدَّقْ عَلَيْنَا سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ برادرانِ یوسفؑ اولادِ انبیاء ہیں ان کے لئے صدقہ خیرات کیسے حلال تھا؟ دوسرے اگر صدقہ حلال بھی ہو تو سوال کرنا کیسے جائز تھا، برادرانِ یوسفؑ اگر انبیاء بھی نہ ہوں تو بھی یوسف علیہ السلام تو پیغمبر تھے، انھوں نے اس غلطی پر کیوں متنبہ نہیں فرمایا؟

اس کا ایک واضح جواب تو یہ ہے کہ یہاں لفظ صدقہ سے حقیقی صدقہ مراد نہیں بلکہ معاملے میں رعایت کرنے کو صدقہ خیرات کرنے سے تعبیر کر دیا ہے، کیونکہ بالکل مفت غلہ کا سوال تو انھوں نے کیا ہی نہ تھا، بلکہ کچھ نیکی چیزیں پیش کی تھیں، اور درخواست کا حاصل یہ تھا کہ ان کم قیمت چیزوں کو رعایت کر کے قبول فرمائیں، اس کے علاوہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اولادِ انبیاء کے لئے صدقہ خیرات کی حرمت صرف امت محمدیہ کے ساتھ مخصوص ہو جیسا کہ ائمہ تفسیر میں سے مجاہد کا یہی قول ہے (بیان مسترآن)

إِنَّ اللَّهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِينَ، سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ صدقہ و خیرات کرنے والوں کو جزائے خیر دیتے ہیں، مگر اس میں تفصیل یہ ہے کہ صدقہ و خیرات کی ایک جزا تو عام ہے، جو ہر مومن کافر کو دنیا میں ملتی ہے، وہ ہے رزق بلا اور دفع مصائب، اور ایک جزا آخرت کے ساتھ مخصوص ہے یعنی جنت، وہ صرف اہل ایمان کا حصہ ہے، یہاں چونکہ مخاطب عزیز مصر ہے، اور برادران یوسف کو ابھی تک یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ مومن ہی یا نہیں، اس لئے ایسا عام جملہ اختیار کیا جس میں دنیا و آخرت دونوں کی جزا شامل ہے۔ (بیان ہشرآن)

اس کے علاوہ بظاہر مروج تو اس جگہ اس کا تھا کہ چونکہ عزیز مصر سے خطاب تھا اس لئے اس جملہ میں بھی خطاب ہی کے صیغہ سے یہ کہا جاتا کہ تم کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دیں گے، لیکن چونکہ ان کا تو مومن ہونا معلوم نہ تھا اس لئے عام عنبران ختم تیار کیا اور خصوصی طور پر ان کو جزا ملنے کا ذکر نہیں کیا (قرطبی) قَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَىٰ نَا سے ثابت ہوا کہ جب انسان کسی تکلیف و مصیبت میں گرفتار ہو، اور پھر اللہ تعالیٰ اس سے نجات عطا فرما کر اپنی نعمت سے نوازیں تو اب اس کو گذشتہ مصائب کا ذکر کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کے اس انعام و احسان ہی کا ذکر کرنا چاہئے جو اب حاصل ہوا ہے، مصیبت سے نجات اور انعام الہی کے حصول کے بعد بھی پچھلی تکلیف و مصیبت کو روتے رہنا ناشکری ہے، ایسے ہی ناشکر کو قرآن عزیز میں کَنُود کہا گیا ہے، إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ، کَنُود کہتے ہیں اس شخص کو جو احسانات کو یاد نہ رکھے صرف تکلیفوں اور مصیبتوں کو یاد رکھو۔ اسی لئے یوسف علیہ السلام کو بھائیوں کے عمل سے عرصہ دراز تک جن مصیبتوں سے لقمہ پڑا تھا ان کا اس وقت کوئی ذکر نہیں کیا، بلکہ اللہ جل شانہ کے انعامات ہی کا ذکر فرمایا۔

مبر و تقویٰ ہر مصیبت | إِنَّكَ مِنْ يَتِيٍّ وَتَصْبِرُ سے معلوم ہوا کہ تقویٰ یعنی گناہوں سے بچنا کا علاج ہے اور تکلیفوں پر صبر و ثبات قدم، یہ دو صفتیں ایسی ہیں جو انسان کو ہر بلا

و مصیبت سے نکال دیتی ہیں، قرآن کریم نے بہت سے مواقع میں انہی دو صفتوں پر انسان کی فلاح و کامیابی کا مدار رکھا ہے، ارشاد ہے: وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرَّكُمْ كَيْدُ الْمُكْمِلِينَ شَيْعًا، یعنی اگر تم نے صبر و تقویٰ اختیار کر لیا تو دشمنوں کی مخالفانہ تدبیریں تمہیں کوئی گزند نقصان نہ پہنچا سکیں گی۔

یہاں بظاہر یہ دعویٰ معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام اپنے متقی اور صابر ہونے کا ادعا کر رہے ہیں کہ ہمارے صبر و تقویٰ کی وجہ سے ہمیں مشکلات سے نجات اور درجہ عالیہ نصیب ہوئے، مگر کسی کو خود اپنے تقویٰ کا دعویٰ کرنا بنص قرآن ممنوع ہے، فَلَا تُزَكُّوْا أَنْفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَىٰ، یعنی اپنی پاکی نہ جتلاؤ اللہ ہی زیادہ جانتا ہے کہ کون

مستحق ہے، مگر یہاں درحقیقت دعویٰ نہیں بلکہ تحدیث بالنعمة اور اللہ تعالیٰ کے احسانات کا ذکر ہے، کہ اس نے اول ہم کو صبر و تقویٰ کی توفیق عطا فرمائی پھر اس کے ذریعہ تمام نعمتیں عطا فرمائی۔
لَا تَزِرُ وَبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ، یعنی آج تم پر کوئی ملامت نہیں، یہ اخلاق کریمانہ کا اعلیٰ مقام ہے کہ ظالم کو صرف معاف ہی نہیں کر دیا بلکہ یہ بھی واضح کر دیا کہ اب تم پر کوئی ملامت بھی نہیں۔

اِذْ هَبُوا بَصِیْرًا هٰذَا اَفَالْقُوْهُ عَلٰی وَجْهِ اٰبٰی یٰکِتٍ بَصِیْرًا ۚ

لے جاؤ یہ کرتا میرا اور ڈالو اس کو منہ پر میرے باپ کے کہ چلا آئے آنکھوں سے دیکھتا ہوا

وَاَتُوْنِیْ بِاَهْلِکُمْ اَجْمَعِیْنَ ۙ ﴿۹۳﴾ وَکَمَا فَصَلَّتِ الْعِیْرُ قَالَ اٰبُوْهُمُ

اور لے آؤ میرے پاس گھر اپنا سارا، اور جب جدا ہوا قافلہ کہا ان کے باپ نے

اِنِّیْ لَآ اَجِدُ رِیْحَ یُّوسُفَ لَوْ لَا اَنْ تَفِیْدُوْنِ ﴿۹۴﴾ قَالُوْا تَاٰدِیْ اِنَّکَ

میں پاتا ہوں بو یوسف کی اگر نہ کہو مجھ کو کہ بوڑھا بہک گیا، لوگ بولے قسم اللہ کی تو تو

لَفِیْ ضَلٰلٰکَ الْفَقْدِیْمِ ۙ ﴿۹۵﴾ فَلَمَّا اَنَّ جَاۤءَ الْبَشِیْرَ اَلْفَنَۃُ عَلٰی

اپنی اس قدیم غلطی میں ہے، پھر جب پہنچا خوش خبری والا ڈالا اس نے وہ کرتا

وَجْهِہٗ فَارْتَدَّ بَصِیْرًا ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّکُمْ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مِّنْ

اس کے منہ پر پھوٹ کر ہو گیا دیکھنے والا، بولا میں نے نہ کہا تھا تم کو کہ میں جانتا ہوں اللہ

اَللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۙ ﴿۹۶﴾ قَالُوْا اٰیَاۤ اَنَا اسْتَغْفِرُ لَنَا ذُنُوْبَنَا

کی طرف سے جو تم نہیں جانتے، بولے اے باپ بخشو ہمارے گناہوں کو

اِنَّا کُنَّا خٰطِیْیْنَ ۙ ﴿۹۷﴾ قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَکُمْ رَبِّیْۤ اِنَّکُمْ

بیشک ہم تھے مجھ کے دالے، کہا دم لو بخشاؤں گا تم کو اپنے رب سے وہی ہو

هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ۙ ﴿۹۸﴾ فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰی یُّوسُفَ اَوٰی اِلَیْہِ

بخشنے والا مہربان، پھر جب داخل ہوئے یوسف کے پاس جگہ دی اپنی

اَبُوْیْہِ وَقَالَ اَدْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ اٰمِیْنٌ ۙ ﴿۹۹﴾

اپنے ماں باپ کو اور کہا داخل ہو مصر میں اللہ نے چاہا تو دل جی سے

وَرَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا ۖ وَقَالَ يَا أَبَتِ هَذَا

اور اونچا بٹھایا اپنے ماں باپ کو تخت پر اور سب گرے اس کے آگے سجدے میں اور کہا اے باپ یہ

تَاوِيلٌ مِّن رَّوَايَ مِنْ قَبْلُ ۚ وَقَدْ جَعَلَهَا رَبِّي حَقًّا ۚ وَقَدْ أَحْسَنَ بِي

بیان پر میرے اس پہلے خواب کا اس کو میرے رب نے سچ کر دیا اور اس نے انعام کیا مجھ پر

إِذَا أَخْرَجَنِي مِنَ السِّجْنِ وَجَاءَ بِكُم مِّنَ الْبَدْرِ مِّنْ أَعْدٍ

جب مجھ کو نکالا قید خانہ سے اور تم کو لے آیا گاؤں سے بعد اس کے کہ

أَن تَزْعُمَ الشَّيْطَانُ بَيْنِي وَبَيْنَ إِخْوَتِي ۚ إِنَّ رَبِّي لَطِيفٌ لِّمَا يَشَاءُ ۚ

جھگڑا ڈال چکا تھا شیطان مجھ میں اور میرے بھائیوں میں میرا رب تدبیر سے کرتا ہے جو چاہتا ہے

إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ۝۱۰۰

بیشک وہی ہی خبردار حکمت والا ۔

خلاصہ تفسیر

اب تم (میرے باپ کو جا کر بشارت دو اور بشارت کے ساتھ) میرا یہ گرتہ (بھی) لیتے جاؤ اور اس کو میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو (اس سے) ان کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی (اور یہاں تشریف لے آئیں گے) اور اپنے (باقی) گھر والوں کو (بھی) سب کو میرے پاس لے آؤ (کہ سب ملیں اور خوش ہوں، کیونکہ حالت موجودہ میں میرا جاننا مشکل ہے، اس لئے گھر والے ہی چلے آئیں) اور جب (یوسف علیہ السلام سے بات چیت ہو چکی، اور آپ کے فرمانے کے موافق گرتہ لے کر چلنے کی تیاری کی اور) قافلہ (شہر مصر سے) چلا (جس میں یہ لوگ بھی تھے) تو ان کے باپ نے (پاس والوں سے) کہنا شروع کیا کہ اگر تم مجھ کو بڑھاپے میں پہنچا کر دے والے ہو تو ایک بات کہوں کہ مجھ کو تو یوسف کی خوشبو آ رہی ہے (معجزہ اختیاری نہیں ہوتا اس لئے اس سے پہلے یہ ادراک نہ ہوا) وہ (پاس والے) کہنے لگے کہ بخدا آپ تو اپنے اسی پرانے غلط خیال میں مبتلا ہیں کہ یوسف زندہ ہیں اور ملیں گے اسی خیال کے غلبہ سے اب خوشبو کا وہم ہو گیا، اور واقع میں نہ خوشبو ہے نہ کچھ اور ہے، یعقوب علیہ السلام خاموش ہو رہے (پس جب (یوسف کے صحیح سلامت ہونے کی) خوش خبری لانے والا (مع گرتہ کے یہاں) آپہنچا تو راتے ہی) اس نے وہ گرتہ ان کے منہ پر لا کر ڈال دیا پس (آنکھوں کو لگنا تھا اور دماغ میں خوشبو پہنچا کہ) فوراً ہی

ان کی آنکھیں کھل گئیں اور انھوں نے سارا ماجرا آپ سے بیان کیا، آپ نے (بیٹوں سے) فرمایا: کیوں، میں نے تم سے کہا تھا کہ اللہ کی باتوں کو جتنا میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے (اور اس لئے میں نے تم کو یوسفؑ کے تجسس کے لئے بھیجا تھا، دیکھو آخر اللہ تعالیٰ میری امید راست لیا) ان کا یہ قول اس سے اوپر کے رکوع میں آچکا ہے، اُس وقت (سب بیٹوں نے کہا کہ اے ہمارے باپ ہمارے لئے (خدا سے) ہمارے گناہوں کی دعا، مغفرت کیجئے (ہم نے جو کچھ آپ کو یوسفؑ علیہ السلام کے معاملہ میں تکلیف دی) ہم بیشک خطا دار تھے (مطلب یہ ہے کہ آپ بھی معاف کر دیجئے، کیونکہ عادتاً کسی کے لئے استغفار دہی کرتا ہے جو خود بھی مواخذہ کرنا نہیں چاہتا)۔ یعقوب (علیہ السلام) نے فرمایا عنقریب تمھارے لئے اپنے رب سے دعائے مغفرت کروں گا بے شک وہ غفور رحیم ہے (اور اسی سے ان کا معاف کر دینا بھی معلوم ہو گیا اور عنقریب کا مطلب یہ ہے کہ نہجہر کا وقت آنے دو جو کہ قبولیت کی ساعت ہے کذا فی الدر المنثور) غرض سب مصر کو تیار ہو کر چل دیئے اور یوسفؑ علیہ السلام خبر سن کر استقبال کے لئے مصر باہر تشریف لائے اور باہر ہی ملاقات کا سامان کیا گیا، پھر جب سب کے سب یوسفؑ (علیہ السلام) کے پاس پہنچے تو انھوں نے (سب مل ملا کر) اپنے والدین کو اپنے پاس (تعظیماً) جگہ دی، اور (بات چیت سے فارغ ہو کر) کہا سب مصر میں چلتے (اور) انشاء اللہ تعالیٰ (وہاں) امن چین سے رہتے (مفارقت کا غم اور قحط کا الم سب کا فور ہو گئے، غرض سب مصر میں پہنچے) اور (وہاں پہنچ کر تعظیماً) اپنے والدین کو تخت (شاہی) پر ادباً بٹھایا، اور (اس وقت سب کے قلوب پر یوسفؑ علیہ السلام کی ایسی عظمت غالب ہوئی کہ) سب کے سب ان کے سامنے سجدہ میں گر گئے اور (یہ حالت دیکھ کر) وہ کہنے لگے کہ اے آبا یہ ہے میرے خواب کی تعبیر جو پہلے زمانہ میں دیکھا تھا، کہ شمس و قمر اور گیارہ ستارے مجھ کو سجدہ کرتے ہیں (میرے رب نے اس خواب کو سچا کر دیا، یعنی اس کی سچائی کا ظہور کر دیا) اور (اس شرف کے سوا میرے رب نے مجھ پر اور انعامات بھی فرمائے، چنانچہ) میرے ساتھ (ایک) اُس وقت احسان فرمایا جس وقت مجھ کو قید سے نکالا (اور اس مرتبہ سلطنت تک پہنچایا) اور (دوسرا یہ انعام فرمایا کہ) بعد اس کے کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان میں فساد ڈلوا دیا تھا جس کا مقتضایہ تھا کہ عمر بھر بھی جمع و متفق نہ ہوتے، مگر اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے کہ وہ (تم سب کو) جن میں میرے بھائی بھی ہیں) باہر سے (یہاں) لے آیا (اور سب کو ملا دیا) بلاشبہ میرا رب جو چاہتا ہے اس کی تدبیر لطیف کر دیتا ہے، بلاشبہ وہ بڑا علم اور حکمت والا ہے، (اپنے علم و حکمت سے سب امور کی تدبیر درست کر دیتا ہے) :

معارف و مسائل

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ سے متعلق سابقہ آیات میں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ جب باذن خداوندی اس کا وقت آگیا کہ یوسف علیہ السلام اپنا راز بھائیوں پر ظاہر کر دیں تو انھوں نے حقیقت ظاہر کر دی، بھائیوں نے معافی مانگی، انھوں نے نہ صرف یہ کہ معاف کر دیا، بلکہ گزشتہ واقعات پر کوئی ملامت کرنا بھی پسند نہ کیا، ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی، اور اب والد سے ملاقات کی فکر ہوئی، حالات کے لحاظ سے مناسب یہ سمجھا کہ والد صاحب ہی مع خاندان کے یہاں تشریف لائیں، مگر معلوم ہو چکا تھا کہ ان کی بیانی اس مفارقت میں جاتی رہی، اس لئے سب سے پہلے اس کی فکر ہوئی اور بھائیوں سے کہا:

اِذْ هَبُوا بَعْضِيَ هَذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰی رَجُلٍ يَّاْتِ بِصَيْرٍ اٰیٰتِیْ تَمِیْرٍ اِیہ کرنا لے جاؤ اور میرے والد کے چہرے پر ڈال دو تو ان کی بیانی عود کر آئے گی۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی کے کرتے کا چہرہ پر ڈال دینا بیانی کے عود کرنے کا کوئی مادی سبب نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ ایک معجزہ تھا حضرت یوسف علیہ السلام کا کہ ان کو باذن خداوندی معلوم ہو گیا کہ جب ان کا کرتہ والد کے چہرے پر ڈالا جائے گا تو اللہ تعالیٰ ان کی بیانی بحال فرما دیں گے۔

اور سخاک اور مجاہد وغیرہ ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ اس کرتے کی خصوصیت تھی، کیونکہ یہ عام کپڑوں کی طرح نہ تھا، بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے جنت سے اُس وقت لایا گیا تھا جب ان کو برہنہ کر کے نرود نے آگ میں ڈالا تھا، پھر یہ جنت کا لباس ہمیشہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس محفوظ رہا، اور ان کی وفات کے بعد حضرت اسحق علیہ السلام کے پاس رہا، اُن کی وفات کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام کو ملا، آپ نے اس کو ایک بڑی تبرک شے کی حیثیت سے ایک ٹکلی میں بند کر کے یوسف علیہ السلام کے گھر میں بطور تعویذ کے ڈال دیا تھا، تاکہ نظر بد سے محفوظ رہیں، برادرانِ یوسف نے جب ان کا کرتہ والد کو دھوکہ دینے کے لئے اُتار لیا، اور وہ برہنہ کر کے کنویں میں ڈال دیئے گئے تو جبریل امین تشریف لائے اور گھر میں پڑی ہوئی ٹکلی کھول کر اس سے یہ کرتہ برآمد کیا، اور یوسف علیہ السلام کو پہنا دیا، اور یہ ان کے پاس برابر محفوظ چلا آیا، اس وقت بھی جبریل امین ہی نے یوسف علیہ السلام کو یہ مشورہ دیا کہ یہ جنت کا لباس ہے، اس کی خاصیت یہ ہو کہ نابینا کے چہرے پر ڈال دو تو وہ بینا ہو جاتا ہے، اور فرمایا کہ اس کو اپنے والد کے پاس بھیج دیجئے تو وہ بینا ہو جائیں گے۔

اور حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا

حُسن و جمال اور ان کا وجود خود جنت ہی کی ایک چیز تھی، اس لئے ان کے جسم سے منسلک ہونے والے ہر گرتے میں یہ خاصیت ہو سکتی ہے (منظری)

وَأَنْتَوْنِي بِأَهْلِكُمْ أَجْمَعِينَ، یعنی تم سب بھائی اپنے سب اہل و عیال کو میرے پاس مصر لے آؤ، اصل مقصد تو والد محترم کو بلانے کا تھا، مگر یہاں بالتصریح والد کے بجائے خاندان کو لانے کا ذکر کیا شاید اس لئے کہ والد کو یہاں لانے کے لئے کہنا ادب کے خلاف سمجھا، اور یہ یقین تھا ہی کہ جب والد کی بنیائی عود کر آئے گی، اور یہاں آنے سے کوئی غدر مانع نہیں رہے گا تو وہ خود ہی ضرورت شریف لائیں گے، قرطبی نے ایک روایت نقل کی ہے کہ برادران یوسف میں سے یہود لانے کہا کہ یہ گرتے میں لے جاؤں گا، کیونکہ ان کے گرتے پر جھوٹا خون لگا کر بھی میں ہی لے گیا تھا جس سے والد کو صدمات پہنچے، اب اس کی مکافات بھی میرے ہی ہاتھ سے ہونا چاہیے۔

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ، یعنی جب قافلہ شہر سے باہر نکلا ہی تھا تو یعقوب علیہ السلام نے اپنے پاس والوں سے کہا کہ اگر تم مجھے بیوقوف نہ کہو تو میں تمہیں بتلاؤں کہ مجھے یوسف کی خوشبو آرہی ہے، شہر مصر سے کنعان تک ابن عباس کی روایت کے مطابق آٹھ دن کی فاصلہ تھا، اور حضرت حسنؓ نے فرمایا کہ اسی فرسخ یعنی تقریباً ڈھائی سو میل کا فاصلہ تھا، اللہ تعالیٰ نے اتنی دُور سے قمیص یوسف کے ذریعہ حضرت یوسفؑ کی خوشبو یعقوب علیہ السلام کے دماغ تک پہنچا دی، اور یہ عجائب میں سے ہے کہ جب یوسف علیہ السلام اپنے وطن کنعان ہی کے ایک کنویں میں تین روز تک پڑے رہے تو اس وقت یہ خوشبو محسوس نہیں ہوئی، یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی معجزہ پیغمبر کے اختیار میں نہیں ہوتا، بلکہ درحقیقت معجزہ پیغمبر کا اپنا فعل و عمل بھی نہیں ہوتا، یہ براہ راست فعل اللہ ہوتا ہے، جب اللہ تعالیٰ ارادہ فرماتے ہیں تو معجزہ ظاہر کر دیتے ہیں، اور جب اذن خداوندی نہیں ہوتا تو قریب سے قریب بھی بعید ہو جاتا ہے۔

قَالُوا اتَّالَهِ انَّا لَنَعْنِي ضَلِيلَتِ الْفَقْرِ، یعنی حاضرین مجلس نے یعقوب علیہ السلام کی بات سن کر کہا کہ بخدا آپ تو اپنے اسی پُرانے غلط خیال میں مبتلا ہیں، کہ یوسف زندہ ہیں اور وہ پھر ملیں گے۔

وَلَمَّا أَنْ جَاءَ الْبَشِيرُ، یعنی جب بشارت دینے والا کنعان پہنچا، اور قمیص یوسف کو یعقوب علیہ السلام کے چہرے پر ڈال دیا، تو فوراً ان کی بنیائی عود کر آئی، بشارت دینے والا وہی حضرت یوسف علیہ السلام کا بھائی یہودا تھا، جو ان کا کرتہ مصر سے لایا تھا۔

قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَنَا عَبْدُ اللَّهِ، مِمَّا لَا تَعْلَمُونَ، یعنی کیا میں نہ کہہ رہا تھا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ علم حاصل ہے جس کی آپ لوگوں کو خبر نہیں کہ یوسف زندہ ہیں اور وہ پھر ملیں گے۔

قَالُوا يَا بَنَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا إِنَّا كُنَّا خَاطِئِينَ، اب جیکہ حقیقت حال واضح ہو کر سامنے آگئی تو برادرانِ یوسف نے والد سے اپنی خطاؤں کی معافی اس شان سے مانگی کہ والد سے درخواست کی کہ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کریں، اور یہ ظاہر ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے ان کی خطا معاف کرنے کی دعا کریگا وہ خود بھی ان کی خطا معاف کر دے گا۔
قَالَ سَتَرْتُ عَنْكُمْ كَلِمَةً كَبِيرَةً - یعنی یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ میں عنقریب تمہارے لئے اللہ تعالیٰ سے معافی کی دعا کروں گا۔

یہاں حضرت یعقوب علیہ السلام نے فوراً ہی دعا کرنے کے بجائے وعدہ کیا کہ عنقریب دعا کروں گا، اس کی وجہ عام مفسرین نے یہ بھی ہے کہ مقصود اس سے یہ تھا کہ استہام کے ساتھ آخر شب کے وقت میں دعا کریں، کیونکہ اس وقت کی دعا خصوصیت سے قبول کی جاتی ہے، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر رات کے آخری تہائی حصہ میں زمین سے قریب تر آسمان پر فرزولِ اجلال فرماتے ہیں اور یہ اعلان کرتے ہیں کہ کون ہے جو مجھ سے دعا مانگے، تو میں اس کو قبول کر لوں، کون ہے جو مجھ سے مغفرت طلب کرے اور میں اس کی مغفرت کر دوں۔

فَلَمَّا دَخَلُوا مَكَّةَ، بعض روایات میں ہے کہ یوسف علیہ السلام نے اس مرتبہ اپنے بھائیوں کے ساتھ دوسرا دنوں پر لدا ہوا بہت سا سامان کپڑوں اور دوسری ضروریات کا بھیجا تھا، تاکہ پورا خاندان ہمارے لئے عہد تیار کر سکے، اس کے مطابق یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد اور تمام متعلقین مصر کے لئے تیار ہو کر نکلے، تو ایک روایت میں ان کی تعداد بہتر اور دوسری میں قرآن کے نفوس مرد و عورت پر مشتمل تھی۔
دوسری طرف جب مصر پہنچنے کا وقت قریب آیا تو حضرت یوسف علیہ السلام اور ملک مصر کے لوگ استقبال کے لئے شہر سے باہر تشریف لائے، اور چار ہزار سپاہی ان کے ساتھ سلامی دینے کے لئے نکلے، جب یہ حضرات مصر میں یوسف علیہ السلام کے مکان میں داخل ہوئے تو انھوں نے اپنے والدین کو اپنے پاس ٹھہرایا۔
یہاں ذکر والدین کا ہے، حالانکہ یوسف علیہ السلام کی والدہ کا انتقال بچپن ہی میں ہو چکا تھا مگر ان کے بعد یعقوب علیہ السلام نے مرحومہ کی بہن لیثا سے نکاح کر لیا تھا، جو یوسف علیہ السلام کی خالہ ہونے کی حیثیت سے بھی مل والدہ کے تھیں، اور والد کے نکاح میں ہونے کی حیثیت سے بھی والدہ ہی کہلانے کی مستحق تھیں لہذا
وَقَالَ اذْهَبُوا مِصْرَ اِنَّ شَاءَ اللّٰهُ اَمِنَيْنَ، یوسف علیہ السلام نے سب خاندان

لے یہ توجہ اس روایت کے مطابق ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی والدہ بنیامین کی ولادت کے وقت قاتل پائی تھیں اس بنا پر یہاں حضرت معصوم رحمۃ اللہ علیہ کی یہ عبارت صفحہ ۲۹ و ۳۰ کی عبارت سے متفاد معلوم ہوتی ہے جس میں حضرت یوسف علیہ السلام کی والدہ راحیل کو قرار دیا گیا ہے لیکن دراصل اس معاملے میں کوئی مستند روایت تو نہیں، اسرائیلی روایات ہیں اور ان میں بھی تعارض ہی خود صاحبِ روئے المعانی نے لکھا ہے کہ یہودی حضرات حضرت یوسف علیہ السلام کی والدہ کے بنیامین کی ولادت کے وقت انتقال کے قائل نہیں ہیں اگر اس روایت کو لیا جائے تو کوئی اشمال باقی نہیں رہتا، اس سورت میں ورفع البویہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کی حقیقی والدہ مراد ہوگی۔ ابن جریر اور ابن کثیر نے اسی کو راجع قرار دیا جو چنانچہ ابن کثیر اس پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں
قال ابن جریر ولم یقم دلیل علی موت امہ (امی ام یوسف علیہ السلام)، وظاہر القرآن یدل علی حیاتها، محقق عثمانی

کے لوگوں سے کہا کہ آپ سب باذن خداوندی مصر میں بے خوف و خطر بغیر کسی پابندی کے داخل ہو جائیں۔
مطلب یہ تھا کہ دوسرے ملک میں داخل ہونے والے مسافروں پر جو پابندیاں عادتہ ہوا کرتی ہیں
آپ ان سب پابندیوں سے مستثنیٰ ہیں۔

وَرَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ، یعنی یوسف علیہ السلام نے اپنے والدین کو اپنے تخت
شاہی پر بٹھایا۔

وَحُورٌ دَانٌ سَجَّجْنَ، یعنی والدین اور سب بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کے سامنے
سجدہ کیا، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ سجدہ شکر اللہ تعالیٰ کے لئے کیا گیا تھا،
یوسف علیہ السلام کو نہیں تھا، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ سجدہ عبادت تو ہر پیغمبر کی شریعت
میں غیر اللہ کے لئے حرام تھا، لیکن سجدہ تعظیم انبیاء سابقین کی شریعتوں میں جائز تھا جو شریعت
اسلام میں ذریعہ شرک ہونے کی بنا پر منسوخ ہو گیا ہے، جیسا کہ حدیث صحیحین میں مذکور ہے کہ کسی
غیر اللہ کے لئے سجدہ حلال نہیں۔

وَقَالَ يَا بَنَاتِ هَذَا ثَوْبٌ رُءُوسِي، یوسف علیہ السلام کے سامنے جب دونوں
ماں باپ اور گیارہ بھائیوں نے بیک وقت سجدہ کیا تو ان کو اپنا وہ بچپن کا خواب یاد آ گیا، اور
فرمایا کہ ابا جان! یہ میرے اس خواب کی تعبیر ہے جو بچپن میں دیکھا تھا کہ آفتاب و ماہتاب اور
گیارہ ستارے مجھے سجدہ کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے اس خواب کی سچائی کو
آنکھوں سے دکھلا دیا۔

احکام و مسائل | حضرت یعقوب علیہ السلام نے صاحبزادوں کی درخواست معافی و
دعائے مغفرت پر جو یہ فرمایا کہ ”عنقریب تمہارے لئے دعائے مغفرت
کردوں گا، اور فوراً دعا نہیں کی۔

اس تاخیر کی ایک وجہ بعض حضرات نے یہ بھی بیان کی ہے کہ منظور یہ تھا کہ یوسف
علیہ السلام سے مل کر پہلے یہ تحقیق ہو جائے کہ انھوں نے ان کی خطا معاف کر دی ہو یا نہیں،
کیونکہ جب تک مظلوم معافی نہ دے عند اللہ بھی معافی نہیں ہوتی، ایسی حالت میں دعائے
مغفرت بھی مناسب نہ تھی۔

یہ بات اپنی جگہ بالکل صحیح اور اصولی ہے کہ حقوق العباد کی توبہ بغیر اس کے نہیں ہوتی
کہ صاحب حق اپنا حق وصول کر لے یا معاف کر دے، محض زبانی توبہ و استغفار کافی نہیں۔
۲۔ حضرت سفیان ثوریؒ کی روایت ہے کہ جب یہود اقمیص یوسف لے کر آئے اور یعقوب
علیہ السلام کے چہرے پر ڈالا تو پوچھا کہ یوسف کیسے ہیں؟ انھوں نے بتلایا کہ وہ مصر کے بادشاہ

ہیں، یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اس کو نہیں پڑھتا کہ وہ بادشاہ ہیں یا فقیر، پڑھنا یہی کہ ایمان اور عمل کے اعتبار سے کیا حال ہے، تب انھوں نے ان کے تقویٰ و طہارت کے حالات بتلاتے، یہ ہر انبیاء علیہم السلام کی محبت اور تعلق کہ اولاد کی جسمانی راحت سے زیادہ ان کی روحانی حالت کی فکر کرتے ہیں، ہر مسلمان کو اسی کا اتباع کرنا چاہئے۔

۳۔ حضرت حسنؑ سے روایت ہے کہ جب بشارت دینے والا قمیصِ یوسف لے کر پہنچا، تو یعقوب علیہ السلام چاہتے تھے کہ اس کو کچھ انعام دیں مگر حالات سازگار نہ تھے، اس لئے عذر کیا کہ سات روز سے ہمارے گھر میں روٹی نہیں پکی، اس لئے میں کچھ مادی انعام تو نہیں دے سکتا، مگر یہ دعا دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تم پر سکراتِ موت کو آسان کر دیں، قرطبیؒ نے فرمایا کہ یہ دعا ان کے لئے سب سے بہتر انعام تھا۔

۴۔ اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خوشخبری دینے والے کو انعام دینا سنتِ انبیاء ہے، صحابہ کرام میں حضرت کعب بن مالکؓ کا واقعہ مشہور ہے، کہ غزوہ تبوک میں شرکت نہ کرنے پر جب اُن پر عتاب ہوا اور بعد میں توبہ قبول کی گئی، تو جو شخص قبولِ توبہ کی بشارت لایا تھا اپنا جوڑا کپڑوں کا اتار کر اس کو پہنا دیا۔

نیز اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ خوشی کے موقع پر اظہارِ مسرت کے لئے دوستوں وغیرہ کو کھانے کی دعوت دینا بھی سنت ہے، حضرت فاروق اعظمؓ نے جب سورۃ بقرہ پڑھ کر ختم کی تو خوشی میں ایک اونٹ ذبح کر کے لوگوں کو کھلایا۔

۵۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے صاحبزادوں نے حقیقتِ واقعہ ظاہر ہو جانے کے بعد اپنے والد اور بھائی سے معافی مانگی، اس سے معلوم ہوا کہ جس شخص کے ہاتھ یا زبان سے کسی شخص کو ایذا پہنچی، یا اس کا کوئی حق اس کے ذمہ رہا اس پر لازم ہے کہ فوراً اس حق کو ادا کر دے یا اس سے معاف کرالے۔

صحیح بخاری میں بروایت ابو ہریرہؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کے ذمہ کسی دوسرے کا کوئی حق مالی واجب ہو، یا اس کو کوئی ایذا ہاتھ یا زبان سے پہنچائی ہو اس کو چاہئے کہ آج اس کو ادا کر دے، یا معافی مانگ کر اس سے سبکدوشی حاصل کر لے، قبل اس کے کہ قیامت کاؤن آجائے جہاں کسی کے پاس کوئی مال حق ادا کرنے کے لئے نہ ہوگا، اس لئے اس کے اعمالِ صالحہ منظرِ کو دیدیئے جائیں گے، یہ خالی رہ جائے گا، اور اگر اس کے اعمال بھی صالح نہیں تو دوسرے کے جو گناہ ہیں اس کے سر پر ڈال دیئے جائیں گے، والعیاذ باللہ تعالیٰ۔

یوسف علیہ السلام کا اس کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے والدین کے سامنے کچھ اپنی سرگزشت
مقام صبر و شکر بیان کرنا شروع کی، یہاں ایک منٹ ٹھہر کر غور کیجئے، کہ آج اگر کسی اتنے مصائب

کا سامنا کرنا پڑے، جتنے یوسف علیہ السلام پر گزرے اور والدین سے اتنی طویل مفارقت اور مایوسی
کے بعد ملنے کا اتفاق ہو تو وہ والدین کے سامنے اپنی سرگزشت کیا بیان کرے گا، کتنا روئے گا اور
ڈلائے گا، اور کتنے دن رات مصائب کی داستان سنانے میں صرف کرے گا، مگر یہاں طرفین میں اللہ
کے رسول اور پیغمبر ہیں، ان کا طرز عمل ملاحظہ فرمائیے، یعقوب علیہ السلام کے بچھڑے ہوئے
محبوب فرزند ہزاروں مصائب کے دور سے گزرنے کے بعد جب والد سے ملتے ہیں تو کیا فرماتے ہیں

وَقَدْ أَحْسَنَ بَنِيَ إِذْ أَخْرَجَنِي مِنَ السِّجْنِ وَجَاءَ بِكُم مِّنَ الْمَدِينِ وَمِن بَحْنٍ
أَنْ تَزْعُمَ الشَّيْطَانُ بَيْنِي وَبَيْنَ إِخْوَتِي، یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھ پر احسان فرمایا جبکہ مجھے قید خانہ
سے نکال دیا، اور آپ کو باہر سے یہاں لے آیا، بعد اس کے کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں
کے درمیان فساد ڈلوادیا تھا،

حضرت یوسف علیہ السلام کی مصائب ترتیب وار تین بابوں میں تقسیم ہوتی ہیں، اول
بھائیوں کا ظلم و جور، دوسرے والدین سے طویل جدائی، تیسرے قید خانے کی تکالیف، خدا تعالیٰ
کے اس برگزیدہ پیغمبر نے اپنے بیان میں پہلے تو واقعات کی ترتیب کو بدل کر قید خانے سے بات
شروع کی اور اس میں قید خانے میں داخل ہونے اور وہاں کی تکالیف کا نام نہیں لیا، بلکہ قید خانہ
سے نکلنے کا ذکر اللہ تعالیٰ کے شکر کے ساتھ بیان کیا، قید خانہ سے نجات اور اس پر شکر الہی کے
ضمن میں یہ بھی بتلادیا کہ میں کسی وقت قید خانہ میں بھی رہا ہوں۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ یوسف علیہ السلام نے جیل خانے سے نکلنے کا ذکر کیا،
بھائیوں نے جس کنویں میں ڈالا تھا اس کا اس حیثیت سے بھی ذکر نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے
مجھے اس کنویں سے نکالا، وجہ یہ ہے کہ بھائیوں کی خطا پہلے معاف کر چکے تھے، اور فرما چکے تھے
لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمْ الْيَوْمَ، اس لئے مناسب نہ سمجھا کہ اب اس کنویں کا کسی طرح سے بھی ذکر
آئے، تاکہ بھائی شرمندہ نہ ہوں (قرطبی)

اس کے بعد والدین کی طویل اور صبر آزمات مفارقت اور اس کے تاثرات کا ذکر کرنا تھا تو
ان سب باتوں کو چھوڑ کر اس کے آخری انجام اور والدین سے ملاقات کا ذکر اللہ تعالیٰ کے شکر
کے ساتھ کیا، کہ آپ کو بند و یعنی دیہات سے شہر مقرر میں پہنچا دیا، اس میں اس نعمت کی طرف
بھی اشارہ ہے کہ یعقوب علیہ السلام کا وطن دیہات میں تھا، جہاں معیشت کی آسانیاں کم ہوتی
ہیں، اللہ تعالیٰ نے شہر میں شاہی اعزازات کے ساتھ اندر پہنچا دیا۔

اب پہلی بات رہ گئی، بھائیوں کا ظلم و جور، سو اس کو بھی شیطان کے حوالہ کر کے اس طرح بیان کر دیا کہ میرے بھائی تو ایسے نہ تھے جو یہ کام کرتے، شیطان نے ان کو دھوکہ میں ڈال کر یہ فساد کرا دیا۔ یہ ہر شانِ نبوت کہ مصائب اور تکالیف پر صرف صبر ہی نہیں بلکہ ہر جگہ شکر کا پہلو نکال لیتے ہیں، اسی لئے ان کا کوئی حال ایسا نہیں ہوتا جس میں وہ اللہ تعالیٰ کے شکر گزار نہ ہوں، بخلاف عام انسانوں کے کہ ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہزاروں نعمتیں برستی رہیں تو بھی کسی کا ذکر نہ کریں اور کسی وقت کوئی مصیبت پڑ جائے تو اس کو عمر بھر گاتے رہیں، قرآن میں اسی کی شکایت کی گئی ہے إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُورٌ یعنی انسان اپنے رب کا بہت ناشکر ہے۔

یوسف علیہ السلام نے داستانِ مصائب کو تین لفظوں میں مختصر کرنے کے بعد فرمایا اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَآئِشَاۤءِ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝۷ یعنی میرا پروردگار جو چاہتا ہے اس کی تدبیر لطیف کر دیتا ہے، بلاشبہ وہ بڑا علم والا حکمت والا ہے۔

رَبِّ قَدْ اَتَيْتَنِي مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِي مِمَّنْ تَاُوِيْلُ الْاَحَادِيْثِ

اے رب تو نے دی مجھ کو کچھ حکومت اور سکھایا مجھ کو کچھ پھیرنا باتوں کا،

فَاَطَّرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِيٌّ فِی الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۝۸

اے پیدا کرنے والے آسمان اور زمین کے تو ہی میرا کارساز ہو دنیا میں اور آخرت میں،

تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحَقَّنِيْ بِالصَّٰلِحِيْنَ ۝۹

موت دے مجھ کو اسلام پر اور ملا مجھ کو نیک بختوں میں۔

خلاصہ تفسیر

اس کے بعد سب ہنسی خوشی رہتے رہے یہاں تک کہ یعقوب علیہ السلام کی عمر ختم پر پہنچی، اور بعد وفات ان کی وصیت کے مطابق ملک شام میں لے جا کر اپنے بزرگوں کے پاس دفن کئے گئے، پھر یوسف علیہ السلام کو بھی آخرت کا اشتیاق ہوا، اور دعا کی کہ اے میرے پروردگار! آپ نے مجھ کو ہر طرح کی نعمتیں دیں، ظاہری بھی باطنی بھی، ظاہری یہ کہ مثلاً، سلطنت کا بڑا حصہ دیا، اور باطنی یہ کہ مثلاً، مجھ کو خوابوں کی تعبیر دینا تعلیم فرمایا (جو کہ علم عظیم ہے خصوصاً

جب کہ وہ یقینی ہو جو موقوف ہے وہی پرپس اس کا وجود مستلزم ہو گا عطا نبوت کو، اے خالق آسمانوں اور زمین کے آپ میرے کارساز ہیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی (پس جس طرح دنیا میں میرے سارے کام بنادیتے کہ سلطنت دی، علم دیا، اسی طرح آخرت کے کام بھی بنادیتے کہ) مجھ کو فرمانبرداری کی حالت میں دنیا سے اٹھا لیجئے، اور خاص نیک بندوں میں شامل کر دیجئے (یعنی میرے بزرگوں میں جو انبیائے عظام ہوئے ہیں ان میں مجھ کو بھی پہنچا دیجئے)۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں تو والد بزرگوار سے خطاب تھا، اس کے بعد جبکہ والدین اور بھائیوں کی ملاقات سے ایک اہم مقصد حاصل ہو کر سکون ملا تو براہ راست حق تعالیٰ کی حمد و ثناء اور دعائیں مشغول ہو گئے، فرمایا

رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِي مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ فَاطِرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ أَنْتَ وَلِيَّ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَأَلْحَقْنِي بِالصَّالِحِينَ ۝^{۱۰۱} یعنی اے میرے پروردگار آپ نے ہی مجھ کو سلطنت کا بڑا حصہ دیا، اور مجھ کو خوابوں کی تعبیر دینا تعلیم فرمایا، اے آسمان و زمین کے خالق آپ ہی دنیا و آخرت میں میرے کارساز ہیں، مجھ کو پوری فرمانبرداری کی حالت میں دنیا سے اٹھا لیجئے، اور مجھ کو کامل نیک بندوں میں شامل رکھئے، کامل نیک بندے انبیاء علیہم السلام ہی ہو سکتے ہیں، جو ہر گناہ سے معصوم ہیں (ظہری) اس دعا میں حسن خاتمہ کی دعا خاص طور پر قابلِ نظر ہے، کہ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کا رنگ یہ ہوتا ہے کہ کتنے ہی درجات عالیہ دنیا و آخرت کے اُن کو نصیب ہوں، اور کتنے ہی جاہ و منصب ان کے قدموں میں ہوں وہ کسی وقت اُن پر مغرور نہیں ہوتے، بلکہ ہر وقت اس کا کھٹکا لگا رہتا ہے کہ کہیں یہ حالات سلب یا کم نہ ہو جائیں، اس کی دعائیں مانگتے رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ظاہری اور باطنی نعمتیں موت تک برقرار رہیں، بلکہ ان میں اضافہ ہوتا رہے۔ یہاں تک حضرت یوسف علیہ السلام کا عجیب و غریب قصہ اور اس کے ضمن میں آئی ہوئی

ہدایات کا سلسلہ جو قرآن میں مذکور ہو پورا ہو گیا، اس کے بعد کا قصہ قرآن کریم یا کسی حدیث مرفوعہ میں منقول نہیں، اکثر علماء تفسیر نے تاریخی یا اسرائیلی روایات کے حوالہ سے نقل کیا ہے تفسیر ابن کثیر میں حضرت حسنؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ یوسف علیہ السلام کو جس وقت بھائیوں نے کنوئیں میں ڈالا تھا تو ان کی عمر سترہ سال کی تھی، پھر انہی سال والد سے غائب رہے، اور والدین کی ملاقات کے بعد تیس سال زندہ رہے، اور ایک سو بیس

سال کی عمر میں وفات پائی۔

اور محمد بن اسحق نے فرمایا کہ اہل کتاب کی روایات میں ہے کہ یوسف علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کی مفارقت کا زمانہ چالیس سال تھا، پھر یعقوب علیہ السلام مصر میں تشریف لانے کے بعد یوسف علیہ السلام کے ساتھ سترہ سال زندہ رہے، اس کے بعد ان کی وفات ہو گئی۔ تفسیر قرطبی میں اہل تاریخ کے حوالہ سے مذکور ہے کہ مصر میں چوبیس سال رہنے کے بعد یعقوب علیہ السلام کی وفات ہوئی، اور وفات سے پہلے یوسف علیہ السلام کو یہ وصیت فرمائی تھی کہ میری لاش کو میرے وطن بھیج کر میرے والد اسحق علیہ السلام کے پاس دفن کیا جائے۔ سعید بن جبیر نے فرمایا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو سال کی لکڑی کے تابوت میں رکھ کر بیت المقدس کی طرف منتقل کیا گیا، اسی وجہ سے عام یہودیوں میں یہ رسم چلی گئی کہ اپنے مرنے والے کو دور دور سے بیت المقدس میں لے جا کر دفن کرتے ہیں، حضرت یعقوب علیہ السلام کی عمر وفات کے وقت ایک سو سینتالیس سال تھی۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ یعقوب علیہ السلام مع اپنی اولاد کے جب مصر میں داخل ہوئے تو ان کی تعداد تیرا نوے مرد و عورت پر مشتمل تھی، اور جب یہ اولاد یعقوب علیہ السلام کی بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مصر سے نکلے تو ان کی تعداد چھ لاکھ ستر ہزار تھی۔ (قرطبی) یہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ سابق عزیز مصر کے انتقال کے بعد شاہ مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام کی شادی زلیخا کے ساتھ کرادی تھی۔

تورات اور اہل کتاب کی تاریخ میں ہے کہ ان سے یوسف علیہ السلام کے دو لڑکے افرائیم اور منشا اور ایک لڑکی رحمت بنت یوسف پیدا ہوئے، رحمت کا نکاح حضرت ایوب علیہ السلام کے ساتھ ہوا، اور افرائیم کی اولاد میں یوشع بن نون پیدا ہوئے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رفیق تھے (منظری)۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا انتقال ایک سو بیس سال کی عمر میں ہوا، اور دریائے نیل کے کنارے پر دفن کئے گئے۔

ابن اسحق نے حضرت عروہ ابن زبیرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر مصر سے نکل جائیں، تو بذریعہ وحی اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا کہ یوسف علیہ السلام کی لاش کو مصر میں نہ چھوڑیں، اس کو اپنے ساتھ لے کر ملک شام چلے جائیں، اور ان کے آباء و اجداد کے پاس دفن کریں، اس حکم کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تفتیش کر کے ان کی قبر دریافت کی، جو ایک سنگ مرمر کے تابوت میں

تھی، اس کو اپنے ساتھ ارض کنعان فلسطین میں لے گئے، اور حضرت اسحاق اور یعقوب علیہما السلام کے برابر دفن کر دیا (منظری)

حضرت یوسف علیہ السلام کے بعد قوم عمالیق کے فراعنہ مصر پر مسلط ہو گئے اور بنو اسرائیل ان کی حکومت میں رہتے ہوئے دین یوسف علیہ السلام پر قائم رہے، مگر ان کو غیر ملکی سمجھ کر طرَح طرح کی ایذائیں دی جانے لگیں، یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس مذاہب نکال دیا (تفسیر منطہری)

مہر ایات اور احکام | آیات مذکورہ میں ایک مسئلہ قریہ معلوم ہوا کہ والدین کی تعظیم و تکریم واجب ہے جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے واقعہ سے ثابت ہوا۔

دوسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ یوسف علیہ السلام کی شریعت میں سجدہ تعظیمی جائز تھا، اسی لئے والدین اور بھائیوں نے سجدہ کیا، مگر شریعت مجتہدہ میں سجدہ کو خاص عبادت کی علامت قرار دیکر غیر اللہ کے لئے حرام قرار دیا گیا، قرآن مجید میں فرمایا لَا تَسْجُدْ لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ، اور حدیث میں ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ جب ملک شام گئے اور وہاں دیکھا کہ نصاریٰ اپنے بزرگوں کو سجدہ کرتے ہیں تو واپس آکر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سجدہ کرنے لگے، آپ نے منع فرمایا اور فرمایا کہ اگر میں کسی کو سجدہ کرنا جائز سمجھتا تو عورت کو کہتا کہ اپنے شوہر کو سجدہ کیا کرے، اسی طرح حضرت سلمان فارسیؓ نے آپ کو سجدہ کرنا چاہا تو آپ نے فرمایا لَا تَسْجُدْ لِي يَا سَلْمَانُ وَاسْجُدْ لِلْحَقِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ یعنی اے سلمان! مجھے سجدہ نہ کرو بلکہ سجدہ حق اس ذات کو کرو جو حی و قیوم ہے جس کو کبھی فنا نہیں (ابن کثیر)

اس سے معلوم ہوا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تعظیمی سجدہ جائز نہیں تو اور کسی بزرگ یا پیر کے لئے کیسے جائز ہو سکتا ہے۔

هَذَا أَتَاوَيْلُ رُغْبَايَ سَے معلوم ہوا کہ خواب کی تعبیر بعض اوقات زمانہ دراز کے بعد ظاہر ہوتی ہے، جیسے اس واقعہ میں چالیس یا انسی سال کے بعد ظہور ہوا را بن جریر و ابن کثیر) قَدْ أَحْسَنَ بَنِي سَے ثابت ہوا کہ جو شخص کسی مرض یا مصیبت میں مبتلا ہو پھر اس سے نجات ہو جائے تو سنت پیغمبری یہ ہے کہ نجات پر شکر ادا کرے، اور مرض و مصیبت کے ذکر کو بھول جائے۔

اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَاءُ سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ جس کام کا ارادہ فرماتے ہیں اس کی ایسی لطیف اور مخفی تدبیریں اور سامان کر دیتے ہیں کہ کسی کو اس کا وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا۔

تَوَفَّنِي مُسْلِمًا، میں یوسف علیہ السلام نے ایمان و اسلام پر موت کی دعا مانگی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ خاص حالات میں موت کی دعا کرنا ممنوع نہیں، اور احادیث صحیحہ میں جو موت کی تمنا کو منع فرمایا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ دنیا کی تکلیفوں سے گھبرا کر بے صبری سے موت مانگنے لگے، یہ درست نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی شخص کسی مصیبت کی وجہ سے موت کی تمنا نہ کرے، اگر کہنا ہی ہے تو یوں کہے کہ یا اللہ مجھے جب تک میرے لئے زندگی بہتر ہے اس وقت تک زندہ رکھ اور جب موت بہتر ہو تو مجھے موت دیدے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ

یہ خبریں ہیں غیب کی ہم بھیجتے ہیں تیرے پاس اور تو نہیں تھا ان کے پاس

اِذَا جَمَعُوا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَنْكُرُوْنَ ۝۱۳ وَمَا اَكْثَرُ النَّاسِ

جب وہ بٹھرانے لگے اپنا کام اور فریب کرنے لگے، اور اکثر لوگ نہیں ہیں

وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۴ وَمَا تَسْأَلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۙ

یقین کرنے والے اگرچہ تو کتا ہی چاہے، اور تو مانگتا نہیں ان سے اس پر کچھ بدلہ،

اِنَّ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِيْنَ ۝۱۵ وَكَآيِنٌ مِّنْ آيٰتِيْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ

یہ تو اور کچھ نہیں مگر سارے عالم کو، اور بہتری نشانیاں ہیں آسمان اور

الْاَرْضِ خٰنٍ يَّمُرُّنَ عَلَيْهِمْ اَوْ هُمْ اَعْرَاسٌ مُّضَوْنَ ۝۱۶ وَمَا

زمین میں جن پر گذر ہوتا رہتا ہے ان کا اور وہ ان پر دھیان نہیں کرتے، اور نہیں

يُؤْمِنُوْنَ ۚ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ شُرَكَآءُ كُوْنٌ ۝۱۷ اَفَاْمِنُوْا اَنْ

ایمان لاتے بہت لوگ اللہ پر مگر ساتھ ہی شریک بھی کرتے ہیں، کیا نہ رہ گئے اس کے

تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً

کہ آڑھانکے ان کو ایک آفت اللہ کے عذاب کی یا آپہنچے قیامت اچانک،

وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝۱۸ قُلْ هٰذِهِ سَبِيْلِيْ اَدْعُوْا اِلَى اللّٰهِ عَلٰٓ

اور ان کو خبر نہ ہو، کہہ دے یہ میری راہ ہے بلاتا ہوں اللہ کی طرف، سمجھ

بَصِيرَةً أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي ۖ وَسُبْحَانَ اللَّهِ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۱۰۸﴾

جو جگر میں اور جو میرے ساتھ ہے، اور اللہ پاک ہر اور میں نہیں شریک بنانے والوں میں

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُوْحِي إِلَيْهِمْ مِنْ أَهْلِ

اور جتنے بھیجے ہم نے تجھ سے پہلے وہ سب مرد ہی تھے کہ وحی بھیجتے تھے ہم ان کو بستیوں کے

الْقَرْيٰ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ

رہنے والے، سو کیا ان لوگوں نے نہیں سیر کی ملک کی کہ دیکھ لیتے کیسا ہوا

عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۖ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ

انجام ان لوگوں کا جو اُن سے پہلے تھے، اور آخرت کا گھر تو بہتر ہے

لِلَّذِينَ اتَّقَوْا أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۱۰۹﴾

پرہیز کرنے والوں کو، کیا اب بھی نہیں سمجھتے۔

خلاصہ تفسیر

یہ قصہ (جو اوپر بیان کیا گیا آپ کے اعتبار سے) غیب کی خبروں میں سے ہے (کیونکہ آپ کے پاس کوئی ظاہری ذریعہ اس کے جاننے کا نہیں تھا صرف) ہم (ہی) وحی کے ذریعہ سے آپ کو یہ قصہ بتلاتے ہیں اور (یہ ظاہر ہے کہ) آپ ان (برادرانِ یوسفؑ) کے پاس اُس وقت موجود نہ تھے جبکہ انھوں نے اپنا ارادہ (یوسف علیہ السلام کو کنوئیں میں ڈالنے کا) پختہ کر لیا تھا اور وہ اس کے متعلق تدبیریں کر رہے تھے (کہ آپ سے یوں کہیں کہ ان کو یوں لے جائیں، وغیرہ) ذلک، اور اس طرح یہ امر یقینی ہے کہ آپ نے کسی سے یہ قصہ سنا سنا یا بھی نہیں، پس یہ صاف دلیل ہے نبوت کی اور صاحبِ وحی ہونے کی (اور) باوجود نبوت پر دلائل قائم ہونے کے (اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے گو آپ کا کیسا ہی جی چاہتا ہو اور ان کے ایمان نہ لانے سے آپ کا تو کوئی نقصان ہی نہیں، کیونکہ آپ ان سے اس (قرآن) پر کچھ معاوضہ تو چاہتے نہیں (جس میں یہ احتمال ہو کہ اگر یہ قرآن کو قبول نہ کریں گے تو آپ کا معاوضہ فوت ہو جائے گا) یہ (قرآن) تو صرف تمام جہان والوں کے لئے ایک نصیحت ہو رہا نہ مانے گا اسی کا نقصان ہوگا اور جیسی یہ لوگ منکرِ نبوت ہیں اسی طرح باوجود دلائل منکرِ توحید بھی ہیں چنانچہ بہت سی نشانیاں ہیں

کہ توحید پر دلالت کرنے والی، آسمانوں میں (جیسا کہ اکب وغیرہ) اور زمین میں (جیسے عناصر و عنصریات) جن پر ان کا گزر ہوتا رہتا ہے (یعنی ان کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں) اور وہ ان کی طرف (ذرا) توجہ نہیں کرتے (یعنی ان استدلال نہیں کرتے) اور اکثر لوگ جو خدا کو مانتر ہیں تو اس طرح کہ شرک بھی کرتے جاتے ہیں (پس بدون توحید خدا کا ماننا مثل نماز کے ہے پس یہ لوگ اللہ کی تہمت بھی کفر کرتے ہیں اور نبوت کی تہمت بھی کفر کرتے ہیں) سو کیا اللہ در رسول کے منکر ہو کہ پھر بھی اس سے مطمئن ہو رہے ہیں کہ اپنے خدا کے عذاب کی کوئی ایسی آفت آپڑے جو انکو محیط ہو جائے، یا ان پر چنانکہ قیامت آجائے، اور ان کو (پہلے سے) خبر بھی نہ ہو (مطلب یہ ہے کہ مقتضائے کفر کا عقوبت ہے خواہ دنیا میں نازل ہو جائے یا قیامت کے دن واقع ہو رہے) ان کو ڈرنا اور کفر کو چھوڑ دینا چاہئے) آپ فرمادیتے کہ میں خدا کی طرف اس طور پر بلاتا ہوں کہ میں (توحید کی اور اپنے داعی من اللہ ہونے کی) دلیل پر قائم ہوں میں بھی اور میرے ساتھ والے بھی (یعنی میرے پاس بھی دلیل ہے توحید و رسالت کی اور میرے ساتھ والے بھی استدلال کے ساتھ مجھ پر ایمان لائے ہیں، میں بے دلیل بات کی طرف کسی کو نہیں بلاتا، دلیل سنو اور سمجھو، پس حاصل طریق یہ ہوا کہ خدا واحد ہے اور میں داعی ہوں) اور اللہ (شرک سے) پاک ہے اور میں (اس طریق کو قبول کرتا ہوں اور مشرکین میں سے نہیں ہوں اور یہ جو نبوت پر مشبہ کرتے ہیں کہ نبی فرشتہ ہونا چاہئے محض مہمل بات ہے کیونکہ) ہم نے آپ سے پہلے مختلف بستی والوں میں سے جتنے (رسول) بھیجے سب آدمی ہی تھے جن کے پاس ہم وحی بھیجتے تھے (کوئی بھی فرشتہ نہ تھا جنہوں نے ان کو نہ مانا، اور ایسے ہی مہمل شبہات کرتے رہے، ان کو سزائیں دی گئیں، اسی طرح ان کو بھی سزا ہوگی خواہ دنیا میں خواہ آخرت میں، اور یہ لوگ جو بے فکر ہیں) تو کیا یہ لوگ ملک میں (کہیں) چلے پھرے نہیں کہ (اپنی آنکھوں سے) دیکھ لیتے کہ ان لوگوں کا کیسا (دُبرا) انجام ہوا جو ان سے پہلے (کافر) ہو گزرے ہیں اور (یاد رکھو کہ جس دنیا کی محبت میں مریض ہو کر تم نے کفر اختیار کیا ہے یہ دنیا فانی اور سچ ہے) البتہ عالم آخرت ان لوگوں کے لئے نہایت بہبودی کی چیز ہے، جو (شرک وغیرہ سے) احتیاط رکھتے ہیں (اور توحید و اطاعت اختیار کرتے ہیں) تو کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے (کہ فانی اور بے حقیقت چیز اچھی ہو یا باقی اور پائدار) :

معارف و مسائل

ان آیات میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ پورا بیان فرمانے کے بعد پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے :

ذٰلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ، یعنی یہ قصہ غیب کی اُن خبروں میں سے ہے جو ہم نے بذریعہ وحی آپ کو بتلایا ہے، آپ برادرانِ یوسفؑ کے پاس موجود نہ تھے،

جبکہ وہ یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالنا طے کر چکے تھے اور اس کے لئے تدبیریں کر رہے تھے۔
اس اظہار کا مقصد یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کے اس قصہ کو پوری تفصیل کے ساتھ صحیح صحیح بیان کر دینا آپ کی نبوت اور وحی کی واضح دلیل ہے، کیونکہ یہ قصہ آپ کے زمانہ سے ہزاروں سال پہلے کا ہے، نہ آپ وہاں موجود تھے، نہ دیکھ کر بیان فرمادیا ہو اور نہ آپ نے کہیں کسی سے تعلیم حاصل کی، کہ کتب تاریخ دیکھ کر یا کسی سے سنا کر بیان فرمادیا ہو اس لئے بجز وحی الہی ہونے کے اور کوئی راستہ اس کے علم کا نہیں۔

قرآن کریم نے اس جگہ صرف اتنی بات پر اکتفا فرمایا ہے کہ آپ وہاں موجود نہ تھے کسی دوسرے شخص یا کتاب سے اس کا علم حاصل نہ ہونے کا ذکر اس لئے ضروری نہیں سمجھا کہ پورا عرب جانتا تھا، کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم امی ہیں، آپ نے کسی سے لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا اور یہ بھی سب کو معلوم تھا کہ آپ کی پوری عمر مکہ معظمہ میں گزری ہے، ملک شام کا ایک سفر تو اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ کیا تھا، جس میں راستے ہی سے واپس تشریف لے آئے، دوسرا سفر تجارت کے لئے کیا، چند ایام میں کام کر کے واپس تشریف لے آئے، اس سفر میں بھی کسی عالم سے ملاقات یا کسی علمی ادارے سے تعلق کا کوئی شائبہ نہیں تھا، اس لئے اس جگہ اس کے ذکر کرنے کی ضرورت نہ سمجھی گئی، اور قرآن کریم میں دوسری جگہ اس کا بھی ذکر فرمادیا ہے مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا أَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هَذَا، یعنی نزول قرآن سے پہلے ان واقعات کو نہ آپ جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم۔

امام بغویؒ نے فرمایا کہ یہود اور قریش نے مل کر آزمائش کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا تھا کہ اگر آپ اپنے دعوائے نبوت میں سچے ہیں تو یوسف علیہ السلام کا واقعہ بتلائیے کہ کیا اور کس طرح ہوا، جب آپ نے بوحی الہی یہ سب بتلادیا اور وہ پھر بھی اپنے کفر و انکار پر جے رہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صدمہ پہونچا، اس پر اگلی آیت میں فرمایا گیا کہ آپ کی نبوت و رسالت کے دلائل واضح ہونے کے باوجود بہت سے لوگ ایمان لانے والے نہیں آپ کتنی ہی کوشش کریں، مطلب یہ ہے کہ آپ کا کام تبلیغ اور اصلاح کی کوشش ہے اس کا کامیاب بنانا نہ آپ کے اختیار میں ہے نہ آپ کے ذمہ ہے، نہ آپ کو اس کا کوئی بیج ہونا چاہئے اس کے بعد فرمایا:

وَمَا تَسْأَلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ هُوَ إِلَّا فِي كَسْرِ لَعَلَّيْنِ، یعنی آپ جو کچھ ان کو تبلیغ کرنے اور صحیح راستے پر لانے کے لئے کوشش کرتے ہیں اس پر ان لوگوں سے کوئی معاوضہ تو نہیں مانگتے، جس کی وجہ سے انکو اس کے سننے یا ماننے میں کوئی دشواری ہو، بلکہ آپ کا کلام تو خالص خیر خواہی

اور نصیحت ہر تمام جہان والوں کے لئے، اس میں اس طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے کہ جب اس کو شش
سے آپ کا مقصد کوئی دنیوی منفعت نہیں، بلکہ ثوابِ آخرت اور قوم کی خیر خواہی ہو تو وہ مقصد آپ کا
حاصل ہو چکا پھر آپ کیوں غمگین ہوتے ہیں۔

وَكَايَتٌ مِّنَ آيَاتِ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لِيُذَكِّرَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ
”یعنی یہ لوگ صرف یہی نہیں کہ کسی ناصح کی نصیحت خدا اور ہٹ دھرمی سے نہیں سنتے بلکہ ان کا تو
حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی جو کھلی کھلی نشانیاں آسمان و زمین میں ہر وقت سامنے
رہتی ہیں ان پر بھی یہ غفلت و اعراض سے گزرے چلے جاتے ہیں، ذرا دھیان نہیں دیتے کہ کس کی
قدرت و عظمت کی نشانیاں ہیں، آسمان و زمین میں حق تعالیٰ شانہ کی خدائی و حکمت و قدرت کی
نشانیاں بے شمار ہیں، ان میں سے یہ بھی ہے کہ پھیلی قوموں پر جو عذاب آئے اور ان کی اُلٹی ہوئی یا
برباد کی ہوئی بستیاں ان کی نظروں سے گزرتی ہیں، مگر اُن سے بھی کوئی عبرت نہیں پکڑتے۔
یہ بیان تو ایسے لوگوں کا تھا جو خدا تعالیٰ کے وجود اور اس کی حکمت و قدرت ہی کے
قائل نہیں تھے، آگے ان کا بیان ہے جو وجود باری تعالیٰ کے تو قائل ہیں، مگر اس کی خدائی میں
دوسری چیزوں کو شریک قرار دیتے ہیں، فرمایا:

وَمَا يُوَفِّىٰ مِنْ اَكْثَرِهِمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُونَ، یعنی ان میں جو لوگ اللہ تعالیٰ
پر ایمان بھی لاتے ہیں تو وہ بھی شرک کے ساتھ، یعنی اللہ تعالیٰ کے علم و قدرت وغیرہ اوصاف میں
دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں، جو سراسر ظلم اور جہل ہے۔

ابن کثیر نے فرمایا کہ اس آیت کے مفہوم میں وہ مسلمان بھی داخل ہیں جو ایمان کے باوجود
مختلف قسم کے شرک میں مبتلا ہیں، مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ
مجھے تم پر جس چیز کا خطرہ ہے ان میں سب سے زیادہ خطرناک شرک صغریٰ ہے، صحابہ کے دریافت کرنے
پر فرمایا کہ ریا، شرک صغریٰ ہے، اسی طرح ایک حدیث میں غیر اللہ کی قسم کھانے کو شرک فرمایا،
راہن کثیر عن احمد بن حنبل، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کے نام کی نعت اور نیاز ماننا بھی باتفاق
فقہاء اس میں داخل ہے۔

اس کے بعد ان کی غفلت و جہالت پر اظہارِ افسوس و تعجب ہے، کہ یہ لوگ اپنے انکار و کفر
کے باوجود اس بات سے کیسے بے فکر ہو گئے کہ اُن پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی حادثہ عذاب کا
آپڑے، یا دفعۃً اُن پر قیامت آجائے اور وہ اس کے لئے تیار نہ ہوں۔

قُلْ هٰذِهِ سَبِيْلِيْ اَدْعُوْا اِلَى اللّٰهِ عَلَىٰ بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ
وَمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ، ”یعنی آپ ان لوگوں سے کہہ دیں کہ (تم مانو یا نہ مانو) میرا تو یہی

طریقہ اور مسلک ہو کہ لوگوں کو بصیرت اور یقین کے ساتھ اللہ کی طرف دعوت دیتا رہوں، میں بھی اور وہ لوگ بھی جو میرا اتباع کرنے والے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ میری یہ دعوت کسی سرسری نظر پر مبنی نہیں بلکہ پوری بصیرت اور عقل و حکمت کا ثمرہ ہے، اس دعوت و بصیرت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متبعین اور پیروؤں کو بھی شامل فرمایا ہے، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں جو علوم رسالت کے خزانے اور خداوند سبحانہ و تعالیٰ کے سپاہی ہیں، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اس تمام امت کے بہترین افراد ہیں جن کے قلوب پاک اور علم گہرا ہے، تکلف کا ان میں نام نہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے رسول کی صحبت و خدمت کے لئے منتخب فرمایا ہے، تم انہی کے اخلاق و عادات اور طریقوں کو سیکھو، کیونکہ وہی سیدھے راستہ پر ہیں۔

اور یہ بھی محسوس ہو سکتے ہیں کہ مَنِ اتَّبَعَنِي عام ہو ہر اس شخص کے لئے جو قیامت تک دعوت رسول کو امت تک پہنچانے کی خدمت میں مشغول ہو، کبھی اور ابن زید نے فرمایا کہ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا دعویٰ کرے اس پر لازم ہو کہ آپ کی دعوت کو لوگوں میں پھیلائے، اور قرآن کی تعلیم کو عام کرے (مظہری)

سَبَّحَنَ اللّٰهُ وَمَا آتَانَا مِنَ الْمَشْرِكَیْنِ، یعنی شرک سے پاک ہے اللہ اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں، اور چونکہ یہ ذکر آیا تھا کہ اکثر لوگ جب اللہ پر ایمان بھی لاتے ہیں تو اس کے ساتھ شرک جلی یا خفی ملا دیتے ہیں، اس لئے شرک سے اپنی بالکل برائت کا اعلان فرمایا، خلاصہ یہ ہے کہ میری دعوت کا یہ مطلب نہیں کہ میں لوگوں کو اپنا بندہ بناؤں، بلکہ میں خود بھی اللہ کا بندہ ہوں اور لوگوں کو بھی اسی کی بندگی کی طرف دعوت دیتا ہوں، البتہ بحیثیت اعلیٰ مجھ پر ایمان لانا فرض ہے۔

اس پر جو مشرکین مکہ یہ شبہ پیش کیا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا رسول اور قاصد تو انسان نہیں بلکہ فرشتہ ہونا چاہئے، اس کا جواب اگلی آیت میں اس طرح فرمایا:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْ اِلَيْهِمْ مِنْ اٰهْلِ الْقُرْاٰی، یعنی

ان کا یہ خیال بے بنیاد اور لغو ہے کہ اللہ کا رسول اور پیغمبر فرشتہ ہونا چاہئے انسان نہیں ہو سکتا بلکہ معاملہ برعکس ہو، کہ انسانوں کے لئے اللہ کا رسول ہمیشہ انسان ہی ہوتا چلا آیا ہے، البتہ عام انسانوں سے اس کو یہ امتیاز حاصل ہوتا ہے کہ اس کی طرف براہ راست حق تعالیٰ کی وحی اور پیغام آتا ہے، اور وہ کسی کی سعی و عمل کا نتیجہ نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ خود ہی اپنے بندوں میں سے جس کو

مناسب سمجھتے ہیں اس کام کے لئے انتخاب فرمالتے ہیں، اور یہ انتخاب ایسی خاص صفات کمال کی بنا پر ہوتا ہے جو عام انسانوں میں نہیں ہوتیں۔

آگے ان لوگوں کو تنبیہ ہے جو اللہ کی طرف داعی اور رسول کی ہدایات کی خلاف ورزی کر کے عذاب الہی کو دعوت دیتے ہیں، فرمایا:

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَ لَئِنْ أَرَأَوْا خَيْرًا مِّنَ الَّذِينَ اتَّقَوْا أَفَلَا تَعْقِلُونَ، یعنی کیا یہ لوگ زمین میں چلتے پھرتے نہیں کہ ان کو پچھلی قوموں کے حالات کا مشاہدہ ہو کہ رسولوں کے انکار نے ان کو کس انجام بد میں مبتلا کیا، مگر یہ لوگ دنیا کی ظاہری زینت و راحت میں مست ہو کر آخرت کو بھلا بیٹھے ہیں، حالانکہ پرہیزگاروں کے لئے آخرت اس دنیا سے کہیں زیادہ بہتر ہے، کیا ان لوگوں کو اتنی بھی عقل نہیں کہ دنیا کی چند روزہ راحت کو آخرت کی دائمی اور مکمل نعمتوں اور راحتوں پر ترجیح دیتے ہیں۔

احکام و ہدایات

ذَٰلِكَ مِّنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ يَه سب کچھ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم آپ کو وحی کے ذریعہ بتلاتے ہیں، یہی مضمون تقریباً انہی الفاظ کے ساتھ سورۃ آل عمران آیت ۴۴ میں حضرت مریم کے قصہ میں آیا ہے، ذَٰلِكَ مِّنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ، اور سورۃ ہود کی آیت نمبر ۴۹ میں نوح علیہ السلام کے واقعہ سے متعلق آیا ہے، تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ۔

ان آیتوں سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ حق تعالیٰ اپنے انبیاء علیہم السلام کو بہت سی غیب کی خبروں پر بذریعہ وحی مطلع کر دیتے ہیں، خصوصاً ہمارے رسول سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کو ان غیب کی خبروں کا خاص حصہ عطا فرمایا ہے جو تمام انبیاء سابقین سے زیادہ ہے، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو قیامت تک ہونے والے بہت سے واقعات کا تفصیل یا اجمال سے پتہ دیا ہے، کتب حدیث میں کتاب الفتن کی تمام حدیثیں اس سے بھری ہوئی ہیں۔

عوام الناس چونکہ علم غیب صرف اسی کو جانتے ہیں کہ کوئی شخص غیب کی خبروں سے کسی طرح واقف ہو جائے، اور یہ وصف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں بدرجہ اتم موجود ہے، اس لئے خیال کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب تھے، مگر قرآن کریم نے منافقوں میں اعلان فرمایا ہرگز لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ

عالم الغیب سوائے خداے تعالیٰ کے اور کوئی نہیں ہو سکتا، علم غیب اللہ جل شانہ کی صفت خاصہ ہے اس میں کسی رسول یا فرشتہ کو شریک سمجھنا ان کو اللہ کی برابر بنانے کے مرادف اور عیسائیوں کا عمل ہی جو رسول کو خدا کا بیٹا اور خدائی کا شریک قرار دیتے ہیں، قرآن کریم کی مذکورہ آیتوں سے معاملہ کی پوری حقیقت واضح ہو گئی، کہ علم غیب تو صرف اللہ تعالیٰ کی صفت خاصہ ہے، اور علم الغیب صرف اللہ جل شانہ ہی ہیں، البتہ غیب کی بہت سی خبریں اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو بذریعہ وحی بتلا دیتے ہیں، یہ قرآن کریم کی اصطلاح میں علم غیب نہیں کہلاتا، اور عوام چونکہ اس باریک فرق کو نہیں سمجھتے تو غیب کی خبروں ہی کو علم غیب کہہ دیتے ہیں اور جب قرآنی اصطلاح کے مطابق غیر اللہ سے علم غیب کی نفی کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے اختلاف کرنے لگتے ہیں، جس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ

اختلاف خلق از نام اوستاد چوں معنی رفت آرام اوستاد

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُوْهِیَ إِلَیْهِمْ مِّنْ أَهْلِ الْقُرَیْ، اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے رسولوں کے متعلق لفظ رِجَال سے معلوم ہوا کہ رسول ہمیشہ مرد ہی ہوتے ہیں، عورت نبی یا رسول نہیں ہو سکتی۔

امام ابن کثیر نے جمہور علماء کا یہی قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی عورت کو نبی یا رسول نہیں بنایا، بعض علماء نے چند عورتوں کے متعلق نبی ہونے کا اقرار کیا ہے، مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بی بی سارہ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اور حضرت مریم ام عیسیٰ علیہا السلام، کیونکہ ان تینوں خواتین کے بارے میں قرآن کریم میں ایسے الفاظ موجود ہیں جن سے سمجھا جاتا ہے کہ بحکم خداوندی فرشتوں نے ان سے کلام کیا، اور بشارت سنائی یا خود ان کو وحی الہی سے کوئی بات معلوم ہوئی، مگر جمہور علماء کے نزدیک ان آیتوں سے ان تینوں خواتین کی بزرگی اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کا بڑا درجہ ہوتا تو ثابت ہوتا ہے مگر وہ فرماتے ہیں کہ صرف یہ الفاظ ان کی نبوت و رسالت کے ثبوت کے لئے کافی نہیں۔

اور اسی آیت میں لفظ اَهْلِ الْقُرَیْ سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول عموماً شہروں اور قصبوں کے رہنے والوں میں بھیجتے ہیں، دیہات اور جنگل کے باشندوں میں سے رسول نہیں ہوتے، کیونکہ عموماً دیہات اور جنگل کے باشندے سخت مزاج اور عقل و فہم میں کامل نہیں ہوتے (ابن کثیر و مترطبی وغیرہ)۔

حَتَّىٰ إِذَا اسْتَيْسَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْا أَنَّهُمْ قَدْ كُنَ بَوَاجِءَ هُمْ

یہاں تک کہ جب نامید ہونے لگے رسول اور خیال کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تھا پہنچی ان کو

نَصْرُنَا فَنُجِّیْ مَنْ نَّشَاءُ وَلَا یُرَدُّ بِأَسْنَانٍ لِّقَوْمٍ الْمَجْرُمِیْنَ ۝۱۱۱

ہماری مدد پھر بچا دیا جن کو ہم نے چاہا اور پھر تا نہیں عذاب ہمارا قوم گنہگار سے

لَعَدَّ كَانَ فِیْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولِی الْأَلْبَابِ مَا كَانَ حَدِیْثًا

البتہ ان کے احوال سے اپنا حال قیاس کرنا ہے عقل والوں کو، کچھ بنائی ہوئی بات

یُفْتَرٰی وَلٰكِنْ تَصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَتَفْصِیْلُ كُلِّ

نہیں لیکن موافق ہے اس کلام کے جو اس سے پہلے ہے اور بیان ہر چیز

شَیْءٍ وَهَدٰی وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۝۱۱۲

کا اور ہدایت اور رحمت ان لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

(اگر تم کو کفار پر تاخیر عذاب سے شبہ عدم وقوع کا ہوتا ہو تو تمہاری غلطی ہے، اس لئے

کہ پہلی امتوں کے کفار کو بھی بڑی بڑی مہلتیں دی گئی تھیں) یہاں تک کہ مدت مہلت دراز

ہونے کی وجہ سے (پیغمبر اس بات سے) مایوس ہو گئے کہ ہم نے اللہ کی طرف سے کفار پر عذاب

آنے کے وعدہ کا جو وقت اپنے قیاس اور انداز سے مقرر کر لیا تھا اس وقت میں کفار پر عذاب آکر ہمارا

غلبہ اور حقانیت واضح ہو جائے گی) اور ان (پیغمبروں) کو گمان غالب ہو گیا کہ (وعدہ الہیہ کا وقت

مقرر کرنے میں) ہمارے فہم نے غلطی کی (کہ بلا تنصیص محض قرآن یا نصرت الہیہ کے جلد آنے کی خواہش

سے قریب کا وقت متین کر لیا، حالانکہ وعدہ مطلق ہے ایسی مایوسی کی حالت میں) ان کو ہماری مدد

پہنچی (وہ مدد یہ کہ کفار پر عذاب آیا) پھر (اُس عذاب سے) ہم نے جس کو چاہا وہ بچا لیا گیا،

(مراد اس سے مؤمنین ہیں) اور (اس عذاب میں کفار ہلاک کئے گئے، کیونکہ) ہمارا عذاب مجرم لوگوں

سے نہیں ہٹتا، (بلکہ اُن پر ضرور واقع ہوتا ہے، گو بدیر سہی، پس یہ کفار مکہ بھی اس دھوکہ میں رہیں،

ان (انبیاء و ائمہ سابقین) کے قصہ میں سمجھدار لوگوں کے لئے (بڑی) عبرت ہو (جو اس سے عبرت حاصل کرتے ہیں

کہ اطاعت کا یہ انجام ہو اور محسنت کا یہ انجام ہو) یہ قرآن (جس میں یہ قصے ہیں) کوئی تراشی ہوئی بات تو نہیں

(کہ اس سے عبرت نہ ہوتی) بلکہ اس سے پہلے جو آسمانی کتابیں نازل ہو چکی ہیں یہ اُن کی تصدیق کرنیوالا ہوا اور

ہر ضروری بات کی تفصیل کرنے والا ہے اور ایمان والوں کے لئے ذریعہ ہدایت و رحمت ہے (اسی کتاب میں جو مضامین عبرت کے ہوں گے ان سے تو عبرت حاصل کرنا لازم ہی ہے) :

معارف و مسائل

پچھلی آیتوں میں انبیاء علیہم السلام کے بھیجنے اور دعوت حق دینے کا ذکر اور انبیاء کے متعلق کچھ شبہات کا جواب دیا گیا تھا، آیات مذکورہ میں سے پہلی آیت میں اس پر تنبیہ ہو کہ یہ لوگ انبیاء کی مخالفت کے انجام بد پر نظر نہیں کرتے، اگر یہ ذرا بھی غور کریں اور اپنے گرد و پیش کے شہروں اور مقامات کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کرنے والوں کا انجام بد اس دنیا میں بھی کس قدر سخت ہوا ہے، قوم لوط علیہ السلام کی بستی الٹ دی گئی، قوم عاد و ثمود کو طح طح کے عذابوں سے نیست و نابود کر دیا گیا، اور آخرت کا عذاب اس سے زیادہ سخت ہے۔

دوسری آیت میں ہدایت کی گئی کہ دنیا کی تکلیف و راحت تو بہر حال چند روزہ ہے، اصل فکر آخرت کی ہونی چاہئے، جہاں کا قیام دائمی اور رنج یا راحت بھی دائمی ہو اور فرمادیا کہ آخرت کی درستی تقویٰ پر موقوف ہے، جس کے معنی تمام احکام شرعیہ کی پابندی کرنا ہیں۔

اس آیت میں پچھلے رسولوں اور ان کی امتوں کے حالات سے موجودہ لوگوں کو متنبہ کرنا تھا اس لئے اگلی آیت میں ان کے ایک شبہ کو دور کیا گیا، وہ یہ کہ اکثر لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عذاب الہی سے ڈرانے کا ذکر عرصہ سے سن رہے تھے اور کوئی عذاب آتا نظر نہیں آتا تھا، اس سے ان کی ہمتیں بڑھ رہی تھیں کہ کوئی عذاب آتا ہوتا تو اب تک آچکا ہوتا، اس لئے فرمایا کہ اللہ جل شانہ اپنی رحمت اور حکمت بالغہ سے بسا اوقات مجرم قوموں کو مہلت دیتے رہتے ہیں اور یہ مہلت بعض اوقات بڑی طویل بھی ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے سرکشوں کی جرأت بڑھ جاتی ہے، اور پیغمبروں کو ایک گونہ پریشانی پیش آتی ہے، ارشاد فرمایا:-

حَتَّىٰ إِذَا اسْتَيْسَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْا أَنَّهُمْ قَدْ كُنُوْا إِجْمَاعًا فَلَمْ نُنْصِرْهُمْ فَنَبَّحْنَاهُمْ مِّنْ نَّشَاءٍ وَلَا يُرِيْدُوْنَ بِأَسْمَاعِنَ الْقَوْمِ الْمَذْجِرِ مِثْلَ ۚ "یعنی پچھلی امتوں کے نافرمانوں کو بڑی بڑی ہمتیں دی گئیں، یہاں تک کہ مدت دراز تک ان پر عذاب نہ آنے سے پیغمبر یہ خیال کر کے مایوس ہو گئے کہ اللہ تعالیٰ کے اجمالی وعدہ عذاب کا جو وقت ہم نے اپنے انداز سے اپنے ذہنوں میں مقرر کر رکھا تھا اس وقت میں کفار پر عذاب نہ آئے گا اور حق کا غلبہ ظاہر نہ ہوگا، اور اُن پیغمبروں کو گمان غالب ہو گیا کہ وعدہ الہیہ کا اپنے اندازہ سے وقت مقرر کرنے میں ہماری فہم نے غلطی کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو کوئی معین وقت بتلایا نہیں تھا، ہم نے مخصوص قرآن سے ایک مدت

متعین کر لی تھی، اسی مایوسی کی حالت میں ان کو ہماری مدد پہنچی، وہ یہ کہ وعدے کے مطابق کفار پر عذاب آیا، پھر اس عذاب سے ہم نے جس کو چاہا اس کو بچا لیا گیا، مراد اس سے یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے ماننے والے مؤمنین کو بچا لیا گیا، اور کفار ہلاک ہو گئے، کیونکہ ہمارا عذاب مجرم لوگوں سے نہیں ہٹتا، بلکہ ضرور آکر رہتا ہے، اس لئے کفار مکہ کو چاہئے کہ عذاب میں دیر ہونے سے دھوکہ میں رہیں۔ اس آیت میں لفظ **کُنْ بُؤَا** مشہور قرات کے مطابق پڑھا گیا ہے، اور اس کی جو تفسیر ہم نے اختیار کی ہے وہ سب زیادہ اسلم اور بے غبار ہے، کہ لفظ **کُنْ بُؤَا** کا حاصل اپنے تخمینہ اور خیال کا غلط ہونا ہے، جو ایک قسم کی اجتہادی غلطی ہے، اور انبیاء علیہم السلام سے کوئی ایسی اجتہادی غلطی ہو سکتی ہے، البتہ انبیاء اور دوسرے مجتہدین میں یہ فرق ہے کہ انبیاء علیہم السلام جب کوئی اجتہادی غلطی ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان کو اس غلطی پر قائم نہیں رہنے دیتے، بلکہ ان کو بانہر کر کے حقیقت کھول دیتے ہیں، دوسرے مجتہدین کا یہ مقام نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا واقعہ صلہ حدیبیہ اس مضمون کے لئے کافی شاہد ہے، کیونکہ قرآن کریم میں مذکور ہے کہ اس واقعہ کی بنیاد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ خواب ہے، آپ نے دیکھا کہ آپ مع صحابہ کے بیت اللہ کا طواف کر رہے ہیں، اور انبیاء علیہم السلام کا خواب بھی حکیم وحی ہوتا ہے، اس لئے اس واقعہ کا ہونا یقینی ہو گیا، مگر خواب میں اس کا کوئی خاص وقت اور مدت نہیں بتلائی گئی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اندازہ سے خیال فرمایا کہ اسی سال ایسا ہو گا، اس لئے صحابہ کرام میں اعلان کر کے ان کی خاصی تعداد کو ساتھ لے کر عمرہ کے لئے مکہ معظمہ کو روانہ ہو گئے، مگر قریش مکہ نے مزاحمت کی اور اس وقت طواف و عمرہ کی نوبت نہ آئی، بلکہ اس کا مکمل ٹھور دو سال بعد شہرہ بدری میں نجات مکہ کی صورت سے ہوا، اور اس واقعہ سے معلوم ہو گیا کہ جو خواب آپ نے دیکھا تھا وہ حق و یقینی تھا، مگر اس کا وقت جو قرآن یا اندازہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمایا تھا اس میں غلطی ہوئی مگر اس غلطی کا ازالہ اسی وقت ہو گیا۔

اسی طرح آیت مذکورہ میں **قَدْ کُنْ بُؤَا** کا بھی یہی مفہوم ہے کہ کفار پر عذاب آنے میں دیر ہوئی، اور جو وقت اندازہ سے انبیاء نے اپنے ذہن میں متعین کیا تھا اس وقت عذاب نہ آیا تو ان کو یہ گمان ہوا کہ ہم نے وقت متعین کرنے میں غلطی کی ہے، یہ تفسیر حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے منقول ہوئی اور علامہ طبری نے کہا کہ یہ روایت صحیح ہے، کیونکہ صحیح بخاری میں ذکر کی گئی ہے (مظہری)

اور بعض قراءتوں میں یہ لفظ **ذَال** کی تشدید کے ساتھ **قَدْ کُنْ بُؤَا** بھی آیا ہے، جو مصدر تکذیب سے مشتق ہے، اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ انبیاء نے جو اندازہ سے وقت عذاب مقرر کر دیا تھا اس وقت پر عذاب نہ آنے سے ان کو یہ خطہ ہو گیا کہ اب جو مسلمان ہیں وہ بھی ہماری

تکذیب نہ کرنے لگیں، کہ جو کچھ ہم نے کہا تھا وہ پورا نہیں ہوا، ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا، منکروں پر عذاب آپڑا اور مومنین کو اس سے نجات ملی، اس طرح ان کا غلبہ ظاہر ہو گیا۔
لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ”یعنی ان حضرات کے قصوں میں عقل والوں کے لئے بڑی عبرت ہے“

اس سے مراد تمام انبیاء علیہم السلام کے قصے جو قرآن میں مذکور ہیں وہ بھی ہو سکتے ہیں اور خاص حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ جو اس سورۃ میں بیان ہوا ہے وہ بھی، کیونکہ اس واقعہ میں یہ بات پوری طرح روشن ہو کر سامنے آگئی کہ اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار بندوں کی کس کس طرح سے تائید نصرت ہوتی ہے، کہ کنویں سے نکال کر ایک تخت سلطنت پر اور بدنامی سے نکال کر نیک نامی کی انتہا پر پہنچا دیئے جاتے ہیں، اور مکر و فریب کرنے والوں کا انجام ذلت و رسوائی ہوتا ہے۔

مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَٰكِن تَصَدِّقُ الْكِنَانِ ”یعنی نہیں ہے یہ قصہ کوئی گھڑی ہوئی بات، بلکہ تصدیق ہے ان کتابوں کی جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہیں، کیونکہ تورات و انجیل میں بھی یہ قصہ یوسف علیہ السلام کا مذکور ہے، اور حضرت وہاب بن منبہ فرماتے ہیں کہ جتنی آسمانی کتابیں اور صحیفے نازل ہوئے ہیں یوسف علیہ السلام کے قصے کوئی خالی نہیں (منظر) وَتَفْصِيلُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُذَكِّرُونَ ”یعنی یہ قرآن تفصیل ہے ہر چیز کی، مراد یہ ہے کہ قرآن کریم میں ہر اس چیز کی تفصیل موجود ہے جس کی دین میں انسان کو ضرورت ہے، عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت، حکومت، سیاست وغیرہ انسانی زندگی کے ہر انفرادی یا اجتماعی حال سے متعلق احکام و ہدایات اس میں موجود ہیں، اور فرمایا کہ یہ قرآن ہدایت اور رحمت ہر ایمان لانے والوں کے لئے، اس میں ایمان لانے والوں کی تنصیح اس لئے کی گئی کہ اس کا نفع ایمان والوں ہی کو پہنچ سکتا ہے، کافروں کے لئے بھی اگرچہ قرآن رحمت اور ہدایت ہی ہے مگر ان کی اپنی بدعتی اور نافرمانی کے سبب یہ رحمت و ہدایت ان کے لئے وبال بن گئی۔

شیخ ابو منصور نے فرمایا کہ پوری سورۃ یوسف اور اس میں درج شدہ قصہ یوسف کے بیان سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا مقصود ہے کہ آپ کو جو کچھ ایذا میں اپنی قوم کے ہاتھوں پہنچ رہی ہیں پچھلے انبیاء کو بھی پہنچی ہیں، مگر انجیلا کا اللہ تعالیٰ اپنی پیروی کو غالب فرمایا آپ کا معاملہ بھی ایسا ہی ہونے والا ہے۔

سورۃ یوسف تمام شد

سُورَةُ الرَّعْدِ

سُورَةُ الرَّعْدِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ ثَلَاثٌ وَأَرْبَعُونَ آيَةً وَسِتِّينَ رُكُوعًا

سورۃ رعد مکہ میں نازل ہوئی اور اس میں تینتالیس آیتیں اور چھ رکوع ہیں

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بحد مہربان نہایت رحم والا ہے

الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكَ مِنَ السَّمَاءِ

یہ آیتیں ہیں کتاب کی اور جو کچھ اُترا تجھ پر تیرے رب سے

الْحَقِّ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ①

سو حق ہو لیکن بہت لوگ نہیں مانتے ، اللہ وہ ہے جس نے اوپر

السَّمَاوَاتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرْوَاهُنَّ غُلَسًا مُسْتَوًى عَلَى الْعَرْشِ فَتَشْهَرُ

بنائے آسمان بغیر ستون دیکھتے ہو تم ان کو پھر قائم ہوا عرش پر اور کام میں لگا دیا

الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى يُدِيرُ الْأَمْرَ

سورج اور چاند کو ، ہر ایک چلتا ہے وقت مقرر پر تدبیر کرتا ہے کام کی

يُفَصِّلُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ بَلِقَاءَ رَبِّكُمْ تُوقِنُونَ ② وَهُوَ الَّذِي

ظاہر کرتا ہے نشانیاں کہ شاید تم اپنے رب سے ملنے کا یقین کرو ، اور وہی ہے جس نے

مَدَّ الْأَرْضَ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْهَارًا وَمِنْ كُلِّ

پھیلائی زمین اور رکھے اس میں بوجھ اور ندیاں اور ہر

الشَّمَرَاتِ جَعَلَ فِرَّازًا وَجِيْنًا اِثْنَيْنِ يُغْشَى اللَّيْلُ النَّهَارُ اِنْ

میرے کے رکے اس میں جوڑے دو دو قسم، ڈھانکتا ہو دن پر رات کو اس میں

فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۳ وَفِي الْاَرْضِ قِطْعٌ

نشانیاں ہیں اُن کے واسطے جو کہ دھیان کرتے ہیں، اور زمین میں کھیت ہیں مختلف

مَتَجَوَزَتْ مِّنْ اَعْنَابٍ وَزُرْعٍ وَنَخِيْلٍ صِنَوَانٌ وَغَيْرُ

ایک دوسرے سے متصل اور باغ ہیں انگور کے اور کھیتیاں اور کھجوریں ہیں ایک کی جڑ دوسری سے ملی

صِنَوَانٌ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ تَرْتَفِعُ بِغُضْبٍ مِّنْ بَعْضِهَا عَلٰى بَعْضٍ

ہوتی اور بعض بن ملی اُن کو پانی بھی ایک ہی دیا جاتا ہے، اور ہم ہیں کہ بڑھا دیتی ہیں ان میں سے ایک کو ایک سے

فِي الْاَكْلِ اِنْ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُوْنَ ۝۴

میروں میں ان چیزوں میں نشانیاں ہیں ان کو جو غور کرتے ہیں ۔

خلاصہ تفسیر

الشمَرَاتِ، (اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ (جو آپ سن رہی ہیں) آیتیں ہیں ایک

بڑی کتاب (یعنی قرآن) کی، اور جو کچھ آپ پر آپ کے رب کی طرف سے نازل کیا جاتا ہے یہ بالکل
سچ ہے اور (اس کا مقتضایہ تھا کہ سب ایمان لاتے) لیکن بہت سے آدمی ایمان نہیں لاتے،

(رُبطاً، اور حقیقت قرآن کا مضمون تھا، آگے توحید کا مضمون ہے جو کہ اعظم مقاصد قرآن سے
ہے) اللہ ایسا (قادر) ہے کہ اس نے آسمانوں کو بدون ستون کے اوجھا کھڑا کر دیا چنانچہ قرآن

(آسمانوں) کو (اسی طرح) دیکھ رہے ہو پھر عرش پر (جو مشابہ ہے تخت سلطنت کے اس طرح)
قائم (اور جلوہ فرما) ہوا (جو کہ اس کی شان کے لائق ہے) اور آفتاب و ماہتاب کو کام میں

لگا دیا (ان دونوں میں سے) ہر ایک (اپنے مدار پر) ایک وقت معین میں چلتا رہتا ہے (چنانچہ
سورج اپنے مدار کو سال بھر میں قطع کر لیتا ہے اور چاند مہینہ بھر میں) وہی (اللہ) ہر کام کی

(جو کچھ عالم میں واقع ہوتا ہے) تدبیر کرتا ہے (اور) دلائل (سموینیہ و تشریعیہ) کو صاف صاف
بیان کرتا ہے، تاکہ تم اپنے رب کے پاس جانے کا (یعنی قیامت کا) یقین کر لو (اس کے امکان کا

تو اس طرح کہ جب اللہ تعالیٰ ایسی عظیم چیزوں کی تخلیق پر قادر ہو تو مردوں کو زندہ کرنے پر کیوں
نہیں قادر ہوگا، اور اس کے وقوع کا یقین اس طرح کہ مخبر صادق نے ایک امر ممکن کے وقوع

کی خبر دی، لامحالہ وہ سچی اور صحیح ہے) اور وہ ایسا ہے کہ اس نے زمین کو پھیلا دیا اور اس (زمین) میں پہاڑ اور نہریں پیدا کیں اور اس میں ہر قسم کے پھلوں سے دو دو قسم کے پیدا کئے (مثلاً کھٹے اور میٹھے یا چھوٹے اور بڑے، کوئی کسی رنگ کا اور کوئی کسی رنگ کا اور) شب (کی تاریکی) سے دن (کی روشنی) کو چھپا دیتا ہے (یعنی شب کی تاریکی سے دن کی روشنی پوشیدہ اور زائل ہو جاتی ہے) ان امور (مذکورہ) میں سوچنے والوں کے (سمجھنے کے) واسطے (توحید پر) دلائل (موجود) ہیں (جس کی تقریر بارہ دوم کے رکوع چہارم کے شروع میں گزری ہے) اور (اسی طرح اور بھی دلائل ہیں توحید کے چنانچہ) زمین میں پاس پاس (اور پھر) مختلف قطعات ہیں (جن کا باوجود متصل ہونے کے مختلف الاثر ہونا عجیب بات ہے) اور انگوروں کے باغ ہیں اور (مختلف) کھیتیاں ہیں اور کھجور (کے درخت) ہیں جن میں بعضے تو ایسے ہیں کہ ایک تنہ اوپر جا کر دو تنے ہو جاتے ہیں اور بعضوں میں دو تنے نہیں ہوتے (بلکہ جڑ سے شاخوں تک ایک ہی تنہ چلا جاتا ہے اور) سب کو ایک ہی طرح کا پانی دیا جاتا ہے اور (باوجود اس کے پھر بھی) ہم ایک کو دوسرے پر پھلوں میں فوقیت دیتے ہیں ان امور (مذکورہ) میں (بھی) سمجھاروں کے (سمجھنے کے) واسطے (توحید کے) دلائل (موجود) ہیں :

معارف و مسائل

یہ سورۃ مکی ہے اور اس کی محکم آیتیں تین تالیس ہیں، اس سورۃ میں بھی قرآن مجید کا کلام حق ہونا، اور توحید و رسالت کا بیان اور شبہات کے جوابات مذکور ہیں۔
الکسر، یہ حروف مقطعه ہیں، جن کے معنی اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں، اُمت کو اس کے معنی نہیں بتلائے گئے، عام اُمت کو اس کی تحقیق میں پڑنا بھی مناسب نہیں۔

حدیث رسول بھی قرآن | پہلی آیت میں قرآن کریم کے کلام الہی اور حق ہونے کا بیان ہے، کتاب کی طرح وحی الہی ہے | سے مراد قرآن ہے اور الَّذِیْ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَبِّكَ سے بھی ہو سکتا ہے کہ قرآن ہی مراد ہو لیکن واو حرف عطف بظاہر یہ چاہتا ہے کہ کتاب اور الَّذِیْ اُنْزِلَ اِلَیْكَ دو چیزیں الگ الگ ہوں، اس صورت میں کتاب سے مراد قرآن اور الَّذِیْ اُنْزِلَ اِلَیْكَ سے مراد وہ وحی ہوگی جو علاوہ قرآن کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر آئی ہے کیونکہ اس میں تو کوئی کلام نہیں ہو سکتا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر آنے والی وحی صرف قرآن میں منحصر نہیں، خود قرآن کریم میں ہے وَمَا یَنْطَلِقُ عَنِ الْهَوٰی اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوَسِّیْ، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کہہ رہے ہیں وہ کسی اپنی غرض سے نہیں کہتے، بلکہ ایک وحی ہوتی ہو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو بھیجی جاتی ہے، اس سے ثابت ہوا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

جو قرآن کے علاوہ دوسرے احکام دیتے ہیں وہ بھی منزل من اللہ ہی ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ قرآن کی تلاوت کی جاتی ہو اور اس کی تلاوت نہیں ہوتی، اور اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کے معانی اور الفاظ دونوں اللہ جل شانہ کی طرف سے ہوتے ہیں، اور قرآن کے علاوہ حدیث میں جو احکام آپ دیتے ہیں، ان کے بھی معانی اگرچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی نازل ہوتے ہیں، مگر الفاظ منزل من اللہ نہیں ہوتے، اسی لئے نماز میں ان کی تلاوت نہیں کی جاسکتی۔

معنی آیت کے یہ ہو گئے کہ یہ قرآن اور جو کچھ احکام آپ پر نازل کئے جاتے ہیں وہ سب حق ہیں جن میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں، لیکن اکثر لوگ غیور و فکر نہ کرنے کی وجہ سے اس پر ایمان نہیں لاتے۔

دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی توحید کے دلائل مذکور ہیں کہ اس کی مخلوقات اور مصنوعات کو ذرا غور سے دیکھو تو یہ یقین کرنا پڑے گا کہ ان کی بنانے والی کوئی ایسی ہستی ہے جو قادرِ مطلق ہے اور تمام مخلوقات و کائنات اس کے قبضہ میں ہیں۔

ارشاد فرمایا: اللَّهُ الَّذِي رَفَعَ السَّمَوَاتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا، یعنی اللہ ایسا ہے جس نے آسمانوں کے اتنے بڑے وسیع اور بلند قبة کو بغیر کسی ستون کے اونچا کھڑا کر دیا، جیسا کہ تم ان آسمانوں کو اسی حالت میں دیکھ رہے ہو۔

کیا آسمان کا جرم عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ نیلا رنگ جو ہمیں اوپر نظر آتا ہے آسمان کا رنگ ہے آنکھوں نظر آتا ہے مگر فلاسفہ کہتے ہیں کہ یہ رنگ روشنی اور اندھیری کی آمیزش سے محسوس ہوتا ہے، کیونکہ نیچے ستاروں کی روشنی اور اس کے اوپر اندھیری ہے تو باہر سے رنگ نیلا محسوس ہوتا ہے جیسے گہرے پانی پر روشنی پڑتی ہے تو وہ نیلا نظر آتا ہے، قرآن کریم کی چند آیات ایسی ہیں جن میں آسمان کے دیکھنے کا ذکر ہے، جیسے اسی آیت مذکورہ میں تَرَوْنَهَا کے الفاظ ہیں، اور دوسری آیت میں إِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ کے الفاظ ہیں، فلاسفہ کی یہ تحقیق اول تو اس کے منافی نہیں، کیونکہ ایسا ممکن ہے کہ آسمان کا رنگ بھی نیلگوں ہو، یا کوئی دوسرا رنگ ہو مگر درمیانی روشنی اور اندھیری کے امتزاج سے نیلا نظر آتا ہو، اس سے انکار کی کوئی دلیل نہیں کہ اس فضاء کے رنگ میں آسمان کا رنگ بھی شامل ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ قرآن کریم میں جہاں آسمان کے دیکھنے کا ذکر ہے وہی اور مجازی ہو کہ آسمان کا وجود ایسے یعنی دلائل سے ثابت ہے کہ گویا دیکھ ہی لیا (روح المعانی) اس کے بعد فرمایا ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ، یعنی پھر عرش پر جو تخت سلطنت کے مشابہ ہے، قائم اور اس طرح جلوہ فرما ہوا جو اس کی شان کے لائق ہے، اس جلوہ فرمانے کی کیفیت کو کوئی نہیں سمجھ سکتا، اتنا اعقاد رکھنا کافی ہے کہ جس طرح کا استواءِ شانِ الہی کے

شایان ہے وہ مراد ہے۔

وَسَخَّرَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرَ لِيَجْزِيَ الْإِسْحَاقَ مَعَهُ، یعنی اللہ تعالیٰ نے سورج اور چاند کو مسخر اور تابع حکم کیا ہوا ہے، ان میں سے ہر ایک ایک معین رفتار سے چلتا ہے۔ مسخر کرنے سے مراد یہ ہے کہ دونوں کو جس جس کام پر لگا دیا ہے برابر لگے ہوئے ہیں، ہزاروں سال گزر گئے ہیں لیکن نہ کبھی ان کی رفتار میں کمی بیشی ہوتی ہے، نہ ٹھکتے ہیں، نہ کبھی اپنے مقررہ کام کے خلاف کسی دوسرے کام میں لگتے ہیں، اور معین مدت کی طرف چلنے کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ پورے عالم دنیا کے لئے جو آخری مدت قیامت تعین ہے، سب اسی کی طرف چل رہے ہیں اس منزل پر پہنچ کر ان کا یہ سارا نظام ختم ہو جائے گا۔

اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ حق سبحانہ و تعالیٰ نے ہر ایک سیارے کے لئے ایک خاص رفتار اور خاص مدار مقرر کر دیا ہے وہ ہمیشہ اپنے مدار پر اپنی مقررہ رفتار کے ساتھ چلتا رہتا ہے، چاند اپنے مدار کو ایک ماہ میں پورا کر لیتا ہے، اور آفتاب سال بھر میں پورا کرتا ہے۔ ان سیاروں کا عظیم الشان وجود پھر ایک خاص مدار پر خاص رفتار کے ساتھ ہزاروں سال سے یکساں انداز میں اسی طرح چلتے رہنا کہ کبھی ان کی مشین گھستی ہے نہ ٹوٹتی ہے، نہ اس کو گرہ لینگ کی ضرورت ہوتی ہے، انسانی مصنوعات میں سنس کی اس انتہائی ترقی کے بعد بھی اس کی نظیر تو کیا اس کا ہزاروں حصہ ملنا بھی ناممکن ہے، یہ نظام قدرت باواز بلند پکار رہا ہے کہ اس کو بنانے اور چلانے والی کوئی ایسی ہستی ضرور ہو جو انسان کے ادراک و شعور سے بالاتر ہے۔

ہر چیز کی تدبیر حقیقت اللہ تعالیٰ ہی کا | قَدْ بَرَأَ الْإِنْسَانَ لَعَلَّ يَذْكُرَ، یعنی اللہ تعالیٰ ہی ہر کام کی تدبیر کرتا ہے۔ کام ہے، انسانی تدبیر برائے نام ہے | انسان جو اپنی تدبیروں پر نازاں ہے ذرا آنکھ کھول کر دیکھے تو معلوم ہو گا کہ اس کی تدبیر کسی چیز کو نہ پیدا کر سکتی ہے، نہ بنا سکتی ہے، اس کی ساری تدبیروں کا حاصل اس سے زیادہ نہیں کہ خداوند سبحانہ و تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں کا تسبیح استعمال سمجھ لے، تمام اشیاء عالم کے استعمال کا نظام بھی اس کی قدرت سے خارج ہے، کیونکہ انسان اپنے ہر کام میں دوسرے ہزاروں انسانوں، جانوروں اور دوسری مخلوقات کا محتاج ہے جن کو اپنی تدبیر سے اپنے کام میں نہیں لگا سکتا، قدرت خداوندی ہی نے ہر چیز کی کڑی دوسری چیز سے اس طرح جوڑی ہے کہ ہر چیز کچھنی چلی آتی ہے، آپ کو مکان بنانے کی ضرورت پیش آتی ہے تو نقشہ بنانے والے آرکٹیکٹ سے لے کر رنگ و روغن کرنے والوں تک سینکڑوں انسان اپنی جان اور اپنا ہنر لے کر آپ کی خدمت کو تیار نظر آتے ہیں، سامان تعمیر جو بہت سی دکانوں میں بکھرا ہوا ہے سب آپ کو تیار مل جاتا ہے، کیا آپ کی قدرت میں تھا

کہ اپنے مال یا تدبیر کے زور سے یہ ساری چیزیں نہیں اور سارے انسانوں کو اپنی خدمت کے لئے حاضر کر لیتے، آپ تو کیا کوئی بڑی سے بڑی حکومت بھی قانون کے زور سے یہ نظام قائم نہیں کر سکتی، بلاشبہ یہ تدبیر اور نظام عالم کا قیام صرف حق و قیوم ہی کا کام ہے، انسان اگر اس کو اپنی تدبیر قرار دے تو جہالت کے سوا کیا ہے۔

يَقْصِلُ الْاٰلِيَّتِ، یعنی وہ اپنی آیات کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے، اس سے مراد آیات قرآنی بھی ہو سکتی ہیں جن کو حق تعالیٰ نے تفصیل کے ساتھ نازل فرمایا، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ مزید ان کا بیان اور تفسیر فرمائی۔

اور آیات سے مراد آیات قدرت یعنی اللہ جل شانہ کی قدرت کاملہ کی نشانیاں جو آسمان زمین اور خود انسان کے وجود میں موجود ہیں، وہ بھی ہو سکتی ہیں، جو بڑی تفصیل کے ساتھ ہر وقت ہر جگہ انسان کی نظر کے سامنے ہیں۔

لَعَلَّكُمْ يَلْقَآءَ رَبِّكُمْ تَوَقُّوْنَ، یعنی یہ سب کائنات اور ان کا عجیب و غریب نظام کو تدبیر اللہ تعالیٰ نے اس لئے قائم فرمائے ہیں کہ تم اس میں غور کرو، تو سمجھیں آخرت اور قیامت کا یقین ہو جائے، کیونکہ اس نظام عجیب اور پیدائش عالم پر نظر کرنے کے بعد یہ اشکال تو رہ نہیں سکتا کہ آخرت میں انسان کے دوبارہ پیدا کرنے کو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے خارج سمجھیں، اور جب داخل قدرت اور ممکن ہونا معلوم ہو گیا، اور ایک ایسی ہستی نے اس کی خبر دی جس کی زبان پوری عمر میں کبھی جھوٹ پر نہیں چلی، تو اس کے واقع اور ثابت ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہو۔
وَهُوَ الَّذِي مَلَآَ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِرْعٰوْنَ اَسٰی وَاَقْبٰطًا وَّرٰوِیْیَ وَهٰذَا
ہے جس نے زمین کو پھیلایا اور اس میں بوجھل پہاڑ اور نہریں بنائیں۔

زمین کا پھیلانا اس کے کرہ اور گول ہونے کے منافی نہیں، کیونکہ گول چیز جب بہت بڑی ہو تو اس کا ہر ایک حصہ الگ الگ ایک پھیلی ہوئی سطح ہی نظر آتا ہے، اور قرآن کریم کا خطاب عام لوگوں سے انہی کی نظروں کے مطابق ہوتا ہے، ظاہر دیکھنے والا اس کو ایک پھیلی ہوئی سطح دیکھتا ہے، اس لئے اس کو پھیلانے سے تعبیر کر دیا گیا، پھر اس کا توازن قائم رکھنے کے لئے نیز اور بہت سے دوسرے فوائد کے لئے اس پر اونچے اونچے بھاری پہاڑ قائم فرمادیئے، جو ایک طرف زمین کا توازن قائم رکھتے ہیں، دوسری طرف ساری مخلوق کو پانی پہنچانے کا انتظام کرتے ہیں، پانی کا بہت بڑا ذخیرہ ان کی چوٹیوں پر بحر منجمد (برف) کی شکل میں رکھ دیا جاتا ہے، جس کے لئے نہ کوئی حوض ہے اور نہ ٹنکی بنانے کی ضرورت ہے، نہ ناپاک ہونے کا احتمال، نہ سڑنے کا امکان، پھر اس کو ایک زیر زمین قدرتی پائپ لائن کے ذریعہ ساری دنیا

میں پھیلا جاتا ہے، اسی سے کہیں کھلی ہوتی ندیاں اور نہریں نکلتی ہیں اور کہیں زیر زمین مستور رہ کر کنوؤں کے ذریعہ اس پائپ لائن کا سراغ لگایا اور پانی حاصل کیا جاتا ہے۔

وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ جَعَلَ فِيهَا زَرْعَيْنِ اثْنَيْنِ، یعنی پھر اس زمین سے طرح طرح کے پھل نکالے اور ہر ایک پھل دو دو قسم کے پیدا کئے، چھوٹے بڑے، سُرخ، سفید، کھٹے میٹھے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ زوجین سے مراد صرف دونوں ہوں بلکہ متعدد انواع و اقسام مراد ہوں جسکی تعداد کم سے کم دو ہوتی ہے، اس لئے زوجین اثنین سے تعبیر کر دیا گیا، اور کچھ بعید نہیں کہ زوجین سے مراد نر و مادہ ہوں، جیسے بہت سے درختوں کے متعلق تو تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ ان میں نر و مادہ ہوتے ہیں، جیسے کھجور، پپیتہ وغیرہ دوسرے درختوں میں بھی اس کا امکان ہے، اگرچہ ابھی تک تحقیقات وہاں تک نہ پہنچی ہوں۔

يُخْشَى الْيُسْكَرُ الْيُسْكَرُ، یعنی اللہ تعالیٰ ہی ڈھانپ دیتا ہے رات کو دن پر، مراد یہ ہے کہ دن کی روشنی کے بعد رات لے آتا ہے جیسے کسی روشن چیز کو کسی پردہ میں ڈھانپ دیا جائے۔
إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ، بلاشبہ اس تمام کائنات کی تخلیق اور اس کی تدبیر و نظام میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ شانہ کی قدرت کا ملکہ کی بہت سی نشانیاں موجود ہیں۔

وَفِي الْأَرْضِ قِطْعٌ مِّمَّجَرَاتٍ وَجَنَّتْ مِنْ آعْنَابٍ وَزَرْعٌ وَنَخِيلٌ صِنْوَانٌ وَغَيْرُ صِنْوَانٍ يُسْقَى بِمَاءٍ وَاحِدٍ وَنُفِصِلُ بَعْضَهَا عَلَى بَعْضٍ فِي الْإِثْمِ، یعنی پھر زمین میں بہت سے قطعے آپس میں ملے ہوئے ہونے کے باوجود مزاج اور خاصیت میں مختلف ہیں، کوئی اچھی زمین ہے کوئی کھاری، کوئی نرم کوئی سخت، کوئی کھیتی کے قابل کوئی باغ کے قابل، اور ان قطعات میں باغات ہیں، انگور کے، اور کھیتی ہے اور کھجور کے درخت ہیں، جن میں بعض ایسے ہیں کہ ایک تنے سے اوپر جا کر دو تنے ہو جاتے ہیں، اور بعض میں ایک ہی تنہ رہتا ہے۔

اور یہ سارے پھل اگرچہ ایک ہی زمین سے پیدا ہوتے ہیں، ایک ہی پانی سے سیراب کئے جاتے ہیں، اور آفتاب و ماہتاب کی شعاعیں اور مختلف قسم کی ہوائیں بھی ان سب کو یکساں پہنچتی ہیں مگر کچھ بھی ان کے رنگ اور ذائقے مختلف اور چھوٹے بڑے کا نمایاں فرق ہوتا ہے۔

باد و جو و اتصال کے پھر یہ طرح طرح کے اختلافات اس بات کی قوی اور واضح دلیل ہے کہ یہ سب کار و بار کسی حکیم و مدبر کے فرمان کے تابع چل رہا ہے، محض مادہ کے تطورات

نہیں، جیسا کہ بعض جاہل سمجھتے ہیں، کیونکہ مادے کے تلورات ہوتے تو سب مواد کے مشترک ہونے کے باوجود یہ اختلاف کیسے ہوتا، ایک ہی زمین سے ایک پھل ایک درخت میں نکلتا ہے دو درختوں سے دو نم میں، ایک ہی درخت کی ایک ہی شاخ پر مختلف قسم کے چھوٹے بڑے اور مختلف ذائقہ کے پھل پیدا ہوتے ہیں۔

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝ اُس میں بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و عظمت اور اس کی وحدت پر دلالت کرنے والی بہت سی نشانیاں ہیں عقل والوں کے لئے ۝ اس میں شاہد ہے کہ جو لوگ ان چیزوں میں غور نہیں کرتے وہ عقل والے نہیں گو دنیا میں ان کو کیسا ہی عقلمند سمجھا، اور کہا جاتا ہو۔

وَإِنْ تَعَجَّبَ فَعَجَبٌ قَوْلِهِمْ إِذْ أَكْنَأَتْ رَبَّاءُ إِنَّا لَفِي خَلْقٍ

اور اگر تو عجب بات چاہے تو عجب ہے ان کا کہنا کہ کیا جب ہو گئے ہم مٹی کی بنے ہوئے بناتے

جَدِيدٌ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ الْأَغْلَىٰ

جائیں گے، وہی ہیں جو منکر ہو گئے اپنے رب سے اور وہی ہیں کہ طوق ہیں

فِي آعْنَاقِهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝

ان کی گردنوں میں، اور وہیں دوزخ والے وہ اسی میں رہیں گے برابر،

وَلَيَسَّعِجَلُونَكَ بِالسَّيِّئَاتِ قَبْلَ الْحَسَنَاتِ ۖ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ

اور جلد مانگتے ہیں تجھ سے بُرائی کو پہلے بھلائی سے اور گزر چکے ہیں ان سے

قَبْلَهُمُ الْمَثَلَاتُ ۖ وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰی

پہلے بہت سے عذاب اور تیرا رب مہمان بھی کرتا ہے لوگوں کو باوجود ان کے

ظُلْمِهِمْ ۖ وَإِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيدُ الْعِقَابِ ۝ وَيَقُولُ الَّذِينَ

ظلم کے اور تیرے رب کا عذاب بھی سخت ہے، اور کہتے ہیں کافر

كَفَرُوا وَالْأُولَٰئِكَ لَا تُنَزِّلُ عَلَيْهِ آيَةً مِّن رَّبِّهِ ۖ إِنَّمَا أَنْتَ مُنذِرٌ

کیوں نہ اُتری اس پر کوئی نشانی اس کے رب کے تیرا کام تو ڈر سنا دینا ہے،

۱
ع

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝۸ اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِيْضُ

اور ہر قوم کیلئے ہوا ہر راہ بتانے والا، اللہ جانتا ہے جو بیٹ میں رکھتی ہے ہر مادہ اور جو سکڑاتے ہیں

الْاَرْحَامِ وَمَا تَرْدَادُ وَاٰطَ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَكَ بِمِقْدَارٍ ۝۹

پینٹ اور بڑھتے ہیں، اور ہر چیز کا اس کے یہاں اندازہ ہے۔

خلاصہ تفسیر

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اگر آپ کو دان لوگوں کے انکارِ قیامت سے (تعب ہو تو واقعی) ان کا یہ قول تعجب کے لائق ہے کہ جب ہم (مر کر) خاک ہو گئے کیا (خاک ہو کر) ہم پھر (قیامت کو) از سر نو پیدا ہوں گے (تعجب کے لائق اس لئے کہ جو ذات ایسی اشیاء مذکورہ کے خلق پر ابتداء قادر ہے اس کو دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے، اور اسی سے جواب ہو گیا استبعادِ بعث کا اور انکارِ نبوت کا بھی جس کا مبنی وہ استبعاد تھا ایک کے جواب سے دوسرے کا جواب ہو گیا، آگے ان کے لئے وعید ہے کہ) یہ وہ لوگ ہیں کہ انھوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا (کیونکہ انکارِ بعث سے اُس کی قدرت کا انکار کیا، اور انکارِ قیامت سے انکارِ نبوت لازم آتا ہے) اور ایسے لوگوں کی گردنوں میں (دوزخ میں) طوق ڈالے جائیں گے اور ایسے لوگ دوزخی ہیں (اور) وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ لوگ عافیت (کی میعاد ختم ہونے) سے پہلے آپ سے مصیبت (کے نازل ہونے) کا تقاضا کرتے ہیں کہ اگر آپ نبی ہیں تو جاتیے عذاب منگوا دیجئے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عذاب کے وقوع کو بہت بعید سمجھتے ہیں) حالانکہ ان سے پہلے (اور کفار پر) واقعاتِ عقوبت گذر چکے ہیں (تو ان پر آجانا کیا مستبعد ہے) اور (اللہ تعالیٰ کے غفور اور رحیم ہونے کو سن کر یہ لوگ مخرور نہ ہو جاویں کہ اب ہم کو عذاب نہ ہو گا کیونکہ وہ صرف غفور و رحیم ہی نہیں ہوتے اور پھر سب کے لئے غفور و رحیم نہیں ہیں، بلکہ دونوں باتیں اپنے اپنے موقع پر ظاہر ہوتی ہیں یعنی) یہ بات بھی یقینی ہے کہ آپ کا رب لوگوں کی خطائیں باوجود ان کی (ایک خاص درجہ کی) بیجا حرکتوں کے معاف کر دیتا ہے اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ آپ کا رب سخت سزا دیتا ہے، (یعنی اس میں دونوں صفتیں ہیں اور ہر ایک کے ظہور کی شرطیں اور اسباب ہیں، پس انھوں نے بلا سبب اپنے کو مستحقِ رحمت و مغفرت کیسے سمجھ لیا، بلکہ کفر کی وجہ سے اُن کے لئے تو اللہ تعالیٰ شدید العقاب ہے) اور یہ کفار (انکارِ نبوت کی غرض سے) یوں (بھی) کہتے ہیں کہ ان پر خاص معجزہ (جو ہم چاہتے ہیں) کیوں نہیں نازل کیا گیا (اور یہ اعتراض محض حماقت ہے کیونکہ آپ مالکِ معجزات نہیں، بلکہ آپ

عزت (عذاب خدا سے کافروں کو ڈرانے والے) ہیں (یعنی نبی) اور نبی کے لئے مطلق معجزہ کی ضرورت ہو جو کہ ظاہر ہو چکا ہے نہ کسی خاص معجزہ کی) اور (کوئی آپ انوکھے نبی نہیں ہوتے بلکہ) ہر قوم کیلئے (اعجاز باضیہ میں) بادی ہوتے چلے آئے ہیں (ان میں بھی یہی قاعدہ چلا آیا ہے کہ دعویٰ نبوت کے لئے مطلق دلیل کو کافی قرار دیا گیا، خاص دلیل کا التزام نہیں ہوا) اللہ تعالیٰ کو سب خبر رہتی ہے جو کچھ کسی عورت کو حمل رہتا ہے، اور جو کچھ جسم میں کمی بیشی ہوتی ہے، اور ہر چیز اللہ کے نزدیک ایک خاص انداز سے ہے۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ کی پہلی تین آیتوں میں کفار کے شبہات کا جواب ہے جو نبوت کے متعلق تھے اور اس کے ساتھ منکرین کے لئے عذاب کی وعید مذکور ہے۔

ان کے شبہات تین تھے، ایک یہ کہ یہ لوگ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے اور عیش کے حساب و کتاب کو محالِ خلافِ عقل سمجھتے تھے، اسی بنا پر آخرت کی خبر دینے والے انبیاء کی تکذیب اور ان کی نبوت کا انکار کرتے تھے، جیسا کہ قرآن کریم نے ان کے اس شبہ کا بیان اس آیت میں فرمایا ہے: **هَلْ نَدَّبَكُم عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنْكُمْ إِذْ أُمِرْتُمْ كُلٌّ مِّنْكُمْ لَقِيَ خَلْقًا جَدِيدًا** اس میں انبیاء کا مذاق اڑانے کے لئے کہتے ہیں کہ آؤ ہم تمہیں ایک ایسا آدمی بتائیں جو تمہیں یہ بتلاتا ہے کہ جب تم مرنے کے بعد ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے اور تمہاری مٹی کے ذرات بھی سارے جہان میں پھیل جائیں گے تم اس وقت پھر دوبارہ زندہ کئے جاؤ گے مرنے کے بعد دوبارہ آیت مذکورہ میں سے پہلی آیت میں ان کے اس شبہ کا جواب دیا گیا:

زندہ ہونے کا ثبوت **وَلَمَّا نَسُوا مَا كُنْتُمْ تُحْيَوْنَ لَهُمْ إِذْ كُنَّا شَرِبَاءً إِذْ نَفَخْنَا فِي خَلْقٍ**

جدید، اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہو کہ اگر آپ کو اس پر تعجب ہے کہ یہ کفار آپ کے لئے کھلے ہوئے معجزات اور آپ کی نبوت پر اللہ تعالیٰ کی واضح نشانیاں دیکھنے کے باوجود آپ کی نبوت کا انکار کرتے ہیں، اور مانتے ہیں تو ایسے بے جان پتھروں کو مانتے ہیں جن میں نہ جس سے نہ شعور، خود اپنے نفع و نقصان پر بھی قادر نہیں دوسروں کو کیا نفع پہنچا سکتے ہیں لیکن اس سے زیادہ تعجب کے قابل ان کی یہ بات ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ جب ہم مڑ کر مٹی ہو جائیں گے تو ہمیں دوبارہ پیدا کیا جائے گا، قرآن نے وجہ اس تعجب کی بالتصریح بیان نہیں کی، کیونکہ پچھلی آیات میں اللہ جل شانہ کی قدرت کاملہ کے عجیب عجیب مظاہر بیان کر کے یہ ثابت کر دیا گیا ہے کہ وہ ایسا قادر مطلق ہے جو ساری مخلوق کو عدم سے وجود میں

لایا، اور پھر ہر چیز کے وجود میں کیسی کیسی حکمتیں رکھیں کہ انسان ان کا ادراک و احاطہ بھی نہیں کر سکتا اور یہ ظاہر ہے کہ جو ذات پہلی مرتبہ بالکل عدم سے ایک چیز کو موجود کر سکتی ہے اس کو دوبارہ موجود کر دینا کیا مشکل ہو انسان بھی جب کوئی نئی چیز بنانا چاہتا ہے تو پہلی مرتبہ اس کو مشکل پیش آتی ہو اور اسی کو دوبارہ بنانا چاہیے تو آسان ہو جاتا ہے۔

تو تعجب کی بات یہ ہو کہ یہ لوگ اس کے تو قائل ہیں کہ پہلی مرتبہ تمام کائنات کو بے شمار حکمتوں کے ساتھ اسی نے پیدا فرمایا ہے پھر دوبارہ پیدا کرنے کو کیسے محال اور خلاف عقل سمجھتے ہیں۔ شاید ان منکرین کے نزدیک بڑا اشکال یہ ہے کہ مرنے اور خاک ہو جانے کے بعد انسان کے اجزاء اور ذرات دنیا بھر میں منتشر ہو جاتے ہیں، ہوائیں ان کو کہیں سے کہیں لیجاتی ہیں اور دوسرے اسباب و ذرائع سے بھی یہ ذرات سارے جہان میں پھیل جاتے ہیں، پھر قیامت کے روز ان تمام ذرات کو جمع کس طرح کیا جائے گا اور پھر ان کو جمع کر کے دوبارہ زندہ کیسے کیا جائیگا؟ مگر وہ نہیں دیکھتے کہ اس وقت جو وجود ان کو حاصل ہے اس میں کیا سارے جہان کے ذرات جمع نہیں، دنیا کے مشرق و مغرب کی چیزیں پانی ہوا اور ان کے لائے ہوئے ذرات انسان کی غذا میں شامل ہو کر اس کے بدن کا حصہ بنتے ہیں، اس مسکین کو بسا اوقات خبر بھی نہیں ہوتی کہ ایک لقمہ جو منہ تک لے جا رہا ہے اس میں کتنے ذرات اذریعہ کے کتنے امریکہ کے اور کتنے مشرقی ممالک کے ہیں، تو جس ذات نے اپنی حکمت بالغہ اور تدبیر امور کے ذریعہ اس وقت ایک ایک انسان اور جانور کے وجود کو سارے جہان کے منتشر ذرات جمع کر کے کھا کر دیا ہے، کل اس کے لئے یہ کیوں مشکل ہو جائے گا کہ ان سب ذرات کو جمع کر ڈالے، جبکہ دنیا کی ساری طاقتیں ہوا اور پانی اور دوسری قوتیں سب اس کے حکم کے تابع اور مسخر ہیں، اس کے اشارے پر ہوا اپنے اندر کے، اور پانی اپنے اندر کے، اور فضا اپنے اندر کے سب ذرات کو جمع کر دے اس میں کیا اشکال ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور قدر کو پہچانا ہی نہیں، اس کی قدرت کو اپنی قدرت پر قیاس کرتے ہیں، حالانکہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی سب چیزیں اپنی اپنی حیثیت کا ادراک و شعور رکھتے ہیں، اور حکیم حق کے تابع چلتے ہیں۔

خاک و باد و آب و آتش زندہ اند

بامن و تو مردہ باحق زندہ اند

خلاصہ یہ ہو کہ کھلی ہوئی نشانیوں کو دیکھنے کے باوجود جس طرح ان کا نبوت سے انکار قابل تعجب ہو اس سے زیادہ قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے اور حشر کے دن سے انکار آجوب

کی چیز ہے۔

اس کے بعد ان معاند منکرین کی سزا کا ذکر کیا گیا ہے کہ یہ لوگ صرف آپ ہی کا انکار نہیں کرتے، بلکہ درحقیقت اپنے رب کا انکار کرتے ہیں، اُن کی سزا یہ ہوگی کہ ان کی گردنوں میں ملوک ڈالے جائیں گے اور ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔

دوسرا شبہ منکرین کا یہ تھا کہ اگر فی الواقع آپ اللہ کے نبی اور رسول ہیں تو نبی کی مخالفت جو عذاب کی وعیدیں آپ سناتے ہیں وہ عذاب آتا کیوں نہیں، اس کا جواب دوسری آیت میں دیا گیا

وَلَيْسَ عِزَّكَ بِذَلِكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثَلَاتُ وَإِنَّ رَبَّنَا لَذِيْ ذِكْرٍ مُّقْبِلٍ عَلَى غُلَامٍ عِمَامٍ وَإِنَّ رَبَّنَا لَشَدِيدُ الْعِقَابِ ۚ

یعنی یہ لوگ ہمیشہ عافیت کی میعاد ختم ہونے سے پہلے آپ سے عیبیت کے نازل ہونے کا تقاضا کرتے ہیں کہ اگر آپ نبی ہیں تو فوری عذاب منکدار کیجئے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ عذاب کے آنے کو بہت ہی اچھا یا ناممکن سمجھتے ہیں، حالانکہ ان سے پہلے دوسرے کافروں پر بہت سے واقعات عذاب کے گذر چکے ہیں جن کا سب لوگوں نے مشاہدہ کیا ہے، تو ان پر عذاب آجانا کیا مستبعد ہے، یہاں لفظ مَثَلَاتُ مسئلہ کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں ایسی سزا جو انسان کو سب کے سامنے رسوا کر دے، اور دوسروں کے لئے عبرت کا ذریعہ بنے۔

پھر فرمایا کہ بیشک آپ کا رب لوگوں کے گناہوں اور نافرمانیوں کے باوجود بڑی مغفرت و رحمت والا بھی ہے، اور جو لوگ اس مغفرت و رحمت سے فائدہ نہ اٹھائیں، اپنی سرکشی و نافرمانی پر تے رہیں ان کے لئے سخت عذاب دینے والا بھی ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ اسے غفور و رحیم ہونے سے کسی غلط فہمی میں نہ پڑیں، کہ ہم پر عذاب آہی نہیں سکتا۔

تیسرا شبہ ان کفار کا یہ تھا کہ اگرچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے معجزات ہم دیکھ چکے ہیں، لیکن جن خاص خاص قسم کے معجزات کا ہم نے مطالبہ کیا ہے وہ کیوں ظاہر نہیں کرتے؟ اس کا جواب تیسری آیت میں یہ دیا گیا ہے:-

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا أَلَا نُنْزِلُ عَلَيْهِ آيَاتٍ مِّنْ رَبِّهِ إِنَّمَا أَنْتَ مُنْذِرٌ

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۚ

یعنی یہ کفار آپ کی نبوت پر اعتراض کرنے کے لئے یہ کہتے ہیں کہ اُن پر جن معجزہ جس کو طلب کرتے ہیں وہ کیوں نازل نہیں کیا گیا، سو اس کا جواب واضح ہے کہ معجزہ ظاہر کرنا پیغمبرِ ادنیٰ کے اختیار میں نہیں ہوتا، بلکہ براہِ راست وہ حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، وہ اپنی حکمت سے جس وقت جس طرح کا معجزہ ظاہر کرنا پسند فرماتے ہیں اس کو ظاہر کر دیتے ہیں، وہ کسی کے مطالبہ اور خواہش کے پابند نہیں، اسی لئے فرمایا إِنَّمَا أَنْتَ مُنْذِرٌ، یعنی

آپ کا فرد کو خدا کے عذاب سے صرف ڈرانے والے ہیں، معجزہ ظاہر کرنا آپ کا کام نہیں۔
 وَدِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ، یعنی ہر قوم کے لئے پچھلی امتوں میں ہادی ہوتے چلے آئے ہیں، آپ کوئی
 انوکھے نبی نہیں، سب ہی انبیاء کا وظیفہ یہ تھا کہ وہ قوم کو ہدایت کریں، اللہ کے عذاب سے ڈرائیں
 معجزات کا ظاہر کرنا کسی کے اختیار میں نہیں دیا گیا، اللہ تعالیٰ جب اور جس طرح کا معجزہ ظاہر کرنا
 پسند فرماتے ہیں ظاہر کر دیتے ہیں۔

کیا ہر قوم اور ہر ملک میں | اس آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہے، اس سے ثابت
 نی آنا ضروری ہے؟ | ہوا کہ کوئی قوم اور کوئی خطہ ملک اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے اور ہدایت
 کرنے والوں سے غالی نہیں ہو سکتا خواہ وہ کوئی بنی ہو یا اس کے قائم مقام نبی کی دعوت کو پھیلانے
 والا ہو جیسا سورۃ یونس میں نبی کی طرف سے کسی قوم کی طرف پہلے دو شخصوں کو دعوت دہرایت کے لئے
 بھیجے گا ذکر ہے، جو خود نبی نہیں تھے، اور پھر تیسرے آدمی کو ان کی تائید و نصرت کے لئے بھیجنا
 مذکور ہے۔

اس لئے اس آیت سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہندوستان میں بھی کوئی بنی و رسول پیدا ہوا ہو
 البتہ دعوت رسول کے پہونچانے اور پھیلانے والے علماء کا کثرت سے یہاں آنا بھی ثابت ہے،
 اور پھر یہاں بے شمار ایسے ہادیوں کا پیدا ہونا بھی ہر شخص کو معلوم ہے۔

یہاں تک تین آیتوں میں نبوت کا انکار کر لے والوں کے شہادت کا جواب تھا، چوتھی آیت
 میں پھر وہی اصل مضمون توحید کا مذکور ہے، جس کا ذکر اس سورۃ کی ابتداء سے آ رہا ہے، ارشاد کہ
 اللَّهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُ فُتُورٌ وَمَا كَانَ لَهُ أَكْرَهٌ
 عِنْدَ رَبِّهِ يَعْنِي اللہ تعالیٰ کو سب خبر رہتی ہے جو کچھ کسی عورت کو حمل رہتا ہے لڑکا یا لڑکی
 حیلن ہے یا بڑا، ایک ہے یا بد، اور جو کچھ ان عورتوں کے رحم میں کمی بیشی ہوتی ہے، کہ کبھی ایک
 بچہ پیدا ہوتا ہے کبھی زیادہ اور کبھی جلدی پیدا ہوتا ہے کبھی دیر میں۔

اس آیت میں حق تعالیٰ کی ایک مخصوص صفت کا بیان ہے، کہ وہ عالم الغیب ہیں،
 تمام کائنات و مخلوقات کے ذرہ ذرہ سے واقف اور ہر ذرہ کے بدلتے ہوتے حالات سے باخبر ہیں
 اس کے ساتھ ہی تخلیق انسانی کے ہر دور اور ہر تغیر اور ہر صفت سے پوری طرح واقف ہونے کا
 ذکر ہے کہ حمل کا یقینی اور صحیح علم صرف اسی کو ہوتا ہے کہ لڑکا ہے یا لڑکی، یا دونوں یا کچھ بھی نہیں
 صرف پانی یا ہوا ہے، قرآن اور تخمینہ سے کوئی حکیم یا ڈاکٹر جو کچھ اس معاملہ میں رائے دیتا ہے اس
 کی حیثیت ایک گمان اور اندازہ سے زیادہ نہیں ہوتی، بسا اوقات واقعہ اس کے خلاف نکلتا ہے،
 ایکس رے کا جدید آلہ بھی اس حقیقت کو دکھانے سے قاصر ہے، اس کا حقیقی اور یقینی علم صرف

اللہ جل شانہ ہی کو ہو سکتا ہے، اسی کا بیان ایک دوسری آیت میں ہے وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْأَنْحَامِ
یعنی اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے جو کچھ رحموں میں ہے۔

لفظ تَغْيِثُ غریبی زبان میں کم ہونے اور خشک ہونے کے معنی میں آتا ہے آیت مذکورہ
میں اس کے بالمقابل تَزْدَادُ کے لفظ نے متعین کر دیا کہ اس جگہ معنی کم ہونے کے ہیں، مطلب
یہ ہے کہ رحم مادر میں جو کچھ کمی یا بیشی ہوتی ہے اس کا علم بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، اس
کمی اور بیشی سے مراد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پیدا ہونے والے بچے کی تعداد میں کمی بیشی ہو کہ حمل
میں صرف ایک بچہ ہے یا زیادہ، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زمانہ پیدائش کی کمی بیشی مراد ہو کہ یہ حمل
کتنے پہلے کتنے دن اور کتنے گھنٹوں میں پیدا ہو کر ایک انسان کو ظاہری وجود دے گا، اس کا یقینی
علم بھی بجز اللہ جل شانہ کے کسی کو نہیں ہو سکتا۔

ادام تفسیر خواہ نے فرمایا کہ زمانہ حمل میں جو خون عورت کو آجاتا ہے وہ حمل کی جسامت
صحیح میں کمی کا باعث ہوتا ہے، تَغْيِثُ الْأَنْحَامُ سے مراد یہ کمی ہے، اور حقیقت یہ ہے
کہ جتنے اقسام کمی کے ہیں آیت کے الفاظ سب پر حاوی ہیں، اس لئے کوئی اختلاف نہیں۔

کُلُّ شَيْءٍ عِنْدَ بَدِيعِ أَرْوَاحِیْنِ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہر چیز کا ایک خاص انداز
اور پیمانہ مقرر ہے، نہ اس سے کم ہو سکتی ہے نہ زیادہ، بچے کے تمام حالات بھی اس میں
داخل ہیں کہ اس کی ہر چیز اللہ کے نزدیک متعین ہو کہ کتنے دن حمل میں رہے گا، پھر کتنے زمانہ
تک دنیا میں زندہ رہے گا، کتنا رزق اس کو حاصل ہوگا، اللہ جل شانہ کا یہ بے مثال علم
اس کی توحید کی واضح دلیل ہے۔

عِلْمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيرُ السُّعَالِ ① سَوَاءٌ مِنْكُمْ مَنْ

جاننے والا پوشیدہ اور ظاہر کا سب سے بڑا برتر، برابر ہے تم میں جو

أَسْرَ الْقَوْلِ وَمَنْ جَحَرَبِهِ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِاللَّيْلِ وَسَارِبٌ

آہستہ بات کہے اور جو کہے بھڑا کر اور جو چھپ رہا ہے رات میں اور جو گھسوں میں

بِالنَّهَارِ ② لَهُ مَعْقِبَاتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُونَهُ

پھر تا ہر دن کو، اس کے پہلے والے ہیں بندہ کے آگے سے اور پیچھے سے اس کی نگہبانی کرتے ہیں

مِنْ أَمْرِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرَ أَمْرًا بِأَنفُسِهِمْ ③

اللہ کے حکم سے، اللہ نہیں بدلتا کسی قوم کی حالت کو جب تک وہ نہ بدلیں جو ان کے جیوں میں ہے

وَإِذَا أَرَادَ اللَّهُ بِقَوْمٍ سُوءَ أَفْلًا مَرَدًّا لَهُ ۖ وَمَا لَهُمْ مِنْ دُونِهِ

اور جب چاہتا ہے اللہ کسی قوم پر آفت پھروہ نہیں پھرتی ، اور کوئی نہیں اُن کا اس کے سوا

مِنْ وَآلٍ ۝۱۱ هُوَ الَّذِي يُرِيكُمْ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنْشِئُ

مرد و گار ، وہی ہوتا ہے بجلی ڈر کو اور امید کو اور اٹھاتا ہے

السَّحَابَ الثِّقَالَ ۝۱۲ وَيَسِّرُ الرِّعْدَ بِحَمْدِهِ ۖ وَالْمَلَائِكَةُ مِنْ

بادل ، بھاری ، اور پڑھتا ہے گرجنے والا غویاں اس کی اور سب فرشتے اس کے

خِيفَتِهِ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَشَاءُ ۖ وَهُمْ

ڈرے اور بھیجتا ہے کرکٹ بجلیاں پھر ڈالتا ہے جس پر چاہے اور یہ لوگ

يَعَادِلُونَ فِي اللَّهِ وَهُوَ شَدِيدُ الْمِحَالِ ۝۱۳ لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِّ ۖ

جھگڑتے ہیں اللہ کی بات میں اور اس کی آن سخت ہے ، اسی کا پکارنا سچ ہے ،

وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ لَا يَسْتَجِيبُونَ لَهُمْ بِشَيْءٍ إِلَّا

اور جن لوگوں کو پکارتے ہیں اس کے سوا وہ نہیں کام آتے ان کے کچھ بھی نگرانی کسی

كَبَاسٍ كَفَّيْهِ إِلَى الْمَاءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِأَلْفِ عَا ۖ

پھیلا دیئے دونوں ہاتھ پانی کی طرف کہ آپہنچے اس کے منہ تک اور کہیں پہنچے گا اس تک اور جتنی بکارت

الْكُفْرَيْنِ إِلَّا فِي ضَلَالٍ ۝۱۴ وَلِلَّهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَ

کافروں کی سب گمراہی ہے ، اور اللہ کو سجدہ کرتا ہے جو کوئی ہو آسمان اور

الْأَرْضِ مِنْ طُوعًا وَكَرْهًا وَظِلَالُهُم بِالْغُدُوِّ وَالْآخِرِ ۝۱۵

زمین میں خوشی سے اور زور سے اور ان کی پرچائیاں صبح اور شام

حکامہ تفسیر

وہ تمام پوشیدہ اور ظاہر چیزوں کا جاننے والا ہے سب سے بڑا اور عالی شان ہے تم میں سے جو شخص کوئی بات چپکے سے کہے اور جو پکار کر کہے اور جو شخص رات میں کہیں چھپ جائے اور جودن میں چلے پھرے یہ سب (خدا کے علم میں) برابر ہیں (یعنی سب کو یکساں جانتا ہے اور

جیسا تم میں سے ہر شخص کو بابت ہے اسی طرح ہر ایک کی حفاظت بھی کرتا ہے چنانچہ تم میں سے ہر شخص کی حفاظت کے لئے کچھ فرشتے مقرر ہیں جن کی بدلی ہوتی رہتی ہے کچھ اس کے آگے اور کچھ اس کے پیچھے کہ وہ کبیم خدا بہت بلاؤں سے اس کی حفاظت کرتے ہیں (اور اس سے کوئی یوں نہ سمجھ جائے کہ جب فرشتے ہمارے محافظ ہیں پھر جو چاہو کرو، مصیبت خواہ کفر، کسی طرح عذاب نازل ہو گا، یہ سمجھنا بالکل غلط ہے، کیونکہ) واقعی اللہ تعالیٰ (ابتداءً تو کسی کو عذاب دیتا نہیں، چنانچہ اس کی عادت ہے کہ وہ) کسی قوم کی (اچھی) حالت میں تغیر نہیں کرتا جب تک وہ لوگ خود اپنی (صلاحیت کی) حالت کو نہیں بدل دیتے (مگر اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جب وہ اپنی صلاحیت میں غفلت ڈالنے لگتے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر مصیبت و عقوبت بخیز کی جاتی ہے) اور جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر مصیبت ڈالنا تجویز کر لیتا ہے تو پھر اس کے ہٹنے کی کوئی صورت ہی نہیں (وہ واقع ہو جاتی ہے) اور ایسے وقت میں، کوئی خدا کے سوا (جن کی حفاظت کا ان کو زعم ہے) ان کا مددگار نہیں رہتا (وہی کہ فرشتے بھی ان کی حفاظت نہیں کرتے اور اگر کرتے بھی تو حفاظت ان کے کام نہ آسکتی) وہ ایسا (عظیم الشان) ہے کہ تم کو (بارش کے وقت) بجلی دیکھتی ہوئی، دکھلاتا ہے جس سے (اس کے گرنے کا) ڈر بھی ہوتا ہے اور (اس سے بارش کی) امید بھی ہوتی ہے اور وہ پانیوں کو (بھی) بند کرتا ہے جو پانی سے بھرے ہوئے ہیں اور رعد (فرشتہ) اس کی تعریف کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتا ہے اور (دوسرے) فرشتے بھی اس کے خوف سے (اس کی تمجید و تسبیح کرتے ہیں) اور وہ (زمین کی طرف) بجلیاں بھیجتا ہے پھر جس پر چاہے گرا دیتا ہے اور وہ لوگ اللہ کے بائے میں (یعنی اس کی توحید میں) باوجود اس کے ایسے عظیم الشان ہونے کے) جھگڑتے ہیں حالانکہ وہ بڑا شدید العقوبت ہے (کہ جس سے ڈرنا چاہئے) مگر یہ لوگ ڈرتے نہیں اور اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں اور وہ ایسا عجیب العتوات ہے کہ سچا پکارنا اسی کے لئے خاص ہے (کیونکہ اس کو قبول کرنے کی قدرت ہے) اور خدا کے سوا جن کو یہ لوگ (اپنے سوا کچھ و مصائب میں) پکارتے ہیں وہ (بوجہ عدم قدرت کے) ان کی درخواست کو اس سے زیادہ منظور نہیں کر سکتے جتنا پانی اس شخص کی درخواست کو منظور کرتا ہے، جو اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلا کر بتا ہو (اور اس کو اشارہ سے اپنی طرف بلاتا ہو) تاکہ وہ (پانی) اس کے منہ تک (آڈکر) آجائے اور وہ (از خود) اس کے منہ تک (کسی طرح) آئیوا لائیں (پس اس طرح پانی ان کی درخواست قبول کرنے سے عاجز ہے اسی طرح ان کے مجبور دعا جزی ہیں، اس لئے) کافروں کی (ان سے) درخواست کرنا محسن بے اثر ہے اور اللہ ہی (ایسا قادر مطلق ہے کہ اس) کے سامنے سب سر خم کئے ہوئے ہیں جتنے آسمانوں میں ہیں اور جتنے زمین میں ہیں

(یعنی) خوشی سے، اور (یعنی) مجبوری سے (خوشی سے یہ کہ با اختیار خود عبادت کرتے ہیں، اور مجبوری کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ جس مخلوق میں جو تصرف کرنا چاہتے ہیں وہ اس کی مخالفت نہیں کر سکتا، اور ان زمین والوں کے سائے بھی (سرخم کے ہیں) صبح اور شام کے وقتوں میں (یعنی) تاکو جتنا چاہیں بڑھائیں جتنا چاہیں گھٹائیں اور صبح و شام کے وقت چونکہ دراز ہونے اور گھٹنے کا زیادہ ظہور ہوتا ہے اس لئے تنفیص کی گئی ورنہ سایہ بھی بائیں معنی ہر طرح مطیع ہے) :

معارف و مسائل

آیات مذکورہ سے پہلے اللہ جل شانہ کی مخصوص صفات کمال کا سلسلہ چل رہا ہے، جو درحقیقت توحید کے دلائل ہیں، اس آیت میں فرمایا:

عَلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيرُ الْمُتَعَالِ - غیب سے مراد وہ چیزیں جو انسانی حواس سے غائب ہو، یعنی نہ آنکھوں سے اس کو دیکھا جاسکے نہ کانوں سے سنا جاسکے، نہ ناک سے سونگھا جاسکے نہ زبان سے چکھا جاسکے، نہ ہاتھوں سے چھو کر معلوم کیا جاسکے۔

شہادت، اس کے بالمقابل وہ چیزیں ہیں جن کو انسانی حواس مذکورہ کے ذریعہ معلوم کیا جاسکے، معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی کی خاص صفت کمال یہ ہے کہ وہ ہر غیب کو اسی طرح جانتا ہے جس طرح حاضر و موجود کو جانتا ہے۔

الکبیر، کے معنی بڑا اور متعال کے معنی بالا و بلند، مراد ان دونوں لفظوں سے یہ ہر وہ مخلوقات کی صفات سے بالا و بلند اور اکبر ہے، کفار و مشرکین اللہ تعالیٰ کے لئے اہمالی طور پر بڑائی اور کبریائی کا تو اقرار کرتے تھے، مگر اپنے قصور و فہم سے اللہ تعالیٰ کو بھی عا انسانیوں پر قیاس کر کے اللہ کے لئے ایسی صفات ثابت کرتے تھے جو اس کی شان بہت بعید ہیں، جیسے یہود و نصاریٰ نے اللہ کے لئے بیٹا ثابت کیا، کسی نے اللہ کے لئے انسان کی طرح جسم اور اعضا ثابت کئے، کسی نے جہت اور سمت ثابت کیا، حالانکہ وہ ان تمام حالات و صفات سے بالا و بلند اور منزہ ہے، قرآن کریم نے ان کی بیان کردہ صفات سے برات کے لئے بار بار فرمایا

شَبَّانِ اَدْنٰی عَمَّا یُشْفِقُونَ، یعنی پاک ہے اللہ ان صفات سے جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں،

پہلے جیلے عَلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ میں نیز اس سے پہلی آیت اللہ یَعْلَمُ مَا تَكْتُمُ تَحْسِبُ اَنْتَ اَنْتَی میں اللہ جل شانہ کے کمالِ علمی کا بیان تھا، اس دو سرے جیلے الْكَبِيرُ الْمُتَعَالِ میں کمال قدرت و عظمت کا ذکر ہے، کہ اس کی طاقت و قدرت انسانی تصورات کے بالاتر ہے، اس کے بعد کی آیت میں بھی اسی کمالِ علمی اور کمال قدرت کو ایک خاص انداز

سے بیان فرمایا ہے :

سَوَاءٌ مِنْكُمْ مَنْ أَسْرَ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهِ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِآتِلٍ
وَسَارِبٍ بِالنَّهَارِ۔

اَسْرَ الْقَوْلَ، اسرار سے بنا ہے جس کے معنی خفیہ کلام اور جہر کے معنی علانیہ کلام کے ہیں جو کلام انسان کسی دوسرے کو سنانے کے لئے کرتا ہے اسے جہر کہتے ہیں، اور جو خود اپنے آپ کو سنانے کے لئے کرتا ہے اس کو سر کہاجاتا ہے، مستخف کے معنی چھپنے والا، سارِب کے معنی آزادی اور بے فکری سے راستہ پر چلنے والا۔

معنی آیت کے یہ ہیں کہ اللہ جل شانہ کے علم محیط کی وجہ سے اس کے نزدیک خفیہ کلام کرنے والا اور بلند آواز سے کلام کرنے والا دونوں برابر ہیں، وہ دونوں کے کلام کو یکساں طور پر سنتا اور جانتا ہے، اسی طرح جو شخص رات کی اندھیری میں چھپا ہوا ہے، اور جو دن کے اُجالے میں کھلے راستے پر چل رہا ہے، یہ دونوں اس کے علم اور قدرت کے اعتبار سے برابر ہیں، کہ دونوں کے اندرونی اور ظاہری سب حالات اس کو یکساں معلوم ہیں، اور دونوں پر اس کی قدرت یکساں حاوی ہے، کوئی اس کے دستِ قدرت سے باہر نہیں، اسی کا مزید بیان اگلی آیت میں اس طرح ہے۔

لَهُ مُعَقِّبَاتٌ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُونَكَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ
مُعَقِّبَاتٌ، معقبہ کی جمع ہے، اس جماعت کو جو دوسری جماعت کے پیچھے متعقب
آئے اس کو مُعَقِّبَہ یا متعقبہ کہا جاتا ہے، مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ کے لفظی معنی ہیں دونوں ہاتھ کے
درمیان، مراد انسان کے سامنے کی جہت اور سمت، وَمِنْ خَلْفِهِ پیچھے کی جانب مِنْ أَمْرِ اللَّهِ
میں جو معنی بارِ سببیت کے لئے ہے، بِأَمْرِ اللَّهِ کے معنی میں آیا ہے، بعض قراتوں میں یہ لفظ بِاللَّهِ
منقول بھی ہے (روح)

معنی آیت کے یہ ہیں کہ ہر شخص خواہ اپنے کلام کو چھپاتا ہے یا ظاہر کرنا چاہتا ہے اسی
طرح اپنے چلنے پھرنے کو رات کی تاریکیوں کے ذریعہ مخفی رکھنا چاہے یا کھلے بندوں میں
پر پھرے ان سب انسانوں کے لئے اللہ کی طرف سے فرشتوں کی جماعتیں مقرر ہیں، جو اُن
کے آگے اور پیچھے سے احاطہ کرتے رہتے ہیں، جن کی خدمت اور ڈیوٹی بدلتی رہتی ہے اور
وہ یکے بعد دیگرے آتی رہتی ہیں، اُن کے ذمہ یہ کام سپرد ہے کہ وہ بحکمِ خداوندی انسانوں
کی حفاظت کریں۔

صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ فرشتوں کی دو جماعتیں حفاظت کے لئے مقرر ہیں

ایک رات کے لئے دوسری دن کے لئے اور یہ دونوں جہانیں صبح اور عصر کی نمازوں میں جمع ہوتی ہیں صبح کی نماز کے بعد رات کے محافظ رخصت ہو جاتے ہیں، دن کے محافظ کام سنبھال لیتے ہیں اور عصر کی نماز کے بعد یہ رخصت ہو جاتے ہیں، رات کے فرشتے ڈیوٹی پر آ جاتے ہیں۔
ابوداؤد کی ایک حدیث میں بروایت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کہ ہر انسان کے ساتھ کچھ حفاظت کرنے والے فرشتے مقرر ہیں جو اس کی حفاظت کرتے رہتے ہیں کہ اس کے اوپر کوئی دیوار وغیرہ نہ گر جائے، یا کسی گڑبٹ اور غار میں نہ گر جائے، یا کوئی جانور یا انسان اس کو تکلیف نہ پہنچائے، البتہ جب تک کہ کسی انسان کو بلا و مصیبت میں مبتلا کرنے کے لئے نافر ہو جاتا ہے تو محافظ فرشتے وہاں سے ہٹ جاتے ہیں۔ (روح المعانی)

ابن جریر کی ایک حدیث بروایت عثمان غنی رضی اللہ عنہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان محافظ فرشتوں کا کام صرف دنیاوی مصائب اور تکلیفوں ہی سے حفاظت نہیں بلکہ وہ انسان کو گناہوں سے بچانے اور غفلت رکھنے کی بھی کوشش کرتے ہیں، انسان کے دل میں نیکی اور خوف خدا کا داعیہ بیدار کرتے رہتے ہیں، جس کے ذریعہ وہ گناہ سے بچے، اور اگر پھر بھی وہ فرشتوں کے الہام سے غفلت برت کر گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے تو وہ اس کی دعا اور کوشش کرتے ہیں کہ جلد توبہ کر کے گناہ سے پاک ہو جائے، پھر اگر وہ کسی طرح متنبہ نہیں ہوتا تب وہ اس کے نامہ اعمال میں گناہ کا کام لکھ دیتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ محافظ فرشتے دین و دنیا دونوں کی مصیبتوں اور آفتوں سے انسان کی سوتے جاگتے حفاظت کرتے رہتے ہیں، حضرت کعب احبارؓ فرماتے ہیں کہ اگر انسان سے یہ حفاظت خداوندی کا یہ ہٹا دیا جائے تو جنات ان کی زندگی و بال کر دیں، لیکن یہ سب حفاظتی پہرے اسی وقت تک کام کرتے ہیں جب تک تقدیر الہی ان کی حفاظت کی اجازت دیتی ہے، اور جب اللہ تعالیٰ ہی کسی بندہ کو مبتلا کرنا چاہیں تو یہ حفاظتی پہرے ہٹ جاتا ہے، اسی کا بیان انکی آیت میں اس طرح کیا گیا ہے:

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا أَمْرًا بِأَنفُسِهِمْ وَإِذَا أَلَأَ اللَّهُ بِقَوْمٍ سُوءَ فَلَا مَرَدَ لَهُ وَمَا لَهُم مِّن دُونِهِ مِن دَالٍ، یعنی اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت میں رعایت کو آفت و مصیبت میں اس وقت تک تبدیل نہیں کرتے جب تک وہ قوم خود ہی اپنے اعمال و احوال کو بُرائی اور فساد میں تبدیل نہ کر لے، اور جب وہ اپنے حالات کو بُرے کش اور نافرمانی سے بدلتی ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اپنا طرز بدل دیتے ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ہی کسی کا بُرا چاہیں اور عذاب دینا چاہیں تو نہ پھر کوئی اس کو مال سکتا ہے اور نہ کوئی حکم ربانی

کے خلاف ان کی مدد کو پہنچ سکتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کی طرف سے انسانوں کی حفاظت کے لئے فرشتوں کا پہرہ لگاتا رہتا ہے۔ لیکن جب کوئی قوم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا نہ کرے اس کی اطاعت چھوڑ کر بدلتی ہو کر داری اور سرکشی ہی اختیار کر لے تو اللہ تعالیٰ بھی اپنا حفاظتی پہرہ اٹھا لیتے ہیں، پھر خدا تعالیٰ کا قہر و عذاب اُن پر آتا ہے جس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں رہتی۔

اس تشریح سے معلوم ہوا کہ آیت مذکورہ میں تخییرِ احوال سے مراد یہ ہے کہ جب کوئی قوم اطاعت اور شکر گزاری چھوڑ کر اپنے حالات میں بری تبدیلی پیدا کرے تو اللہ تعالیٰ بھی اپنا طرزِ رحمت و حفاظت کا بدل دیتے ہیں۔

اس آیت کا جو عام طور پر یہ مفہوم بیان کیا جاتا ہے کہ کسی قوم میں اچھا انقلاب اس وقت تک نہیں آتا جب تک وہ خود اس اچھے انقلاب کے لئے اپنے حالات کو درست نہ کرے، اسی مفہوم میں یہ شعر مشہور ہے ۵

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی

نہ ہو جب کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

یہ بات اگرچہ ایک حد تک صحیح ہے، مگر آیت مذکورہ کا یہ مفہوم نہیں، اور اس کا صحیح ہونا بھی ایک عام قانون کی حیثیت سے ہے کہ جو شخص خود اپنی حالت کی اصلاح کا ارادہ نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اس کی امداد و نصرت کا وعدہ نہیں، بلکہ یہ وعدہ اسی حالت میں ہر جب کوئی خود بھی اصلاح کی فکر کرے جیسا کہ آیت کریمہ **وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهَبَنَّ لَهُمْ سُبُلَنَا** سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ہدایت کے راستے جب ہی کھلتے ہیں جب خود ہدایت کی طلب موجود ہو، لیکن انعاماتِ الہیہ اس قانون کے پابند نہیں، بسا اوقات اس کے بغیر بھی عطا ہو جاتے ہیں، ۵

داد حق را قابلیت شرط نیست

بلکہ شرط قابلیت داد ہست

خود ہمارا وجود اور اس میں بیشمار نعمتیں نہ ہماری کوشش کا نتیجہ ہیں نہ ہم نے کبھی اس کے لئے دعا مانگی تھی کہ ہمیں ایسا وجود عطا کیا جائے جس کی آنکھ، ناک، کان اور سب قوی و اعضاء درست ہوں، یہ سب نعمتیں بے مانگے ہی ملی ہیں ۵

مانبودیم و تقاضا مان نبود

لطیف تو ناگفت مامی شنود

البتہ انعامات کا استحقاق اور وعدہ بغیر اپنی سعی کے حاصل نہیں ہوتا، اور کسی قوم کو بغیر سعی و عمل کے انعامات کا انتظار کرتے رہنا خود فریبی کے مرادف ہے۔
 هُوَ الَّذِي يُبْرِئُكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ
 اللہ تعالیٰ ہی کی ذات پاک ہے، جو تمہیں برق و بجلی دکھاتا ہے جو انسان کے لئے خوف بھی بن سکتی ہے کہ جس جگہ پڑ جائے سب کچھ خاک کر ڈالے اور طمع بھی ہوتی ہے کہ بجلی کی چمک کے بعد بارش آئے گی، جو انسان اور حیوانات کی زندگی کا ہمارا ہے، اور وہی ذات پاک ہے جو بڑے بڑے بھاری بادل سمندر سے مان سون بنا کر اٹھاتا ہے، اور پھر ان پانی سے بھرے ہوئے بادلوں کو فضا میں بڑی سرعت کے ساتھ کہیں سے کہیں لے جاتا ہے، اور اپنے حکم قضاء و قدر کے مطابق جس زمین پر چاہتا ہے برساتا ہے۔

وَيَسِيحُ الْمُرْسَلُونَ
 اللہ تعالیٰ کے سمندر و شکر کی اور تسبیح پڑھتے ہیں فرشتے اس کے خوف سے، رعد، عرف و حجاز میں بادل کی آواز کو کہا جاتا ہے جو بادلوں کے باہمی ٹکراؤ سے پیدا ہوتی ہے، اس کے تسبیح پڑھنے سے مراد وہی تسبیح ہے جس کے متعلق قرآن کریم کی ایک دوسری آیت میں آیا ہے کہ زمین و آسمان میں کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ کی تسبیح نہ کرتی ہو، لیکن یہ تسبیح عام لوگ سن نہیں سکتے۔ اور بعض روایات حدیث میں ہے کہ رعد اس فرشتہ کا نام ہے جو بارش برسانے پر مسلط ہو اور مامور ہے، اس معنی کے اعتبار سے تسبیح پڑھنا ظاہر ہے۔

وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَشَاءُ، صَوَاعِقُ، صاعقہ کی جمع ہے زمین پر گرے والی بجلی کو صاعقہ کہا جاتا ہے، مطلب آیت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی یہ بجلیاں زمین پر بھیجتا ہے، جن کے ذریعہ جس کو چاہتا ہے جلا دیتا ہے۔

وَهُمْ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ
 حیلہ و تدبیر کے معنی میں ہے، اور عذاب و عقاب کے معنی میں بھی، اور قدرت کے معنی میں بھی، معنی آیت کے یہ ہیں کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی توحید کے معاملہ میں باہمی جھگڑالے اور مجادلہ میں مبتلا ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ بڑی قوی تدبیر کرنے والے ہیں جس کے سامنے کسی کی چال نہیں چلتی۔

قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ قُلِ اللَّهُ قُلْ أَفَأَتَّخِذُكُمْ

پوچھ کون ہے رب آسمان اور زمین کا، کہہئے اللہ، کہ پھر کیا تم نے کیا اور کیا

مَنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءُ لَا يَمْلِكُونَ لِأَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَلَا ضَرًّا قُلْ

اس کے سوا ایسے حمایتی جو مالک نہیں اپنے بھلے اور بُرے کے، کہ

هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ أَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمَاتُ وَالنُّورُ

کیا برابر ہوتا ہے اندھا اور دیکھنے والا، یا کہیں برابر ہی اندھیرا اور

النُّورُ أَمْ جَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ خَلَقُوا كَخَلْقِهِ فَتَشَابَهُ الْخَلْقُ

اجالا کیا ٹھہراتے ہیں انھوں نے اللہ کے لئے شریک کہ انھوں نے کچھ پیدا کیا ہے جیسے پیدا کیا اللہ نے کچھ

عَلَيْهِمْ قُلِ اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ⑮

ہوگئی پیدائش ان کی نظریں کہ اللہ ہی پیدا کرنے والا ہر چیز کا اور وہی ہے آبیلا زبردست،

أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ

اتارا اس نے آسمان سے پانی پھر بہنے لگے نالے اپنی اپنی مقدار کے موافق پھر اوپر لے آیا

السَّيْلُ سَرَبًا رَبُّ أَرْبَابٍ مُّتَبَعِينَ وَنَ عَلَيْهِ فِي السَّمَاءِ

وہ تالا جھاگ پھولا ہوا، اور جس چیز کو ڈھونڈتے ہیں آگ میں واسطے

الْبَغَاءِ حُلِيَّةٍ وَأَرْبَابٍ مُّتَبَعِينَ كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ

زبور کے یا اسباب کے اس میں بھی جھاگ ہو ویسا ہی، یوں بیان کرتا ہے اللہ

الْحَقِّ وَالْبَاطِلَ وَأَمَّا الزُّبُرُ فَيَذَرُهَا حِقْلًا وَآمَّا

حق اور باطل کو، سودہ جھاگ تو جاتا رہتا ہو سوکھ کر اور وہ جو کام

مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ ⑯

آتا ہے لوگوں کے سو باقی رہتا زمین میں، اس طرح بیان کرتا ہے اللہ مثالیں

خلاصہ تفسیر

آپ (ان سے یوں) کہتے کہ آسمانوں اور زمین کا پروردگار الہی موجد و مقلد جس

خالق و حافظ (کون ہے) اور جو نگاہ میں کا جواب متعین ہے، اس نے جواب بھی آپ (جی) کی دیکھی

کہ اللہ ہے (پھر) آپ یہ کہتے کہ کیا ایسے واسطے قوی ہیں کہ انہیں بھی تم نے خدا کے سوا اور شریک

برگزار (یعنی مجبور دین) قرار دے رکھے ہیں جو (بوجہ غایت عجز کے) خود اپنی ذات کے نفع نقصان کا بھی تمسیر نہیں رکھتے (اور پھر شرک کے ابطال اور توحید کے احقاق کے بعد اہل توحید و اہل شرک اور خود توحید و شرک کے درمیان اظہارِ فرق کے لئے) آپ یہ (بھی) کہتے کہ کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہو سکتا ہے (یہ مثال ہے شرک اور توحید کی) یا آنکھوں نے اللہ کے ایسے اور روشنی برابر ہو سکتی ہے (یہ مثال ہے شرک اور توحید کی) یا آنکھوں نے اللہ کے ایسے شریک قرار دے رکھے ہیں کہ آنکھوں نے بھی (کسی چیز کو) پیدا کیا ہو جیسا خدا (ان کے عہد کے موافق بھی) پیدا کرتا ہے پھر (اس وجہ سے) ان کو (دونوں کا) پیدا کرنا ایک سا معلوم ہوا ہو (اور اس سے استدلال کیا ہو کہ جب دونوں یکساں خالق ہیں تو دونوں یکساں جبار بھی ہوں گے اس کے متعلق بھی) آپ (یہی) کہہ دیجئے کہ اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے اور وہی (اپنی ذات و صفات کمال میں) واحد ہے (اور سب مخلوقات پر) غالب ہے اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی نازل فرمایا پھر (اس پانی سے) نالے (بھر کر) اپنی مقدار کے موافق چلنے لگے (یعنی چھوٹے نالے میں تھوڑا پانی اور بڑے نالے میں زیادہ پانی) پھر وہ سیلاب (کا پانی) خس و خاشاک کو بہا لایا، جو اس (پانی) کی (سطح کے) اوپر (آ رہا) ہے (ایک کوڑا کرکٹ تو یہ ہے) اور جن چیزوں کو آگ کے اندر (رکھ کر) زیور یا اور اسباب (ظرف وغیرہ) بنانے کی غرض سے تپاتے ہیں اس میں بھی ایسا ہی میل کچیل (اوپر آ جاتا) ہے (پس ان دو مثالوں میں دو چیزیں ہیں، ایک کارآمد چیز کہ اصل پانی اور اصل مال ہے اور ایک ناکارہ چیز کہ کوڑا کرکٹ میل کچیل ہو غرض) اللہ تعالیٰ حق (یعنی توسیع و ایمان وغیرہ) اور باطل (یعنی کفر و شرک وغیرہ) کی اسی طرح کی مثال بیان کر رہا ہے (جس کی تکمیل اگلے مضمون سے ہوتی ہے) سو ان دونوں مذکورہ مثالوں میں (جو میل کچیل تھا وہ تو بھینک دیا جاتا ہے اور جو چیز لوگوں کے کارآمد ہے وہ دنیا میں (نفع رسانی کے ساتھ) رہتی ہے، اور جس طرح حق و باطل کی مثال بیان کی گئی، اللہ تعالیٰ اسی طرح (ہر ضروری مضمون میں) مثالیں بیان کیا کرتے ہیں۔

معارف و مسائل

حاصل دونوں مثالوں کا یہ ہے کہ جیسا کہ ان مثالوں میں میل کچیل برائے چندے اصل چیز کے اوپر نظر آتا ہے، لیکن انجام کار وہ بھینک دیا جاتا ہے، اور اصل چیز رہ جاتی ہے، اسی طرح باطل جو چند روز حق کے اوپر غالب نظر آئے، لیکن آخر کار باطل جو اور مخلوب

ہو جاتا ہے اور حق باقی اور ثابت رہتا ہے، کذا فی الحبلا لیں۔

لِلَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ الْحُسْنَىٰ وَالَّذِينَ لَمْ يَسْتَجِيبُوا

جنہوں نے مانا اپنے رب کا حکم ان کے واسطے بھلائی ہے، اور جنہوں نے اس کا حکم نہ مانا

لَهُ لَوْ أَنَّ لَهُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لَافْتَدَوْا

اگر ان کے پاس ہو تو کچھ کہ زمین میں ہر سارا اور اتنا ہی اس کے ساتھ اور تو سب دیویں اور

بِهِ أُولَٰئِكَ لَهُمْ سُوءُ الْحِسَابِ ۚ وَمَا وَهُمْ مِنْكُمْ مَدْرَسًا

ہلا میں ان لوگوں کے لئے ہے برا حساب، اور ٹھکانا ان کا دوزخ ہے، اور وہ بُری

الْبِهَادِ ۚ أَفَمَنْ يَعْلَمُ أَنَّمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ الْحَقُّ

آرام کی جگہ ہے، بھلا جو شخص جانتا ہے کہ جو کچھ اُترا تجھ پر تیرے رب سے حق ہے،

كَمَنْ هُوَ أَعْلَىٰ انَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولَٰئِكَ الْأَلْبَابِ ۚ ۱۹

برابر ہو سکتا ہے اس کے جو کہ اندھا ہو جیتے وہی ہیں جن کو عقل ہے، وہ لوگ جو پورا

يُوفُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَلَا يَنْقُضُونَ الْمِيثَاقَ ۚ ۲۰ وَالَّذِينَ

کرتے ہیں اللہ کے عہد کو اور نہیں توڑتے اس عہد کو، اور وہ لوگ جو

يَصِلُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ

ملاتے ہیں جسکو اللہ نے فرمایا ملانا اور ڈرتے ہیں اپنے رب سے،

وَيَخَافُونَ سُوءَ الْحِسَابِ ۚ ۲۱ وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ

اور اندیشہ رکھتے ہیں بُرے حساب کا، اور وہ لوگ جنہوں نے صبر کیا خوشی کو

وَجْهِ رَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ

اپنے رب کی اور قائم رکھی نماز اور خرچ کیا ہمارے دیئے میں سے

سِرًّا وَعَلَانِيَةً وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ أُولَٰئِكَ

پوشیدہ اور ظاہر اور کرتے ہیں بُرائی کے مقابلہ میں بھلائی ان لوگوں کے لئے

وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ

۲۱

لَهُمْ عَقَبَى الدَّارِ ۝۲۲ جَنَّتٌ عَدْنٌ يَدْخُلُونَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ

جو آخرت کا گھر ، باغ ہیں رہنے کے داخل ہوں گے ان میں اور جو نیک ہوتے

أَبَاءَهُمْ وَأَنْزَلْنَا لَهُمْ وَذُرِّيَّتَهُمْ وَالْمَلَائِكَةُ يَدْخُلُونَ

ان کے باپ دادوں میں اور جو مردوں میں اور اولاد میں اور فرشتے آئیں گے ان کے

عَلَيْهِمْ مِنْ كُلِّ بَابٍ ۝۲۳ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ

پاس ہر دروازے سے ، کہیں گے سلامتی تم پر بدلے اس کے کہ تم نے صبر کیا ،

عَقَبَى الدَّارِ ۝۲۳

سوفیاب ملا عاقبت کا گھر ۔

خلاصہ تفسیر

جن لوگوں نے اپنے رب کا کہنا مان لیا اور توحید اور اطاعت کو اختیار کر لیا

ان کے واسطے اچھا بدلہ (یعنی جنت مقرر) ہے اور جن لوگوں نے اس کا کہنا نہ مانا (اور کفر و

معصیت پر قائم رہے) ان کے پاس (قیامت کے دن) اگر تمام دنیا بھر کی چیزیں (موجود)

ہوں اور (بلکہ) اس کے ساتھ اسی کے برابر اور بھی (مال و دولت) ہو تو سب اپنی رہائی کے

لئے ڈالیں ان لوگوں کا سخت حساب ہوگا، (جس کو دوسری آیت میں حساب غیر فرمایا ہے)

اور ان کا ٹھکانہ (ہیشہ کے لئے) دوزخ ہے، اور وہ بُری قرار گاہ ہو جو شخص یہ یقین رکھتا ہو کہ

جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل ہوا ہے وہ سب حق ہے کیا ایسا شخص اس کی طرح

ہو سکتا ہے جو کہ (اس علم سے محض) اندھا ہے (یعنی کافر و مؤمن برابر نہیں) پس نصیحت

تو سمجھا رہی ہوگ قبول کرتے ہیں (اور) یہ (سمجھا رہی ہوگ ایسے ہیں کہ اللہ سے جو کچھ انھوں

نے عہد کیا ہے اس کو پورا کرتے ہیں اور اس) عہد کو توڑتے نہیں اور یہ ایسے ہیں کہ اللہ نے

جن ملاقول کے قائم رکھنے کا حکم کیا ہے ان کو قائم رکھتے ہیں اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور

نعت عذاب یا اللہ! رکھتے ہیں (جو کفار کے ساتھ خاص ہوگا، اس لئے کفر سے بچتے ہیں)

لوگ ایسے ہیں کہ اپنے رب کی سلامتی کے چوایاں دیکھ کر (دین حق پر) مضبوط رہتے ہیں

اور ان کی بات نہ کرتے ہیں، ان کو کچھ ہوس نے ان کو (دلی دہی ہے اس میں سے پیچھے ہٹیں اور

ان کے لئے ہر چیز سے بڑھ کر ہے) چاہتے ہیں اور (لوگوں کی) بدسلوکی کو اچانک

ساتھ کی جادوئے حسن سلوک سے مال دیتے ہیں یعنی کوئی ان کے ساتھ بدسلوکی کرے تو کچھ نیلا نہیں کرتے بلکہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں، اس جہان میں (یعنی آخرت میں) نیک انجام ان لوگوں کے واسطے ہے یعنی ہمیشہ رہنے کی جنتیں جن میں وہ لوگ بھی داخل ہوں گے اور ان کے ماں باپ اور بیویوں اور اولاد میں جو (جنت کے) لائق (یعنی مؤمن) ہوں گے (گو ان موصوفین کے درجہ کے نہ ہوں) وہ بھی (جنت میں انکی برکت سے اپنی کے درجوں میں) داخل ہوں گے اور فرشتے ان کے پاس ہر (سمت کے) دروازہ سے آتے ہوں گے (اور یہ کہتے ہوں گے) کہ تم (ہر آفت اور خطرہ سے) صبح سلامت رہو گے بدولت اس کے کہ تم (دین حق پر) مضبوط رہے تھے، سو اس جہان میں تمہارا انجام بہت اچھا ہے۔

معارف و مسائل

پچھلی آیتوں میں حق و باطل کو مثالوں کے ذریعہ واضح کیا گیا تھا، مذکورہ آیات میں اہل حق اور اہل باطل کی علامات و صفات اور ان کے اچھے اور بُرے اعمال اور ان کی جزا و سزا کا بیان ہے۔

پہلی آیت میں احکام ربانی کی تعمیل و اطاعت کرنے والوں کے لئے اچھے بدلے کا اور نافرمانی کرنے والوں کے لئے عذاب شدید کا ذکر ہے۔

دوسری آیت میں ان دونوں کی مثال بیٹا اور نابینا سے دی گئی ہے، اور اس کے آخر میں فرمایا اِنَّ سَآئِئَنَ كُفْرًا وَّلَا اِلٰهَ اِلَّا رَبُّكَ، یعنی اگرچہ بات واضح ہے مگر اس کو وہی سمجھ سکتے ہیں جو عقل والے ہیں، جن کی عقلیں غفلت و معصیت نے بیکار کر رکھی ہیں وہ اتنے بڑے عظیم فرق کو بھی نہیں سمجھتے۔

تیسری آیت سے ان دونوں فریق کے خاص خاص اعمال اور علامات کا بیان شروع ہوا ہے، پہلے احکام الہیہ کے ماننے والوں کی صفات یہ ذکر فرمائی ہیں: اَلَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ بَعْثًا لِلّٰهِ، یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے عہد کو پورا کرتے ہیں، مراد اس سے وہ تمام عہد و پیمان ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے لئے ہیں، جن میں سب سے پہلا وہ عہد ربوبیت ہے جو ازل میں تمام ارواح کو حاضر کر کے ایا گیا تھا، اَلَّذِيْنَ يَزَكُّوْنَ، یعنی کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ جس کے جواب میں سب نے یک زبان ہو کر کہا تھا، بَلٰی یعنی کیوں نہیں، آپ ضرور ہمارے رب ہیں، اسی طرح تمام احکام الہیہ کی اطاعت تمام فرائض کی ادائیگی اور ناجائز چیزوں سے اجتناب کی منجانب اللہ وصیت اور بندوں

کی طرف سے اس کا اقرار مختلف آیات قرآن میں مذکور ہے۔

دوسری صفت وَلَا يَنْفُضُونَ الْعَيْثَانَ ہے یعنی وہ کسی عہد و میثاق کی خلافت و رزی نہیں کرتے، اس میں وہ عہد و پیمان بھی داخل ہیں جو بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہیں جن کا ذکر ابھی پہلے جملے میں عَفَىٰ اللَّهُ کے الفاظ سے کیا گیا ہے، اور وہ عہد بھی جو امت کے لوگ اپنے نبی و رسول سے کرتے ہیں، اور وہ معاہدے بھی جو ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ کرتا ہے۔ ابو داؤد نے بروایت عوف ابن مالک یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے اس پر عہد اور بیعت لی کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے اور پانچ وقت نماز کو پابندی سے ادا کریں گے اور اپنے امراء کی اطاعت کریں گے، اور کسی انسان سے کسی چیز کا سوال نہ کریں گے۔

جو لوگ اس بیعت میں شریک تھے ان کا حال پابندی عہد میں یہ تھا کہ اگر گھوڑے پر سواری کے وقت ان کے ہاتھ سے کوڑا اگر جاتا تو کسی انسان سے نہ کہتے کہ یہ کوڑا اٹھا دو، بلکہ خود سواری سے اتر کر اٹھاتے تھے۔

یہ صحابہ کرامؓ کے دلوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عظمت اور جذبہ اطاعت کا اثر تھا، ورنہ یہ ظاہر تھا کہ اس طرح کے سوال سے منع فرمانا مقصود نہ تھا، جیسے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ ایک مرتبہ مسجد میں داخل ہو رہے تھے، دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے ہیں اور اتفاق سے ان کے دخول مسجد کے وقت آپؐ کی زبان مبارک سے یہ کلمہ نکلا کہ بیٹھ جاؤ۔ عبداللہ بن مسعود جانتے تھے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ سڑک پر یا بے موقع کسی جگہ کوئی ہو تو وہیں بیٹھ جائے، مگر جذبہ اطاعت نے ان کو آگے قدم بڑھانے نہ دیا، دروازہ سے باہر ہی جہاں یہ آواز کان میں پڑی اُسی جگہ بیٹھ گئے۔

تیسری صفت اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار بندوں کی یہ بتلائی گئی وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا آمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوَصَّلَ، یعنی یہ لوگ ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جن تعلقات کے قائم رکھنے کا حکم دیا ہے ان کو قائم رکھتے ہیں، اس کی مشہور تفسیر یہ ہے کہ رشتہ داری کے تعلقات قائم رکھنے اور ان کے تقاضوں پر عمل کرنے کا اللہ تعالیٰ نے جو حکم دیا ہے یہ لوگ ان تعلقات کو قائم رکھتے ہیں، بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ ایمان کے ساتھ عمل صالح کو یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر ایمان کے ساتھ پچھلے انبیاء اور ان کی کتابوں پر ایمان کو ملا دیتے ہیں۔

چوتھی صفت یہ بیان فرمائی وَيَتَجَشَّوْنَ رَبَّهُمْ، یعنی یہ لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں

یہاں لفظ خوف کے بجائے خشیت کا لفظ استعمال کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ان کا خوف اس طرح کا نہیں جیسے درندہ جانور یا موذی انسان سے بطعاً خوف ہوا کرتا ہے، بلکہ ایسا خوف ہے جیسے اولاد کو ماں باپ کا، شاگرد کو استاد کا خوف عادت ہوتا ہے کہ اس کا منشا کسی ایذا رسانی کا خوف نہیں ہوتا، بلکہ عظمت و محبت کی وجہ سے خوف اس کا ہوتا ہے کہ کہیں ہمارا کوئی قول و فعل اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسند اور مکروہ نہ ہو جائے، اسی لئے مقامِ مدرّس میں یہاں کہیں اللہ تعالیٰ کے خوف کا ذکر ہے عموماً وہاں یہی لفظ خشیت کا استعمال ہوا ہے، کیونکہ خشیت اسی خوف کو کہا جاتا ہے جو عظمت و محبت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، اسی لئے اگلے جملہ میں یہاں حساب کی سختی کا خوف بیان کیا گیا ہے وہاں خشیت کا لفظ نہیں بلکہ خوف ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے، ارشاد فرمایا:

وَيَخَافُونَ سُوءَ الْحِسَابِ، یعنی یہ لوگ بُرے حساب سے ڈرتے ہیں۔ " بُرے حساب کے مراد حساب میں سختی اور تجزیسی ہے، حضرت صدیقہ عائشہؓ نے فرمایا کہ انسان کی نجات تو رحمتِ الہی سے ہو سکتی ہے، کہ حسابِ اعمال کے وقت اجمال اور عفو و درگزر سے کام لیا جائے ورنہ جس شخص سے بھی پورا پورا ذرہ ذرہ کا حساب لے لیا جائے اس کا عذاب بچنا ممکن نہیں، کیونکہ ایسا کون ہے جس سے کوئی گناہ و خطا کبھی سرزد نہ ہوا ہو، یہ حساب کی سختی کا خوف نیک و فرمانبردار لوگوں کی پانچویں صفت ہے۔

پہلی صفت یہ بیان فرمائی: وَكَانَ يَتَذَكَّرُ أَلْفًا مَرَّةً يَوْمًا، یعنی وہ لوگ جو خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے صبر کرتے ہیں۔

صبر کے معنی عربی زبان میں اس مفہوم سے بہت عام ہیں جو اردو زبان میں بجا جاتا ہے، کہ کسی مصیبت اور تکلیف پر صبر کریں، کیونکہ اس کے اصلی معنی خلافِ طبع چیزوں سے پریشان نہ ہونا، بلکہ ثابت قدمی کے ساتھ اپنے کام پر لگے رہنا ہے، اسی لئے اس کی دو قسمیں بیان کی جاتی ہیں، ایک صبر علی الطاعة، یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل پر ثابت قدم رہنا، دوسرے صبر عن المعصية یعنی گناہوں سے بچنے پر ثابت قدم رہنا۔

صبر کے ساتھ اِتِّخَاءَ وَجْهِكَ لِلْكَرْبِ، یعنی یہ بتلایا کہ مطلقاً صبر کوئی فضیلت کی چیز نہیں، کیونکہ کبھی تو بے صبری انسان کو بھی انجام کار ایک مدت کے بعد صبر آ ہی جاتا ہے، جو صبر غیر اختیارسی ہو اس کی کوئی خاص فضیلت نہیں، نہ ایسی غیبی اختیاری کیفیت کا اللہ تعالیٰ کسی کو حکم دیتے ہیں، اسی لئے حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الصَّبْرُ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْأُولَى، یعنی اصلی اور پہلا صبر تو وہی ہے جو ابتداءِ صدمہ کے

وقت اختیار کر لیا جائے، ورنہ بعد میں تو کہیں نہ کہیں جہی طور پر انسان کو صبر آ ہی جاتا ہے، بلکہ قبل مدت دشنا وہ صبر ہے کہ اپنے اختیارات خلاف طبع اور کو برداشت کرے، خواہ وہ نفس و واجبات کی ادائیگی ہو یا محرمات و مکروہات سے بچنا ہو۔

اسی لئے اگر کوئی شخص چوری کی نیت سے کسی مکان میں داخل ہو گیا مگر وہاں چوری کا موقع نہ ملا صبر کر کے واپس آ گیا، تو یہ غیر خستہ کاری صبر کوئی طرح و ثواب کی چیز نہیں، ثواب جب ہے کہ گناہ سے بچنا خدا کے خوف اور اس کی رضا جوئی کے سبب سے ہو۔

ساتویں صفت أَقَامُوا الصَّلَاةَ إِذَا قَامَتِ صَلَاةُ کے معنی نماز کو اس کے پورے آداب و شرائط اور خشوع کے ساتھ ادا کرنا ہے، محض نماز پڑھنا نہیں، اسی لئے قرآن کیم میں عموماً نماز کا حکم اقامتِ صلوٰۃ کے الفاظ سے دیا گیا ہے۔

آٹھویں صفت وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ رِيبًا اور عَلَانِيَةً ہے، یعنی وہ لوگ جو اللہ کے دیئے ہوئے رزق میں کچھ اللہ کے نام پر بھی خرچ کرتے ہیں، اس میں اشارہ کیا گیا کہ تم سے جس مال زکوٰۃ وغیرہ کا مطالبہ اللہ تعالیٰ کرتا ہے وہ کچھ تم سے نہیں مانگتا بلکہ اپنے ہی دیئے ہوئے رزق کا کچھ حصہ وہ بھی صرف دھانی فی صد جیسی قلیل و حقہ مقدار میں آپٹ مانگا جاتا ہے جس کے دینے میں آپ کو طبعاً کوئی پس و پیش نہ ہونی چاہئے۔

مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے ساتھ بِرَّاءَ عَلَانِيَةً کی قید سے معلوم ہوا کہ ستر خیرات میں ہر جگہ اخفاء ہی مسنون نہیں بلکہ بعض اوقات اس کا اظہار بھی درست و مستحب ہوتا ہے، اسی لئے علماء نے ذرا یا کہ زکوٰۃ اور صدقات واجبہ کا اعلان و اظہار ہی افضل و بہتر ہو اس کا اخفاء مناسب نہیں تاکہ دوسرے لوگوں کو بھی تلقین اور ترغیب ہو، البتہ نقل صدقات کا خفیہ دینا افضل و بہتر ہے، جن احادیث میں غنیہ دینے کی فضیلت آئی ہے وہ نفلی صدقات ہی کے متعلق ہے۔

نویں صفت يَكْرَهُنَّ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةِ، یعنی یہ لوگ بُرائی کو بھلائی سے دشمنی کو دوستی سے، ظلم کو عفو و درگزر سے دفع کرتے ہیں، بُرائی کے جواب میں بُرائی سے پیش نہیں آتے، اور بعض حضرات نے اس کے یہ معنی بیان فرمائے ہیں کہ گناہ کو نیکی سے دفع کرتے ہیں، یعنی اگر کسی وقت کوئی خطا و گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو اس کے بعد طاعت و عبادت کی کثرت اور اہتمام اتنا کرتے ہیں کہ اس سے پچھلا گناہ مٹ ہو جاتا ہے، حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو وصیت فرمائی کہ بدی کے بعد نیکی کر لو، تو وہ بدی کو مٹا دے گی، مراد یہ ہے کہ جب اس بدی اور گناہ پر نادم ہو کر توبہ

کر لی اور اس کے پیچھے نیک عمل کیا تو یہ نیک عمل پچھلے گناہ کو مٹا دے گا، بغیر ذمہ امت اور توبہ کے گناہ کے بعد کوئی نیک عمل کر لینا گناہ کی معافی کے لئے کافی نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ کے فرمانبرداروں کی یہ دو صفتیں بیان کرنے کے بعد ان کی جزا یہ بیان فرمائی اُولَئِكَ لَهُمْ عَقَبَى الدَّارِ، دار سے مراد دارِ آخرت ہے، یعنی اپنی لوگوں کے لئے ہے دارِ آخرت کی فلاح، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس جگہ دار سے مراد دارِ دنیا ہے، اور مراد یہ ہے کہ نیک لوگوں کو اگرچہ اس دنیا میں تکلیفیں بھی پیش آتی ہیں مگر انجام کار دنیا میں بھی فلاح و کامیابی اپنی کا حصہ ہوتا ہے، آگے اس عَقَبَى الدَّارِ یعنی دارِ آخرت کی فلاح کا بیان ہے، کہ وہ جَنَّتُ عَدْنٍ ہوں گی جن میں وہ داخل ہوں گے، عَدْن کے معنی قیام و قرار کے ہیں، مراد یہ ہے کہ ان جنتوں سے کسی وقت ان کو نکالنا نہ جائے گا، بلکہ ان میں ان کا قرار و قیام دائمی ہوگا، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ عَدْن وسط جنت کا نام ہے جو جنت کے مقامات میں بھی اعلیٰ مقام ہے۔

اس کے بعد ان حضرات کے لئے ایک اور انعام یہ ذکر فرمایا گیا کہ یہ انعام ربانی صرف ان لوگوں کی ذات تک محدود نہیں ہوگا بلکہ ان کے آباء و اجداد اور ان کی بیبیوں اور اولاد کو بھی اس میں حصہ ملے گا، شرط یہ ہے کہ وہ صالح ہوں جس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ مسلمان ہوں، اور مراد یہ ہے کہ ان لوگوں کے آباء و اجداد اور ان کی بیبیوں کا اپنا عمل اگرچہ اس مقام پر پہنچنے کے قابل نہ تھا، مگر اللہ کے مقبول بندوں کی رعایت اور برکت سے ان کو بھی اسی مقام بلند پر پہنچا دیا جائے گا۔

اس کے بعد دارِ آخرت میں ان کی فلاح و کامیابی کا مزید بیان یہ ہے کہ درشتے ہر دروازہ سے ان کو سلام کرتے ہوئے داخل ہوتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ تمہارا صبر کی وجہ سے تمام تکلیفوں سے سلامتی ہے، اور یہ کیسا اچھا انجام ہے دارِ آخرت کا یہ

وَالَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ

اور جو لوگ توڑتے ہیں عہد اللہ کا مضبوط کرنے کے بعد اور قطع کرتے ہیں

مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيَفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ ۚ

اس چیز کو جس کو فرمایا اللہ نے جوڑنا اور فساد اٹھاتے ہیں ملک میں ایسے لوگ

أُولَئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ ۚ (۲۵) اللہ بے بسط

ان کے واسطے ہے لعنت اور ان کے لئے ہو بُرا گھر، اللہ کشادہ کرتا ہے

الرِّشْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ وَفِرْحُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَا

روزی جسکو چاہے اور تنگ کرتا ہے، اور فریفتہ ہیں دنیا کی زندگی پر اور دنیا

الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا مَتَاعٌ ۖ ۲۶ وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا

کی زندگی کچھ نہیں آخرت کے آگے مگر متاع حقیر، اور کہتے ہیں کافروں

لَوْلَا أَنْزَلَ عَلَيْنَا آيَةً مِنْ رَبِّهِ قُلْ إِنْ اللَّهُ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ

کیوں نہ اُتری اس پر کوئی نشانی اس کے رب کے کہنے اللہ گمراہ کرتا ہو جسکو چاہے،

وَيَهْدِي إِلَىٰ آلِهِ مَنْ أَنَابَ ۖ ۲۷ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ

اور راہ دکھلاتا ہو اپنی طرف اس کو جو رجوع ہوا، وہ لوگ جو ایمان لائے اور چین پاتے ہیں

قُلُوبُهُمْ بِذِكْرِ اللَّهِ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ ۖ ۲۸

ان کے دل اللہ کی یاد سے، ستا ہر اللہ کی یاد ہی سے چین پاتے ہیں دل،

الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ طُوبَىٰ لَهُمْ وَحَسَنُ مَا أَجْرُ ۲۹

جو لوگ ایمان لائے اور کام کئے اچھے، خوش حالی ہے ان کے واسطے اور اچھا ٹھکانا

كَذَٰلِكَ أَمَرَ سَلْمَانَ فِي أُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَا أُمَمٌ لَبَّسُوا

اسی طرح تجھ کو بھیجا ہم نے ایک امت میں کہ گذر چکی ہیں اس سے پہلے بہت امتیں تاکہ سنا دے تو

عَلَيْهِمُ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُونَ بِالرَّحْمَنِ ط

ان کو جو حکم بھیجا ہم نے تیری طرف اور وہ منکر ہوتے ہیں رحمن سے،

قُلْ هُوَ رَبِّي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ مَتَابُ ۖ ۳۰

تو کہہ وہی رب میرا ہے کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہو اور اسی کی طرف آتا ہوں آج کر کے

خلاصہ تفسیر

اور جو لوگ خدا تعالیٰ کے معاہدہ وں کو ان کی پختگی کے بعد توڑتے ہیں، اور خدا تعالیٰ نے

جن علاقوں کے قائم رکھنے کا حکم فرمایا ہے ان کو قطع کرتے ہیں اور دنیا میں فساد کرتے ہیں ایسے

لوگوں پر لعنت ہوگی اور ان کے لئے اس جہان میں خرابی ہوگی یعنی ظاہری دولت و ثروت

کو دیکھ کر یہ دھوکہ نہ کھانا چاہئے کہ یہ لوگ مورد رحمت ہیں کیونکہ رزق کی تو یہ کیفیت ہے کہ اللہ جس کو چاہے زیادہ رزق دیتا ہے، (اور جس کے لئے چاہتا ہے) تنگی کر دیتا ہے (رحمت و غضب کا یہ معیار نہیں) اور یہ (کفار) لوگ دنیوی زندگی پر (اور اسکے عیش و عشرت پر) اتراتے ہیں اور (ان کا اترنا بالکل فضول اور غلطی ہے، کیونکہ) یہ دنیوی زندگی (اور اس کی عیش و عشرت) آخرت کے مقابلہ میں بجز ایک شاعِ قلیل کے اور کچھ بھی نہیں، اور یہ کافر لوگ (آپ کی نبوت میں طعن و اعتراض کرنے کے لئے یوں) کہتے ہیں کہ ان (پیغمبر) پر کوئی معجزہ (جس کے فرمائشی معجزہ میں سے) ان کے رب کی طرف سے کیونکہ نہیں نازل کیا گیا، آپ کہہ دیجئے کہ واقعی رہنمائی ان یہودہ فرمائشوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے گمراہ کر دیتے ہیں (وہ معلوم ہونے کی ظاہر ہے کہ باوجود معجزات کا یہ کہ جن میں سب سے اعظم قرآن ہے) پھر فضول باتیں کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قسمت ہی میں گمراہی لکھی ہے، اور اس طرح ان معاندین کو قرآن جو اعظم معجزات ہے ہدایت کے لئے کافی نہ ہوا اور گمراہی ان کو نصیب ہوئی اسی طرح) جو شخص ان کی طرف متوجہ ہوتا ہے (اور طریق حق کا طالب ہوتا ہے جس کا مصداق آگے آتا ہے اَلَّذِينَ آمَنُوا أَتَقْنُونَ الْإِيمَانَ) اس کو اپنی طرف درستی دینے کے لئے) ہدایت کر دیتے ہیں (اور گمراہی سے بچا لیتے ہیں) مراد اس سے وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور اللہ کے ذکر سے (جس کی بڑی فرد قرآن ہے) ان کے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے (جس کی بڑی فرد ایمان ہے، یعنی وہ قرآن کے اعجاز کو دلالت علی النبوة کے لئے کافی سمجھتے ہیں اور وہ اسی تباہی فرمائش نہیں کرتے پھر خدا کی یاد اور طاعت میں ان کو ایسی رغبت ہوتی ہے کہ متاعِ حیات دنیا سے مثل کفار کے ان کو رغبت اور فرحت نہیں ہوتی اور) خوب سمجھ لو کہ اللہ کے ذکر (کی ایسی ہی خاصیت ہو کہ اس) سے دل کو اطمینان ہو جاتا ہے (یعنی جس مرتبے کا ذکر ہو اسی مرتبہ کا اطمینان، چنانچہ قرآن سے ایمان اور اعمال صالحہ سے طاعت کا شدت تعلق اور توجہ الی اللہ مستر ہوتا ہے، غرض) جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے (جن کا ذکر اوپر ہوا) ان کے لئے (دنیا میں) خوش حالی اور (آخرت میں) نیک انجامی ہے (جس کو دوسری آیت میں فَالْحَيَاتِ، حَيَاةٌ طَيِّبَةٌ وَنَجْرُ يَتْمُومُ آخِرُ يَتْمُومُ الْعِلْمُ سے تعبیر فرمایا اسی طرح) ہم نے آپ کو ایک ایسی امت میں رسول بنا کر بھیجا ہے کہ اس (امت) سے پہلے اور بہت سی امتیں گزر چکی ہیں اور آپ کو ان کی طرف اس لئے رسول بنا کر بھیجا ہے (تاکہ آپ ان کو وہ کتاب پڑھ کر سنادیں جو ہم نے آپ کے پاس وحی کے ذریعہ بھیجی ہے اور) ان کو چاہئے تھا کہ اس نعمتِ عظمیٰ کی قدر کرتے اور اس کتاب پر کہ وہ معجزہ بھی ہے ایمان لے آتے مگر) وہ لوگ ایسے بڑے رحمت والے کی ناسپاسی کرتے ہیں (اور قرآن پر ایمان نہیں لاتے) آپ فرمادیجئے کہ (تھانے ایمان نہ لانے سے میرا کوئی ضرر

نہیں کیونکہ تم زیادہ سے زیادہ میرے ساتھ مخالفت کرو گے، سو اس سے مجھ کو اس لئے اندیشہ نہیں کہ وہ میرا ربی (اور نگہبان ہے) اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں رہیں لامحالہ وہ کامل الصفا ہوگا اور حفاظت کے لئے کافی ہوگا اس لئے میں نے اسی پر بھروسہ کر لیا اور اسی کے پاس مجھ کو جانا ہے (خلاصہ یہ کہ میری حفاظت کے لئے تو اللہ تعالیٰ کافی ہے تم مخالفت کر کے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے البتہ تمہارا ہی ضرر ہے)۔

معارف و مسائل

شروع رکوع میں نکل انسانوں کی دو قسم کر کے بتلایا گیا تھا کہ ان میں کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہیں کچھ نافرمان، پھر فرمانبردار بندوں کی چند صفات و علامات بیان کی گئیں، اور آخرت میں ان کے لئے بہترین جزاء کا ذکر کیا گیا۔

اب دوسری قسم کے لوگوں کی علامات و صفات اور ان کی سزا کا بیان ان آیات میں ہے، اس میں ان سرکش اور نافرمان بندوں کی ایک خصلت تو یہ بتلائی گئی:

الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ، یعنی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے

عہد کو پختہ کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے عہد میں وہ عہد بھی داخل ہے جو ازل میں حق تعالیٰ کی ربوبیت اور وحدانیت کے متعلق تمام پیدا ہونے والی روحوں سے لیا گیا تھا جس کو کفار و مشرکین نے دنیا میں آکر توڑ ڈالا اور اللہ کے ساتھ سینکڑوں ہزاروں رب اور موجود بنا بیٹھے۔

اور وہ تمام عہد بھی اس میں داخل ہیں جن کی پابندی عہد لا الہ الا اللہ کے ضمن میں انسان پر لازم ہو جاتی ہے، کیونکہ کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ دراصل ایک عظیم معاہدہ کا عنوان ہے جس کے تحت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے تمام احکام کی پابندی اور جن چیزوں سے روکا گیا ہے ان سے پرہیز کا عہد بھی آجاتا ہے، اس لئے جب کوئی انسان کسی حکم خداوندی یا حکم رسول سے انحراف کرتا ہے تو اس عہد ایمانی کی عہد شکنی کرتا ہے۔

دوسری خصلت ان نافرمان بندوں کی یہ بتلائی گئی:

وَيَقْطَعُونَ مَا آَمَرَهُ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوَصَّلَ، یعنی یہ لوگ ان تعلقات کو قطع کر دیتے

ہیں جن کو قائم رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا، ان میں انسان کا وہ تعلق بھی شامل ہے جو اس کو اللہ جل شانہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، اس تعلق کا قطع کرنا یہی ہے کہ ان کے احکام کی خلاف ورزی کی جائے، اور رشتہ داری کے وہ تعلقات بھی اس میں شامل ہیں

جن کو قائم رکھنے اور ان کے حقوق ادا کرنے کی قرآن کریم میں جا بجا ہدایت کی گئی ہے۔
 اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے والے ان حقوق و تعلقات کو بھی توڑ ڈالتے ہیں مثلاً ماں
 باپ، بھائی بہن، پڑوسی، اور دوسرے متعلقین کے جو حقوق اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ نے
 انسان پر عائد کئے ہیں، یہ لوگ ان کو ادا نہیں کرتے۔
 تیسری خصلت یہ بتلائی ہے:

وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ، یعنی یہ لوگ زمین میں فساد مچاتے ہیں، اور یہ تیسری خصلت
 درحقیقت پہلی ہی دو خصلتوں کا نتیجہ ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ اور بندوں کے عہد کی پرواہ نہیں کرتے
 اور کسی کے حقوق و تعلقات کی رعایت نہیں کرتے ظاہر ہے کہ ان کے اعمال و افعال دوسرے
 لوگوں کے لئے مضرت اور ایذا کا سبب بنیں گے، لڑائی جھگڑے، قتل و قتال کے بازار گرم
 ہوں گے یہی زمین کا سب سے بڑا فساد ہے۔

سرکش اور نافرمان بندوں کی یہ تین خصلتیں بتلانے کے بعد ان کی سزا یہ بتلائی گئی ہے:
 أُولَٰئِكَ لَهُمُ الْعَذَابُ الَّذِي لَمْ يَرْوُوا إِلَيْهِ، یعنی ان کے لئے لعنت ہے اور بڑا ٹھکانا ہے،
 لعنت کے معنی اللہ کی رحمت سے دور اور محروم ہونے کے ہیں، اور ظاہر ہے کہ اس کی رحمت سے دور
 ہونا سب عذابوں سے بڑا عذاب اور ساری مصیبتوں سے بڑی مصیبت ہے۔

مذکورہ آیات میں انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کے متعلق خاص
احکام و ہدایات احکام و ہدایات آئی ہیں، بعض صراحۃً اور بعض اشارۃً مثلاً:

(۱) الَّذِينَ يُؤْفُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَلَا يَقْضُونَ الْمِثْقَاتِ، سے ثابت ہوا کہ جو معاہدہ
 کسی سے کر لیا جائے اس کی پابندی فرض اور اس کی خلاف ورزی حرام ہے، خواہ وہ معاہدہ اللہ
 اور رسولؐ سے ہو جیسے عہد ایمانی یا مخلوقات میں کسی سے ہو، خواہ مسلمان سے یا کافر سے عہد شکنی
 بہر حال حرام ہے۔

(۲) وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا آمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يَوْصَلَ سے معلوم ہوا کہ اسلام کی
 تعلیم راہبانہ انداز سے ترک تعلقات کی نہیں بلکہ ضروری تعلقات کو قائم رکھنے اور ان کے حقوق ادا
 کرنے کو ضروری قرار دیا گیا ہے، ماں باپ کے حقوق، اولاد، بیوی اور بہن بھائیوں کے حقوق،
 دوسرے رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے حقوق اللہ تعالیٰ نے ہر انسان پر لازم کئے ہیں، ان کو
 نظر انداز کر کے نفل عبادت میں یا کسی دینی خدمت میں لگ جانا بھی جائز نہیں، دوسرے کاموں میں
 لگ کر ان کو بھلا دینا تو کیسے جائز ہوتا۔

صلہ رحمی اور رشتہ داری کے تعلقات کو قائم رکھنے اور ان کی خبر گیری اور ادائے حقوق

کی تاکید قرآن کریم کی بے شمار آیات میں مذکور ہے۔

اور بخاری و مسلم کی حدیث میں بروایت انسؓ مذکور ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے رزق میں وسعت اور کاموں میں برکت عطا فرمادے تو اس کو چاہئے کہ صلہ رحمی کرے، صلہ رحمی کے معنی یہی ہیں کہ جن سے رشتہ داری کے خصوصی تعلقات ہیں ان کی خبر گیری اور بقدر گنجائش امداد و اعانت کرے۔

اور حضرت ابوالیوب انصاریؓ فرماتے ہیں کہ ایک گاؤں والا اعرابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان پر حاضر ہوا، اور سوال کیا کہ مجھے یہ بتلا دیجئے کہ وہ عمل کونسا ہے جو مجھے جنت سے قریب اور جہنم سے دور کر دے، آپؐ نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، اور نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور صلہ رحمی کرو (بخاری)

اور صحیح بخاری میں بروایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صلہ رحمی اتنی بات کا نام نہیں کہ تم دوسرے عزیز کے احسان کا بدلہ ادا کرو اور اس نے تمہارے ساتھ کوئی احسان کیا ہے تو تم اس پر احسان کرو، بلکہ اصل صلہ رحمی یہ ہے کہ تمہارا رشتہ دار عزیز تمہارے حقوق میں کوتاہی کرے، تم سے تعلق نہ رکھے تم پھر بھی محض اللہ کے لئے اس سے تعلق کو قائم رکھو، اور اس پر احسان کرو۔

رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے اور ان کے تعلقات کو نبھانے ہی کے خیال سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے نسب ناموں کو محفوظ رکھو، جن کے ذریعہ تمہیں اپنی رشتہ داریاں محفوظ رہ سکیں، اور تم ان کے حقوق ادا کر سکو، پھر ارشاد فرمایا کہ صلہ رحمی کے فوائد یہ ہیں کہ اس سے آپس میں محبت پیدا ہوتی ہے اور مال میں برکت اور زیادتی ہوتی ہے، اور عمر میں برکت ہوتی ہے (یہ حدیث ترمذی نے روایت کی ہے)۔

اور صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بڑی صلہ رحمی یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ کے انتقال کے بعد ان کے دوستوں سے وہی تعلقات قائم رکھے جو باپ کے سامنے تھے۔

(۳) وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ، سے معلوم ہوا کہ صبر کے جو فضائل قرآن و حدیث میں آئے ہیں کہ صبر کرنے والے کو اللہ جل شانہ کی معیت اور نصرت و امداد حاصل ہوتی ہے اور بے حساب اجر و ثواب ملتا ہے وہ سب اسی وقت ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے صبر اختیار کیا ہو، ورنہ یوں تو ہر شخص کو کبھی نہ کبھی صبر آ ہی جاتا ہے۔

صبر کے اصلی معنی اپنے نفس کو قابو میں رکھنے اور ثابت قدم رہنے کے ہیں جس کی مختلف

صورتیں ہیں ایک، سببیت اور تکلیف پر صبر کہ گہرا ہے نہیں اور مایوس نہ ہو اللہ تعالیٰ پر نظر رکھے اور امیدوار رہے، دوسرے طاعت پر صبر کہ احکام الہیہ کی پابندی اگرچہ نفس کو دشوار معلوم ہو اس پر قائم رہے، تیسرے معصیت اور برائیوں سے صبر کہ اگرچہ نفس کا تقاضا بُرائی کی طرف جلیڑ کا ہو لیکن خدا تعالیٰ کے خوف سے اس طرف نہ چلے۔

(۴) وَالنَّفَقَاتُ امْتَارُنَا فَنُكْفِيَنَّ سِرًّا وَاعْلَانِيَةً سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا خفیہ اور علانیہ دونوں طرح سے درست ہے، البتہ افضل یہ ہے کہ صدقات واجبہ زکوٰۃ، صدقہ لفظ وغیرہ کو علانیہ ادا کرے تاکہ دوسرے مسلمانوں کو بھی ادائیگی کی ترغیب ہو اور صدقات نافلہ جو واجب نہیں ان کو خفیہ ادا کرے تاکہ ریاکاری اور نام و نمود کے شبہ سے نجات ہو۔

(۵) يَذَرُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ سے معلوم ہوا کہ ہر بُرائی کو دفع کرنا جو عقلی اور لاجبی تقاضا ہے اسلام میں اس کا طریقہ یہ نہیں، کہ بُرائی کا جواب بُرائی سے دے کر دفع کیا جائے، بلکہ اسلامی تعلیم یہ ہے کہ بُرائی کو بھلائی کے ذریعہ دفع کرو، جس نے تم پر ظلم کیا ہے تم اس کے ساتھ انصاف کا معاملہ کرو، جس نے تمہارے تعلق کا حق ادا نہیں کیا تم اس کا حق ادا کرو جس نے تم پر غصہ کیا تم اس کا جواب حلم و بردباری سے دو، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ دشمن بھی دوست ہو جائے گا اور شریک بھی آپ کے سامنے نیک بن جائے گا۔

اور اس جملہ کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ گناہ کا بدلہ طاعت سے ادا کرو کہ اگر کبھی کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو فوراً توبہ کرو اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی عبادت میں لگ جاؤ، تو اس سے تمہارا پچھلا گناہ بھی معاف ہو جائے گا۔

حضرت ابوذر غفاریؓ نے فرمایا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب تم سے کوئی بُرائی یا گناہ سرزد ہو جائے تو اس کے بعد تم نیک عمل کر لو، اسی سے وہ گناہ مٹ جائے گا، (رواہ احمد بسند صحیح، منہجی) اس نیک عمل کی شرط یہ ہے کہ پچھلے گناہ سے توبہ کر کے نیک عمل اختیار کرے۔

جَنَّاتٌ عَدْنٌ فِيهَا مَأْوٰی صَالِحٍ مِّنْ اٰبَائِهِمْ وَاَزْوَاجُهُمْ وَذُرِّيَّاتُهُمْ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے مقبول اور نیک بندوں کو خود بھی جنت میں مقام ملے گا اور ان کی رعایت سے ان کے ماں باپ، بیوی اور اولاد کو بھی، بشرط یہ ہو کہ وہ لوگ صالح یعنی متوہن اور مسلمان ہوں کافر نہ ہوں، اگرچہ اعمال صالحہ میں اپنے اس بزرگ کے برابر نہ ہوں، مگر اللہ تعالیٰ اس بزرگ کی برکت سے ان لوگوں کو بھی اسی مقام جنت میں پہنچا دیں گے جو اس بزرگ کا مقام ہو جیسے دوسری آیت میں مذکور ہے، اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ یعنی اپنے نیک بندوں کی ذریت

اور اولاد کو بھی انہی کے ساتھ کر دیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بزرگوں کے ساتھ تعلق خواہ نسب اور قرابت کا ہو یا دوستی کا وہ آخرت میں بھی بشرط ایمان نفع دے گا۔

(۶) سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ سے معلوم ہوا کہ آخرت کی نجات اور درجاتِ عالیہ سب اس کا نتیجہ ہوتے ہیں کہ انسان دنیا میں صبر سے کام لے، اللہ تعالیٰ اور بندوں کے حقوق کو ادا کرنے اور اس کی نافرمانیوں سے بچنے پر اپنے نفس کو بہور کرتا ہے۔ اُولَٰئِكَ لَهُمُ اللَّحْتَةُ وَلَهُمُ سُورَةُ الدَّارِ، جس طرح پہلی آیات میں اللہ کے فرمانبردار بندوں کی جزا یہ ذکر فرمائی ہے کہ ان کا مقام جنت میں ہوگا، فرشتے ان کو سلام کریں گے، اور بتلائیں گے کہ یہ جنت کی دائمی نعمتیں سب بہتارے صبر و ثبات اور فرمانبرداری کا نتیجہ ہیں، اسی طرح اس آیت میں نافرمان سرکش لوگوں کا انجام بدیہ بتلایا ہے کہ ان پر اللہ کی لعنت ہے، یعنی وہ رحمت سے دور ہیں، اور ان کے لئے جہنم کا ٹھکانا مقرر ہے، اس سے یہ معلوم ہوا کہ عہدِ شکنی اور رشتہ داروں و عزیزوں سے قطع رحمی لعنت اور جہنم کا سبب ہے،

نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْهُ

وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ أَوْ قُطِعَتْ بِهِ الْآرْضُ

اور اگر کوئی قرآن ہوا ہوتا کہ چلیں اس سے پہاڑ یا کھڑے ہوئے اس سے زمین

أَوْ كَلَّمَ بِهِ الْمَوْفَىٰ بِبَلِّ اللَّهِ إِلَّا مَرْجِعِي عَا أَفَلَمْ يَأْيُسِ الَّذِينَ

بابولیں اس سے بڑے تو کیا ہوتا ، بلکہ سب کام تو اللہ کے ہاتھ میں ہیں ، سو کیا خاطر جمع نہیں ایمان

۱۱. اٰمَنُوْا اَنْ تَوْيَّشَآءُ اللّٰهُ لَهْدٰى النَّاسَ جَمِیْعًا وَلَا يَزَالُ الَّذِیْنَ

والوں کو اس پر کہ اگر چاہے اللہ تو راہ پر لائے سب لوگوں کو اور برابر پہنچتا رہے گا منکروں

كَفَرُوا لِيُصِيبَهُمْ رِيَاضَتُهُمْ أَقَارِعُهُمْ أَوْ تُحِلُّ قَرِيبًا مِّنْ دَارِهِمْ

کو ان کے کروت پر صدمہ یا اُترے گا اُن کے گھر سے نزدیک جب تک

حَتَّى يَأْتِيَ وَعْدُ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ ﴿٣١﴾ وَقَدْ

کہ پیچھے وعدہ اللہ کا ، بیشک اللہ خلاف نہیں کرتا اپنا وعدہ ، اور تمہیں

اسْتَهْزِئْ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمَلَيْتَ لِلَّذِينَ كَفَرُواْ اَنْتُمْ اَنْتُمْ اَخَذْتُمْ

کرچکے ہیں کتنے رسولوں سے تجھ سے پہلے سوڈھیل دی ہیں نے منکروں کو پھران کو پکڑ لیا،

فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ۚ ﴿۳۲﴾ اَفَمَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلَىٰ كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ۚ

سوکیسا تھا میرا بدلہ، بھلا جو لئے کھڑا ہے ہر کسی کے سر پر جو کچھ اس نے کیا ہے،

وَجَعَلُوا لِلّٰهِ شُرَكَاءَ قُلْ سَبُّوْهُمْ اَمْ يَنْتَبِعُوْنَہٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ

اور مقرر کرتے ہیں اللہ کے لئے شریک کہہ ان کا نام لو یا اللہ کو بتلاتے ہو جو وہ نہیں جانتا

فِي الْاَرْضِ اَمْ يَنْظَاهِرُ مِنَ الْقَوْلِ بَلْ زَيْنَ لِلَّذِينَ كَفَرُواْ

زمین میں یا کرتے ہو ادب ہی ادب باتیں یہ نہیں بلکہ بھلے بھٹادیے ہیں منکروں کو

مَكْرَهُمْ وَصَدُّوا عَنِ السَّبِيلِ ۚ وَمَنْ يُّضِلِّ اللّٰهُ فَمَا لَهُ

ان کے فریب اور وہ روک دیئے گئے ہیں راہ سے اور جس کو گمراہ کرے اللہ سو کوئی نہیں اس کو

مِنْ هَآٓءِ ۚ ﴿۳۳﴾

راہ بتانے والا۔

خلاصہ تفسیر

اور (اے پیغمبر اور اے مسلمانو!) ان کافروں کی عناد کی یہ کیفیت ہو کہ قرآن کی جو موجودہ حالت ہو کہ اس کا معجزہ ہونا غور و فکر پر موقوف ہے بجائے اس کے (اگر کوئی قرآن ایسا ہوتا جس کے ذریعہ سے پہاڑ (اپنی جگہ سے) ہٹا دیئے جاتے یا اس کے ذریعے سے زمین جلدی جلدی طے ہو جاتی یا اس کے ذریعہ سے مردوں کے ساتھ کسی کو باتیں کرادی جاتیں (یعنی مردہ زندہ ہو جاتا اور کوئی اس سے باتیں کر لیتا اور یہ وہ معجزے ہیں جن کی فرمائش اکثر کفار کیا کرتے تھے، لیکن مطلقاً لیکن اس طرح سے کہ قرآن کو بحالت موجودہ تو ہم معجزہ مانتے نہیں، البتہ اگر قرآن سے ان خوارق کا ظہور ہو تو ہم اس کو معجزہ مان لیں، مطلب یہ کہ قرآن سے ایسے ایسے معجزات کا بھی ظہور ہوتا جس سے دونوں طرح کے لوگوں کی فرمائش پوری ہو جاتی، یعنی جو نفس خوارق مذکورہ کے مستحق تھے اور جو ان کا ظہور قرآن سے چاہتے تھے، تب بھی یہ لوگ ایمان نہ لاتے (کیونکہ یہ اسباب موثر حقیقی نہیں) بلکہ سارا اختیار اللہ ہی کو ہے (وہ جس کو توفیق عطا فرماتے ہیں وہی ایمان لاتا ہے)

ان کو شریک کہتے ہو۔ اور مصداق واقعی اس کا کہیں نہیں ہے، اگر یہ شق ثانی ہے تو ان کے شریک نہ ہونے کو از خود تسلیم کرتے ہو، پس مطلوب کہ بطلان اشراک ہے دونوں شقوں پر ثابت ہو گیا۔ اول شق میں دلیل سے دوسری شق میں بمقاری تسلیم سے اور یہ تقریر باوجودیکہ اعلیٰ درجہ میں کافی ہو مگر یہ لوگ نہ مانیں گے، بلکہ ان کافروں کو اپنے مغالطہ کی باتیں (جس سے تمسک کر کے مبتلا سے شرک ہیں) مرغوب معلوم ہوتی ہیں اور (اسی وجہ سے) یہ لوگ راہ (حق) سے محروم رہ گئے ہیں اور (اصل وہی بات ہے جو اوپر (بَلِّغُوا الْأُمَمَ) سے مفہوم ہو چکی ہے یعنی) جس کو خدا تعالیٰ گمراہی میں رکھے اس کو کوئی راہ پر لانے والا نہیں (البتہ وہ اسی کو گمراہ رکھتا ہے جو باوجود وضوح حق کے عناد کرتا ہے)۔

معارف و مسائل

مشرکین مکہ کے سامنے اسلام کی حقانیت کے واضح دلائل اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے رسول ہونے کی کھلی ہوئی نشانیاں آپ کی زندگی کے ہر شعبہ سے پھر حیرت انگیز معجزات سے پوری طرح روشن ہو چکی تھیں، اور ان کا سردار ابو جہل یہ کہہ چکا تھا کہ بنو ہاشم سے ہمارا خاندانی مقابلہ ہے ہم ان کی اس برتری کو کیسے قبول کر لیں کہ خدا کا رسول ان میں سے آیا، اس لئے وہ کچھ بھی کہیں اور کیسی ہی نشانیاں دکھلائیں ہم ان پر کس حال ایمان نہیں لاتیں گے۔ اسی لئے وہ ہر موقع پر اس ضد کا مظاہرہ لغو قسم کے سوالات اور فرمائشوں کے ذریعہ کیا کرتے تھے، آیات مذکورہ بھی ابو جہل اور اس کے ساتھیوں کے ایک سوال کے جواب میں نازل ہوئی ہیں تفسیر بغوی میں ہے کہ مشرکین مکہ جن میں ابو جہل بن ہشام اور عبداللہ بن امیہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، ایک روز بیت اللہ کے پیچھے جا کر بیٹھ گئے، اور عبداللہ بن امیہ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا، اس نے کہا کہ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کی قوم اور ہم سب آپ کو رسول تسلیم کر لیں اور آپ کی پیروی کریں، تو ہمارے چند مطالبات ہیں اپنے قرآن کے ذریعہ ان کو پورا کر دیجئے تو ہم سب اسلام قبول کر لیں گے۔

مطالبات میں ایک تو یہ تھا کہ شہر مکہ کی زمین بڑی تنگ ہے، سب طرف پہاڑوں سے گھری ایک طرلائی زمین ہے جس میں نہ کاشت اور زراعت کی گنجائش ہے، نہ باغات اور دوسری ضروریات کی، آپ معجزہ کے ذریعہ ان پہاڑوں کو دور ہٹا دیجئے، تاکہ مکہ کی زمین فراخ ہو جائے، آخر آپ ہی کے کہنے کے مطابق داؤد علیہ السلام کے لئے پہاڑ مسخر کر دیئے گئے تھے، جب وہ تسبیح پڑھتے تو پہاڑ بھی ساتھ تسبیح کرتے تھے، آپ اپنے قول کے مطابق اللہ کے

نزدیک راؤڈ سے کمتر تو نہیں ہیں۔

دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ جس طرح سلیمان علیہ السلام کے لئے آپ کے قول کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ہوا کو سحر کر کے زمین کے بڑے بڑے فاصلوں کو مختصر کر دیا تھا آپ بھی ہمارے لئے ایسا ہی کر دیں کہ ہمیں شام و یمن وغیرہ کے سفر آسان ہو جائیں۔

تیسرا مطالبہ یہ تھا کہ جس طرح عیسیٰ علیہ السلام مُردوں کو زندہ کر دیتے تھے آپ ان سے کچھ کم تو نہیں، آپ بھی ہمارے لئے ہمارے دادا اقصیٰ کو زندہ کر دیجئے، تاکہ ہم ان سے یہ دریافت کر سکیں کہ آپ کا دین سچا ہے یا نہیں، (منظری بحوالہ بغوی وابن ابی حاتم و ابن مردویہ) مذکور الصدر آیات میں ان معاندانہ مطالبوں کا یہ جواب دیا گیا:

وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ أَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْأَرْضُ أَوْ كُلُّ نَفْسٍ لَبِئْسَ الْأَمْرُ حَبِيبًا

اس میں تسبیح جبال سے پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہٹانا اور قطعیت بہ الارض سے مراد مختلف وقت میں بڑی مسافت قطع کرنا اور کلمہ بہ الموتی سے مُردوں کو زندہ کر کے کلام کرنا مراد ہو اور تو سحر کا جواب بقرینہ مقام مخدوف ہے، یعنی لَمَّا آمَنُوا، جیسا کہ قرآن مجید میں ایک دوسری جگہ ایسا ہی مذکور ہے، وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ أَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْأَرْضُ أَوْ كُلُّ نَفْسٍ لَبِئْسَ الْأَمْرُ حَبِيبًا، وَحَسْبُ نَاصِيحَةٍ لَّكُمْ شَيْءٌ قَبْلًا مَّا كَانُوا يَلْعَنُونَ اور معنی یہ ہیں کہ اگر قرآن کے ذریعہ بطور معجزہ کے ان کے یہ مطالبات پورے کر دیے جاتیں تب بھی وہ ایمان لانے والے نہیں، کیونکہ وہ ان مطالبات سے پہلے ایسے معجزات کا مشاہدہ کر چکے ہیں جو ان کے مطلوبہ معجزات سے بہت زیادہ بڑھے ہوئے ہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارہ سے چاند کے دو ٹکڑے ہو جانا پہاڑوں کے اپنی جگہ سے ہٹ جانے سے اور تسخیر ہوا سے کہیں زیادہ حیرت انگیز ہے، اسی طرح بے جان کنکریوں کا آپ کے دست مبارک میں بولنا اور تسبیح کرنا کسی مُردہ انسان کے دوبارہ زندہ ہو کر بولنے سے کہیں زیادہ عظیم معجزہ ہے، لیلۃ المعراج میں مسجد اقصیٰ اور پھر وہاں سے آسمانوں کا سفر اور بہت مختصر وقت میں واپسی تسخیر ہوا اور تخت سلیمانی کے اعجاز سے کتنا زیادہ عظیم ہے، مگر یہ ظالم یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی جب ایمان نہ لائے تو اب ان مطالبات سے بھی ان کی نیت معلوم ہے کہ محض دفع الوقتی ہے، کچھ ماتنا اور کرنا نہیں ہے، مشرکین کے ان مطالبات کا مقصد چونکہ یہی تھا کہ ہمارے مطالبات پورے نہ کئے جائیں گے تو ہم کہیں گے کہ معاذ اللہ، اللہ تعالیٰ ہی کو ان کاموں پر قدرت نہیں، یا پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات اللہ تعالیٰ کے یہاں شروع

اور قبول نہیں جس سے سمجھا جاتا ہے کہ وہ اللہ کے رسول نہیں، اس لئے اس کے بعد ارشاد فرمایا
 بَلِّغِ الْوَعْدَ الْمُعْتَمَدَ، یعنی اللہ ہی کے لئے ہے اختیار سب کا سب، مطلب یہ ہے کہ مذکورہ
 مطالبات کا پورا کرنا اس وجہ سے نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے خارج ہیں، بلکہ حقیقت یہ
 ہے کہ مصالح عالم کو وہی جاننے والے ہیں، انھوں نے اپنی حکمت سے ان مطالبات کو پورا کرنا
 مناسب نہیں سمجھا، کیونکہ مطالبہ کرنے والوں کی ہٹ دھرمی اور بدعتی ان کو معلوم ہے، وہ جانتے
 ہیں کہ یہ سب مطالبے پورے کر دیئے جائیں گے جب بھی یہ ایمان نہ لائیں گے۔

أَفَلَمْ يَأْتِ الْيُنَيْنَ آمَنُوا أَنْ لَوْ شَاءَ اللَّهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيعًا،

امام بغویؒ نے نقل کیا ہے کہ صحابہ کرام نے جب مشرکین مکہ کے یہ مطالبات سنے تو یہ تمنا کرنے
 لگے کہ بطور مجزہ کے یہ مطالبات پورے کر دیئے جائیں تو بہتر ہے، سارے مکہ والے مسلمان ہو جائیں گے
 اور اسلام کو بڑی قوت حاصل ہو جائے گی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس کے معنی یہ ہیں کہ کیا
 اہل ایمان ان مشرکین کی حیلہ جوئی اور معاندانہ بھٹوں کو دیکھنے بھانسنے کے باوجود اب تک ان
 کے ایمان لانے سے مایوس نہیں ہوئے، کہ ایسی تمنائیں کرنے لگے، جب کہ وہ یہ بھی جانتے ہیں
 کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو سب ہی انسانوں کو ایسی ہدایت دیدیتا، کہ وہ مسلمان بنے بغیر نہ رہ سکتے
 مگر حکمت کا تقاضا یہ نہ تھا کہ سب کو اسلام و ایمان پر مجبور کر دیا جائے، بلکہ حکمت یہی تھی کہ
 ہر شخص کا اپنا اختیار باقی رہے، اپنے اختیار سے اسلام کو قبول کرے یا کفر کو۔

وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُصِيبَهُمْ بِمَا صَنَعُوا قَارِعَةٌ أَوْ تَحُلُّ قَرِيبًا

مِنْ دَارِهِمْ، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ قارعہ کے معنی مصیبت اور آفت کے ہیں، معنی
 آیت کے یہ ہیں کہ ان مشرکین کے مطالبات تو اس لئے منظور نہیں کئے گئے کہ ان کی بدعتی
 اور ہٹ دھرمی معلوم تھی کہ پورے کرنے پر بھی یہ ایمان لانے والے نہیں، یہ تو اللہ کے نزدیک
 اسی کے مستحق ہیں کہ ان پر دنیا میں بھی آفتیں اور مصیبتیں آئیں جیسا کہ اہل مکہ پر کبھی قحط کی
 مصیبت آئی، کبھی سلامی غزوہ اور بتر و آخر وغیرہ میں اُن پر قتل اور قید ہونے کی آفت
 نازل ہوئی، کسی پر بجلی گر گئی، کوئی اور کسی بلا میں مبتلا ہوا، اَوْ تَحُلُّ قَرِيبًا مِنْ دَارِهِمْ
 یعنی کبھی ایسا بھی ہوگا کہ مصیبت براہ راست اُن پر نہیں آئے گی، بلکہ ان کے قریب والی
 بستیوں پر آئے گی، جس سے ان کو عبرت حاصل ہو اور ان کو اپنا انجام بد بھی نظر آنے لگے۔

حَتَّىٰ يَأْتِيَ وَعْدُ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ، یعنی ان مصائب و آفات کا

یہ سلسلہ چلتا ہی رہے گا، جب تک کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا نہ ہو جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ
 کبھی ٹل نہیں سکتا، مراد اس وعدہ سے فتح مکہ کا وعدہ ہے، مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں پر مختلف

قسم کی آفتیں آتی رہیں گی، یہاں تک کہ آخر میں مکہ مکرمہ فتح ہو گا، اور یہ سب لوگ مغلوب و مغلوبہ ہو جائیں گے۔
آیت مذکورہ میں أَوْ تَحُلَّ قَلْبُ مُبَآئِنٍ دَا رِہِمَہ سے معلوم ہوا کہ جس قوم اور بستی کے قریب
جوار پر کوئی عذاب یا آفت و مصیبت آتی ہے تو اس میں حق تعالیٰ مشانہ کی یہ حکمت بھی مستور
ہوتی ہے کہ اس پاس کی بستیوں کو بھی تنبیہ ہو جائے، اور وہ دوسروں سے عبرت حاصل کر کے اپنے
اعمال درست کر لیں، تو یہ دوسروں کا عذاب اُن کے لئے رحمت بن جائے، ورنہ پھر ایک دن
ان کا بھی وہی انجام ہونا ہے جو دوسروں کا مشاہدہ میں آیا ہے۔

آج ہمارے ملک میں ہمارے قریب و جوار میں روز بروز کسی جماعت کسی بستی پر مختلف قسم کی
آفتیں آتی رہتی ہیں، کہیں سیلاب کی تباہ کاری، کہیں ہوا کے طوفان، کہیں زلزلہ کا عذاب، کہیں
کرتی اور آفت، قرآن کریم کے اس ارشاد کے مطابق یہ صرف ان بستیوں اور قوموں ہی کی ہنرا
نہیں ہوتی بلکہ قریب و جوار کے لوگوں کو بھی تنبیہ ہوتی ہے، پہلے زمانہ میں اگرچہ علم و فن کی اتنی
ٹریپ ٹاپ نہ تھی مگر لوگوں کے دلوں میں خدا کا خوف تھا، کسی جگہ اس طرح کا کوئی حادثہ پیش آ جاتا
تو خود وہ لوگ بھی اور اس کے قریب و جوار والے بھی سہم جاتے، اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے،
اپنے گناہوں سے تائب ہوتے، اور استغفار، صدقہ و خیرات کو ذریعہ نجات سمجھتے تھے، اور انکیوں
سے مشاہدہ ہوتا تھا کہ ان کی مصیبتیں بڑی آسانی سے ٹل جاتی تھیں، آج ہماری غفلت کا یہ
عالم ہے کہ مصیبت کے وقت بھی خدا ہی یاد نہیں آتا اور سب کچھ یاد آتا ہے، دنیا کے عمام
غیر مسلموں کی طرح ہماری نظریں بھی صرف مادی اسباب پر جم کر رہ جاتی ہیں، مسبب الاسباب
کی طرف توجہ کی اس وقت بھی توفیق کم لوگوں کو ہوتی ہے، اسی کا نتیجہ اس طرح کے مسلسل حوادث
ہیں جن سے دنیا ہمیشہ دوچار رہتی ہے۔

حَتَّىٰ يَأْتِيَ وَعْدُ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ، یعنی ان کفار و مشرکین پر
دنیا میں بھی مختلف عذابوں اور آفتوں کا یہ سلسلہ چلتا ہی رہے گا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ
آپہونچے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے کبھی خلاف نہیں کرتے۔

وعدہ سے مراد اس جگہ فتح مکہ ہے جس کا وعدہ حق تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
سے کیا ہوا تھا، اور مطلب آیت کا یہ ہوا کہ آخر میں تو مکہ فتح ہو کر ان سب مشرکین کو زیر و برادر
مغلوب و مغلوبہ ہونا ہی ہے، اس سے پہلے بھی ان کے جرائم کی کچھ کچھ سزا ان کو ملتی رہے گی، اور
یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وَعْدُ اللَّهِ سے مراد اس جگہ روز قیامت ہو، جس کا وعدہ سب پیغمبروں سے
کیا ہوا ہے، اور ہمیشہ سے کیا ہوا ہے، اس روز تو ہر کافر و مجرم اپنے کئے کی پوری پوری سزا اٹھائے گا
مذکورہ صدر واقعہ میں مشرکین کے معاندانہ سوالات اور ان کی ہٹ دھرمی سے رسول کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کو رنج و تکلیف پہنچنے کا اندیشہ تھا اس لئے اگلی آیت میں آپ کی تسلی کے لئے فرمایا گیا: وَلَقَدْ اَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَرْسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ فَاْمَلَيْتَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَنْتُمْ اَخَذْتُمْ اَعْيُنَهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ، یہ حالات جو آپ کو درپیش ہیں کچھ آپ ہی کو پیش نہیں آئے، آپ سے پہلے انبیاء کو بھی اسی طرح کے حالات سے سابقہ پڑتا رہا ہے کہ مجرموں اور منکروں کو ان کے جرم پر فوراً نہیں پکڑا گیا اور وہ انبیاء کے ساتھ استہزاء و تمسخر کرتے رہے، جب وہ انتہا کو پہنچ گئے تو پھر ان کو عذاب الہی نے پکڑ لیا اور کیسا پکڑا کہ کسی کو مقابلہ کی تاب نہ رہی۔

اَفَمَنْ هُوَ قَاتِلٌ عَلٰٓى كُلِّ نَفْسٍ، اس آیت میں شرکین کی جہالت اور بے عقلی کو اس طرح واضح فرمایا ہے کہ یہ کیسے بیوقوف ہیں کہ بے جان و بے شعور بتوں کو اس ذات پاک کے برابر ٹھہراتے ہیں جو ہر نفس پر نگراں اور اس کے اعمال و افعال کا محاسبہ کرنے والی ہے، پھر فرمایا کہ اصل سبب اس کا یہ ہے کہ شیطان نے ان کی اس جہالت ہی کو ان کی نظریں میں مزین کر رکھا ہے وہ اسی کو بڑا کمال اور کامیابی سمجھتے ہیں۔

لَهُمْ عَذَابٌ اَبَدٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَمَا

اُن کو مار پڑتی ہے دنیا کی زندگی میں اور آخرت کی مار تو بہت ہی سخت ہے اور کوئی

لَهُمْ مِّنْ اِلٰهِ مِّنْ وَّاقٍ ۚ (۳۳) مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِى وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ط

نہیں ان کو اللہ سے بچانے والا، حال جنت کا جس کا وعدہ ہے پر ہمیز گاروں سے

تَجْرِى مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ ط اَمْ لَهُمْ اٰیٰتٌ يَّذَكِّرُوْنَ ۚ اِنَّكَ عِندَ عَيْنِ

بہتی ہیں اس کے نیچے نہریں، میوہ اس کا ہمیشہ ہو اور سایہ بھی، یہ بدلہ ہے اُن کا

الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۚ وَعِندَ الْعَبْدِ الْكَافِرِيْنَ النَّارُ ۚ (۳۴) وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنَاهُمُ

جو ڈرتے رہے، اور بدلہ منکروں کا آگ ہے، اور وہ لوگ جن کو ہم نے دی ہو

الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَن

کتاب خوش ہوتے ہیں اس سے جو نازل ہوا تجھ پر اور بعض فرقے نہیں مانتے

يُنْكِرُ بَعْضُهُمْ قُلُ اِنَّمَا اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَا اَشْرِكَ

اس کی بعض بات، کہہ مجھ کو یہی حکم ہوا ہے کہ بندگی کروں اللہ کی اور شریک نہ کروں

بِهِ إِلَيْهِ أَدْعُوا وَإِلَيْهِ مَآبٌ ۝۳۶ وَكَذَلِكَ أَنْزَلْنَاهُ حُكْمًا

اس کا، اسی کی طرف بلاتا ہوں اور اسی کی طرف ہمیں اٹھکانا، اور اس طرح اتارا ہم نے یہ کلام حکم

عَرَبِيًّا وَلَئِنَّ أَتَّبَعْتَهُمْ بَعْدَ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ

عربی زبان میں، اور اگر تو چلے ان کی غواہش کے موافق بعد اس علم کے جو تجھ کو پہنچ چکا،

مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِن وَّلِيٍّ وَلَا وَاقٍ ۝۳۷

کوئی نہیں تیرا اللہ سے حمایتی اور نہ بچانے والا

خلاصہ تفسیر

ان کافروں کے لئے دنیوی زندگی میں (بھی) عذاب ہے (وہ قتل و قید و ذلت یا امر من و مصائب ہے) اور آخرت کا عذاب اس سے بدرجہا زیادہ سخت ہے (کیونکہ شدید بھی ہے اور دائم بھی ہے) اور اللہ (کے عذاب) سے ان کو کوئی بچانے والا نہیں ہوگا (اور) جس جنت کا متقیوں سے (یعنی شرک و کفر سے بچنے والوں سے) وعدہ کیا گیا ہے اس کی کیفیت یہ کہ اس (کی غمخوارات اور اشجار) کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی، اور اس کا پھل اور اس کا سایہ دائم رہے گا یہ تو انجام ہوگا متقیوں کا، اور کافروں کا انجام دوزخ ہوگا، اور جن لوگوں کو ہم نے (آسمانی) کتاب (یعنی تورات و انجیل) دی ہے (اور وہ اس کو پورے طور سے مانتے تھے) وہ اس (کتاب) سے خوش ہوتے ہیں جو آپ پر نازل کی گئی ہے (کیونکہ اس کی خبر اپنی کتابوں میں پاتے ہیں اور خوش ہو کر مان لیتے ہیں اور ایمان لے آتے ہیں، جیسے یہود میں عبد اللہ بن سہلام اور ان کے ساتھی اور نصاریٰ میں نجاشی اور ان کے فرستادے جن کا ذکر اور آیات میں بھی ہے) اور انہی کے گروہ میں بعض ایسے ہیں کہ اس (کتاب) کے بعض حصہ کا (جن میں ان کی کتاب کے خلاف احکام ہیں) انکار کرتے ہیں (اور کفر کرتے ہیں) آپ (ان سے) فرمائیے کہ (احکام دو قسم کے ہیں اصول اور فروع، اگر تم اصول میں مخالفت ہو سو وہ سب شرائع میں مشترک ہیں چنانچہ) مجھ کو (توحید کے متعلق) صرف یہ حکم ہوا ہے کہ میں اللہ کی عبادت کروں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤں (اور نبوت کے متعلق یہ بات ہے کہ) میں (لوگوں کو) اللہ ہی کی طرف بلاتا ہوں (یعنی نبوت کا حاصل یہ ہے کہ میں داعی الی اللہ ہوں) اور (معاد کے متعلق میرا یہ عقیدہ ہے کہ) اسی کی طرف مجھ کو دنیا سے لوٹ کر (جانا ہے) (یعنی اصول یہ تین ہیں، سو ان میں سے ایک بات بھی قابل انکار نہیں، چنانچہ توحید سب کے نزدیک مسلم ہے، جیسا کہ یہی مضمون دوسری آیت میں ہو گا) وَالْإِلٰهَ الْوَاحِدُ

بَيْنَنَا وَهُوَ، اور نبوت میں اپنے لئے مال و جاہ نہیں چاہتا جس پر انکار کی گنجائش ہو، محض دعوت الی اللہ کرتا ہوں، سو ایسے لوگ پہلے بھی ہوئے ہیں جس کو تم بھی مانتے ہو، جیسا یہی مضمون دوسری جگہ بھی ہے مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ إِلَّا بِطَرَحٍ مَعَادٍ کا عقیدہ مشترک اور مسلم اور غیر قابل انکار ہے، اور اگر فروع میں مخالفت ہو تو اس کا جواب اللہ تعالیٰ یوں دیتے ہیں کہ ہم نے جس طرح اور رسولوں کو خاص خاص زبانوں میں خاص احکام دیئے (اسی طرح ہم نے اس (قرآن) کو اس طور پر نازل کیا کہ وہ خاص حکم ہے عربی زبان میں (عربی کی تصریح سے اشارہ ہو گیا دوسرے انبیاء کی دوسری زبانوں کی طرف، اور زبانوں کے اختلاف سے اشارہ ہو گیا اختلاف اُمم کی طرف، تو حاصل جواب کا یہ ہوا کہ فروع میں اختلاف بسبب اختلاف اُمم کے ہوا، کیونکہ مصالح اُمم کے ہر زمانہ میں جدا گانہ ہیں، پس یہ اختلاف شرائع کا مقتضی مخالفت نہیں، چنانچہ خود تمہاری شرائع مسئلہ میں بھی ایسا اختلاف فروع کا ہوا ہے، پھر تمہاری مخالفت و انکار کی کیا گنجائش ہے) اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اگر آپ (بفرض محال) ان کے نفسانی خیالات کا (یعنی احکام منسوخ یا احکام مخدومہ کا) اتباع کرنے لگیں بعد اس کے کہ آپ کے پاس (احکام مقصودہ کا) علم (صحیح) پہنچ چکا ہے تو اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں نہ کوئی آپ کا مددگار ہوگا اور نہ کوئی بچانے والا (اور جب نبی کو ایسا خطاب کیا جا رہا ہے تو اور لوگ انکار کر کے کہاں رہیں گے، سو اس میں تعریض ہے اہل کتاب کے ساتھ، پس دونوں شقوں پر منکرین و مخالفین کا جواب ہو گیا)۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ آزْوَاجًا وَذُرِيَّةً

اور بھیج چکے ہیں ہم کتنے رسول تجھ سے پہلے اور ہم نے دی تھیں ان کو جوڑدیں اور اولاد

وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ لِكُلِّ أَجَلٍ

اور نہیں ہوا کسی رسول سے کہ وہ لے آئے کوئی نشانی مگر اللہ کے اذن سے ہر ایک وعدہ ہے

كِتَابٍ ③۸ يَمْحُو اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثَبِّتُ ③۹ وَعِنْدَهُ أُمَمٌ

لکھا ہوا، مٹاتا ہے اللہ جو چاہے اور باقی رکھتا ہے، اور اس کے پاس ہے

الْكِتَابِ ③۹ وَإِنْ مَّا نَرِيكَ بِعُضِّ الذِّمِّي نَعِدُ هُمْ أَوْ نَنْوَفِيكَ

اصل کتاب، اور اگر دکھلاویں ہم تجھ کو کوئی وعدہ جو ہم نے کیا ہے ان سے یا تجھ کو انہیں

فَانْصَاعَلَيْكَ الْبَلْعُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ﴿۴۰﴾ اَوْلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَأْتِي

سو تیرا ذمہ تو پہنچا دینا ہے اور ہمارا ذمہ ہر حساب لینا ، کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم چلے آتے ہیں

الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ

زمین کو گھٹاتے اس کے کناروں سے ، اور اللہ حکم کرتا ہے کوئی نہیں کہ پیچھے ڈالے اس

لِحُكْمِهِ وَهُوَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿۴۱﴾ وَقَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ

کا حکم ، اور وہ جلد لیتا ہے حساب ، اور فریب کرچکے ہیں جو اُن سے پہلے تھے ، سو

قُلِ لِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيعًا يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ وَسَيَعْلَمُ

اللہ کے ہاتھ میں ہر سب فریب ، جانتا ہے جو کچھ کراتا ہے ہر ایک جی ، اور اب معلوم کئے لیتے ہیں

الْكُفْرَ لِمَنْ عُقِيَ الدَّارِ ﴿۴۲﴾ وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَالسَّيِّئَاتِ

کافر کہ کس کا ہوتا ہے بچلا گھر ، اور کہتے ہیں کافر تو بھیجا ہوا نہیں

مُرْسَلًا قُلْ كَفَىٰ بِاللّٰهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ اَوْ مِنْ عِنْدِ

آیا ، کہہ دے اللہ کافی ہے گواہ میرے اور تمہارے بیچ میں اور جس کو خبر

عِلْمُ الْكِتَابِ ﴿۴۳﴾

ہے کتاب کی ۔

خلاصہ تفسیر

اور اہل کتاب میں سے بعضوں کا جو نبوت پر یہ طعن ہے کہ ان کے پاس متعدد بیبیاں ہیں سو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نے یقیناً آپ سے پہلے بہت سے رسول بھیجے اور ہم نے ان کو بیبیاں اور بچے بھی دیئے (یہ کونسا امر منافی رسالت ہے ، ایسا ہی مضمون دوسری آیت میں ہے اَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ اَمْوَالٍ اور چونکہ اختلاف شرائع کا شبہ دیگر شہادت سے زیادہ مشہور اور ادھر محض اجمال کے ساتھ مذکور تھا ، اس لئے اس کو آگے مکرر و مفصل ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص نبی پر اختلاف شرائع کا شبہ کرتا ہے وہ درپردہ نبی کو مالک احکام سمجھتا ہے حالانکہ کسی پیغمبر کے اختیار میں یہ امر نہیں کہ ایک آیت (یعنی ایک حکم) بدون خدا کے حکم کے (اپنی طرف سے) لائے بلکہ احکام کا مقرر ہونا اذن و اختیار خداوندی پر موقوف ہے ، اور

خدا تعالیٰ کی حکمت و مصلحت کے اعتبار سے یہ معمول مقرر ہے کہ ہر زمانہ کے مناسب خاص خاص احکام ہوتے ہیں (پھر وہ سکر زمانے میں بعض امور میں دوسرے احکام آتے ہیں اور پہلے احکام موقوف ہو جاتے ہیں اور بعضے بحالہ باقی رہتے ہیں پس) خدا تعالیٰ (ہی) جس حکم کو چاہیں موقوف کر دیتے ہیں اور جس حکم کو چاہیں قائم رکھتے ہیں اور اصل کتاب (یعنی لوح محفوظ) انہی کے پاس (رہتی) ہے (اور یہ سب احکام ناسخ و منسوخ و مستر اس میں درج ہیں وہ سب کی جامع اور گویا میزان اکمل ہے، یعنی جہاں سے یہ احکام آتے ہیں وہ اللہ ہی کے قبضہ میں ہے، پس احکام سابقہ کے موافق یا مغائر احکام لانے کی کسی کو گنجائش اور دسترس ہی نہیں ہو سکتی)

اور (یہ لوگ جو اس بنا پر انکار نبوت کرتے ہیں کہ اگر آپ نبی ہیں تو انکار نبوت پر جس عذاب کا وعدہ کیا جاتا ہے وہ عذاب کیوں نہیں نازل ہوتا، اس کے متعلق سن لیجئے کہ) جس بات کا (یعنی عذاب کا) ہم ان سے (انکار نبوت پر) وعدہ کر رہے ہیں، اس میں کا بعض واقعہ اگر ہم آپ کو دکھلا دیں (یعنی آپ کی حیات میں کوئی عذاب ان پر نازل ہو جاوے) خواہ (قبل نزول اس عذاب کے) ہم آپ کو وفات دیدیں (پھر بعد میں وہ عذاب واقع ہو خواہ دنیا میں یا آخرت میں دونوں حالتوں میں آپ فکر و اہتمام نہ کریں کیونکہ) بس آپ کے ذمہ تو صرف (احکام کا) پہنچا دینا ہوا (اور رد و انکار کرنا تو ہمارا کام ہے) آپ اس فکر میں کیوں پڑیں کہ اگر واقع ہو جائے تو بہتر ہے، شاید ایمان لے آویں، اور ان لوگوں پر بھی تعجب ہو کہ وقوع عذاب علی الکفر کا کیسے یک لخت انکار کر رہے ہیں) کیا (مقدمات عذاب میں سے) اس امر کو نہیں دیکھ رہے کہ ہم دفع اسلام کے ذریعہ سے انکی زمین کو ہر چار طرف سے برابر کم کرتے چلے آتے ہیں (یعنی ان کی عملداری بسبب کثرت فتوحات اسلامیہ کے روز بروز گھٹتی جا رہی ہے، سو یہ بھی تو ایک قسم کا عذاب ہے جو مقدمہ ہے اہل عذاب کا، جیسا کہ دوسری آیت میں ہے وَلَنُنْزِلَنَّ يَقْتُلُهُم مِّنَ الْعَذَابِ الَّذِي دُونِ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ) اور اللہ جو چاہتا ہے حکم کرتا ہے، اس کے حکم کو کوئی ہٹانے والا نہیں (پس عذاب الٰہی خواہ عذاب اکبر جو بھی ہو اس کو کوئی ان کے شرکار یا غیر شرکار میں سے رو نہیں کر سکتا) اور اگر ان کو چنرے ہلت بھی ہو گئی تو کیا ہے، وہ بڑی جلدی حساب لینے والا ہے (وقت کی دیر ہے، پھر فوراً ہی سزا دے موعود شروع ہو جائے گی) اور یہ لوگ جو ایذا رسول یا تنقیص اسلام میں طرح طرح کی تدبیریں کرتے ہیں تو ان سے کچھ نہیں ہوتا چنانچہ (ان سے پہلے جو کفر) لوگ ہو چکے ہیں انھوں نے (بھی) ان ہی اغراض کے لئے بڑی بڑی تدبیریں کیں سو (کچھ بھی نہ ہوا کیونکہ) اصل تدبیر تو خدا ہی کی ہے (اس کے سامنے کسی کی نہیں چلتی، سو اللہ نے ان کی وہ تدبیریں نہ چلنے دیں اور) اس کو سب خبر رہتی ہے جو شخص جو کچھ بھی کرتا ہے (پھر اس کو وقت پر

سزا دیتا ہے اور اسی طرح ان کفار کے اعمال کی بھی سب اس کو خبر ہے سو ان کو (بھی) ابھی معلوم ہوا جاتا ہے کہ اس عالم میں نیک انجامی کس کے حصہ میں ہے آیا ان کے یا مسلمانوں کے یعنی عنقریب ان کو اپنی بد انجامی اور سزائے اعمال معلوم ہو جائے گی اور یہ کافر لوگ (ان سزاؤں کو بھولے ہوئے) یوں کہہ رہے ہیں کہ (نعوذ باللہ) آپ پیغمبر نہیں، آپ فرما دیجئے کہ (تمہارے انکار بے معنی سے کیا ہوتا ہے) میرے اور تمہارے درمیان (میری نبوت پر) اللہ تعالیٰ اور وہ شخص جس کے پاس کتاب (آسمانی) کا علم ہے (جس میں میری نبوت کی تصدیق ہے) کافی گواہ ہیں (مراد اس سے علماء اہل کتاب جو منصف تھے اور نبوت کی پیشینگوئی دیکھ کر ایمان لے آئے تھے، مطلب یہ ہوا کہ میری نبوت کی دو دلیلیں ہیں عقلی اور نقلی، عقلی تو یہ کہ حق تعالیٰ نے مجھ کو معجزات عطا فرمائے جو دلیل نبوت ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے گواہ ہونے کے یہی معنی ہیں، اور نقلی یہ ہے کہ کتب ساریہ سابقہ میں اس کی خبر موجود ہے، اگر یقین نہ آئے تو منصف علماء سے پوچھ لو وہ ظاہر کر دیں گے، پس دلائل نقلیہ و عقلیہ کے ہوتے ہوئے نبوت کا انکار کرنا بجز شقاوت کے اور کیا ہے، کسی عاقل کو اس سے شبہ نہ ہونا چاہئے) :

معارف و مسائل

کفار و مشرکین کا رسول و نبی کے متعلق ایک عام تخیل یہ تھا کہ وہ جنس بشر اور انسان کے علاوہ کوئی مخلوق مثل فرشتوں کے ہونی چاہئے جس کی وجہ سے عام انسانوں سے ان کی برتری واضح ہو جائے، قرآن کریم نے ان کے اس خیال فاسد کا جواب متعدد آیات میں دیا ہے کہ تم نے نبوت و رسالت کی حقیقت اور حکمت کو ہی نہیں پہچانا، اس لئے ایسے تخیلات کے درپے ہوئے، کیونکہ رسول کو حق تعالیٰ ایک نمونہ بنا کر بھیجتے ہیں کہ امت کے سارے انسان ان کی پیروی کریں انہی جیسے اعمال و اخلاق سیکھیں اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی انسان اپنے ہمجنس انسان ہی کی پیروی اور اتباع کر سکتا ہے، جو اس کی جنس کا نہ ہو اس کی پیروی انسان سے ناممکن ہے مثلاً فرشتہ کو نہ بھوک لگے نہ پیاس نہ نفسانی خواہشات سے اس کو کوئی واسطہ نہ اس کو نیند آوے نہ مکان ہو، اب اگر انسانوں کو ان کے اتباع اور پیروی کا حکم دیا جاتا تو ان کے لئے ان کی قدرت سے زائد تکلیف ہو جاتی، اس جگہ بھی مشرکین کا یہی اعتراض پیش ہوا، حضرت صابر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تعدد از دواج سے ان کا یہ شبہ اور بڑھا، اس کا جواب پہلی آیت کے ابتدائی جملوں میں یہ دیا گیا کہ ایک یا ایک سے زیادہ نکاح کرنے اور بیوی بچوں والا ہونے کو تم نے کس دلیل سے نبوت و رسالت کے خلاف سمجھ لیا، اللہ تعالیٰ کی تو ابتداء آفرینش سے یہی سنت رہی ہے کہ وہ اپنے پیغمبروں کو صاحب اہل و عیال بناتے ہیں، جتنے انبیاء علیہم السلام پہلے گزرے ہیں، اور ان میں سے بعض کی نبوت کے تم بھی قائل ہو

وہ سب مستعد بیویاں رکھتے تھے، اور صاحبِ اولاد تھے، اس کو نبوت و رسالت یا بزرگی اور ولایت کے خلاف سمجھنا نادانی ہے۔

صحیح بخاری و مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تو روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں (یعنی ایسا نہیں کہ ہمیشہ روزے ہی رکھا کروں) اور فرمایا کہ میں رات میں سوتا بھی ہوں اور نماز کے لئے کھڑا بھی ہوتا ہوں (یعنی ایسا نہیں کہ ساری رات عبادت ہی کروں) اور گوشت بھی کھاتا ہوں، عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، جو شخص میری اس سنت کو قابلِ اعتراض سمجھے وہ مسلمان نہیں وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ، یعنی کسی رسول کو اختیار نہیں کہ وہ ایک آیت بھی بغیر حکمِ خدا تعالیٰ کے خود لائے۔

کفار و مشرکین جو معاندانہ سوالات ہمیشہ انبیاء علیہم السلام کے سامنے پیش کرتے آئے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی اس زمانہ کے مشرکین نے پیش کئے، ان میں دو سوال بہت عام ہیں، ایک یہ کہ اللہ کی کتاب میں ہماری خواہش کے مطابق احکام نازل ہوا کریں، جیسے سورہ یونس میں اُن کی یہ درخواست مذکور ہے کہ اِنْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَذَا اَوْ بَيِّنْ لَنَا، یعنی یا تو آپ اس موجودہ قرآن کے بجائے باکھل ہی کوئی دوسرا قرآن لائے، جس میں ہمارے بتوں کی عبادت کو منع نہ کیا گیا ہو، یا پھر آپ خود ہی اس کے لئے ہونے والے احکام کو بدل دیجئے، عذاب کی جگہ رحمت اور حرام کی جگہ حلال کر دیجئے۔

دوسرا سوال: انبیاء علیہم السلام کے واضح معجزات دیکھنے کے باوجود نئے نئے معجزات کا مطالبہ کرنا کہ فلاں قسم کا معجزہ دکھلائیے تو ہم مسلمان ہوں، قرآن کریم کے اس جملہ میں لفظ آیۃ سے دونوں چیزیں مراد ہو سکتی ہیں، کیونکہ اصطلاح قرآن میں قرآنی آیات کو بھی آیت کہا جاتا ہے اور معجزہ کو بھی، اسی لئے اس آیت کی تفسیر میں حضرات مفسرین میں سے بعض نے آیت قرآنی مراد لے کر یہ مطلب بیان کیا کہ کسی پیغمبر کو یخت یا نہیں ہوتا کہ اپنی طرف سے اپنی کتاب میں کوئی آیت بنالے، اور بعض نے اس آیت سے مراد معجزہ لے کر یہ معنی قرار دینے کہ کسی رسول و نبی کو اللہ نے یختیار نہیں دیا کہ جس وقت چاہے اور جس طرح چاہے معجزہ ظاہر کر دے تفسیر روح المعانی میں فرمایا کہ عموم مجاز کے قاعدہ پر اس جگہ یہ دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں، اور دونوں تفسیریں صحیح ہو سکتی ہیں۔

اس لحاظ سے خلاصہ مضمون اس آیت کا یہ ہوا کہ ہمارے رسول سے قرآنی آیات کے بدلنے کا مطالبہ بے جا اور غلط ہے، ہم نے ایسا اختیار کسی رسول کو نہیں دیا، اسی طرح یہ مطالبہ کہ فلاں خاص قسم کا معجزہ دکھلائیے، یہ بھی حقیقتِ نبوت سے ناواقفیت کی دلیل ہے، کیونکہ کسی نبی رسول

کے اختیار میں نہیں ہوتا کہ لوگوں کی خواہش کے مطابق جو وہ چاہیں معجزہ ظاہر کر دیں۔
لَا تَلْجُ الْاَجَلَ كِتَابٌ، اجل کے معنی مدت معینہ اور میعاد کے آتے ہیں، اور کتاب اس جگہ
بمعنی مصدر ہے، یعنی تحریر، معنی یہ ہیں کہ ہر چیز کی میعاد اور مقدار اللہ تعالیٰ کے پاس لکھی ہوئی ہے،
اس نے ازل میں لکھ دیا ہے کہ فلاں شخص فلاں وقت پیدا ہوگا، اور اتنے دن زندہ رہے گا، کہاں کہاں
جائے گا، کیا کیا کام کرے گا، کس وقت اور کہاں مرے گا۔

اسی طرح یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ فلاں زمانے میں فلاں پیغمبر پر کیا وحی اور احکام نازل ہوئے
کیونکہ احکام کا ہر زمانے اور ہر قوم کے مناسب حال آتے رہنا ہی مقتضائے عقل و انصاف ہے، اور
یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ فلاں پیغمبر سے فلاں وقت کس کس معجزہ کا ظہور ہوگا۔

اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مطالبہ کہ فلاں قسم کے احکام قرآن میں تاویل
کرائیں، یا یہ مطالبہ کہ فلاں خاص معجزہ دکھلائیں ایک معاذرہ اور غلط مطالبہ ہے، جو رسالت و
نبوت کی حقیقت سے بے خبر ہونے پر مبنی ہے۔

يَسْأَلُ اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَيُثَبِّتُ وَرَعْدًا اَمُّ الْكِتَابِ، اُمُّ الْكِتَابِ کے لفظی معنی اصل کتاب
کے ہیں، مراد اس سے وہ لوح محفوظ ہے جس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔

معنی آیت کے یہ ہیں کہ حق تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ سے جس چیز کو چاہتا
ہے مٹا دیتا ہے، اور جس چیز کو چاہتا ہے ثابت اور باقی رکھتا ہے، اور اس محو و اثبات کے بعد جو کچھ
واقع ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے پاس محفوظ ہے، جس پر نہ کسی کی دسترس ہے، نہ اس میں کوئی کمی بیشی
ہو سکتی ہے۔

ائمہ تفسیر میں سے حضرت سعید بن جبیرؓ اور قتادہؓ وغیرہ نے اس آیت کو بھی احکام و شرائع
کے محو و اثبات یعنی نسخ کے متعلق قرار دیا ہے، اور آیت کا مطلب یہ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ
جو ہر زمانے اور ہر قوم کے لئے مختلف رسولوں کے ذریعہ اپنی کتابیں بھیجتے ہیں، جن میں احکام
شریعت اور فرائض کا بیان ہوتا ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ سب احکام دائمی ہوں اور ہمیشہ
باقی رہیں، بلکہ قوموں کے حالات اور زمانے کے تغیرات کے مناسب اپنی حکمت کے ذریعہ جس حکم
کو چاہتے ہیں مٹا دیتے ہیں، اور جس کو چاہتے ہیں ثابت اور باقی رکھتے ہیں، اور اصل کتاب بہر حال
ان کے پاس محفوظ ہے، جس میں پہلے ہی سے یہ لکھا ہوا ہے کہ فلاں حکم جو فلاں قوم کے لئے نازل
کیا گیا ہے یہ ایک خاص میعاد کے لئے یا خاص حالات کی بنا پر ہے، جب وہ میعاد گزر جائیگی،
یا وہ حالات بدل جائیں گے تو یہ حکم بھی بدل جائے گا، اس اُمُّ الْكِتَابِ میں اس کی میعاد اور وقت
مقرر بھی پوری تعیین کے ساتھ درج ہے، اور یہ بھی کہ اس حکم کو بدل کر کونسا حکم لایا جائے گا۔

اس سے یہ شبہ بھی جاتا رہا کہ احکام خداوندی کبھی منسوخ نہ ہونے چاہئیں، کیونکہ کوئی حکم جاری کرنے کے بعد منسوخ کرنا علامت اس کی ہے کہ حکم جاری کرنے والے کو حالات کا اندازہ نہ تھا اس لئے حالات دیکھنے کے بعد اس کو منسوخ کرنا پڑا، اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کی شان اس سے بلند و بالا ہے کہ کوئی چیز اس کے علم سے باہر ہو، کیونکہ تقدیر مذکور سے معلوم ہو گیا کہ جس حکم کو منسوخ کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے سے ہوتا ہے کہ یہ حکم صرف اتنی مدت کے لئے جاری کیا گیا ہے، اس کے بعد بدل جاتا ہے گا، اس کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے کسی مریض کا حال دیکھ کر کوئی حکیم یا ڈاکٹر ایک دو اس وقت کے مناسب حال تجویز کرتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ اس دوا کا یہ اثر ہوگا اس کے بعد اس دوا کو بد لکر فلاں دوسری دوا دی جائے گی، خلاصہ یہ ہے کہ اس تفسیر کے مطابق آیت میں نمود اثبات سے مراد احکام کا منسوخ ہونا اور باقی رہنا ہے۔

اور ائمہ تفسیر کی ایک جماعت سفیان ثوری وکیع وغیرہ نے حضرت ابن عباس سے اس آیت کی دوسری تفسیر نقل کی جس میں مضمون آیت کو نوشتہ تقدیر کے متعلق قرار دیا ہے، اور معنی آیت کے یہ بیان کئے گئے ہیں کہ قرآن و حدیث کی تصریحات کے مطابق مخلوقات کی تقدیریں اور ہر شخص کی عمر اور زندگی بھر میں ملنے والا رزق اور پیش آنے والی راحت یا مصیبت اور ان سب چیزوں کی مقداریں اللہ تعالیٰ نے ازل میں مخلوقات کی پیدائش سے بھی پہلے لکھی ہوئی ہیں، پھر بچہ کی پیدائش کے وقت فرشتوں کو بھی لکھوا دیا جاتا ہے، اور ہر سال شب قدر میں اس سال کے اندر پیش آنے والے معاملات کا چٹھا فرشتوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہر فرد مخلوق کی عمر، رزق، حرکات و سکنات سب متعین ہیں، اور لکھے ہوئے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ اس نوشتہ تقدیر میں سے جس کو چاہتے ہیں مٹا دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں باقی رکھتے ہیں وَعِشَّةَ اُمِّ الْكِتٰبِ، یعنی اصل کتاب جس کے مطابق نمود و اثبات کے بعد انجام کا عمل ہوتا ہے، وہ اللہ کے پاس ہے اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔

تشریح اس کی یہ ہے کہ بہت سی احادیث صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اعمال سے انسان کی عمر اور رزق بڑھ جاتے ہیں، بعض سے گھٹ جاتے ہیں، صحیح بخاری میں ہے کہ صلہ رحمی عمر میں زیادتی کا سبب بنتی ہے، اور مسند احمد کی روایت میں ہے کہ بعض اوقات آدمی کوئی ایسا گناہ کرتا ہے کہ اس کے سبب رزق سے محروم کر دیا جاتا ہے، اور ماں باپ کی خدمت و اطاعت سے بڑھ جاتی ہے، اور تقدیر الہی کو کوئی چیز بجز دعاء کے ٹال نہیں سکتی۔

ان تمام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو عمر یا رزق وغیرہ کسی کی تقدیر میں لکھ دیئے ہیں وہ بعض اعمال کی وجہ سے کم یا زیادہ ہو سکتے ہیں، اور دعاء کی وجہ سے بھی تقدیر

بدلی جاسکتی ہے۔

اس آیت میں اسی مضمون کا بیان اس طرح کیا گیا کہ کتابِ تقدیر میں لکھی ہوئی عمر یا رزق یا مصیبت یا راحت وغیرہ میں جو تغیر و تبدل کسی عمل یا دُعا کی وجہ سے ہوتا ہے، اس سے مراد وہ کتابِ تقدیر ہے جو فرشتوں کے ہاتھ یا ان کے علم میں ہے اس میں بعض اوقات کوئی حکم کسی خاص شرط پر معلق ہوتا ہے، جب وہ شرط نہ پائی جائے تو یہ حکم بھی نہیں رہتا، اور پھر یہ شرط بعض اوقات تو تحریر میں لکھی ہوئی فرشتوں کے علم میں ہوتی ہے، بعض اوقات لکھی نہیں ہوتی، صرف اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوتی ہے، جب وہ حکم بدلا جاتا ہے تو سب حیرت میں رہ جاتے ہیں، اس طرح کی تقدیر معلق کہلاتی ہے، جس میں اس آیت کی تصریح کے مطابق محو و اثبات ہوتا رہتا ہے، لیکن آیت کے آخری جملہ وَعِنْدَهُ أُمُّ الْكِتَابِ نے بتلادیا، کہ اس تقدیر معلق کے اوپر ایک تقدیرِ مُبْرَم ہے، جو اُمُّ الْكِتَابِ میں لکھی ہوئی اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، وہ صرف علمِ الہی کے لئے مخصوص ہے، اس میں وہ احکام لکھے جاتے ہیں جو شرائطِ اعمال یا دُعا کے بعد آخری نتیجہ کے طور پر ہوتے ہیں، اسی کو وہ محو و اثبات اور کمی بیشی سے بالکل بری ہے (ابن کثیر)

وَأَنَّ مَأْثِرَتَكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُ هُمْ أَوْ نَنْتَوِيذُكَ، اس آیت میں رسولِ کریم ﷺ علیہ وسلم کو تسلی دینے اور مطمئن رکھنے کے لئے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جو وعدے آپ سے کئے ہیں کہ اسلام کی مکمل فتح ہوگی، اور کفر و کافر ذلیل و خوار ہوں گے، یہ تو ہو کر رہے گا، مگر آپ اس فکر میں نہ پڑیں کہ یہ فتح مکمل کب ہوگی، ممکن ہے کہ آپ کی زندگی میں ہو جائے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ وفات کے بعد ہو، اور آپ کے اطمینان کے لئے تو یہ بھی کافی ہے کہ آپ برابر دیکھ رہے ہیں کہ ہم کفار کی زمینوں کو ان کے اطراف سے گھٹاتے چلے جاتے ہیں، یعنی یہ اطراف مسلمانوں کے قبضہ میں آجاتے ہیں، اس طرح ان کی مقبوضہ زمین گھٹتی جاتی ہے، اور مسلمانوں کے لئے کشائش ہوتی جاتی ہے، اس طرح ایک دن اس فتنہ کی تکمیل بھی ہو جائے گی، حکم اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے، اس کے حکم کو کوئی ٹالنے والا نہیں، وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے :

سُورۃ رعد تمام شد

سورة ابراهيم

سُورَةُ اِبْرَاهِيمَ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ اِثْنَتَانِ خَمْسُونَ آيَةً وَسَبْعُ رُكُوعَاتٍ

سورۃ ابراہیم مکہ میں اُتری اور اس کی باؤن آیتیں ہیں اور مشات رکوع

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ○

شرع اللہ کے نام سے جو بید مہربان نہایت رحم والا ہے

الرَّحِيمُ كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ

یہ ایک کتاب ہے کہ ہم نے اتاری تیری طرف کہ تو نکالے لوگوں کو اندھیروں سے

إِلَى النُّورِ بِإِذْنِ رَجِيمٍ إِلَى صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ۝۱۱ اللَّهُ

اجالے کی طرف، ان کے رب کے حکم سے رستہ پر اس زبردست
 نبیوں والے اللہ کے

الَّذِي لَهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَوَيْلٌ لِلْكَافِرِينَ

جس کا ہی جو کچھ کہ موجود ہی آسمانوں میں اور جو کچھ ہی زمین میں اور مصیبت ہے کافروں کو

مَنْ عَذَابٍ شَدِيدٍ ۝۲۰ الَّذِينَ يَسْتَحِبُّونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا

ایک سخت عذاب سے جو کہ پسند رکھتے ہیں زندگی دنیا کی

عَلَى الْآخِرَةِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا

آخرت سے اور روکتے ہیں اللہ کی راہ سے اور تلاش کرتے ہیں اس میں کبھی

أُولَئِكَ فِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ (٣)

وہ راستہ بھول کر جا پڑے ہیں دور -

خلاصہ تفسیر

الٰہی، (اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ (قرآن) ایک کتاب ہے جس کو ہم نے آپ پر نازل فرمایا ہے تاکہ آپ (اس کے ذریعہ سے) تمام لوگوں کو ان کے پروردگار کے حکم سے (مرتبہ تبلیغ میں کفر کی) تاریکیوں سے نکال کر (ایمان و ہدایت کی) روشنی کی طرف یعنی ذات غالب ستودہ صفات کی راہ کی طرف لاویں (روشنی میں لانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ راہ بتلاویں) جو ایسا خدا ہے کہ اس کی ملک ہے جو کچھ کہ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ کہ زمین میں ہے اور (جب یہ کتاب خدا کا رہتہ بتلاتی ہو تو) بڑی خرابی یعنی بڑا سخت عذاب ہے ان کافروں کو جو (اس راہ کو نہ تو خود قبول کرتے ہیں بلکہ) دنیوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں (اس لئے دین کی جستجو نہیں کرتے) اور (نہ دوسروں کو یہ راہ اختیار کرنے دیتے ہیں بلکہ) اللہ کی (اس) راہ (مذکور) سے روکتے ہیں اور اس میں کبھی (یعنی شبہات) کے متلاشی رہتے ہیں (جن کے ذریعہ سے دوسروں کو گمراہ کر سکیں) ایسے لوگ بڑی دور کی گمراہی میں ہیں (یعنی وہ گمراہی حق سے بڑی دور ہے)۔

معارف و مسائل

سورۃ اور اس کے مضامین | یہ قرآن کریم کی چودھویں سورۃ ابراہیم شروع ہوتی ہے یہ سورۃ مکی ہے، قبل از ہجرت نازل ہوئی، بحر چند آیات کے جن کے بارے میں اختلاف ہے کہ مدنی ہیں یا مکی۔ اس سورۃ کے شروع میں رسالت و نبوت اور ان کی کچھ خصوصیات کا بیان ہے، پھر توحید کا مضمون اور اس کے شواہد کا ذکر ہے، اسی سلسلہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ ذکر کیا گیا ہے، اور اسی کی مناسبت سے سورۃ کا نام سورۃ ابراہیم رکھا گیا ہے۔

اَلرَّحْمٰنُ كَتَبَ اَنْزَلْنَاهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ، الرَّ، اُن حروف مقطعات میں سے ہیں جن کے متعلق بار بار ذکر کیا جا چکا ہے کہ اس میں اسلم اور بے غبار طریقہ سلف صالحین کا ہے کہ اس پر ایمان و یقین رکھیں کہ جو کچھ اس کی مراد ہے وہ حق ہے، لیکن اس کے معانی کی تحقیق و تفتیش کے درپے نہ ہوں۔

كِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ اِلَيْكَ میں نحو کی ترکیب کے لحاظ سے زیادہ واضح اور صاف بات یہ ہے کہ اس کو لفظ ہذا مذکور کی خبر قرار دی جائے، اور جملہ کے معنی یہ ہوں کہ یہ وہ کتاب ہے جس کو ہم نے آپ کی طرف نازل کیا ہے، اس میں نازل کرنے کی نسبت حق تعالیٰ شانہ کی طرف، اور خطاب کی نسبت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنے میں دو چیزوں کی طرف اشارہ پایا گیا

ایک یہ کہ یہ کتاب نہایت عظیم المرتبہ ہے، کہ اس کو خود ذاتِ حق تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے، دوسرے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عالی مرتبہ ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ آپ کو اس کا پہلا مخاطب بنایا ہے۔

لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ لَفْظِ نَاسٍ عام انسانوں کے لئے بولا جاتا ہے، اس سے مراد تمام عالم کے موجودہ اور آئندہ آنے والے انسان ہیں، ظلمت ظلمت کی جمع ہے، جس کے معنی اندھیرے کے معروف و مشہور ہیں، یہاں ظلمت سے مراد کفر و شرک اور برا کاریوں کی ظلمت ہے، اور نور سے مراد ایمان کی روشنی ہے، اسی لئے لفظ ظلمت کو بصیغہ جمع لایا گیا، کیونکہ کفر و شرک کی بہت سی انواع و اقسام ہیں، اسی طرح بُرے اعمال بھی بیشمار ہیں، اور لفظ نور کو بصیغہ مفرد لایا گیا، کیونکہ ایمان اور حق واحد ہے، معنی آیت کے یہ ہیں کہ یہ کتاب ہم نے اس لئے آپ کی طرف نازل کی ہے کہ آپ اس کے ذریعہ تمام عالم کے انسانوں کو کفر و شرک اور بُرے کاموں کی اندھیروں سے نجات دلا کر ایمان اور حق کی روشنی میں لے آئیں اُن کے رب کی اجازت سے، یہاں لفظ رب لانے میں اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عام انسانوں پر یہ انعام کہ اپنی کتاب اور پیغمبر کے ذریعہ اُن کو اندھیروں سے نجات دلائیں، اس کا سبب اور منشاء بجز اس لطف و مہربانی کے اور کچھ نہیں، جو تمام انسانوں کے خالق و مالک نے اپنی شانِ ربوبیت سے اُن پر مبذول کر رکھی ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ نہ کسی کا کوئی حق لازم ہے نہ کسی کا زور اس پر چلتا ہے۔

ہدایت صرف خدا کا فعل ہے | اس آیت میں اندھیری سے نجات دے کر روشنی میں لانے کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل قرار دیا گیا ہے، حالانکہ ہدایت دینا حقیقت میں حق تعالیٰ ہی کا فعل ہے، جیسا کہ ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے اِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ اَجَبْتَ وَ لَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ، یعنی آپ باختیارِ خود کسی کو ہدایت نہیں دے سکتے، بلکہ اللہ تعالیٰ ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، اسی لئے اس آیت میں بِإِذْنِ رَبِّهِمْ کا لفظ بڑھا کر یہ شبہ ختم کر دیا کیونکہ معنی آیت کے یہ ہو گئے کہ یہ کفر و شرک کی اندھیروں سے نکال کر ایمان و عملِ صالح کی روشنی میں لانا، اگرچہ اصل حقیقت کی رو سے آپ کے ہاتھ میں نہیں، مگر اللہ تعالیٰ کے حکم و اجازت سے آپ کر سکتے ہیں۔

احکام و ہدایات | اس آیت سے معلوم ہوا کہ تمام بنی آدم اور نوع انسانی کو بُرائیوں کی اندھیروں سے نکالنے اور روشنی میں لانے کا واحد ذریعہ اور انسان و انسانیت کو دنیا و آخرت کی بربادی اور ہلاکت سے نجات دلانے کا واحد راستہ قرآن کریم ہی،

جتنا جتنا لوگ اس کے قریب آئیں گے، اسی انداز سے ان کو دنیا میں بھی امن و امان اور عافیت و اطمینان نصیب ہوگا اور آخرت میں بھی فلاح و کامیابی حاصل ہوگی، اور جتنا اس سے دور ہونگے اتنا ہی دونوں جہان کی خرابیوں بربادیوں مصیبتوں اور پریشانیوں کے غار میں گریں گے۔

آیت کے الفاظ میں یہ نہیں کھولا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے ذریعہ کس طرح لوگوں کو اندھیروں سے نجات دے کر روشنی میں لائیں گے، لیکن اتنی بات ظاہر ہے کہ کسی کتاب کے ذریعہ کسی قوم کو درست کرنے کا طریقہ یہی ہوتا ہے کہ اس کتاب کی تعلیمات و ہدایات کو اس قوم میں پھیلایا جائے، اور ان کو اس کا پابند کیا جائے۔

قرآن کریم کی تلاوت بھی مگر قرآن کریم کی ایک مزید خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی تلاوت اور بغیر تجھے مستقل مقصد ہے۔ ہوتے اس کے الفاظ کا پڑھنا بھی بالخاصہ انسان کے نفس پر اثر انداز ہوتا ہے، اور اس کو بُرائیوں سے بچنے میں مدد دیتا ہے، کم از کم کفر و شرک کے کیسے ہی خوب صورت جال ہوں قرآن پڑھنے والا اگرچہ بے سمجھے ہی پڑھتا ہو، ان کے دامن میں نہیں آسکتا، ہندوؤں کی تحریک شدہ سنگٹھن کے زمانے میں اس کا مشاہدہ ہو چکا ہے، کہ ان کے دامن میں صرف کچھ وہ لوگ آئے جو قرآن کی تلاوت سے بھی بیگانہ تھے، آج عیسائی مشنریاں مسلمانوں کے ہر خطہ میں طرح طرح کے سبز باغ اور سنہرے جال لئے پھرتی ہیں، لیکن ان کا اگر کوئی اثر پڑتا ہے تو صرف اُن گھرانوں پر جو قرآن کی تلاوت سے بھی غافل ہیں، خواہ جاہل ہونے کی وجہ سے یا نئی تعلیم کے غلط اثر سے۔

شاید اسی معنوی اثر کی طرف اشارہ کرنے کے لئے قرآن کریم میں جہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد بتلائے گئے ہیں وہاں تعلیم معانی سے پہلے تلاوت کا جداگانہ ذکر کیا گیا ہے: **يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ**، یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نین کاموں کے لئے بھیجا گیا ہے، پہلا کام قرآن مجید کی تلاوت ہے، اور ظاہر ہے کہ تلاوت کا تعلق الفاظ سے ہے، معانی سمجھے جاتے ہیں ان کی تلاوت نہیں ہوتی، دوسرا کام لوگوں کو بُرائیوں سے پاک کرنا، اور تیسرا کام قرآن کریم اور حکمت یعنی سنت رسول کی تعلیم دینا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم ایک ایسا ہدایت نامہ ہے جس کے معانی سمجھ کر اس پر عمل کرنا تو اصل مقصد ہی ہے، اور اس کا انسانی زندگی کی اصلاح میں مؤثر ہونا بھی واضح ہے، اس کے سوا اس کے الفاظ کی تلاوت کرنا بھی غیر شعوری طور پر انسان کے نفس کی اصلاح میں نمایاں اثر رکھتا ہے اس آیت میں باذن خداوندی اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لانے کی نسبت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کر کے یہ بھی بتلادیا گیا ہے کہ اگرچہ ہدایت کا پیدا کرنا حقیقتہً حق تعالیٰ کا فعل ہے مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے کے بغیر اس کو حاصل نہیں کیا جاسکتا، قرآن کریم

کا مفہوم اور تعبیر بھی وہی معتبر ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول یا عمل سے بتلا دی ہو اس کے خلاف کوئی تعبیر معتبر نہیں۔

إِلَىٰ صِرَاطٍ اَلْعِزِّ اَلْحَمِيدِ اَللّٰهُ اَلَّذِیْ لَکَ فِی السَّمٰوٰتِ وَ اَلْاَرْضِ رِضْنٌ
اس آیت کے شروع میں جو ظلمت و نور کا ذکر آیا ہے ظاہر ہے کہ یہ وہ اندھیری اور روشنی نہیں جو عام آنکھوں سے نظر آئے، اس لئے اس کو واضح کرنے کے لئے اس جملے میں ارشاد فرمایا کہ وہ روشنی اللہ کا راستہ ہے جس پر گامزن ہونے والا نہ اندھیرے میں چلنے والے کی طرح بھٹکتا ہے، نہ اس کو لغزش ہوتی ہے، نہ وہ مقصد تک پہنچنے میں ناکام ہوتا ہے، اللہ کے راستہ سے مراد وہ راستہ ہے جس پر چل کر انسان خدا تک پہنچ سکے، اور اس کی رضا کا درجہ حاصل کر سکے۔

اس جگہ لفظ اللہ تو بعد میں لایا گیا، اس سے پہلے اس کی دو صفتیں عزیز اور حمید ذکر کی گئی ہیں، عزیز کے معنی عربی لغت کے اعتبار سے قوی اور غالب کے ہیں، اور حمید کے معنی وہ ذات جو حمد کی مستحق ہو، ان دو صفتوں کو اصل نام حق سے پہلے لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ راستہ جس ذات قدوس کی طرف لے جانے والا ہے وہ قوی اور غالب ہے اور ہر حمد کی مستحق بھی، اس لئے اس پر چلنے والا نہ کہیں ٹھوکر کھائے گا نہ اس کی کوشش رائیگاں ہوگی بلکہ اس کا منزل مقصود پر پہنچنا یقینی ہے شرط یہ ہے کہ اس راستہ کو نہ چھوڑے۔

اللہ تعالیٰ کی یہ دو صفتیں پہلے بیان کرنے کے بعد فرمایا اَللّٰهُ اَلَّذِیْ لَکَ فِی السَّمٰوٰتِ وَ اَلْاَرْضِ رِضْنٌ، یعنی یہ وہ ذات ہے کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب اسی کا پیدا کیا ہوا اور اسی کی ملک خاص ہے جس میں کوئی شریک نہیں۔

وَرٰوٰی لِّلْکٰفِرِیْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِیْدٍ، لفظ وٰوٰی عذاب شدید اور ہلاکت کے معنی میں آتا ہے، معنی یہ ہیں کہ جو لوگ اس نعمت قرآن سے منکر ہیں اور کفر و شرک کے اندھیرے ہی میں رہنے کو پسند کرتے ہیں، ان کے لئے بڑی بربادی اور ہلاکت ہے اس عذاب شدید سے جو ان پر آنے والا ہے۔

خلاصہ مفہوم | آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم اس لئے نازل کیا گیا ہے کہ سب انسانوں کو اندھیرے سے نکال کر اللہ کے راستہ کی روشنی میں لے آئے، مگر جو بد نصیب قرآن ہی کے منکر ہو جائیں تو وہ اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو عذاب میں ڈال رہے ہیں، جو لوگ قرآن کے کلام الہی ہونے ہی کے منکر ہیں وہ تو اس وعید کی مراد ہیں ہی، مگر جو اعتقاداً منکر نہیں مگر عملاً قرآن کو چھوڑے ہوئے ہیں، نہ تلاوت سے کوئی واسطہ ہے نہ اس کے سمجھنے اور عمل کرنے کی طرف کوئی التفات ہے وہ بد نصیب بھی مسلمان ہونے کے باوجود اس وعید سے بالکل بری نہیں۔

الَّذِينَ يَسْتَحِبُّونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْخُلُونَ مِمَّا عَوْجًا أُولَٰئِكَ فِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ ۚ اس آیت میں منکرینِ قرآن کا فردوں کے تین حال بتلائے گئے ہیں، ایک یہ کہ وہ دنیا کی زندگی کو بہ نسبتِ آخرت کے زیادہ پسند کرتے ہیں، اور ترجیح دیتے ہیں، اسی لئے دنیا کے نفع یا آرام کی خاطر آخرت کا نقصان کرنا گوارا کر لیتے ہیں، اس میں اُن کے من کی تشخیص کی طرف اشارہ ہے، کہ یہ لوگ قرآن کریم کے واضح معجزات دیکھنے کے باوجود اس سے منکر کیوں ہیں، وجہ یہ ہے کہ ان کو دنیا کی موجودہ زندگی کی محبت نے آخرت کے معاملات سے اندھا کر رکھا ہے، اس لئے ان کو اپنی اندھیری ہی پسند ہے، روشنی کی طرف آنے سے کوئی رغبت نہیں۔ دوسری خصلت ان کی یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ خود تو اندھیروں میں رہنے کو پسند کرتے ہیں اس پر ظلم یہ ہے کہ وہ اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے کے لئے دوسروں کو بھی روشنی کی شاہراہ یعنی اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔

قرآن نہیں میں بعض تیسری خصلت يَبْخُلُونَ مِمَّا عَوْجًا میں بیان کی گئی ہے، اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں غلطیوں کی نشاندہی ایک یہ کہ یہ لوگ اپنی بد باطنی اور بد عملی کے سبب اس فکر میں لگے رہتے ہیں، کہ اللہ کے روشن اور سیدھے راستہ میں کوئی کمی اور خرابی نظر آئے تو ان کو اعتراض اور طعن کا موقع ملے، ابن کثیر نے یہی معنی بیان فرمائے ہیں۔

اور اس جملہ کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ لوگ اس فکر میں لگے رہتے ہیں کہ اللہ کے راستے یعنی قرآن و سنت میں کوئی چیز ان کے خیالات اور خواہشات کے موافق مل جائے، تو اس کو اپنی حقانیت کے استدلال میں پیش کریں، تفسیرِ قرطبی میں اسی معنی کو اختیار کیا گیا ہے، جیسے آجکل بے شمار اہل علم اس میں مبتلا ہیں کہ اپنے دل میں ایک خیال کہیں اپنی غلطی سے کہیں کسی دوسری قوم سے متاثر ہو کر گھڑ لیتے ہیں، پھر قرآن و حدیث میں اس کے مؤیدات تلاش کرتے ہیں، اور کہیں کوئی لفظ اس خیال کی موافقت میں نظر پڑ گیا تو اس کو اپنے حق میں قرآنی دلیل سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ طریقہ کار اصولاً ہی غلط ہے کیونکہ مؤمن کا کام یہ ہے کہ اپنے خیالات و خواہشات سے خالی الذہن ہو کر کتاب و سنت کو دیکھے، جو کچھ ان سے واضح طور پر ثابت ہو جائے اسی کو اپنا مسلک قرار دے۔

أُولَٰئِكَ فِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ، اس جملہ میں ان کفار کا انجام بد بیان کیا گیا ہے جن کی تین صفتیں اوپر بیان ہوئی ہیں، اور حاصل اس کا یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی گمراہی میں بڑی دیر جا چکے ہیں، کہ اب ان کا راہ پر آنا مشکل ہے۔

احکام و مسائل

تفسیر قرطبی میں ہے کہ اگرچہ اس آیت میں صراحت یہ تین خصلتیں کفار کی بیان کی گئی ہیں، اور انہی کا یہ انجام ذکر کیا گیا ہے کہ وہ گمراہی میں دوڑ چلے گئے ہیں، لیکن اصول کی رُو سے جس مسلمان میں بھی یہ تین خصلتیں موجود ہوں وہ بھی اس وعید کا مستحق ہے، ان تین خصلتوں کا خلاصہ یہ ہے:

- (۱) دنیا کی محبت کو آخرت پر غالب رکھیں، یہاں تک کہ دین کی روشنی میں نہ آئیں۔
- (۲) دوسروں کو بھی اپنے ساتھ شریک رکھنے کے لئے اللہ کے راستہ سے روکیں۔
- (۳) قرآن و سنت کو ہیر پھیر کر کے اپنے خیالات پر منطبق کرنے کی کوشش کریں۔ **نوبالہ منہ**

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانٍ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ فَيُضِلَّ اللَّهُ

اور کوئی رسول نہیں بھیجا ہم نے مگر بولی بولنے والا اپنی قوم کی تاکہ انکو سمجھاے پھر رہتے بھٹاتا ہوا اللہ

مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝

جس کو چاہے اور رہتے دکھلا دیتا ہر جس کو چاہے اور وہ ہے زبردست حکمتوں والا ۔

خلاصہ تفسیر

اور اس کتاب کے منزل من اللہ ہونے میں جو بعض کفار کو یہ شبہ ہے کہ یہ عربی کیوں ہے جس سے احتمال ہوتا ہے کہ خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے تصنیف کر لیا ہوگا، یعنی زبان میں کیوں نہیں تاکہ یہ احتمال ہی نہ ہوتا، اور قرآن دوسری کتب سادہ سے عجیب ہونے میں متوافق بھی ہوتا تو یہ شبہ محض لغو ہے کیونکہ ہم نے تمام (پہلے) پیغمبروں کو (بھی) انہی کی قوم کی زبان میں پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، تاکہ ان کی زبان میں ان سے (احکام الہیہ کو) بیان کریں (کہ اصل مقصود واضح بیان ہے، تو سب کتابوں کا ایک زبان میں ہونا کوئی مقصد نہیں) پھر بیان کرنے کے بعد جس کو اللہ تعالیٰ چاہے گمراہ کرتے ہیں (کہ وہ ان احکام کو قبول نہیں کرتا) اور جس کو چاہیں ہدایت کرتے ہیں (کہ وہ ان احکام کو قبول کر لیتا ہے) اور وہی (سب امور پر) غالب ہے (اور) حکمت والا ہے (پس غالب ہونے کے سبب سب کو ہدایت کر سکتا تھا، مگر بہت سی حکمتیں اس کو مقفی نہ ہوتیں)۔

معارف ومسائل

پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کی اس نعمت اور سہولت کا ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب بھی کوئی رسول کسی قوم کی طرف بھیجا ہے تو اس قوم کا ہمزبان بھیجا ہے، تاکہ وہ احکام اللہ کی انہی کی زبان اور راہی کے محاورات میں مبتلا رہے اور ان کو اس کا سمجھنا آسان ہو، اگر رسول کی زبان امت کی زبان سے مختلف ہوتی تو ظاہر ہے کہ اس کے احکام سمجھنے میں اذیت کو ترجمہ کرنے کرانے کی مشقت بھی اٹھانا پڑتی، اور پھر بھی احکام کو صحیح سمجھنا مشکل رہتا، اس لئے اگر عبرانی زبان بولنے والوں کی طرف کوئی رسول بھیجا تو رسول کی زبان بھی عبرانی ہی تھی، فارسیوں کے رسول کی زبان بھی فارسی، بربریوں کے رسول کی زبان بربری رکھی گئی، خواہ اس صورت سے کہ جس شخص کو رسول بنایا گیا وہ خود اسی قوم کا فرد ہو اور مادری زبان اسی قوم کی زبان ہو، یا یہ کہ اس کی پیدائشی اور مادری زبان اگرچہ کچھ اور ہو مگر اللہ تعالیٰ نے ایسے اسباب پیدا فرمائے کہ اس نے اس قوم کی زبان سیکھ لی، جیسے حضرت نوح علیہ السلام اگرچہ اصل باشندے عراق کے تھے، جہاں کی زبان فارسی تھی، لیکن ملک شام کی طرف ہجرت کرنے کے بعد انہی لوگوں میں شادی کی اور شامیوں کی زبان ہی ان کی زبان بن گئی، تب اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک خطہ شام کا نبی بنایا۔

اور ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جن کی بعثت مکان و مقام کے اعتبار سے پوری دنیا کے لئے اور زمانے کے اعتبار سے قیامت تک کے لئے عام ہے دنیا کی کوئی قوم کسی ملک کی رہنے والی، کسی زبان کی بولنے والی آپ کے دائرۃ رسالت و نبوت سے باہر نہیں، اور قیامت تک جتنی قومیں اور زبانیں نئی پیدا ہوں گی، وہ بھی سب کی سب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت و دعوت میں داخل ہوں گی، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: **يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا**، یعنی اے لوگو! میں اللہ کا رسول ہوں تم سب کی طرف اور صحیح بخاری و مسلم میں بروایت جابر مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام انبیاء کے درمیان اپنی پانچ امتیازی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھ سے پہلے ہر رسول و نبی خاص اپنی قوم و برادری کی طرف مبعوث ہوا کرتا تھا، اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام اقوام بنی آدم کی طرف مبعوث فرمایا۔

حق تعالیٰ نے اس عالم میں انسانی آبادی کو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع فرمایا، اور انہی کو انسانوں کا سب سے پہلا نبی اور پیغمبر بنایا، پھر انسانی آبادی جس طرح اپنی عمرانی

اور اقتصادی حیثیت سے پھیلی اور ترقی کرتی رہی، اسی کی مناسبت سے رشد و ہدایت کے انتظامات بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف رسولوں و پیغمبروں کے ذریعہ ہوتے رہے، زمانہ کے ہر دور اور ہر قوم کے مناسب حال احکام اور شریعتیں نازل ہوتی رہیں، یہاں تک کہ عالم انسانی کا نشوونما سن کمال کو پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے سید الاولین و الآخرین امام الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پوری دنیا کا رسول بنا کر بھیجا اور جو کتاب و شریعت آپ کو دی وہ پورے عالم اور قیامت تک کے پورے زمانے کے لئے کامل و مکمل کر کے دی، اور ارشاد فرمایا: **آلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَسْمَعْتُ عَدِیْکُمْ نِعْمَتِیْ**، "یعنی میں نے آج تمھارے لئے دین کو مکمل کر دیا، اور اپنی نعمت تمھارے لئے پوری کر دی"۔

پہلے انبیاء علیہم السلام کی شریعتیں بھی اپنے وقت اور اپنے خطہ کے اعتبار سے کامل و مکمل تھیں، ان کو بھی ناقص نہیں کہا جاسکتا، لیکن شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا کمال کسی خاص وقت اور خاص خطہ کے ساتھ مخصوص نہیں، یہ کامل علی الاطلاق ہے، اسی حیثیت سے تکمیل دین اس شریعت کے ساتھ مخصوص ہے، اور اسی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلہ نبوت ختم کر دیا گیا۔

قرآن کریم عربی زبان میں کیوں ہوا؟ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح پہلی امتوں کے رسول ان کے ہمزبان بھیجے گئے ان کو ترجمہ کرنے کی محنت کی ضرورت نہ رہی، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم صرف عرب میں عربی زبان کے ساتھ کیوں مبعوث ہوئے؟ اور آپ کی کتاب و قرآن بھی عربی زبان ہی میں کیوں نازل ہوئی، لیکن غور و فکر سے کام لیا جائے تو جواب صاف ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور دعوت تمام اقوام دنیا کے لئے عام ہوئی جن میں سیکڑوں زبانیں رائج ہیں تو ان سب کی ہدایت کے لئے دو ہی صورتیں ممکن تھیں، ایک یہ کہ قرآن ہر قوم کی زبان میں جدا جدا نازل ہوتا، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و ہدایات بھی ہر قوم کی زبان میں جدا جدا ہوتیں، اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے ساتھ اس کا انتظام کوئی دشوار نہ تھا، لیکن تمام اقوام عالم کے لئے ایک رسول ایک کتاب ایک شریعت بھیجنے کا جو ایک عظیم مقصد ان تمام اقوام عالم میں ہزاروں طرح کے اختلافات کے باوجود دینی، اخلاقی، معاشرتی و وحدت اور یک جہتی پیدا کرنا ہے، وہ اس صورت حاصل نہ ہوتا۔ اس کے علاوہ جب ہر قوم ہر ملک کا قرآن و حدیث الگ زبان میں ہوتے تو اس میں تحریف قرآن کے بے شمار راستے کھل جاتے، اور قرآن کریم کے کلام کا محفوظ ہونا جو اس کی ایسی خصوصیت ہے کہ اغیار اور منکرین قرآن بھی اس کے تسلیم کرنے سے گریز نہیں کر سکتے یہ مجرب و

خصوصیت قائم نہ رہتی، اور ایک ہی دین ایک ہی کتاب کے ہوتے ہوئے اس کے ماننے والوں کی اتنی مختلف راہیں ہو جاتیں کہ کوئی نقطہ وحدت ہی باقی نہ رہتا، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم کے ایک عربی زبان میں نازل ہونے کے باوجود اس کی تعبیر و تفسیر میں کس قدر اختلافات جائز حدود میں پیش آئے، اور ناجائز و باطل طریقوں سے اختلافات کی تو کوئی حد نہیں، لیکن ان سب کے باوجود مسلمانوں کی قومی وحدت اور ممتاز تشخص ان سب لوگوں میں موجود ہے، جو قرآن پر کسی درجہ میں بھی عامل ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و بعثت پوری اقوام دنیا کے لئے عام ہونے کی صورت میں ان سب کی تعلیم و ہدایت کی یہ صورت کہ قرآن ہر قوم کی زبان میں الگ الگ ہوتا اس کو تو کوئی ادنیٰ سمجھ کا آدمی بھی درست نہیں سمجھ سکتا، اس لئے ضروری ہوا کہ قرآن کسی ایک ہی زبان میں آئے اور رسول کی زبان بھی وہی قرآن کی زبان ہو، پھر دوسری ملکی اور علاقائی زبانوں میں اس کے ترجمے پہنچائے اور پھیلائے جائیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب علماء ہر قوم ہر ملک میں آپ کی دی ہوئی ہدایات کو اپنی اپنی قوم و ملک کی زبان میں سمجھائیں اور شائع کریں، اس کے لئے حق تعالیٰ شانہ نے تمام دنیا کی زبانوں میں سے عربی زبان کا انتخاب فرمایا جس کی بہت سی وجوہ ہیں۔

عربی کی خصوصیات | اول یہ کہ عربی زبان آسمان کی دفتر کی زبان ہے، فرشتوں کی زبان عربی ہے، لوح محفوظ کی زبان عربی ہے جیسا کہ آیت قرآن بَلْ كُتِبَ الْقُرْآنُ فِي لَوْحٍ مَحْفُوظٍ سے معلوم ہوتا ہے، اور جنت، جو انسان کا وطن اصلی ہے اور جہاں اس کو لوٹ کر جانا ہے اس کی زبان بھی عربی ہے، طبرانی، مستدرک حاکم، شعب الایمان بیہقی میں بروایت حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ منقول ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أَحَبُّوا الْعَرَبَ لِثَلَاثٍ لَا بَنِي عَرَبِيٍّ وَالْقُرْآنُ عَرَبِيٌّ وَكَلَامُ أَهْلِ الْجَنَّةِ عَرَبِيٌّ، اس روایت کو حاکم نے مستدرک میں صحیح کہا ہے، جامع صغیر میں بھی صحیح کی علامت بتائی ہے، بعض محدثین نے اس کو ضعیف و مجرد کہا ہے، حافظ حدیث ابن تیمیہ نے کہا ہے کہ مضمون اس حدیث کا ثابت ہے درجہ حسن کے کم نہیں، (فیض القدر بشرح جامع صغیر، ص ۴۹ ج ۱)

معنی حدیث کے یہ ہیں کہ تم لوگ تین وجہ سے عرب سے محبت کرو، ایک یہ کہ میں عربی ہوں، دوسرے یہ کہ قرآن عربی ہے، تیسرے یہ کہ اہل جنت کی زبان عربی ہے۔

تفسیر قرطبی وغیرہ میں یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی زبان جنت میں عربی تھی، زمین پر نازل ہونے اور توبہ قبول ہونے کے بعد عربی ہی زبان میں کچھ تغیر ہو کر سریانی زبان پیدا ہو گئی۔

اس سے اُن روایات کی بھی تائید و تقویت ہوتی ہے جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ وغیرہ سے منقول ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی کتابیں انبیاء پر نازل فرمائی ہیں ان کی اصلی زبان عربی ہی تھی، جبریل امین نے قومی زبان میں ترجمہ کر کے پیغمبروں کو بتلایا اور انھوں نے اپنی قومی زبان میں امتوں کو پہنچایا، یہ روایات علامہ سیوطیؒ نے اتقان میں اور آیت مذکورہ کے ذیل میں اکثر مفسرین نے نقل کی ہیں، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سب آسمانی کتابوں کی اصل زبان عربی ہے، مگر قرآن کریم کے سوا دوسری کتابیں ملکی اور قومی زبانوں میں ترجمہ کر کے دی گئی ہیں، اس لئے ان کے معانی تو سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں مگر الفاظ بدلے ہوئے ہیں، یہ صرف قرآن کی خصوصیت ہے کہ اس کے معانی کی طرح الفاظ بھی حق تعالیٰ ہی کی طرف سے آئے ہوئے ہیں، اور شاید یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے یہ دعویٰ کیا کہ سارا جہان جنّ و انس سج ہو کر بھی قرآن کی ایک چھوٹی سورۃ بلکہ ایک آیت کی مثال نہیں بنا سکتے، کیونکہ وہ معنوی اور لفظی حیثیت سے کلام الہی اور ایک صفحت الہی ہے، جس کی کوئی نقل نہیں اتار سکتا، معنوی حیثیت سے تو دوسری آسمانی کتابیں بھی کلام الہی ہیں، مگر ان میں شاید اصل عربی الفاظ کے بجائے ترجمہ ہونے ہی کی وجہ سے یہ دعویٰ کسی دوسری آسمانی کتاب نے نہیں کیا، ورنہ قرآن کی طرح کلام الہی ہونے کی حیثیت سے ہر کتاب کی یتانی اور بے مثال ہونا یقینی تھا۔

عربی زبان کے انتخاب کی ایک وجہ خود اس زبان کی ذاتی صلاحیتیں بھی ہیں کہ ایک مفہوم کی ادائیگی کے لئے اس میں بے شمار صورتیں اور طریقے ہیں۔ اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مسلمان کو اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر عربی زبان سے ایک مناسبت عطا فرمائی ہے، جس کی وجہ سے ہر شخص باسانی عربی زبان بقدر ضرورت سیکھ لیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام جس ملک میں پہنچے تھوڑے ہی عرصہ میں بغیر کسی جبر و اکراہ کے پورے ملک کی زبان عربی ہو گئی، مصر، شام، عراق سب میں کسی کی زبان بھی عربی نہ تھی، جو آج عربی ممالک کہلاتے ہیں ایک یہ وجہ بھی ہے کہ عرب لوگ اگرچہ اسلام سے پہلے سخت بد اعمالیوں کے شکار تھے مگر اس قوم کی صلاحیتیں اور ملکات اور جذبات ان حالتوں میں بھی بے نظیر تھے، یہی وجہ تھی کہ حق تعالیٰ نے اپنے سب سے بڑے اور آخری رسول کو ان میں پیدا فرمایا، اور ان کی زبان کو قرآن کے لئے اختیار فرمایا، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے پہلے انہی کی ہدایت و تعلیم کا حکم دیا وَ اَنْتَ رَحْمَتُ رَبِّكَ الْاَوَّلٰی بَیِّنٌ، اور سب سے پہلے اسی قوم کے ایسے افراد اپنے رسول کے گرد جمع فرمادیئے، جنھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی جان، مال، اولاد سب کچھ قربان کیا اور آپ کی تعلیمات کو جانوں سے زیادہ عزیز سمجھا، اور اس طرح ان پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کی صحبت و تعلیم کا وہ گہرا رنگ چڑھا کہ پوری دنیا میں ایک ایسا مثالی معاشرہ پیدا ہو گیا جس کی نظیر اس سے پہلے آسمان و زمین نے نہیں دیکھی تھی، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بے مثال جماعت کو قرآنی تعلیمات کے پھیلائے اور شائع کرنے کے لئے کھڑا کر دیا اور فرمایا:

بَلِّغُوا عَنِّي ذِكْرَ آيَةٍ، یعنی مجھ سے سنی ہوئی بات کو امت تک پہنچا دو، جاں نثار صحابہ نے اس ہدایت کو پتے باندھا، اور دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچ کر قرآن اور اس کی تعلیمات کو جہاں میں پھیلا دیا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر پچیس سال گزرنے نہ پاتے تھے کہ قرآن کی آواز مشرق و مغرب میں گونجنے لگی۔

دوسری طرف حق تعالیٰ نے تقدیری اور تکوینی طور پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت دعوت جس میں دنیا کے مشرکین اور اہل کتاب یہود و نصاریٰ سب داخل ہیں، ان میں ایک خاص ملکہ اور جذبہ تعلیم و تعلم اور تصنیف و تالیف، تبلیغ و اشاعت کا ایسا پیدا فرما دیا کہ اس کی نظیر دنیا کی پچھلی تاریخ میں نہیں ملتی، اس کے نتیجہ میں عجمی اقوام میں نہ صرف قرآن و سنت کے علوم حاصل کرنے کا قوی جذبہ پیدا ہوا بلکہ عربی زبان کو حاصل کرنے اور اس کی ترویج و اشاعت میں عجمیوں کا قدم عرب سے پیچھے نہیں رہا۔

یہ ایک حیرت انگیز حقیقت ہے کہ اس وقت عربی لغت اور محاورات اور اس کے قواعد و صرف (گرامر) پر جتنی کتابیں دنیا میں موجود ہیں وہ بیشتر عجمیوں کی لکھی ہوئی ہیں، قرآن و سنت کی جمع و تدوین پھر تفسیر و تشریح میں بھی ان کا حصہ عربوں سے کم نہیں رہا۔ اس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اور آپ کی کتاب عربی ہونے کے باوجود پورے عالم پر محیط ہو گئی، اور دعوت و تبلیغ کی حد تک عرب و عجم کا فرق مٹ گیا، ہر ملک قوم اور ہر عجمی زبان کے لوگوں میں ایسے علماء پیدا ہو گئے جنہوں نے قرآن و سنت کی تعلیمات کو اپنی قومی زبانوں میں نہایت سہولت کے ساتھ پہنچا دیا، اور رسول کو قوم کی زبان میں بھیجنے کی جو حکمت تھی وہ جاہل ہو گئی۔

آخر آیت میں فرمایا کہ ہم نے لوگوں کی سہولت کے لئے اپنے رسولوں کو ان کی زبان میں اس لئے بھیجا کہ وہ ہمارے احکام ان کو اچھی طرح سمجھا دیں، لیکن ہدایت اور گمراہی پھر بھی کسی انسان کے بس میں نہیں، اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت میں ہے وہ جس کو چاہتے ہیں گمراہی میں رکھتے ہیں جس کو چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں، وہی بڑی قوت اور حکمت والے ہیں۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ

اور بھیجا تھا ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دیکھ کر نکال اپنی قوم کو اندھیروں سے

إِلَى النُّورِ ۚ وَذَكَرْهُمْ يَا يُسُفُّ اللَّهُ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ

آجالے کی طرف اور یاد دلا ان کو دن اللہ کے، البتہ اس میں نشانیاں ہیں اس کو جو صبر

صَبَّارٍ شَكُورٍ ۝ وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِذْ كُنتُمْ وَالْعِمَّةَ ۚ اللَّهُ

کرنے والا ہر شکر گزار، اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو یاد کرو اللہ کا احسان اپنے

عَلَيْكُمْ إِذْ أَنْجَاكُمْ مِّنَ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ

اوپر جب بچھا دیا تم کو فرعون کی قوم سے وہ پہنچاتے تھے تم کو برا عذاب،

وَيَذَّبَحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ ۚ وَفِي ذَٰلِكُمْ

اور ذبح کرتے تھے بچوں کو اور زندہ رکھتے تھے عورتوں کو اور اس میں درد

بَلَاءٍ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٍ ۝ وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِن

ہوئی تمہارے رب کی طرف سے بڑی، اور جب سنا دیا تمہارے رب نے اگر احسان

شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّ بِدَٰئِكُمْ وَلَئِن كُفِرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ ۝

مانو گے تو اور بھی دوں گا تم کو اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب البتہ سخت ہے،

وَقَالَ مُوسَىٰ إِنَّ تَكْفُرًا أَنتُمْ وَمَن فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا

اور کہا موسیٰ نے اگر کفر کرو گے تم اور جو لوگ زمین میں ہیں سارے،

فَإِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ حَمِيدٌ ۝

تو اللہ بے پردہ ہے سب خوبیوں والا۔

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنی نشانیاں دے کر بھیجا کہ اپنی قوم کو (کفر و معاصی کی)

تاریکیوں سے (نکال کر ایمان و طاعت کی) روشنی کی طرف لاؤ اور ان کو اللہ تعالیٰ کے معاملات

(نعمت اور عذاب کے) یاد دلاؤ بلاشبہ ان معاملات میں عبرتیں ہیں ہر صابر و شاکر کے لئے

دیکھو کہ نعمت کو یاد کر کے شکر کرے گا اور نعمت یعنی عتاب کو پھر اس کے زوال کو یاد کر کے آئندہ حوادث میں صبر کرے گا اور اس وقت کو یاد کیجئے کہ جب پہلے اس ارشاد بالا کے موافق موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ کا انعام اپنے اوپر یاد کرو جب کہ تم کو فرعون والوں سے نجات دی جو تم کو سخت تکلیفیں پہنچاتے تھے اور تمہارے بیٹوں کو ذبح کر دیتے تھے اور تمہاری عورتوں کو (یعنی لڑکیوں کو جو کہ بڑی ہو کر عورتیں ہو جاتی تھیں) زندہ چھوڑ دیتے تھے (تاکہ ان سے کار و خدمت لیں سو یہ بھی مثل ذبح ہی کے ایک عقوبت تھی) اور اس (مصیبت اور نجات دونوں) میں تمہارے رب کی طرف سے ایک بڑا امتحان ہے (یعنی مصیبت میں بلا تھی اور نجات میں نعمت تھی اور بلا اور نعمت دونوں بندے کے لئے امتحان ہیں پس اس میں موسیٰ علیہ السلام نے ایام اللہ یعنی نعمت و نعمت دونوں کی تذکرہ فرمادی) اور موسیٰ (علیہ السلام) نے یہ بھی فرمایا کہ اے میری قوم! وہ وقت یاد کرو جب کہ تمہارے رب نے (میرے ذریعہ سے) تم کو اطلاع فرمادی کہ اگر (میری نعمتوں کو سن کر) تم شکر کرو گے تو تم کو (خواہ دنیا میں بھی یا آخرت میں تو ضرور) زیادہ نعمت دوں گا اور اگر تم (ان نعمتوں کو شکر) ناشکری کرو گے تو (یہ سمجھ رکھو کہ) میرا عذاب بڑا سخت ہے (ناشکری میں اس کا احتمال ہے) اور موسیٰ (علیہ السلام) نے (یہ بھی) فرمایا کہ اگر تم اور تمام دنیا بھر کے آدمی سب کے سب مل کر بھی ناشکری کرنے لگو تو اللہ تعالیٰ رکاوٹی ضرر نہیں کیونکہ وہ) بالکل بے حسیاج (اور اپنی ذات میں) ستودہ صفات ہیں (ہتکمال بالغیر کا وہاں احتمال نہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ کا ضرر مختل ہی نہیں اور تم اپنا ضرر سن چکے ہو ان عذابِ تشدید اس لئے شکر کرنا ناشکری مت کرنا)

معارف و مسائل

پہلی آیت میں مذکور ہے کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی آیات دے کر بھیجا کہ وہ اپنی قوم کو کفر و محصیت کی تاریکیوں سے ایمان و طاعت کی روشنی میں لے آئیں۔
لفظ آیات سے آیات تورات بھی مراد ہو سکتی ہیں کہ ان کے نازل کرنے کا مقصد ہی حق کی روشنی پھیلانا تھا، اور آیات کے دوسرے معنی معجزات کے بھی آتے ہیں، وہ بھی اس جگہ مراد ہو سکتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے نو معجزات خاص طور سے عطا فرمائے تھے جن میں عصا کا سانپ بن جانا اور ہاتھ کا روشن ہو جانا کئی جگہ قرآن میں مذکور ہے، آیات کو معجزات کے معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایسے کھلے ہوئے معجزات دے کر بھیجا گیا جن کو دیکھنے کے بعد کوئی شریف سمجھدار انسان اپنے انکار اور نافرمانی

پر قائم نہیں رہ سکتا۔

ایک نکتہ | اس آیت میں لفظ قوم آیا ہے کہ اپنی قوم کو اندھیری سے روشنی میں لائیں، لیکن یہی مضمون اسی سورۃ کی پہلی آیت میں جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے بیان کیا گیا تو وہاں قوم کے بجائے لفظ ناس استعمال کیا گیا، لَتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ، اس میں اشارہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت و بعثت صرف اپنی قوم بنی اسرائیل اور مصری اقوام کی طرف تھی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تمام عالم کے انسانوں کے لئے ہے۔

پھر ارشاد فرمایا اذْكُرْ هَمًّا بِأَمْرِ اللَّهِ، یعنی حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنی قوم کو ایام اللہ یاد دلاؤ۔

ایام اللہ | ایام، یوم کی جمع ہے، جس کے معنی دن کے مشہور ہیں، لفظ ایام اللہ دو معنی کے لئے بولا جاتا ہے، اور وہ دونوں یہاں مراد ہو سکتے ہیں، اول وہ خاص ایام جن میں کوئی جنگ یا انقلاب آیا ہے، جیسے غزوہ بدر و احد اور احزاب و حنین وغیرہ کے واقعات یا پھیلی امتوں پر عذاب نازل ہونے کے واقعات ہیں، جن میں بڑی بڑی قومیں زیر و زبر یا نیست و نابود ہو گئیں، اس صورت میں ایام اللہ یاد دلانے سے ان قوموں کو کفر کے انجام بد سے ڈرانا اور متنبہ کرنا مقصود ہوگا۔

دوسرے معنی ایام اللہ کے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور احسانات کے بھی کہتے ہیں تو ان کو یاد دلانے کا مقصد یہ ہوگا کہ شریف انسان کو جب کسی محسن کا احسان یاد دلایا جائے تو وہ اس کی مخالفت اور نافرمانی سے شرماتا ہے۔

قرآن مجید کا اسلوب اور طریق اصلاح عموماً یہ ہے کہ جب کوئی حکم دیا جاتا ہے تو ساتھ ہی اس حکم پر عمل آسان کرنے کی تدبیریں بھی بتلائی جاتی ہیں، یہاں پہلے جملہ میں موسیٰ علیہ السلام کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کی آیات سنا کر یا معجزات دیکھا کر اپنی قوم کو کفر کی اندھیری سے نکالو، اور ایمان کی روشنی میں لاؤ، اس کی تدبیر اس جملہ میں یہ ارشاد فرمائی کہ ناسرمانوں کو راہ راست پر لانے کی دو تدبیریں ہیں، ایک منزل سے ڈرانا، دوسرے نعمتوں اور احسانات کو یاد دلا کر اطاعت کی طرف بلانا، جملہ اذْكُرْ هَمًّا بِأَمْرِ اللَّهِ میں یہ دونوں چیزیں مراد ہو سکتی ہیں کہ پھیلی امتوں کے نافرمانوں کا انجام بد ان پر آنے والے عذاب اور جہاد میں ان کا مقتول یا ذلیل و خوار ہونا ان کو یاد دلائیں، تاکہ وہ عبرت حاصل کر کے اس سے بچ جائیں، اسی طرح اس قوم پر جو اللہ تعالیٰ کی عام نعمتیں دن رات برستی ہیں اور جو مخصوص نعمتیں ہر موقع پر ان کے لئے

مبذول ہوتی ہیں، مثلاً وادی تپہ میں ان کے سروں پر ابر کا سایہ، خوراک کے لئے من و سلوئی کا نزول پانی کی ضرورت ہوتی تو پتھر سے چشموں کا بہہ نکلنا وغیرہ ان کو یاد دلا کر خدا تعالیٰ کی اطاعت اور توحید کی طرف بلایا جاتے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَا يَتَّبِعُ كَلِمًا صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝۱۴ اس میں آیات سے مراد نشانیاں اور دلائل ہیں، اور صَبَّار صبر سے مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں بہت صبر کرنے والا اور شَكُوْر شکر سے مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں بہت شکر گزار، جملہ کے معنی یہ ہیں کہ اَتَايَمُ اللہ یعنی پچھلے واقعات خواہ وہ جو منکروں کی سزا اور عذاب سے متعلق ہوں یا اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات سے متعلق بہر حال ماضی کے واقعات میں اللہ تعالیٰ کی قدر کاملہ اور کثرت نعمت کی بڑی نشانیاں اور دلائل موجود ہیں اس شخص کے لئے جو بہت صبر کرنے والا اور بہت شکر کرنے والا ہو۔

مطلب یہ ہے کہ یہ کھلی ہوئی نشانیاں اور دلائل اگرچہ ہر غور کرنے والے کی ہدایت کے لئے ہیں مگر بد نصیب کفار ان میں غور و فکر ہی نہیں کرتے ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے، فائدہ صرف وہ لوگ اٹھاتے ہیں، جو صبر و شکر کے جامع ہیں، مراد اس سے مؤمن ہیں، کیونکہ بیہقی نے بروایت انسؓ نقل کیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایمان کے درجے میں آدھا صبر اور آدھا شکر (مظہری)۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ صبر نصف ایمان ہے، اور صبح مسلم اور مسر احمد میں بروایت حضرت مصیبؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مؤمن کا ہر حال خیر ہی خیر اور بھلا ہی بھلا ہے، اور یہ بات سوائے مؤمن کے اور کسی کو نصیب نہیں، کیونکہ مؤمن کو اگر کوئی راحت، نعمت یا عزت ملتی ہے تو وہ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوتا ہے جو اس کے لئے دین و دنیا میں خیر اور بھلائی کا سامان ہو جاتا ہے رد دنیا میں تو حسب وعدہ الہی نعمت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے، اور قائم رہتی ہے، اور آخرت میں اس کے شکر کا اجر عظیم اس کو ملتا ہے، اور اگر مؤمن کو کوئی تکلیف یا مصیبت پیش آجائے تو وہ اس پر صبر کرتا ہے اس کے صبر کی وجہ سے وہ مصیبت بھی اس کے لئے نعمت و راحت کا سامان ہو جاتی ہے رد دنیا میں اس طرح کہ صبر کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی معیت نصیب ہوتی ہے، قرآن کا ارشاد ہے اِنَّ اللہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ، اور اللہ جس کے ساتھ ہوا انجام کار اس کی مصیبت راحت سے تبدیل ہو جاتی ہے، اور آخرت میں اس طرح کہ صبر کا اجر عظیم اللہ تعالیٰ کے نزدیک بے حساب ہے، جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے اِنَّمَآ یُوْفٰی الصَّابِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِخَيْرٍ حَسَابٍ ۝۱۵، خلاصہ یہ ہے کہ مؤمن کا کوئی حال بُرا نہیں ہوتا، اچھا ہی اچھا ہے، وہ گرنے میں بھی

اُبھرتا ہے اور بگڑنے میں بھی بنتا ہے، ۵

نہ شوخی چل سکی بادِ صبا کی،

بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی

ایمان وہ دولت ہر جو مصیبت و تکلیف کو بھی راحت و نعمت میں تبدیل کر دیتی ہے۔
حضرت ابوالدرداءؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے
حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ میں آپ کے بعد ایک ایسی امت پیدا کرنے والا ہوں کہ
اگر ان کی دلی مراد پوری ہو اور کام حسبِ منشاء ہو جائے تو وہ شکر ادا کریں گے، اور اگر ان کی
خواہش اور مرضی کے خلاف ناگوار اور نا پسندیدہ صورتِ حال پیش آئے تو وہ اس کو ذریعہ
ثواب سمجھ کر صبر کریں گے اور یہ دانشمندی اور بردباری ان کی اپنی ذاتی عقل و حلم کا نتیجہ نہیں،
بلکہ ہم ان کو اپنے علم و حلم کا ایک حصہ عطا فرما دیں گے (منہجری)
شکر کی حقیقت کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو اس کی نافرمانی اور حرام
و ناجائز کاموں میں خرچ نہ کرے اور زبان سے بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے اور اپنے افعال و
اعمال کو بھی اس کی مرضی کے مطابق بنائے۔

اور صبر کا خلاصہ یہ ہے کہ خلافِ طبع امور پر پریشان نہ ہو، اپنے قول و عمل میں ناشکری
سے بچے، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کا دنیا میں بھی امیدوار رہے اور آخرت میں صبر کے اجرِ عظیم
کا یقین رکھے۔

دوسری آیت میں عنون سابق کی مزید تفصیل ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا
کہ وہ اپنی قوم بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ کی یہ خاص نعمت یاد دلائیں کہ موسیٰ علیہ السلام سے پہلے
فرعون نے ان کو ناجائز طور پر غلام بنایا ہوا تھا، اور پھر ان غلاموں کے ساتھ بھی انسانیت کا
سلوک نہ تھا، ان کے لڑکوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دیا جاتا تھا، اور صرف لڑکیوں کو اپنی خدمت
کے لئے پالا جاتا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد ان کی برکت سے اللہ تعالیٰ
نے ان کو اس فرعونی عذاب سے نجات دیدی۔

شکر اور ناشکری کے نتائج

دَاذِ تَاَذَنَ رَقِیْکُمْ لَیْنِ شَکْرٍ تُمْرَ لَا رِیْدَ تَکْفُرٍ وَلَیْنِ
کَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابَ اٰبِیْ نَکَشٍ یِّدٌ، لَفِظ تَاَذَنَ، اَذِن اور اطلاع
دینے اور اعلان کرنے کے معنی میں ہے، مطلب آیت کا یہ ہے کہ یہ بتیاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان عام فرمادیا کہ اگر تم میری نعمتوں کا شکر ادا کیا
کراؤ تو میری فرمانیوں اور ناجائز کاموں میں خرچ نہ کیا اور اپنے اعمال و افعال کو میری مرضی کے مطابق بنائے
کی کوشش کی تو میں ان نعمتوں کو اور زیادہ کر دوں گا، یہ زیادتی نعمتوں کی مقدار میں بھی ہو سکتی ہے،

اور ان کے بقا و دوام میں بھی، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کو شکر ادا کرنے کی توفیق ہوگئی وہ کبھی نعمتوں میں برکت اور زیادت سے محروم نہ ہوگا (رواہ ابن مردویہ عن ابن عباس مظہری)، اور فرمایا کہ اگر تم نے میری نعمتوں کی ناشکری کی تو میرا عذاب بھی سخت ہے، ناشکری کا حاصل یہی ہے کہ اللہ کی نعمتوں کو اس کی نافرمانی اور ناجائز کاموں میں صرف کرے، یا اس کے فرائض و واجبات کی ادائیگی میں سستی کرے، اور کفرانِ نعمت کا عذاب شدید دنیا میں بھی یہ ہو سکتا ہے کہ یہ نعمت سلب ہو جائے یا ایسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے کہ نعمت کا فائدہ نہ اٹھا سکے اور آخرت میں بھی عذاب میں گرفتار ہو۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے شکر گزاروں کے لئے تو اجر و ثواب اور نعمت کی زیادتی کا وعدہ اور وہ بھی بلفظ تاکید وعدہ فرمایا ہے لَا زَيْدٌ لَّكُمْ لیکن اس کے بالمقابل ناشکری کرنے والوں کے لئے یہ نہیں فرمایا کہ لَا عَذَابٌ بِّكُمْ یعنی میں تمہیں ضرور عذاب دوں گا، بلکہ صرف اتنا فرما کر ڈرایا ہے کہ میرا عذاب بھی جس کو پہونچے، وہ بڑا سخت ہوتا ہے، اس خاص تعبیر میں اشارہ ہے کہ ہر ناشکرے کا گرفتار عذاب ہونا کچھ ضروری نہیں معافی کا بھی امکان ہے۔

قَالَ مُوسَىٰ إِنَّ تَكْفُرًا أَنتُمْ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا، فَإِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ غَنِيًا
یعنی موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اگر تم سب اور جتنے آدمی زمین پر آباد ہیں وہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کرنے لگو تو یاد رکھو کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں، وہ تو سب کی حمد و ثنا، اور شکر و ناشکری سے بے نیاز اور بالائز ہو اور وہ اپنی ذات میں حمید یعنی مستحق حمد ہے، اس کی حمد تم نہ کرو تو اللہ کے سارے فرشتے اور کائنات کا ذرہ ذرہ کر رہا ہے۔

شکر کا فائدہ ہو کچھ ہے وہ تمہارے ہی لئے ہے، اس لئے شکر گزاری کی تاکید اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ اپنے فائدے کے لئے نہیں بلکہ بسبب رحمت تمہیں ہی فائدہ پہونچانے کے لئے ہے۔

أَكْمَرِيَا قَوْمُ النَّبِيِّ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَعَادٌ وَثَمُودٌ

کیا نہیں پہنچی تم کو خبر ان لوگوں کی جو پہلے تھے تم سے قوم نوح کی اور عاد اور ثمود

وَالَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا اللَّهُ ط جَاءَهُمْ رَسُولُهُمْ

اور جو ان سے پیچھے ہوئے، کسی کو ان کی خبر نہیں مگر اللہ کو آئے ان کے پاس ان کے رسول

بِالْبَيِّنَاتِ فَرَدُّوا أَيْدِيَهُمْ فِي أَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوا إِنَّا كَفَرْنَا بِمَا

نشانیاں لے کر پھر لوٹائے انھوں نے اپنے ہاتھ اپنے منہ میں اور بولے ہم نہیں مانتے جو تم کو

اَسْرُسَلْتُمْ بِهِ وَاِنَّا لَفِي شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُونَا اِلَيْهِ مُرِيبٍ ⑨

دے کر بھیجا گیا اور ہم کو تو شبہ ہے اس راہ میں جس کی طرف تم ہم کو بلاتے ہو غلبان میں ڈالنے والا

قَالَتْ رُسُلُهُمْ اِنِّي اللّٰهُ شَكُّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَدْعُوَكُمْ

بولے ان کے رسول کیا اللہ میں شبہ ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین وہ تم کو بلاتا ہے

لِيَخْفِيَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوبِكُمْ وَيُخْرِجَكُمْ اِلَىٰ اَجَلٍ مُّسَمًّى ۖ قَالُوا

تاکہ بنٹے تم کو کچھ گناہ تمھارے اور ڈھیل دے تم کو ایک وعدہ تک جو ظہر چکا ہو کہنے لگے

اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا تُرِيدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانِ

تم تو یہی آدمی ہو ہم جیسے ، تم چاہتے ہو کہ روک دو ہم کو ان چیزوں سے جن کو پوجتے رہے

يَعْبُدُ اٰبَاؤُنَا فَاتُّوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۚ ⑩ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ

ہمارے باپ دادا سولاؤ کوئی سند کھلی ہوئی ، ان کو کہا ان کے رسولوں نے

اِنْ تَنْحَرِ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰی مَنْ يَّشَآءُ ۚ مِّنْ

ہم تو یہی آدمی ہیں جیسے تم لیکن اللہ احسان کرتا ہے اپنے بندوں میں جس پر

عِبَادِهٖ ۚ وَمَا كَانَ لَنَا اَنْ نَّاتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَعَلٰی

چاہے ، اور ہمارا کام نہیں کہ لے آئیں تمھارے پاس سند مگر اللہ کے حکم سے اور اللہ

اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۚ ⑪ وَمَا لَنَا اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلٰی اللّٰهِ وَقَدْ

پر بھروسہ چاہتے ایمان والوں کو ، اور ہم کو کیا ہوا کہ بھروسہ نہ کریں اللہ پر اور

هٰذَا نَسُئِبُنَا وَنَحْصِرُنَّ عَلٰی مَا اٰذَيْنَا وَنَاوَعَلٰی اللّٰهُ فَلْيَتَوَكَّلِ

وہ سمجھا چکا ہم کو ہماری راہیں ، اور ہم صبر کریں گے ایذا پر جو تم ہم کو دیتے ہو اور اللہ پر بھروسہ چاہو

اَلْمُتَوَكِّلُوْنَ ۚ ⑫ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِلٰی رُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ

بھروسے والوں کو ، اور کہا کافروں نے اپنے رسولوں کو ہم نکال دیں گے تم کو

مِّنْ أَرْضِنَا أَوْ لَتَعُوْدَنَّ فِي مِלَّتِنَا فَأَوْحَىٰ إِلَيْهِمْ رَبُّكَ لَهَا لِكُنَّ

اپنی زمین سے یا لوٹ آؤ ہمارے دین میں، تب حکم بھیجا ان کو ان کے رب نے ہم غارت کریں گے

الظَّالِمِينَ ﴿۱۴﴾ وَلَنَسِيكَنَّكُمْ أَلْأَرْضَ مِنْ بَعْدِهِمْ ط ذٰلِكَ

ان ظالموں کو، اور آباد کریں گے تم کو اس زمین میں اُن کے بچے، یہ ملتا ہے

لِمَنْ خَافَ مَقَامِي وَخَافَ وَعِثِدِ ﴿۱۵﴾ وَاسْتَفْتَحُوا وَخَابَ

اس کو جو ڈرتا ہو کھڑے ہونے سے میرے سامنے اور ڈرتا ہو میری عذاب کے وعدے سے، اور فیصلہ لگے مانگنے پیغمبر اور

كُلَّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ ﴿۱۵﴾

ہوا ہر ایک سرکش ضدی۔

حُلاصۃ تفسیر

اے کفار مکہ، کیا تم کو ان لوگوں کے واقعات کی خبر دگوا جیسا کہ ہے، انہیں پہنچی جو تم سے پہلے ہو گئے ہیں یعنی قوم نوح اور عاد (قوم ہود) اور ثود (قوم صالح) اور جو لوگ اُن کے بعد ہوئے ہیں جن کی مفصل حالت کو بجز اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا، (کیونکہ ان کے حالات تفصیلات منضبط و منقول نہیں ہوتے، اور وہ واقعات یہ ہیں کہ) ان کے پیغمبر اُن کے پاس دلائل لے کر آئے سوان قوموں (میں جو کفار تھے انھوں نے اپنے ہاتھ اُن پیغمبروں کے منہ میں دیدیئے (یعنی مانتے تو کیا یہ کوشش کرتے تھے کہ ان کو بات تک نہ کرنے دیں) اور کہنے لگے کہ جو حکم دے کر تم کو (بزرگم تمھارے) بھیجا گیا ہے (یعنی توحید و ایمان) ہم اس کے منکر ہیں، اور جس امر کی طرف تم ہم کو بلا لے ہو (یعنی وہی توحید و ایمان) ہم تو اس کی جانب سے بہت بڑے مشبہ میں ہیں جو (ہم کو) تردد میں ڈالے ہوئے ہے (مقصود اس سے توحید و رسالت دونوں کا انکار ہے، توحید کا تو ظاہر ہے اور رسالت کا تدعوٰنا میں، جس کا حاصل یہ ہے کہ تم خود اپنی رائے سے دعوتِ توحید کر رہے ہو، مامور و مرسل من اللہ نہیں ہو) ان کے پیغمبروں نے اس بات کے جواب میں کہا کیا (تم کو) اللہ تعالیٰ کے بارے میں (یعنی اس کی توحید میں) شک (و انکار) ہے جو کہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے (یعنی اس کا ان چیزوں کو پیدا کرنا خود دلیل اس کی ہستی اور وحدانیت کی ہے، پھر اس دلیل کے ہوتے ہوئے شک کز باٹری تعجب کی بات ہے اور تم جو دعوت الی التوحید کو استقلالاً ہماری طرف منسوب کرتے ہو یہ

بھی محض غلط ہے گو توحید بوجہ حق ہونے کے اس قابل ہے کہ اگر کوئی اپنی رائے سے بھی اس کی دعوت کرے تو بھی زیبا ہے، لیکن محل متنازع فیہ میں تو ہماری دعوت بحکم خداوند تعالیٰ ہی (ہے) وہ (ہی) تم کو توحید کی طرف، بلارہا ہے تاکہ (اس کے قبول کرنے کی برکت سے) تمہارا (گزشتہ) گناہ معاف کر دے اور (تمہاری عمر کی) معین مدت تک تم کو (خیر و خوبی کے ساتھ) حیات دے (مطلب یہ کہ توحید علاوہ اس کے کہ فی نفسہ حق ہے تمہارے لئے دونوں جہان میں نافع بھی ہے، اور اس جواب میں دونوں امر کے متعلق جواب ہو گیا، توحید کے متعلق بھی آئی اللہ شاک الخ اور رسالت کے متعلق بھی یٰٰنَّ مُحَمَّدٌ میں جیسا تقریر ترجمہ سے ظاہر ہے) پھر انہوں نے (پھر دونوں امر کے متعلق گفتگو شروع کی اور) کہا کہ تم (پیغمبر نہیں ہو بلکہ) محض ایک آدمی ہو جیسے ہم ہیں (اور بشریت منافی رسالت ہے، تم جو کہتے ہو وہ من اللہ نہیں ہے بلکہ) تم (اپنی رائے ہی سے) یوں چاہتے ہو کہ ہمارے آباء و اجداد جس چیز کی عبادت کرتے تھے، (یعنی بت) اس سے ہم کو روک دو ہو (اگر رسالت کے مدعی ہو تو علاوہ ان دلائل و بیانات مذکورہ کے اور) کوئی صاف معجزہ دکھلاؤ (جو ان سب کے واضح تر ہو، اس میں نبوت پر تو کلام ظاہر ہے، اور یَعْبُدُ الْبَاطِلَ وَنَاہِیں توحید کلام کی طرف اشارہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ شرک کے حق ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ہمارے بزرگ اس کو کرتے تھے) ان کے رسولوں نے (اس کے جواب میں) کہا کہ (تمہاری تقریر کے کئی جزو ہیں، انکار توحید دلیل فعل آباء، انکار نبوت مطالبہ سلطان مبین علاوہ بیانات سابقہ، سو امر اول کے متعلق قَاطِبِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ، میں جواب ہو گیا، کیونکہ دلیل عقل کے رد و رسم و عزت کوئی چیز نہیں، امر دوم کے متعلق ہم اپنی بشریت کو تسلیم کرتے ہیں کہ واقعی) ہم بھی تمہارے جیسے آدمی ہیں لیکن (بشریت اور نبوت میں تنافی نہیں، کیونکہ نبوت ایک اعلیٰ درجہ کا احسان خداوندی ہے اور) اللہ کو اختیار ہے کہ) اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے (وہ) احسان فرما دے (اور احسان کے غیر بشر کے ساتھ مختص ہونے کی کوئی دلیل نہیں) اور (امر سوم کے متعلق یہ ہو کہ دعویٰ کے لئے جس میں دعویٰ نبوت بھی داخل ہے، نفس دلیل اور مطلق بلکہ جو دعویٰ نبوت کی صورت میں معجزہ ہو گا ضرور ہو جو کہ پیش کی جا چکی ہے، رہا دلیل معجزہ خاص جس کو سلطان مبین یعنی صاف دلیل سے تعبیر کر رہے ہو سو اولاً حسب قواعد مناظرہ ضروری نہیں ثانیاً، یہ بات ہمارے قبضہ کی نہیں کہ ہم تم کو کوئی معجزہ دکھلا سکیں بغیر خدا کے حکم کے پس تمہارے تمام تر شبہات کا جواب ہو گیا، پھر اگر اس پر بھی تم نہ مانو اور مخالفت کئے جاؤ تو خیر ہم تمہاری مخالفت سے نہیں ڈرتے بلکہ اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں) اور اللہ ہی پر سب

ایمان والوں کو بھروسہ کرنا چاہئے، (چونکہ ہم بھی با ایمان ہیں اور ایمان مقتضی ہے توکل کو اس لئے ہم بھی اس کو اختیار کرتے ہیں) اور ہم کو اللہ پر بھروسہ نہ کرنے کا کون امر باعث ہو سکتا ہے، حالانکہ اس نے (ہماری حالت پر بڑا فضل کیا کہ) ہم کو ہمارے (منافع دارین کے) رستے بتلا دیتے (جس کا اتنا بڑا فضل ہو اس پر تو ضرور بھروسہ کرنا چاہئے) اور (عتر خارجی سے تو یوں بے فکر ہو گئے، رہا ضرر داخلی کہ تمہاری مخالفت کا غم و حزن ہوتا ہو) تم نے (عناد و خلاف کر کے) جو کچھ ہم کو ایذا پہنچائی ہے ہم اس پر صبر کریں گے (پس اس سے بھی ہم کو ضرر نہ رہا اور حاصل اس صبر کا بھی وہی توکل ہے) اور اللہ ہی پر بھروسہ کرنے والوں کو (ہمیشہ) بھروسہ رکھنا چاہئے اور (ان تمام تر اسقام حجت کے بعد بھی کفار نرم نہ ہوئے بلکہ) ان کفار نے اپنے رسولوں سے کہا کہ ہم تم کو اپنی سر زمین سے نکال دیں گے، یا یہ ہو کہ تم ہمارے مذہب میں پھر آ جاؤ (پھر آنا اس لئے کہا کہ سکوت قبل بعثت سے وہ بھی یہی سمجھتے تھے کہ ان کا اعتقاد بھی ہم ہی جیسا ہو گا، پس ان رسولوں پر ان کے رب نے (تسلّی کے لئے) وحی نازل فرمائی کہ (یہ بیچارے تم کو کیا نکالیں گے ہم (ہی) ان ظالموں کو ضرور ہلاک کر دیں گے اور ان کے (ہلاک کرنے کے) بعد تم کو اس سر زمین میں آباد رکھیں گے (اور) یہ (دعویٰ آباد رکھنے کا کچھ تمہارے ساتھ خاص نہیں، بلکہ) ہر اس شخص کے لئے (عام) ہے جو میرے روبرو کھڑے ہونے سے ڈرے اور میری وعید سے ڈرے (مراد یہ کہ جو مسلمان ہو جس کی سلامت خوف قیامت اور خوفِ وعید ہے سب کیلئے یہ وعدہ عذاب سے نجات دینے کا عام ہے) اور (پیشبردن نے جو یہ مضمون کفار کو سنایا کہ تم نے دلائل کے فیصلہ کو نہ مانا، اب عذاب سے فیصلہ ہونے والا ہے، یعنی عذاب آنے والا ہے تو) کفار (چونکہ جہل مرکب و عناد میں غرق اب تھے اس سے بھی نہ ڈرے بلکہ کمالِ بیباکی سے وہ) فیصلہ چاہنے لگے (جیسا آیت فَاَتَيْنَا بِمَا نَحْنُ نَادُوا امثالہا سے معلوم ہوتا ہے) اور (جب وہ فیصلہ آیا تو) جتنے سرکش (اور) ہنری لوگ تھے: وہ سب (اس فیصلہ میں) بے مراد ہوئے (یعنی ہلاک ہو گئے اور جو ان کی مراد تھی کہ اپنے کو اہل حق سمجھ کر فتح و ظفر چاہتے تھے وہ حاصل نہ ہوئی)۔

مِنْ وَرَائِهِمْ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰی مِنْ مَّاءٍ صَدِيْدٍ ۝۱۶ يَتَجَرَّعُوْهُ وَلَا

پچھلے اس کے دوزخ ہے اور پلائیں گے اس کو پانی پیپ کا، گھونٹ گھونٹ پیتا ہو اس کو اور

يَكَادُ يُسِيْفُهُ وَيٰۤاٰتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ مَا هُوَ بِمُعِيْدٍ ط و

کھلے نہیں اتار سکتا اور چلی آتی ہے اس پر موت ہر طرف سے اور وہ نہیں مڑتا، اور

مِنْ وَرَائِهِ عَذَابٌ غَلِيظٌ ①۴

اس کے پیچھے عذاب ہے سخت۔

خلاصہ تفسیر

(جس جبار عنبر کا اوپر ذکر ہوا ہے علاوہ دنیوی عذاب کے) اس کے آگے دوزخ (کا غذا آنے والا) ہے اور اس کو (دوزخ میں) ایسا پانی پینے کو دیا جاوے گا جو کہ پیپ لہو (کے مشابہ) ہوگا جس کو (غایت تشنگی کی وجہ سے) گھونٹ گھونٹ کر کے پیوے گا اور (غایت حرارت و کراہت کی وجہ سے) گلے سے آسانی کے ساتھ اتارنے کی کوئی صورت نہ ہوگی اور ہر (چہار) طرف سے اس پر (سامان) موت کی آمد ہوگی اور وہ کسی طرح مرے گا نہیں بلکہ یوں ہی سسکتا رہے گا) اور (پھر یہ بھی نہیں کہ یہی عذاب مذکور ایک حالت پر رہے بلکہ) اس (شخص) کو اور (زیادہ) سخت عذاب کا سامنا برابر (ہو) (اگرے) گا جس سے عادت پڑنے کا احتمال ہی نہیں ہو سکتا۔
سَقُولُهُ تَعَالَى كَلَّمَا نَضَجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّ لَهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا۔

مَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ أَعْمَالُهُمْ كَرَمَادٍ اشْتَدَّتْ

حال ان لوگوں کا جو منکر ہوئے اپنے رب سے ان کے عمل ہیں جیسے وہ لکھ کر زور کی چٹے اس پر
بِهِ الرِّيحُ فِي يَوْمٍ عَاصِفٍ لَا يَقْدِرُونَ مِمَّا كَسَبُوا عَلَى شَيْءٍ

ہوا آندھی کے دن ، کچھ ان کے ہاتھ میں نہ ہوگا اپنی کمائی میں سے ،

ذَلِكَ هُوَ الضَّلَلُ الْبَعِيدُ ①۵ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ

یہی ہو بہک کر دور جا پڑنا ، تو نے کیا نہیں دیکھا کہ اللہ نے بنائے آسمان اور

الْأَرْضَ بِالْحَقِّ ط إِنَّ يَشَاءُ يَذْهَبُ بِكُمْ وَيَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍ ①۹

زمین جیسی چاہتے ، اگر چاہے تم کو لیاؤ اور لائے کوئی پیدا کرے نئی ،

وَمَا ذَلِك عَلَى اللَّهِ بَعِزٌ ②۰ وَبَرَزُوا لِلَّهِ جَمِيعًا فَقَالَ

اور یہ اللہ کو کچھ مشکل نہیں ، اور سامنے کھڑے ہوں گے اللہ کے سامنے پھر کہیں گے

الضَّعْفُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ أَنْتُمْ

مزدور بڑائی والوں کو ہم تو تمہارے تابع تھے ، سو کیا بچاؤ گے

مُخَوِّنَ عَنَّا مِنْ عَبْدٍ أَلْبَسَ لَوْ هَدَانَا اللَّهُ

ہم کو اللہ کے کسی عذاب سے بچھڑانے والا، وہ کہیں گے اگر ہدایت کرتا ہم کو اللہ

لَهْدًا يَتْلُو سَوَاءٌ عَلَيْنَا أَجَزِعْنَا أَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ

تو البتہ ہم تم کو ہدایت کرتے، اب برابر ہے ہمارے حق میں ہم بیقراری کریں یا صبر کریں ہم کو نہیں

مَجِيصٍ ۲۱) وَقَالَ الشَّيْطَانُ لَبِئْسَ أَقْصَى الْأَمْرِ أَنْ يَتْلُو

خلاصہ، اور بولا شیطان جب فیصل ہو چکا سب کام بیشک اللہ نے تم کو دیا تھا

وَعَدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُكُمْ فَأَخْلَفْتُكُمْ وَمَا كَانَ لِي عَلَيْكُمْ مِنْ

سچا وعدہ اور میں نے تم سے وعدہ کیا پھر جھوٹا کیا، اور میری تم پر کچھ حکومت نہ

سُلْطَانٍ إِلَّا أَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي ۚ فَلَا تَلُمُونِي وَلَوْلَا

تھی مگر یہ کہ میں نے بلایا تم کو پھر تم نے مان لیا میری بات کو سوا الزام نہ دو مجھ کو اور الزام دو

أَنْفُسُكُمْ مَا أَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَا أَنْتُمْ بِمُصْرِخِي ۚ إِنِّي كَفَرْتُ

اپنے آپ کو، نہ میں تمہاری فریاد کو پہنچوں اور نہ تم میری فریاد کو پہنچو، میں منکر ہوں

بِمَا أَشْرَكْتُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَنَّ الظَّالِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۲۲)

جو تم نے مجھ کو شریک بنایا تھا اس سے پہلے، البتہ جو ظالم ہیں ان کے لئے ہے عذاب دردناک۔

خلاصہ تفسیر

ان کافروں کو اگر اپنی نجات کے متعلق یہ زعم ہو کہ ہمارے اعمال ہم کو نافع ہوں گے تو اس کا قاعدہ کلیہ تو یہ سن لو کہ جو لوگ اپنے پروردگار کے ساتھ کفر کرتے ہیں ان کی حالت باعتبار عمل کے یہ ہے (یعنی ان کے اعمال کی ایسی مثال ہے) جیسے کچھ راکھ ہو (جو اڑنے میں بہت نینٹ ہوتی ہے) جس کو تیز آندھی کے دن میں تیزی کے ساتھ ہوا اڑالے جائے کہ اس صورت میں اس راکھ کا نام و نشان بھی نہ رہے گا اسی طرح ان لوگوں نے جو کچھ عمل کئے تھے اس کا کوئی حصہ (یعنی اثر و نفع کے قبیل سے) ان کو حاصل نہ ہو گا اس راکھ کی طرح منافع و برباد جائے گا یہ بھی بڑی دور دراز کی گمراہی ہے کہ گمان تو ہو کہ ہمارے عمل نیک اور نافع ہیں اور پھر ظاہر ہو بد اور مضرا جیسے عبادت اصنام یا غیر نافع جیسے اعتاق و صلہ رحمی، اور چونکہ حق سے اس کو

بہت بخیر ہے اس لئے کہا گیا، پس اس طریقے تو نجات کا احتمال نہ رہا، اور اگر ان کا یہ زعم ہو کہ قیامت ہی کا وجود محال ہے اور اس صورت میں عذاب کا احتمال نہیں تو اس کا جواب یہ ہو کہ کیا رائے مخاطب، تجھ کو یہ بات معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو اور زمین کو بالکل ٹھیک ٹھیک (یعنی مشتمل بر منافع و مصالح) پیدا کیا ہے (اور اس سے قادر ہونا اس کا ظاہری پس جب وہ قادر مطلق ہے تو) اگر وہ چاہے تو تم سب کو فنا کر دے اور ایک دوسری نئی مخلوق پیدا کر دے اور یہ خدا کو کچھ بھی مشکل نہیں (پس جب نئی مخلوق پیدا کرنا آسان ہے تو تم کو دوبارہ پیدا کر دینا کیا مشکل ہے) اور اگر یہ سو سمجھو کہ ہمارے اکابر ہم کو بچالیں گے تو اسکی حقیقت سن لو کہ قیامت کے دن (خدا کے سامنے سب پیش ہوں گے پھر چھوٹے درجہ کے لوگ (یعنی غوام و تابعین) بڑے درجہ کے لوگوں سے (یعنی خواص و متبعین سے بطور ملامت و عتاب کہیں گے کہ ہم (دنیا میں) تمہارے تابع تھے (حتیٰ کہ دین کی جو راہ تم نے ہم کو بتلائی ہم اسی پر چلے گئے، اور آج ہم پر مصیبت ہے) تو کیا تم خدا کے عذاب کا کچھ جزو ہم سے مٹا سکتے ہو (یعنی اگر بالکل نہ بچا سکو تو کسی قدر بھی بچا سکتے ہو) وہ (جواب میں) کہیں گے کہ (ہم تم کو کیا بچاتے خود ہی نہیں بچ سکتے ہیں البتہ) اگر اللہ ہم کو (کوئی) راہ (بچنے کی) بتلاتا تو ہم تم کو بھی (وہ) راہ بتلا دیتے (اور اب تو) ہم سب کے حق میں دونوں صورتیں برابر ہیں خواہ ہم پریشان ہوں، (جیسا کہ تمہاری پریشانی فَمَنْ أَنْتُمْ مُخْتَوُونَ سے ظاہر ہو اور ہماری پریشانی تو يَوْمَ يَدْعُ اللَّهُ سے ظاہر ہی ہے) خواہ ضبط کریں (دونوں حالتوں میں) ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہیں (پس اس سوال جواب سے یہ معلوم ہو گیا کہ طریق کفر کے اکابر بھی اپنے متبعین کے کچھ کام نہ آئیں گے، یہ طریق بھی نجات کا محال نہ رہا) اور اگر اس کا بھروسہ ہو کہ یہ مجبور دین غیر اللہ کام آویں گے اس کا حال اس حکایت سے معلوم ہو جائے گا کہ جب (قیامت میں) تمام مقررات فیصل ہو چکیں گے (یعنی اہل ایمان جنت میں اور کفار دوزخ میں بھیج دیئے جائیں گے) تو اہل دوزخ سب شیطان کے پاس کہ وہ بھی وہاں ہو گا جا کر ملامت کریں گے کہ کم بخت تو تو ڈوبا ہی تھا ہم کو بھی اپنے ساتھ ڈوبا (اس وقت) شیطان (جواب میں) کہے گا کہ مجھ پر تمہاری ملامت ناسحق ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تم سے (جتنے وعدے کئے تھے سب) سچے وعدے کئے تھے (کہ قیامت ہوگی اور کفر سے ہلاکت ہوگی اور ایمان سے نجات ہوگی) اور میں نے بھی وعدے تم سے کئے تھے (کہ قیامت نہ ہوگی اور تمہارا طریقہ کفر بھی طریقہ نجات ہے) سو میں نے وہ وعدے تم سے خلاف کئے تھے (اور اللہ تعالیٰ کے وعدوں کے حق ہونے پر اور میرے وعدوں کے باطل ہونے پر دلائل قطعیہ قائم تھے، سو باوجود اس کے تم نے میرے وعدوں کو صحیح

اور خدا تعالیٰ کے وعدوں کو غلط سمجھا، تو اپنے ہاتھوں تم ڈوبے اور اگر تم یوں کہو کہ آخر پتے وعدوں کو جھوٹا سمجھنے اور جھوٹے وعدوں کو سچا سمجھنے کا سبب بھی تو میں ہی ہوا تو بات یہ ہے کہ واقعی میں اغوار کے مرتبہ میں سبب ضرور ہوا، لیکن یہ دیکھو کہ میرے اغوار کے بعد تم مختار تھے، یا مضطرب مجبور، سو ظاہر ہے کہ میرا تم پر اور تو کچھ زور چلتا نہ تھا۔ بجز اس کے کہ میں نے تم کو (گمراہی کی طرف) بلایا تھا سو تم نے (بانتیاری خود) میرا کہنا مان لیا اگر نہ مانتے تو میں بزور تم کو گمراہ نہ کر سکتا تھا، جب یہ بات ثابت ہے، تو مجھ پر (ساری) ملامت مت کرو (اس طرح سے کہ اپنے کو بالکل بری سمجھنے لگو) اور (زیادہ) ملامت اپنے آپ کو کرو (کیونکہ اصل علت عذاب کی تمہارا ہی فعل ہے اور میرا فعل تو محض سبب ہے جو بعید اور غیر مستلزم ہے، پس ملامت کا تو یہ جواب ہے، اور اگر مقصود اس قول سے استعانت و استمداد ہے تو میں کسی کی کیا مدد کروں گا، خود ہی مبتلائے مصیبت و محتاج امداد ہو رہا ہوں، لیکن جانتا ہوں کہ کوئی میری مدد نہ کرے گا ورنہ میں بھی تم سے اپنے لئے مدد چاہتا کیونکہ زیادہ مناسبت تم سے ہے بس اب تو) نہ میں تمہارا مددگار ہو سکتا ہوں اور نہ تم میرے مددگار (ہو سکتے) ہو (البتہ اگر میں تمہارے طریقہ شریک کو حق سمجھتا تو بھی اس تعلق کی وجہ سے نصرت کا مطالبہ کرنے کی گنجائش بنتی لیکن) میں خود تمہارے اس فعل سے بیزار ہوں (اور اس کو باطل سمجھتا ہوں) کہ تم اس کے قبل (دنیا میں) مجھ کو (خدا کا) شریک قرار دیتے تھے (یعنی دربارہٴ عبادۃ اصنام وغیرہ میری ایسی اطاعت کرتے تھے جو اطاعت کہ خاصہ حق تعالیٰ ہے، پس اصنام کو شریک ٹھہرانا بایں معنی شیطان کو شریک ٹھہرانا ہے، پس مجھ سے تمہارا کوئی تعلق نہیں نہ تم کو استمداد کا کوئی حق ہے پس) یقیناً ظالموں کے لئے دردناک عذاب (مقرر) ہے پس عذاب میں پڑے ہو نہ مجھ پر ملامت کرنے سے نفع کی امید رکھو اور نہ مدد چاہنے سے جو تم نے ظلم کیا تھا تم بھگتو جو میں نے کیا تھا میں بھگتوں گا، پس گفتگو قطع کرو، یہ حاصل ہوا ابلیس کے جواب کا، پس اس سے مجبورین غیر اللہ کا بھروسہ بھی قطع ہوا، کیونکہ جو ان مجبورین کی عبادت کا اصل بانی و محرک ہے اور درحقیقت عبادت غیر اللہ سے زیادہ راضی و ہی ہوتا ہے، چنانچہ اسی بناء پر قیامت کے دن دوزخ میں اہل نا اسی سے کہیں سنیں گے، اور کسی مجبور غیر اللہ سے کچھ بھی نہ کہیں گے، جب اس نے صاف جواب دیدیا تو اوروں سے کیا امید ہو سکتی ہے، پس نجات کفار کے سب طریقے مسدود ہو گئے، اور یہی مضمون مقصود تھا۔

وَأَدْخِلَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ

اور داخل کئے گئے جو لوگ ایمان لائے تھے اور کام کئے تھے نیک، باغوں میں جن کے نیچے

تَعْتَبُوا أَلَانَهُمْ خُلْدَيْنِ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ طَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ ۝۲۳

بہتی ہیں نہریں ہمیشہ رہیں ان میں اپنے رب کے حکم سے ان کی ملاقات ہے وہاں سلام

خلاصہ تفسیر

اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے وہ ایسے باغوں میں داخل کئے جائیں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی (اور) وہ ان میں اپنے پروردگار کے حکم سے ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے (اور) وہاں ان کو سلام اس لفظ سے کیا جائے گا السلام علیکم (یعنی باہم بھی اور فرشتوں کی طرف سے بھی، لقولہ تعالیٰ اِلَّا قَلِيلًا سَلَامًا سَلَامًا و لقولہ تعالیٰ وَالْمَلَائِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِنْ كُلِّ بَابٍ سَلَامٌ عَلَیْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ الْآیۃ)

الَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا

تو نے نہ دیکھا کیسے بیان کی اللہ نے ایک مثال بات مستحری جیسے ایک درخت مستحرا اس کی

ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ۝۲۴ تُوْتِیْ اُكْلُهَا كُلِّ حَیْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا ط

جڑ مضبوط ہو اور ٹہنی ہے آسمان میں، لاتا ہے پھل اپنا ہر وقت پر اپنے رب کے حکم سے

وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝۲۵

اور بیان کرتا ہے اللہ مثالیں لوگوں کے واسطے تاکہ وہ منکر کریں۔

خلاصہ تفسیر

کیا آپ کو معلوم نہیں (یعنی اب معلوم ہو گیا) کہ اللہ تعالیٰ نے کیسی (اچھی اور موقع کی) مثال بیان فرمائی ہے کلمہ طیبہ کی (یعنی کلمہ توحید و ایمان کی) کہ وہ مشابہ ہے ایک پاکیزہ درخت کے (مراد کھجور کا درخت ہے) جس کی جڑ (زمین کے اندر) خوب گڑی ہوئی ہو اور اس کی شاخیں اونچائی میں جا رہی ہوں (اور) وہ (درخت) خدا کے حکم سے ہر فصل میں (یعنی جب اس کی فصل آجاوے) اپنا پھل دیتا ہو (یعنی خوب پھلتا ہو) کوئی فصل ماری نہ جاتی ہو، اسی طرح کلمہ توحید (یعنی لا الہ الا اللہ کی ایک جڑ ہے، یعنی اعتقاد جو مؤمن کے قلب میں استقامت کے ساتھ جا بجا رہے، اور اس کی کچھ شاخیں ہیں یعنی اعمال صالحہ جو ایمان پر مرتب ہوتے ہیں جو بارگاہ قبولیت میں آسمان کی طرف لے جاتے ہیں، پھر ان پر رضائے دائمی کا ثمرہ مرتب ہوتا ہے) اور اللہ تعالیٰ

اس قسم کی مثالیں لوگوں کے بتلانے کے واسطے اس لئے بیان فرماتے ہیں تاکہ وہ لوگ معافی مقصود کو خوب سمجھ لیں کیونکہ مثال سے مقصود کی خوب توضیح ہو جاتی ہے۔

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَيِّثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَيْرَةٍ اِجْتَمَعَتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ

اور مثال گندی بات کی جیسے درخت گندہ اکھاڑ لیا اس کو زمین کے اوپر سے

مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ۝۲۶ يَثْبُتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ

کچھ نہیں اس کو ٹھہراؤ، مضبوط کرتا ہی اللہ ایمان والوں کو مضبوط بات سے دنیا کی زندگی

الَّذِيْنَ يٰۤاُوْفِي الْاٰخِرَةِ اَوْ يُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ تَدْرِكُوْنَ ۝۲۷ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ۝۲۸

میں اور آخرت میں اور بچلا دیتا ہی اللہ بے انصافیوں کو اور کرتا ہی اللہ جو چاہے،

الْمُرْتَرٰى اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّ اٰخَلُوْا اَقْوَامَهُمْ

تو نے نہ دیکھا ان کو جنہوں نے بدل کیا اللہ کے احسان کا ناشکری اور اتارا اپنی قوم کو

دَاۤاِسَ الْبَوَارِ ۝۲۸ جَهَنَّمَ يَصْلُوْنَهَا طَوْبًا وَيُبْسِ الْقَرَارِ ۝۲۹

تباہی کے گھر میں، جو دوزخ ہے داخل ہوں گے اس میں اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

خلاصہ تفسیر

اور گندہ کلمہ کی (یعنی کلمہ کفر و شرک کی) مثال ایسی ہے جیسے ایک خراب درخت ہو (مراد درخت حنظل ہے) کہ وہ زمین کے اوپر ہی اوپر سے اکھاڑ لیا جائے (اور اس کو زمین میں) کچھ ثبات نہ ہو (خراب فرمایا باعتبار اس کی بو اور مزہ اور رنگ کے یا اس کے پھل کی بو اور مزہ اور رنگ کے یہ صفت طیبہ کے مقابل ہوئی اور اوپر سے اکھاڑنے کا مطلب یہ ہے کہ جڑ اس کی دوڑک نہیں ہوتی اوپر ہی کمی ہوتی ہے، یہ اصل ثابت کے مقابل فرمایا اور ما لہا من قرار اسی کی تاکید کے لئے فرمایا اور اس کی شاخوں کا اونچا نہ جانا اور اس کے پھل کا تفکھا مطلوب نہ ہونا ظاہر ہے یہی حال کلمہ کفر کا ہے کہ گو کافر کے دل میں اس کی جڑ ہے مگر حق کے سامنے اس کا مضجول و مغلوب ہو جانا مشابہ اسی کے ہے جیسے اس کی جڑ ہی نہیں، قال تعالیٰ حُجَّتُمْ مِمَّا اِحْضَنُ اور شاید ما لہا من قرار کی تصریح سے کفر کا یہی اضطراب و مغلوبیت بتلانا مقصود ہو، اور چونکہ اس کے اعمال مقول نہیں ہوتے، اس لئے گویا اس درخت کی شاخیں بھی فضا میں نہیں پھیلیں اور چونکہ اس کے

اعمال پر رضائے الہی مرتب نہیں ہوتی اس لئے پھل کی نفی بھی ظاہر ہو، اور چونکہ قبول و رضا کا کافر میں بالکل احتمال نہیں اسی لئے مشبہ بہ کی جانب میں شاخوں اور پھل کا ذکر قطعاً متروک فرما دیا ہو، بخلاف نفس کفر کے کہ اس کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ اس کا وجود محسوس بھی ہے اور احکام جہاد وغیرہ میں معتبر بھی ہے، یہ تو دونوں کی مثال ہو گئی، آگے اثر کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو اس کی بات (یعنی کلمہ طیبہ ثابت الاصل کی برکت) سے دنیا میں اور آخرت (دونوں جگہوں) میں (دین میں اور امتحان میں) مضبوط رکھتا ہے اور (اس کلمہ خبیثہ کی نحوست) ظالموں (یعنی کافروں) کو (دونوں جگہ دین میں اور امتحان میں) بچلا دیتا ہے اور (کسی کو ثابت رکھنے اور کسی کو بچلا دینے میں ہزاروں حکمتیں ہیں پس) اللہ تعالیٰ (اپنی حکمت سے) جو چاہتا ہے کرتا ہے، کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا (یعنی ان کا حال عجیب ہے) جنہوں نے بجائے نعمت الہی (کے شکر) کے کفر کیا (مراد اس سے کفار مکہ ہیں، کذا فی الدر المنثور عن ابن عباسؓ) اور جنہوں نے اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر یعنی جہنم میں پہنچایا (یعنی ان کو بھی کفر کی تعلیم کی جس سے) وہ اس (جہنم) میں داخل ہوں گے اور وہ رہنے کی جگہ ہے (اس میں اشارہ ہو گیا کہ ان کا داخل ہونا قرار اور دوام کے لئے ہو گا)۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ سے پہلے ایک آیت میں حق تعالیٰ نے کفار کے اعمال کی یہ مثال بیان فرمائی ہے کہ وہ راکھ کی مانند ہیں، جس پر تیز اور سخت ہوا چل جائے تو اس کا ذرہ ذرہ ہوا میں منتشر ہو کر بے نشان ہو جائے، پھر کوئی اس کو جمع کر کے اس سے کوئی کام لینا چاہے تو ناممکن ہو جائے، مَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا ذُرًّا أُبِرَ جَهَنَّمَ أَغْمَا لَّهُمْ كَرَمًا مَّا دِ ابْتَدَتْ بِهِنَّ السَّيِّئَاتُ يَوْمَ يَعِصُفُ، مطلب یہ ہے کہ کفار کے اعمال جو بظاہر اچھے بھی ہوں وہ بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول نہیں، اس لئے سب ضائع اور بیکار ہیں۔

اس کے بعد مذکورہ آیات میں پہلے مؤمن اور اس کے اعمال کی ایک مثال دی گئی ہو پھر کفار و منافقین کے اعمال کی، پہلی آیت میں مؤمن اور اس کے اعمال کی مثال ایک ایسے درخت سے دی گئی ہے جس کا تنہ مضبوط اور بلند ہو اور اس کی جڑیں زمین میں گہری گئی ہوئی ہوں اور زیر زمین پانی کے چشموں سے سیراب ہوتی ہوں، گہری جڑوں کی وجہ سے اس درخت کو استحکام اور مضبوطی بھی حاصل ہو کہ ہوا کے جھونکے سے گرنے جائے، اور سطح زمین سے دور ہونے کی وجہ سے اس کا پھل گذرگی سے پاک صاف رہے، دوسری صفت اس درخت کی یہ ہے کہ اس کی شاخیں بلند ہی پر

آسمان کی طرف ہوں، تیسری صفت اس درخت کی یہ ہے کہ اس کا پھل ہر وقت ہر حال میں کھایا جاتا ہو۔ یہ درخت کونسا اور کہاں ہے؟ اس کے متعلق مفسرین کے اقوال مختلف ہیں، مگر زیادہ اقرب یہ ہے کہ وہ کھجور کا درخت ہے، اس کی تائید تجربہ اور مشاہدہ سے بھی ہوتی ہے، اور روایات حدیث سے بھی، کھجور کے درخت کے تنہ کا بلند اور مضبوط ہونا تو مشاہدہ کی چیز ہے، سب ہی جانتے ہیں، اس کی جڑوں کا زمین کی دو گہرائی تک پہنچنا بھی معروف و معلوم ہے، اور اس کا پھل بھی ہر وقت اور ہر حال میں کھایا جاتا ہے، جس وقت سے اس کا پھل درخت پر ظاہر ہوتا ہے اس وقت سے پکھنے کے زمانہ تک ہر حال اور ہر صورت میں اس کا پھل مختلف طریقوں سے چٹنی و اچار کے طریقہ سے یا دوسرے طریقہ سے کھایا جاتا ہے، پھر پھل پک جانے کے بعد اس کا ذخیرہ بھی پورے سال باقی رہتا ہے، صبح و شام دن اور رات، گرمی اور سردی، غرض ہر موسم اور ہر وقت میں کام دیتا ہے، اس درخت کا گودا بھی کھایا جاتا ہے، اس سے میٹھا رس بھی نکالا جاتا ہے، اس کے پتوں سے بہت سی مفید چیزیں چٹائیاں وغیرہ بنتی ہیں، اس کی گٹھلی جانوروں کا چارہ ہے، بخلاف دوسرے درختوں کے پھلوں کے کہ وہ خاص موسم میں آتے ہیں، اور ختم ہو جاتے ہیں، ان کا ذخیرہ نہیں رکھا جاتا ہے، اور نہ ان کی ہر چیز سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔

اور ترمذی، نسائی، ابن حبان اور حاکم نے بروایت انس رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شجرۃ طیبۃ (جس کا ذکر قرآن میں ہے) کھجور کا درخت ہے اور شجرۃ خبیثۃ حنظل کا درخت (مظہری)

اور مسند احمد میں بروایت مجاہد مذکور ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ ایک روز ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے، کوئی صاحب آپ کے پاس کھجور کے درخت کا گودہ لائے، اس وقت آپ نے صحابہ کرامؓ سے ایک سوال کیا کہ درختوں میں سے ایک ایسا درخت جیسا ہے جو مرد مؤمن کی مثال ہے، (اور بخاری کی روایت میں اس جگہ یہ بھی مذکور ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اس درخت کے پتے کسی موسم میں جھڑتے نہیں) بتلاؤ وہ درخت کونسا ہے؟ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میرے دل میں آیا کہ کہہ دوں وہ کھجور کا درخت ہے، مگر مجلس میں ابو بکرؓ و عمرؓ اور دوسرے اکابر صحابہ موجود تھے، ان کو خاموش دیکھ کر مجھے بولنے کی ہمت نہ ہوئی، پھر خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ کھجور کا درخت ہے۔

مؤمن کی مثال اس درخت سے دینے کی ایک وجہ یہ ہے کہ کلمہ طیبہ میں ایمان اس کی جڑ ہے، جو بہت مستحکم اور مضبوط ہے، دنیا کے حوادث اس کو ہلا نہیں سکتے، مؤمنین کا ملیں صحابہ و تابعین بلکہ ہر زمانہ کے پختہ مسلمانوں کی ایسی مثالیں کچھ کم نہیں کہ ایمان کے مقابلہ میں

نہ جان کی پروا کی نہ مال کی اور نہ کسی دوسری چیز کی، دوسری وجہ ان کی طہارت و نظافت ہے کہ دنیا کی گندگیوں سے متاثر نہیں ہوتے، جیسے بڑے درخت پر سطح زمین کی گندگی کا کوئی اثر نہیں ہوتا، یہ دو وصف تو اَصْلًا ثابت کی مثال ہیں، تیسری وجہ یہ ہے کہ جس طرح کھجور کے درخت کی شاخیں بلند آسمان کی طرف ہوتی ہیں، مومن کے ایمان کے ثمرات یعنی اعمال بھی آسمان کی طرف اٹھائے جاتے ہیں، مترآن کریم میں **إِلَّا كَيْدٌ يَصْعَدُ الْكَلِمَةُ الطَّيِّبَةُ** یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف اٹھائے جاتے ہیں پاکیزہ کلمات، مطلب یہ ہے کہ مومن جو اللہ تعالیٰ کا ذکر تسبیح، تہلیل، قرآن و غیرہ کرتا ہے یہ صبح شام اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچتے رہتے ہیں۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ جس طرح کھجور کا پھل ہر وقت ہر حال ہر موسم میں لیل و نہار کھایا جاتا ہے، مومن کے اعمال صالحہ بھی ہر وقت ہر موسم اور ہر حال میں صبح شام جاری ہیں، اور جس طرح کھجور کے درخت کی ہر چیز کارآمد ہے، مومن کا ہر قول و فعل اور حرکت و سکون اور اس سے پیدا ہونے والے آثار پوری دنیا کے لئے نافع و مفید ہوتے ہیں، بشرطیکہ وہ مومن کامل اور تعلیمات خدا و رسول کا پابند ہو۔

مذکورہ تقریر سے معلوم ہوا کہ **فَوَقَّيْ أَعْطَمَ كُلَّ شَيْءٍ** میں **أَعْطَمَ** سے مراد پھل اور کھانے کے لائق چیزیں ہیں اور **شَيْءٍ** سے مراد ہر وقت ہر حال ہے، اکثر مفسرین نے اسی کو ترجیح دی ہے، بعض حضرات کے دوسرے اقوال بھی ہیں۔

اس کے بالمقابل دوسری مثال کفار کی **شَجَرَةٌ خَبِيثَةٌ** سے دی گئی، جس طرح کفار کی مثال **كَلِمَةٍ طَيِّبَةٍ** مراد قول **لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ** یعنی ایمان ہے، اسی طرح کلمۃ خبیثۃ سے مراد کلمات کفر اور افعال کفر ہیں، شجرۃ خبیثہ سے مراد مذکورہ حدیث میں حنظل کو قرار دیا گیا ہے، اور بعض نے لہسن وغیرہ کہا ہے۔

اس شجرۃ خبیثہ کا حال قرآن نے یہ بیان کیا ہے کہ اس کی جڑیں زمین کے اندر زیادہ نہیں ہوتیں اس لئے جب کوئی چاہے اس درخت کے پورے جثہ کو زمین سے اکھاڑ سکتا ہے، **أَجْثَثَتْ مِنْ قَوْقِ الْأَرْضِ** کے یہی معنی ہیں، کیونکہ **أَجْثَثَتْ** کے اصل معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کے جثہ کو پورا پورا اٹھا لیا جائے۔

کافر کے اعمال کو اس درخت سے تشبیہ دینے کی وجہ ظاہر ہے کہ اول تو اس کے عقائد کی کوئی جڑ بنیاد نہیں، ذرا دیر میں متزلزل ہو جاتے ہیں، دوسرے دنیا کی گندگی سے متاثر ہوتے ہیں، تیسرے ان کے درخت کے پھل پھول یعنی اعمال و افعال عند اللہ کارآمد نہیں۔

ایمان کا خاص اثر | اس کے بعد مومن کے ایمان اور کلمۃ طیبہ کا ایک خاص اثر دوسری

آیت میں بیان فرمایا ہے یَسْبِتُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوَةِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَةِ یعنی مومن کا کلمہ طیبہ مضبوط و مستحکم درخت کی طرح ایک قول ثابت ہے، جس کو اللہ تعالیٰ ہمیشہ قائم و برقرار رکھتے ہیں، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، بشرطیکہ یہ کلمہ اخلاص کے ساتھ کہا جائے، اور لا الہ الا اللہ کے مفہوم کو پوری طرح سمجھ کر ختم کیا جائے۔

مطلب یہ ہے کہ اس کلمہ طیبہ پر ایمان رکھنے والے کی دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ مرتے دم تک اس کلمہ پر قائم رہتا ہے، خواہ اس کے خلاف کتنے ہی حوادث سے مقابلہ کرنا پڑے اور آخرت میں اس کلمہ کو قائم و برقرار رکھ کر اس کی مدد کی جاتی ہے صحیح بخاری و مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ آخرت سے مراد اس آیت میں برزخ یعنی قبر کا عالم ہے۔

قبر کا عذاب و ثواب | حدیث یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب قبر میں مومن سے سوال کیا جائے گا تو ایسے ہولناک مقام اور سخت حال میں بھی وہ بتائید

ربانی اس کلمہ پر قائم رہو گا، اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دے گا، اور پھر فرمایا کہ ارشادِ مبرا اَنْ یَّتَبَّتَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوَةِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَةِ کا یہی مطلب ہے، (یہ روایت حدیث حضرت براہ بن عازبؓ نے نقل فرمائی)۔ اسی طرح تقریباً چالیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے معتبر اسانید کے ساتھ اسی مضمون کی حدیثیں منقول ہیں جن کو امام ابن کثیر نے اس جگہ اپنی تفسیر میں جمع کیا ہے، اور شیخ جلال الدین سیوطی نے اپنے منظوم رسالہ التثبیت عند التبییت میں اور شراح الصدور میں شتر احادیث کا حوالہ نقل کر کے ان روایات کو متواتر فرمایا ہے، ان سب حضرات صحابہ کرام نے آیت مذکورہ میں آخرت سے مراد قبر اور اس آیت کو قبر کے عذاب و ثواب سے متعلق قرار دیا ہے۔

مرنے اور دفن ہونے کے بعد قبر میں انسان کا دوبارہ زندہ ہو کر فرشتوں کے سوالات کا جواب دینا، پھر اس امتحان میں کامیابی اور ناکامی پر ثواب یا عذاب کا ہونا قرآن مجید کی تقریباً دس آیات میں اشارۃً اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شتر احادیث متواترہ میں بڑی صراحت و وضاحت کے ساتھ مذکور ہے، جن میں مسلمان کو شک و شبہ کی گنجائش نہیں، رہو وہ عامیانہ شبہات کہ دنیا میں دیکھنے والوں کو یہ ثواب و عذاب نظر نہیں آتے، سو اس کے تفصیلی جوابات کی تو یہاں گنجائش نہیں، اجمالاً اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ کسی چیز کا نظر نہ آنا اس کے موجود نہ ہونے کی دلیل نہیں ہوتی، جنات اور فرشتے بھی کسی کو نظر نہیں آتے مگر موجود ہیں، ہوا نظر نہیں آتی، مگر موجود ہے جس کا انسانی فضا کا اس زمانہ میں راکٹوں کے ذریعہ مشاہدہ ہو رہا ہے وہ اب سے پہلے کسی کو نظر نہ آتی تھی مگر موجود تھی، خواب دیکھنے والا خواب میں کسی مصیبت میں

گر رفتار ہو کر سخت عذاب میں بے چین ہوتا ہے، مگر پاس بیٹھنے والوں کو اس کی کچھ خبر نہیں ہوتی۔
اصول کی بات یہ ہے کہ ایک عالم کو دوسرے عالم کے حالات پر قیاس کرنا خود غلط ہے،
جب خالق کائنات نے اپنے رسول کے ذریعہ دوسرے عالم میں پہنچنے کے بعد اس عذاب و ثواب کی
خبر دیدی تو اس پر ایمان و اعتقاد رکھنا لازم ہے۔

آخر آیت میں فرمایا وَيُخَيِّلُ اللَّهُ الظَّالِمِينَ، یعنی اللہ تعالیٰ مؤمنین کو تو کاملہ طیبہ اور
قول ثابت پر ثابت قدم رکھتے ہیں، اور اس کے نتیجہ میں قبر ہی سے اُن کے لئے راحت کے سامان
جمع ہو جاتے ہیں، مگر ظالموں یعنی کفار و مشرکین کو یہ خداوندی نصرت و امداد نہیں ملتی، منکر تکبر
کے سوالات کا صحیح جواب نہیں دے سکتے، اور انجام کار ابھی سے ایک قسم کے عذاب میں مبتلا
ہو جاتے ہیں۔

وَيَفْعَلُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ یعنی اللہ تعالیٰ کرتا ہے جو چاہتا ہے، کوئی طاقت نہیں
جو اس کے ارادہ اور مشیت کو روک سکے، حضرت ابی بن کعبؓ، عبداللہ ابن مسعودؓ، حذیفہ بن
یمانؓ وغیرہ حضرات صحابہ نے فرمایا ہے کہ مؤمن کو اس کا اعتقاد لازم ہے کہ اس کو جو جو چیز حاصل
ہوئی وہ اللہ کی مشیت اور ارادہ سے حاصل ہوئی، اس کا "لنا ناممکن تھا، اسی طرح جو چیز
حاصل نہیں ہوئی اس کا حاصل ہونا ممکن نہ تھا، اور فرمایا کہ اگر تمہیں اس پر یقین و اعتماد نہ ہو
تو تمہارا ٹھکانا جہنم ہے۔

الْمُتَرَاتِلِ إِلَى الَّذِينَ بَدَلُوا نِعْمَةَ اللَّهِ كُفْرًا وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ
الْآبِارِ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنََهَا وَبَلَّسَ الْقُرْآنُ یعنی کیا آپ اُن لوگوں کو نہیں دیکھتے جنہوں
نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے بدلہ میں کفر اختیار کر لیا، اور اپنی قوم کو جو اُن کے کہنے پر چلتی تھی
ہلاکت و بربادی کے مقام میں اتار دیا، وہ جہنم میں جلیں گے، اور جہنم بہت بُرا ٹھکانا ہے۔
یہاں نعمۃ اللہ سے اللہ تعالیٰ کی عام نعمتیں بھی مراد ہو سکتی ہیں جو نفسوس و مشاہد ہیں
اور جن کا تعلق انسان کے ظاہری منافع سے ہے جیسا کھانے پینے پہننے کی اشیاء، زمین اور
مکان وغیرہ اور وہ مخصوص معنوی نعمتیں بھی ہو سکتی ہیں جو انسان کے رشد و ہدایت کے لئے
حق تعالیٰ کی طرف سے آئی ہیں، مثلاً انبیاء اور آسمانی کتابیں اور جو نشانیاں اللہ تعالیٰ کی قدرت و
حکمت کی اپنے وجود کے ہر جزو میں پھر زمین اور اس کی بے شمار مخلوقات میں، آسمان اور اس کی
ناقابل ادراک کائنات میں انسان کی ہدایات کا سامان ہیں۔

ان دونوں قسم کی نعمتوں کا تقاضا یہ تھا کہ انسان اللہ تعالیٰ کی عظمت و قدرت کو پہچانتا
اس کی نعمتوں کا شکر گزار ہو کر اس کی فرمانبرداری میں لگ جاتا، مگر کفار و مشرکین نے نعمتوں کو

مقابلہ شکر کے بجائے کفرانِ نعمت اور سرکشی و نافرمانی سے کیا، جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے اپنی قوم کو ہلاکت و بربادی کے مقام میں ڈال دیا اور خود بھی ہلاک ہوئے۔

احکام و ہدایات | ان تینوں آیتوں میں توحید اور کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ کی عظمت و فضیلت اور اس کی برکات و ثمرات اور اس سے انکار کی نحوست اور انجام بد کا بیان ہوا ہے کہ توحید ایسی لازوال دولت ہے جس کی برکت سے دنیا میں تائید ایزدی ساتھ ہوتی ہے اور آخرت اور قبر میں بھی اور اس سے انکار اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو عذاب سے بدل ڈالنے کے مرادف ہے۔

وَجَعَلُوا لِلَّهِ أَندَادًا لِيُضِلُّوهُ عَنِ سَبِيلِهِ قُلْ تَمَسُّوهُ فَإِنَّ

اور ٹھہراتے اللہ کے لئے مقابل کہ بہکائیں لوگوں کو اس کی راہ سے، تو کہہ مزا اڑاؤ پھر

مَصِيرَكُمْ إِلَى النَّارِ ۖ قُلْ لِعِبَادِيَ الَّذِينَ آمَنُوا يَقِيمُوا

تم کو ٹٹنا ہے طرف آگ کی ، کہہ دے میرے بندوں کو جو ایمان لائے ہیں قائم رکھیں

الصَّلَاةَ وَيُفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً مِّن قَبْلِ

نماز اور خرچ کریں ہماری دی ہوئی روزی میں سے پوشیدہ اور ظاہر پہلے اس سے کہ

أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خِلَالٌ ۖ (٣١) اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ

آئے وہ دن جس میں نہ سودا ہے نہ دوستی ، اللہ وہ ہے جس نے بنائے

السَّهْلُوتِ وَالْأَرْضِ وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ

آسمان اور زمین اور اتارا آسمان سے پانی پھر اس سے نکالی روتی

مِنَ الشَّجَرَاتِ بِرُءُوفٍ ۖ وَقَالُوا لَكُمْ بِهِ سَعَةٌ لَّكُمْ ۖ وَسَخَّرْنَا لَكُمْ آفَافَكُم لِيَتَجَبَّرَ بِى

تمہاری میوے ، اور کہنے میں کیا بھٹالے کشتی کو کہ

فِي الْبَحْرِ بِأَمْرٍ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْوُجُوهَ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ

دریا میں اس کے حکم سے اور کام میں لگا دیا تھا اے ندیوں کو ، اور کام میں لگا دیا تھا اے سورج

وَالْقَمَرَ دَائِبِينَ وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۖ وَآتَاكُم

اور چاند کو ایک دستور پر برابر اور کام میں لگا دیا تمہارے رات اور دن کو ، اور دیا تم کو

مِنْ كُلِّ مَآسَا لَتَمُوتَ ۖ وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تَحْصُوهَا ۗ

ہر چیز میں سے جو تم نے مانگی، اور اگر گنو احسان اللہ کے نہ پورے کر سکو

إِنَّ الْإِنْسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ ﴿۳۴﴾

بیشک آدمی بڑا بے انصاف ہے ناشکر

خلاصہ تفسیر

اور راہ پر جو کہا گیا ہے کہ ان لوگوں نے شکرِ نعمت کی جگہ کفر کیا اور اپنی قوم کو جہنم میں پہنچایا اس کفر اور پہنچانے کا بیان یہ ہے کہ ان لوگوں نے اللہ کے ساتھ بھی قرار دیے تاکہ (دوسروں کو بھی) اس کے دین سے گمراہ کریں پس ساتھ ہی قرار دینا کفر ہے اور دوسروں کو گمراہ کرنا جہنم میں پہنچانا ہے (آپ ان سب سے) کہہ دیجئے کہ چندے عیش کر لو، کیونکہ آخر انجام تمہارا دوزخ میں جانا ہے (عیش سے مراد حالتِ کفر میں بہناؤ، کیونکہ ہر فتنے کو اپنے مذہب میں لذت ہوتی ہے، یعنی اور چندے کفر کر لو یہ تہدید ہے، اور مطلب "کیونکہ" کا یہ ہے کہ چونکہ جہنم میں جانا تو تمہارا ضروری ہے، اس واسطے کفر سے باز آنا تمہارا مشکل ہے، خیر، اور چندے گزار لو، پھر تو اس مصیبت کا سامنا ہو ہی گا اور جو میرے خاص ایمان والے بندے ہیں (ان کو اس کفرِ نعمت کے وبال پر متنبہ کر کے اس سے محفوظ رکھنے کے لئے، ان سے کہہ دیجئے کہ وہ نعمتِ الہی کے اس طرح شکر گزار رہیں کہ) نماز کی پابندی رکھیں اور ہم نے جو کچھ ان کو دیا ہے اس میں سے (حسبِ عہدِ شرعیہ) پوشیدہ اور آشکارا (جیسا موقع ہو) خرچ کیا کریں ایسے دن کے آنے سے پہلے پہلے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوستی ہوگی (مطلب یہ کہ عباداتِ دینیہ و مالیہ کو ادا کرتے رہیں کہ یہی شکر ہے نعمت کا) اللہ ایسا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسایا، پھر اس پانی سے پھلوں کی قسم سے تمہارے لئے رزق پیدا کیا اور تمہارے نفع کے واسطے کشتی (اور جہاز) کو (اپنی قدرت کا) مسخر بنایا تاکہ وہ خدا کے حکم (و قدرت) سے دریا میں چلے اور تمہاری تجارت اور سفر کی غرض حاصل ہو اور تمہارے نفع کے واسطے نہروں کو (اپنی قدرت کا) مسخر بنایا تاکہ اسی سے پانی پیو اور آبِ پاشی کرو اور اس میں کشتی چلاؤ اور تمہارے نفع کے واسطے سورج اور چاند کو (اپنی قدرت کا) مسخر بنایا جو ہمیشہ چلتے ہی میں رہتے ہیں، تاکہ تم کو روشنی اور گرمی وغیرہ کا فائدہ ہو اور تمہارے نفع کے واسطے رات اور دن کو (اپنی قدرت کا) مسخر بنایا تاکہ تم کو معیشت اور آسائش کا نفع حاصل ہو اور جو چیز تم نے مانگی (اور

وہ تمہارے مناسب حال ہوتی، تم کو ہر چیز دی اور (اشیائے مذکورہ ہی پر کیا منحصر ہی) اللہ تعالیٰ کی نعمتیں (تو اس قدر بے شمار ہیں کہ) اگر (ان کو) شمار کرنے لگو تو شمار میں نہیں لاسکتے (مگر) سچ یہ ہے کہ آدمی بہت ہی بے انصاف بڑا ہی ناشکر ہے (اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر اور شکر نہیں کرتا، بلکہ اور بالعکس کفر و معصیت کرنے لگتا ہے، جیسا اور پر آیا ہے اَلَّذِينَ يَدَّبُرُوْنَ اَعْيُنَهُۥ اللّٰهِ كُفْرًا)۔

معارف و مسائل

سورۃ ابراہیم کے شروع میں رسالت و نبوت اور معاد و آخرت کے متعلق مضامین تھے اس کے بعد توحید کی فضیلت اور کلمہ کفر و شرک کی مذمت کا بیان مثالوں کے ذریعہ کیا گیا، پھر مشرکین کی مذمت اس بات پر کی گئی کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے بجائے ناشکری اور کفر کا راستہ اختیار کیا۔

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں کفار و مشرکین کی مذمت اور ان کے انجامِ بد کا ذکر ہے، دوسری آیت میں مؤمنین کی فضیلت اور ان کو ادا سے شکر کے لئے کچھ احکامِ الہیہ کی تاکید کی گئی ہے، تیسری چوتھی اور پانچویں آیات میں اللہ جل شانہ کی عظیم نعمتوں کا ذکر فرما کر اس پر آمادہ کیا گیا کہ وہ ان نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں صرف نہ کریں۔

تفسیر و تشریح

اَنْذَارٌ نَّذْرٌ جمع ہے، جس کے معنی مثل اور برابر کے ہیں، بتوں کو انداز اس لئے کہا جاتا ہے کہ مشرکین نے ان کو اپنے عمل میں خدا کی مثل یا برابر قرار دے رکھا تھا، تمسّح کے معنی کسی چیز سے چند روزہ عارضی فائدہ حاصل کرنے کے ہیں، اس آیت میں مشرکین کے اس غلط نظریہ پر نیکی ہے کہ انھوں نے بتوں کو خدا کے مثل اور اس کا شریک ٹھہرا دیا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ ان لوگوں کو جلا دیں کہ ان کا انجام کیا ہونے والا ہے فرمایا کہ چند روزہ دنیا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ، مگر تمہارا ٹھکانا جہنم کی آگ ہے۔

دوسری آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہے کہ کفار مکہ نے تو اللہ کی نعمت کو کفر سے بدل ڈالا اب آپ میرے مؤمن بندوں سے فرمادیں کہ نماز کی پابندی کریں اور ہم نے جو رزق ان کو دیا ہے اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کیا کریں، پوشیدہ اور علانیہ طور پر اس آیت میں مؤمن بندوں کے لئے بڑی بشارت اور اعزاز ہے، اول تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنا بندہ کہہ کر پکارا، پھر صفتِ ایمان کے ساتھ موصوف کیا، پھر ان کو دائمی رحمت اور اعزاز دینے کی ترکیب بتلائی، کہ نماز کی پابندی کریں، نہ اس کے اوقات میں سُستی کریں

نہ آداب میں کوتاہی، اور اللہ ہی کے دیئے ہوئے رزق میں سے کچھ اس کی راہ میں بھی خرچ کیا کریں۔ خرچ کرنے کی دونوں صورتوں کو جائز قرار دیا کہ پوشیدہ طور پر صدقہ خیرات کریں یا اعلانِ انہار کے ساتھ کریں، بعض علماء نے فرمایا کہ زکوٰۃ فرض صدقۃ الفطر وغیرہ علانیہ ہونے چاہئیں تاکہ دوسروں کو بھی ترغیب ہو، اور نفل صدقہ خیرات کو پوشیدہ دینا بہتر ہے کہ نام و نمود کا خطرہ نہ رہے، اور اصل مدارِ نیت اور حالات پر ہے، اگر اعلان و انہار میں نام و نمود کا شائبہ آجائے تو صدقہ کی فضیلت ختم ہو جاتی ہے خواہ فرض ہو یا نفل اور اگر نیت یہ ہو کہ دوسروں کو بھی ترغیب ہو تو فرض اور نفل دونوں میں اعلان و انہار جائز ہے۔

مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خِلَالٌ لَفْظِ خِلَالٌ، خُلَّةٌ کی جمع بھی ہو سکتی ہے، جس کے معنی بے غرض دوستی کے ہیں، اور اس لفظ کو بابِ مفاعلة کا مصدر بھی کہہ سکتے ہیں، جیسے قتال، دفاع وغیرہ اس صورت میں اس کے معنی دو شخصوں کے آپس میں دونوں طرف سے مخلصانہ دوستی کرنے کے ہوں گے، اس جملہ کا تعلق اوپر کے بیان کے ہوئے دونوں حکم یعنی نماز اور صدقہ کے ساتھ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ آج تو اللہ تعالیٰ نے طاقتِ فرصت عطا فرما رکھی ہے کہ نماز ادا کریں، اور اگر پچھلی عمر میں غفلت سے کوئی نماز رہ گئی ہو تو اس کی قصار کریں، اسی طرح آج مال تمھاری ملک اور قبضہ میں ہے اس کو اللہ کے لئے خرچ کر کے دائمی زندگی کا کام بنا سکتے ہو، لیکن وہ دن قریب آنے والا ہے جب کہ یہ دونوں قوتیں اور قدرتیں تم سے لے لی جائیں گی، نہ تمھارے بدن نماز پڑھنے کے قابل رہیں گے، نہ تمھاری ملک اور قبضہ میں کوئی مال رہے گا، جس سے ضائع شدہ حقوق کی ادائیگی کر سکو، اور اس دن میں کوئی بیع و شراء اور خرید و فروخت بھی نہ ہو سکے گی، کہ آپ کوئی ایسی چیز خرید لیں جس کے ذریعہ اپنی کوتاہیوں اور گناہوں کا کفارہ کر سکیں، اور اس دن میں آپس کی دوستیاں اور تعلقات بھی کام نہ آسکیں گے، کوئی عزیز دوست کسی کے گناہوں کا بار نہ اٹھائے گا اور نہ اس کے عذاب کو کسی طرح ہٹائے گا۔ اس دن سے مراد بظاہر حشر و قیامت کا دن ہے، اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ موت کا دن ہو، کیونکہ یہ سب آثارِ موت ہی کے وقت سے ظاہر ہو جاتے ہیں، نہ بدن میں کسی عمل کی صلاحیت رہتی ہے، نہ مال ہی اس کی ملک میں رہتا ہے۔

احکام و ہدایات | اس آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ قیامت کے روز کسی کی دوستی کسی کے کام نہ آئے گی، اس کا مطلب یہ ہے کہ محض دنیاوی دوستیاں اس روز کام نہ آئیں گی، لیکن جن لوگوں کی دوستی اور تعلقات اللہ کے لئے اور اس کے دین کے

کاموں کے لئے ہوں ان کی دوستی اس وقت بھی کام آئے گی کہ اللہ کے نیک اور مقبول بندے دوسروں کی شفاعت کریں گے جیسا کہ احادیث کثیرہ میں منقول ہے، اور قرآن عزیز میں ارشاد ہے: **أَلَا يَجْعَلُ اللَّهُ يَوْمَئِذٍ لِّبَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوًّا إِلَّا الْمُسْتَقِيمِينَ** ”یعنی وہ لوگوں کو دنیا میں باہم دوست تھے، اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے، کہ یہ چاہیں گے کہ دوست پر اپنا گناہ ڈال کر خود بری ہو جائیں، مگر وہ لوگ جو تقویٰ شعار ہیں،“ کیونکہ اہل تقویٰ وہاں بھی ایک دوسرے کی مدد بطریق شفاعت کر سکیں گے۔

تیسری، چوتھی اور پانچویں آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی بڑی بڑی نعمتوں کی یاد دہانی کر کے انسان کو اس کی عبادت و اطاعت کی طرف دعوت دی گئی ہے، ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جس نے آسمان اور زمین پیدا کئے جس پر انسانی وجود کی ابتداء اور بقا موقوف ہے، پھر آسمان سے پانی اتارا جس کے ذریعہ طرح طرح کے ثمرات پیدا کئے تاکہ وہ تمہارا رزق بن سکیں، لفظ **ثَمَرَاتٌ**، ثمرہ کی جمع ہے، ہر چیز سے حاصل ہونے والے نتیجہ کو اس کا ثمرہ کہا جاتا ہے، اس لئے لفظ **ثَمَرَاتٌ** میں وہ تمام چیزیں بھی شامل ہیں جو انسان کی غذا بنتی ہیں، اور وہ چیزیں بھی جو اس کا لباس بنتی ہیں، اور وہ چیزیں بھی جو اس کے رہنے بہنے کا مکان بنتی ہیں، کیونکہ لفظ **رِزْقٌ** جو اس آیت میں مذکور ہے وہ ان تمام ضروریات انسانی پر حاوی اور شامل ہے (مظہری)

پھر فرمایا کہ اللہ جل شانہ ہی کشتیوں اور جہازوں کو تمہارے کام میں لگا دیا کہ وہ اللہ کے حکم سے دریاؤں میں چلتے پھرتے ہیں، لفظ **سُفُوفٌ** جو اس آیت میں آیا ہے اس سے مراد یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کا استعمال تمہارے لئے آسان کر دیا ہے، لکڑی، لوہا اور ان سے کشتی جہاز بنانے کے اوزار و آلات اور ان سے صحیح کام لینے کی عقل و دانش یہ سب چیزیں اسی کی دی ہوئی ہیں اس لئے ان چیزوں کے موجد اس پر ناز نہ کریں، کہ یہ ہم نے ایجاد کی یا بنائی ہے، کیونکہ جن چیزوں سے ان میں کام لیا گیا ہے ان میں کوئی چیز بھی تم نے پیدا کی ہو نہ کر سکتے ہو، خالق کائنات کی بنائی ہوئی لکڑی، لوہے، تانبے اور پتیل ہی میں تصرفات کر کے یہ ایجاد کا سہرا آپ نے اپنے سر لیا ہے ورنہ حقیقت دیکھو تو خود آپ کا اپنا وجود اپنے ہاتھ پاؤں، اپنا دماغ اور عقل بھی تو آپ کی بنائی ہوئی نہیں۔

اس کے بعد فرمایا کہ ہم نے تمہارے لئے سورج اور چاند کو مسخر کر دیا، کہ یہ دونوں ہمیشہ ایک حالت پر چلتے ہی رہتے ہیں **ذَاسْبِغِينَ**، ذاب سے مشتق ہے، جس کے معنی عادت کے ہیں، مراد یہ ہے کہ ہر وقت اور ہر حال میں چلنا ان دونوں سیاروں کی عادت بنا دی گئی کہ کبھی اس کے خلاف نہیں ہوتا، مسخر کرنے کے یہ معنی نہیں کہ وہ تمہارے حکم اور اشاروں پر چلا کریں

کیونکہ اگر شمس و قمر کو اس طرح انسان کا سخر کر دیا جاتا کہ وہ انسانی حکم کے تابع چلا کرتے تو انسانوں کے باہمی اختلاف کا یہ نتیجہ ہوتا کہ ایک انسان کہتا کہ آج آفتاب دو گھنٹے بعد نکلے، کیونکہ رات میں کام زیادہ ہے، دوسرا چاہتا کہ دو گھنٹے پہلے نکلے کہ دن کے کام زیادہ ہیں، اس لئے رب العزت جل شانہ نے آسمان اور ستاروں کو انسان کا مسخر تو بنایا، مگر اس معنی سے مسخر کیا کہ وہ ہر وقت ہر حال میں حکمت خداوندی کے ماتحت انسان کے کام میں لگے ہوئے ہیں، یہ نہیں کہ ان کا طلوع و غروب اور رفتار انسان کی مرضی کے تابع ہو جائے۔

اسی طرح یہ ارشاد کہ ہم نے رات اور دن کو تمھارے لئے مسخر کر دیا، اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ ان دونوں کو انسان کی خدمت اور راحت کے کام میں لگا دیا۔

وَ أَشْكُم مِّنْ كُلِّ مَآسٍ لِّشُمُوعِهِمْ، ”یعنی اللہ تعالیٰ نے دیا تم کو ہر اس چیز میں سے جو تم نے مانگی، اگرچہ اللہ تعالیٰ کی عطا اور بخشش کسی کے مانگنے پر موقوف نہیں، ہم نے تو اپنا وجود بھی نہیں مانگا تھا، اسی نے اپنے فضل سے بے مانگے عطا فرمایا۔“
مَانِبُودِیْمِ وَ تَقَاضَا مَانِبُودٍ ۖ لَطِیْفٌ تَوْنَا كَفْتَهُ مَامِی شَنُودِ

اسی طرح آسمان، زمین، چاند، سورج، وغیرہ پیدا کرنے کی دعا، کس نے مانگی تھی، یہ سب کچھ مالک نے بے مانگے ہی دیا ہے، اسی لئے قاضی بیضاوی نے اس لفظ کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو ہر وہ چیز دیدی جو مانگنے کے قابل ہے، اگرچہ تم نے مانگا ہو لیکن اگر الفاظ کے ظاہری معنی ہی مراد ہوں تو ان میں بھی کچھ اشکال نہیں کہ عموماً انسان جو کچھ مانگتا اور طلب کرتا ہے اکثر تو اس کو دے ہی دیا جاتا ہے، اور جہاں کہیں اس کا سوال اپنی ظاہری صورت میں پورا نہیں کیا جاتا اس میں اس شخص کے لئے یا پورے عالم کے لئے کوئی مصلحت ہوتی ہے جس کا اس کو علم نہیں ہوتا، مگر علیم وخبیر جانتے ہیں کہ اگر اس کا یہ سوال پورا کر دیا گیا تو خود اس کے لئے یا اس کے خاندان کے لئے یا پورے عالم کے لئے وبال جان بنیگا ایسی صورت میں سوال کا پورا نہ کرنا ہی بڑی نعمت ہوتی ہے، مگر انسان اپنے قصور علم کی وجہ سے اس کو نہیں جانتا، اس لئے غمگین ہوتا ہے۔

وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تَحْصُوْهَا، ”یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں انسان پر اس قدر ہیں کہ سب انسان مل کر ان کو شمار کرنا چاہیں تو شمار میں بھی نہیں آسکتیں، انسان کا اپنا وجود خود ایک عالم صغیر ہے، اس کی آنکھ، ناک، کان اور ہاتھ پاؤں اور بدن کے ہر جوڑ بلکہ ہر رگ و ریشہ میں رب العزت کی غیر متناہی نعمتیں مستور ہیں جن سے یہ چلتی پھرتی سیکڑوں نازک مشینوں کی عجیب و غریب فیکٹری ہر وقت مشغول بکار ہے، پھر آسمان و

زمین اور دونوں کی مخلوقات سمندروں پہاڑوں کی مخلوقات کہ آج کی جدید تحقیقات اور اس میں عمریں لکھانے والے ہزاروں ماہرین بھی ان کا احاطہ نہیں کر سکے، پھر نعمتیں صرف وہی نہیں جو مثبت صورت میں عام طور پر نعمت سمجھی جاتی ہیں، بلکہ ہر مرض، ہر تکلیف، ہر مصیبت ہر رنج و غم سے محفوظ رہنا الگ الگ مستقل نعمت ہے، ایک انسان کو کتنی قسم کی بیماریاں اور کتنی اقسام کی بدنی اور ذہنی تکلیفیں دنیا میں پیش آسکتی ہیں انہی کا شمار ایک انسان سے نہیں ہو سکتا، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پورے عطیات اور نعمتوں کا شمار کس سے ہو سکتا ہے۔

انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ بے شمار نعمتوں کے بدلہ میں بے شمار عبادت اور بے شمار شکر لازم ہوتا، مگر اللہ جل شانہ نے ضعیف البنیان انسان کی رعایت فرمائی، جب وہ حقیقت پر نظر کر کے یہ اعتراف کر لے کہ شکر واجب سے سبکدوش ہونا اس کی قدرت میں نہیں، تو اسی اعتراف کو ادائے شکر کے قائم مقام قرار دیدیا ہے، جیسا کہ حق تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے ہی اعتراف پر ارشاد فرمایا کہ **الْآنَ قَدْ شَكَرْتَ يَادَاؤُدُ**، یعنی یہ اللہ کا کر لینا ہی ادائے شکر کے لئے کافی ہے۔

آخر آیت میں فرمایا **إِنَّ الْإِنْسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ**، یعنی انسان بہت بے انصاف اور بڑا ناشکر ہے، یعنی مقتضی انصاف کا تو یہ تھا کہ کوئی تکلیف و مصیبت پیش آئے تو صبر و سکون سے کام لے، زبان اور دل کو شکایت سے پاک رکھے، اور سمجھے کہ یہ جو کچھ پیش آیا ہے ایک حاکم حکیم کی طرف سے آیا ہے، وہ بھی مقتضائے حکمت ہونے کی بناء پر ایک نعمت ہی ہے، اور جب کوئی راحت و نعمت ملے تو دل اور زبان ہر عمل سے اس کا شکر گزار ہو، مگر عام انسانوں کی عادت اس سے مختلف ہے، کہ ذرا مصیبت و تکلیف پیش آجائے، تو بے صبری میں مبتلا ہو جائیں، اور کہتے پھر میں، اور ذرا نعمت و دولت مل جائے تو اس میں مست ہو کر خدا تعالیٰ کو بھلا دیں، اسی لئے مومنین مخلصین کی صفت پچھلی آیت میں صَبَّارِ اور شُكُّورِ بتلائی گئی ہے۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا الْبَلَدَ آمِنًا وَاجْنُبْنِي وَ

اور جس وقت کہا ابراہیم نے اے رب کروے اس شہر کو امن والا اور دور رکھ مجھ کو اور

بَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ إِلَّا صَنَامًا ۖ رَبِّ إِنِّي أَخْلَسْتُكَ كَثِيرًا مِّنْ

میری اولاد کو اس بات سے کہ ہم پوجیں مورتوں کو، اے رب انھوں نے گمراہ کیا بہت

النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي ۖ وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۳۱﴾

لوگوں کو سوتیں نے پیروی کی میری سو وہ تو میری اور جس نے میرا کھانا مانا سو تو بخشنے والا مہربان ہے ،

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بُرَادٍ غَيْرِ ذِي زُرْعَةٍ عِنْدَ بَيْتِكَ

اے رب میں نے بسایا ہوا اپنی ایک اولاد کو میدان میں کہ جہاں کھیتی نہیں تیرے محترم گھر کے

الْمَحْرَمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْنَدَةً مِنَ النَّاسِ

پاس ، اے رب ہمارے تاکہ قائم رکھیں نماز کو سو رکھ بٹنے لوگوں کے دل کہ

تُكْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقَهُمْ مِنَ الشَّجَرِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ ﴿۳۲﴾

مائل ہوں ان کی طرف اور روزی دے ان کو میووں سے شاید وہ شکر کریں

رَبَّنَا إِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِي وَمَا نُعْلِنُ وَمَا يَخْفَى عَلَى اللَّهِ مِنْ

اے رب ہمارے تو جانتا ہر جو کچھ ہم کرتے ہیں چھپا کر اور جو کچھ کرتے ہیں دکھا کر اور غفی نہیں اللہ پر کوئی

شَيْءٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ﴿۳۳﴾ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي وَهَبَ

چیز زمین میں اور نہ آسمان میں ، شکر ہو اللہ کا جس نے بخشا

لِي عَلَى الْكِبَرِ إِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِنَّ رَبِّي لَسَمِيعٌ دُعَاءِ ﴿۳۴﴾

مجھ کو اتنی بڑی عمر میں اسمعیل اور اسحاق ، بیشک میرا رب سنتا ہے دعا کو

رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي قَابِلًا وَتَقَبَّلْ

اے رب میرے کر مجھ کو کہ قائم رکھوں نماز اور میری اولاد میں سے بھی اے رب میری اور قبول

دُعَاءِ ﴿۳۵﴾ رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ

کر میری دعا ، اے ہمارے رب بخش مجھ کو اور میرے ماں باپ کو اور سب ایمان والوں کو جس

يَقُومُ الْحِسَابِ ﴿۳۶﴾

دن قائم ہو حساب ۔

خلاصہ تفسیر

اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جب کہ ابراہیم (علیہ السلام) نے (حجرت

اسمعیل اور حضرت ہاجرہ کو حکیم الہی میدانِ مکہ میں لاکر رکھنے کے وقت دعا کے طور پر کہا کہ اے میرے رب اس شہر (مکہ) کو امن والا بنادیکھے کہ اس کے رہنے والے مستحق امن رہیں، یعنی حرم کر دیجئے اور مجھ کو اور میرے خاص فرزندوں کو بتوں کی عبادت سے (جو کہ اس وقت جہلا میں شائع ہے) بچائے رکھے (جیسا اب تک بچائے رکھا) اے میرے پروردگار (میں بتوں کی عبادت سے بچنے کی دعا اس لئے کرتا ہوں کہ) ان بتوں نے بہتیرے آدمیوں کو گمراہ کر دیا، یعنی ان کی گمراہی کا سبب ہو گئے، اس لئے ڈر کر آپ کی پناہ چاہتا ہوں اور میں جس طرح اولاد کے بچنے کی دعا کرتا ہوں، اسی طرح ان کو بھی کہتا سنتا رہوں گا) پھر (میرے کہنے سننے کے بعد) جو شخص میری راہ پر چلے گا وہ تو میرا ہے (اور اس کے لئے وعدہ مغفرت ہے ہی) اور جو شخص (اس باب میں) میرا کہنا نہ ملے (سو اس کو آپ ہدایت فرمائیے، کیونکہ) آپ تو کثیر المغفرت (اور) کثیر الرحمتہ ہیں ان کی مغفرت اور رحمت کا سامان بھی کر سکتے ہیں کہ ان کو ہدایت دیں مقصود اس دعا سے شفاعتِ مؤمنین کے لئے اور طلبِ ہدایتِ غیر مؤمنین کے لئے ہے، اے ہمارے رب میں اپنی اولاد کو (یعنی اسمعیل علیہ السلام کو اور ان کے واسطے سے ان کی نسل کو) آپ کے محکم گھر (یعنی خانہ کعبہ) کے قریب (جو کہ پہلے سے یہاں بنا ہوا تھا اور ہمیشہ سے لوگ اس کا ادب کرتے آئے تھے) ایک (چھوٹے سے) میدان میں جو (بوجہ سنگت ان ہونے کے) زرت کے قابل (بھی) نہیں آباد کرتا ہوں اے ہمارے رب (بیت البرام کے پاس اس لئے آباد کرتا ہوں) تاکہ وہ لوگ نماز کا (خاص) اہتمام رکھیں (اور چونکہ یہ اس وقت چھوٹا سا میدان ہی) تو آپ کچھ لوگوں کے قلوب ان کی طاعت مانل کر دیجئے (کہ یہاں آکر رہیں) تاکہ آبادی پر رونق ہو جائے (اور چونکہ یہاں زراعت وغیرہ نہیں ہے اس لئے) ان کو (محض اپنی قدرت سے) پھل کھانے کو دیجئے تاکہ یہ لوگ (ان نعمتوں کا) شکر کریں، اے ہمارے رب (یہ دعائیا محض اپنی بندگی اور حاجت مندی کے اظہار کے لئے ہیں آپ کو اپنی حاجت کی اطلاع کے لئے نہیں، کیونکہ) آپ کو تو سب کچھ معلوم ہے، جو ہم اپنے دل میں رکھیں اور جو ظاہر کر دیں اور (ہمارے ظاہر و باطن پر کیا حصر ہے) اللہ تعالیٰ سے (تو) کوئی چیز بھی مخفی نہیں نہ زمین میں اور نہ آسمان میں (کچھ دعائیں آگے آئیں گی اور بیچ میں بعض نعم سابقہ پر حمد و شکر کیا تاکہ شکر کی برکت سے یہ دعائیں اقرب الی القبول ہو جائیں، چنانچہ فرمایا) تمام حمد و ثناء خدا کے لئے (سزاوار) ہے جس نے مجھ کو بڑھاپے میں اسمعیل اور اسحق (دو بیٹے) عطا فرمائے، حقیقت میں میرا رب دعا کا بڑا سننے والا (یعنی قبول کرنے والا) ہے کہ عطاۓ اولاد کے متعلق میری یہ دعا دیتے ہیں مِنَ الذَّلِيلِ قبول کر لی، پھر اس نعمت کا شکر ادا کر کے آگے بقیہ

دعائیں پیش کرتے ہیں، اے میرے رب (جو میری نیت ہے اپنی اولاد کو بیت محرم کے پاس بسائے سے کہ وہ نمازوں کا اہتمام رکھیں اس کو پورا کر دیجئے، اور جیسا اُن کے لئے اہتمام نماز میرا مطلوب ہو اس طرح اپنے لئے بھی مطلوب ہے، اس لئے اپنے اور ان کے دونوں کے لئے دعا کرتا ہوں اور چونکہ مجھ کو وحی سے معلوم ہو گیا ہے کہ ان میں بعض غیر مؤمن بھی ہوں گے اس لئے دعا سب کے لئے نہیں کر سکتا ہوں، پس ان مضامین پر نظر کر کے یہ دعا کرتا ہوں کہ) مجھ کو بھی نماز کا (خاص) اہتمام کرنیوالا رکھئے، اور میری اولاد میں بھی بعضوں کو (نماز کا اہتمام رکھنے والا کیجئے) اے ہمارے رب اور میری (یہ) دعا قبول کیجئے (اور) اے ہمارے رب میری مغفرت کر دیجئے اور میرے ماں باپ کی بھی اور کل مؤمنین کی بھی حساب قائم ہونے کے دن (یعنی قیامت کے روز سب مذکورین کی مغفرت کر دیجئے) ۝

معارف و مسائل

پہلی آیات میں عقیدہ توحید کی معقولیت اور اہمیت کا اور شرک کی جہالت اور مذمت کا بیان تھا، توحید کے معاملہ میں زمرہ انبیاء علیہم السلام میں سب سے زیادہ کامیاب جہاد حضرت خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام کا جہاد تھا، اسی لئے دین ابراہیمی کو خاص طور پر دین حنیف کا نام دیا جاتا ہے۔

اسی مناسبت سے یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ کا ذکر آیات مذکور میں کیا گیا ہے، ایک وجہ یہ بھی ہے کہ پہلی ایک آیت اَلَّذِیْنَ بَدَّلُوْا دِیْنَہُمْ کُفْرًا میں قریش مکہ کے ان لوگوں کی مذمت بیان کی گئی تھی جنہوں نے تقلیدِ آبائی کی بنا پر ایمان کو کفر سے اور توحید کو شرک سے بدل ڈالا تھا، ان آیات میں ان کو بتلایا گیا کہ تمہارا جدِ امجد ابراہیم علیہ السلام کا عقیدہ اور عمل کیا تھا تا کہ تقلیدِ آبائی کے خوگر اسی پر نظر کر کے اپنے کفر سے باز آجائیں (بحر محیط)

اور یہ ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے قصص اور حالات کے بیان سے قرآن کریم کا مقصد صرف ان کی تاریخ بیان کرنا نہیں ہوتا، بلکہ ان میں انسانی زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق ہدایتی اصول ہوتے ہیں، انہی کو جاری رکھنے کے لئے یہ واقعات قرآن میں بار بار دہرائے جاتے ہیں۔

اس جگہ پہلی آیت میں حضرت ابراہیم کی دو دعائیں مذکور ہیں، اول رَبِّ اجْعَلْ لِّیْ ذٰلِکَ اٰیٰتًا مِّنْکَ اَلَّذِیْنَ یَدْعُوْنَکَ اِسْمًا غَیْرَکَ اِسْمَ اٰبَآئِیْکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اِنَّکَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ (یعنی اے میرے پروردگار اس شہرِ مکہ کو جائے امن بنا دیجئے) سورۃ

بقدرہ میں بھی یہی دعا مذکور ہے، مگر اس میں لفظ بَلَدٌ بغیر الف لام کے بَلَدًا فرمایا ہے، جس کے معنی غیر متحین شہر کے ہیں، وجہ یہ ہے کہ وہ دعا اُس وقت کی تھی جبکہ شہر مکہ کی بستی آباد نہ تھی، اس لئے عام الفاظ میں یہ دعا کی کہ اس جگہ کو ایک شہر مامون بنادیتے۔

اور دوسری دعا اس وقت کی ہے جبکہ مکہ کی بستی بس چکی تھی، تو شہر مکہ کو متحین کر کے دعا فرمائی، کہ اس کو جائے امن بنادیتے، دوسری دعا یہ فرمائی کہ مجھ کو اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچائیے۔

انبیاء علیہم السلام اگرچہ معصوم ہوتے ہیں ان سے شرک و بت پرستی بلکہ کوئی گناہ سرزد نہیں ہو سکتا، مگر یہاں حضرت خلیلؑ نے اس دعا میں اپنے آپ کو بھی شامل فرمایا ہے، اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ طبعی خوف کے اثر سے انبیاء بھی ہر وقت اپنے کو خطرہ میں محسوس کرتے رہتے ہیں، یا یہ کہ اصل مقصود اپنی اولاد کو شرک و بت پرستی سے بچانے کی دعا کرنا تھا، اولاد کو اس کی اہمیت سمجھانے کے لئے اپنے آپ کو بھی شامل دعا فرمایا۔

اللہ جل شانہ نے اپنے خلیل کی دعا قبول فرمائی ان کی اولاد شرک و بت پرستی سے محفوظ رہی، اس پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اہل مکہ تو عموماً اولاد ابراہیم علیہ السلام ہیں، ان میں تو بت پرستی موجود تھی، بحر محیط میں اس کا جواب بحوالہ سفیان بن عیینہ یہ دیا ہے کہ اولاد اسمعیل علیہ السلام میں کسی نے درحقیقت بت پرستی نہیں کی، بلکہ جس وقت مکہ پر قوم جرہم کے لوگوں نے قبضہ کر کے اولاد اسمعیل علیہ السلام کو حرم سے نکال دیا، تو یہ لوگ حرم سے انتہائی محبت و عظمت کی بنا پر یہاں کے کچھ پتھر اپنے ساتھ اٹھالے گئے تھے، ان کو حرم محترم اور بیت اللہ کی یادگار کے طور پر سامنے رکھ کر عبادت اور اس کے گرد طواف کیا کرتے تھے، جس میں کسی غیر اللہ کی طرف کوئی رخ نہ تھا، بلکہ جس طرح بیت اللہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا یا بیت اللہ کے گرد طواف کرنا اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت ہے، اسی طرح وہ اس پتھر کی طرف رخ اور اس کے گرد طواف کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے منافی نہ سمجھتے تھے، اس کے بعد یہی طریقہ کار بت پرستی کا سبب بن گیا۔

دوسری آیت میں اپنی اس دعا کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ بت پرستی سے ہم اس لئے پناہ مانگتے ہیں کہ ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہی میں ڈال دیا ہے، یہ اس لئے فرمایا کہ حضرت ابراہیم السلام اپنے والد اور قوم کا تجربہ کر چکے تھے کہ بت پرستی کی رسم نے ان کو ہر خیر و صلاح سے محروم کر دیا۔

آخر آیت میں فرمایا فَمَنْ يَتَّبِعْنِي فَإِنَّهُ مِنِّي وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَافِرٌ رَّحِيمٌ

یعنی ان میں سے جو شخص میرا اتباع کرے یعنی ایمان اور عمل صالح کا پابند ہو جائے وہ تو میری ہر مطلب یہ ہے کہ اس پر فضل و کرم کی امید تو ظاہر ہے، اور جو شخص میری نافرمانی کرے تو آپ بہت مغفرت کرنے والے بڑی رحمت کرنے والے ہیں، اس میں نافرمانی سے اگر عمل نافرمانی یعنی بد عملی مراد لی جائے تو معنی ظاہر ہیں، کہ آپ کے فضل سے ان کی بھی مغفرت کی امید ہے، اور اگر نافرمانی سے مراد کفر و انکار لیا جائے تو یہ ظاہر ہے کہ کافر و مشرک کی مغفرت نہ ہونے اور ان کی شفاعت نہ کرنے کا حکم حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پہلے ہو چکا تھا، پھر ان کی مغفرت کی امید کا اظہار کرنا درست نہیں ہو سکتا، اس لئے بحر محیط میں فرمایا کہ اس جگہ حضرت خلیل علیہ السلام نے ان کی سفارش یا دعاء کے الفاظ نہیں اختیار کئے، یہ نہیں فرمایا کہ آپ ان کی مغفرت کر دیں، البتہ پیغمبرانہ شفقت جس کے دامن میں کافر بھی رہتے ہیں اور ہر پیغمبر کی دلی خواہش یہی ہوتی ہے کہ کوئی کافر بھی عذاب میں مبتلا نہ ہو اپنی اس طبعی خواہش کا اظہار اس عنوان سے کر دیا کہ ”آپ تو بڑے غفور و رحیم ہیں“ یوں نہیں فرمایا کہ ان کے ساتھ مغفرت و رحمت کا معاملہ فرمایا جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت کے کافروں کے بارے میں فرمایا إِنَّ تَغْفِرَ لَهُمْ وَأَنْتَ أَنتَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ یعنی اگر آپ ان کی مغفرت فرمائیں تو آپ قوی اور رحمت والے ہیں سب کچھ کر سکتے ہیں کوئی روکنے والا نہیں۔

ان دونوں بزرگوں نے کافروں کے معاملہ میں سفارش پر اقدام تو اس لئے نہیں کیا کہ وہ ادب حق کے خلاف تھا، مگر یہ بھی نہیں فرمایا کہ ان کافروں پر آپ عذاب نازل کر دیں بلکہ ادب کے ساتھ ایک خاص عنوان سے ان کے بھی بخشے جانے کی طبعی خواہش کا اظہار کر دیا۔

احکام و ہدایات | دعاء تو ہر انسان مانگتا ہے، مگر مانگنے کا سلیقہ ہر ایک کو نہیں ہوتا انبیاء علیہم السلام کی دعائیں سبق آموز ہوتی ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ کیا چیز مانگنے کی ہے، اس دعائے ابراہیمی کے دو جز ہیں، ایک شہر مکہ کو خوف خطر سے آزاد جائے امن بنا دینا، دوسرے اپنی اولاد کو بت پرستی سے ہمیشہ کے لئے نجات دلانا۔ غور سے کام لیا جائے تو انسان کی صلاح و فلاح کے یہی دو بنیادی اصول ہیں، کیونکہ انسانوں کو اگر اپنے رہنے سہنے کی جگہ میں خوف و خطر اور دشمنوں کے حملوں سے امن اطمینان نہ ہو تو نہ دنیوی اور مادی اعتبار سے ان کی زندگی خوشگوار ہو سکتی ہے اور نہ دینی اور روحانی اعتبار سے، دنیا کے سارے کامیوں اور راحتوں کا مدار تو امن و اطمینان پر ہونا ظاہر ہی ہے، جو شخص دشمنوں کے ترغیوں اور مختلف قسم کے خطروں میں گھرا ہوا ہو اس کے سامنے دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت کھانے پینے، سونے جاگنے کی بہترین آسانیاں، اعلیٰ قسم کے محلات اور بنگلے، مال دولت

三

یہ لوگ شکر گزار ہوں۔

حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس دعا کا واقعہ یہ ہے کہ بیت اللہ شریف کی تعمیر جو طوفانِ نوح میں بے نشان ہو گئی تھی جب اللہ تعالیٰ نے اس کی دوبارہ تعمیر کا ارادہ فرمایا تو اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام کو اس کے لئے منتخب فرمایا کہ ان کو ملکِ شام سے ہجرت کر کے حضرت ہاجرہ اور صاحبزادے اسمعیل علیہ السلام کے ساتھ اس بے آب و گیاہ مقام کو مسکن بنانے کے لئے مامور فرمایا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ اسمعیل علیہ السلام اس وقت شیرخوار بچے تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حسبِ حکم ان کو اور ان کی والدہ ہاجرہ کو موجودہ بیت اللہ اور چاہِ زمزم کے قریب ٹھہرا دیا، اس وقت یہ جگہ پہاڑوں سے گھری ہوئی ایک چٹیل میدان تھی، دور دور تک نہ پانی نہ آبادی، ابراہیم علیہ السلام نے ان کے لئے ایک توشہ دان میں کچھ کھانا اور ایک مشکیزہ میں پانی رکھ دیا تھا۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ملکِ شام کی طرف واپس ہونے کا حکم ملا، جس جگہ حکم ملا تھا وہیں سے تعمیلِ حکم کے لئے روانہ ہو گئے، بیوی اور شیرخوار بچہ کو اس نئی وادیِ جنگل میں چھوڑنے کا جو طبعی اور فطری اثر تھا اس کا اظہار تو اس دعا سے ہو گا جو بعد میں کی گئی مگر حکمِ ربانی کی تعمیل میں اتنی دیر بھی گوارا نہیں فرمائی کہ حضرت ہاجرہ کو خبر دیدیں، اور کچھ تسلی کے الفاظ کہہ دیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جب حضرت ہاجرہ نے ان کو جاتے ہوئے دیکھا تو بار بار آوازیں دیں کہ اس جنگل میں آپ ہمیں کس پر چھوڑ کر جا رہے ہیں، جہاں نہ کوئی انسان ہے نہ زندگی کا سامان مگر خلیل اللہ نے مُڑ کر نہیں دیکھا، تب حضرت ہاجرہ کو خیال آیا کہ اللہ کا خلیل ایسی بے وفائی نہیں کر سکتا، شاید اللہ تعالیٰ ہی کا حکم ملا ہے، تو آواز دے کر پوچھا کہ کیا آپ کو اللہ تعالیٰ نے یہاں سے چلے جانے کا حکم دیا ہے، تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مُڑ کر جواب دیا کہ ہاں، حضرت ہاجرہ نے یہ سن کر فرمایا اِذَا لَا يُضَيِّعُنَا، ”یعنی اب کوئی پرواہ نہیں، جس مالک نے آپ کو یہاں سے چلے جانے کا حکم دیا ہے وہ ہمیں بھی ضائع نہ کرے گا۔“

حضرت ابراہیم علیہ السلام آگے بڑھتے رہے، یہاں تک کہ ایک پہاڑی کے پیچھے پہنچ گئے، جہاں ہاجرہ و اسمعیل علیہما السلام آنکھوں سے اوجھل ہو گئے، تو اس وقت بیت اللہ کی طرف متوجہ ہو کر یہ دعا مانگی جو اس آیت میں مذکور ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مذکورہ دعا کے ضمن میں بہت سی ہدایات اور مسائل ہیں، ان کا بیان یہ ہے :-

(۱) دعاء ابراہیمی کے اسرار و حکم | حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک طرف تو مقام خلیل النبی کا حق ادا کیا، کہ جس وقت اور جس جگہ ان کو

یہ حکم ملا کہ آپ ملک شام واپس چلے جائیں، اس بے آب و گیاہ لٹ و دق میدان میں اہلیہ و شیرخوار بچے کو چھوڑ کر چلے جانے اور حکم ربانی کی تعمیل میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں فرمائی، اس کی تعمیل میں اتنی دیر لگانا بھی گوارا نہیں فرمایا کہ اہلیہ محترمہ کے پاس جا کر تسلی کر دیں، اور کہہ دیں کہ مجھ یہ حکم ملا ہے آپ گھبراہٹیں نہیں، بلکہ جس وقت جس جگہ حکم ملا فوراً حکم ربانی کی تعمیل کے لئے چل کھڑے ہوئے۔

دوسری طرف اہل و عیال کے حقوق اور ان کی نجات کا یہ حق ادا کیا کہ پہاڑی کے پیچھے ان سے اوجھل ہوتے ہی حق تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کی حفاظت اور امن و اطمینان کے ساتھ رہنے کی دعا فرمائی، ان کی راحت کا سامان کر دیا، کیونکہ وہ اپنی جگہ مطمئن تھے کہ تعمیل حکم کے ساتھ جو دعا کی جائے گی بارگاہ کریم سے وہ ہرگز روند نہ ہوگی، اور ایسا ہی ہوا کہ یہ بکس دیے بس عورت اور بچہ نہ صرف خود آباد ہوئے، بلکہ ان کے طفیل میں ایک شہر آباد ہو گیا اور نہ صرف یہ کہ ان کو ضروریات زندگی اطمینان کے ساتھ نصیب ہوئیں بلکہ ان کے طفیل میں آج تک اہل مکہ پر ہر طرح کی نعمتوں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔

یہ ہے پیغمبرانہ استقامت اور حسن انتظام کہ ایک پہلو کی رعایت کے وقت دوسرا پہلو کبھی نظر انداز نہیں ہوتا، وہ عام صوفیائے کرام کی طرح مغلوب الحال نہیں ہوتے، اور یہی وہ تعلیم ہے جس کے ذریعہ ایک انسان انسان کا مل بنتا ہے۔

(۲) غَیْرِ ذِی زَرْعٍ، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب حق تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ملا کہ شیرخوار بچے اور اس کی والدہ کو اس خشک میدان میں چھوڑ کر ملک شام چلے جائیں تو اسی حکم سے اتنا تو یقین ہو چکا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کو ضائع نہ فرما دیں گے بلکہ ان کیلئے پانی ضرور ہیا کیا جائے گا، اس لئے بَوَادِ غَیْرِ ذِی مَاءٍ نہیں کہا، بلکہ غَیْرِ ذِی زَرْعٍ فرما کر درخواست یہ کی کہ ان کو پھل اور ثمرات عطا ہوں خواہ کسی دوسری جگہ ہی سے لائے جائیں، یہی وجہ ہو کہ مکہ مکرمہ میں آج تک بھی کاشت کا کوئی خاص انتظام نہیں، مگر دنیا بھر کے پھل اور ہر چیز کے ثمرات وہاں اتنے پہنچتے ہیں کہ دوسرے بہت سے شہروں میں ان کا ملنا مشکل ہے۔ (بحر محیط)

(۳) عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ سے ثابت ہوا کہ بیت اللہ شریف کی بناء حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے ہو چکی تھی، جیسا کہ ایام قرطبی نے تفسیر سورۃ بقرہ میں متعدد روایات سے ثابت کیا ہے کہ سب سے پہلے بیت اللہ کی تعمیر آدم علیہ السلام نے کی ہے، جب

ان کو زمین پر اتارا گیا، تو بطور معجزہ جبل سراندیپ سے اس جگہ تک ان کو پہونچایا گیا، اور جبریل امین نے بیت اللہ کی جگہ کی نشاندہی بھی کی، اس کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام نے اس کی تعمیر کی وہ خود اور ان کی اولاد اس کے گرد طواف کرتے تھے، یہاں تک کہ طوفانِ نوح میں بیت اللہ کو اٹھا لیا اور اس کی بنیادیں زمین میں موجود رہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو انہی بنیادوں پر بیت اللہ کی نئی تعمیر کا حکم ملا، حضرت جبریل امین نے قدیم بنیادوں کی نشان دہی کی، پھر یہ بناء ابراہیم علیہ السلام کی جگہ پر عرب میں منہدم ہو گئی، تو قریش جاہلیت نے از سر نو تعمیر کی، جس کی تعمیر میں ابو طالب کے ساتھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نبوت سے پہلے حصہ لیا۔

اس میں بیت اللہ کی صفت محترم ذکر کی گئی ہے، محترم کے معنی معزز کے بھی ہو سکتے ہیں اور محفوظ کے بھی، بیت اللہ شریعت میں یہ دونوں صفتیں موجود ہیں کہ ہمیشہ معزز اور محترم رہا ہے، اور ہمیشہ دشمنوں سے محفوظ بھی رہا ہے۔

(۴) لَيَقِيَنَّاهُ الصَّلَاةَ، حضرت خلیلؑ نے شروع دعا میں اپنے بچے اور اس کی والدہ کی بے بسی اور خستہ حالی ذکر کرنے کے بعد سب سے پہلے جو دعا کی وہ یہ کہ ان کو نماز کا پابند بنادے کیونکہ نماز دنیا و آخرت کی تمام خیرات و برکات کے لئے جامع ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اولاد کے حق میں اس سے بڑی کوئی ہمدردی اور خیر خواہی نہیں کہ ان کو نماز کا پابند بنادیا جائے اور اگرچہ وہاں اُس وقت صرف ایک عورت اور بچہ کو پھنسا تھا، مگر دعا میں صیغہ جمع کا استعمال فرمایا جس سے معلوم ہوا کہ حضرت خلیل علیہ السلام کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ یہاں شہر آباد ہو گا اور اس بچہ کی نسل چلے گی، اس لئے دعا میں ان سب کو شریک کر لیا۔

(۵) أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ، اَفْئِدَہ، فُؤاد کی جمع ہے، جس کے معنی دل کے ہیں، اس جگہ لفظ اَفْئِدَہ کو نکرہ اور اسکے ساتھ حرفِ مَن لایا گیا، جو تبعیض اور تقلیل کے لئے آتا ہے، اس لئے معنی یہ ہوتے کہ کچھ لوگوں کے قلوب اُن کی طرف مائل کر دیجئے، امام تفسیر حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ اگر اس دعا میں یہ حرف تبعیض و تقلیل نہ ہوتا بلکہ أَفْئِدَةَ النَّاسِ کہہ دیا جاتا تو ساری دنیا کے مسلم و غیر مسلم یہود و نصاریٰ اور مشرق و مغرب کے سب آدمی مکہ پر ٹوٹ پڑتے، جو اُن کے لئے باعثِ رحمت ہو جاتا، اس حقیقت کے پیش نظر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا میں یہ الفاظ فرمائے کہ کچھ لوگوں کے قلوب اُن کی طرف مائل کر دیجئے۔

(۶) وَأَسْرُزُّهُمْ مِّنَ الشَّجَرَاتِ، شَجَرَات، شجرۃ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں پھل اور عادتہ ان پھلوں کو کہا جاتا ہے جو کھائے جاتے ہیں، اس اعتبار سے دعا کا حاصل یہ ہو گا کہ ان لوگوں کو کھانے کے لئے ہر طرح کے پھل عطا فرمائے۔

اور کبھی لفظ شجرہ نتیجہ اور پیداوار کے معنی میں بھی آتا ہے، جو کھانے کی چیزوں سے زیادہ عام ہے، ہر نفع آور چیز کے نتیجہ اور حاصل کو اس کا شجرہ کہا جاسکتا ہے، مشینوں اور صنعتی کارخانوں کے ثمرات ان کی مصنوعات کہلائیں گی، ملازمت اور مزدوری کا شجرہ وہ اجرت اور تنخواہ کہلائیں گی جو اس کے نتیجہ میں حاصل ہوئی۔ قرآن کریم کی ایک آیت میں اس دعا میں شجرہ کھلے شے کا لفظ بھی آیا ہے، اس میں لفظ شجرہ کے بجائے لفظ شے لایا گیا ہے، جس سے اس طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ حضرت خلیل اللہ نے ان لوگوں کے لئے صرف کھانے کے پھلوں ہی کی دعا نہیں فرمائی، بلکہ ہر چیز کے ثمرات اور حاصل شدہ نتائج کی دعا مانگی ہے، جس میں دنیا بھر کی مصنوعات اور ہر طرح کی قابل انتفاع چیزیں داخل ہیں، شاید اس دعا کا یہ اثر ہے کہ مکہ مکرمہ باوجود دے کے نہ کوئی زراعتی ملک ہو نہ تجارتی یا صنعتی، لیکن دنیا بھر کی ساری چیزیں مشرق و مغرب سے پہنچ کر مکہ معظمہ میں آتی ہیں، جو غالباً دنیا کے کسی بڑے سے بڑے شہر کو بھی نصیب نہیں۔

(۷) حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی اولاد کے لئے یہ دعا نہیں فرمائی کہ مکہ کی زمین کو قابل کاشت بنادیں، ورنہ کچھ مشکل نہ تھا کہ مکہ کی وادی اور سائے پہاڑ سرسبز کر دیتے جاتے، جن میں باغات اور کھیت ہوتے، مگر خلیل اللہ نے اپنی اولاد کے لئے یہ زراعت کا مشغلہ پسند نہ کیا، اس لئے دعا فرمائی کہ کچھ لوگوں کے قلوب اُن کی طرف مائل کر دیئے جائیں، جو مشرق و مغرب اور اطرافِ عالم سے یہاں آیا کریں، ان کا یہ اجتماع پوری دنیا کے لئے رشد و ہدایت کا اور اہل مکہ کی خوش حالی کا ذریعہ بنے، اطرافِ عالم کی چیزیں بھی یہاں پہنچ جائیں، اور اہل مکہ کو کسبِ مال کے ذرائع بھی ہاتھ آجائیں، اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول فرمائی، اور آج تک اہل مکہ زراعت اور کاشت سے بے نیاز ہو کر تمام ضروریاتِ زندگی سے مالا مال ہیں۔

(۸) تَعَلَّمُوا شُكْرَ مَوْلَانِ، میں اشارہ کر دیا کہ اولاد کے لئے معاشی راحت و سکون کی دعا بھی اسی لئے کی گئی کہ یہ شکر گزار بن کر اس پر بھی اجر حاصل کریں، اس طرح دعا کی ابتداء نماز کی پابندی سے ہوتی، اور انتہا شکر گزاری پر، درمیان میں معاشی راحت و سکون کا ذکر آیا، اس میں یہ تعلیم ہے کہ مسلمان کو ایسا ہی ہونا چاہئے، کہ اس کے اعمال و احوال خیالات و افکار پر آخرت کی فلاح کا غلبہ ہو، اور دنیا کا کام بقدر ضرورت ہو۔

رَبَّنَا إِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نَحْفِظُ وَمَا نَخْفِیْ ۖ وَ مَا یَخْفِیْ عَلَی اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ۚ فِی السَّمٰوٰتِ ۝

اس آیت میں دعا کا تکملہ اللہ جل شانہ کے علمِ محیط کا حوالہ دے کر کیا گیا ہے، اور

لفظ رَبَّنَا کو الحاج و زاری کے لئے مکرر لایا گیا ہے، معنی یہ ہیں کہ آپ ہمارے ہر حال سے واقف اور ہماری قلبی باطنی کیفیات اور ظاہری عرض و محرومیت سب سے باخبر ہیں۔

باطنی کیفیات سے مراد وہ رنج و غم اور فکر ہے جو شیرخوار بچے اور اس کی والدہ کو ایک کھلے میدان میں بے سرو سامان فریاد کرتے ہوئے چھوڑنے اور ان کی جدائی سے فطری طور پر لاحق ہو رہا تھا، اور ظاہری عرض و محرومیت سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور حضرت ہاجرہ کے وہ کلمات مراد ہیں جو انھوں نے امراہی کی خبر سن کر کہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم کیا ہے تو وہ ہمارے لئے بھی کافی ہے وہ ہمیں بھی ضائع نہیں کرے گا، آخر آیت میں عِلْمِ اٰہِی کی اسی وسعت کا مزید بیان ہے کہ ہمارا ظاہر و باطن ہی کیا، تمام زمین و آسمان میں کوئی چیز اللہ تعالیٰ پر مخفی نہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَی الْکِبَرِ اِسْمٰحِیْلَ وَاسْتَخْوٰ طِرَانًا رَبِّیْ
تَسْمِیْعَ الدُّعَاۤءِ اس آیت کا مضمون بھی اس دعا کا تکملہ ہے، کیونکہ یہ دعا کے آداب میں سے ہے کہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کی جائے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خصوصیت سے اس جگہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا شکر ادا کیا کہ شدید بڑھاپے کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرما کر اولاد صالح حضرت اسمحیل اور اسحق علیہما السلام عطا فرمائے۔

اس حمد و ثناء میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ بچہ جو بے یار و مددگار چٹیل میدان میں چھوڑا ہے آپ ہی کا عطیہ ہے، آپ ہی اس کی حفاظت فرمائیں گے، آخر میں حمد و ثناء کا تکملہ اِنَّ رَبِّیْ تَسْمِیْعَ الدُّعَاۤءِ سے کیا گیا، یعنی بلاشبہ میرا پروردگار دعاؤں کا سننے والا اور مقبول کرنے والا ہے۔

اس حمد و ثناء کے بعد پھر دعا میں مشغول ہو گئے، اور فرمایا: رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوۃِ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ رَبَّنَا وَ تَقَبَّلْ دُعَاۤءِ، جس میں اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے نماز کی پابندی پر قائم رہنے کی دعا کی، اور آخر میں پھر بطور الحاج کے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! میری یہ دعا قبول فرمائیے۔

آخر میں ایک جامع دعا فرمائی رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَلِیِّ لَیْ وَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ
یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ یعنی اے ہمارے پروردگار! میری اور میرے والدین کی اور تمام مؤمنین کی مغفرت فرما، اس دن جب کہ محشر میں تمام زندگی کے اعمال کا حساب لیا جائیگا اس میں والدین کے لئے بھی مغفرت کی دعا فرمائی، حالانکہ والد یعنی آذر کا کافر ہونا قرآن میں مذکور ہے، ہو سکتا ہے کہ یہ دعا اُس وقت کی ہو جب کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کافروں کی سفارش اور دعائے مغفرت سے منع نہیں کیا گیا تھا، جیسے دوسری جگہ

قرآن کریم میں ہے **وَاعْفُ عَنِّي** اِذْنِي اِذْنِي كَانَ مِنَ الصَّالِّينَ ۝

احکام و ہدایات آیات مذکورہ سے دعا کے آداب یہ معلوم ہوتے ہیں کہ بار بار الحاج و زائر کے ساتھ کی جائے، اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بھی کی جائے اس طرح دعا کی قبولیت کی بڑی امید ہو جاتی ہے۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظَّالِمُونَ ۚ إِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ

اور ہرگز مت خیال کر کہ اللہ بے خبر ہو ان کاموں سے جو کرتے ہیں بے انصاف، ان کو تو ڈھیل دے رکھی

لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيهِ الْأَبْصَارُ ۚ ۝۴۲ مَّطُوعِينَ مُقْنِعِي رُءُوسِهِمْ

ہو اس دن کے لئے کہ پتھرا جائیں گی آنکھیں، دھڑکتے ہوں گے اوپر اٹھائے اپنے سر

لَا يَرْتَدُّ إِلَيْهِمْ طَرَفُهُمْ ۚ وَأَفِيدَ تَهُمُهُمْ هَوَاءُ ۚ ۝۴۳ وَأَنْذِرِ

پھر نہ لوٹیں آئیں گی ان کی طرف انکی آنکھیں، اور دل اُن کے اڑ گئے ہوں گے، اور ڈرا دے

النَّاسَ يَوْمَ يَأْتِيهِمُ الْعَذَابُ ابْ فَيَقُولُ الَّذِينَ ظَلَمُوا رَبَّنَا

لوگوں کو اس دن سے کہ آئے گا ان پر عذاب تب کہیں گے ظالم اے رب ہمارے

أَخِّرْنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ ۖ نَجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرَّسُولَ ۖ أَوَّلَمَ

ہمت دے ہم کو تھوڑی مدت تک، کہ ہم قبول کر لیں تیری بلائے کو اور پیردی کر لیں رسولوں کی کیا تم

تَكُونُوا أَقْسَمًا مِّنْ قَبْلِ مَا لَكُم مِّنْ زَوَالٍ ۚ ۝۴۴ وَكَانَتْ

پہلے قسم نہ کھاتے تھے کہ تم کو نہیں دنیا سے ملنا، اور آباد تھے تم

فِي مَسَاكِينِ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا

بستیوں میں انہی لوگوں کی جنہوں نے ظلم کیا اپنی جان پر اور کھل چکا تھا تم کو کہ کیسا کیا

بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمْ الْأَمْثَالَ ۚ ۝۴۵ وَقَدْ مَكَرُوا مَكْرَهُمْ وَ

ہم نے اُن سے اور بتلائے ہم نے تم کو سب قصے، اور یہ بنا چکے ہیں اپنے داؤ اور

عِنْدَ اللَّهِ مَكْرُهُمْ ۚ وَإِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُولَ مِنْهُ الْجِبَالُ ۚ ۝۴۶

اللہ کے آگے جو ان کا داؤ اور نہ ہوگا ان کا داؤ کہ ٹل جائیں اس سے پہاڑ،

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ مُخَلِّفًا وَعْدَهُ ۚ رُسُلُهُ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ ذُو

سو خیال مت کر کہ اللہ خلاف کریگا اپنا وعدہ اپنے رسولوں کے بیشک اللہ زبردست ہے

اِتِّقَاءِ ۝ يَوْمَ تَبْدَلُ الْأَرْضُ مِنْ غَيْرِ الْأَرْضِ وَالسَّمَوَاتُ وَ

بدلہ لینے والا، جس دن بدلی جائے اس زمین سے اور زمین اور بدلے جائیں آسمان اور

بَرَزُوا لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝ وَتَرَى الْمُجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ

لوگ نکل کھڑے ہوں سامنے اللہ اکیلے زبردست کے، اور دیکھے تو گنہگاروں کو اس دن

مَقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ ۝ سَكَرَابِيلُهُمْ مِنْ قَطَرٍ اِنْ وَتَغْشَى

باہم جکڑے ہوئے زنجیروں میں، کرتے اُن کے ہیں گندھک کے اور ڈھانکے لیتی

وَجُوهُهُمُ النَّارُ ۝ لِيَجْزِيَ اللَّهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ اِنَّ

ہر ان کے منہ کو آگ، تاکہ بدلے اللہ ہر ایک جی کو اس کی کمائی کا، بیشک

اللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝ هَذَا ابْلَغُ النَّاسِ وَلِيُنْذِرُ وَاٰيِه

اللہ جلد کرنے والا ہے حساب، یہ خبر پہنچا دینی ہے لوگوں کو اور تاکہ چونک جائیں ہر

وَلِيَعْلَمُوا اَنَّ سَآءَ مَا هُوَ وَاِلَهُ وَاَحَدٌ وَلَسِيذٌ كَرَّ اُولَآءِ الْاَلْبَابِ ۝

اور تاکہ جان لیں کہ معبود وہی ایک ہے اور تاکہ سوچ لیں عقل والے۔

خلاصہ تفسیر

اور (اے مخاطب) جو کچھ یہ ظالم (کافر) لوگ کر رہے ہیں اس سے خدا تعالیٰ کو (جلدی

عذاب نہ دینے کی بنا پر) بے خبر مت سمجھ (کیونکہ) ان کو صرف اس روز تک ہملت دے رکھی ہے

جس میں اُن لوگوں کی نکاہیں (ماتے حیرت اور ہیبت کے) پھیلی رہ جاویں گی (اور وہ موقف حساب کی طرف

حسب الطلب) دوڑتے ہوں گے (اور فرط حیرت سے) اپنے سر پر اٹھار کھے ہوں گے (اور) ان کی نظر اُن کی طرف ہٹ

کر نہ آدینگی (یعنی ایسی ٹکٹکی بندھے گی کہ اُنکی نہ چسکیں گے) اور ان کے دل (شدت بول سے) بالکل بدحواس

ہوں گے اور (جب وہ دن آجائے گا پھر ہملت نہ ہوگی پس) آپ ان لوگوں کو اس دن (کے آنے)

سے ڈرائیے جس دن ان پر عذاب آپڑے گا، پھر یہ ظالم لوگ کہیں گے کہ اے ہمارے رب ایک مدت

قلیل تک ہم کو (اور) ہملت دیدیجئے (اور دنیا میں پھر بھیج دیجئے) ہم (اس مدت میں) آپ کا

سب کہنا مان لیں گے اور پیغمبروں کا اتباع کریں گے (جواب میں ارشاد ہوگا کہ کیا ہم نے دنیا میں تم کو مہلت طویلہ نہ دی تھی اور کیا تم نے اس مہلت کے سول ہی کے سبب اس کے قبل (دنیا میں) قسمیں نہ کھائی تھیں کہ تم کو (دنیا سے) کہیں جو نہ ہی نہیں ہے (یعنی قیامت کے منکر تھے اور اس پر قسم کھاتے تھے، بقولہ تعالیٰ وَ أَقْسَمُوا بِاللّٰهِ جَهَنَّمَ اٰیٰمًا زَمِنُمْ لَا یَبْعَثُ اللّٰهُ مِنْ یَّمُوْتٍ) حالانکہ انکار سے باز آجانے کے اسباب سب مجتمع تھے چنانچہ (تم ان (پہلے) لوگوں کے رہنے کی جگہوں میں رہتے تھے جنہوں نے کفر و انکار قیامت کر کے، اپنی ذات کا نقصان کیا تھا اور تم کو (تو اتر اخبار سے) یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ ہم نے ان کے ساتھ کیونکر معاملہ کیا تھا کہ ان کے کفر و انکار پر ان کو سزائیں دیں، اس سے تم کو معلوم ہو سکتا تھا کہ انکار کرنا موجب غضب ہے، پس تصدیق واجب ہے، اور ان کے مساکن میں رہنا ہر وقت اُن کے ان حالات کی یاد دلانے کا سبب ہو سکتا تھا، پس انکار کی کسی وقت گنجائش نہ تھی) اور علاوہ ان واقعات کے سننے کے جو کہ عبرت کے لئے کافی تھے، ہم نے (بھی) تم سے مثالیں بیان کیں (یعنی کتب سماویہ میں ہم نے بھی ان واقعات کو مثال کے طور پر بیان کیا کہ اگر تم ایسا کرو گے تو تم بھی ایسے ہی مغضوب و مستحق عذاب ہو گے پس واقعات کا اولاً اخبار سے سننا پھر ہمارا ان کو بیان کرنا، پھر مماثلت پھر تنبیہ کروینا یہ سب سبب مقتضی، اس کو تھے کہ قیامت کا انکار نہ کرتے، اور ہم نے جن پہلے لوگوں کو ان کے کفر و انکار پر سزائیں دیں، ان لوگوں نے ردین حق کے مٹانے میں اپنی سی بہت ہی بڑی بڑی تدبیریں کیں تھیں اور ان کی (یہ سب) تدبیریں اللہ کے سننے تھیں (اس کے علم سے غفلت نہ رہ سکتی تھیں) اور واقعی ان کی تدبیریں ایسی تھیں کہ (عجب نہیں) ان سے پہاڑ بھی (اپنی جگہ سے) تل جا دیں، دریا بھی حق ہی غالب رہا اور ان کی ساری تدبیریں لغو و بیکار ہو گئیں اور وہ ہلاک کئے گئے، اس سے بھی معلوم ہو گیا کہ حق وہی ہے جو پیغمبر فرماتے تھے اور اس کا انکار موجب غضب و عذاب ہے، جب قیامت میں ان کا مخلو ہونا معلوم ہو گیا، پس (اسے مخاطب) اللہ تعالیٰ کو اپنے رسولوں سے وعدہ خلافی کرنے والا نہ سمجھنا، (چنانچہ قیامت کے دن ان کے منکرین کے عذاب کا وعدہ تھا سو وہ پورا ہوگا، جیسا اوپر مذکور ہوا) بیشک اللہ تعالیٰ بڑا زبردست (اور) پورا بدلہ لینے والا ہے (کہ اس کو کوئی بدلہ لینے سے نہیں روک سکتا، پس قدرت بھی کامل پھر مشیت کا تعلق اوپر معلوم ہوا، پھر خلف وعدہ کا کیا احتمال رہا اور یہ بدلہ اس روز ہوگا) جس روز دوسری زمین بدل جاوے گی اس زمین کے علاوہ اور آسمان بھی (دوسرے بدل دیئے جاویں گے) ان آسمانوں کے علاوہ کیونکہ اول بار کے نفع خور سب زمین و آسمان ٹوٹ پھوٹ جاویں گے، پھر دوسری بار میں از سر نو زمین و آسمان بنیں گے،

اور سب کے سب ایک (اور) زبردست اللہ کے روبرو پیش ہوں گے (اور اس سے قیامت کا دن ہر
یعنی قیامت میں بدلہ لیا جاوے گا) اور اس روز اے مخاطب (تو مجرموں کو) یعنی کافروں کو (زنجیروں
میں جکڑے ہوئے دیکھے گا) اور ان کے کرتے قطران کے ہوں گے (یعنی سارے بدن کو قطران
پٹی ہوگی کہ اس میں آگ جلدی اور تیزی کے ساتھ لگے اور قطران درخت چتر کا روغن ہوتا ہے
کما فی کتب اللغات والطب) اور آگ ان کے چہروں پر (بھی) پٹی ہوگی (یہ سب کچھ اس سے
ہوگا) تاکہ اللہ تعالیٰ ہر (مجرم) شخص کو اس کے کئے کی سزا دے (اور گواہی سے مجرم بے انتہا ہونگے
مگر) یقیناً اللہ تعالیٰ (کو ان کا حساب و کتاب کچھ دشوار نہیں کیونکہ وہ) بڑی جلد حساب لینے والا
ہے (سب کا فیصلہ شروع کر کے فوراً ہی ختم کر دے گا) یہ (قرآن) لوگوں کے لئے احکام کا پہنچانا
ہے (تاکہ مبلغ یعنی رسول کی تصدیق کریں) اور تاکہ اس کے ذریعہ سے (عذاب کے) ڈرائے جائیں
اور تاکہ اس بات کا یقین کر لیں کہ وہی ایک معبود برحق ہے اور تاکہ دانشمند لوگ نصیحت حاصل کر لیں:

معارف و مسائل

سورۃ ابراہیم میں حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کے کچھ حالات و معاملات
کی تفصیل اور احکام الہیہ کی مخالفت کرنے والوں کے انجام بد اور آخر میں حضرت خلیل اللہ
ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ تھا، جنہوں نے بیت اللہ کی تعمیر کی، اور جن کی اولاد کے لئے اللہ تعالیٰ
نے مکہ مکرمہ کی بستی بسائی، اور اس کے بسنے والوں کو ہر طرح کا امن و امان اور غیر معمولی طور پر
معاشی سہولتیں عطا فرمائیں، انہی کی اولاد بنی اسماعیل قرآن عظیم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کے مخاطب اول ہیں۔

سورۃ ابراہیم کے اس آخری رکوع میں خلاصہ کے طور پر اپنی اہل مکہ کو پچھلی قوموں کی
سرگذشت سے عبرت حاصل کرنے کی تلقین اور اب بھی ہوش میں نہ آنے کی صورت میں قیامت
کے ہولناک عذابوں سے ڈرایا گیا ہے۔

پہلی آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ہر مظلوم کی تسلی اور ظالم کے لئے سخت
عذاب کی دھمکی ہے کہ ظالم اور مجرم لوگ اللہ تعالیٰ کی ڈھیل دینے سے بے فکر نہ ہو جائیں، اور یہ
نہ سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ کو ان کے جبرائتم کی خبر نہیں، اس لئے باوجود جبرائتم کے وہ پھل پھول رہے
ہیں، کوئی عذاب و مصیبت ان پر نہیں آتی، بلکہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں سب اللہ تعالیٰ کی نظر
میں ہے، مگر وہ اپنی رحمت اور حکمت کے تقاضے سے ڈھیل دے رہے ہیں۔

لَا تَحْسِبَنَّ اللَّهَ غَافِلًا، یعنی نہ سمجھو اللہ تعالیٰ کو غافل، یہ خطاب بظاہر ہر اس

شخص کے لئے ہے جس کو اس کی غفلت اور شیطان نے اس دھوکہ میں ڈالا ہوا ہے، اور اگر اس کا مخاطب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہوں تو بھی مقصود اس سے امت کے غافلوں کو سنانا اور تنبیہ کرنا ہے کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا امکان ہی نہیں کہ وہ معاذ اللہ تعالیٰ کو حالات سے بے خبر یا غافل سمجھیں۔

دوسری آیت میں بتلایا کہ ان ظالموں پر فوری طور سے عذاب نہ آنا ان کے لئے کچھ اچھا نہیں، کیونکہ اس کا انجام یہ ہے کہ یہ لوگ اچانک قیامت اور آخرت کے عذاب میں پکڑ لئے جائیں گے آگے سورۃ تک اس عذاب آخرت کی تفصیلات اور ہولناکی و قاتل کا بیان ہے۔

لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيهِ الْأَبْصَارُ، یعنی اس دن جبکہ چھٹی رہ جائیں گی آنکھیں۔
مُطَاعِطِينَ مُقْبِعِي رُؤُسِهِمْ، یعنی خوف و حیرت کے سبب سر اوپر اٹھائے ہوئے بے تحاشا دوڑ رہے ہوں گے، لَا يَرْجِعُونَ إِلَىٰ هِمَّتِهِمْ فَهُمْ أَن كِي يَكْسِي كِي، وَأَقْبِلَتْهُمُ هَوَاهُو، اُن کے دل خالی ہو جو اس ہوں گے۔

یہ حالات بیان کرنے کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے کہ آپ اپنی قوم کو اس دن کے عذاب سے ڈرائیے جس میں ظالم اور مجرم لوگ بیور ہو کر پکاریں گے کہ اے ہمارے پروردگار! میں کچھ اور مہلت دیدیجئے یعنی پھر دنیا میں چند روز کے لئے بھیج دیجئے تاکہ ہم آپ کی دعوت قبول کر لیں اور آپ کے رسولوں کا اتباع کر کے اس عذاب سے نجات حاصل کر سکیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی درخواست کا یہ جواب ہو گا کہ اب تم یہ کہہ رہے ہو کیا تم نے اس سے پہلے قسمیں نہیں کھائی تھیں کہ ہماری دولت و شوکت کو زوال نہ ہو گا ہم ہمیشہ دنیا میں یوں ہی عیش و عشرت میں رہیں گے اور دوبارہ زندگی اور عالم آخرت کا انکار کیا تھا۔

وَسَكُنْتُمْ فِي مَسَاكِينِ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَحَشَا بَنَاتُكُمْ إِلَّا مَنَال، ظاہر یہ ہے کہ یہ خطاب مشرکین عرب کو ہے، جن کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا ہے أَنْذِرِ النَّاسَ، یعنی ڈراؤ ان لوگوں کو، اس خطاب میں ان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ اقوام سابقہ کے حالات و انقلابات تمہارے لئے بہترین واعظ ہیں تعجب ہو کہ تم ان سے عبرت حاصل نہیں کرتے، حالانکہ تم انہی ہلاک شدہ قوموں کے گھروں میں بستے اور چلتے پھرتے ہو، اور تمہیں کچھ حالات کے مشاہدہ سے کچھ متواتر خبروں سے یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے ان پر کیسا سخت عذاب نازل کیا، اور ہم نے بھی تمہارے راہ پر لانے کے لئے بہت سی مثالیں بیان کیں، پھر بھی تم ہوش میں نہیں آتے۔

وَقَدْ مَكَرُوا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللَّهِ مَكْرُهُمْ وَإِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُولَ مِنْهُ الْجِبَالُ، یعنی ان لوگوں نے دین حق مٹانے اور دعوت حق قبول کرنے والے مسلمانوں کو ستانے اور ایذا پہنچانے کے لئے بھرپور تدبیریں کیں، اور اللہ تعالیٰ کے پاس انکی سب کھلی اور چھپی ہوئی تدبیریں سامنے موجود ہیں، وہ سب سے واقف اور ان کو ناکام بنا دینے پر قادر ہیں، اگرچہ ان کی تدبیریں ایسی عظیم اور سخت تھیں کہ ان کے مقابلہ پر پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہٹ جائیں، مگر اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے سامنے یہ ساری تدبیریں گرد اور ناکام ہو کر رہ گئیں۔

جن مخالفانہ تدبیروں کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے، اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد پھلی ہلاک شدہ قوموں کی تدبیریں ہوں، مثلاً نمrod، فرعون، قوم عاد و ثمود وغیرہ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس میں موجودہ مشرکین عرب کا حال بیان کیا گیا ہو کہ انھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں بڑی گہری اور دور رس سازشیں اور تدبیریں کیں مگر اللہ تعالیٰ نے ان سب کو ناکام بنا دیا اور اکثر مفسرین نے وَإِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ میں لفظ إِنْ کو حرف نفی قرار دے کر یہ معنی کئے ہیں کہ اگرچہ انھوں نے بہت سی تدبیریں کیں اور چالیں چلیں، لیکن ان کی تدبیروں اور چالوں سے یہ ممکن نہ تھا کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائیں، اور پہاڑ سے مراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کا عزم و استقلال ہے کہ کفار کی کوئی چال اس پر اثر انداز نہیں ہو سکی۔

اس کے بعد امت محمدیہ کو سنانے کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یا ہر مخاطب کو یہ تنبیہ کی گئی: فَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ مُخَلَّفًا وَعِدٍ بِرُسُلِهِ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ ذُو انتِقَامٍ ”یعنی کوئی یہ نہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں سے جو وعدے کیے و نصرت اور کامیابی کے کوئے ہیں وہ ان کے خلاف کرے گا، بلاشبہ اللہ تعالیٰ زبردست اور انتقام لینے والا ہے، وہ ضرور اپنے پیغمبروں کے دشمنوں سے انتقام لے گا، اور پیغمبروں سے جو وعدے کئے ان کو پورا کرے گا۔

اس کے بعد کی آیات میں پھر قیامت کے ہولناک حالات و واقعات کا ذکر ہے، ارشاد فرمایا: يَوْمَ تَبْدَلُ السَّمَاوَاتُ غَيْرَ السَّمَاوَاتِ وَتَبْدَلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَتَكُونُ السَّمَاءُ آسَافًا مُدْخِلًا ”یعنی قیامت کا دن ایسا ہوگا کہ اس میں موجودہ زمین بھی بدل دی جائے گی، اور آسمان بھی اور سب کے سب اللہ واحد و قہار کے سامنے حاضر ہوں گے“

زمین و آسمان کے بدل دینے کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ان کی صفات اور شکل و صورت بدل دی جائے، جیسا کہ قرآن کریم کی دوسری آیات اور روایات حدیث میں ہے کہ پوری زمین ایک سطح مستوی بنا دی جائے گی، جس میں نہ کسی مکان کی آڑ ہوگی، نہ درخت وغیرہ کی، نہ کوئی پہاڑ اور ٹیلہ رہے گا نہ غار اور گہرائی، قرآن کریم میں اسی حال کا ذکر اس طرح مندرمایا ہے

لَا تَرَىٰ فِيهَا عِوَجًا وَلَا أَمْتًا، یعنی تعمیرات اور پہاڑوں کی وجہ سے جو آجکل راستے اور سڑکیں ترا کر گزرتی ہیں، اور کہیں اونچائی ہے کہیں گہرائی، یہ صورت نہ رہے گی بلکہ سب صاف میدان ہو جائے گا۔

اور تبدیل زمین و آسمان کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ بالکل ہی اس زمین کے بدلے میں دوسری زمین اور اس آسمان کی جگہ دوسرے آسمان بنادیے جائیں، روایات حدیث جو اس کے متعلق منقول ہیں ان میں بھی بعض سے صرف صفات کی تبدیلی معلوم ہوتی ہے بعض سے ذات کی تبدیلی امام حدیث بیہقی نے بسند صحیح حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے اس آیت کے بارے میں یہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محشر کی زمین بالکل نئی زمین چاندی کی طرح سفید ہوگی اور یہ زمین ایسی ہوگی جس پر کسی نے کوئی گناہ نہیں کیا ہوگا جس پر کسی کا ناحق خون نہیں گرایا گیا، اسی طرح مسند احمد اور تفسیر ابن جریر کی حدیث میں یہی مضمون بروایت حضرت انسؓ مذکور ہے (تفسیر مظہری)

صحیحین، بخاری و مسلم میں حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز لوگ ایک ایسی زمین پر اٹھائے جائیں گے جو ایسی صاف و سفید ہوگی جیسے میدے کی روٹی، اس میں کسی کی کوئی علامت (مکان، باغ، درخت، پہاڑ، ٹیلہ وغیرہ کی) کچھ نہ ہوگی، یہی مضمون بیہقی نے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے۔

اور حاکم نے سند قوی کے ساتھ حضرت جابرؓ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز یہ زمین اس طرح کھینچی جائے گی، جیسے پٹڑے کو کھینچا جائے جس سے اس کی سلوٹیں اور شکن نکل جائیں (اس کی وجہ سے زمین کے غار اور پہاڑ سب برابر ہو کر ایک سطح مستوی بن جائے گی، اور اس وقت تمام اولاد آدم اس زمین پر جمع ہوگی، اس ہجوم کی وجہ سے ایک انسان کے حصہ میں صرف اتنی ہی زمین ہوگی، جس پر وہ کھڑا ہو سکے، پھر محشر میں سب سے پہلے مجھے بلایا جائے گا، میں رب العزت کے سامنے سجدہ میں گر پڑوں گا، پھر مجھے شفاعت کی اجازت دی جائے گی تو میں تمام مخلوق کے لئے شفاعت کروں گا، کہ ان کا حساب کتاب جلد ہو جائے۔ اس آخری روایت سے تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمین میں تبدیلی صرف صفت کی ہوگی کہ غار اور پہاڑ اور عمارت اور درخت نہ رہیں گے، مگر ذات زمین ہی باقی رہے گی، اور پہلی سب روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ محشر کی زمین اس موجودہ زمین کے علاوہ کوئی اور ہوگی، اور جس تبدیلی کا ذکر اس آیت میں ہے اس سے ذات کی تبدیلی مراد ہے۔

بَيَانُ الْقُرْآنِ میں حضرت حکیم الامت نے فرمایا کہ ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں، ہو سکتا کہ پہلے نغمہ صور کے وقت اسی موجودہ زمین کی صفات تبدیل کی جائیں اور پھر حساب کتاب کے لئے ان کو کسی دوسری زمین کی طرف منتقل کیا جائے۔

تفسیر منہری میں مسند عبد بن حمید سے حضرت عکرمہؓ کا ایک قول نقل کیا ہے جس سے اس کی تائید ہوتی ہے، اس کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے کہ یہ زمین سمٹ جائے گی اور اس کے پہلو میں ایک دوسری زمین ہوگی جس پر لوگوں کو حساب کتاب کے لئے کھڑا کیا جائے گا۔

پیچہ مسلم میں بروایت حضرت ثوبانؓ منقول ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک یہودی عالم آیا اور یہ سوال کیا کہ جس دن یہ زمین بدلی جاوے گی تو آدمی کہاں ہوں گے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ پل صراط کے پاس ایک اندھیری میں ہوں گے۔

اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ زمین سے بذریعہ پل صراط دوسری طرف منتقل کئے جائیں گے، اور ابن جریر نے اپنی تفسیر میں متحد صحابہ و تابعین کے یہ اقوال نقل کئے ہیں کہ اُس وقت موجودہ زمین اور اس کے سب دریا آگ ہو جائیں گے، گویا یہ سارا علاقہ جس میں اب دنیا آباد ہے اس وقت جہنم کا علاقہ ہو جائے گا، اور حقیقت حال اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے، بندہ کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں ہے۔

زبان تازہ کردن با قرار تو ؛ نینگختن علت از کار تو

آخری آیات میں اہل جہنم کا یہ حال بتلایا گیا ہے کہ مجرم لوگوں کو ایک زنجیر میں باندھ دیا جاتے گا، یعنی ہر جرم کے مجرم الگ الگ جمع کر کے یک جا باندھ دیئے جائیں گے، اور ان کو جو لباس پہنایا جائے گا وہ قطران کا ہوگا، جس کو تار کول کہا جاتا ہے، اور وہ ایک آتش گیر مادہ ہے کہ آگ فوراً پکڑ لیتا ہے۔

آخری آیت میں ارشاد فرمایا کہ یہ سب احوال قیامت کا بیان کرنا لوگوں کو تنبیہ کرنے کے لئے ہے، تاکہ وہ اب بھی سمجھ لیں کہ قابل عبادت و اطاعت صرف ایک ذات اللہ تعالیٰ کی ہے، اور تاکہ جن میں کچھ بھی عقل و ہوش ہے وہ شرک سے باز آجائیں :

سورۃ ابراہیم ختم شد

ایک یادداشت اور اطلاع

احقر ناکارہ نہ اس کا اہل تھا کہ تفسیر قرآن لکھنے کی جرأت کرے، نہ کبھی اس خیال کی ہمت کرتا تھا البتہ اپنے مرشد حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی تفسیر بیان القرآن کو جو اس زمانہ کی بے نظیر تفسیر ہے نہ بہت مختصر کہ مضمون قرآن سمجھنا مشکل ہو نہ بہت طویل کہ پڑھنا مشکل ہو، پھر خداداد علم و ذکاوت اور تقویٰ و طہارت کی برکت سے اقوال مختلفہ میں ایک کو ترجیح دے کر لکھ دینے کا جو خاص ذوق حق تعالیٰ نے موصوف کو عطا فرمایا تھا وہ بڑی تفسیروں سے بھی حاصل ہونا مشکل تھا، مگر یہ تفسیر حضرت نے اہل علم کے لئے اپنی کی زبان اور علمی اصطلاحوں میں لکھی ہے، عوام خصوصاً اس زمانہ کے عوام جو عربی زبان اور اس کی اصطلاحات سے بہت دور ہو چکے ہیں ان کو اس تفسیر سے استفادہ مشکل تھا۔

اس لئے یہ خیال اکثر رہا کرتا تھا کہ اس کے معنایں عجیبہ کو آجکل کی آسان زبان میں لکھا جائے مگر یہ بھی کوئی آسان کام نہ تھا۔

بحکم قہار و قدر اس کی ابتداء اس طرح ہو گئی کہ ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر صاحب نے مجھ پر اصرار کیا کہ ریڈیو پر ایک سلسلہ قرآن کی خاص خاص آیات کا بعنوان "معارف القرآن" جاری کیا جائے ان کا اصرار اس کام کے آغاز کا سبب بن گیا، اور ریڈیو پاکستان پر ہر جمعہ کے روز جمعہ ۳۱ شوال ۱۳۷۳ء مطابق ۲ جولائی ۱۹۵۴ء سے شروع ہو کر ۱۵ صفر ۱۳۸۴ء مطابق ۲۵ جون ۱۹۶۴ء تک جاری رہا، جو سورۃ ابراہیم کے اختتام پر منجانب محکمہ ریڈیو پاکستان ختم کر دیا گیا۔

حق تعالیٰ نے اس کو میرے دہم و گمان سے زیادہ مقبولیت عطا فرمائی، اور اطراف عالم سے اس کو کتابی صورت میں طبع کرنے کا تقاضا ہوا، اس کا ارادہ کیا تو جتنا کام اس وقت تک ہو چکا تھا وہ بھی اس لحاظ سے ناتمام تھا کہ یہ سلسلہ منتخب آیات کا تھا، درمیان آیات کو جو خالص علمی تھیں ریڈیو پر عوام کو ان کی تفسیر سمجھانا آسان نہ تھا، وہ رہ گئی تھیں، کتابی شکل میں طبع کرنے کے لئے ان کا سلسلہ بھی پورا کرنا تھا، جو بوجہ وقتی مشاغل کے پورا کرنا مشکل تھا۔

عجائب قدرت سے ہے کہ رمضان ۱۳۸۵ء میں احقر سخت بیمار ہو کر نقل و حرکت سے معذور صاحب فراش ہو گیا، اور موت سامنے محسوس ہونے لگی، تو اس کا افسوس ستانے لگا کہ یہ مسودات یوں ہی ضائع ہو جائیں گے، حق تعالیٰ نے دل میں یہ داعیہ پیدا فرما دیا کہ لیٹے بیٹھے "معارف القرآن" کے مسودات پر نظر ثانی اور درمیان آیات جو رہ گئی ہیں ان کی تکمیل کسی طرح اسی حالت میں کر دی جائے۔

ادھر بیماری کا سلسلہ طویل ہوتا چلا گیا، بیماری نے تمام دوسرے مشاغل پہلے ہی چھڑا دیے تھے، اب صرف یہی مشغلہ رہ گیا، اس لئے قدرت کے عجیب و غریب انتظام نے اسی بیماری میں بجلتہ یہ کام ۲۹ رجب ۱۳۹۱ھ تک پورا کرادیا۔

یہاں تک کہ سورۃ ابراہیم کا ختم اور قرآن پاک کے تیرہ پارے اسی ریڈیو کی نشری دروس کے ذریعہ پورے ہو گئے۔

اب اللہ تعالیٰ نے اگلے حصہ کے لکھنے کی توفیق و بہت بھی عطا فرمادی، نقل و حرکت سے معذوری کی تکلیف بھی رفع فرمادی، اگرچہ سلسلہ مختلف امراض کا تقریباً مسلسل رہا اور ضعف بھی بڑھتا رہا، مگر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اسی کی امداد سے ۳۰ شعبان ۱۳۹۱ھ سے قرآن کے اگلے پاروں کی تفسیر کا لکھنا شروع ہو کر اس وقت جبکہ معارف القرآن کی تین جلدیں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں، یعنی ۲۵ صفر ۱۳۹۱ھ میں اس تفسیر کا مسودہ قرآن کریم کی چوتھی منزل سورۃ فرقان انیسویں پارے تک بعون اللہ سبحانہ مکمل ہو چکا ہے۔

اس وقت بھی مختلف امراض اور ضعف کا سلسلہ بھی ہے، اور بھرا اللہ یہ کام بھی جاری ہے، کچھ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس کی تکمیل کی توفیق عطا فرمادیں۔
وما ذلک علی اللہ بعزیز

بنہ محمد شفیق
۲۵ صفر ۱۳۹۱ھ

سُورَةُ الْحَجَرِ

سُورَةُ الْحَجَرِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ تِسْعٌ وَتِسْعُونَ آيَةً وَسِتُّ رُكُوعَاتٌ

سورۃ حجر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ننانوے آیتیں اور چھ رکوع ہیں،

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الَّذِينَ تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ وَفُرْآنٍ مُّبِينٍ ①

۲ یہ آیتیں ہیں کتاب کی اور واضح قرآن کی ،

رَبِّمَا يَوْمَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَلَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ ②

کسی وقت آرزو کریں گے یہ لوگ جو منکر ہیں کیا اچھا ہوتا جو ہوتے مسلمان ،

ذُرِّهِمْ يَأْكُلُوا وَيَسْمَعُوا وَيُلْمِهِمْ أَلَا مَلُوفُ سُوءِ يَعْلَمُونَ ③

چھوڑ دے ان کو کھالیں اور برت لیں اور امیدیں لگے رہیں سو آئندہ معلوم کر لیں گے

وَمَا أَمْلَكْنَا مِنْ قُرْيَةٍ إِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُومٌ ④ مَا تَسْبِقُ

اور کوئی بستی ہم نے غارت نہیں کی مگر اس کا وقت لکھا ہوا تھا مقرر ، نہ سبقت کرتا ہے

مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ ⑤

کوئی فرقہ اپنے وقت مقرر سے اور نہ پیچھے رہتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

الَّذِينَ، اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں، یہ آیتیں ہیں ایک کامل کتاب کی اور

الَّذِينَ تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ وَفُرْآنٍ مُّبِينٍ

قرآن واضح کی دلیل اس کی دونوں صفتیں ہیں، کامل کتاب ہونا بھی اور قرآن واضح ہونا بھی، ان کلمات سے قرآن کا کلام حق ہونا واضح کرنے کے بعد ان لوگوں کی حسرت اور عذاب کا بیان ہے جو قرآن پر ایمان نہیں لاتے، یا اس کے احکام کی تعمیل نہیں کرتے، فرمایا **رَبَّمَا يَوَدُّ** یعنی جب قیامت کے حشر و نشر کے میدان میں کافروں پر طرح طرح کا عذاب ہوگا تو کافر لوگ بار بار تمنا کریں گے کہ کیا خوب ہوتا اگر وہ (یعنی ہم دنیا میں) مسلمان ہوتے (بار بار اس لئے کہ جب کوئی نئی شدت و مصیبت دیکھیں گے تو ہر مرتبہ اپنے اسلام نہ لانے پر حسرت تازہ ہوتی رہے گی)، آپ دنیا میں ان کے کفر پر غم نہ کیجئے اور ان کو ان کے حال پر رہنے دیجئے، کہ وہ (خوب) کھالیں اور چین اڑالیں، اور خیالی منصوبے ان کو غفلت میں ڈالے رکھیں ان کو ابھی (مرنے کے ساتھ ہی) حقیقت معلوم ہوتی جاتی ہے (اور دنیا میں جو ان کو ان کے کفر اور بد عملی کی فوراً سزا نہیں ملتی اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سزا کا وقت مقرر کر رکھا ہے، ابھی وہ وقت نہیں آیا، اور ہم نے جتنی بستیاں (کفر کی وجہ سے) ہلاک کی ہیں ان سب کے لئے ایک معین وقت لکھا ہوا ہوتا رہا اور رہا (اصول ہو کہ) کوئی امت اپنی میعاد مقرر سے نہ پہلے ہلاک ہوتی ہے اور نہ پیچھے رہی ہے (بلکہ وقت مقرر پہ ہلاک ہوتی ہے، اسی طرح جب ان کا وقت آجائے گا ان کو بھی سزا دی جائے گی)۔

معارف و مسائل

ذَرِّهُمْ يَأْكُلُوا الخ سے معلوم ہوا کہ کھانے پینے کو مقصد اور اصلی مشغلہ بنالینا اور دنیاوی عیش و عشرت کے سامان میں موت سے بے فکر ہو کر طویل منصوبوں میں لگے رہنا کفار ہی سے ہو سکتا ہے، جن کا آخرت اور اس کے حساب و کتاب اور جزاء و سزا پر ایمان نہیں، یومن بھی کھاتا پیتا ہے، اور معاش کا بقدر ضرورت سامان کرتا ہے، اور آئندہ کاروبار کے منصوبے بھی بناتا ہے، مگر موت اور فکر آخرت سے غافل ہو کر یہ کام نہیں کرتا، اسی لئے ہر کام میں حلال و حرام کی فکر رہتی ہے، اور فضول منصوبہ بندی کو مشغلہ نہیں بناتا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چار چیزیں بدبختی اور بد نصیبی کی علامت ہیں، آنکھوں سے آنسو جاری نہ ہونا (یعنی اپنے گناہوں، غفلتوں پر نادم ہو کر نہ رونا) اور سخت دلی، طولِ امل اور دنیا کی حرص (قرطبی عن مسند البزار عن انسؓ)

اور طولِ امل کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی محبت اور حرص میں اہٹناک اور موت و آخرت سے بے فکری کے ساتھ دور دراز کے منصوبے بنائے جائیں، (قرطبی) جو منصوبے دینی مقاصد

کے لئے یا کسی قوم و ملک کے آئندہ مفاد کے لئے بنائے جاتے ہیں وہ اس میں داخل نہیں، کیونکہ وہ فکر آخرت ہی کی ایک صورت ہے۔

اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس امت کے پہلے طبقہ کی نجات ایسا کامل اور دنیا سے اعراض کی وجہ سے ہوگی، اور آخری امت کے لوگ بخل اور طولِ امل کی وجہ سے ہلاک ہوں گے۔

اور حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ وہ جامع مسجد دمشق کے مستبر پر کھڑے ہوئے اور فرمایا، اے اہل دمشق! کیا تم اپنے ایک ہمدرد خیر خواہ بھائی کی بات سنو گے سن لو کہ تم سے پہلے بہت بڑے بڑے لوگ گزرے ہیں، جنہوں نے مال و متاع بہت جمع کیا اور بڑے بڑے شان دار محلات تعمیر کئے اور دروازے طویل منصوبے بنائے، آج وہ سب ہلاک ہو چکے ہیں، ان کے مکانات ان کی قبریں ہیں، اور ان کی طویل امیدیں سب دھوکہ اور فریب ثابت ہوئیں، قوم عاد بھٹکائے قریب تھی جس نے اپنے آدمیوں سے اور ہر طرح کے مال و متاع سے اور اسلحہ اور گھوڑوں سے ملک کو بھر دیا تھا، آج کوئی بے جو ان کی وراثت مجھ سے دو درہم میں خریدنے کو تیار ہو جائے۔

حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ جو شخص اپنی زندگی میں طویل امیدیں باندھتا ہے اس کا عمل مزد خراب ہو جاتا ہے (قرطبی)

وَقَالُوا يَا أَيُّهَا الَّذِي نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ ① لَوْ مَا

اور لوگ کہتے ہیں اے وہ شخص کہ تجھ پر اترا ہے قرآن تو بیشک دیوانہ ہے، کیوں نہیں

تَأْتِينَا بِالْمَلَكَةِ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ② مَا نُنْزِلُ

لے آتا ہمارے پاس فرشتوں کو اگر تو سچا ہے، ہم نہیں اتارتے

الْمَلَكَةَ إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوا إِذًا مُّنْظَرِیْنَ ③

فرشتوں کو مگر کام پورا کر کے اور اس وقت نہ ملے گی ان کو مہلت۔

خلاصہ تفسیر

وَالْحَقُّ میں لفظ حق سے مراد فیصلہ عذاب ہے، اور بعض مفسرین نے قرآن یارسا

کو مقرر دیا ہے، بیان القرآن میں پہلے معنی کو ترجیح دی ہے، یہ معنی حضرت حسن بصریؒ سے منقول ہیں، تفسیر آیات یہ ہے)۔

اور ان کفار (مکہ) نے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے) یوں کہا کہ اے وہ شخص جس پر (اس کے دعوے کے مطابق) قرآن نازل کیا گیا ہے تم (نعوذ باللہ) مجنون ہو (اور نبوت کا غلط دعوہ کرتے ہو ورنہ) اگر تم (اس دعوے میں) سچے ہو تو ہمارے پاس فرشتوں کو کیوں نہیں لاتے (جو ہمارے سامنے تمہارے صدق کی گواہی دیں کہ قولہ تعالیٰ کَذٰلَکَ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مَلٰکٌ فَاِکْثَرُ مِنْ نِّیْۡرَۃِ اللّٰهِ تعالیٰ جواب دیتے ہیں کہ) ہم فرشتوں کو (جس طریق پر وہ درخواست کرتے ہیں) صرف فیصلہ ہی کے لئے نازل کیا کرتے ہیں اور اگر ایسا ہوتا تو اس وقت ان کو جہلت بھی نہ دی جاتی بلکہ جب ان کے آنے پر بھی ایمان نہ لاتے جیسا کہ ان کے حالات سے ہی متیقن ہو تو فوراً ہلاک کر دیئے جاتے جیسا کہ سورۃ النعام کے اوّل رکوع کی اخیر آیتوں میں اس کی وجہ مذکور ہو چکی ہے)

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ ⑨

ہم نے آپ اتاری ہے یہ نصیحت اور ہم آپ اس کے نگہبان ہیں۔

خلاصہ تفسیر

ہم نے قرآن کو نازل کیا ہے اور یہ دعویٰ بلا دلیل نہیں بلکہ اس کا معجز ہونا اس پر دلیل ہے، اور قرآن کے ایک اعجاز کا بیان تو دوسری سورتوں میں مذکور ہے کہ کوئی انسان اس کی ایک سورۃ کی مثل نہیں بنا سکتا، دوسرا اعجاز یہ ہے کہ ہم اس (قرآن) کے محافظ (اور نگہبان) ہیں اس میں کوئی کمی بیشی نہیں کر سکتا، جیسا اور کتابوں میں ہوتا ہے، یہ ایسا صریح معجزہ ہے جس کو ہر عام و خاص سمجھ سکتا ہے، پہلا معجزہ کہ قرآن کی فصاحت و بلاغت اور جامعیت کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا، اس کو تو اہل علم ہی سمجھ سکتے ہیں، مگر کمی بیشی نہ ہونے کو تو ایک آن پڑھ جاہل بھی دیکھ سکتا ہے۔

معارف و مسائل

مامون کے دربار کا امام قرطبیؒ نے اس جگہ سند متصل کے ساتھ ایک واقعہ امیر المؤمنین مامون ایک واقعہ کے دربار کا نقل کیا ہے کہ مامون کی عادت تھی کہ کبھی کبھی اس کے دربار

میں علمی مسائل پر بحث و مباحثہ اور مذاکرے ہوا کرتے تھے، جس میں ہر اہل علم کو آنے کی اجازت تھی، ایسے ہی ایک مذاکرہ میں ایک یہودی بھی آگیا، جو صورت، شکل اور لباس وغیرہ کے اعتبار سے بھی ایک ممتاز آدمی معلوم ہوتا تھا، پھر گفتگو کی تودہ بھی فصیح و بلیغ اور عاقلانہ گفتگو تھی، جب مجلس ختم ہو گئی تو مامون نے اس کو بلا کر پوچھا کہ تم اسرائیلی ہو؟ اس نے اقرار کیا، مامون نے امتحان لینے کے لئے کہا کہ اگر تم مسلمان ہو جاؤ تو ہم تمہارے ساتھ بہت اچھا سلوک کریں گے۔ اس نے جواب دیا کہ میں تو اپنے اور اپنے آباء و اجداد کے دین کو نہیں چھوڑتا، بات ختم ہو گئی، یہ شخص چلا گیا، پھر ایک سال کے بعد یہی شخص مسلمان ہو کر آیا، اور مجلس مذاکرہ میں فقہ اسلامی کے موضوع پر بہترین تقریر اور عمدہ تحقیقات پیش کیں، مجلس ختم ہونے کے بعد مامون نے اس کو بلا کر کہا کہ تم وہی شخص ہو جو سال گذشتہ آئے تھے؟ جواب دیا ہاں وہی ہوں، مامون نے پوچھا کہ اُس وقت تو تم نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، پھر اب مسلمان ہونے کا سبب کیا ہوا؟

اس نے کہا میں یہاں سے لوٹا تو میں نے موجودہ مذاہب کی تحقیق کرنے کا ارادہ کیا، میں ایک خطاط اور خوشنویس آدمی ہوں، کتابیں لکھ کر فروخت کرتا ہوں تو اچھی قیمت سے فروخت ہو جاتی ہیں، میں نے امتحان کرنے کے لئے تورات کے تین نسخے کتابت کئے، جن میں بہت جگہ اپنی طرف سے کمی بیشی کر دی اور یہ نسخے لے کر میں کنیسہ میں پہنچا، یہودیوں نے بڑی رغبت سے ان کو خرید لیا، پھر اسی طرح انجیل کے تین نسخے کمی بیشی کے ساتھ کتابت کر کے نصاریٰ کے عبادت خانہ میں لے گیا وہاں بھی عیسائیوں نے بڑی قدر و منزلت کے ساتھ یہ نسخے مجھ سے خرید لئے، پھر یہی کام میں نے قرآن کے ساتھ کیا، اس کے بھی تین نسخے عمدہ کتابت کئے، جن میں اپنی طرف سے کمی بیشی کی تھی، ان کو لے کر جب میں فروخت کرنے کے لئے نکلا تو جس کے پاس لے گیا اس نے دیکھا کہ صحیح بھی ہے یا نہیں، جب کمی بیشی نظر آئی تو اس نے مجھے واپس کر دیا۔ اس واقعہ سے میں نے یہ سبق لیا کہ یہ کتاب محفوظ ہے، اور اللہ تعالیٰ ہی نے اس کی حفاظت کی ہوئی ہے، اس لئے مسلمان ہو گیا، قاضی یحییٰ بن اکثم اس واقعہ کے راوی کہتے ہیں کہ اتفاقاً اسی سال مجھے حج کی توفیق ہوئی، وہاں سفیان بن عیینہ سے ملاقات ہوئی، تو یہ قصہ ان کو سنایا انھوں نے فرمایا کہ بیشک ایسا ہی ہونا چاہیے، کیونکہ اس کی تصدیق قرآن میں موجود ہے۔ یحییٰ بن اکثم نے پوچھا قرآن کی کونسی آیت میں؟ تو فرمایا کہ فترآن عظیم نے جہاں تورات و انجیل کا ذکر کیا ہے، اس میں تو فرمایا **بِمَا اسْتَحْفِظُوا مِنْ كِتَابِ اللَّهِ**، یعنی یہود و نصاریٰ کو کتاب اللہ تورات و انجیل کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی ہے، یہی وجہ ہوئی کہ جب یہود و

نصاری نے فریضہ حفاظت ادا نہ کیا تو یہ کتابیں مسخ و محرف ہو کر ضائع ہو گئیں، بخلاف قرآن کریم کے کہ اس کے متعلق حق تعالیٰ نے فرمایا اِنَّا كَذَّٰلِكَ نَحْفَظُوكَ، یعنی ہم ہی اس کے محافظ ہیں، اس لئے اس کی حفاظت حق تعالیٰ نے خود فرمائی تو دشمنوں کی ہزاروں کوششوں کے باوجود اس کے ایک نقطہ اور ایک زیر و زبر میں فرق نہ آسکا، آج ہمدرد سالت کو بھی تقریباً چودہ سو برس ہو چکے ہیں تمام دینی اور اسلامی امور میں مسلمانوں کی کوتاہی اور غفلت کے باوجود قرآن کریم کے حفظ کرنے کا سلسلہ تمام دنیا کے مشرق و مغرب میں اسی طرح قائم ہے، ہر زمانہ میں لاکھوں بلکہ کروڑوں مسلمان جوان بوڑھے، لڑکے اور لڑکیاں ایسے موجود رہتے ہیں جن کے سینوں میں پورا قرآن محفوظ ہے، کسی بڑے سے بڑے عالم کی بھی مجال نہیں کہ ایک حرف غلط پڑھ دے، اسی وقت بہت سے بڑے اور بچے اس کی غلطی پکڑ لیں گے۔

حفاظت قرآن کے وعدے میں تمام اہل علم اس پر متفق ہیں کہ قرآن نہ صرف الفاظ قرآنی کا نام حفاظت حدیث بھی داخل ہو، نہ صرف معانی قرآن کا، بلکہ دونوں کے مجموعے کو قرآن کہا جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ معانی اور مضامین قرآنیہ تو دوسری کتابوں میں بھی موجود ہیں، اور اسلامی تصانیف میں تو عموماً مضامین قرآنیہ ہی ہوتے ہیں مگر ان کو قرآن نہیں کہا جاتا، کیونکہ الفاظ قرآن کے نہیں ہیں، اسی طرح اگر کوئی شخص قرآن کریم کے متفرق الفاظ اور جملے لے کر ایک مقالہ یا رسالہ لکھ دے تو اس کو بھی کوئی قرآن نہیں کہے گا اگرچہ اس میں ایک لفظ بھی قرآن سے باہر نہ ہو، اس سے معلوم ہوا کہ قرآن صرف اس مصحف ربانی کا نام ہے جس کے الفاظ اور معانی ساتھ ساتھ محفوظ ہیں۔

اسی سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہو گیا کہ کسی زبان اردو یا انگریزی وغیرہ میں جو صرف ترجمہ قرآن کا شائع کر کے لوگ اس کو اردو یا انگریزی قرآن کا نام دیتے ہیں یہ ہرگز جائز نہیں، کیونکہ وہ قرآن نہیں، اور جب یہ معلوم ہوا کہ قرآن صرف الفاظ قرآن کا نام نہیں بلکہ معانی بھی اس کا ایک جزو ہیں، تو حفاظت قرآن کی جو ذمہ داری اس آیت میں حق تعالیٰ نے خود اپنے ذمے قرار دی ہے اس میں جس طرح الفاظ قرآنی کی حفاظت کا وعدہ اور ذمہ داری ہے اسی طرح معانی اور مضامین قرآن کی حفاظت اور معنوی تحریف سے اس کے محفوظ رہنے کی بھی ذمہ داری اللہ ہی نے لے لی ہے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ معانی قرآن وہی ہیں جن کے تعلیم دینے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا گیا، جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا ہے لَتُبَيِّنَنَّ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ، یعنی آپ کو اس لئے بھیجا گیا ہے کہ آپ بتلا دیں لوگوں کو مفہوم اس کلام کا جو ان کے لئے نازل کیا گیا۔

اور یہی معنی اس آیت کے ہیں۔

يَعْلَمُ مَنْ كَتَبَ وَالْحِكْمَةَ، اور اسی لئے آپ نے فرمایا اِنَّمَا بُحِثْتُ مُعَلِّمًا، یعنی میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں، اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معانی قرآن کے بیان اور تعلیم کے لئے بھیجا گیا تو آپ نے امت کو جن اقوال و افعال کے ذریعہ تعلیم دی، انہی اقوال و افعال کا نام حدیث ہے۔

مطلقاً احادیث رسول کو جو لوگ کج دنیا کو اس مغالطہ میں ڈالنا چاہتے ہیں کہ احادیث کا ذخیرہ جو غیر محفوظ کہنے والا درحقیقت قرآن کو غیر محفوظ کہتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت بعد میں مدون کیا گیا ہے۔

اول تو ان کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں، کیونکہ حدیث کی حفاظت و کتابت خود عہد رسالت میں شروع ہو چکی تھی، بعد میں اس کی تکمیل ہوتی، اس کے علاوہ حدیث رسول درحقیقت تفسیر قرآن اور معانی قرآن ہیں، ان کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہے، پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ قرآن کے صرف الفاظ محفوظ رہ جائیں معانی (یعنی احادیث رسول) ضائع ہو جائیں؟

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي شِعْرِ الْأَوَّلِينَ ⑩ وَمَا يَأْتِيهِمْ

اور ہم بھیج چکے ہیں رسول تجھ سے پہلے اگلے فرقوں میں، اور نہیں آتا ان کے پاس

مِّنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ⑪ كَذَلِكَ نَسْلُكُهُ

کوئی رسول مگر کرتے رہے ہیں اس سے ہنسی، اسی طرح بٹھادیتے ہیں ہم

فِي قُلُوبِ الْمُجْرِمِينَ ⑫ لَا يُؤْمِنُونَ بِهِ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ

اس کو دل میں گنہگاروں کے، یقین نہ لائیں گے اس پر اور ہوتی آئی ہے رسم

الْأَوَّلِينَ ⑬ وَلَوْ فَتَنَّا عَلَيْهِم بِالْآفَاتِ مِنَ السَّمَاءِ فَظَلُّوا فِيهِ يَعِزُّونَ ⑭

پہلوں کی، اور اگر ہم کھول دیں ان پر دروازہ آسمان سے اور سایے دن اس میں چڑھتے رہیں

لَقَالُوا إِنَّمَا سَكِرَاتُ أَبْصَارِنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُورُونَ ⑮

تو بھی یہی کہیں گے کہ باندھ دیا ہر ہماری نگاہ کو، نہیں بلکہ ہم لوگوں پر جادو ہوا ہے

اللُّغَاتِ

الشَّيْعَ جمع شیعہ کی ہے جس کے معنی کسی شخص کے پیروکار و مددگار کے بھی آتے ہیں، اور ایسے فرقہ کو بھی شیعہ کہا جاتا ہے جو خاص عقائد و نظریات پر اتفاق رکھتے ہوں، مراد یہ ہو کہ ہم نے ہر فرقہ اور ہر گروہ کے اندر رسول بھیجتے ہیں اس میں لفظ الیٰ کے بجائے فی شیعہ الّا وّلین فرما کر اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ ہر گروہ کا رسول اسی گروہ کے لوگوں میں سے بھیجا گیا، تاکہ لوگوں کو اس پر اعتماد کرنا آسان ہو، اور یہ بھی اُن کی مباحث اور مزاج سے واقف ہو کر ان کی اصلاح کے لئے مناسب پروگرام بنا سکے۔

خلاصہ تفسیر

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان کی تکذیب سے غم نہ کیجئے، کیونکہ یہ معاملہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے، چنانچہ) ہم نے آپ سے پہلے بھی پیغمبروں کو اگلے لوگوں کے بہت سے گردہوں میں بھیجا تھا، (اور ان کی یہ حالت تھی کہ) کوئی رسول اُن کے پاس ایسا نہیں آیا جس کے ساتھ انھوں نے استہزاء نہ کیا (ہو کہ تکذیب کی بدترین قسم ہے، پس جس طرح ان لوگوں کے دلوں میں یہ استہزاء پیدا ہوا تھا) اسی طرح ہم یہ استہزاء ان مجرمین (یعنی کفار مکہ) کے قلوب میں ڈال دیتے ہیں (جس کی وجہ سے) یہ لوگ قرآن پر ایمان نہیں لاتے اور یہ دستور پہلوں سے ہی ہوتا آیا ہے (کہ انبیاء کی تکذیب کرتے رہے ہیں، پس آپ مغموم نہ ہوں) اور (ان کے عناد کی یہ کیفیت ہے کہ فرشتوں کا آسمان سے آنا تو درکنار اس سے بڑھ کر) اگر خود ان کو آسمان پر بھیجا جاسے (اس طرح سے کہ) ہم اُن کے لئے آسمان میں کوئی دروازہ کھول دیں پھر یہ دن کے وقت (جس میں نیند اور ادنگھ وغیرہ کا بھی شبہ نہ ہو) اس (دروازہ) میں (سے آسمان کو) چڑھ جاویں تب بھی یوں کہہ دیں کہ ہماری نظر بند کر دی گئی تھی (جس سے ہم اپنے کو آسمان پر چڑھتا ہوا دیکھ رہے ہیں اور واقع میں نہیں چڑھ رہے، اور نظر بندی میں کچھ اسی واقعہ کی تخصیص نہیں) بلکہ ہم لوگوں پر تو بالکل جادو کر رکھا ہے (اگر ہم کو اس سے بڑھ کر بھی کوئی معجزہ دکھلایا جاسے گا وہ بھی واقع میں معجزہ نہ ہوگا) :

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّظَرِ ۚ (۱۶)

اور ہم نے بنائے ہیں آسمان میں برج اور رونق دی اس کو دیکھنے والوں کی نظر میں۔

خلاصہ تفسیر

پہلی آیات میں منکرین کی ہٹ دھرمی اور عناد کا ذکر تھا، ان آیات میں جو آگے

آرہی ہیں، اللہ جلّ شانہ کے وجود، توحید، علم، قدرت کے واضح دلائل، آسمان اور زمین اور ان کے درمیان کی مخلوقات کے حالات و مشاہدات سے بیان کئے گئے ہیں جن میں ذرا بھی غور کیا جائے تو کسی عاقل کو انکار کی مجال نہیں رہتی ارشاد فرمایا:

اور بیشک ہم نے آسمان میں بڑے بڑے ستارے پیدا کئے اور دیکھنے والوں کیلئے آسمان کو (ستاروں سے) آراستہ کیا۔

معارف و مسائل

بُرُوجًا، بُرُج کی جمع ہے، جو بڑے محل اور قلعہ وغیرہ کے لئے بولا جاتا ہے، ائمہ تفسیر مجاہد، قتادہ، ابو صالح وغیرہ نے اس جگہ بُرُوج کی تفسیر بڑے ستاروں سے کی ہے، اور اس آیت میں جو ان بڑے ستاروں کا آسمان میں پیدا کرنا ارشاد ہے، یہاں آسمان سے مراد فضاء آسمانی ہے، جس کو آجکل کی اصطلاح میں خلا کہا جاتا ہے، اور لفظ سماء کا دونوں معنی میں اطلاق عام معروف ہے، جزم آسمان کو بھی سہا کہا جاتا ہے اور آسمان سے بہت نیچے جو فضاء آسمانی ہے اس کو بھی قرآن کریم میں جا بجا لفظ سماء سے تعبیر کیا گیا ہے، اور سیارات اور ستاروں کا آسمانوں کے اندر نہیں بلکہ فضاء آسمانی میں ہونا کمال تحقیق قرآن کریم کی آیات سے نیز قدیم و جدید علم فلکیات کی تحقیق سے انشاء اللہ سورۃ فرقان کی آیت لَا تَبَارَكَ إِلَّا الَّذِي جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَجَعَلَ فِيهَا سِرَاجًا وَقَمَرًا مُنِيرًا کی تفسیر میں آئے گی۔

وَحَفِظْنَا مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ رَجِيزٍ ۝۱۷ إِلَّا مَنْ اسْتَرَقَ السَّمْعَ

اور محفوظ رکھا ہم نے اس کو ہر شیطان مردود سے، مگر جو چوری سے سن بھاگا سو

فَاتَّبَعَهُ شَرَابٌ مُبِينٌ ۝۱۸

اس کے پیچھے پڑا انگارہ چمکتا ہوا۔

خلاصہ تفسیر

آسمان کو (ستاروں کے ذریعہ) ہر شیطان مردود سے محفوظ فرمادیا کہ وہاں تک ان کی رسائی نہیں ہونے پاتی، ہاں مگر کوئی بات (فرشتوں کی) چوری چھپے سن بھاگے تو اس کے پیچھے ایک روشن شعلہ ہوتا ہے، (اور اس کے اثر سے وہ شیطان ہلاک یا بدحواس ہو جاتا ہے)۔

معارف ومسائل

شہاب ثاقب | ان آیات سے ایک قویہ ثابت ہوا کہ شیاطین کی رسائی آسمانوں تک نہیں ہوتی ابلیس لعین کا تخلیق آدم علیہ السلام کے وقت آسمانوں میں ہونا اور آدم دھواڑا علیہما السلام کو دھوکہ میں مبتلا کرنا وغیرہ یہ سب آدم علیہ السلام کے زمین پر نزول سے پہلے کے واقعات ہیں، اس وقت تک جنات و شیاطین کا داخلہ آسمانوں میں ممنوع نہیں تھا، نزول آدم علیہ السلام اور اخراج شیطان کے بعد سے یہ داخلہ ممنوع ہوا، سورۃ جن کی آیات میں جو یہ مذکور ہے اَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ فَمَنْ يَسْمِعُ الْآنَ يَجِدْ لَهُ سِيبًا بِرَحْمَةٍ اِس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے تک شیاطین آسمانوں کی خبریں فرشتوں کی باہمی گفتگو سے سن لیا کرتے تھے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ شیاطین آسمانوں میں داخل ہو کر سنتے تھے، نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ کے الفاظ سے بھی یہ مفہوم ہوتا ہے کہ چور دہ کی طرح آسمانی فضا میں جہاں بادل ہوتے ہیں چھپ کر بیٹھ جاتے اور سن لیا کرتے تھے، ان الفاظ سے خود بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ قبل بعثت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی جنات و شیاطین کا داخلہ آسمانوں میں ممنوع ہی تھا، مگر فضا آسمانی تک پہنچ کر چوری سے کچھ سن لیا کرتے تھے، بعثت نبوی کے بعد حفاظت وحی کا یہ مزید سامان ہوا کہ شیاطین کو اس چوری سے بھی بذریعہ شہاب ثاقب روک دیا گیا۔

رہا یہ سوال کہ آسمانوں کے اندر فرشتوں کی گفتگو کو آسمانوں سے باہر شیاطین کس طرح سن سکتے تھے، سو یہ کوئی ناممکن چیز نہیں، بہت ممکن ہے کہ اجرام سماویہ سماعت اصوات سے مانع نہ ہوں، اور یہ بھی بعید نہیں کہ فرشتے کسی وقت آسمانوں سے نیچے اتر کر باہم ایسی گفتگو کرتے ہوں جس کو شیاطین سن بھاگتے تھے، صحیح بخاری میں حضرت صدیقہ عائشہ کی حدیث سے اسی کی تائید ہوتی ہے کہ فرشتے آسمان سے نیچے جہاں بادل ہوتے ہیں کبھی کسی وقت یہاں تک اترتے ہیں، اور آسمانی خبروں کا باہمی تذکرہ کرتے ہیں، شیاطین اسی فضا آسمانی میں چھپ کر یہ خبریں سنتے تھے جن کو شہاب ثاقب کے ذریعہ بند کیا گیا، اس کی پوری تفصیل انشاء اللہ سورۃ جن میں اَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ کی تفسیر میں آئے گی۔

دوسرا مسئلہ: ان آیات میں شہاب ثاقب کا ہے قرآن کریم کے ارشادات

سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہاب حفاظت وحی کے لئے شیاطین کو مارنے کے واسطے پیدا ہوتے ہیں ان کے ذریعہ شیاطین کو دفع کیا جاتا ہے تاکہ وہ فرشتوں کی باتیں نہ سن سکیں۔

اس میں ایک اشکال قومی یہ ہر کہ فضاء آسمانی میں شہابوں کا وجود کوئی نئی چیز نہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بھی ستارے ٹوٹنے کا مشاہدہ کیا جاتا تھا، اور بعد میں بھی یہ سلسلہ جاری ہے، تو یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ شہاب ثاقب شیاطین کو دفع کرنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں، جو کہ عہد نبوی کی خصوصیت ہے، اس سے تو بظاہر اسی بات کی تقویت ہوتی ہے جو فلاسفہ کا خیال ہے کہ شہاب ثاقب کی حقیقت اتنی ہی ہے کہ آفتاب کی تمازت سے جو بخارات زمین سے اُٹھتے ہیں ان میں کچھ آتش گیر مادے بھی ہوتے ہیں، اور ہر جا کہ جب اُن کو آفتاب یا کسی دوسری وجہ سے مزید گرمی پہنچتی ہے تو وہ سبک اُٹھتے ہیں، اور دیکھنے والوں کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ستارا ٹوٹا ہے، اسی لئے بخارات میں اس کو ستارا ٹوٹنے ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے، عربی زبان میں بھی اس کے لئے انقضاء کو کب کا لفظ استعمال ہوتا ہے جو اسی کا ہم معنی ہے۔

جواب یہ ہے کہ ان دونوں باتوں میں کوئی تعارض و اختلاف نہیں، زمین سے اُٹھنے والے بخارات مسلسل ہو جاتیں یہ بھی ممکن ہے، اور یہ بھی کوئی بعید نہیں کہ کسی ستارے یا سیارے سے کوئی شعلہ نکل کر گرے، اور ایسا ہونا عام عادات کے مطابق ہمیشہ سے جاری ہوا مگر بعثت نبوی سے پہلے ان شعلوں سے کوئی خاص کام نہیں لیا جاتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد ان شہابی شعلوں سے یہ کام لے لیا گیا، کہ شیاطین جو فرشتوں کی بائیں چوری سے سننا چاہتے ان کو اس شعلے سے مارا جائے۔

علامہ آلوسی نے رُوح المعانی میں یہی توجیہ بیان فرمائی ہے، اور نقل کیا ہے کہ امام احمد زہری سے کسی نے دریافت کیا کہ کیا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بھی ستارے ٹوٹتے تھے؟ فرمایا کہ ہاں؛ اس پر اس نے سورۃ جن کی مذکورہ آیت معارضہ کے لئے پیش کی تو فرمایا کہ شہاب ثاقب تو پہلے بھی تھے، مگر بعثت نبوی کے بعد جب شیاطین پر تشدد کیا گیا تو ان سے شیاطین کے دفع کرنے کا کام لے لیا گیا۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہما آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد موجود ہے کہ آپ صحابہ کے ایک مجمع میں تشریف فرما تھے، کہ ستارہ ٹوٹا، آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ تم زمانہ جاہلیت میں یعنی اسلام سے پہلے اس ستارہ ٹوٹنے کو کیا سمجھا کرتے تھے؟ لوگوں نے کہا کہ ہم یہ سمجھا کرتے تھے کہ دنیا میں کوئی بڑا حادثہ پیدا ہونے والا ہے، یا کوئی بڑا آدمی مرے گا، یا پیدا ہوگا، آپ نے فرمایا کہ یہ غو خیال ہے، اس کا کسی کے مرنے جینے سے کوئی تعلق نہیں، یہ شعلے تو شیاطین کو دفع کرنے کے لئے پھینکے جاتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ شہاب ثاقب کے متعلق جو کچھ فلاسفہ نے کہا ہے وہ بھی قرآن

کے منافی نہیں، اور یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ یہ شعلے براہ راست بعض ستاروں سے ٹوٹ کر گرائے جاتے ہوں، مقصد قرآن دونوں صورتوں میں ثابت اور واضح ہے۔

وَالْأَرْضُ مَدَدٌ دُنَاهَا وَالْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ

اور زمین کو ہم نے پھیلایا اور رکھ دیے اس پر بوجھ اور اُگائی اس میں

کُلِّ شَيْءٍ مَّوْرُودٍ ۝۱۹ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَكُمْ

ہر چیز اندازے سے، اور بنادیے تمھارے واسطے اس میں معیشت کے اسباب اور وہ چیزیں

لَهُ بِرِزْقَيْنَ ۝۲۰ وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَ نَاخِرَاتِ غُوبٍ وَمَا

جن کو تم روزی نہیں دیتے، اور ہر چیز کے ہمارے پاس خزانے ہیں، اور

نُنَزِّلُ لَهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَعْلُومٍ ۝۲۱ وَأَرْسَلْنَا الرِّيحَ لَوَاقِثَ

اتارتے ہیں ہم اندازہ معین پر، اور چلائیں ہم نے ہوائیں رس بھری،

فَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَسْقَيْنَاكُمُوهُ وَمَا أَنْتُمْ لَهُ

پھر اتارا ہم نے آسمان سے پانی پھر تم کو وہ پلایا اور تمھارے پاس نہیں

بِخَزَائِنٍ ۝۲۲ وَإِنَّا لَنَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَنَحْنُ الْوَارِثُونَ ۝۲۳

اس کا خزانہ، اور ہم ہی ہیں جلانے والے اور مارنے والے اور ہم ہی ہیں پیچھے رہنے والے،

وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِينَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَأْخِرِينَ ۝۲۴

اور ہم نے جان رکھا ہر آگے بڑھنے والوں کو تم میں سے اور جان رکھا ہر پیچھے رہنے والوں کو

وَإِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ۝۲۵

اور تیرا رب وہی اکٹھا کر لائے گا ان کو بیشک وہی ہے حکمتوں والا خبردار

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے زمین کو پھیلایا اور اس زمین میں بھاری بھاری پہاڑ ڈال دیے اور اس میں قہریم

کی ضرورت کی پیداوار، ایک معین مفتدار سے اُگائی، اور ہم نے تمھارے واسطے اس (زمین) میں

حاش کے سامان بنائے (جس میں ضروریات زندگی کی تمام چیزیں داخل ہیں جو کھانے پینے، پہننے

اور رہنے پہنے سے متعلق ہیں اور یہ سامانِ معاش اور ضروریاتِ زندگی صرف تم کو ہی نہیں دیا، بلکہ ان کو بھی دیا جن کو تم روزی نہیں دیتے (یعنی وہ تمام مخلوقات جو ظاہر میں بھی تمہارے ہاتھ سے خورد و نوش اور زندگی گزارنے کا سامان نہیں پاتے، ظاہر اس لئے کہا کہ گھر کے پالتو بکری، بکری، گائے، بیل، گھوڑا، گدھا وغیرہ بھی اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے اپنی روزی اور ضروریاتِ معاش حقیقۃً اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے پاتے ہیں، مگر ظاہری طور پر ان کے خورد و نوش اور رہائش کا انتظام انسانوں کے ہاتھوں ہوتا ہے، ان کے علاوہ تمام دنیا کے بری اور بھری جانور، پرندے اور درندے ایسے ہیں جن کے سامانِ معاش میں کسی انسانی ارادے اور عمل کا کوئی دخل اور شائبہ بھی نہیں پایا جاتا، اور یہ جانور اتنے بے حد بے شمار ہیں کہ انسان نہ ان سب کو پہچان سکتا ہے نہ شمار کر سکتا ہے) اور جتنی چیزیں (ضروریاتِ زندگی سے متعلق) ہیں ہمارے پاس سب کے خزانے کے خزانے (بھرے پڑے) ہیں اور ہم (اپنی خاص حکمت کے مطابق) اس (چیز کو ایک معین مقدار سے اتارتے رہتے ہیں اور ہم ہی ہواؤں کو بھیجتے رہتے ہیں جو بادل کو پانی سے بھر دیتی ہیں پھر ہم ہی آسمان سے پانی برساتے ہیں، پھر وہ پانی تم کو پینے کو دیتے ہیں اور تم اس کو ذخیرہ کر کے رکھنے والے نہ تھے، رکھ اگلی بارش تک اس ذخیرہ کو استعمال کرتے رہتے) اور ہم ہی ہیں کہ زندہ کرتے ہیں اور مارتے ہیں اور سب کے مرنے کے بعد ہم ہی باقی رہ جاؤں گے، اور ہم ہی جانتے ہیں تم میں سے آگے بڑھ جانے والوں کو اور تم جانتے ہیں پیچھے رہنے والوں کو، اور بیشک آپ کا رب ہی ان سب کو (قیامت میں) محشر فرمادے گا (یہ اس لئے فرمایا کہ اوپر توحید ثابت ہوئی ہے، اس میں منکر توحید کی سزا کی طرف اشارہ کر دیا) بیشک وہ حکمت والا ہے (ہر شخص کو اس کے مناسب بدلہ دینا اور) علم والا ہے (سب کے اعمال کی اس کو پوری خبر ہے) :

معارف و مسائل

حکمتِ الہیہ، ضروریاتِ معاش میں | مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُونٍ کا ایک مفہوم تو وہی ہے جو ترجمہ میں
تناسبِ موزونیت | لیا گیا ہے کہ بتقاضائے حکمت ہر اگنے والی چیز کی ایک مقدار

محسوس آگائی، جس سے کم ہو جاتی تو زندگی میں دشواریاں پیدا ہو جاتیں، اور زیادہ ہو جاتی تو بھی مشکلات پیدا کرتی، انسانی ضرورت کے گندم اور چاول وغیرہ اور بہتر سے بہتر عمدہ کھل اگر اتنے زیادہ پیدا ہو جاتیں جو انسانوں اور جانوروں کے کھانے پینے کے بعد بھی بہت بچ رہیں تو ظاہر ہے کہ وہ سڑیں گے، ان کا رکھنا بھی مشکل ہوگا، اور پھینکنے کے لئے جگہ بھی نہ رہے گی اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں تو یہ بھی تھا کہ جن دانوں اور پھلوں پر

انسان کی زندگی موقوف ہے، ان کو اتنا زیادہ پیدا کر دیتے کہ ہر شخص کو ہر جگہ مفت مل جایا کرتے، اور بے فکری سے استعمال کرنے کے بعد بھی ان کے بڑے ذخیرے پڑے رہتے، لیکن یہ انسان کے لئے عذاب ہو جاتا، اس لئے ایک خاص مقدار میں نازل کئے گئے، کہ ان کی قدر و قیمت بھی باقی رہے اور بیکار بھی نہ بچیں۔

اور میں کُلّ شئی مَوْزُون کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمام آگنے والی چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک خاص تناسب اور وزونیت کے ساتھ پیدا کیا ہے، جس سے اس میں حسن اور دل کشی پیدا ہوتی ہے، مختلف درختوں کے تنے، شاخیں، پتے، پھول اور پھل، مختلف سائز اور مختلف شکل، مختلف رنگ اور ذائقے کے پیدا کئے گئے، جس کے تناسب اور حسین منظر سے تو انسان فائدہ اٹھاتا ہے، مگر ان کی تفصیلی حکمتوں کا ادراک کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔

تمام مخلوق کے لئے آبِ رسانی اور آبپاشی کا عجیب و غریب نظام الہی کے اس حکیمانہ نظام کی طرف اشارہ ہے جس کے ذریعہ روئے زمین پر بسنے والے تمام انسان اور جانور، چرندوں، پرندوں، درندوں کے لئے ضرورت کے مطابق

آبِ رسانی کا ایسا نظام محکم قائم کیا گیا ہے کہ ہر شخص کو ہر جگہ ہر حال میں اپنی ضرورت کے مطابق پینے، ہانے، دھونے اور کھیتوں، درختوں کو سیراب کرنے کے لئے پانی بلا کسی قیمت کے مل جاتا ہے، اور جو کچھ کسی کو کنواں بنانے یا پائپ لگانے پر خرچ کرنا پڑتا ہے وہ اپنی سہولتیں حاصل کرنے کی قیمت ہے، پانی کے ایک قطرہ کی قیمت بھی کوئی ادا نہیں کر سکتا، نہ کسی سے مانگی جاتی ہے، اس آیت میں پہلے تو اس کا ذکر کیا گیا کہ کس طرح قدرتِ الہیہ نے سمندر کے پانی کو پوری زمین پر پہنچانے کا عجیب و غریب نظام بنایا ہے، کہ سمندر میں بخارات پیدا فرماتے جن سے بارش کا مواد (مان سون) پیدا ہوا اوپر سے ہوائیں چلائیں، جو اس کو بادل کی شکل میں تبدیل کر کے پانی سے بھرے ہوئے پہاڑوں جیسے جہاز بنادیں، پھر پانی سے لبریز ان ہوائی جہازوں کو دنیا کے ہر گوشہ میں جہاں جہاں پہونچانا ہے پہونچا دیں، پھر فرمانِ الہی کے تابع جس زمین پر جتنا پانی ڈالنے کا حکم ہے، اس کے مطابق یہ خود کار ہوائی جہاز وہاں پانی برسا دیں۔

اس طرح یہ سمندر کا پانی زمین کے ہر گوشے میں بسنے والے انسانوں اور جانوروں کو گھر بیٹھے مل جاتے، اسی نظام میں ایک عجیب و غریب تبدیلی پانی کے ذائقے اور دوسری کیفیات میں پیدا کر دی جاتی ہے، کیونکہ سمندر کے پانی کو اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ سے انتہائی کھارا اور ایسا نمکین بنایا ہے کہ ہزاروں ٹن نمک اس سے نکالا اور استعمال کیا جاتا ہے، حکمت اس میں یہ ہے کہ یہ عظیم الشان پانی کا کرہ جس میں کروڑوں قسم کے جانور رہتے

اور اسی میں مرتے اور سڑتے ہیں، اور ساری زمین کا گندہ پانی بالآخر اسی میں جا کر پڑتا ہے، اگر یہ پانی بیٹھا ہوتا تو ایک دن میں سڑ جاتا، اور اس کی بدبو اتنی شدید ہوتی کہ خشکی میں رہنے والوں کی تندرستی اور زندگی بھی مشکل ہو جاتی، اس لئے قدرت نے اس کو ایسا تیزابی کھار بنا دیا کہ دنیا بھر کی غلاظتیں اس میں پہونچ کر جہنم ہو جاتی ہیں، غرض اس حکمت کی بناء پر سمندر کا پانی کھار بلکہ تلخ بنایا گیا، جو نہ پیا جاسکتا ہے اور نہ اس سے پیاس بجھ سکتی ہے، نظام قدرت نے جو پانی کے ہوائی جہاز بادلوں کی شکل میں تیار کئے ان کو صرف سمندری پانی کا خزانہ ہی نہیں بنایا بلکہ مان سون اٹھنے سے لے کر زمین پر برسنے تک اس میں ایسے انقلابات بغیر کسی ظاہری مشین کے پیدا کر دیئے کہ اس پانی کا نمک علیحدہ ہو کر میٹھا پانی بن گیا، سورہٴ مرسلات میں اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے:-

وَأَسْقَيْنَكُم مَّاءً قَسًا ۖ اِنَّآ اِسْمٰلُہٗ فَرَا تَہٗ مَعْنٰی ہِیْ اِیْسَا مِیْٹھا پانی جس سے پیاس بجھے، معنی یہ ہیں کہ ہم نے بادلوں کی قدرتی مشینوں سے گزار کر سمندر کے کھاری اور تلخ پانی کو تھارے پینے کے لئے شیریں بنا دیا۔

سورہ واقعہ میں اسی مضمون کو ارشاد فرمایا ہے: اَفَرَأٰی یَسْمَہٗ الْمَآءِ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَ ؕ اَنۡ اَنۡزَلْنٰہُ مِنۡ السَّمَآءِ اَمۡ نَحۡمِلُہٗ اِنۡزِلَہٗ لَوۡ نَشَآءُ جَعَلْنٰہُ اُجۡلًا ۚ فَلَا تَشۡکُرُوۡنَ ؕ مِّمۡلَا دِیکَہٗ تَوۡ پانی کو جو تم پیتے ہو کیا تم نے اتارا اس کو بادل سے یا ہم ہیں اُتارنے والے، اگر ہم چاہیں کر دیں اس کو کھارا، پھر کیوں نہیں احسان مانتے ؟

یہاں تک تو قدرت الہیہ کی یہ کرشمہ سازی دیکھی کہ سمندر کے پانی کو میٹھے پانی میں تبدیل کر کے پورے روئے زمین پر بادلوں کے ذریعے کس جن نظام کیسا پہونچایا کہ ہر خطہ کے نہ صرف انسانوں کو بلکہ اُن جانوروں کو بھی جو انسانوں کی دریافت سے باہر ہیں، گھر بیٹھے پانی پہونچا دیا، اور بالکل مفت بلکہ جبری طور پر پہونچا۔

لیکن انسان اور جانوروں کا مسئلہ صرف اتنی بات سے حل نہیں ہو جاتا کیونکہ پانی انکی ایسی ضرورت ہے جس کی حتمی حاج ہر روز بلکہ ہر آن ہے، اس لئے ان کی ضرورت روزمرہ کو پورا کرنے کا ایک طریقہ تو یہ تھا کہ ہر جگہ سال کے بارہ مہینے ہر روز بارش ہو ا کرتی، لیکن اس صورت میں اُن کی پانی کی ضرورت تو رفع ہو جاتی، مگر دوسری معاشی ضروریات میں کتنا خلل آتا، اس کا اندازہ کسی اہل تجربہ کے لئے مشکل نہیں، سال بھر کے ہر دن کی بارش تندرستی پر کیا اثر ڈالتی اور کاروبار اور نقل و حرکت میں کیا تعطل پیدا کرتی۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ سال بھر کے خاص خاص مہینوں میں اتنی بارش ہو جائے کہ ہر پانی باقی مہینوں کے لئے کافی ہو جائے، مگر اس کے لئے ضرورت ہوتی کہ ہر شخص کا ایک کوٹہ

مقرر کر کے اس کے سپرد کیا جائے وہ اپنے کوٹہ اور حصہ کا پانی خود اپنی حفاظت میں رکھے۔ اندازہ لگائیے کہ اگر ایسا کیا جاتا تو ہر انسان اتنی ٹنکیاں یا برتن وغیرہ کہاں سے لاتا جن میں تین یا چھ مہینہ کی ضرورت کا پانی جمع کر کے رکھ لے، اور اگر وہ کسی طرح ایسا کر بھی لیتا تو ظاہر ہے کہ چند روز کے بعد یہ پانی سٹرجاتا، اور پینے بلکہ استعمال کرنے کے بھی قابل نہ رہتا، اس کو قدرت الہیہ نے اس کے باقی رکھنے اور بوقت ضرورت ہر جگہ مل جانے کا ایک دوسرا عجیب و غریب نظام بنایا، کہ جو پانی برسا یا جاتا ہے اس کا کچھ حصہ تو فوری طور پر درختوں، کھیتوں اور انسانوں اور جانوروں کو سیراب کرنے میں کام آہی جاتا ہے، کچھ کھلے تالابوں، جھیلوں میں محفوظ ہو جاتا ہے اور اس کے بہت بڑے حصہ کو برف کی شکل میں بجز منجمد بنا کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر لا دیا جاتا ہے، جہاں تک نہ گرد و غبار کی رسائی ہے نہ کسی غلاظت کی، پھر اگر وہ پانی سیال صورت میں رہتا تو ہوا کے ذریعے کچھ گرد و غبار یا دوسری خراب چیزیں اس میں پہنچ جانے کا خطرہ رہتا، پرندے جانوروں کے اس میں گرنے مرنے کا اندیشہ رہتا، جس سے وہ پانی خراب ہو جاتا، مگر قدرت نے اس پانی کے عظیم خزانے کو بجز منجمد (برف) بنا کر پہاڑوں پر لا دیا جہاں تک تھوڑا تھوڑا اس کردہ پہاڑوں کی رگوں میں پیوست ہو جاتا ہے، اور پھر چشموں کی صورت میں ہر جگہ پہنچ جاتا ہے، اور جہاں یہ چشمے بھی نہیں ہیں تو وہاں زمین کی ہتھ میں یہ پانی انسانی رگوں کی طرح زمین کے ہر خطہ پر بہتا ہوا درکنواں کھودنے سے برآمد ہونے لگتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آب رسائی کا یہ نظام الہی ہزاروں نعمتیں اپنے اندر لئے ہوئے ہے، اول تو پانی کو پیدا کرنا ایک بڑی نعمت ہے، پھر بادلوں کے ذریعہ اس کو زمین کے ہر خطہ پر پہنچانا دوسری نعمت ہے، پھر اس کو انسان کے پینے کے قابل بنانا تیسری نعمت ہے، پھر انسان کو اس کے پینے کا موقع دینا چوتھی نعمت ہے، پھر اس پانی کو ضرورت کے مطابق جمع اور محفوظ رکھنے کا نظام محکم یا پنویں نعمت ہے، پھر انسان کو اس سے پینے اور سیراب ہونے کا موقع دینا چھٹی نعمت ہے، کیونکہ پانی کے موجود ہوتے ہوئے بھی ایسی آفتیں ہو سکتی ہیں کہ ان کی وجہ سے آدمی پینے پر قادر نہ ہو، قرآن کریم کی آیت فَأَسْقَيْنَكُمُوهُمَا وَمَا نَسْتَمْتَلُهُمْ بِخِزْيَةٍ میں اپنی نعماء الہیہ کی طرف اشارہ اور تنبیہ کی گئی ہے، فَسُبَّارُكَ اللَّهُ الْخَالِقِينَ۔

نیک کاموں میں آگے بڑھنے اور وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِينَ مِنَّكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَأْخِرِينَ میں پیچھے رہنے میں درجات کا فرق مستقدین اور مستأخرین کی چند تفسیریں ائمہ صحابہ و تابعین سے

مختلف منقول ہیں:- مستقدین وہ لوگ جو اب تک پیدا ہو چکے ہیں اور مستأخرین وہ جو ابھی پیدا نہیں ہوئے (قتادہ و عکرمہ) مستقدین سے مراد اموات ہیں اور مستأخرین سے وہ لوگ جو اب

زندہ ہیں (ابن عباس و ضحاک) مستقدمین سے مراد امت محمدیہ سے پہلے حضرات ہیں اور مستأخرین سے امت محمدیہ (مجاہد) مستقدمین سے مراد اہل طاعت و خیر ہیں اور مستأخرین سے اہل معصیت و غفلت (حسن و قتادہ) مستقدمین وہ لوگ ہیں جو نماز کی صفوں یا جہاد کی صفوں اور دوسرے نیک کاموں میں آگے رہنے والے ہیں اور مستأخرین وہ جو ان چیزوں میں پچھلی صفوں میں رہنے والے اور دیر کرنے والے ہیں، حسن بصری، سعید بن مسیب، قرطبی، شعبی وغیرہ ائمہ تفسیر کی یہی تفسیر ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ درحقیقت ان اقوال میں کوئی خاص اختلاف نہیں، سب جمع ہو سکتے ہیں، کیونکہ اللہ جل شانہ کا علم محیط ان تمام اقسام کے مستقدمین و مستأخرین پر حاوی ہے۔

قرطبی نے اپنی تفسیر میں فرمایا کہ اسی آیت سے نماز میں صفِ اول اور شروع وقت میں نماز ادا کرنے کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر لوگوں کو معلوم ہو جانا کہ اذان کہنے اور نماز کی صفِ اول میں کھڑے ہونے کی کتنی بڑی فضیلت ہو تو تمام آدمی اس کی کوشش میں لگ جاتے کہ پہلی ہی صف میں کھڑے ہوں اور سب کے لئے جگہ نہ ہوتی تو قرعہ اندازی کرنا پڑتی۔

قرطبی نے اس کے ساتھ حضرت کعب کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ اس امت میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں کہ جب وہ سجدے میں جاتے ہیں تو جتنے آدمی اس کے پیچھے ہیں سب کی مغفرت ہو جاتی ہے، اسی لئے حضرت کعب آخری صف میں رہنا پسند کرتے تھے کہ شاید اگلی صفوں میں اللہ کا کوئی بند اس شان کا ہو تو اس کی برکت سے میری مغفرت ہو جائے، انتہی کلام۔

اور ظاہر یہ ہے کہ اصل فضیلت تو صفِ اول ہی میں ہے، جیسا کہ آیت قرآن اور حدیث کی تصریحات سے ثابت ہوا، لیکن جس شخص کو کسی وجہ سے صفِ اول میں جگہ نہ ملے تو اس کو بھی ایک گونہ فضیلت یہ حاصل رہے گی کہ شاید اگلی صفوں کے کسی تیک بندے کی بدولت اس کی بھی مغفرت ہو جائے، اور آیت مذکورہ میں جیسے نماز کی صفِ اول کی فضیلت ثابت ہوئی اسی طرح جہاد کی صفِ اول کی انصیت بھی ثابت ہو گئی۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَإٍ مَسْنُونٍ ﴿۲۶﴾

اور بنایا ہم نے آدمی کو کھنکھاتے سے ہوتے گارے سے ،

وَالْجَبَّارِ فَخَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَارِ السُّمُورِ ﴿۲۷﴾ وَإِذْ قَالَ

اور جب کو بنایا ہم نے اس سے پہلے تو کی آگ سے ، اور جب کہا

رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِیُّ خَالِیٍّۢ بَشَرًاۙ اَمِّنْ صَلٰۤیٰتٍۭ مِّنْ حَمَیْمٍۭ مُّسْتَوِیْنَ ۝۲۸

تیرے رب نے فرشتوں کو میں بناؤں گا ایک بشر کنکھناتے سے ہوتے گارے سے ،

فَاِذَا سُوِّیْتَهُۥ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیۡ فَقَعُوْا۟ اِلَیْهِ سٰجِدِیْنَ ۝۲۹

پھر جب ٹھیک کر دوں اس کو اور پھونک دوں اس میں اپنی جان سے تو گر پڑو اس کے آگے سجدہ کرتے ہوؤ

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اٰجَمُوْنَ ۝۳۰ اِلَّا اِبْلِیْسَۙ اَبٰی اَنْ

تب سجدہ کیا ان فرشتوں نے سب نے میں کر ، مگر ابلیس نے نہ مانا کہ ساتھ

یَكُوْنُ مَعَ السَّٰجِدِیْنَ ۝۳۱ قَالَ یٰۤاِبْلِیْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنُ مَعَ

ہو سجدہ کرنے والوں کے ، فرمایا ، اے ابلیس کیا ہوا تجھ کو کہ ساتھ نہ ہوا

السَّٰجِدِیْنَ ۝۳۲ قَالَ لَمَّا كُنْتُ لَاۤ اَسْجُدُ لِبَشَرٍۭ خَلَقْتَهُۥ مِنْ صَلٰۤیٰلٍۭ

سجدہ کرنے والوں کے ، بولا میں وہ نہیں کہ سجدہ کروں ایک بشر کو جس کو تو نے بنایا کنکھناتے

مِّنْ حَمَیْمٍۭ مُّسْتَوِیْنَ ۝۳۳ قَالَ فَاخْرِجْ مِنْهَاۙ فَاِنَّكَ رَٰجِعٌۭ ۝۳۴ وَاِنَّ

سے ہوتے گارے سے ، فرمایا تو تو نکل یہاں سے تجھ پر مار ہے ، اور تجھ پر

عَلٰیكَ اللَّعْنَةُۙ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ ۝۳۵ قَالَ رَبِّۙ اَنْظِرْنِیۡ اِلٰی

پھٹکار ہے اُس دن تک کہ انصاف ہو ، بولا اے رب تو مجھ کو ڈھیل دے اُس دن تک کہ

یَوْمٍۭ یَّبْعَثُوْنَ ۝۳۶ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ ۝۳۷ اِلٰی یَوْمِ الْوَقْتِ

مُردے زندہ ہوں ، فرمایا تو تجھ کو ڈھیل دی ، اسی مقرر وقت کے دن

الْمَعْلُوْمِ ۝۳۸ قَالَ رَبِّۙ بِمَاۤ اَغْوٰیْتَنِیۡ لَاۤ اُنْرِیْتَنِیۡۤ لَهْمٌۭ فِی الْاَرْضِۙ

تک ، بولا اے رب جیسا تو نے مجھ کو راہ سے کھو دیا میں بھی ان سب کو بہاریں دکھلاؤں گا زمین میں

وَلَاۤ اُغْوِیْتُهُمْۙ اَجْمَعِیْنَ ۝۳۹ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِیْنَ ۝۴۰

اور راہ سے کھو دوں گا ان سب کو ، مگر جو تیرے چنے ہوئے بندے ہیں ،

قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلٰی مُّسْتَقِیْمٍۭ ۝۴۱ اِنَّ عِبَادِیۡ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ

فرمایا یہ راہ ہے مجھ تک سیدھی ، جو میرے بندے ہیں تیرا اُن پر کچھ

سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۳۲﴾ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدٌ لَّهُمْ

زور نہیں مگر جو تیری راہ چلا بہکے آدمیوں میں ، اور دوزخ پر وعدہ ہے ان

اَجْمَعِيْنَ ﴿۳۳﴾ لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ لِكُلِّ بَابٍ مِنْهُمْ

سب کا ، اس کے سات دروازے ہیں ، ہر دروازہ کے واسطے ان میں سے

جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ﴿۳۴﴾

ایک فرقہ ہے بانٹا ہوا

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے انسان کو (یعنی اس نوع کی اصل اول آدم علیہ السلام کو) بجتی ہوئی مٹی سے جو کہ سڑے ہوئے گارے کی بنی تھی پیدا کیا (یعنی اول گارے کو خوب خمیر کیا کہ اس میں بڑا آنے لگی پھر وہ خشک ہو گیا کہ وہ خشک ہونے سے کھن کھن بولنے لگا جیسا مٹی کے برتن چٹلی مارنے سے بجا کرتے ہیں پھر اس خشک گارے سے آدم کا پتلا بنایا جو بڑی قدرت کی علامت ہے) اور جن کو (یعنی اس نوع کی اصل ابوالجان کو) اس کے قبل (یعنی آدم علیہ السلام کے قبل) آگ سے کہ وہ (غایت لطافت کی وجہ سے) ایک گرم ہوا تھی پیدا کر چکے تھے (مطاب یہ کہ چونکہ اس آگ میں اجزائے دخانیہ نہ تھے اس لئے وہ مثل ہوا کے نظر نہ آتی تھی، کیونکہ آگ کا نظر آنا اجزائے کثیفہ کے اختلاط سے ہوتا ہے، اس کو دوسری آیت میں اس طرح فرمایا ہے وَخَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نَّارٍ حَمِئَةٍ اور وہ وقت یاد کرنے کے قابل ہے جب آپ کے رب نے ملائکہ سے (ارشاد) فرمایا کہ میں ایک بشر کو (یعنی اس کے پتلے کو) بجتی ہوئی مٹی سے جو کہ سڑے ہوئے گارے کی بنی ہوگی پیدا کرنے والا ہوں، سو میں جب اس کو (یعنی اس کے اعضاء جسمانیہ کو) پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی (طرف سے) جان ڈال دوں تو تم سب اس کے روبرو سجدہ میں گر پڑنا سو (جب اللہ تعالیٰ نے اس کو بنا لیا تو) سارے کے سارے فرشتوں نے (آدم علیہ السلام کو) سجدہ کیا مگر ابلیس نے کہ اس نے اس بات کو قبول نہ کیا کہ سجدہ کرنے والوں کے ساتھ شامل ہو (یعنی سجدہ نہ کیا) اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے ابلیس تجھ کو کون امر باعث ہوا کہ تو سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا، کہنے لگا کہ میں ایسا نہیں کہ بشر کو سجدہ کروں جس کو آپ نے بجتی ہوئی مٹی سے جو کہ سڑے ہوئے گارے کی بنی ہے پیدا کیا ہے (یعنی ایسے حقیر و ذلیل مادہ سے بنایا گیا ہے کیونکہ میں نورانی مادہ آتش

سے پیدا ہوا ہوں تو نورانی ہو کر ظلمانی کو کیسے سجدہ کر دوں، ارشاد ہوا تو (اچھا پھر) آسمان سے نکل، کیونکہ بیشک تو (اس حرکت سے) مردود ہو گیا اور بیشک تجھ پر (میری) لعنت قیامت تک رہے گی جیسا دوسری آیت میں ہے عَلَیْكَ لَعْنَتِی، یعنی قیامت تک تو میری رحمت سے بعید رہے گا، توبہ کی توفیق نہ ہوگی اور مقبول و مرحوم نہ ہوگا، اور ظاہر ہے کہ قیامت تک جو محل رحمت نہ ہو تو پھر قیامت میں تو مرحوم ہونے کا احتمال ہی نہیں، پس جس وقت تک احتمال تھا اس کی نفی کر دی، اور اس سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اس میں تو مہلت مانگنے سے پہلے ہی مہلت دینے کا وعدہ ہو گیا، بات یہ ہے کہ مقصود قیامت تک عمرو دینا نہیں ہو کہ یہ شبہ ہو، بلکہ مطلب یہ ہے کہ حیاتِ دنیویہ میں تو ملعون ہے گو وہ قیامت تک ممتد کیوں نہ ہو، کہنے لگا کہ اگر مجھ کو آدم کی وجہ سے مردود کیا ہے، تو پھر مجھ کو (مرنے سے) مہلت دیجئے قیامت کے دن تک (تاکہ ان سے اور ان کی اولاد سے خوب بدلہ لوں) ارشاد ہوا جب تو مہلت مانگتا ہے، تو (جا) تجھ کو معینِ وقت کی تاریخ تک مہلت دی گئی، کہنے لگا اے میرے رب بسبب اس کے کہ آپ نے مجھ کو (بحکم تکوین) گمراہ کیا ہے میں قسم کھاتا ہوں کہ میں دنیا میں ان کی (یعنی آدم اور اولادِ آدم کی) نظر میں معاصی کو مرغوب کر کے دکھلاؤں گا، اور ان سب کو گمراہ کروں گا بجز آپ کے اُن بندوں کے جو اُن میں منتخب کئے گئے ہیں (یعنی آپ نے ان کو میرے اثر سے محفوظ رکھا ہے) ارشاد ہوا کہ (ہاں) یہ (منتخب ہو جانا جس کا طریقہ اعمالِ صالحہ و اطاعتِ کاملہ ہے) ایک سیدھا راستہ ہے جو مجھ تک پہنچتا ہے (یعنی اس پر چل کر سہارا مقرب ہو جاتا ہے) واقعی میرے ان (مذکور) بندوں پر تیرا ذرا بھی پس چلے گا ہاں مگر جو گمراہ لوگوں میں تیری راہ پر چلنے لگے (تو چلے) اور (جو لوگ تیری راہ پر چلیں گے) ان سب کا ٹھکانا جہنم ہے، جس کے سات دروازے ہیں ہر دروازہ (میں سے جانے) کیلئے ان لوگوں کے الگ الگ حصے ہیں (کہ کوئی کسی دروازے سے جائے گا کوئی کسی دروازے سے)

معارف و مسائل

بدنِ انسانی میں نفخِ روح اور اس کو مسجود ملائکہ بنانے کی مختصر تحقیق	روح کوئی جسم ہر یا جو ہر مجرد، اس میں علماء و حکماء کا اختلاف قدیم زمانے سے چلا آتا ہے، شیخ عبدالرؤف منادی نے فرمایا کہ اس میں حکماء کے اقوال ایک ہزار تک پہنچے ہیں، مگر سب قیاسات اور
--	--

تجنیس ہی ہیں، کسی کو یقینی نہیں کہا جاسکتا، امام غزالی، امام رازی اور عموماتِ صوفیہ اور فلاسفہ کا قول یہ ہے کہ وہ جسم نہیں بلکہ جو ہر مجرد ہے، امام رازی نے اس کے بارے دلائل پیش کئے ہیں۔ مگر جمہورِ علماء امت روح کو ایک جسم لطیف قرار دیتے ہیں، نفخ کے معنی پھونک مارنے

کے ہیں، اگر بقول یہو رُوح کو جسم لطیف قرار دیا جائے تو اس کو پھونکنا ظاہر ہے، اور جو ہر خستہ و مان لیا جائے تو پھونکنے کے معنی اس کا بدن سے تعلق پیدا کر دینا ہوگا (بیان القرآن)۔
روح اور نفس کے متعلق یہاں اس طویل الذیل بحث کو چھوڑ کر ایک خاص تحقیق پر اکتفا کیا جاتا ہے۔
حضرت قاضی ثنار اللہ کی تحقیق جو تفسیر منہری میں قاضی ثنار اللہ پانی پتیؒ نے تحریر فرمائی ہے۔

حضرت قاضی صاحبؒ فرماتے ہیں کہ رُوح کی دو قسم ہیں، علوی اور سفلی، روح علوی مادہ سے مجرد اللہ تعالیٰ کی ایک مخلوق ہے جس کی حقیقت کا ادراک مشکل ہے، اہل کشف کو اس کا اصل مقام عرش کے اوپر دکھائی دیتا ہے، کیونکہ وہ عرش سے زیادہ لطیف ہے، اور رُوح علوی بنظر کشفی اوپر نیچے پانچ درجات میں محسوس کی جاتی ہے، وہ پانچ یہ ہیں، قلب، روح، بستر، خفی، اخفی، اور یہ سب عالم امر کے لطائف میں سے ہیں جس کی طرف قرآن کریم نے اشارہ فرمایا ہے قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي۔

اور رُوح سفلی وہ بخار لطیف ہے جو بدن انسانی کے عناصر اربعہ آگ، پانی، مٹی، ہوا، سے پیدا ہوتا ہے، اور اسی روح سفلی کو نفس کہا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس رُوح سفلی کو جسے نفس کہا جاتا ہے، اور ارج علویہ مذکورہ کا آئینہ بنا دیا ہے، جس طرح آئینہ جب آفتاب کے مقابل کیا جائے تو آفتاب کے بہت بعید ہونے کے باوجود اس میں آفتاب کا عکس آجاتا ہے، اور روشنی کی وجہ سے وہ بھی آفتاب کی طرح چمک اٹھتا ہے، اور آفتاب کی حرارت بھی اس میں آجاتی ہے، جو کپڑے کو جلا سکتی ہے، اسی طرح ارج علویہ اگرچہ اپنے تجرد کی وجہ سے بہت اعلیٰ و ارفع اور بہت مسافت بعیدہ پر ہیں مگر ان کا عکس اس رُوح سفلی کے آئینہ میں آکر ارج علویہ کی کیفیات و آثار اس میں منتقل کر دیتا ہے، اور یہی آثار جو نفوس میں پیدا ہو جاتے ہیں ہر ہر فرد کے لئے ارج تجزیہ کہلاتے ہیں۔

پھر یہ رُوح سفلی جس کو نفس کہتے ہیں اپنی ان کیفیات و آثار کے ساتھ جن کو ارج علویہ سے حاصل کیا ہے، اس کا تعلق بدن انسانی میں سب سے پہلے مضخہ قلبیہ سے ہوتا ہے، اور اس تعلق ہی کا نام حیات اور زندگی ہے، رُوح سفلی کے تعلق سے سب سے پہلے انسان کے قلب میں حیات اور وہ ادراکات پیدا ہوتے ہیں، جن کو نفس نے ارج علویہ سے حاصل کیا ہے، یہ رُوح سفلی پورے بدن میں پھیلی ہوئی باریک رگوں میں سرایت کرتی ہے، جن کو شرائین کہا جاتا ہے، اور اس طرح وہ تمام بدن انسانی کے ہر حصہ میں پہنچ جاتی ہے۔

رُوح سفلی کے بدن انسانی میں سرایت کرنے ہی کو نفخ رُوح سے تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ یہ کسی چیز میں پھونک بھرنے سے بہت مشابہ ہے۔

اور آیت مذکورہ میں اللہ تعالیٰ نے رُوح کو اپنی طرف منسوب کر کے مِنْ رُوحِی اسی لئے فرمایا ہے کہ تمام مخلوقات میں رُوح انسانی کا اشرف و اعلیٰ ہونا واضح ہو جائے، کیونکہ وہ بغیر مادہ کے محض امر الہی سے پیدا ہوتی ہے، نیز اس میں تجلیاتِ رحمانیہ کے قبول کرنے کی ایسی استعداد ہر جو انسان کے علاوہ کسی دوسرے جاندار کی رُوح میں نہیں ہے۔

اور انسان کی پیدائش میں اگرچہ عنصر غالب مٹی کا ہے، اور اسی لئے قرآن عزیز میں انسان کی پیدائش کو مٹی کی طرف منسوب کیا گیا ہے، لیکن درحقیقت وہ دس چیزوں کا جامع ہو جن میں پانچ عالمِ خلق کی ہیں اور پانچ عالمِ امر کی، عالمِ خلق کے چار عنصر، آگ، پانی، مٹی، ہوا، اور پانچواں ان چاروں سے پیدا ہونے والا بخار لطیف جس کو رُوحِ سفلی یا نفس کہا جاتا ہے، اور عالمِ امر کی پانچ چیزیں وہ ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے یعنی قلب، رُوح، سر، خفی، اخفی۔ اسی جامعیت کے سبب انسان خلافتِ الہیہ کا مستحق بنا، اور نورِ معرفت اور نارِ عشق و محبت کا قتل ہوا، جس کا نتیجہ بے کیف معیتِ الہیہ کا حصول ہے، کیونکہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ، یعنی ہر انسان اس فرد کے ساتھ ہو گا جس سے اس کو محبت ہے۔

اور انسان میں تجلیاتِ الہیہ کی قابلیت اور معیتِ الہیہ کا جو درجہ اس کو حاصل ہے، اسی کی وجہ سے حکمتِ الہیہ کا تقاضا یہ ہوا کہ اس کو مسجد ملائکہ بنایا جائے، ارشاد ہوا فَخَعُّوا لَكَ سَجْدَیْنِ

حکمِ سجدہ فرشتوں کو ہوا تھا | سورہ اعراف میں ابلیس کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا ہے مَا مَنَعَكَ ابلیس اس میں تبعا شامل قرار دیا گیا | اَلَا تَسْجُدُ اِذَا اُمِرْتُ لَكَ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سجدہ کا حکم فرشتوں کے ساتھ ابلیس کو بھی دیا گیا تھا، اسی لئے اس سورت کی جو آیات ابھی آپ نے پڑھی ہیں جن سے بظاہر اس حکم کا فرشتوں کے لئے مخصوص ہونا معلوم ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اصالتاً یہ حکم فرشتوں کو دیا گیا، مگر ابلیس بھی چونکہ فرشتوں کے اندر موجود تھا، اس لئے تبعا وہ بھی اس حکم میں شامل تھا، کیونکہ آدم علیہ السلام کی تعظیم و تکریم کے لئے جب اللہ تعالیٰ کی بزرگترین مخلوق فرشتوں کو حکم دیا گیا تو دوسری مخلوق کا تبعا اس حکم میں داخل ہونا بالکل ظاہر تھا، اسی لئے ابلیس نے جواب میں یہ نہیں کہا کہ مجھے سجدہ کا حکم دیا ہی نہیں گیا تو عدم تعمیل کا جرم مجھ پر عائد نہیں ہوتا، اور شاید قرآن کریم کے الفاظ اَلَا اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السَّجِدِیْنَ میں بھی اس کی طرف اشارہ ہو کہ اَلَا اَنْ يَّسْجُدَ کے بجائے اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السَّجِدِیْنَ ذکر فرمایا جس سے اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ اصل ساجدین تو فرشتے ہی تھے، مگر عقلاً لازم تھا کہ

ابلیس بھی جب ان میں موجود تھا تو وہ بھی ملائکہ ساجدین کے ساتھ شامل ہو جاتا، اس کے عدم شمول پر عتاب فرمایا گیا۔

اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندوں پر | اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ سِوَا الَّذِيْ رَزَقْنٰهُمْ مِنْهُ ۚ وَبَعْضُ مَا يَصْتَلِبُوْنَ (آل عمران) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ پر بھی شیطان کا کید اس موقع میں چل گیا۔

اس لئے آیت مذکورہ میں اللہ کے مخصوص بندوں پر شیطان کا تسلط نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے قلوب و عقول پر شیطان کا ایسا تسلط نہیں ہوتا، کہ وہ اپنی غلطی پر کسی وقت متنبہ ہی نہ ہوں جس کی وجہ سے ان کو توبہ نصیب نہ ہو، یا کوئی ایسا گناہ کر بیٹھیں جس کی مغفرت نہ ہو سکے۔

اور مذکورہ واقعات اس کے منافی نہیں، کیونکہ آدم و حوا علیہما السلام نے توبہ کی اور یہ توبہ قبول ہوئی، اسی طرح حضرات صحابہؓ نے بھی توبہ کر لی تھی، اور شیطان کے مکر سے جس گناہ میں ابتلا ہوا وہ معاف کر دیا گیا۔

جہنم کے سات دروازے | لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ، امام احمد، ابن جریر طبری اور بیہقی نے بروایت حضرت علی کرم اللہ وجہہ لکھا ہے کہ جہنم کے سات دروازے اوپر نیچے سات طبقات کے اعتبار سے ہیں، اور بعض حضرات نے ان کو عام دروازوں کی طرح قرار دیا ہے، ہر دروازہ خاص قسم کے مجرمین کے لئے مخصوص ہوگا (سترطبی)

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنَّتٍ وَعِيُوْنَ ﴿۴۵﴾ اَدْخُلُوْهَا بِسَلَامٍ اٰمِنِيْنَ ﴿۴۶﴾

پرہیزگار ہیں باغوں میں اور چشموں میں، کہیں گے ان کو جادان میں سلامتی سے جمع خاطر سے

وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ

اور نکال ڈالی ہم نے جو ان کے جیوں میں تھی غمگنی، بھائی ہو گئے تختوں پر بیٹھے

مُتَقَابِلِيْنَ ﴿۴۷﴾ لَا يَسْخَرُ مِنْهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ ۚ وَمَا لَهُمْ مِنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ﴿۴۸﴾

آمنے سامنے، نہ پیچھے گی ان کو وہاں کچھ تکلیف اور نہ ان کو وہاں سے کوئی نکالے

نَبِيِّ عِبَادِي أَنِّي أَنَا الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿۴۹﴾ وَأَنَّا عَلَّابِي هُمْ

خبر سنا دے میرے بندوں کو کہ میں ہوں مہل بخشنے والا مہربان، اور یہ بھی کہ میرا عذاب

الْعَذَابُ الْأَلِيمُ ﴿۵۰﴾

وہی عذاب دردناک ہے۔

خلاصہ تفسیر

بے شک خدا سے ڈرنے والے (یعنی اہل ایمان) باغیوں اور چشمیوں میں رہتے رہیں گے،
رخواہ اول ہی سے اگر معصیت نہ ہو یا معاف ہو گئی ہو اور خواہ سزا سے معصیت بھگتنے کے
بعد ان سے کہا جائے گا کہ تم ان (جنات و عیون) میں سلامتی اور امن کے ساتھ داخل ہو (یعنی اس
وقت بھی ہرنا پسند چیز سے سلامتی ہے، اور آئندہ بھی کسی شرکا اندیشہ نہیں) اور دنیا میں طبعی
تقاضے سے ان کے دلوں میں جو کینہ تھا ہم وہ سب ان کے دلوں سے جنت میں داخل ہونے
کے قبل ہی دور کر دیں گے سب بھائی بھائی کی طرح (الفت و محبت سے) رہیں گے، تختوں پر
آمنے سامنے بیٹھا کریں گے، وہاں ان کو ذرا بھی تکلیف نہ پہنچے گی اور نہ وہ وہاں سے نکالے جائیں گے
(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ میرے بندوں کو اطلاع دیدیجئے کہ میں بڑا مغفرت اور رحمت والا
بھی ہوں اور (نیز) یہ کہ میری سزا (بھی) دردناک سزا ہے (تاکہ اس سے مطلع ہو کر ایمان اور تقویٰ
کی رغبت اور کفر و معصیت سے خوف پیدا ہو)۔

معارف و مسائل

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اہل جنت جب جنت میں داخل ہوں گے تو سب
پہلے ان کے سامنے پانی کے دو چشمے پیش کئے جائیں گے، پہلے چشمہ سے وہ پانی پییں گے تو ان
سب کے دلوں سے باہمی رنجش جو کبھی دنیا میں پیش آئی تھی، اور طبعی طور پر اس کا اثر آخر تک
موجود رہا وہ سب مٹ جائے گی، اور سب کے دلوں میں باہمی الفت و محبت پیدا ہو جائیگی،
کیونکہ باہمی رنجش بھی ایک تکلیف و عذاب ہے، اور جنت ہر تکلیف سے پاک ہے۔

اور حدیث صحیح میں جو یہ وارد ہوا ہے کہ جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی کینہ کسی
مسلمان سے ہو گا وہ جنت میں نہ جائے گا، اس سے مراد وہ کینہ اور بغض ہے جو دنیوی غرض
سے اور اپنے قصد و اختیار سے ہو اور اس کی وجہ سے یہ شخص اس کے درپے رہے کہ جب موقع پائے

اپنے دشمن کو تکلیف اور نقصان پہنچائے، طبعی انقباض جو خاصہ بشری اور غیر اختیاری ہے وہ اس میں داخل نہیں، اسی طرح جو کسی شرعی بنیاد پر مبنی ہو، ایسے ہی بغض و انقباض کا ذکر اس آیت میں ہے کہ اہل جنت کے دلوں سے ہر طرح کا انقباض اور رنجش دور کر دی جائے گی۔ اسی کے متعلق حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ: ”نبی امید ہے کہ میں اور طلحہ اور زبیر انہی لوگوں میں سے ہوں گے جن کے دلوں کا غبار جنت میں داخلہ کے وقت دور کر دیا جائے گا۔“ اشارہ اُن اختلافات و مشاجرات کی طرف ہے جو ان حضرات اور حضرت علیؑ کے درمیان پیش آئے تھے۔

لَا يَسْتَكْبِرُ فِيهَا نَصَبٌ وَمَا هُمْ مِنْهَا بِمُخْرَجِينَ ۝ اس آیت سے جنت کی دو خصوصیات معلوم ہوتی ہیں، اول یہ کہ کسی کو کبھی تکان اور ضعف محسوس نہ ہوگا، بخلاف دنیا کے کہ یہاں محنت و مشقت کے کاموں سے تو ضعف و تکان ہوتا ہی ہے، خالص آرام اور تفریح سے بھی کسی نہ کسی وقت آدمی تھک جاتا ہے اور ضعف محسوس کرنے لگتا ہے، خواہ وہ کتنا ہی لذیذ کام اور مشغلہ ہو۔

دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے جو آرام و راحت اور نعمتیں وہاں کسی کو مل جائیں گی پھر وہ دائمی ہوں گی، نہ وہ نعمتیں کبھی کم ہوں گی اور نہ ان میں سے اس شخص کو نکالا جائے گا، سورہ ص میں ارشاد ہے إِنَّ هَذَا الْوَرْدُ قُنَا مَالَهُ مِنْ نَفَادٍ، یعنی یہ ہمارا رزق ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا، اور اس آیت میں فرمایا وَمَا هُمْ مِنْهَا بِمُخْرَجِينَ، یعنی ان کو کبھی ان نعمتوں و راحتوں سے نکالا نہیں جائے گا، بخلاف معاملات دنیا کے کہ یہاں اگر کوئی کسی کو بڑے سے بڑا انعام و راحت دے بھی دے تو یہ خطرہ ہر وقت لگا رہتا ہے کہ جس نے یہ انعامات دیے ہیں وہ کسی وقت ناراض ہو کر یہاں سے نکال دے گا۔

ایک تیسرا احتمال جو یہ تھا کہ نہ جنت کی نعمتیں ختم ہوں اور نہ اس کو وہاں سے نکالا جائے مگر وہ خود ہی وہاں رہتے رہتے اکتا جائے اور باہر جانا چاہے، قرآن عزیز نے اس احتمال کو بھی ایک جملہ میں ان الفاظ سے ختم کر دیا ہے کہ لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حَوْلًا، یعنی یہ لوگ بھی وہاں سے پلٹ کر آنے کی کبھی خواہش نہ کریں گے۔

وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ ۝ اِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا

اور حال سنا دے ان کو ابراہیم کے ہمانوں کا، جب چلے آئے اس کے گھر میں اور بولے

سَلَامًا قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُونَ ۝ قَالُوا لَا تَوْجَلْ اِنَّا

سلام وہ بولا ہم کو تم سے ڈر معلوم ہوتا ہے، بولے درست ہم بھتہ کو

نَبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ ﴿۵۳﴾ قَالَ أَبَشِّرْهُنِّي عَلَىٰ أَنَّمَسِّنِيَ الْكَبِيرَ

خوش خبری سناتے ہیں ایک ہو شیار لڑکے کی، بولا کیا خوش خبری سناتے ہو۔ مجھ کو جب پہنچا مجھ کو بڑھاپا

فِيهِمْ تَبَشِّرُونَ ﴿۵۴﴾ قَالُوا ابَشِّرْنَاكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُن مِّنَ الْقَانِطِينَ ﴿۵۵﴾

اب کا، تو پر خوش خبری سناتے ہو، بولے ہم نے تجھ کو خوش خبری سنائی بھی سومت ہوتا امیدوں میں،

قَالَ وَمَنْ يَقْنَطُ مِن رَّحْمَةِ رَبِّهِ إِلَّا الضَّالُّونَ ﴿۵۶﴾ قَالَ

بولا اور کون اس توڑے اپنے رب کی رحمت سے نگر ہو گمراہ ہیں، بولا پھر

فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ ﴿۵۷﴾ قَالُوا إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَىٰ قَوْمٍ

کیا ہم ہر تمہاری اے اللہ کے بھیجے ہوئے، بولے ہم بھیجے ہوئے آئے ہیں ایک قوم

مُجْرِمِينَ ﴿۵۸﴾ إِلَّا آلَ لُوطٍ إِنَّا لَمُنَجِّوهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۵۹﴾ إِلَّا أَمْرًا

گنہگار پر، مگر لوط کے گھر والے ہم ان کو بچالیں گے سب کو، مگر ایک اسکی عورت

قَدَرْنَا لَا إِنهَآ لَمِنَ الْغَیْرِینَ ﴿۶۰﴾ فَلَمَّا جَاءَ آلَ لُوطٍ الْمُرْسَلُونَ ﴿۶۱﴾

ہم نے ٹھہر لیا، وہ ہر وہ جانے والوں میں، پھر جب پہنچے لوط کے گھر وہ بھیجے ہوئے

قَالَ إِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّكَرُّونَ ﴿۶۲﴾ قَالُوا بَلْ جِئْنَاكَ بِمَا كَانُوا

بولا تم لوگ ہو ادھر سے، بولے نہیں پر ہم لیکر آئے ہیں تیرے پاس وہ چیز جس میں

فِيهِ يَشْتَرُونَ ﴿۶۳﴾ وَأَتَيْنَاكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ﴿۶۴﴾

وہ جھگڑتے تھے، اور ہم لائے ہیں تیرے پاس سچی بات اور ہم سچا کہتے ہیں

فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ اللَّيْلِ وَاتَّبِعْ أَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ

سوئے نکل اپنے گھر والوں کچھ رات رہے سے، اور تو جہل ان کے پیچھے اور مڑ کر نہ دیکھے

مِّنْكُمْ أَحَدٌ وَأَمْضُوا حَيْثُ تُؤْمَرُونَ ﴿۶۵﴾ وَقَضَيْنَا إِلَيْهِ

تم میں سے کوئی، اور چلے جاؤ جہاں تم کو حکم ہے، اور مقرر کر دی ہم نے اس کو

ذَلِكَ إِلَّا مِرَّآءَ دَابِرَ هَوَاءٍ مَّقْطَعُ مَصْبِحِ حِينَ ﴿۶۶﴾ وَ

یہ بات کہ ان کی جھڑکے کی صبح ہوتے، اور

جَاءَ أَهْلَ الْمَدِينَةِ يَتَبَشَّرُونَ ﴿۶۷﴾ قَالَ إِنَّ هَؤُلَاءِ ضِيفَىٰ

آئے شہر کے لوگ خوشیاں کرتے، لوط نے کہا یہ لوگ میرے مہمان ہیں

فَلَا تَفْضَحُون ۝۶۸ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَلَا تُخْرَوْنَ ۝۶۹ قَالُوا أَوَلَمْ

سو مجھ کو رسالت کرو ، اور ڈرو اللہ سے اور میری آبرودست کھو دو ، بولے کیا ہم نے تجھ کو منح

نہک عن العالَمِیْنَ ۝۷۰ قَالَ هُوَ لِأَبْنَتِي إِنْ كُنْتُمْ فَعِلِیْنَ ۝۷۱

نہیں کیا جہان کی حمایت سے ، بولایہ حاضر ہیں میری بیٹیاں اگر تم کو کرنا ہے ،

لَعَمْرُكَ أَنْتُمْ لَفِي سَكْرَةٍ كَثِيرٍ كَمَا يَعْدِلُونَ ۝۷۲ فَأَخَذَتْ هُمُ

قسم ہر تیری جان کی وہ اپنی مستی میں مدہوش ہیں ، پھر آپکڑا ان کو چٹھاڑ

الصَّيْحَةَ مُشْرِقِينَ ۝۷۳ فَجَعَلْنَا عَلَيْهِمْ سَافِلَةً وَأَمْطَرْنَا

نے سورج نکلنے دقت ، پھر کر ڈالی ہم نے وہ بستی ادب تلے اور برسائے

عَلَيْهِمْ حِجَابًا مِّنْ سَجَلٍ ۝۷۴ إِنَّ فِيْ ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْمُتَوَسِّعِينَ ۝۷۵

ان پر پتھر کھنگر کے ، بیشک اس میں نشانیاں ہیں دھیان کرنیوالوں کو

وَأَنَّهُمَا لَبِئْسَ لِمَقِيَرٍ ۝۷۶ إِنَّ فِيْ ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ ۝۷۷

اور وہ بستی واقع ہر سیدھی راہ پر ، البتہ اس میں نشانی ہے ایمان والوں کو ۔

خلاصہ تفسیر

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان (لوگوں) کو ابراہیم (علیہ السلام) کے مہمانوں
 (کے قصہ) کی بھی اطلاع دیجئے وہ قصہ اس وقت واقع ہوا تھا) جب کہ وہ (مہمان جو کہ واقع میں
 فرشتے تھے ، اور بشکل انسانی ہونے کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو مہمان سمجھا)
 ان کے (یعنی ابراہیم علیہ السلام کے) پاس آئے پھر (آکر) انھوں نے السلام علیکم کہا (ابراہیم
 علیہ السلام ان کو مہمان سمجھ کر فوراً ان کے لئے کھانا تیار کر کے لاتے ، مگر چونکہ وہ فرشتے تھے ،
 انھوں نے کھانا نہیں تب) ابراہیم (علیہ السلام) دل میں ڈرے کہ یہ لوگ کھانا کیوں نہیں کھاتے
 کیونکہ وہ فرشتے (بشکل بشر تھے) ان کو بشر ہی سمجھا اور کھانا نہ کھانے سے شبہ ہوا کہ یہ لوگ
 کہیں مخالف نہ ہوں اور) کہنے لگے کہ ہم تو تم سے خائف ہیں ، انھوں نے کہا کہ آپ خائف نہ ہوں
 کیونکہ ہم (فرشتے ہیں) منجانب اللہ ایک بشارت لے کر آئے ہیں اور) آپ کو ایک منہ زندگی
 بشارت دیتے ہیں جو بڑا عالم ہوگا (مطلب یہ کہ نبی ہوگا ، کیونکہ آدمیوں میں سب سے زیادہ

علم انبیاء کو ہوتا ہے، مراد اس فرزند سے اسحق علیہ السلام ہیں، اور دوسری آیتوں میں حضرت اسحق علیہ السلام کے ساتھ یعقوب علیہ السلام کی بشارت بھی مذکور ہے، ابراہیم (علیہ السلام) کہنے لگے کہ کیا تم مجھ کو اس حالت میں (فرزند کی) بشارت دیتے ہو کہ مجھ پر بوڑھا پانا گیا ہو (ایسی حالت میں مجھ کو) کس چیز کی بشارت دیتے ہو (مطلب یہ کہ یہ امر فی نفسہ عجیب ہی، نہ یہ کہ قدرت سے بعید) وہ (فرشتے) بولے کہ ہم آپ کو امر واقعی کی بشارت دیتے ہیں (یعنی تولدِ فرزند یقیناً ہونے والا ہے) سو آپ ناامید نہ ہوں (یعنی اپنے بڑھاپے پر نظر نہ کیجئے کہ ایسے اسباب عادیہ پر نظر کرنے سے دساویں ناامیدی کے غالب ہوتے ہیں) ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کہ بھلا اپنے رب کی رحمت سے کون ناامید ہوتا ہے بجز گمراہ لوگوں کے (یعنی میں نبی ہو کر گمراہوں کی صفت سے کب موصوف ہو سکتا ہوں، محض مقصود اس امر کا عجیب ہونا ہے، باقی اللہ کا وعدہ سچا اور مجھ کو امید سے بڑھ کر اس کا کامل یقین ہی، بعد اس کے ذرا سب نبوت سے آپ کو معلوم ہوا کہ ان ملائکہ کے آنے سے علاوہ بشارت کے اور بھی کوئی ہم عظیم مقصود ہو اس لئے) فرمانے لگے کہ (جب قرأتیں سے مجھ کو یہ معلوم ہو گیا کہ تمہارے آنے کا کچھ اور بھی مقصود ہے) تو یہ بتاؤ کہ اب تم کو کیا ہم درپیش ہے اے فرشتو! فرشتوں نے کہا کہ ہم ایک مجرم قوم کی طرف (ان کو سزا دینے کے لئے) بھیجے گئے ہیں (مراد قوم لوط ہے) مگر لوط (علیہ السلام) کا خاندان کہ ہم ان سب کو (عذاب سے) بچالیں گے (یعنی ان کو بچنے کا طریقہ بتلا دیں گے کہ ان مجرموں سے علیحدہ ہو جائیں) بجز ان کی (یعنی لوط علیہ السلام کی) بی بی کے کہ اس کی نسبت ہم نے تجویز کر رکھا ہے کہ وہ ضرور اسی قوم مجرم میں رہ جائے گی (اور ان کے ساتھ عذاب میں مبتلا ہوگی)۔

پھر جب وہ فرشتے خاندانِ لوط (علیہ السلام) کے پاس آئے (تو چونکہ بشکل بشر تھے اس لئے) کہنے لگے تم تو اجنبی آدمی (معلوم ہوتے) ہو، (دیکھئے شہر والے تمہارے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں، کیونکہ یہ اجنبی لوگوں کو پریشان کیا کرتے ہیں) انھوں نے کہا نہیں (ہم آدمی نہیں) بلکہ ہم (فرشتے ہیں) آپ کے پاس وہ چیز (یعنی وہ عذاب) لے کر آئے ہیں جس میں یہ لوگ شک کیا کرتے تھے اور ہم آپ کے پاس یقینی ہونے والی چیز (یعنی عذاب) لے کر آئے ہیں اور ہم (اس خبر دینے میں) بالکل سچے ہیں، سو آپ رات کے کسی حصہ میں اپنے گھر والوں کو لیکر (یہاں سے) چلے جائیے، اور آپ سب کے پیچھے ہو لیجئے (تاکہ کوئی رہ نہ جائے یا لوٹ نہ جائے، اور آپ کے رعب اور ہیبت کی وجہ سے کوئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے جس کی ممانعت کر دی گئی ہو) اور تم میں سے کوئی پیچھا پھر کر بھی نہ دیکھے (یعنی سب جلدی چلے جائیں، اور جس جگہ (جانے کا) حکم ہوا ہے اس طرف سب کے سب چلے جاؤ (تفسیر درمنثور میں بحوالہ سہمی نقل کیا ہے)

کہ وہ جگہ ملک شام ہے، جس کی طرف ہجرت کرنے کا ان حضرات کو حکم دیا گیا تھا، اور ہم نے ان فرشتوں کے واسطے سے، لوط (علیہ السلام) کے پاس یہ حکم بھیجا کہ صبح ہوتے ہی بالکل ان کی جڑ کٹ جائیگی (یعنی بالکل ہلاک و برباد ہو جائیں گے)، فرشتوں کی یہ گفتگو وقوع کے اعتبار سے اس قصہ کے بعد ہوئی ہے جس کا ذکر آگے آ رہا ہے، لیکن اس کو ذکر کرنے میں اس لئے مقدم کر دیا کہ قصہ بیان کرنے سے ہجرات مقصود ہے، یعنی نافرمانوں پر غراب اور فرمانبرداروں کی نجات و کامیابی وہ پہلے ہی اہتمام کے ساتھ معلوم ہو جائے، اگلا قصہ یہ ہے، اور شہر کے لوگ (یہ خبر سن کر کہ لوط علیہ السلام کے یہاں تین لڑکے آئے ہیں) خوب خوشیاں مناتے ہوئے (اپنی فاسدنیت اور بُرے ارادہ کے ساتھ لوط علیہ السلام کے گھر پہنچے) لوط (علیہ السلام) نے جواب تک ان کو آدمی اور اپنا مہمان ہی سمجھ رہے تھے ان کے فاسد ارادوں کا احساس کر کے، فرمایا کہ یہ لوگ میرے مہمان ہیں (ان کو پریشان کر کے) مجھ کو (عام لوگوں میں) رسوا نہ کرو (کیونکہ مہمان کی توہین میزبان کی توہین ہوتی ہے، اگر تمہیں ان پر دلیسوں پر رحم نہیں آتا تو کم از کم میرا خیال کرو کہ میں تمہاری بستی کا رہنے والا ہوں، اس کے علاوہ جو ارادہ تم کر رہے ہو وہ اللہ تعالیٰ کے قہر و غضب کا سبب ہی) تم اللہ سے ڈرو اور مجھ کو (ان مہمانوں کی نظر میں) رسوا مت کرو (کہ مہمان یہ سمجھیں گے کہ اپنی بستی کے لوگوں میں بھی ان کی کوئی وقعت نہیں) وہ کہنے لگے (کہ یہ رسوائی ہماری طرف سے نہیں آپنے خود اپنے ہاتھوں خریدی ہے کہ ان کو مہمان بنایا، کیا ہم آپ کو دنیا بھر کے لوگوں کو اپنا مہمان بنانے سے (بار بار) منع نہیں کر چکے) نہ آپ ان کو مہمان بناتے نہ اس رسوائی کی نوبت آتی (لوط علیہ السلام) نے فرمایا کہ (یہ تو بتلاؤ کہ اس بیہودہ حرکت کی کیا ضرورت ہے جس کی وجہ سے ہمیں کسی کو مہمان بنانے کی بھی اجازت نہیں دی جاتی، قصداً شہوت کے طبعی تقاضے کے لئے) یہ میری (بہو) بیٹیاں (جو تمہارے گھروں میں ہیں) موجود ہیں اگر تم میرا کہنا کرو (تو مشرعیانہ طور پر اپنی عورتوں سے اپنا مطلب پورا کرو، مگر وہ کس کی سنتے تھے) آپ کی جان کی قسم، اپنی مستی میں مہوش تھے، پس سوچ نکلتے نکلتے ان کو سخت آواز نے آدیا (یہ ترجمہ تشریف کا ہے، اس سے پہلے جو تبیین کا لفظ آیا ہے جس کے معنی صبح ہوتے ہوتے کے ہیں، ان دونوں کا اجتماع اس اعتبار سے ممکن ہو کہ صبح سے ابتداء ہوئی اور اشراق تک خاتمہ ہوا) پھر اس سخت آواز کے بعد ہم نے ان بستیوں کی زمین کو الٹ کر ان کا اوپر کا تختہ (تو) نیچے کر دیا (اور نیچے کا تختہ اوپر کر دیا) اور ان لوگوں پر کھنکھ کے پتھر برسانا شروع کئے، اس واقعہ میں بہت سے نشانات ہیں اہل بصیرت کے لئے مثلاً ایک تو یہ کہ بُرے فعل کا نتیجہ آخر کار بُرا ہوتا ہے، اگر کچھ دن کی مہلت اور ڈھیل مل جائے تو اس سے دھوکہ نہ کھانا چاہئے، دوسرے یہ کہ دائمی اور باقی رہنے والی راحت و عزت

صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کی اطاعت پر موقوف ہے، تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کو انسانی قدرت پر قیاس کر کے فریب میں مبتلا نہ ہوں، اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں سب کچھ ہو وہ ظاہری اسباب کے خلاف بھی جو چاہے کر سکتا ہے۔ وغیرہ ذلک

معارف و مسائل

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم | قَوْلَ تَحْمُزُكَ رُوحُ الْمَعَانِي فِي جَبْهَةِ مَفْسَرِيْنَ كَا قَوْلِ يَهْ نُفْلُ كَيَا هِي كِه
کا خصوصی اعزاز و اکرام | تَحْمُزُكَ كِه مُخَاطَبِ رَسُوْلِ كَرِيْمِ صَلِيَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هِيْنَ، اللّٰهُ تَعَالٰی نِي
آپ کی حیات کی قسم کھائی ہے، یہی قی نے دلائل اسبوتہ میں اور ابو نعیم و ابن مردودہ وغیرہ نے حضرت
عبداللہ ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات و کائنات میں کسی کو محمد
مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ عزت و مرتبہ عطا نہیں فرمایا، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی
پیغمبر یا کسی فرشتے کی حیات پر کبھی قسم نہیں کھائی اور اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی
عمر و حیات کی قسم کھائی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انتہائی اعزاز و اکرام ہے۔
غیر اللہ کی قسم کھانا | کسی انسان کے لئے جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے علاوہ کسی
اور چیز کی قسم کھائے، کیونکہ قسم اس کی کھائی جاتی ہے جس کو سب سے زیادہ بڑا سمجھا جائے، اور
ظاہر ہے سب سے زیادہ بڑا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہو سکتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنی ماؤں اور باپوں کی اور
بتوں کی قسم نہ کھاؤ، اور اللہ کے سوا کسی کی قسم نہ کھاؤ، اور اللہ کی قسم بھی صرف اس وقت
کھاؤ جب تم اپنے قول میں سچے ہو (رواہ ابو داؤد و الترمذی عن ابی ہریرۃ)
اور صحیحین میں ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر بن خطاب
کو دیکھا کہ اپنے باپ کی قسم کھا رہے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پکار کر فرمایا کہ ”خبردار
رَبُّ اللّٰهِ تَعَالٰی باپوں کی قسم کھانے سے منع فرماتا ہے، جس کو حلف کرنا ہو اللہ کے نام کا حلف کر
ورنہ خاموش رہے (قرطبی، مائتہ)

لیکن یہ حکم عام مخلوقات کے لئے ہے، اللہ جل شانہ، خود اپنی مخلوقات میں سے مختلف
چیزوں کی قسم کھاتے ہیں، یہ ان کے لئے مخصوص ہے، جس کا مقصد کسی خاص اعتبار سے اس چیز
کا اشرف اور عظیم النفع ہونا بیان کرنا ہے، اور عام مخلوق کو غیہ اللہ کی قسم کھانے سے روکنے کا
جو سبب ہے وہ یہاں موجود نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں اس کا کوئی امکان نہیں کہ وہ اپنی
کسی مخلوق کو سب سے بڑا اور افضل سمجھیں، کیونکہ علی الاطلاق بڑائی تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات سے

مخصوص ہے۔

جن بستیوں پر عذاب نازل ہوا | اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّمَنۡتَوَسَّعَتۡ وَاٰتَمَّ السَّبِيْلُ مُعْتَبِرٍ
ان سے عبرت حاصل کرنا چاہیے | اس میں حق تعالیٰ نے ان بستیوں کا محل وقوع بیان فرمایا جو عرب کے شام
تک جانے والے راستہ پر ہیں، اور ساتھ ہی ارشاد فرمایا کہ ان میں اہل بصیرت کے لئے اللہ تعالیٰ کی
قدرت کا ملکہ کی بڑی نشانیاں ہیں۔

ایک دوسری آیت میں ان کے متعلق یہ بھی ارشاد ہوا ہے لَمَّا تَسْكُنْ مِنْۢ بَحْرٍ هَيۡمٍ
اِلَّا قَلِيْلًا، یعنی یہ بستیاں عذاب الہی کے ذریعہ دیران ہونے کے بعد پھر دوبارہ آباد نہیں ہوتیں،
بجز چند بستیوں کے، اس مجموعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے ان بستیوں اور ان کے مکانات
کو آنے والی نسلوں کے لئے عبرت کا سامان بنایا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب ان مقامات سے گزرے ہیں تو آپ پر
ہیبت حق کا ایک خاص حال ہوتا تھا جس سے سر مبارک جھک جاتا تھا، اور آپ اپنی سواری کو ان مقامات
میں تیز کر کے جلد عبور کرنے کی سعی فرماتے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل نے یہ سنت
قائم کر دی کہ جن مقامات پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا ہے ان کو تماشا گاہ بنانا بڑی قسادت ہے بلکہ
ان سے عبرت حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ وہاں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ملکہ کا ہتھنار
اور اس کے عذاب کا خوف طاری ہو۔

حضرت لوط علیہ السلام کی بستیاں جن کا تختہ الٹا گیا ہے، قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق
عرب سے شام کو جانے والے راستہ پر اردن کے علاقہ میں آج بھی یہ مقام سطح سمندر سے
کافی گہرائی میں ایک عظیم صحراء کی صورت میں موجود ہے، اس کے ایک بہت بڑے رقبہ پر ایک
خاص قسم کا پانی دریا کی صورت اختیار کرتے ہوئے ہے، اس پانی میں کوئی پھٹی، مینڈک وغیرہ
جانور زندہ نہیں رہ سکتا، اسی لئے اس دریا کو بحر میت اور بحر لوط کے نام سے موسوم کیا جا
تا ہے، اور تحقیق سے معلوم ہوا کہ درحقیقت اس میں پانی کے اجزاء بہت کم اور تیل کی قسم کے
اجزاء زیادہ ہیں، اس لئے اس میں کوئی جانور زندہ نہیں رہ سکتا۔

آجکل آثار قدیمہ کے محکمہ نے کچھ رہائشی عمارتیں ہوٹل وغیرہ بھی بنادیں ہیں، اور آخرت
سے غافل مادہ پرست طبیعتوں نے آجکل اس کو ایک سیرگاہ بنایا ہوا ہے، لوگ تماشے کے طور
پر اسے دیکھنے جاتے ہیں، قرآن کریم نے اسی غفلت شکاری پر تنبیہ کیلئے آخر میں فرمایا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ
لِّمَنۡتَوَسَّعَتۡ، یعنی درحقیقت تو یہ واقعات و مقامات ہر چشم بصیرت رکھنے والے کیلئے عبرت آموز ہیں، لیکن اس
عبرت کا فائدہ اٹھانیو! مومنین ہی ہوتے ہیں دوسرے لوگ ان مقامات کو ایک تماشائی کی حیثیت دیکھ کر رواں ہو جاتے ہیں

وَإِنْ كَانَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ ظَالِمِينَ ۝۸۶ فَانْقَبْنَا مِنْهُمْ مَرْوَاتٍ ۝۸۷

اور تحقیق تھے بن کے رہنے والے گنہگار ، سو ہم نے بدلہ لیا ان سے اور یہ دونوں

لبا مام مبین ۝۸۷ وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحَابُ الْحِجْرِ الْمُرْسِلِينَ ۝۸۸

بستیاں واقع ہیں کھلے راستہ پر، اور بیشک جھٹلایا ہجر والوں نے رسولوں کو ،

وَآتَيْنَاهُمْ آيَاتِنَا فَكَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ۝۸۹ وَكَانُوا يُدْعَوْنَ مِنْ

اور دیں ہم نے ان کو اپنی نشانیاں ہر ہے ان سے گمنہ پھرتے ، اور تھے کہ تراشتے تھے

الْجِبَالِ بَيِّنَاتٍ ۝۹۰ فَأَخَذَ اللَّهُ الصَّيْحَةَ مُصْحِحِينَ ۝۹۱

پہاڑوں کے گہرا طینان کے ساتھ ، پھر پکڑا ان کو چنگھاڑنے صبح ہونے کے وقت

فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝۹۲ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ

پھر کام نہ آیا ان کے جو کچھ کمایا تھا ، اور ہم نے بنائے نہیں آسمان

وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَإِنَّ السَّاعَةَ

اور زمین اور جو ان کے بیچ میں ہے بغیر حقت ، اور قیامت بیشک

لَأَتِيَةٌ ۝۹۳ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ ۝۹۴ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ

آنے والی ہے سو کنارہ کراچی طرح کنارہ ، تیرا رب جو ہے وہی ہے

الْخَلْقُ الْعَلِيمُ ۝۹۵

پیدا کرنے والا خبردار۔

خلاصہ تفسیر

قصہ اصحاب ایکہ اور بن والے (یعنی شعیب علیہ السلام کی امت بھی) بڑے ظالم تھے سو ہم نے

اور اصحاب حجر ان سے (بھی) بدلہ لیا (اور ان کو عذاب سے ہلاک کیا) اور دونوں (قوم کی)

بستیاں صاف سڑک پر (واقع) ہیں (اور شام کو جاتے ہوئے راہ میں نظر آتی ہیں) اور حجر

رکبہ حارم والوں نے (بھی) پیغمبروں کو جھوٹا بتلایا (کیونکہ حبیب علیہ السلام کو جھوٹا کہا اور سب پیغمبروں کا

اصل دین ایک ہی ہے تو گویا سب کو جھوٹا بتلایا) اور ہم نے انکو اپنی (طرف) نشانیاں دیں (جس سے اللہ تعالیٰ کی توحید اور

حضرت صالح علیہ السلام کی موت ثابت ہوتی تھی مثلاً دلائل تو حیدر تھا کہ حجرہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا، تو لوگ ان (نشانوں) سے درگزرانی دہی کرتے رہے اور وہ لوگ پہاڑوں کو تراش تراش کر ان میں گھر بناتے تھے کہ ان میں سب آفات سے (امن میں رہیں سو ان کو صبح کے وقت (خواہ اول ہی صبح میں یا دن چڑھے، علی الاحتمالین) آواز سخت نے آچکرا، سو ان کے (دنوی) ہنران کے کچھ بھی کام آئے (ان ہی مستحکم گھروں میں عذاب سے کام تمام ہو گیا، اس آفت سے اُن کے گھروں نے نہ بچایا، بلکہ اس آفت کا ان کو احتمال بھی نہ تھا، اور اگر ہوتا بھی تو کیا کرتے)۔

معارف ومسائل

آیہ، بن یعنی گھنے جنگل کو کہتے ہیں، بعض کہتے ہیں کہ مَدِیْن کے پاس ایک بن تھا، اس لئے ایک اصحاب مَدِیْن ہی کا لقب ہے، بعض نے کہا ہے کہ اصحاب ایکہ اور اصحاب مَدِیْن دو علیحدہ علیحدہ قومیں تھیں، ایک قوم کی ہلاکت کے بعد شعیب علیہ السلام دوسری قوم کی طرف مبعوث ہوئے۔

تفسیر روح المعانی میں ابن عساکر کے حوالہ سے یہ مرفوع حدیث نقل کی گئی ہے کہ: **اِنَّ مَدِیْنَةَ وَاصْحَابِهَا لَا یُکْفَرُ اَمَّتَانِ بَعَثَ اللّٰهُ تَعَالٰی اِلَیْهِمَا شَعِیْبًا**، واللہ اعلم اور حجاز ایک وادی ہے جو حجاز و شام کے درمیان واقع ہے، اس میں قوم ثمود آباد تھی۔ شروع سورت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کفار مکہ کو جو شدید عناد و مخالفت تھی اس کا بیان تھا، اس کے ساتھ اجمالاً آپ کی تسلی کا مضمون بھی ذکر کیا تھا، اب ختم سورت پر اسی عناد و مخالفت کے بارے میں آپ کی تسلی کے لئے تفصیلی مضمون بیان کیا جا رہا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: **بَقِیَّةُ خَلَاَصَةِ تَفْسِیْرٍ** اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان لوگوں کے عناد و خلاف سے غم نہ کیجئے کیونکہ اس کا ایک روز فیصلہ ہونے والا ہے، اور وہ روز قیامت ہے، جس کی آمد کے متعلق ہم آپ سے تذکرہ کرتے ہیں کہ) ہم نے آسمانوں کو اور زمین کو اور ان کے درمیانی چیزوں کو بغیر مصلحت کے پیدا نہیں کیا (بلکہ اس مصلحت سے پیدا کیا کہ ان کو دیکھ کر صالح عالم کے وجود اور وحدت و عظمت پر استدلال کر کے اس کے احکام کی اطاعت کریں، اور بعد اقامت اس حجت کے جو ایسا نہ کرے وہ معذب ہو) اور (دنیا میں پورا عذاب ہوتا نہیں تو اور کہیں ہونا چاہئے اس کے لئے قیامت مقرر ہے پس) ضرور قیامت آنے والی ہے (وہاں سب کو ہجستایا جائے گا، سو آپ (کچھ غم نہ کیجئے بلکہ) خوبی کے ساتھ (ان کی شرارتوں سے) درگزر کیجئے (درگزر کا مطلب یہ ہے کہ اس غم میں نہ پڑیے، اس کا خیال نہ کیجئے، اور خوبی یہ کہ شکوہ و شکایت بھی نہ کیجئے، کیونکہ

بل شبہ آپ کا رب (چونکہ بڑا خالق رہے اس سے ثابت ہوا کہ بڑا عالم بھی) ہے (سب کا حال اس کو معلوم ہے آپ کے صبر کا بھی ان کی شرارت کا بھی) اس لئے ان سے پورا پورا بدلہ لے لے گا۔

وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ ۝ لَا تَحْزَنْ

اور ہم نے دی ہیں تجھ کو سات آیتیں وقلیفہ اور قرآن بڑے درجہ کا ، مت ڈال اپنی

عَيْنُكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَاهُ أَزْرًا وَأَجَافَتْنَاهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ

آنکھیں ان چیزوں پر جو برتنے کو دیں ہم نے ان میں سے کئی طرح کے لوگوں کو اور نہ غم کھا ان پر

وَأَخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ وَقُلْ إِنِّي أَنَا النَّذِيرُ الْمُبِينُ ۝

اور جھکا اپنے بازو ایمان والوں کے واسطے ، اور کہہ کہ میں وہی ہوں ڈرانے والا کھول کر

كَمَا أَنزَلْنَاهُ عَلَى الْمُقْسِمِينَ ۝ الَّذِينَ جَعَلُوا الْقُرْآنَ عِضِينَ ۝

جیسا ہم نے بھیجا ہے اُن باندھنے والوں پر ، جنہوں نے کیا ہے قرآن کو بوٹیاں ،

فَوَرَبِّكَ لَنَسْأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝

سو قسم ہوتیرے رب کی ہم کو پوچھنا ہوا ان سب سے ، جو کچھ وہ کرتے تھے ،

فَأَصْدَقُ بِمَا نُودِمْ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ ۝ إِنَّا كَفَيْنَاكَ

سو سادے کھول کر جو تجھ کو حکم ہوا اور پردہ نہ کر مشرکوں کی ، ہم بس ہیں تیری طرف سے

الْمُسْتَضِينَ ۝ الَّذِينَ يَجْعَلُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ

ٹھٹھے کرنے والوں کو ، جو کہ ٹھہراتے ہیں اللہ کے ساتھ دوسرے کی بندگی ،

فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ۝ وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرُكَ

سو غریب معلوم کر لیں گے ، اور ہم جانتے ہیں کہ تیرا جی رکتا ہے ان کی

بِمَا يَقُولُونَ ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُن مِّنَ السَّجِدِينَ ۝

باتوں سے ، سو تو یاد کر خوبیاں اپنے رب کی اور ہو سجدہ کرنے والوں سے

وَأَعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّىٰ يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ ۝

اور بندگی کئے جا اپنوں رب کی جب تک آئے تیرے پاس یقینی بات

خلاصہ تفسیر

اور آپ ان کے معاملہ کو نہ دیکھئے کہ موجب غم ہوتا ہے، ہمارا معاملہ اپنے ساتھ دیکھئے، کہ ہماری طرف سے آپ کے ساتھ کس قدر لطف و عنایت ہے چنانچہ ہم نے آپ کو ایک بڑی بھاری نعمت یعنی سات آیتیں دیں جو (نمازیں) مکرر پڑھی جاتی ہیں اور وہ (بوجہ جامع مضامین عظیمہ ہونے کے اس قابل ہے کہ اس کے دینے کو یوں کہا جادے کہ) قرآن عظیم دیا (مراد اس سے سورۃ فاتحہ ہے جس کی عظمت کی وجہ سے اس کا نام اُمّ القرآن بھی ہے، پس اس نعمت اور منعم کی طرف نگاہ رکھئے کہ آپ کا قلب مسرور و مطمئن ہو، ان لوگوں کے عناد و خلاف کی طرف التفات نہ کیجئے اور آپ اپنی آنکھ اٹھا کر بھی اس چیز کو نہ دیکھئے نہ بلحاظ افسوس نہ بلحاظ ناراضگی) جو کہ ہم نے مختلف قسم کے کافروں کو (مثلاً یہود و نصاریٰ جو اس اور مشرکین کو) برتنے کے لئے دے رکھی ہے اور بہت جلد ان سے جدا ہو جائے گی) اور ان (کی حالت کفر) پر دیکھئے (غم نہ کیجئے) بلحاظ ناراضگی نظر کرنے سے یہ مراد ہے کہ چونکہ وہ دشمن خدا ہیں اس لئے بوجہ لجنہ فی اللہ غصہ آئے کہ ایسی قسمیں ان کے پاس نہ ہوتیں، اس کے جواب کی طرف متعنائیں اشارہ ہے کہ یہ کوئی بڑی بھاری دولت نہیں کہ ان مبنیٰ ضمین کے پاس نہ ہوتیں، یہ تو متاراع فانی ہے، بہت جلد جاتا رہے گا، اور بلحاظ افسوس کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ افسوس یہ چیزیں ان کو ایمان سے مانع ہو رہی ہیں، اگر یہ نہ ہوں تو غالباً ایمان لے آتیں، اس کا جواب لا تحزن میں ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ ان کی طینت میں حد درجہ عناد ہے، ان سے کسی طرح توقع نہیں، اور حزن ہوتا ہے خلاف توقع پر جب توقع نہیں تو پھر حزن بے وجہ ہے، اور بلحاظ حرص نظر کرنے کا تو آپ سے احتمال ہی نہیں، غرض یہ کہ آپ کسی بھی طرح ان کفار کے فکر و غم میں نہ پڑتے) اور مسلمانوں پر شفقت رکھئے (یعنی فکر مصلحت اور شفقت کے لئے مسلمان کافی ہیں کہ ان کو اس سے نفع بھی ہے) اور (کافروں کے لئے چونکہ فکر مصلحت کا کوئی نتیجہ نہیں اس لئے ان کی طرف توجہ بھی نہ کیجئے، البتہ تبلیغ جو آپ کا فرض منصبی ہے اس کو ادا کرتے رہئے، اور اتنا کہہ دیجئے کہ میں کلمہ کھلا (تم کو خدا کے عذاب سے) ڈرانے والا ہوں اور خدا کی طرف سے تم کو یہ مضمون پہنچاتا ہوں کہ وہ عذاب جس سے ہمارا نبی ڈراتا ہے ہم تم پر کسی وقت ضرور نازل کریں گے) جیسا ہم نے (وہ عذاب) ان لوگوں پر (مختلف اوقات گذشتہ میں) نازل کیا ہے جنہوں نے (الحکم الہی کے) حقے کر رکھے تھے، یعنی آسمانی کتاب کے مختلف اجزاء قرار دیئے تھے) ان میں جو مرضی کے موافق ہوا مان لیا جو مرضی کے خلاف ہوا اس

انکار کر دیا، مراد اس سے سابق یہود و نصاریٰ ہیں جن پر مخالفتِ انبیاء علیہم السلام کی وجہ سے عذابوں کا ہونا مثل مسخ بصورتِ بندر و خنزیر، قید، قتل اور ذلت مشہور و معروف تھا، مطلب یہ کہ عذاب کا نازل ہونا امر بعید نہیں، پہلے ہو چکا ہے اگر تم پر بھی ہو جائے تو تعجب کی کونسی بات ہے، خواہ وہ عذاب دنیا میں ہو یا آخرت میں، اور جب تقریر مذکور سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جس طرح پہلے لوگ مخالفتِ انبیاء کی وجہ سے عذاب کے مستحق تھے اسی طرح موجودہ لوگ بھی مستحق عذاب ہو گئے ہیں) سو (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو) آپ کے پروردگار کی (یعنی اپنی) قسم ہم ان سب (انگلوں اور پھیلوں) سے ان کے اعمال کی (قیامت کے روز) ضرور باز پرس کریں گے (پھر ہر ایک کو اس کے مناسب سزا دیں گے) غرض (حاصل کلام یہ کہ) آپ کو جس بات (کے پہنچانے کا حکم کیا گیا ہے اس کو) (تو) صاف صاف سنا دیجئے اور (اگر یہ نہ مانیں تو) ان مشرکوں (کے ذمہ) کی (مطلق) پروا نہ کیجئے (یعنی غم نہ کیجئے، جیسا اوپر آیا ہے لَا تَحْزَنْ، اور نہ طبعی طور پر خوف کیجئے کہ یہ مخالفتِ بہت سے ہیں کیونکہ) یہ لوگ جو (آپ کے اور خدا کے مخالف ہیں) چنانچہ آپ پر تو (جنتے ہیں) اور (اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرا معبود قرار دیتے ہیں ان کے شر و ایذا) سے آپ (کو محفوظ رکھنے) کے لئے (اور ان سے بدلہ لینے کے لئے) ہم کافی ہیں، سو ان کو ابھی معلوم ہوا جاتا ہے کہ ہتھڑا اور شرک کا کیا انجام ہوتا ہے، غرض جب ہم کافی ہیں پھر کاتے کا خوف ہی) اور واقعی ہم کو معلوم ہے کہ یہ لوگ جو (کفر و استہزاء کی باتیں کرتے ہیں اس سے آپ تنگ دل ہوتے ہیں) کہ یہ طبعی بات ہے) سو (اس کا علاج یہ ہے کہ) آپ اپنے پروردگار کی تسبیح و تحمید کرتے رہئے اور نمازیں پڑھنے والوں میں رہئے، اور اپنے رب کی عبادت کرتے رہئے یہاں تک کہ (اسی حالت میں) آپ کو موت آجائے (یعنی مرتے دم تک) کر و عباد میں مشغول رہئے، کیونکہ ذکر اللہ اور عبادت میں آخرت کے اجر و ثواب کے علاوہ یہ نصیبت بھی ہے کہ دنیا میں جب انسان اس طرف لگ جاتا ہے تو دنیا کے رنج و غم اور تکلیف و مصیبت ہلکی ہو جاتی ہے۔

معارف و مسائل

سورۃ فاتحہ پورے قرآن | ان آیات میں سورۃ فاتحہ کو قرآن عظیم کہنے میں اس طرف اشارہ ہے
کا متن اور خلاصہ ہے | کہ سورۃ فاتحہ ایک حیثیت سے پورا قرآن ہی، کیونکہ اصول اسلام سب

اس میں سموتے ہوئے ہیں۔

مفسرین سوال کس چیز کا ہوگا | آیت مذکورہ میں حق تعالیٰ نے اپنی ذات پاک کی قسم کھا کر فرمایا ہے

کہ ان سب انگلوں پھیلوں سے ضرور سوال اور باز پرس ہوگی۔

صحابہ کرام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یہ سوال کس معاملہ کے متعلق ہوگا، تو آپ نے فرمایا قول لا الہ الا اللہ کے متعلق، تفسیر قرطبی میں اس روایت کو نقل کر کے فرمایا ہے کہ ہمارے نزدیک اس سے مراد اس عہد کو عملی طور پر پورا کرنا ہے جس کی علامت کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ ہے، محض زبانی قول مقصود نہیں کیونکہ زبان سے اقرار تو منافقین بھی کرتے تھے، حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ ایمان کسی خاص وضع و نسبت بنانے سے اور دین حسن تمنائیں کرنے سے نہیں بنتا، بلکہ ایمان اس یقین کا نام ہے جو قلب میں ڈال دیا گیا، اور اعمال نے اس کی تصدیق کی ہو، جیسا کہ ایک حدیث میں حضرت زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اخلاص کے ساتھ لا الہ الا اللہ کہے گا وہ ضرور جنت میں جائے گا۔ لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ اس کلمہ میں اخلاص کا کیا مطلب ہے؟ آپ نے فرمایا کہ جب یہ کلمہ انسان کو اللہ کے بخارم اور ناجائز کاموں سے روک دے تو وہ اخلاص کے ساتھ ہے (قرطبی)

تبلیغ و ارشاد میں تدریج | فاصِدًا مِمَّا قَدْ مَرَّ، اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام چھپ چھپ کر عبادت اور تلاوت کرتے تھے، اور تبلیغ و ارشاد کا سلسلہ بھی خفیہ ہی ایک ایک دو دو فرد کے ساتھ جاری تھا، کیونکہ اظہار و اعلان میں کفار کی ایذا رسانی کا خطرہ تھا، اس آیت میں حق تعالیٰ نے استہزاء کرنے والے اور ایذا دینے والے کفار کی ایذا سے محفوظ رکھنے کی خود ذمہ داری لے لی، اس لئے اس وقت بے فکری کے ساتھ اعلان اظہار کے ذریعہ تلاوت و عبادت اور تبلیغ و دعوت کا سلسلہ شروع ہوا۔

اَنَا كَفَيْتُكَ الْمُسْتَعِزِّينَ، میں جن لوگوں کا ذکر ہے، ان کے لیڈر پانچ آدمی تھے، جس بن امل، اسود بن المطلب، اسود بن عبد لیث، ولید بن خیرہ، حارث بن العطلۃ، یہ پانچوں مجرمانہ طور پر ایک ہی وقت میں حضرت جبریلؑ کے اشارے سے ہلاک کر دیئے گئے، اس واقعہ سے تبلیغ و دعوت کے معاملہ میں یہ حاصل ہوا کہ اگر انسان کسی ایسے مقام یا ایسے حال میں مبتلا ہو جائے کہ وہاں حق بات کو علی الاعلان کہنے سے اُن لوگوں کو تو کوئی فائدہ پہنچنے کی توقع نہ ہو اور اپنے آپ کو نقصان و تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہو تو ایسی حالت میں یہ حکم خفیہ طور پر کرنا بھی درست اور جائز ہے، البتہ جب اظہار اعلان کی قدرت ہو جائے تو پھر اعلان میں کوتاہی نہ کی جائے۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اِلٰی فَبَيِّنْهُمْ سے معلوم ہوا کہ جب انسان کو دشمنوں کی باتوں سے بے تشدد کی کا علاج | پہنچنے اور دل تنگی پیش آئے تو اس کا روحانی علاج یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح و عبادت میں مشغول ہو جائے اللہ تعالیٰ خود اس کی تکلیف کو دور فرمادیں گے۔

سورۃ حجر تمام شد

سُورَةُ النَّحْلِ

سُورَةُ النَّحْلِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ مِائَةٌ وَثَمَانُ وَعِشْرُونَ آيَةً وَسِتَّةَ عَشَرَ رُكُوعًا

سورۃ نحل مکہ میں اتری اور اس کی ایک سو اٹھائیس آیتیں ہیں اور سولہ رکوع

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بخیر و برکت ہر بات کا سرچشمہ ہے۔

أَتَىٰ أَمْرَ اللَّهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوهُ سُبْحَنَهُ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ①

آپہنجا حکم اللہ کا سو اس کی جلدی مت کرو، وہ پاک ہو اور برتر ہو ان کے شریک بتلانے سے

يُنْزِلُ الْمَلَائِكَةَ بِالرُّوحِ مِنْ أَمْرِهِ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ

اتارتا ہے فرشتوں کو بھیج دے کر اپنے حکم سے جس پر چاہے اپنے بندوں میں

أَنۢ أَنذِرُوا أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاتَّقُونِ ②

کہ خبردار کرو کہ کسی کی بندگی نہیں سوا میرے، سو مجھ سے ڈرو

خلاصہ تفسیر

اس سورۃ کا نام سورۃ نحل اس مناسبت سے رکھا گیا ہے کہ اس میں نحل یعنی شہد کی مکھیوں کا ذکر قدرت کی عجیب و غریب صنعت کے بیان کے سلسلے میں ہوا ہے، اس کا دوسرا نام سورۃ نحم بھی ہے (قرطبی) نعم بکبرون نعمت کی جمع ہی اس لئے کہ اس سورۃ میں خاص طور پر اللہ جل شانہ کی عظیم نعمتوں کا ذکر ہے۔

خدا تعالیٰ کا حکم (یعنی سزا سے کفر کا وقت قریب) آپہنچا سو تم اس میں (منکرانہ) جلدی مت

مچاؤ (بلکہ توجہ اختیار کرو اور اس کی حقیقت سنو کہ) وہ لوگوں کے شرک سے پاک اور برتر ہے وہ

اللہ تعالیٰ فرشتوں (کی جنس یعنی جبرئیل) کو وحی یعنی اپنا حکم دے کر اپنے بندوں میں جس پر چاہیں (یعنی

انبیاء پر) نازل فرماتے ہیں (اور وہ حکم) یہ ہے کہ لوگوں کو خبردار کرو کہ میرے سوا کوئی لائق عبادت

نہیں سوچے ہی ڈرتے رہو (یعنی میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ ورنہ سزا ہوگی)۔

معارف و مسائل

اس سورۃ کو بغیر کسی خاص تہمید کے ایک شدید وعید اور ہیبت ناک عنوان سے شروع کیا جس کی وجہ مشرکین کا یہ کہنا تھا کہ محمد (ﷺ) ہمیں قیامت سے اور اللہ کے عذاب سے ڈراتے رہتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو غالب کرنے اور مخالفوں کو سزا دینے کا وعدہ کیا ہے، ہمیں تو یہ کچھ بھی ہوتا نظر نہیں آتا، اس کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ ”آپہو نچا حکم اللہ کا تم جلد بازی نہ کرو“

حکم اللہ سے اس جگہ مراد وہ وعدہ ہے جو اللہ نے اپنے رسولؐ سے کیا ہے، کہ ان کے دشمنوں کو زیر و مغلوب کیا جاوے گا، اور مسلمانوں کو فتح و نصرت اور عزت و شوکت حاصل ہوگی، اس آیت میں حق تعالیٰ نے ہیبت ناک لہجہ میں ارشاد فرمایا کہ حکم اللہ کا آپہنچا، یعنی پہونچنے ہی والا ہے جس کو تم عنقریب دیکھ لو گے۔

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس میں حکم اللہ سے مراد قیامت ہے، اس کے آپہونچنے کا مطلب یہی ہے کہ اس کا وقوع قریب ہے، اور پوری دنیا کی عمر کے اعتبار سے دیکھا جائے تو قیامت کا قریب ہونا یا آپہونچنا بھی کچھ بعید نہیں رہتا (بحر محیط)

اس کے بعد کے جملے میں جو یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ شرک سے پاک ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ جو حق تعالیٰ کے وعدہ کو غلط قرار دے رہے ہیں یہ کفر و شرک ہے، اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہیں (بحر)

اس آیت کا خلاصہ ایک وعید شدید کے ذریعہ توحید کی دعوت دینا ہے، دوسری آیت میں دلیل نقل سے توحید کا اثبات ہے، کہ آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک دنیا کے مختلف خطوں، مختلف زمانوں میں جو بھی رسول آیا ہے، اس نے یہی عقیدہ توحید پیش کیا ہے، حالانکہ ایک کو دوسرے کے حال اور تعلیم کی بظاہر اسباب کوئی اطلاع بھی نہ تھی، غور کرو کہ کم از کم ایک لاکھ بیس ہزار حضرات عقلاء جو مختلف اوقات میں مختلف ملکوں مختلف خطوں میں پیدا ہوئے اور وہ سب ایک ہی بات کے قائل ہوں تو فطرۃ انسان یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ بات غلط نہیں ہو سکتی، ایمان لانے کے لئے تنہا یہ دلیل بھی کافی ہے۔

لفظ روح سے مراد اس آیت میں بقول ابن عباس رضی اللہ عنہما اور بقول بعض مفسرین ہدایت ہو (بحر)، اس آیت میں توحید کا دلیلی اور نقلی ثبوت پیش کرنے کے بعد اگلی آیتوں میں اسی عقیدہ توحید کو عقلی طور سے حق تعالیٰ کی نعمتیں پیش نظر

کر کے ثابت کیا جاتا ہے، ارشاد ہے :-

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ط تَعْلٰمَ اَيْشِرْ كُوْن ۝۳ خَلَقَ

بنائے آسمان اور زمین ٹھیک ٹھیک وہ برتر ہر ان کے شریک بتلانے سے، بنایا

اِلٰ نَسٰنٍ مِّنْ لُّطْفِهٖ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۝۴ وَالْاَنْعَامَ

آدمی کو ایک بلند سے پھر جب ہی ہو گیا جگڑا کر نیوالا بولنے والا، اور چوپائے

خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَمَنْفَعٌ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝۵ وَلَكُمْ

بنادیتے تمھارے واسطے ان میں بڑا اول ہر اور کتنے فائدے اور بعضوں کو کھاتے ہو، اور تم کو

فِيْهَا جَمَالٌ ۚ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَّحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ۝۶ وَتَحْمِلُ

ان سے عورت ہر جب شام کو چرا کر لاتے ہو اور جب چرانے لجاتے ہو، اور اٹھائے چلتے ہیں

اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا اَبْلَغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ اِلٰ نَفْسٍ ط

بوجھ تمھارے ان شہروں تک کہ تم نہ پہنچتے وہاں مگر جان مار کر،

اِنَّ رَبَّكُمْ لَسَرَّوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝۷ وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ

بیشک تمھارا رب بڑا شفقت کر نیوالا ہر بان ہر، اور گھوڑے پیدا کئے اور بھریں اور گدھے

لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً ط وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۸

کہ ان پر سوار ہو اور زینت کے لئے اور پیدا کرتا ہے جو تم نہیں جانتے

لغات کی تشریح | خَصِيْمٌ، خصومت سے مشتق ہے، بمعنی جھگڑاوا، اَنْعَامٌ، نَعْمٌ رَّبْفِخْ نُونِ

کی جمع ہے، چوپایوں میں سے اونٹ، بکری، گائے کو کہا جاتا ہے (مفردات راغب)

دِفْءٌ، گرمی اور گرمائی حاصل کرنے کی چیز، مراد اُون ہے، جس کے گرم کپڑے بنائے

جاتے ہیں، تُرِيْحُوْنَ، رواج سے اور تَسْرَحُوْنَ ہر راج سے مشتق ہے، چوپائے جانوروں کے صبح

کے وقت چراگاہ کی طرف جانے کو ہر راج اور شام کو گھر میں واپس آنے کو رواج کہا جاتا ہے،

بَشِقِّ اِلَّا نَفْسٌ، جان کی محنت و مشقت۔

خلاصہ تفسیر

(اللہ تعالیٰ نے) آسمانوں کو اور زمین کو حکمت سے بنایا وہ ان کے شرک سے پاک ہے (اور) انسان کو لطفہ سے بنایا پھر وہ اچانک کھلم کھلا (خدا ہی کی ذات و صفات میں) جھگڑنے لگا (یعنی بعض ایسے بھی ہوئے، مطلب یہ ہے کہ ہماری یہ نعمتیں اور انسان کی طرف سے ناشکری) اور اسی نے چوپایوں کو بنایا، ان میں تمھارے جاڑے کا بھی سامان ہے (جانوروں کے بال اور کھال سے انسان کے پوشین اور کپڑے بنتے ہیں) اور بھی بہت سے فائدے ہیں (دودھ، سواری، بار بڑاری وغیرہ) اور ان میں (جو کھانے کے قابل ہیں ان کو) کھاتے بھی ہو اور ان کی وجہ سے تمھاری رونق بھی ہو جب کہ شام کے وقت (جنگل سے گھر) لاتے ہو اور جب کہ صبح کے وقت (گھر سے جنگل کو) چھوڑ دیتی ہو اور وہ تمھارے بوجھ بھی (لا دکر) ایسے شہر کو لے جاتے ہیں جہاں تم بدون جان کو منت میں ڈالے ہو کہ نہیں پہنچ سکتے، واقعی تمھارا رب بڑی شفقت و رحمت والا ہے کہ تمھارے آرام کے لئے کیا کیا سامان پیدا کئے (اور گھوڑے اور چمچ اور گدھے بھی پیدا کئے تاکہ ان پر سوار ہو اور نیز زینت کے لئے بھی، اور وہ ایسی ایسی چیزیں (تمھاری سواری وغیرہ کے لئے) بناتا ہے جن کی تم کو خبر بھی نہیں ہے

معارف و مسائل

ان آیتوں میں تخلیق کائنات کی عظیم نشانیوں سے حق تعالیٰ کی توحید کا اثبات ہے، اول تو سب سے پہلی مخلوق آسمان اور زمین کا ذکر فرمایا اس کے بعد تخلیق انسان کا ذکر فرمایا جس کو اللہ تعالیٰ نے مخلوق کائنات بنایا ہے، انسان کی ابتداء ایک حقیر لطفہ سے ہونا بیان کر کے فرمایا **فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مِّبْيْنٌ**، یعنی جب اس ضعیف الخلق انسان کو طاقت اور قوت گویائی عطا ہوئی تو خدا ہی کی ذات و صفات میں جھگڑے نکالنے لگا۔

انسان کے بعد ان اشیاء کی تخلیق کا ذکر فرمایا جو انسان کے فائدے کے لئے خصوصی طور پر بنائی گئی ہیں، اور قرآن کے سب سے پہلے مخاطب چونکہ عرب تھے، اور عرب کی عیشت کا بڑا مدار پالتو چوپاؤں اونٹ، گائے، بکری پر تھا، اس لئے پہلے ان کا ذکر فرمایا **وَالْاَنْعَامَ خَلَقْنَا** پھر **الْاَنْعَامُ** سے جو فوائد انسان کو حاصل ہوتے ہیں ان میں سے دو فائدے خاص طور سے بیان کر دیئے، ایک **لَكُمْ فِيْهَا دِيْنٌ**، یعنی ان جانوروں کے اڈن سے انسان اپنے کپڑے اور کھال سے پوشین اور ٹوپیاں وغیرہ تیار کر کے جاڑے کے موسم میں گرمائی حاصل کرتا ہے۔ دوسرا فائدہ **وَمِنْهَا قُلُوبٌ**، یعنی انسان ان جانوروں کو ذبح کر کے اپنی خوراک بھی

بنا سکتا ہے، اور جب تک زندہ ہے ان کے دودھ سے اپنی بہترین غذا پیدا کرتا ہے، دودھ دہی مکھن، گھی اور ان سے بننے والی تمام اشیاء اس میں داخل ہیں۔

اور باقی عام فوائد کے لئے فرمادیا **وَمِنْ مَّا فَعَّمْ**، یعنی بے شمار منافع اور فوائد انسان کے جانوروں کے گوشت، چرٹے، بڑی، اور بالوں سے وابستہ ہیں، اس ابہام و اجمال میں ان سب نئی سے نئی ایجادات کی طرف بھی اشارہ ہے جو حیوانی اجزاء سے انسان کی غذا، لباس، دوا، استعمالی اشیاء کے لئے اب تک ایجاد ہو چکی ہیں، یا آئندہ قیامت تک ہوں گی۔

اس کے بعد ان چوپایہ جانوروں کا ایک اور فائدہ عرب کے مذاق کے مطابق یہ بیان کیا گیا کہ وہ تمھارے لئے جمال اور رونق کا ذریعہ ہیں، خصوصاً جب وہ شام کو چراگا ہوں سے تمھارے مولشی خانوں کی طرف آتے ہیں یا صبح کو گھروں سے چراگا ہوں کی طرف جاتے ہیں، کیونکہ اس وقت مولشی سے ان کے مالکان کی خاص شان و شوکت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

آخر میں ان جانوروں کا ایک اور اہم فائدہ یہ بیان کیا کہ یہ جانور تمھارے بوجھل سامان دور دراز شہروں تک پہنچا دیتے ہیں جہاں تمھاری اور تمھارے سامان کی رسائی جان جو کموں میں ڈالے بغیر ممکن نہ تھی، اونٹ اور بیل خاص طور سے انسان کی یہ خدمت بڑے پیمانے پر انجام دیتے ہیں، آج ریل گاڑیوں، ٹرکوں، ہوائی جہازوں کے زمانے میں بھی انسان ان جانوروں سے مستغنی نہیں، کتنے مقامات دنیا میں ایسے ہیں جہاں یہ تمام فوائد سواریاں باربرداری کا کام نہیں دے سکتیں وہاں پھر انہی کی خدمات حاصل کرنے پر انسان مجبور ہوتا ہے۔

أَنْعَامٌ یعنی اونٹ اور بیل وغیرہ کی باربرداری کا ذکر آیا تو اس کے بعد ان چوپایہ جانوروں کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوا جن کی تخلیق ہی سواری اور باربرداری کے لئے ہے، ان کے دودھ یا گوشت سے انسان کا فائدہ تعلق نہیں، کیونکہ از روئے شرع وہ اخلاقی بیماریوں کا سبب ہونے کی وجہ سے ممنوع ہیں، فرمایا:

وَالْخَيْلَ وَالْبِخَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً، یعنی ہم نے گھوڑے،

خیر، گدھے پیدا کئے، تاکہ تم ان پر سوار ہو سکو، اس میں باربرداری بھی ضمناً آگئی، اور ان کو اس لئے بھی پیدا کیا کہ یہ تمھارے لئے زینت بنیں، زینت سے وہی شان و شوکت مراد ہے جو عرفاً ان جانوروں کے مالکان کو دنیا میں حاصل ہوتی ہے۔

قرآن میں ریل موٹر | آخر میں سواری کے تین جانور گھوڑے، خیر، گدھے کا خاص طور سے بیان کرنے ہوائی جہاز کا ذکر | کے بعد دوسری قسم کی سواریوں کے متعلق بصیغہ استقبال فرمایا۔

وَيَخْلُقُ مَا لَا تَحْكُمُونَ، یعنی اللہ تعالیٰ پیدا کرے گا وہ چیزیں جن کو تم نہیں جانتے۔

اس میں وہ تمام نو ایجاد سواری گاڑیاں بھی داخل ہیں جن کا زمانہ قدیم میں نہ وجود تھا نہ کوئی تصور، مثلاً ریل، موٹر، ہوائی جہاز وغیرہ جو اب تک ایجاد ہو چکے ہیں اور وہ تمام چیزیں بھی اس میں داخل ہیں جو آئندہ زمانے میں ایجاد ہوں گی، کیونکہ تخلیق ان سب چیزوں کی درحقیقت خالق مطلق ہی کا فعل ہے، سائنس قدیم و جدید کا اس میں صرف اتنا ہی کام ہے کہ قدرت کی پیدا کی ہوئی دھاتوں میں قدرت ہی کی دی ہوئی عقل و فہم کے ذریعہ جوڑ توڑ کر کے ان کے مختلف کھل پُرزے بنالے، اور پھر اس میں قدرت الہیہ کی بخشی ہوئی ہوا، پانی، آگ وغیرہ سے برقی رو پیدا کر لے، یا قدرت ہی کے دیئے ہوئے خزانوں میں سے پیٹرول نکال کر ان سواریوں میں استعمال کر لے، سائنس قدیم و جدید مل کر بھی نہ کوئی لوہا، پیتل پیدا کر سکتی ہے، نہ ایلومینیم قسم کی ہلکی دھاتیں بنا سکتی ہے، نہ لکڑی پیدا کر سکتی ہے، نہ ہوا اور پانی پیدا کرنا اس کے بس میں ہے، اس کا کام اس سے زائد نہیں کہ قدرت الہیہ کی پیدا کی ہوئی قوتوں کا استعمال سمجھ لے، دنیا کی ساری ایجادات صرف اسی استعمال کی تفصیل ہیں، اس لئے جب ذرا بھی کوئی غور و فکر سے کام لے تو ان سب نئی ایجادات کو تخلیق خالق مطلق کہنے اور تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہیں۔

یہاں یہ بات خاص طور سے قابلِ نظر ہے کہ پچھلی تمام اشیاء کی تخلیق میں لفظ ماضی خَلَقَ استعمال فرمایا گیا ہے، اور معروف سواریوں کا ذکر کرنے کے بعد بصیغہ مستقبل یَخْلُقُ ارشاد ہوا ہے، اس تغیر عنوان سے واضح ہو گیا کہ یہ لفظ ان سواریوں اور دوسری اشیاء کے متعلق ہے جو ابھی معرض وجود میں نہیں آئیں، اور اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ اگلے زمانے میں کیا کیا سواریاں اور دوسری اشیاء پیدا کرنا ہیں، ان کا اظہار اس مختصر جملے میں فرمادیا۔

حق جل شانہ یہ بھی کر سکتے تھے کہ آئندہ وجود میں آنے والی تمام نئی ایجادات کا نام لیکر ذکر فرمادیتے، مگر اس زمانے میں اگر ریل، موٹر، طیارہ وغیرہ کے الفاظ ذکر بھی کر دیتے جاتے، تو اس سے بجز تشویش ذہن کے کوئی فائدہ نہ ہوتا، کیونکہ ان اشیاء کا اُس وقت تصور کرنا بھی لوگوں کے لئے آسان نہ تھا، اور نہ یہ الفاظ ان چیزوں کے لئے اس وقت کہیں مستعمل ہوتے تھے، کہ اس سے کچھ مفہوم سمجھا جاسکے۔

میرے والد ماجد حضرت مولانا محمد حسین صاحب نے فرمایا کہ ہمارے استاذ اذکرہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نافو تو یہی فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کریم میں ریل کا ذکر موجود ہے، اور اسی آیت سے استدلال فرمایا، اس وقت تک موٹرس عام نہ ہوئی تھیں اور ہوائی جہاز ایجاد

نہ ہوئے تھے اس لئے ریل کے ذکر پر اکتفا فرمایا۔

مسئلہ: قرآن کریم نے اَوَّلُ الْاَنْعَامِ یعنی اونٹ، گائے، بکری کا ذکر فرمایا، اور ان کے فوائد میں سے ایک اہم فائدہ ان کا گوشت کھانا بھی قرار دیا، پھر اس سے الگ کر کے فرمایا:

وَالْخَيْلَ وَالْبِخَالَ وَالْحَمِيرَ، ان کے فوائد میں سواری لینے اور ان سے اپنی زینت حاصل کرنے کا تو ذکر کیا، مگر گوشت کھانے کا یہاں ذکر نہیں کیا، اس میں یہ دلالت پائی جاتی ہے کہ گھوڑے، خچر، گدھے کا گوشت حلال نہیں، پھر اور گدھے کا گوشت حرام ہونے پر تو جمہور فقہاء کا اتفاق ہے اور ایک مستقل حدیث میں ان کی حرمت کا صراحتہ بھی ذکر آیا ہے، مگر گھوڑے کے معاملہ میں حدیث کی دو روایتیں متعارض آئی ہیں، ایک سے حلال اور دوسری سے حرام ہونا معلوم ہوتا ہے، اسی لئے فقہائے امت کے اقوال اس مسئلے میں مختلف ہو گئے، بعض نے حلال قرار دیا بعض نے حرام، امام اعظم ابو حنیفہ نے اسی تعارض دلائل کی وجہ سے گھوڑے کے گوشت کو گدھے اور خچر کی طرح حرام تو نہیں کہا مگر مکروہ قرار دیا (احکام القرآن جصاص)۔

مسئلہ: اس آیت سے جمال اور زینت کا جواز معلوم ہوتا ہے، اگرچہ تفاخر و تکبر حرام ہیں، فرق یہ ہے کہ جمال اور زینت کا حاصل اپنے دل کی خوشی یا اللہ تعالیٰ کی نعمت کا اظہار ہوتا ہے نہ دل میں اپنے کو اس نعمت کا مستحق سمجھتا ہے اور نہ دوسروں کو حقیر جانتا ہے، بلکہ حق تعالیٰ کا عطیہ اور انعام ہونا اس کے پیش نظر ہوتا ہے، اور تکبر و تفاخر میں اپنے آپ کو اس نعمت کا مستحق سمجھنا، دوسروں کو حقیر سمجھنا پایا جاتا ہے وہ حرام ہے (بیان القرآن)۔

وَعَلَى اللَّهِ قَصْدُ السَّبِيلِ وَمِنْهَا جَائِرٌ وَكَوْشَاءٌ لَهْدَكُمْ

اور اللہ تک پہنچتی ہو سیدھی راہ اور بعضی راہ کج بھی ہو اور اگر وہ چاہے تو سیدھی راہ

اجْمَعِينَ ۹

دے تم سب کو۔

خلاصہ تفسیر

اور (دلائل مذکورہ سابقہ و لاحقہ سے جو) سیدھا رستہ (دین کا ثابت ہوتا ہے وہ خاص) اللہ

تک پہنچتا ہے اور بعضے رستے (جو کہ دین کے خلاف ہیں) ٹیڑھے بھی ہیں کہ ان سے اللہ تک رسائی ممکن نہیں، پس بعض تو سیدھے رستہ پر چلتے ہیں اور بعض ٹیڑھے پر (اور اگر خدا چاہتا تو تم سب کو

(منزل) مقصود تک پہنچا دیتا مگر وہ اسی کو پہنچاتے ہیں جو صراطِ مستقیم کا طالب بھی ہو وَالَّذِينَ جَاءُوا
فِيْنَا لَنَمُنِّيَنَّهُمْ سُبُلَنَا، اس لئے تم کو چاہئے کہ دلائل میں غور کرو اور ان سے حق کو طلب کرو کہ تم کو
منزل مقصود تک رسائی عطا ہو)

معارف و مسائل

ان آیات میں اللہ جل شانہ کی عظیم شان نعمتوں کا ذکر فرما کر توحید کے عقلی دلائل جمع
کئے گئے، آگے بھی انہی نعمتوں کا ذکر ہے، درمیان میں یہ آیت بطور جملہ معترضہ کے اس بات پر
تنبیہ کرنے کے لئے لائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی وعدہ قدیمہ کی بناء پر اپنے ذمہ لے لیا ہے کہ لوگوں
کے لئے وہ صراطِ مستقیم واضح کر دے جو اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والا ہے، اسی لئے نعماءِ الہیہ کو پیش
کر کے اللہ تعالیٰ کے وجود اور توحید کے دلائل جمع کئے جا رہے ہیں۔

لیکن اس کے برخلاف کچھ لوگوں نے دوسرے ٹیڑھے راستے بھی اختیار کر رکھے ہیں، وہ ان
تمام واضح آیات اور دلائل سے کچھ فائدہ نہیں اٹھاتے بلکہ گمراہی میں بھٹکتے رہتے ہیں۔

پھر ارشاد فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتے کہ سب کو سیدھے راستہ پر مجبور کر کے ڈال دیں،
تو ان کے اختیار میں تھا، مگر حکمت و مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ جبر نہ کیا جائے، دونوں راستے سامنے
کر دیئے جائیں، چلنے والا جس راستہ پر چلنا چاہے چلا جائے، صراطِ مستقیم اللہ تعالیٰ اور جنت
تک پہنچائے گا، اور ٹیڑھے راستے جہنم پر پہنچائیں گے، انسان کو اختیار دیدیا کہ جس کو چاہے
انتخاب کر لے۔

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً لَّكُمْ مِنْهُ شَرَابٌ وَمِنْهُ شَجَرٌ

وہی ہے جس نے آسمان سے تمہارے لئے پانی اس سے پیتے ہو اور اسی سے درخت ہوتے

فِيهِ تَسْمُونٌ ① يَبْنِي لَكُمْ بِهِ الرُّعُ وَالزَّيْتُونَ وَالنَّخِيلَ

میں جس میں چراتے ہو، اُگاتا ہے تمہارے واسطے اس سے کھیتی اور زیتون اور کھجوریں

وَالْأَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّمَنْ

اور انگور اور ہر قسم کے میوے، اس میں البتہ نشانی ہے اُن لوگوں کو

يَتَفَكَّرُونَ ② وَسَخَّرَ لَكُمْ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ

جو غور کرتے ہیں، اور تمہارے کام میں لگا دیا رات اور دن اور سورج اور چاند کو

وَالنَّجُومُ مَسْحَرَاتٌ بِّأَمْرِهِ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿۱۲﴾

اور ستارے کام میں لگے ہیں اس کے حکم سے اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کو جو سمجھ رکھتے ہیں ،

وَمَا ذَرَأْتُمْ فِي الْأَرْضِ مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً

اور جو بیجیں پھیلاتیں تمھارے واسطے زمین میں رنگ برنگ کی اس میں نشانی ہے اُن

لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿۱۳﴾ وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لَنَا كُلَّوَاِمْنَهُ لَحْمًا

لوگوں کو جو سوچتے ہیں ، اور وہی ہے جس نے کام میں لگا دیا دریا کو کہ کھاد اس میں سے گوشت

طریا و تَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَازِجَ

تازہ اور نکالو اس میں سے گہنا جو پہنتے ہو ، اور دیکھتا ہو تو کشتیوں کو چلتی ہیں پانی

فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلِعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۱۴﴾ وَالْقَلَىٰ

پھاڑ کر اس میں اور اس واسطے کہ تلاش کرو اس کے فضل سے اور تاکہ احسان مانو ، اور رکھ دیئے

فِي الْأَرْضِ رَوَاسِي أَنْ تُبِيدَ بِكُمْ وَآَنْهَارًا وَسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ

زمین پر بوجھ کہ کہیں ٹھک پڑے تم کوئے کر اور بنائیں ندیاں اور راستے تاکہ تم

تَهْتَدُونَ ﴿۱۵﴾ وَعَلَّمَتْ بِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ ﴿۱۶﴾

راہ پاؤ ، اور بنائیں علامتیں اور ستاروں سے لوگ راہ پاتے ہیں

خلاصہ تفسیر

وہ (اللہ) ایسا ہے جس نے تمھارے (فائدہ کے) واسطے آسمان سے پانی برسایا جس سے

تم کو پینے کو ملتا ہے اور جس (کے سبب) سے درخت (پیدا ہوتے) ہیں، جن میں تم اپنے مویشی

کو (چرنے چوڑ دیتے ہو) اور (اس پانی) سے تمھارے (فائدے کے) لئے کھیتی اور زمینوں اور

کھجور اور انگور اور ہر قسم کے پھل زمین سے (اگاتا ہے بیشک اس (مذکور) میں سوچنے والوں کے

لئے (توحید کی) دلیل (موجود) ہے اور اس (اللہ) نے تمھارے (فائدہ کے) لئے رات اور دن

اور سورج اور چاند کو (اپنا) مسخر (قدرت) بنایا اور (اسی طرح اور) ستارے (بھی) اس کے حکم

سے مسخر (قدرت) ہیں بیشک اس (مذکور) میں (بھی) عقلمند لوگوں کے لئے (توحید کی) چند دلیلیں

(موجود ہیں اور) اسی طرح ان چیزوں کو بھی مسخر (قدرت) بنایا جن کو تمھارے (فائدہ کیلئے)

اس طور پر پیدا کیا ہے کہ ان کے اقسام (یعنی اجناس و انواع و اصناف) مختلف ہیں (اس میں تمام حیوانات و نباتات و جمادات، مفردات و مرکبات داخل ہو گئے) بیشک اس (مذکور) میں رکبی (بجھدار لوگوں کے لئے توحید کی) دلیل (موجود) ہے اور وہ (اللہ) ایسا ہے کہ اس نے دریا کو (کئی مسخر (قدرت) بنایا تاکہ اس میں سے تازہ تازہ گوشت (یعنی پھل نکال نکال کر) کھاؤ اور (تاکہ) اس میں سے (موتیوں کا) گہنا نکالو جس کو تم (مرد و عورت سب) پہنتے ہو اور (اے مخاطب اس دریا کا ایک یہ بھی فائدہ ہے کہ) تو کشتیوں کو (خواہ چھوٹی ہوں یا بڑی جیسے بڑے جہاز تو ان کو) دیکھتا ہے کہ اس (دریا) میں (اس کا) پانی چیرتی ہوئی چلی جا رہی ہیں اور (نیز اس لئے دریا کو مسخر قدرت بنایا) تاکہ تم (اس میں مال تجارت لے کر سفر کرو اور اس کے ذریعہ سے) خدا کی روزی تلاش کرو اور تاکہ (ان سب فائدوں کو دیکھ کر اس کا) شکر (ادا) کرو اور اس نے زمین میں پہاڑ رکھ دیئے تاکہ وہ (زمین) تم کو لے کر ڈھنگاٹے (اور ملنے) نہ لگے اور اس نے (چھوٹی چھوٹی) نہریں اور رستے بنائے تاکہ (ان رستوں کے ذریعہ سے اپنے) منزل مقصود تک پہنچ سکو اور (ان رستوں کی پہچان کے لئے) بہت سی نشانیاں بنائیں (جیسے پہاڑ درخت، تعمیرات وغیرہ جن سے رستہ پہچانا جاتا ہے ورنہ اگر تمام زمین کی سطح یکساں حالت پر ہوتی تو رستہ ہرگز نہ پہچانا جاتا) اور ستاروں سے بھی لوگ رستہ معلوم کرتے ہیں (چنانچہ ظاہر و معلوم ہے)۔

معارف و مسائل

مِنْهُ شَجَرٌ فِيهِ تُسِيمُونَ، لفظ شجر اکثر درخت کے لئے بولا جاتا ہے، جو ساق یعنی تنے پر کھڑا ہوتا ہے، اور کبھی مطلق زمین سے اُگنے والی ہر چیز کو بھی شجر کہتے ہیں، گھاس اور بیل وغیرہ بھی اس میں داخل ہوتی ہیں، اس آیت میں یہی معنی مراد ہیں، کیونکہ آگے جانوروں کے چرانے کا ذکر ہے، اس کا تعلق زیادہ تر گھاس ہی سے ہے۔

تُسِيمُونَ، اسامت سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں جانور کو چراگاہ میں چرنے کیلئے چھوٹنا۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ، ان تمام آیات میں نعمات الہیہ اور عجیب و غریب حکمت کے ساتھ تخلیق کائنات کا ذکر ہے، جس میں غور و فکر کرنے والوں کو ایسے دلائل اور شواہد ملتے ہیں کہ ان سے حق تعالیٰ کی توحید کا گویا مشاہدہ ہونے لگتا ہے، اسی لئے ان نعمتوں کا ذکر کرتے کرتے بار بار اس پر متنبہ کیا گیا ہے، اس آیت کے اخیر میں فرمایا کہ اس میں سوچنے والوں کے لئے دلیل ہے، کیونکہ کھیتی اور درخت اور ان کے پھل پھول وغیرہ کا تعلق اللہ جل شانہ کی صنعت و حکمت کے ساتھ کسی قدر غور و فکر چاہتا ہے، کہ آدمی یہ سوچے کہ دانہ یا گٹھلی زمین کے

اندھ لٹنے سے اور پانی دینے سے تو خود بہ خود یہ نہیں ہو سکتا کہ اس میں سے ایک عظیم الشان درخت نکل آئے اور اس پر رنگارنگ کے پھول لگنے لگیں، اس میں کسی کا مشترک کار زمیندار کے عمل کا کوئی دخل نہیں، یہ سب قادر مطلق کی صنعت و حکمت سے وابستہ ہی، اور اس کے بعد لیل و نہار اور ستاروں کا اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع چلنے کا ذکر آیا تو آخر میں ارشاد فرمایا:

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝ یعنی ان چیزوں میں چند دلائل ہیں عقل والوں کے لئے، اس میں اشارہ اس کی طرف ہے کہ ان چیزوں کا حکم الہی کا مسخر ہونا ایسا ظاہر ہے کہ اس میں بہت کچھ غور فکر کی ضرورت نہیں، جسکو ذرا بھی عقل ہو گی وہ سمجھ لے گا، کیونکہ نباتات اور درختوں کے اگانے میں تو بظاہر کچھ نہ کچھ انسانی عمل کا دخل تھا بھی یہاں وہ بھی نہیں۔

اس کے بعد زمین کی دوسری مختلف انواع و اقسام کی پیداوار کا ذکر فرما کر فرمایا:-

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَذَكَّرُونَ ۝ کہ اس میں دلیل ہے ان لوگوں کے لئے جو نصیحت پکڑتے ہیں و مراد یہ ہے کہ یہاں بھی بہت گہرے فکر و نظر کی ضرورت نہیں، کیونکہ اس کی دلالت بالکل مکمل ہوتی ہے، مگر بشرط یہ ہے کہ کوئی اس کی طرف توجہ سے دیکھے، اور نصیحت حاصل کرے، ورنہ بیوقوف بے فکر آدمی جو ادھر دھیان ہی نہ دے اس کو اس سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔

تَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ ۝ رات اور دن کو مسخر بنانے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو انسان کے کام میں لگانے کے لئے اپنی قدرت کا مسخر بنادیا، کہ رات انسان کو آرام کے سامان مہیا کرتی ہو اور دن اس کے کام کے راستے ہموار کرتا ہے، ان کے مسخر کرنے کے یہ معنی نہیں کہ رات اور دن انسان کے حکم کے تابع چلیں۔

هُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لَنَا كَلًّا ۝ آسمان و زمین کی مخلوقات اور ان میں انسان کے منافع اور فوائد بیان کرنے کے بعد بحر منیط (سمندر) کے اندر حق تعالیٰ کی حکمت بالغہ سے انسان کے لئے کیا کیا فوائد ہیں ان کا بیان ہے، کہ دریا میں انسان کی خوراک کا کیسا اچھا انتظام کیا گیا ہے کہ پھل کا تازہ گوشت اس کو ملتا ہے۔

لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا ۝ کے الفاظ میں پھل کو تازہ گوشت قرار دینے سے اس طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے کہ دوسرے جانوروں کی طرح اس میں ذبح کرنے کی شرط نہیں وہ گویا بنانا یا گوشت ہے۔

وَتَسَخَّرُ جَوْاِمِئُهُ حَلِيَّةً ۝ یہ دریا کا دوسرا فائدہ بتلایا گیا ہے، کہ اس میں غوطہ لگا کر انسان اپنے لئے جلیہ نکال لیتا ہے، جلیہ کے لفظی معنی زینت کے ہیں، مراد وہ موتی، مونگا اور جواہرات ہیں جو سمندر سے نکلنے میں اور عورتیں ان کے ہار بنا کر گلے میں یا دوسرے طریقوں

سے کانوں میں پہنتی ہیں، یہ زیور اگرچہ عورتیں پہنتی ہیں، لیکن قرآن نے لفظ مذکر استعمال فرمایا
تَلْبَسُوْنَهَا یعنی تم لوگ پہنتے ہو، اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ عورتوں کا زیور پہننا درحقیقت
مردوں ہی کے مفاد کے لئے ہے عورت کی زینت درحقیقت مرد کا حق ہے، وہ اپنی بیوی کو زینت کہتا ہے
اور زیور پہننے پر مجبور بھی کر سکتا ہے، اس کے علاوہ جواہرات کا استعمال مرد بھی انگلیٹھی وغیرہ میں کر سکتے ہیں
وَقَرَى الْفَلَكَ مَوَاجِزَ فَبِئْسَ الْفِتْنَىٰ وَلِيْتَ بَتُّغُوا مِنْ فُجُورٍ، یہ تیسرا فائدہ دریا کا بتلایا گیا ہے
فُجُور کے معنی کشتی، اور مَوَاجِز مآخرہ کی جمع ہے، فخر کے معنی پانی کو چیرنے کے ہیں، مادہ کشتیاں
اور بھری جہاز ہیں جو پانی کی موجوں کو چیرتے ہوئے مسافت طے کرتے ہیں۔

مطلب آیت کا یہ ہے کہ دریا کو اللہ تعالیٰ نے بلاد بعیدہ کے سفر کا راستہ بنایا ہے، دروازے
کے ملکوں میں دریا ہی کے ذریعہ سفر کرنا اور تجارتی مال کی درآمد و برآمد کرنا آسان فرمادیا ہے، اور اس
کو حصول رزق کا عمدہ ذریعہ قرار دیا، کیونکہ دریا کے راستہ سے تجارت سب سے زیادہ نفع بخش ہوتی ہے
وَالْفَلَكِ فِي الْأَسْوَاقِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيزَ الْبَحْرَ رَوَاسِيَ، رَاسِیہ کی جمع ہے، بھاری پہاڑ
کو کہا جاتا ہے، تمیز، تمیز مصدر سے مشتق ہے، جس کے معنی ڈمگکانا یا مضطربانہ قسم کی حرکت کرنا،
معنی آیت کے یہ ہیں کہ زمین کے کرہ کو حق تعالیٰ نے بہت سی حکمتوں کے ماتحت ٹکوس اور
متوازن اجزاء سے نہیں بنایا، اس لئے وہ کسی جانب سے بھاری کسی جانب سے ہلکی واقع ہوئی ہو
اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ زمین کو عام فلاسفوں کی طرح ساکن مانا جائے یا کچھ قدیم و جدید فلاسفوں
کی طرح حرکت مستدیرہ کے ساتھ متحرک قرار دیا جائے، دونوں حال میں زمین کے اندر ایک
اضطرابی حرکت ہوتی، جس کو اردو میں کانپنے یا ڈمگانے سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس اضطرابی حرکت
کو روکنے اور اجزاء زمین کو متوازن کرنے کے لئے حق تعالیٰ نے زمین پر پہاڑوں کا وزن رکھ دیا
تاکہ وہ اضطرابی حرکت نہ کر سکے، باقی رہا مستدیرہ حرکت مستدیرہ کا، جیسے تمام سیارات کرتے ہیں
اور قدیم فلاسفہ میں سے فیثاغورث کی یہی تحقیق تھی، اور جدید فلاسفہ سب اس پر متفق ہیں اور
نئے تجربات نے اس کو اور بھی زیادہ واضح کر دیا ہے تو قرآن کریم میں نہ کہیں اس کا اثبات ہے نہ
اس کی نفی، بلکہ یہ اضطرابی حرکت جس کو پہاڑوں کے ذریعہ بند کیا گیا ہے اس حرکت مستدیرہ کے
لئے اور زیادہ معین ہوگی جو سیارات کی طرح زمین کے لئے ثابت کی جاتی ہے، واللہ اعلم

وَعَلَّمَنَّا طَوْقًا بِاللَّجْجِ هُمْ يَكْتُمُونَ، اوپر چونکہ تجارتی سفر کا ذکر آیا ہے تو مناسبت
ہو کہ ان آسائشوں کا بھی ذکر کیا جائے جو حق تعالیٰ نے مسافروں کی قطع مسافت اور منزل مقصود
تک پہنچانے کے لئے زمین و آسمان میں پیدا فرمائی ہیں، اس لئے فرمایا وَعَلَّمَنَّا طَوْقًا، یعنی ہم نے
زمین میں راستہ پہچاننے کے لئے بہت سی علامات پہاڑوں، دریاؤں، درختوں، مکانوں وغیرہ کے

ذریعہ قائم کر دی ہیں، ظاہر ہے کہ اگر زمین ایک سپاٹ کرہ ہوتا تو انسان کسی منزل تک پہنچنے کے لیے کس طرح راستے میں بھٹکتا۔

وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ، یعنی سفر کرنے والے جیسے زمینی علامات سے راستہ پہنچاتے ہیں اس طرح ستاروں کے ذریعے بھی سمت معلوم کر کے راستہ پہچان لیتے ہیں، اس عنوان میں اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ ستاروں کی تخلیق کا اصل مقصد تو کچھ اور ہے، اس کے ساتھ ایک یہ بھی فائدہ ہے کہ ان سے راستے بھی پہچانے جاتے ہیں۔

أَفَسَوْفَ يَخْلُقُ كَمَنْ لَا يَخْلُقُ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿۱۷﴾ وَإِنْ تَعْدُوا

بھلا جو پیہ اگر عو برابر جو اس کے جو کچھ نہ پیدا کرے، کیا تم سوچتے نہیں، اور اگر شمار کرو

نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصَوْهَا إِنَّ اللَّهَ لَعَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۱۸﴾ وَاللَّهُ يَعْلَمُ

اللہ کی نعمتوں کو نہ پورا کر سکو گے ان کو، بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے، اور اللہ تعالیٰ جانتا اور

مَا تَسْرُونَ وَمَا تَعْلَمُونَ ﴿۱۹﴾ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ

جو تم پھیلاتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو، اور جن کو پکارتے ہیں اللہ کے سوائے

اللَّهُ لَا يَخْلُقُونَ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ ﴿۲۰﴾ أَمْ أَلِاتٌ غَيْرُ أَحْيَاءٍ

کچھ پیدا نہیں کرتے اور وہ خود پیدا کئے ہوئے ہیں، مٹتے ہیں جن میں جان نہیں

وَمَا يَشْعُرُونَ أَتَىٰ أَنْ يُبْعَثُونَ ﴿۲۱﴾ إِلَهُكُمُ اللَّهُ وَاحِدٌ

اور نہیں جانتے کب اٹھائے جائیں گے، معبود تمہارا معبود ہے اکیلا،

فَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ قُلُوبُهُمْ مُّزَكَّرَةٌ وَهُمْ

سوجن کو یقین نہیں آخرت کی زندگی کا ان کے دل نہیں مانتے اور وہ

مُسْتَكْبِرُونَ ﴿۲۲﴾ لَا جَرَمَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا

مفسر در ہیں، ٹھیک بات ہے اللہ جانتا ہے جو کچھ چھپاتے ہیں اور جو

يُعْلِنُونَ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِينَ ﴿۲۳﴾

کچھ ظاہر کرتے ہیں، بیشک وہ نہیں پسند کرتا غور کرنے والوں کو

خلاصہ تفسیر

سورہ جب اللہ تعالیٰ کا خالق اشیاء مذکور ہونا اور اس میں اس کا منفرد ہونا ثابت ہو چکا تو کیا جو شخص پیدا کرتا ہو (یعنی اللہ تعالیٰ) وہ اس جیسا ہو جاوے گا جو پیدا نہیں کر سکتا (کہ تم دونوں کو معبود سمجھنے لگے تو اس میں اللہ تعالیٰ کی اہانت ہے کہ اس کو بتوں کے برابر کر دیا) پھر کیا تم (اتنا بھی) نہیں سمجھتے اور اللہ تعالیٰ نے جو اوپر دلائل توحید میں اپنی نعمتیں بتلاتی ہیں ان پر کیا حصرت ہے وہ تو اس کثرت سے ہیں کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کی (ان) نعمتوں کو گننے لگو تو (کبھی) نہ گن سکو (مگر مشہدین شکر اور قدر نہیں کرتے اور یہ جرم اتنا عظیم تھا کہ نہ معاف کرانے سے معاف ہوتا اور نہ اصرار پر آگ کو یہ نعمتیں ملتیں لیکن) واقعی اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے بڑی رحمت والے ہیں (کہ کوئی شرک سے توبہ کرے تو مغفرت ہو جاتی ہے اور نہ کرے جب بھی تمام نعمتیں حیات تک منقطع نہیں ہوتیں) اور رہاں نعمتوں کے فائق ہونے سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ کبھی سزا نہ ہوگی، بلکہ آخرت میں سزا ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہارے پوشیدہ اور ظاہری احوال سب جانتے ہیں (پس ان کے موافق سزا دیں گے یہ تو حق تعالیٰ کے خالق اور منعم ہونے کا بیان تھا) اور جن کی یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں وہ کسی چیز کو پیدا نہیں کر سکتے اور وہ خود ہی مخلوق ہیں (اور اوپر قاعدہ کلیہ ثابت ہو چکا ہے کہ غی خالق اور خالق مساوی نہیں، پس یہ معبودین کیسے مستحق عبادت ہو سکتے ہیں اور) وہ (معبودین) مردے (بے جان) ہیں (خواہ دو اماں جیسے بت یا فی الحال جیسے وہ لوگ جو مرچے ہیں یا فی المسال جو مریں گے مثلاً جن اور عیسیٰ علیہ السلام وغیرہم) زندہ رہنے والے (نہیں) پس خالق تو کیا ہوتے (اور ان (معبودین) کو (اتنی بھی) خبر نہیں کہ (قیامت میں) مردے کب اٹھائے جائیں گے (یعنی بعض کو تو علم ہی نہیں اور بعض کو تعین معلوم نہیں، اور معبود کے لئے علم تو محیط چاہیے، خصوصاً قیامت کا کہ اس پر جزا ہوگی عبادت و عدم عبادت کی تو اس کا علم تو معبود کے لئے بہت ہی مناسب ہے، پس خدا کے برابر تو علم میں کیا ہوں گے، اس تقریر سے ثابت ہوا کہ تمہارا معبود بے حق ایک ہی معبود ہے تو (اس ایضاً حق پر بھی) جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے (اور اسی لئے ان کو ڈر نہیں کہ توحید کو قبول کریں معلوم ہوا کہ) ان کے دل رہی ایسے ناقابل ہیں کہ معقول بات کے (منکر ہو رہے ہیں اور) معلوم ہوا کہ وہ قبول حق سے تکبر کرتے ہیں (اور) ضروری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کے احوال پوشیدہ و ظاہر جانتے ہیں (اور یہ بھی) یقیناً بات ہے کہ اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے (پس جب ان کا تکبر معلوم ہو تو ان کو بھی ناپسند کرینگے اور سزا دیں گے) :

معارف ومسائل

پہلے آیتوں میں اللہ جل شانہ کی نعمتوں کا اور تخلیق کائنات کا مفصل ذکر کرنے کے بعد اس بات پر تنبیہ فرمائی جس کے لئے ان سب نعمتوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اور وہ ہے توحید حق تعالیٰ کی کہ اس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں، اس لئے فرمایا کہ جب یہ ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ ہی تہما زمین و آسمان بنائے، کوہ و دریا بنائے، نباتات و حیوانات بنائے، درخت اور ان کے پھول پھل بنائے تو کیا وہ ذات پاک جو ان سب چیزوں کی خالق ہے ان بتوں کی مانند ہو جائے گی جو کچھ پیدا نہیں کر سکتے، تو کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ مَاذَا أَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿۲۳﴾

اور جب کہ ان سے کہ کیا اتارا ہوا تھا رب نے تو کہیں کہانیاں ہیں پہلوں کی،

لِيَعْمَلُوا أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَمِنْ أَوْزَارِ الَّذِينَ

تاکہ اٹھائیں بوجھ اپنے پورے دن قیامت کے اور کچھ بوجھ ان کے جن کو

يُضِلُّونَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ إِلَّا سَاءَ مَا يَزُرُّونَ ﴿۲۴﴾ قَدْ مَكَرَ الَّذِينَ

بہکاتے ہیں بلا تحقیق ستارہ برا بوجھ ہر جواٹھاتے ہیں، البتہ دغا بازی کر چکے ہیں

مِنْ قَبْلِهِمْ فَأَنَّى اللَّهُ بَنِيَانَهُمْ مِنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ

جو تھے ان سے پہلے پھر بیجا حکم اللہ کا ان کی عمارت پر بنیادوں سے پھر گر پڑی ان پر

السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَأَشْرَقَتْ لَهُمْ السُّيُوفُ ﴿۲۵﴾

چھت اوپر سے اور آیا ان پر عذاب جہاں سے ان کو خبر نہ تھی،

ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَمَةِ يَخْزِيهِمْ وَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَاءُ الَّذِينَ كُنْتُمْ

پھر قیامت کے دن رسوا کرے گا ان کو اور کہے گا کہاں ہیں میرے شریک جن پر تم کو

تَشَاقُّونَ فِيهِمْ قَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ إِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ

بڑی ضد تھی، بولیں گے جن کو دی گئی تھی خبر بیشک رسوائی آج کے دن

وَالشُّعْرَىٰ عَلَى الْكَافِرِينَ ۝۲۰ الَّذِينَ تَتَوَفَّيهِمُ الْمَلَائِكَةُ طَالِمًا

اور بُرائی منکروں پر ہے جن کی جان نکالتے ہیں فرشتے اور وہ بُرا کر رہے ہیں

أَنفُسِهِمْ ۖ فَالْقَوْمَ الشُّعْرَىٰ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوءٍ بَلَىٰ إِنَّ اللَّهَ

اپنے حق میں تب ظاہر کریں گے اطاعت کہ ہم تو کرتے نہ تھے کچھ بُرائی کیوں نہیں اللہ

عَلِيمٌ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝۲۱ فَادْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَلِدِينَ

خوب جانتا ہر جو تم کرتے تھے ، سو داخل ہو دروازوں میں دوزخ کے رہا کر دسا

فِيهَا وَلَبَسَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِينَ ۝۲۲

اسی میں سو کیا بُرا ٹھکانا ہے غرور کرنے والوں کا۔

خلاصہ تفسیر

اور جب ان سے کہا جاتا ہے (یعنی کوئی ناواقف شخص تحقیق کے لئے یا کوئی واقف شخص امتحان کے لئے ان سے پوچھتا ہے) کہ تمہارے رب نے کیا چیز نازل فرمائی ہے (یعنی قرآن جسکو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کا نازل کیا ہوا فرماتے ہیں آیا یہ صیغہ ہے) تو کہتے ہیں کہ (صاحب وہ رب کا نازل کیا ہوا کہاں ہے) وہ تو شخص بے سند ہائیں ہیں جو پہلوں سے (منقول) چلی آرہی ہیں (یعنی اہل ملل پہلے سے توحید و نبوت و معاد کے مدعی ہوتے آئے ہیں ان ہی سے یہ بھی نقل کرنے لگے باقی یہ دعوے خدا کے تعلیم دیئے ہوئے نہیں) نتیجہ اس (کہنے) کا یہ ہو گا کہ ان لوگوں کو قیامت کے دن اپنے گناہوں کا پورا بوجھ اور جن کو یہ لوگ بے علمی سے گمراہ کر رہے تھے ان کے گناہوں کا بھی کچھ بوجھ اپنے اوپر اٹھانا پڑے گا (گمراہ کرنے سے مراد یہی کہنا ہے اَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ کا کیونکہ اس سے دوسرے آدمی کا اعتقاد خراب ہوتا ہے، اور جو شخص کسی کو گمراہ کیا کرتا ہے اس گمراہ کو تو گمراہی کا گناہ ہوتا ہے اور اس گمراہ کرنے والے کو اس کی گمراہی کے سبب بن جانے کا، اس حصہ تسبیب کو کچھ بوجھ فرمایا گیا، اور اپنے گناہ کا کامل طور پر اٹھانا ظاہر ہے) خوب یاد رکھو کہ جس گناہ کو یہ اپنے اوپر لاد رہے ہیں وہ بُرا بوجھ ہے (اور انہوں نے جو گمراہ کرنے کی یہ تدبیر نکالی ہے کہ دوسروں کو ایسی باتیں کر کے بہکاتے ہیں، سو یہ تدبیریں حق کے مقابلہ میں نہ چلیں گی، بلکہ خود انہی پر ان کا وبال نکال دیا کرے گا، چنانچہ جو لوگ ان سے پہلے ہو گزرے ہیں انہوں نے (انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ اور مخالفت میں) بڑی بڑی تدبیریں کیں، سو اللہ تعالیٰ نے ان (کی تدبیروں) کا بننا بنایا گھر جڑ بنیاد

سے ڈھار دیا پھر وہ ایسے ناکام ہوئے جیسے گویا، اوپر سے ان پر (اس گھر کی) چھت آپڑی (ہو یعنی جس طرح چھت آپڑنے سے سب دب کر رہ جاتے ہیں اسی طرح وہ لوگ بالکل خائب و خاسر ہوئے) اور (علاوہ ناکامی کے) ان پر (خدا کا) عذاب ایسی طرح آیا کہ ان کو خیال بھی نہ تھا (کیونکہ توقع تو اس تدبیر میں کامیابی کی تھی خلاف توقع) ان پر ناکامی سے بڑھ کر عذاب آگیا جو کوسوں بھی ان کے ذہن میں نہ تھا، کفار سابقین پر عذابوں کا آنا معلوم و معروف ہے، یہ حالت تو ان کی دنیا میں ہوئی (پھر قیامت کے دن ان کے واسطے یہ ہو گا کہ) اللہ تعالیٰ ان کو رسوا کرے گا اور اس میں سے ایک رسوائی یہ ہو گی کہ ان سے (یہ کہے گا کہ) تم نے جو امیر سے شریک (بنائے تھے) جن کے ہاتھ میں تم (انبیاء) داخل ایمان سے الٹائی جھگڑا کرتے تھے (وہ اب) کہاں ہیں (اس حالت کو دیکھ کر حق تعالیٰ جانز وائے کہیں گے کہ آج پوری رسوائی اور عذاب کا فردوں پر ہے جن کی جان فرشتوں نے حالت کفر پر قبض کی تھی (یعنی آخر وقت تک کافر رہے شاید ان اہل علم کا قول یہ ہے میں اس لئے بیان فرمایا ہوں کہ کفار کی رسوائی کا عام اور علانیہ ہونا معلوم ہو جائے) پھر کافر لوگ (اپنے شرکاء کے جواب میں) صلح کا پیغام ڈالیں گے (اور کہیں گے) کہ (شرک جو اعلیٰ درجہ کی بُرائی اور مخالفت حق تعالیٰ کی ہو ہماری کیا مجال تھی کہ ہم اس کے مرتکب ہوتے) ہم تو کوئی بُرا کام (جس میں ادنیٰ مخالفت بھی حق تعالیٰ کی ہو) نہ کرتے تھے (اس کو صلح کا مضمون اس لئے کہا گیا کہ دنیا میں شرک کا جو کہ لغت یقینیہ ہے بڑے جوش و خروش سے اقرار تھا، لکن قولہ تعالیٰ لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا، اور شرک کا اقرار مخالفت کا اقرار تھا، خصوصاً انبیاء علیہم السلام کے ساتھ تو خود صریح مخالفت کے مدعی تھے وہاں اس شرک کے انکار سے مخالفت کا انکار کریں گے، اس لئے اس کو صلح فرمایا اور یہ ایسا ایسا ہو جیسا دوسری آیت میں ہے وَاللّٰهِ رَبَّنَا مَا كُنَّا فِیْ شِرْکِیْنِ، حق تعالیٰ ان کے اس قول کو رد فرمائیں گے کہ کیوں نہیں (بلکہ واقعی تم نے بڑے کام مخالفت کے کئے بیشک اللہ کو تمہارے سب اعمال کی پوری خبر ہے سو (اچھا) جہنم کے دروازوں میں (سے جہنم میں) داخل ہو جاؤ (اور) اس میں ہمیشہ ہمیشہ کو رہو غرض (حق سے) تکیہ (اور مخالفت اور مقابلہ) کرنے والوں کا وہ بُرا ٹھکانا ہے یہ عذاب آخرت کا ذکر ہو گیا، پس حاصل آیات کا یہ ہوا کہ تم نے اپنے سے پہلے کافروں کا حالِ خسارہ و عذاب دنیا و آخرت کا سن لیا، اسی طرح جو تدبیر و حکم دین حق کے مقابلہ میں تم کر رہے ہو اور خلق کو گمراہ کرنا چاہتے ہو یہی انجام تمہارا ہو گا) :

معارف و مسائل

پچھلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اور تخلیق عالم میں یتما ہونے کا ذکر کر کے مشرکین کی اپنی گمراہی کا بیان تھا، ان آیات میں دوسروں کو گمراہ کرنے اور اس کے عذاب کا بیان ہوا اور اس سے پہلے ایک سوال مقرر کیا گیا ہے، اور اس سوال کے مخاطب یہاں تو مشرکین ہیں اور انہی کا جائزہ جواب یہاں ذکر کر کے ان پر وعید بیان کی گئی ہے، اور پانچ آیتوں کے بعد یہی سوال مؤمنین متعین کو خطاب کر کے کیا گیا اور ان کا جواب اور اس پر وعدہ انعامات کا ذکر ہے۔

قرآن کریم نے یہ نہیں کھولا کہ سوال کرنے والا کون تھا، اس لئے مفسرین کے اس میں اقوال مختلف ہیں، کسی نے کافروں کو سوال کرنے والا قرار دیا، کسی نے مسلمانوں کو کسی نے ایک سوال مشرکین کا اور دوسرا مؤمنین کا قرار دیا، لیکن قرآن کریم نے اس کو مبہم رکھ کر اس طرف اشارہ کر دیا ہے کہ اس بحث میں جانے کی ضرورت ہی کیا ہے کہ سوال کس کی طرف سے تھا، دیکھنا تو جواب اور اس کے نتیجہ کا ہے جن کا قرآن نے خود بیان کر دیا ہے۔

مشرکین کی طرف سے خلاصہ جواب یہ ہے کہ انہوں نے اسی کو تسلیم نہیں کیا کہ کوئی کلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا بھی ہے، بلکہ قرآن کو پچھلے لوگوں کی کہانیاں قرار دیا، قرآن کریم نے اس پر یہ وعید سنائی کہ یہ ظالم قرآن کو کہانیاں بتلا کر دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں، اس کا یہ نتیجہ ان کو بھگتنا پڑے گا، کہ قیامت کے روز اپنے گناہوں کا پورا وبال تو ان پر پڑنا ہی ہے، جن کو یہ گمراہ کر رہے ہیں ان کا بھی کچھ وبال ان پر پڑے گا، اور پھر فرمایا کہ گناہوں کے جس بوجھ کو یہ لوگ اپنے اوپر لا رہے ہیں، وہ بہت بُرا بوجھ ہے۔

وَقِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَاذَا أَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوا خَيْرٌ الَّذِينَ

اور کہا پرہیزگاروں کو کیا اتارا تمہارے رب نے بولے نیک بات جنہوں نے

أَحْسَنُوا فِيْ هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَلَكِنْ أَرْأَيْتُمْ خَيْرٌ وَلِنَعْمَ

بھلائی کی اس دنیا میں ان کو بھلائی ہے اور آخرت کا گھر بہتر ہے، اور کیا خیر

دَارُ الْمُسْتَقِيمِينَ ۝ جَنَّاتٌ عِدْنُ يَدْخُلُونَهَا يُجْرِي مِنْ تَحْتِهَا

گھر ہے پرہیزگاروں کا، باغ ہیں ہمیشہ رہنے کے جن میں وہ جائیں گے بہت ہی اچھے ہیں

الْأَنفُسُ لَهُمْ فِرًا مَّا يَشَاءُونَ كَذَلِكَ يَجْزِي اللَّهُ الْمُتَّقِينَ ﴿٣٣﴾

ہنریں ان کے واسطے وہاں ہر جو چاہیں ایسا بدلہ دیگا اللہ پر ہیزگاروں کو

الَّذِينَ تَتَوَفَّيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ طَيِّبِينَ يَقُولُونَ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ ادْخُلُوا

جن کی جان قبض کرتے ہیں فرشتے اور وہ ستھری ہیں کہتے ہیں فرشتے سلامتی تم پر جاؤ

الْجَنَّةَ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٣٤﴾ هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمُ

بہشت میں بدلہ ہر اس کا جو ہم کرتے تھے، کیا کا ذرا اب اس کے منتظر ہیں کہ آئیں اُن پر

الْمَلَائِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ أَمْرٌ رَبِّكَ كَذَلِكَ فَعَلَ الَّذِينَ مِنَ قَبْلِهِمْ

فرشتے یا پہنچے حکم تیرے رب کا اسی طرح کیا تھا ان سے اگلوں نے

وَمَا ظَلَمَهُمُ اللَّهُ وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٣٥﴾ فَاصْبِرْ لَهُمْ

اور اللہ نے ظلم نہ کیا اُن پر لیکن وہ خود اپنا بُرا کرتے رہے، پھر پڑے ان کے

سَيِّئَاتٍ مَا عَمِلُوا وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ﴿٣٦﴾

سہ اُن کے بُرے کام اور اُلٹ پڑا ان پر جو ٹھٹھا کرتے تھے۔

خلاصہ تفسیر

اور جو لوگ شرک سے بچتے ہیں ان سے (جو قرآن کے بارے میں) کہا جاتا ہے کہ تمہارے رب

نے کیا چیز نازل فرمائی ہے وہ کہتے ہیں کہ بڑی خیر (اور برکت کی چیز) نازل فرمائی ہے جن لوگوں نے

نیک کام کئے ہیں (جس میں یہ قول مذکور اور تمام اعمال صالحہ آگئے) ان کے لئے اس دنیا میں بھی

بھلائی ہے (وہ بھلائی ثواب کا وعدہ و بشارت ہے) اور عالم آخرت تو (بوجہ اس کے) وہاں

اس وعدہ کا مستحق و ظہور ہو جائے گا) اور زیادہ بہتر (اور موزوں) ہے اور واقعی وہ شرک سے

بچنے والوں کا اچھا گھر ہے وہ گھر (کیا ہے) ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں جن میں یہ داخل ہوں گے

ان باغوں کے (اشجار و عمارات کے) نیچے سے ہنریں جاری ہوں گی جس چیز کو ان کا جی چاہے گا

وہاں ان کو ملے گی (اور خاص انہی کی کیا تخصیص ہے جن کا قول اس مقام پر مذکور ہے بلکہ)

اسی طرح کا عوض اللہ تعالیٰ سب شرک سے بچنے والوں کو دے گا، جن کی روح فرشتے اس حالت

میں قبض کرتے ہیں کہ وہ (شرک سے) پاک (صاف) ہوتے ہیں (مطلب یہ کہ مرتے دم تک توحید پر)

قائم رہتے ہیں اور وہ (فرشتے) کہتے جاتے ہیں السلام علیکم تم (قبض روح کے بعد) جنت میں پہلے جانا اپنے اعمال کے سبب یہ لوگ (جو اپنے کفر و عناد و جہالت پر اصرار کر رہے ہیں اور باوجود وضوح دلائل حق کے ایمان نہیں لاتے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف) اسی بات کے منتظر ہیں کہ ان کے پاس (موت کے) فرشتے آجائیں یا آپ کے پروردگار کا حکم (یعنی قیامت) آجائے (یعنی کیا موت کے وقت یا قیامت میں ایمان لائیں گے جبکہ ایمان قبول نہ ہوگا، گو اس وقت تمام کفار بوجہ انکشاف حقیقت کے توبہ کریں گے جب اصرار کفر پر یہ لوگ کر رہے ہیں) ایسا ہی ان سے پہلے جو لوگ تھے انہوں نے بھی (کفر پر اصرار) کیا تھا اور (اصرار کی بدولت) مزا یا اب ہونے سے سو ان پر اللہ تعالیٰ نے ذرا ظلم نہیں کیا، لیکن وہ آپ ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے کہ سزا کے کام جان جان کر کرتے تھے، آخر ان کے اعمال بد کی ان کو مزا ایسے ملیں اور جس عذاب کی خبر پانے پر وہ ملتے تھے ان کو اس (عذاب نے) آگھیرا پس ایسا ہی تمہارا حال ہوگا)۔

وَقَالَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُونِهِ مِنْ

اور بولے شرک کرنے والے اگر چاہتا اللہ نہ پوجتے ہم اس کے سوا کسی

شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَمْنَا مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ ط

چیز کو اور نہ ہمارے باپ اور نہ حرام ٹھہراتے ہم بدون اس کے حکم کے کسی چیز کو

كَذَلِكَ فَعَلَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَهَلْ عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ

اسی طرح کیا ان سے انہوں نے سوا رسولوں کے ذمہ نہیں مگر پہنچا دینا

الْمَسِينِ ۝ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنْ اعْبُدُوا اللَّهَ

صاف صاف، اور ہم نے اٹھائے ہیں ہر امت میں رسول کہ بندگی کرو اللہ کی

وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ فَمِنْهُمْ مَنْ هَدَى اللَّهُ وَمِنْهُمْ مَنْ

اور بھگڑنے والے سے کچھ کس کو ان میں سے ہدایت کی اللہ نے اور کس پر

حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلَالَةُ ۖ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ

ثابت ہوئی گمراہی، سو سفر کرو ملکوں میں کچھ دیکھو کیسا ہوا انجام

كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ۝ (۳۶) إِنَّ تَحْرِيصَ عَلَى هُدَاهُمْ فَإِنْ

جھٹلانے والوں کا، اگر تو طمع کرے ان کو راہ پر لانے کی تو

اللَّهُ لَا يَهْدِي مَنْ يُضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ ﴿۳۷﴾ وَأَقْسِمُوا

اللہ راہ نہیں دیتا جسکو بچلاتا ہے اور کوئی نہیں ان کا مددگار . اور قسمیں کھاتے ہیں

بِاللَّهِ جَعَدَ آيْمَانُهُمْ لَا يَبْعَثُ اللَّهُ مِنْ يَمُوتَ بَلَى وَعْدًا

اللہ کی سخت قسمیں کہ نہ اٹھاتے گا اللہ جو کوئی مر جائے کیوں نہیں وعدہ

عَلَيْهِ حَقًّا وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۳۸﴾ لِيَبَيِّنَ لَهُمُ

ہو چکا ہے اس پر بچا لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ، اٹھاتے گا تاکہ ظاہر کر دے انہیں

الَّذِي يَخْتَلِفُونَ فِيهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّهُمْ كَانُوا

جس بات میں جھگڑتے ہیں اور تاکہ معلوم کر لیں کافر کہ وہ جھوٹے

۵
ع
۱۱

كَاذِبِينَ ﴿۳۹﴾ إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَادْنَاهُ أَنْ نَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿۴۰﴾

تھے ، ہمارا کہنا کسی چیز کو جب ہم اس کو کرنا چاہیں یہی ہو کہ کہیں اس کو ہو جا تو وہ ہو جائے

خلاصہ تفسیر

اور مشرک لوگ یوں کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کو (بطور رضا کے یہ امر) منظور ہو تا تو ہم غیر اللہ کی عبادت نہ کریں جو ہمارے طریقہ کے اصول میں سے ہے اور بعض ہشیار کی تحریم نہ کریں جو ہمارے طریقہ کے فروع میں سے ہے، مطلب یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمارے موجودہ اصول و فروع کو ناپسند کرتے تو خدا کے سوا کسی چیز کی نہ ہم عبادت کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم اس کے بدون (حکم کے) کسی چیز کو حرام کہہ سکتے (اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو ہمارا طریقت پسند ہر دور ہم کو کیوں کرنے دیتے، اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان سے مغموم نہ ہوں کیونکہ یہ یہود و مجاہلہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ جو (کافر) ان سے پہلے ہوئے ہیں ایسی ہی حرکت انہوں نے بھی کی تھی (یعنی یہود و مجاہلات اپنے پیغمبروں سے کہتے تھے) سو پیغمبروں (کا اس سے کیا بھڑکا اور وہ جس طریق کی طرف بلا تے ہیں اس کو کیا ضرر پہنچا ان) کے ذمہ تو (احکام کا) صرف صاف صاف پہنچا دینا ہے (صاف صاف یہ کہ دعویٰ واضح ہو اور دلیل صحیح اس پر قائم ہو اسی طرح آپ کے ذمہ بھی یہی کام تھا جو آپ کر رہے ہیں، پھر اگر براؤ غناد دعویٰ اور دلیل میں غور نہ کریں تو آپ کی بلا سے) اور جس طرح ان کا معاملہ آپ کے ساتھ یعنی مجاہلہ کوئی نئی بات نہیں اسی طرح آپ کا معاملہ ان کے ساتھ یعنی توحید و دین حق کی طرف بلانا کوئی نئی بات نہیں

بلکہ اس کی تعلیم بھی قدیم سے چلی آتی ہے چنانچہ ہم ہر امت میں (امم سابقہ سے) کوئی نہ کوئی پیغمبر (اس بات کی تعلیم کے لئے) بھیجے رہے ہیں کہ تم (خاص) اللہ کی عبادت کرو اور شیطان (کے رستے) سے (کہ وہ شرک و کفر ہے) بچتے رہو (اس میں امتیاز کی وہ تحریم بھی آگئی جو مشرکین اپنی رائے سے کیا کرتے تھے، کیونکہ وہ شعبہ شرک و کفر کا تھا) سو ان میں بعضے وہ ہوتے جن کو اللہ نے ہدایت دی (کہ انہوں نے حق کو قبول کر لیا) اور بعضے ان میں وہ ہوتے جن پر گمراہی کا ثبوت ہو گیا۔

(مطلب یہ کہ کفار اور انبیاء میں یہ معاملہ اسی طرح چلا آرہا ہے، اور ہدایت و اضلال کے متعلق اللہ تعالیٰ کا معاملہ بھی ہمیشہ سے یوں ہی جاری ہے کہ مجادلہ کفار کا بھی مستدیم اور تعلیم انبیاء علیہم السلام کی بھی قدیم اور سب کا ہدایت نہ پانا بھی قدیم پھر آپ کو غم کیوں ہو؟ یہاں تک تسلی فرمائی گئی جس میں اخیر کے مضمون میں ان کے شبہ کا اجمالی جواب بھی ہو گیا کہ ایسی باتیں کرنا گمراہی ہے جس کے گمراہی ہونے کی آگے تائید اور جواب کی زیادہ توضیح ہے، یعنی اگر مجادلہ مع الرسل کا گمراہی ہونا تم کو معلوم نہ ہو (قرآن چھا) زمین میں چلو پھرو پھر (آثار سے) دیکھو کہ (پیغمبروں کے) جھٹلانے والوں کا کیسا (ہرام) انجام ہوا (پس اگر وہ گمراہ نہ تھے تو ان پر عذاب کیوں نازل ہوا، اور واقعات اتفاق یہ ان کو اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ خلاف عادت ہو کر اور انبیاء علیہم السلام کی پیشینگوئی کے بعد ہوتے اور مؤمنین اس سے بچے رہے، پھر اس کے عذاب ہونے میں کیا شک ہو، اور چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو امت کے کسی فرد کی گمراہی سے بھی سخت صدمہ پہنچتا تھا اس لئے آگے پھر آپ کو خطاب ہے کہ جیسے پہلے بعضے لوگ ہوتے ہیں جن پر گمراہی قائم ہو چکی تھی، اسی طرح یہ لوگ بھی ہیں سو) ان کے راہِ راست پر آنے کی اگر آپ کو تمنا ہو تو دیکھ نتیجہ نہیں کیونکہ) اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو ہدایت نہیں کیا کرتا جس کو اس شخص کے عناد کے سبب، گمراہ کرتا ہے (البتہ اگر وہ عناد کو چھوڑ دے تو ہدایت کر دیتا ہے، لیکن یہ عناد کو چھوڑیں گے نہیں، اس لئے ان کو ہدایت بھی نہ ہوگی) اور اضلال و عذاب کے بارے میں اگر ان کا یہ گمان ہو کہ ہمارے معبود اس حالت میں بھی عذاب سے بچا لیں گے تو وہ سمجھ رکھیں خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں، ان کا کوئی حمایتی نہ ہوگا (یہاں تک ان کے پہلے شبہ کے جواب کی تقریر تھی، آگے دوسرے شبہ کے متعلق کلام ہے) اور یہ لوگ بڑے زور لگا لگا کر اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ جو مجاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو دوبارہ زندہ نہ کرے گا اور قیامت نہ آئے گی، آگے جواب ہے، کیوں نہیں زندہ کرے گا (یعنی ضرور زندہ کرے گا) اس وعدہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لازم کر رکھا ہے، لیکن اکثر لوگ ربا و جو د قیام دلیل صحیح کے اس پر یقین نہیں لاتے (اور یہ دوبارہ زندہ کرنا اس لئے ہوگا) تاکہ (دین کے متعلق) جس چیز میں

یہ لوگ (دنیا میں) اختلاف کیا کرتے تھے (اور انبیاء کے فیصلہ سے راستہ پر نہ آتے تھے) انکے ردِ برد اس (کی حقیقت) کا (بطور معائنہ کے) اظہار کر دے اور تاکہ (اس اظہار حقیقت کے وقت) کافر لوگ (پورا) یقین کر لیں کہ واقعی وہی جھوٹے تھے (اور انبیاء و مؤمنین سچے تھے) پس قیامت کا آنا یقینی اور عذاب سے فیصلہ ہونا ضروری ہے، یہ جواب ہو گیا لَا يَبْعَثُ اللَّهُ كَا اور چونکہ وہ لوگ قیامت کا اس لئے انکار کرتے تھے کہ مرکزِ زندہ ہونا ان کے خیال میں کسی کے بس میں نہ تھا، اس لئے آگے اپنی قدرتِ کاملہ کے اثبات سے ان کے اس شبہ کو دفع فرماتے ہیں کہ ہماری قدرت ایسی عظیم ہے کہ (ہم جس چیز کو پیدا کرنا چاہتے ہیں) (ہیں اس میں کچھ محنت مشقت کرنا نہیں پڑتی) بس اس سے ہمارا اتنا ہی کہنا (کافی) ہوتا ہے کہ تو (پیدا) ہو جا بس وہ (موجود) ہو جاتی ہے (تو اتنی بڑی قدرت کاملہ کے ردِ برد بے جان چیزوں میں دوبارہ جان کا پڑ جانا کو نسا دشوار ہے جیسے پہلی بار ان میں جان ڈال چکے ہیں) اب دونوں شبہوں کا پورا جواب ہو چکا واللہ اعلم

معارف و مسائل

ان کفار کا پہلا شبہ تو یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کو اگر ہمارا کفر و شرک اور ناجائز کام پسند نہیں تو وہ ہمیں زبردستی اس سے روک کیوں نہیں دیتے۔

اس شبہ کی بیہودگی واضح تھی، اس لئے اس کا جواب دینے کے بجائے صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی پر اکتفا کیا گیا، کہ ایسے بیہودہ سوالات سے آپ غمگین نہ ہوں، اور شبہ کی بیہودگی کی وجہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عالم دنیا کا نظام ہی اس بنیاد پر قائم فرمایا کہ انسان کو بالکل مجبور نہیں رکھا گیا، ایک قسم کا اختیار اس کو دیا گیا، اسی اختیار کو وہ اللہ کی اطاعت میں استعمال کرے تو ثواب اور نافرمانی میں استعمال کرے تو عذاب کے وعدے اور وعید فرمائے، اسی کے نتیجے میں قیامت اور حشر و نشر کے سائے ہنگامے ہیں، اگر اللہ تعالیٰ چاہے کہ سب کو مجبور کر کے اپنی اطاعت کرائیں تو کس کی مجال تھی کہ اطاعت سے باہر جاتا، مگر بتقاضائے حکمت مجبور کر دینا درست نہ تھا، اس لئے انسان کو اختیار دیا گیا، تو اب کافروں کا یہ کہنا کہ اگر اللہ کو ہمارا طریقہ پسند نہ ہوتا تو ہمیں مجبور کیوں نہ کر دیتے ایک اسمقانہ اور معاندانہ سوال ہے۔

کیا ہندوستان پاکستان میں بھی وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا، اس آیت سے نیز دوسری آیت وَ إِنْ مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ سے ظاہر ہیں اللہ کا کوئی رسول آیا ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان و پاکستان کے علاقوں میں بھی اللہ کے پیغمبر ضرور آئے ہوں گے

خواہ وہ یہیں کے باشندے ہوں یا کسی دوسرے ملک میں ہوں اور ان کے نائب اور مبلغ یہاں پہنچے ہوں اور آیت لَتَشْنِیَنَّ رَقُومًا مَّا آتَاهُم مِّنْ نِّیْلِیْرِیْسے جو یہ مفہوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس امت کی طرف بھیجے گئے ہیں ان کی طرف آپ سے پہلے کوئی رسول نہیں آیا، اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد بظاہر وہ قوم عرب ہے جو آپ کی بعثت و نبوت کی سب سے پہلے مخاطب ہوئی، کہ ان میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد کوئی رسول نہیں آیا تھا، اسی لئے ان لوگوں کا لقب قرآن کریم میں اُمِّیِّیْنَ رکھا گیا ہے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ باقی دنیا میں بھی آپ سے پہلے کوئی رسول نہ آیا ہو، واللہ اعلم

وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوا فِی اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظَلَمُوا النَّبِیَّ نَسَهُمُ

اور جنہوں نے گھر چھوڑا اللہ کے واسطے بعد اس کے کہ ظلم اٹھایا البتہ ان کو ہم ٹھکانا

فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً ۖ وَلَا جُرَۃَ الْآخِرَةِ اَکْبَرُ ۚ کَذٰلِکَ اُنۢبِیَۃُ مَوۡنٍ ﴿۴۱﴾

دیں گے دنیا میں اچھا اور ثواب آخرت کا تو بہت بڑا ہو اگر ان کو معلوم ہوتا،

الَّذِیْنَ صَبَرُوا وَعَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوۡنَ ﴿۴۲﴾

جو ثابت قدم رہے اور اپنے رب پر بھروسہ کیا۔

خلاصہ تفسیر

اور جن لوگوں نے اللہ کے واسطے اپنا وطن (ملکہ) چھوڑ دیا (اور حبشہ چلے گئے) بعد اس کے کہ ان پر کفار کی طرف سے ظلم کیا گیا دیکھو کہ ایسی مجبوری میں وطن چھوڑنا بڑا شاق گذشتہ ہے، ہم ان کو دنیا میں ضرور اچھا ٹھکانا دیں گے (یعنی ان کو مدینہ پہنچا کر خوب امن و راحت دیں گے) چنانچہ بعد چندے مدینہ میں اللہ تعالیٰ نے پہنچا دیا اور اس کو وطن اصلی قرار دیا گیا، اس لئے اس کو ٹھکانا کہا اور ہر طرح کی وہاں ترقی ہوئی اس لئے خسنہ کہا گیا اور حبشہ کا قیام عارضی تھا اس لئے اس کو ٹھکانا نہیں فرمایا، اور آخرت کا ثواب (اس سے) بدرجہا بڑا ہے (کہ خیر بھی ہو اور البقی بھی) کاش (اس اجر آخرت کی) ان (بے خبر کافروں) کو (بھی) خبر ہوئی (اور اس کے حاصل کرنے کی رغبت سے مسلمان ہو جاتے) وہ (مہاجرین) ان وعدوں کے اس لئے مستحق ہیں کہ وہ ایسے ہیں جو رنارگوار واقعات پر صبر کرتے ہیں (چنانچہ وطن کا چھوڑنا گوان کو ناگوار ہے، لیکن بدون اس کے دین پر عمل نہیں کر سکتے تھے، دین کے لئے وطن چھوڑا،

اور سبر کیا) اور (وہ ہر حال میں) اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں (وطن چھوڑنے کے وقت یہ خیال نہیں کرتے کہ کھائیں پئیں گے کہاں سے) :

معارف ومسائل

تشریح و تفسیر | الَّذِينَ هَاجَرُوا، ہجرت سے مشتق ہے، ہجرت کے لغوی معنی ترک وطن کے ہیں، ترک وطن جو اللہ کے لئے کیا جائے وہ اسلام میں بڑی طاعت و عبادت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَلْهَاجِرَةُ كَهَلِّمٍ مَّا كَانَ قَبْلَهَا، یعنی ہجرت ان تمام گناہوں کو ختم کر دیتی ہے جو انسان نے ہجرت سے پہلے کئے ہوں۔ یہ ہجرت بعض صورتوں میں فرض و واجب اور بعض صورتوں میں مستحب و افضل ہوتی ہے، اس کے مفصل احکام تو سورہ نساء کی آیت نمبر ۹۹ اَلَمْ تَرَ كُنْ اَرْضَ اللّٰهِ وَاِسْعَةً فَتَہَاجِرُوا فِيْہَا کے تحت میں بیان ہو چکے ہیں، اس جگہ صرف ان وعدوں کا بیان ہے جو اللہ تعالیٰ نے مہاجرین سے کئے ہیں۔

کیا ہجرت دنیا میں بھی فراخی | آیات مذکورہ میں چند شرائط کے ساتھ مہاجرین کے لئے دو عظیم انعام عیش کا سبب ہوتی ہو؟ وعدے کئے گئے ہیں، اول تو دنیا ہی میں اچھا ٹھکانا دینے کا، دوسرے آخرت کے بے حساب ثواب عظیم کا، ”دنیا میں اچھا ٹھکانا“ ایک نہایت جامع لفظ ہے اس میں یہ بھی داخل ہے کہ مہاجر کو سکونت کے لئے مکان اور پڑوسی اچھے ملیں، یہ بھی داخل ہے کہ اس کو رزق اچھا ملے، دشمنوں پر فتح و غلبہ نصیب ہو، عام لوگوں کی زبان پر ان کی تعریف اور بھلائی ہو، عزت و شرف ملے جو ان کے خاندان اور اولاد تک چلے (قرطبی)

آیت کا شان نزول اصالتاً وہ پہلی ہجرت ہے جو صحابہ کرام نے حبشہ کی طرف کی، اور یہ بھی احتمال ہے کہ ہجرت حبشہ اور اس کے بعد کی ہجرت مدینہ منورہ دونوں اس میں داخل ہوں آیت میں یہاں اپنی مہاجرین حبشہ یا مہاجرین مدینہ کا ذکر ہے، اس لئے بعض علماء نے فرمایا کہ یہ وعدہ انہی حضرات صحابہ کے لئے تھا جنہوں نے حبشہ کی طرف یا پھر مدینہ کی طرف ہجرت کی تھی اور اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ دنیا میں پورا ہو چکا، جس کا سبب نے مشاہدہ کر لیا، کہ اللہ تعالیٰ نے مدینہ منورہ کو ان کا کیسا اچھا ٹھکانا بنا دیا، ایذا دینے والے پڑوسیوں کے بجائے غمخوار، ہمدرد و جاں نثار پڑوسی ملے، دشمنوں پر فتح و غلبہ نصیب ہوا، ہجرت کے تھوڑے ہی عرصہ گزرنے کے بعد ان پر رزق کے دروازے کھول دیئے گئے، فقراء و مساکین مالدار ہو گئے، دنیا کے ممالک فتح ہوئے، ان کے حسن خلاق، حسن عمل کے کارنامے رہتی دنیا تک ہر موافق و مخالف کی زبان پر ہیں، ان کو اور ان کی

نسلوں کو اللہ تعالیٰ نے بڑی عزت و شرف بخشا، یہ تو دنیا میں ہونے والی چیزیں تھیں جو ہو چکیں اور آخرت کا وعدہ پورا ہونا بھی یقینی ہے، لیکن تفسیر بحر محیط میں ابو حیان کہتے ہیں:-

<p>”الَّذِينَ هَاجَرُوا كَالْفِطْرِ هَاجَرِينَ عالم کے لئے عام اور شامل ہر کسی بھی خطے اور زمانہ کے ہاجر ہوں، اس لئے یہ لفظ ہاجرین اولین کو بھی شامل ہوا اور قیامت</p>	<p>وَالَّذِينَ هَاجَرُوا عَمَّا فِي الْمُهَاجِرِينَ كَانُوا فِي شَمَلٍ أَوْ لَهْمٍ وَأَخْرَجَهُمْ (ص ۱۴۹۲، ۵۷۳)</p>
--	---

تک اللہ کے لئے ہر ہجرت کرنے والا اس میں داخل ہے۔

عام تفسیری ضابطہ کا تقاضا بھی یہی ہے کہ آیت کا شان نزول اگرچہ کوئی خاص واقعہ اور خاص جماعت ہو مگر اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے، اس لئے اس وعدہ میں تمام دنیا کے اور ہر زمانہ کے ہاجرین بھی شامل ہیں، اور یہ دونوں وعدہ تمام ہاجرین کے لئے پورا ہونا امر یقینی ہے۔

اسی طرح کا ایک وعدہ ہاجرین کے لئے سورۃ نسا کی اس آیت میں کیا گیا ہے وَمَنْ يُهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرًا عَمَّا كَثِيرًا وَسَعَةً مَكَانًا اور فراخی عیش خاص طور سے موعود ہیں، مگر قرآن کریم نے ان وعدوں کے ساتھ ہاجرین کے کچھ اوصاف اور ہجرت کی کچھ شرائط بھی بیان فرمائی ہیں، اس لئے ان وعدوں کے مستحق وہی ہاجرین ہو سکتے ہیں جو ان اوصاف کے حامل ہوں اور جنہوں نے مطلوبہ شرائط پوری کر دی ہوں۔

ان میں سب سے پہلی شرط تو فی اللہ کی ہے، یعنی ہجرت کرنے کا مقصد صرف اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا ہو، اس میں دنیاوی منافع تجارت، ملازمت وغیرہ اور نفسانی فوائد پیش نظر نہ ہوں، دوسری شرط ان ہاجرین کا مظلوم ہونا ہے، مَنْ بَعْدَ مَا ظَلَمُوا، تیسرا وصف ابتدائی تکالیف و مصائب پر صبر اور ثبات قدم رہنا ہے الَّذِينَ صَبَرُوا، چوتھا وصف تمام مادی تدبیروں کا اہتمام کرتے ہوئے بھی بھروسہ صرف اللہ پر رکھنا ہے، کہ فزع و نصرت اور ہر کامیابی صرف اسی کے ہاتھ میں ہے، وَ عَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ۔

اس سے معلوم ہوا کہ ابتدائی مشکلات و تکالیف تو ہر کام میں ہو اسی کرتی ہیں، ان کو عبور کرنے کے بعد بھی اگر کسی مہاجر کو اچھا ٹھکانا اور اچھے حالات نہیں ملے تو قرآن کے وعدے میں شبہ کرنے کے بجائے اپنی نیت و اخلاص اور اس حُسنِ عمل کا جائزہ لے جس پر یہ وعدے کئے گئے ہیں تو اس کو معلوم ہوگا کہ قصور اپنا ہی تھا، کہیں نیت میں کھوٹ ہوتا ہے، کہیں صبر و ثبات اور توکل کی کمی ہوتی ہے۔

ترک وطن اور ہجرت کی مختلف قسمیں اور ان کے احکام

قرطبی نے بحوالہ ابن عربی لکھا ہے کہ وطن سے نکلنا اور زمین میں سفر کرنا کبھی تو کسی چیز سے بھاگنے اور بچنے کے لئے ہوتا ہے، اور کبھی کسی چیز کی طلب و جستجو کے لئے، پہلی قسم کا سفر جو کسی چیز سے بھاگنے اور بچنے کے لئے ہو اس کو ہجرت کہتے ہیں، اور اس کی تین قسمیں ہیں۔

اول، یعنی دار الکفر سے دار الاسلام کی طرف جانا، یہ قسم سفر عہد رسالت میں بھی فرض تھی، اور قیامت تک بشرط استطاعت و قدرت فرض ہے (جبکہ دار الکفر میں اپنے جان و مال اور آبرو کا امن نہ ہو، یا دینی فرائض کی ادائیگی ممکن نہ ہو) اس کے باوجود دار الحرب میں مقیم رہا تو گناہ گار ہوگا۔

دوسرا دار البدعت سے نکل جانا، ابن قاسم کہتے ہیں کہ میں نے امام مالک سے سنا ہے کہ کسی مسلمان کے لئے اس مقام میں قیام کرنا حلال نہیں جس میں سلف صالحین پر سب و شتم کیا جاتا ہو، ابن عربی یہ قول نقل کر کے لکھتے ہیں کہ یہ بالکل صحیح ہے، کیونکہ اگر ستم کسی منکر کا ازالہ نہیں کر سکتے تو ستم پر لازم ہے کہ خود وہاں سے زائل یعنی علیحدہ ہو جاؤ، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے

وَإِذَا زَايَلْتُمُ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ۔

تیسرا سفر وہ ہے کہ جس جگہ پر حرام کا غلبہ ہو وہاں سے نکل جانا، کیونکہ طلب حلال ہر مسلمان پر فرض ہے۔

چوتھا جسمانی اذیتوں سے بچنے کے لئے سفر، یہ سفر جائز اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام ہے کہ انسان جس جگہ دشمنوں سے جسمانی اذیت کا خطرہ محسوس کرے وہاں سے نکل جائے، تاکہ اس خطرہ سے نجات ہو، یہ چوتھی قسم کا سفر سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا، جبکہ قوم کی ایذاؤں سے نجات حاصل کرنے کے لئے عراق سے ملک شام کی طرف روانہ ہوئے اور فرمایا

إِنِّي مُهَاجِرٌ إِلَى رِبِّي، ان کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایسا ہی ایک سفر مصر سے مدین کی طرف کیا، فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَتَرَقَّبُ

پانچواں سفر آب و ہوا کی خرابی اور امراض کے خطرہ سے بچنے کے لئے ہے، شریعت اسلام نے اس کی بھی اجازت دی ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ چرواہوں کو مدینہ سے باہر جنگل میں قیام کرنے کا ارشاد فرمایا، کیونکہ شہری آب و ہوا ان کو موافق نہ تھی، اسی طرح حضرت فاروق اعظمؓ نے ابو عبیدہؓ کو حکم بھیجا تھا کہ دار الخلافہ اُردن سے منتقل کر کے کسی سطح مرتفع پر لے جائیں، جہاں آب و ہوا خراب نہ ہو۔

لیکن یہ اس وقت میں ہے جب کسی مقام پر طاعون یا وبا کی امراض پھیلے ہوئے نہ ہوں

اور جس جگہ کوئی وبا پھیل جائے اس کے لئے حکم یہ ہے کہ جو لوگ اس جگہ پہلے سے موجود ہیں وہ تو وہاں سے بھاگیں نہیں اور جو باہر ہیں وہ اس کے اندر نہ جائیں، جیسا کہ حضرت فاروق اعظمؓ کو سفر شام کے وقت پیش آیا، کہ سرحد شام پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ ملک شام میں طاعون پھیل چکا ہے، تو آپ کو اس ملک میں داخل ہونے میں تردد پیش آیا، صحابہ کرام سے مسلسل مشوروں کے بعد آخر میں جب حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے ان کو یہ حدیث سنائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

جب کسی خطہ میں طاعون پھیل جائے
اور تم وہاں موجود ہو تو اب وہاں سے نہ
نکلو اور جہاں تم پہلے سے موجود نہیں ہو
طاعون پھیلنے کی خبر سنو تو اس میں داخل

نہ ہو

إِذَا وَقَعَ بِأَرْضٍ وَأَنْتُمْ بِهَا
فَلَا تَخْرُجُوا مِنْهَا وَإِذَا وَقَعَ
بِأَرْضٍ وَلَسْتُمْ بِهَا فَلَا
تَهَيِّظُوا عَلَيْهَا رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ

وقال حديث حسن صحيح

اس وقت فاروق اعظمؓ نے حکم حدیث کی تعمیل کرتے ہوئے پورے قافلہ کو لے کر واپسی کا اعلان کر دیا۔

بعض علماء نے فرمایا کہ حدیث شریف کے اس حکم میں ایک خاص حکمت یہ بھی ہے کہ جو لوگ اس جگہ مقیم ہیں جہاں کوئی وبا پھیل چکی ہے یہاں کے لوگوں میں وبائی جراثیم کا موجود ہونا ظن غالب ہے، وہ اگر یہاں سے بھاگیں گے تو جس میں یہ مادہ وبائی سہایت کر چکا ہے وہ تو بچے بچا نہیں اور جہاں یہ جائے گا وہاں کے لوگ اس سے متاثر ہوں گے، اس لئے یہ حکیمانہ فیصلہ فرمایا۔

چٹا سفر اپنے مال کی حفاظت کے لئے ہے، جب کوئی شخص کسی مقام میں چوروں، ڈاکوؤں کا خطرہ محسوس کرے تو وہاں سے منتقل ہو جائے، شریعت اسلام نے اس کی بھی اجازت دی ہے کیونکہ مسلمان کے مال کا بھی ایسا ہی احترام ہے جیسا اس کی جان کا ہے۔

یہ تین قسمیں تو اس ترک وطن کی ہیں جو کسی چیز سے بھاگنے اور بچنے کے لئے کیا گیا ہو، اور جو سفر کسی چیز کی طلب و جستجو کے لئے کیا جائے اس کی تو قسمیں ہیں:-

۱۔ سفر عبرت: یعنی دنیا کی سیاحت و سفر اس کام کے لئے کرنا کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات اور قدرت کاملہ کا اور اقوام سابقہ کا مشاہدہ کر کے عبرت حاصل کرے، قرآن کریم نے ایسے سفر کی ترغیب دی ہے: فَلَمْ تَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ، حضرت ذی القرنین کے سفر کو بھی بعض علماء نے اسی قسم کا سفر قرار دیا ہے اور بعض نے فرمایا کہ ان کا سفر زمین پر اللہ کا قانون نافذ کرنے کے لئے تھا۔

- دالوں سے اگر تم کو معلوم نہیں، بھیجا تھا ان کو نشانیاں دیکر اور درختے اور اتاری تم نے

إِلَيْكَ الذِّكْرُ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ﴿۴۴﴾

تجہ پڑیادداشت کہ تو کھول دے لوگوں کے سامنے وہ چیز جو اتری ان کے واسطے تاکہ وہ غور کریں

خلاصہ تفسیر

اور یہ منکر لوگ جو آپ کی رسالت و نبوت کا اس بنا پر انکار کر رہے ہیں کہ آپ بشر اور انسان ہیں، اور نبی و رسول ان کے نزدیک کوئی انسان و بشر نہ ہونا چاہتے، یہ ان کا جاہلانہ خیال ہی کیونکہ ہم نے آپ سے پہلے بھی صرف آدمی ہی رسول بنا کر معجزات اور کتابیں دے کر بھیجے ہیں کہ ان سپر وحی بھیجا کرتے تھے (تو اے مکہ والو منکرین) اگر تم کو علم نہیں تو دوسرے اہل علم سے پوچھ دیجو جن کو انبیاء سابقین کے حالات کا علم ہو اور وہ تمہارے خیال میں بھی مسلمانوں کی طرف ذمہ داری نہ کریں، اور اسی طرح آپ کو بھی رسول بنا کر آپ پر بھی یہ قرآن اتارا ہے تاکہ جو ہدایت آپ کے واسطے ہے (لوگوں کے پاس بھیجی گئی ہیں وہ ہدایات آپ ان کو واضح کر کے سمجھا دیں اور تاکہ وہ ان میں غور و فکر کیا کریں۔

معارف و مسائل

روح المعانی میں ہے کہ اس آیت نازل ہونے کے بعد مشرکین نے اپنے قاصد و مینہ طیبہ کے یہود کے پاس دریافت حال کے لئے بھیجے کہ کیا یہ بات واقعی ہے کہ پہلے بھی سب انبیاء جنس بشر و انسان سے ہوتے آئے ہیں۔

اگرچہ لفظ اہل الذکر میں اہل کتاب اور مؤمنین سب داخل تھے مگر یہ ظاہر ہے کہ مشرکین کا اطمینان غیر مسلموں ہی کے بیان سے ہو سکتا تھا، کیونکہ وہ خود رسول کریم کی بات پر مطمئن نہیں تھے، تو دوسرے مسلمانوں کی بات کیسے مان سکتے تھے۔

أَهْلُ الذِّكْرِ، لفظ ذکر چند معانی کے لئے استعمال ہوا ہے ان میں ایک معنی علم کے بھی ہیں، اسی مناسبت سے قرآن کریم میں تو رات کو بھی ذکر فرمایا ہے وَ لَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ کہیں اور قرآن کریم کو بھی ذکر کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے جیسا کہ اس کے بعد والی آیت میں أَنزَلْنَاهَا لَكَ الذِّكْرَ میں قرآن مراد ہے، اس لئے اہل الذکر کے لفظی معنی اہل علم کے ہوئے، اور یہاں اہل علم سے کون لوگ مراد ہیں، اس میں ظاہر یہ ہے کہ علمائے اہل کتاب یہود و نصاریٰ مراد ہیں، یہ قول ابن عباس، حسن، السدی وغیرہ کا ہے، اور بعض حضرات نے اس جگہ بھی ذکر سے قرآن مراد لے کر اہل الذکر کی تفسیر اہل قرآن سے کی ہے، اس میں زیادہ واضح بات

زمانی، زجاج، ازہری کی ہے، وہ کہتے ہیں المراد باہل الذکر علماء اخبار الاہم السالفة
کائنات من کان فالذکر بمعنی الحفظ کا ذہن قلیل اسألوا المصلحین علی اخبار الاہم
یجلسو کم من لک، اس تحقیق کی بناء پر اس میں اہل کتاب بھی داخل ہیں اور اہل شران بھی۔

یہ کتاب کے معنی معروف ہیں اور مراد اس سے یہاں مجزوات ہیں، زہر، دراصل زہرہ
کی جمع ہے جو لوہے کے بڑے ٹکڑوں کے لئے بولا جاتا ہے، اَلْقَوْنِی زُبْرًا حَبِیْبًا، ٹکڑوں کو
جوڑنے کی مناسبت سے لکھنے کو زہر کہا جاتا ہے، اور لکھی ہوئی کتاب کو زہر اور زہر بولتے ہیں
یہاں مراد اس سے اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے جس میں تورات، انجیل، زبور، قرآن سب داخل ہیں۔

امۃ مجتہدین کی تقلید | آیت مذکورہ کا یہ جملہ فَسَلُّوْا اَہْلَی الَّذِیْ کَرِہْتُمْ اَلَا تَعْلَمُوْنَ،
غیر مجتہد پر واجب ہے اس جگہ اگرچہ ایک خاص مضمون کے بارے میں آیا ہے، مگر الفاظ عام ہیں

جو تمام معاملات کو شامل ہیں، اس لئے قرآنی اسلوب کے اعتبار سے درحقیقت یہ اہم ضابطہ ہے
جو عقل بھی ہے نقلی بھی کہ جو لوگ احکام کو نہیں جانتے وہ جاننے والوں سے پوچھ کر عمل کریں، اور
نہ جاننے والوں پر فرض ہے کہ جاننے والوں کے بتلانے پر عمل کریں، اسی کا نام تقلید ہے، یہ قرآن
کا واضح حکم بھی ہے اور عقلاً بھی اس کے سوا عمل کو عام کرنے کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔

امت میں عہد صحابہ سے لے کر آج تک بلا اختلاف اسی ضابطہ پر عمل ہوتا آیا ہے، جو تقلید کے
منکر ہیں وہ بھی اس تقلید کا انکار نہیں کرتے، کہ جو لوگ عالم نہیں وہ علماء سے فتویٰ لے کر عمل
کریں، اور یہ ظاہر ہے کہ ناواقف عوام کو علماء اگر قرآن و حدیث کے دلائل بتلا بھی دیں تو وہ
ان دلائل کو بھی انہی علماء کے اعتماد پر قبول کریں گے، ان میں خود دلائل کو سمجھنے اور پرکھنے کی

صلاحیت تو ہے نہیں، اور تقلید اسی کا نام ہے کہ نہ جاننے والا کسی جاننے والے کے اعتماد پر
کسی حکم کو شریعت کا حکم قرار دے کر عمل کرے، یہ تقلید وہ ہے جس کے جواز بلکہ وجوب میں
کسی اختلاف کی گنجائش نہیں، البتہ وہ علماء جو خود قرآن و حدیث کو اور مواقع اجتماع کو
سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، ان کو ایسے احکام میں جو قرآن و حدیث میں صریح اور واضح طور پر

مذکور ہیں اور علماء صحابہ و تابعین کے درمیان ان مسائل میں کوئی اختلاف بھی نہیں ان احکام میں
وہ علماء براہ راست قرآن و حدیث اور اجتماع پر عمل کریں، ان میں علماء کو کسی مجتہد کی تقلید
کی ضرورت نہیں، لیکن وہ احکام و مسائل جو قرآن و سنت میں صراحتاً مذکور نہیں، یا جن میں
آیات قرآن اور روایات حدیث میں بظاہر کوئی تعارض نظر آتا ہے، یا جن میں صحابہ و تابعین کے

درمیان قرآن و سنت کے معنی متعین کرنے میں اختلاف پیش آیا ہے، یہ مسائل و احکام محل
اجتہاد ہوتے ہیں، ان کو اصطلاح میں مجتہد فیہ مسائل کہا جاتا ہے، ان کا حکم یہ ہے کہ جن عالم

کو درجہ اجتہاد حاصل نہیں اس کو بھی ان مسائل میں کسی امام مجتہد کی تقلید ضروری ہے، محض اپنی ذاتی رائے کے بھروسہ پر ایک آیت یا روایت کو ترجیح دے کر اختیار کرنا اور دوسری آیت یا روایت کو مرجوح قرار دے کر چھوڑ دینا اس کے لئے جائز نہیں۔

اسی طرح جو احکام قرآن و سنت میں صراحتہ مذکور نہیں ان کو قرآن و سنت کے بیان کردہ اصول سے نکالنا اور ان کا حکم شرعی متعین کرنا یہ بھی اپنی مجتہدین امت کا کام ہے جن کو عربی زبان عربی لغت اور محاورات اور طرق استعمال کا نیز قرآن و سنت سے متعلقہ تمام علوم کا معیاری علم اور ورع و تقویٰ کا ادنیٰ مقام حاصل ہو، جیسے امام اعظم ابو حنیفہ، شافعی، مالک، احمد بن حنبل یا اوزاعی، فقہ ابو اللیث وغیرہ، جن میں حق تعالیٰ نے قرب زمانہ نبوت اور صحبت صحابہ و تابعین کی برکت سے شریعت کے اصول و مقاصد سمجھنے کا خاص ذوق اور مخصوص احکام سے غیر مخصوص کو قیاس کر کے حکم نکالنے کا خاص سلیقہ عطا فرمایا تھا، ایسے مجتہد فیہ مسائل میں عام علماء کو بھی ائمہ مجتہدین میں سے کسی کی تقلید لازم ہے، ائمہ مجتہدین کے خلاف کوئی نئی رائے اختیار کرنا خطا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ امت کے اکابر علماء محدثین و فقہاء امام غزالی، رازی، ترمذی، طحاوی، مزنی، ابن ہمام، ابن قدامہ اور اسی معیار کے لاکھوں علماء سلف و خلف باوجود علوم عربیت و علوم شریعت کی اعلیٰ مہارت حاصل ہونے کے ایسے اجتہادی مسائل میں ہمیشہ ائمہ مجتہدین کی تقلید ہی کے پابند رہے ہیں، سب مجتہدین کے خلاف اپنی رائے سے کوئی فتویٰ دینا جائز نہیں تھا البتہ ان حضرات کو علم و تقویٰ کا وہ معیاری درجہ حاصل تھا، کہ مجتہدین کے اقوال و آراء کو قرآن و سنت کے دلائل سے جانچتے اور پرکھتے تھے، پھر ائمہ مجتہدین میں جس امام کے قول کو وہ کتاب و سنت کے ساتھ اقرب پاتے، اس کو اختیار کر لیتے تھے، مگر ائمہ مجتہدین کے مسلک سے خرد ج اور ان سب کے خلاف کوئی رائے قائم کرنا ہرگز جائز نہ جانتے تھے، تقلید کی اصل حقیقت اتنی ہی ہے۔

اس کے بعد روز بروز علیہ کا معیار گھٹتا گیا، اور تقویٰ و خدا ترسی کے بجائے اغراض نفسانی غالب آنے لگیں، ایسی حالت میں اگر یہ آزادی دی جائے کہ جس مسئلہ میں چاہیں کسی ایک امام کا قول اختیار کر لیں اور جس میں چاہیں کسی دوسرے کا قول لے لیں تو اس کا لازمی اثر یہ ہونا تھا کہ لوگ اتباع شریعت کا نام لے کر اتباع ہوئی میں مبتلا ہو جائیں، کہ جس امام کے قول میں اپنی غرض نفسانی پوری ہوتی نظر آئے اس کو اختیار کر لیں، اور یہ ظاہر ہے کہ ایسا کرنا کوئی دین و شریعت کا اتباع نہیں ہوگا، بلکہ اپنی اغراض و اہواء کا اتباع ہوگا، جو باجماع امت حرام ہے، علامہ شاطبی نے موافقات میں اس پر بڑی تفصیل سے کلام کیا ہے، اور ابن تیمیہ نے بھی

عام تقلید کی مخالفت کے باوجود اس طرح کے اتباع کو اپنے قیادی میں باجماع امت حرام کہا ہے، اس لئے متاخرین فقہاء نے یہ ضروری سمجھا کہ عمل کرنے والوں کو کسی ایک ہی امام مجتہد کی تقلید کا پابند کرنا چاہئے، یہیں سے تقلید شخصی کا آغاز ہوا جو درحقیقت ایک انتظامی حکم ہے، جس سے دین کا انتظام قائم رہے اور لوگ دین کی آڑ میں اتباع ہوا کی شکار نہ ہو جائیں، اس کی مثال بعینہ وہ ہے جو حضرت عثمان غنیؓ نے باجماع صحابہ قرآن کے سب سے اہل لغت (یعنی سات لغات) میں سے صرف ایک لغت کو مخصوص کر دینے میں کیا، کہ اگرچہ ساتوں لغات قرآن ہی کے لغات تھے، جبرئیل امین کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش کے مطابق نازل ہوئے مگر جب قرآن کریم عجم میں پھیلا اور مختلف لغات میں پڑھنے سے تحریف قرآن کا خطرہ محسوس کیا گیا تو باجماع صحابہ مسلمانوں پر لازم کر دیا گیا کہ صرف ایک ہی لغت میں قرآن کریم لکھا اور پڑھا جائے، حضرت عثمان غنیؓ نے اسی ایک لغت کے مطابق تمام مصاحف لکھوا کر اطراف عالم میں بھجوائے، اور آج تک پوری امت اسی کی پابند ہے، اس کے یہ معنی نہیں کہ دوسرے لغات حق نہیں تھے، بلکہ انتظام دین اور حفاظت قرآن از تحریف کی بناء پر صرف ایک لغت اختیار کر لیا گیا، اسی طرح ائمہ مجتہدین سب حق ہیں ان میں سے کسی ایک کو تقلید کے لئے معین کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جس امام معین کی تقلید کسی نے اختیار کی ہے اس کے نزدیک دوسرے ائمہ قابل تقلید نہیں، بلکہ اپنی صواب دید اور اپنی سہولت جس امام کی تقلید میں دیکھی اس کو اختیار کر لیا، اور دوسرے ائمہ کو بھی اسی طرح واجب الاحترام سمجھا۔

اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے بیمار آدمی کو شہر کے حکیم اور ڈاکٹر دوں میں سے کسی ایک کو اپنی علاج کے لئے متعین کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے، کیونکہ بیمار اپنی رائے سے کبھی کسی ڈاکٹر سے پوچھ کر دوا استعمال کرے کبھی کسی دوسرے سے پوچھ کر یہ اس کی ہلاکت کا سبب ہوتا ہے، وہ جب کسی ڈاکٹر کا انتخاب اپنے علاج کے لئے کرتا ہے، تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ دوسرے ڈاکٹر ماہر نہیں، یا ان میں علاج کی صلاحیت نہیں۔

حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی کی جو تقسیم امت میں قائم ہوئی، اس کی حقیقت اس سے زائد کچھ نہ تھی، اس میں فرقہ بندی اور گروہ بندی کا رنگ اور باجمعی جدال و شقاق کی گرم بازار نہ کوئی دین کا کام ہے نہ کبھی اہل بصیرت علماء نے اسے اچھا سمجھا ہے، بعض علماء کے کلام میں علمی بحث و تحقیق نے مناظرانہ رنگ اختیار کر لیا، اور بعد میں طعن و طنز تک فوہ آگئی، پھر جابلانہ جنگ و جدال نے وہ فوہ پتھر پتھر کی جھادی جو آج غموں کی دینداری اور مذہب پسندی کا نشان بن گیا، فالی اللہ المشتکی ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلیٰ العظیم

تفسیر: مسئلہ تقلید و اجتہاد پر جو کچھ یہاں لکھا گیا وہ اس مسئلہ کا بہت مختصر خلاصہ ہے، جو عام مسلمانوں کے سمجھنے کے لئے کافی ہے، عالمانہ تحقیقات و تفصیلات اصول فقہ کی کتابوں میں مفصل موجد ہیں، خصوصاً کتاب الموافقات علامہ شاطبی جلد راجع باب الاجتہاد، اور علامہ سیف الدین آمدی کی کتاب احکام الاحکام جلد ثالث القاعدۃ الثالثۃ فی المہتدین، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی کتاب جہۃ اللہ البالغہ اور رسالہ عقد الجید اور آخر میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی کتاب الاقتصاد فی التقليد والاجتہاد، اس مسئلے میں خاص طور سے قابل دید ہیں، اہل علم ان کی طرف مراجعت فرمائیں۔

قرآن فہمی کے لئے حدیث رسول ضروری ہے، حدیث کا انکار در قرآن کا انکار ہے

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ، اس آیت میں ذکر سے مراد باتفاق قرآن کریم ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس آیت میں مامور فرمایا ہے کہ آپ قرآن کی نازل شدہ آیات کا بیان

اور وضاحت لوگوں کے سامنے کر دیں، اس میں اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ قرآن کریم کے حقائق و معارف اور احکام کا صحیح سمجھنا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان پر موقوف ہے، اگر ہر انسان صرف عربی زبان اور عربی ادب سے واقف ہو کر قرآن کے احکام کو حسب منشاء خداوندی سمجھنے پر قادر ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیان و توضیح کی خدمت سپرد کرنے کے کوئی معنی نہیں ہوتا، علامہ شاطبی نے موافقات میں پوری تفصیل سے ثابت کیا ہے کہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری کتاب اللہ کا بیان ہے، کیونکہ قرآن کریم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا ہے، وَأَنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ، اور حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس خلق عظیم کی تفسیر یہ فرمائی تھی كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ، اس کا حاصل یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو بھی کوئی قول و فعل ثابت ہے وہ سب قرآن ہی کے ارشادات ہیں، لیکن تو ظاہری طور پر کسی آیت کی تفسیر و توضیح ہوتے ہیں، جن کو عام اہل علم جانتے ہیں، اور بعض جگہ بظاہر قرآن میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہوتا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں بطور وحی اس کا القاء کیا جاتا ہے وہ بھی ایک حیثیت سے قرآن ہی کے حکم میں ہوتا ہے، کیونکہ حسب تصریح قرآنی آپ کی کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں ہوتی، بلکہ حق تعالیٰ کی طرف سے وحی ہوتی ہے وَمَا يَنْطَلِقُ لِسُنُّكَ إِلَّا بِوَحْيٍ مُّوَسَّعٍ، اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام عبادات، معاملات، اخلاق، عادات سب کی سب وحی خداوندی اور حکم قرآن ہیں، اور جہاں کہیں آپ نے اپنے اجتہاد سے کوئی کام کیا ہے تو بالآخر وحی الہی سے یا اس پر کوئی نیکر نہ کرنے سے اس کی تفسیر اور پھر تائید کر دی جاتی ہے، اس لئے وہ بھی حکم وحی ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بعثت قرآن کریم کی تفسیر بیان کو تشریح دیا ہے، جیسا کہ سورۃ حجہ وغیرہ کی متعدد آیات میں تعلیم کتاب کے الفاظ سے اس مقصد بعثت کو ذکر کیا گیا ہے، اب وہ ذخیرہ حدیث جس کو صحابہ و تابعین سے لے کر متاخرین محدثین تک امت کے بالکمال افراد نے اپنی جانوں سے زیادہ حفاظت کر کے امت تک پہنچایا ہے، اور اس کی چھان بین میں عمریں صرف کر کے روایات حدیث کے درجے قائم کر دیئے ہیں، اور جس روایت کو بیشیئت سند اس درجہ کا نہیں پایا کہ اس پر احکام شرعیہ کی بنیاد رکھی جائے، اس کو ذخیرہ حدیث سے الگ کر کے صرف ان روایات پر مستقل کتابیں لکھ دی ہیں جو عمر بھر کی تنقیدوں اور تحقیقات کے بعد صحیح اور قابل اعتماد ثابت ہوئی ہیں۔

اگر آج کوئی شخص اس ذخیرہ حدیث کو کسی حیلے بہانے سے ناقابل اعتماد کہتا ہے، تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم تشرائی کی خلاف ورزی کی کہ مضمین قرآن کو بیان نہیں کیا، یا یہ کہ آپ نے تو بیان کیا تھا مگر وہ قائم و محفوظ نہیں رہا، بہرہ و صورت قرآن بحیثیت معجزے محفوظ نہ رہا، جس کی حفاظت کی ذمہ داری خود حق تعالیٰ نے اپنے ذمہ رکھی ہے، وَ اِنَّا لَاحْفَظُوْنَ، اس کا یہ دعویٰ اس نص قرآن کے خلاف ہے، اس سے ثابت ہوا کہ جو شخص سنت رسول کو اسلام کی حجت ماننے سے انکار کرتا ہے، وہ درحقیقت قرآن ہی کا منکر ہے، نعوذ باللہ

اَفَاَمِنَ الَّذِينَ مَكَرُوا السَّيِّئَاتِ اَنْ يَّخِيفَ اللّٰهُ بِهِمْ

سو کیا نڈر ہو گئے وہ لوگ جو بُرے فریب کرتے ہیں اس سے کہ دھنسا دیوے اللہ ان کو

الْاَرْضِ اَوْ يَأْتِيَهُمْ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ (۴۵)

۴۵

زمین میں یا آپہنچے ان پر عذاب جہاں سے خبر نہ رکھتے ہوں،

اَوْ يَأْخُذْهُمْ فِيْ ثَلَاثٍ اَوْ اَرْبَعٍ اَوْ يَخُذْهُمْ فِيْ ثَلَاثٍ اَوْ اَرْبَعٍ (۴۶)

یا پکڑے ان کو چلتے پھرتے سو وہ نہیں ہیں عاجز کرنے والے، یا

يَاْخُذْهُمْ عَلَىٰ تَخَوُّفٍ ۖ فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَّءُوفٌ رَّحِيْمٌ (۴۷)

پکڑے ان کو ڈرانے کے بعد، سو تمہارا رب بڑا نرم ہے مہربان

خلاصہ تفسیر

جو لوگ دین حق کے باطل کرنے کو، بُری بُری تدبیریں کرتے ہیں کہ کہیں اس میں شبہ نہ ہو
اعتراض نہ نکالتے ہیں اور حق کا انکار کرتے ہیں کہ ضلال ہے کہیں دوسروں کو روکتے ہیں کہ ضلال
ہے، کیا ایسے لوگ (یہ کارروائیاں کفر کی کرکے) پھر بھی اس بات سے بے فکر رہیں گے (ہوئے) ہیں
کہ اللہ تعالیٰ ان کو دان کے کفر کے وبال میں، زمین میں غرق کر دے، یا ان پر ایسے موقع سے عذاب
آپڑے جہاں ان کو گمان بھی نہ ہو (جیسے جنگ بدر میں ایسے بے سرو سامان مسلمانوں کے ہاتھ سے
ان کو سزا ملی کہ کبھی ان کو اس کا احتمال عقلی بھی نہ ہوتا کہ یہ ہم پر غالب آسکیں گے) یا ان کو چلتے پھرتے
رکسی آفت میں (پکڑ لے) (جیسے کوئی مرض ہی دفعۃً آکھڑا ہو) سو اگر ان امور میں سے کوئی امر ہو جائے
تو یہ لوگ خدا کو ہرا رہی (نہیں) کہتے یا ان کو گھٹاتے گھٹاتے پکڑ لے (جیسے قحط و دباؤ پڑے اور
تدریجاً خاتمہ ہو جائے، یعنی نڈر ہونا نہیں چاہتے، خدا کو سب قدرت ہے، مگر مہلت جو دیکھی
ہے) سو (اس کی وجہ یہ ہے کہ) تمھارا رب شفیق مہربان بڑا ہے (اس لئے مہلت دی ہے کہ اب بھی
سمجھ جاؤ اور فلاح اور نجات کا طریق اختیار کر لو)۔

معارف و مسائل

اس سے پہلی آیات میں کفار کو عذاب آخرت سے ڈرایا گیا تھا ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَمَةِ يُخْزِيهِمْ
ان آیات میں ان کو اس سے ڈرایا گیا ہے کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آخرت کے عذاب سے پہلے دنیا
میں بھی اللہ کے عذاب میں پکڑے جاؤ، جس زمین پر بیٹھے ہو اسی کے اندر دھنسا دیے جاؤ، یا اور
کسی بے گمان راستہ سے اللہ کے عذاب میں پکڑے جاؤ، جیسے غزوہ بدر میں ایک ہزار سپاہدار
مسلم جو انوں کو چند بے سرو سامان مسلمانوں کے ہاتھ سے ایسی سزا ملی جس کا ان کو کبھی دم
گمان بھی نہ ہو سکتا تھا، یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چلتے پھرتے کسی عذاب الہی میں پکڑے جاؤ کہ کوئی
بیماری جان لیوا آکھڑی ہو، یا کسی اونچی جگہ سے گر کر یا کسی سخت چیز سے ٹکرا کر ہلاک ہو جاؤ، اور
عذاب کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ دفعۃً عذاب نہ آئے مگر مال اور صحت اور تندرستی اور اسباب
راحت و سکون گھٹتے چلے جائیں، اسی طرح گھٹاتے گھٹاتے اس قوم کا خاتمہ ہو جائے۔

لفظ تنوّف جو اس آیت میں آیا ہے بظاہر غوغا سے مشتق ہے، اور بعض حضرات مفسرین
نے اسی معنی کے اعتبار سے یہ تفسیر کی کہ ایک جماعت کو عذاب میں پکڑا جائے تاکہ دوسری
جماعت ڈر جائے، اسی طرح دوسری جماعت کو عذاب میں پکڑا جائے جس سے تیسری جماعت

ڈر جائے، یوں ہی ڈراتے ڈراتے سب کا خاتمہ ہو جائے۔

مگر مفسر لہقرآن حضرت ابن عباسؓ اور مجاہدؓ وغیرہ ائمہ تفسیر نے یہاں لفظ تنقوص کے معنی میں لیا ہے، اور اسی معنی کے اعتبار سے ترجمہ گھٹاتے گھٹاتے کیا گیا ہے۔

حضرت سعید بن مسیبؓ نے فرمایا کہ حضرت فاروق اعظمؓ کو بھی اس لفظ کے معنی میں تردد پیش آیا تو آپ نے برسر منبر صحابہ کو خطاب کر کے فرمایا کہ لفظ تنقوص کے آپ کیا معنی سمجھتے ہیں؟ عام مجمع خاموش رہا، مگر قبیلہ ہذیل کے ایک شخص نے عرض کیا کہ امیر المؤمنین! یہ ہمارے قبیلہ کا خاص لغت ہے، ہمارے یہاں یہ لفظ تنقوص کے معنی میں استعمال ہوتا ہے یعنی بتدریج گھٹانا، فاروق اعظمؓ نے سوال کیا کہ کیا عرب اپنے اشعار میں یہ لفظ تنقوص کے معنی میں استعمال کرتے ہیں، اس نے عرض کیا کہ ہاں، اور اپنے قبیلہ کے شاعر ابو کبیر ہذلی کا ایک شعر پیش کیا، جس میں یہ لفظ بتدریج گھٹانے کے معنی میں لیا گیا تھا، اس پر حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا کہ: لوگو! تم اشعار جاہلیت کا علم حاصل کرو، کیونکہ اس میں تمہاری کتاب کی تفسیر اور تمہارے کلام کے معانی کا فیصلہ ہوتا ہے۔

قرآن بھی کے لئے معمولی | اس سے ایک بات تو یہ ثابت ہوئی کہ معمولی طور پر عربی زبان بولنے لکھنے کی عربی دانی کافی نہیں | قابلیت قرآن فہمی کے لئے کافی نہیں، بلکہ اس میں اتنی مہارت اور واقفیت ضروری ہے جس سے قدیم عرب جاہلیت کے کلام کو پورا سمجھا جاسکے، کیونکہ قرآن کریم اسی زبان اور انہی کے محاورات میں نازل ہوا ہے، اس درجہ کا ادب عربی سیکھنا مسلمانوں پر لازم ہے۔

عربی ادب سیکھنے کے لئے | اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے زمانہ جاہلیت کی شعرا و جاہلیت کا کلام پڑھنا | عربی زبان اور اس کا لغت و محاورات سمجھنے کے لئے شعرا و جاہلیت کا کلام پڑھنا پڑھنا جائز ہے، اگرچہ یہ ظاہر ہے کہ شعرا و جاہلیت کا کلام جاہلانہ رسوں اور خلاف اسلام جاہلانہ افعال و اعمال پر مشتمل ہوگا، مگر قرآن فہمی کی ضرورت سے اس کا پڑھنا پڑھنا جائز قرار دیا گیا۔

دنیا کا عذاب بھی ایک | آیات مذکورہ میں دنیا کے مختلف اقسام عذاب کا ذکر کرنے کے بعد خاتمہ طرح کی رحمت ہے | آیات پر فرمایا فَإِنَّ رَبَّكَ لَمَعَ لَرَوْفٌ رَّحِيمٌ اس میں اوّل تو لفظ رَبِّ سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ دنیا کے عذاب انسان کو متنبہ کرنے کے لئے شان ربوبیت کے

نشانے سے ہیں، پھر لام تاکید کے ساتھ حق تعالیٰ کا مشفق و مہربان ہونا بتلایا کہ اس طرف اشارہ فرمادیا کہ دنیا کی تنبیہات درحقیقت شفقت و رحمت ہی کے داعیہ سے ہیں تاکہ غافل انسان متنبہ ہو کر اپنے اعمال کی اصلاح کر لے۔

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى مَا خَلَقَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ يَتَفَيَّؤُا ظِلَالُهُ عَنِ الْيَمِينِ

کیا نہیں دیکھتے وہ جو کہ اللہ نے پیدا کی ہے کوئی چیز کہ ڈھلتے ہیں سائے اس کے دائیں طرف

وَالشَّمَاكِلِ سَجْدًا لِلَّهِ وَهُمْ دَاخِرُونَ ﴿۱۸﴾ وَلِلَّهِ يَسْجُدُ مَا

سے اور باتیں طرف سے سجدہ کرتے ہوئے اللہ کو اور وہ عاجزی میں ہیں ، اور اللہ کو سجدہ کرتا ہر جو

فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مِنْ دَابَّةٍ وَالْمَلَائِكَةُ وَهُمْ

آسمان میں ہے اور جو زمین میں ہے جان داروں سے اور فرشتے اور وہ

لَا يَسْتَكْبِرُونَ ﴿۱۹﴾ يَخَافُونَ رَبَّهُمْ مِنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُونَ مَا

تکبر نہیں کرتے ، ڈر رکھتے ہیں اپنے رب کا اپنے اوپر سے اور کرتے ہیں جو

يُوعَمَّرُونَ ﴿۲۰﴾ وَقَالَ اللَّهُ لَا تَتَّخِذُوا إِلَٰهَيْنِ اثْنَيْنِ إِنَّمَا هُوَ

حکم پاتے ہیں ، اور کہا ہر اللہ نے مت پکڑو معبود دو وہ مسبود

إِلَٰهُ وَاحِدٌ فَإِذَا يَفْعَلُونَ ﴿۲۱﴾ وَلَهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ

ایک ہی ہے ، سو مجھ سے ڈرو ، اور اس کا ہے جو کچھ ہر آسمانوں میں اور زمین

وَلَهُ الَّذِينَ وَاحِدًا فَخَيْرَ اللَّهِ تَتَّقُونَ ﴿۲۲﴾ وَمَا بِكُمْ مِنْ

میں اور اسی کی عبادت ہی ہمیشہ سو کیا سوائے اللہ کے کسی سے ڈرتے ہو ، اور جو کچھ تمہارے پاس

نِعْمَةٍ فَمِنْ اللَّهِ ثُمَّ إِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَإِلَيْهِ تَجْأَرُونَ ﴿۲۳﴾

ہر نعمت سو اللہ کی طرف سے ، پھر جب پہنچتی ہو تم کو سختی تو اسی کی طرف چلاتے ہو ،

ثُمَّ إِذَا كُشِفَ الضُّرُّ عَنْكُمْ إِذَا فَرِّقِينَ مِّنْكُمْ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ إِلَىٰ

پھر جب کھول دیتا ہے سختی سے اسی وقت ایک فرقہ تم میں سے اپنے رب کیلئے لگتا ہر شریک بتلانے

لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ فَتَمَتَّعُوا أَفْقَاتٍ فَنُفِثَ عَنْكُمْ وَجُنُودُ اللَّهِ

تاکہ منکر ہو جائیں اس تیز سے جو کہ ہم نے ان کو دی ہر سوزے اڑالو آخر معلوم کر لو گے ، اور

يَجْعَلُونَ لِمَا لَا يَعْلَمُونَ نَصِيبًا مِّمَّا رَزَقْنَاهُمْ طَسَاءً لِّئَلَّا

ظہراتے ہیں ان کے لئے جن کی خبر نہیں رکھتے ایک حصہ ہماری دی ہوئی روزی میں سے قسم اللہ کی

سورۃ نحل
۱۶: ۵۷

لَسَّالَتْ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُونَ ۝ وَيَجْعَلُونَ لِلَّهِ الْبَدَنَ

تم سے پوچھنا ہی جو تم بہتان باندھتے ہو، اور ٹھہراتے ہیں اللہ کے لئے بیٹیاں

سُبْحَنَهُ ۝ وَلَهُمْ مَا يَشْتَهُونَ ۝ (۵۷)

وہ اس سے پاک ہے اور اپنے لئے جو دل چاہتا ہے

خلاصہ تفسیر

کیا ان لوگوں نے اللہ کی ان پیدا کی ہوئی چیزوں کو نہیں دیکھا اور دیکھ کر توحید پر استدلال نہیں کیا (جن کے سائے کبھی ایک طرف کو بھی دوسری طرف کو اس طور پر جکتے جاتے ہیں کہ بالکل خدا کے حکم کے تابع ہیں یعنی سائے کے اسباب کہ آفتاب کا نورانی ہونا اور سایہ دار جسم کا کثیف ہونا ہی، اور حرکت سایہ کا سبب کہ آفتاب کی حرکت ہی، پھر سایہ کے خواص، یہ سب حکیم الہی ہے) اور وہ (سایہ دار چیزیں بھی) اللہ کے روبرو عاجز اور تابع حکم ہیں، اور (جس طرح یہ اشیاء مذکورہ جن میں حرکت ارادہ نہیں جیسا کہ یَقِیْنُوْا کی اسنادِ ظلال کی طرف اس کا قرینہ ہے، کیونکہ متحرک بالارادہ میں سایہ کی حرکت خود اس متحرک بالارادہ کی حرکت سے ہوتی ہے، حکیم خدا کے تابع ہیں اسی طرح) اللہ ہی کے مطیع (حکم ہیں) جتنی چیزیں (بالارادہ) چلنے والی آسمانوں میں (جیسے فرشتے) اور زمین میں (جیسے حیوانات) موجود ہیں اور (بالخصوص) فرشتے (بھی) اور وہ (فرشتے) باوجود علو مکان و رفعت شان کے اطاعتِ خداوندی سے (محبت نہیں کرتے) اور اسی لئے بالخصوص ان کا ذکر کیا گیا باوجود اسے کہ کافی السموات میں داخل تھے) وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں جو کہ ان پر بالادست ہے، اور ان کو جو کچھ (خدا کی طرف سے) حکم کیا جاتا ہے وہ اس کو کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے (تمام مکلفین کو بواسطہ رسل کے) فرمایا ہے کہ دو یا زیادہ) مجبوریت بناؤ پس ایک مجبور ہی ہے (اور جب یہ بات ہے) تو تم لوگ خاص مجھ ہی سے ڈرا کرو کیونکہ جب الوہیت میرے ساتھ خاص ہے تو جو جو اس کے لوازم ہیں کمال قدرت وغیرہ وہ بھی میرے ہی ساتھ خاص ہوں گے تو انتقام وغیرہ کا خوف مجھ ہی سے چاہئے اور شرک انتقام کو مستدعی ہے، پس شرک نہ کرنا چاہئے) اور اسی کی (ملک) ہیں سب چیزیں جو کچھ کہ آسمانوں میں اور زمین میں ہیں، اور لازمی طور پر اطاعت بجالانا اسی کا حق ہے (یعنی وہی اس امر کا مستحق ہے کہ سب اس کی اطاعت بجالادیں جب یہ بات ثابت ہے) تو کیا پھر بھی اللہ کے سوا اوروں سے ڈرتے ہو، (اور ان سے ڈر کر انکو پوجتے ہو)

اور جیسا ڈرنے کے قابل سوائے خدا کے کوئی نہیں ایسا ہی نعمت دینے والا اور امید کے قابل جیسے خدا کے کوئی نہیں چنانچہ تمہارے پاس جو کچھ (کسی قسم کی) بھی نعمت ہو وہ سب اللہ ہی کی طرف سے ہے پھر جب تم کو (ذرا) تکلیف پہنچتی ہے تو اس کے رفع ہونے کے لئے، اسی (اللہ) سے فریاد کرتے ہو اور کوئی ثبوت وغیرہ اس وقت یاد نہیں آتا جس سے توحید کا حق ہونا اس وقت تمہارے اقرار حال سے بھی معلوم ہو جاتا ہے لیکن (پھر جب اللہ تعالیٰ تم سے اس تکلیف کو ہٹا دیتا ہو تو تم میں کی ایک جماعت (اور وہی بڑی جماعت ہے) اپنے رب کے ساتھ (بدستور سابق) شرک کرنے لگتی ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ ہماری دی ہوئی نعمت کی (کہ وہ تکلیف کا رفع کرنا ہے) ناشکری کرتے ہیں (جو کہ عقلاً بھی قبیح ہے) خیر چند روزہ بیش از الود (دیکھو) اب جلد ہی (مرتے ہی) تم کو خبر ہوئی جاتی ہے اور ایک جماعت اس لئے کہا گیا کہ بعضے اس حالت کو یاد رکھ کر توحید و ایمان پر قائم ہو جاتے ہیں لقولہ تعالیٰ قَدْ تَجَهَّوْا إِلَى الْمَسْبُورِ قَدْ تَجَهَّوْا مَقْصُودٌ اور (مبطلہ ان کے شرک کے ایک یہ ہو کہ) یہ لوگ ہماری دی ہوئی چیزوں میں سے ان (معبودوں) کا حصہ لگاتے ہیں جن کے (معبود ہونے کے) متعلق ان کو کچھ علم (اور ان کے معبود ہونے کی کوئی دلیل و سند) نہیں جیسا اس کی تفصیل پورۃ ہشتم کے رکوع سوم آیت وَ جَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ غُزَرٰی ہے (قسم ہو خدا کی قسم سے تمہاری ان افتراء پر دازیوں کی (قیامت میں) ضرور باز پرس ہوگی (اور ایک شرک ان کا یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ کے لئے بٹیلیاں بچیز کرتے ہیں، سبحان اللہ کیسی بھل بات ہو) اور (اس پر یہ طرہ کہ) اپنے لئے چاہتی چیز (یعنی بیٹے پسند کرتے ہیں) :

وَإِذَا ابْشَرَ أَحَدُهُمْ بِالْأُنْثَىٰ أَظْلًا وَجْهَهُ سَوْدًا وَهُوَ

اور جب خوش خبری ملے ان میں کسی کو بیٹی کی سارے دن بے مٹھ اس کا سیاہ اور جی میں

كَبِيمٌ ﴿٥٨﴾ يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِن سُوءِ مَا بُشِّرَبِهِ أَيُمْسِكُهُ

گھستا رہے، چھپتا پھرے لوگوں سے اسے بڑائی اس خوش خبری کے جو سنی اس کو بہنے دے

عَلَىٰ هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ أَلَا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ﴿٥٩﴾

ذلت قبول کرے یا اس کو داب دے مٹی میں ستا کر بڑا فیصلہ کرتے ہیں،

لَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ وَلِلَّهِ الْمَثَلُ

جو نہیں مانتے آخرت کو ان کی بڑی مثال ہے اور اللہ کی مثال

الَا عَلَىٰ وَهْوٍ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۶۰﴾

سب اوپر اور وہی ہر ذرہ دست حکمت والا۔

خلاصہ تفسیر

اور جب ان میں کسی کو بیٹی (پیدا ہونے) کی خبر دی جائے (جس کو اللہ کے لئے تجویز کرتے ہیں) تو اس قدر ناراض ہو کہ سارے دن اس کا چہرہ بے رونق رہے، اور وہ دل ہی دل میں گھٹنار ہے (اور) جس چیز کی اس کو خبر دی گئی ہے (یعنی تولدِ دختر) اس کی عار سے لوگوں سے چھپ چھپ پھرے، اور دل میں اتار چڑھاؤ کرے کہ آیا اس (مولودِ جدید) کو ذلت (کی حالت) پر لئے رہے، یا اس کو (زندہ یا مار کر) مٹی میں گاڑ دے، خوب سن لو ان کی یہ تجویز بہت بُری ہے (کہ اول تو خدا کے لئے اولاد ثابت کرنا، یہی کس قدر بُری بات ہو، پھر اولاد بھی وہ جس کو خود اس قدر ذلیل و موجبِ عار سمجھیں پس) جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے ان کی بُری حالت ہو (دنیا میں بھی کہ ایسے جہل میں مبتلا ہیں اور آخرت میں بھی کہ مبتلائے عقوبت و ذلت ہوں گے) اور اللہ تعالیٰ کے لئے تو بڑے اعلیٰ درجہ کے صفات ثابت ہیں (نہ وہ جو کہ یہ مشرکین کہتے ہیں) اور وہ بڑے زبردست ہیں (اگر ان کو دنیا میں شرک کی سزا دینا چاہیں تو کچھ مشکل نہیں، لیکن ساتھ ہی) بڑی حکمت والے (بھی ہیں) بقدرتنا ہے حکمت بعد موت تک سزا کو مؤخر فرما دیا ہے۔

معارف و مسائل

ان آیتوں میں کفار و کافرات کی دو خصلتوں پر مذمت کی گئی ہے کہ اول تو وہ اپنے گھر میں لڑکی پیدا ہونے کو اتنا برا سمجھتے ہیں کہ شرمندگی کے سبب لوگوں سے چھپتے پھرتے ہیں، اور اس سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ لڑکی پیدا ہونے سے جو یہی ذلت ہو چکی ہے اس پر صبر کریں یا اس کو زندہ درگور کر کے چھپ چھپاؤں، اور اس پر مزید ہالت یہ ہے کہ جس اولاد کو اپنے لئے پسند نہ کریں، اللہ جل شانہ کی طرف اسی کو منسوب کریں کہ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیں۔

دوسری آیت کے آخر میں آلاءِ مآسآءِ مَا يَخْلُقْنَ کا مفہوم تفسیر بحر محیط میں جو الہ ابنِ عطلیہ ہیں دونوں خصلتیں قرار دی ہیں کہ اول تو ان کا یہ فیصلہ ہی بُرا فیصلہ ہے کہ لڑکیوں کو ایک عذاب اور ذلت سمجھیں، دوسرے پھر جس چیز کو اپنے لئے ذلت سمجھیں، اسی کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کریں۔ تیسری آیت کے اخیر میں وَهْوٍ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے کہ

لڑکی پیدا ہونے کو مصیبت و ذلت سمجھا اور چھپتے پھرنا حکمت خداوندی کا مقابلہ کرنا ہے، کیونکہ مخلوق میں نروادہ کی تخلیق عین قانون حکمت ہے (روح البیان)

مسئلہ :- ان آیتوں میں واضح اشارہ پایا گیا کہ گھر میں لڑکی پیدا ہونے کو مصیبت و ذلت سمجھنا جائز نہیں یہ کفار کا فعل ہے، تفسیر روح البیان میں بحوالہ شریعہ لکھا ہے کہ مسلمان کو چاہئے کہ لڑکی پیدا ہونے سے زیادہ خوشی کا اظہار کرے تاکہ اہل جاہلیت کے فعل پر زد ہو جائے، اور ایک حدیث میں ہے وہ عورت مبارک ہوتی ہے جس کے پہلے پیٹ سے لڑکی پیدا ہو، قرآن کریم کی آیت یَحَبُّ لِمَنْ يَشَاءُ اِنَاثًا وَيَحَبُّ لِمَنْ يَشَاءُ الذَّكَرَ کُوْر میں بھی اناث کو مقدم کرنے سے اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ پہلے پیٹ سے لڑکی پیدا ہونا افضل ہے۔

اور ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ جس کو ان لڑکیوں میں سے کسی کے ساتھ سابقہ پڑے اور پھر وہ ان کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرے تو یہ لڑکیاں اس کے لئے جہنم کے درمیان پردہ بن کر حائل ہو جائیں گی (روح البیان)

خلاصہ یہ ہے کہ لڑکی کے پیدا ہونے کو بُرا سمجھنا جاہلیت کی بُری رسم ہے مسلمانوں کو اس سے اجتناب کرنا چاہئے اور اس کے بالمقابل جو اللہ کا وعدہ ہے اس پر عمل اور مسرور ہونا چاہئے اللہ

وَلَوْ يَرَىٰ اِنَّهٗ اَخَذَ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمٍ لَّهٖمْ مَّا تَرٰكَ عَلٰی رَاْسِ دَابَّةٍ وَّ

اور اگر پکڑے اللہ لوگوں کو ان کی بے انصافی پر نہ چھوڑے زمین پر ایک پلنے والا،

لٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ وَاِذَا اٰجَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاخِرُوْنَ

لیکن ڈھیل دیتا ہے ان کو ایک وقت موعود تک، پھر جب آجھنچے گا ان کا وعدہ نہ بھیجے سرکسین گے

سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقِيْلُوْنَ ۚ اَوْ يَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ وَّ

ایک گھنٹہ اور نہ آگے سرکسین گے، اور کرتے ہیں اللہ کے واسطے جس کو اپنا جی نہ چاہے اور

تَصِفُ اَنْسِنَرُھِمُ الْکِذْبَ اَنْ لَّھُمَّ الْحَسَنٰی لَا جَرَمَ اَنْ لَّھُمَّ

بیان کرتی ہیں زبانیں ان کی جھوٹ کہ ان کے واسطے خوبی ہے، آپ ثابت ہو کہ ان کے واسطے

النَّارُ وَاَنْھُمْ مُّقْرَطُوْنَ ۚ تَا لِّلّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَا اِلٰی اٰمِمِ

آگ ہو اور وہ بڑھاتے جا رہے ہیں، قسم اللہ کی ہم نے رسول بھیجے مختلف فرقوں میں

مِّن قَبْلِكَ فَرِيقَ لَّهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَا لَهُمْ فَعَرَّوْا لِيَوْمِ الْيَوْمِ وَ

بگھرے پہلے پھر اچھے کر کے دکھلائے ان کو شیطان نے ان کے کام سودی رفیق ان کا ہوا اور

لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۶۳﴾ وَمَا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ إِلَّا لِلْمُذِنِّ

ان کے واسطے عذاب دردناک ہے اور ہم نے اتاری کتاب اسی واسطے کہ کھول کر سنائے تو

لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا فِيهِ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿۶۴﴾

ان کو وہ چیز کہ جس میں جھگڑ رہے ہیں اور سیدھی راہ سمجھانے کو اور واسطے بخشش ایمان لانے والوں کے

وَاللَّهُ أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا

اور اللہ نے آسمان سے پانی پھر اس سے زندہ کیا زمین کو اس کے مرنے کے پیچھے،

إِنِّي فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَسْمَعُونَ ﴿۶۵﴾

اس میں نشانی ہے ان لوگوں کو جو سنتے ہیں ۔

خلاصہ تفسیر

اور اگر اللہ تعالیٰ (ظالم) لوگوں پر ان کے ظلم (یعنی شرک و کفر) کے سبب (فی الفور دنیا میں پوری) دار و گیر فرماتے تو سطح زمین پر کوئی رحمت و مروت حرکت کرنے والا نہ چھوڑتے (بلکہ سب کو ہلاک کر دیتے) لیکن (فی الفور دار و گیر نہیں فرماتے بلکہ) ایک میعاد عین تک مہلت دے رہے ہیں (تاکہ اگر کوئی توبہ کرنا چاہے تو گنجائش ہو) پھر جب ان کا (وہ) وقت مہلتیں (نزدیک) آ پہنچے گا اس وقت ایک ساعت نہ (اس سے) پیچھے ہٹ سکیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے (بلکہ فوراً منزا ہو جائیں گی) اور اللہ تعالیٰ کے لئے وہ امور بتویز کرتے ہیں جن کو خود (اپنے لئے) ناپسند کرتے ہیں (جیسا اوپر آیا ہے وَیَجْعَلُونَ لِلَّهِ الْبَنَاتِ) اور (پھر) اس پر اپنی زبان سے جھوٹے دعوے کرتے جاتے ہیں کہ ان کے (یعنی ہماری) لئے (بر تقدیر و قورخ قیامت) ہر طرح کی بھلائی ہے (اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بھلائی کہاں سے آتی تھی بلکہ) لازمی بات ہو کہ ان کے لئے (قیامت کے دن) دوزخ ہے اور بیشک وہ لوگ (دوزخ میں) سب سے پہلے بھیجے جائیں گے (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان کے کفر و جہالت پر کچھ غم نہ کیجئے، کیونکہ) شجرہ آپ (کے زمانہ) سے پہلے جو امتیں ہو گزری ہیں ان کے پاس بھی ہم نے رسولوں کو بھیجا تھا (جیسا کہ آپ کو ان کے پاس بھیجا ہے) سو جس طرح یہ لوگ اپنی کفریات کو پسند کرتے ہیں اور اس پر قورخ ہم ہیں اسی طرح) ان کو بھی شیطان نے ان کے اعمال (کفریہ) مستحسن کر کے

دکھلائے پس وہ (شیطان) آج (یعنی دنیا میں) ان کا رفیق ہے (یعنی رفیق تھا کہ ان کو بہکاتا سکتا تھا) تھا پس دنیا میں تو ان کو یہ خسارہ ہوا (اور) پھر قیامت میں (ان کے واسطے دردناک سزا (مقرر) ہو) (غرض یہ لاشعین بھی ان سابقین کی طرح کفر کر رہے ہیں اور انہی کی طرح ان کو سزا بھی ہوگی، آپ کیوں غم میں پڑے) اور ہم نے آپ پر یہ کتاب (جس کا نام قرآن ہے) اس واسطے نازل نہیں کی کہ سب کا ہدایت پر لانا آپ کے ذمہ ہوتا کہ بعض کے ہدایت پر نہ آنے سے آپ منہم ہوں، بلکہ) صرف اس واسطے نازل کی ہے کہ جن امور (دین) میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں (مثل توحید و معاد و احکام حلال و حرام) آپ (عام) لوگوں پر اس کو ظاہر فرمادیں (یہ فائدہ تو قرآن کا عام ہی) اور ایمان والوں کی ہدایت (خاصہ) اور رست کی غرض سے (نازل فرمایا ہے سو یہ امور بفصلہ تعالیٰ حاصل ہیں) اور اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس سے زمین کو اس کے مرودہ ہونے کے بعد زندہ کیا (یعنی اس کی قوت نامیہ کو بعد اس کے کہ خشک ہو جانے سے کمزور ہو گئی تھی تقویت دی) اس (امداد) میں ایسے لوگوں کے لئے (توحید کی اور منعم ہونے کی) بڑی دلیل ہے جو (جی سے ان باتوں کو سنتے ہیں۔

وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۚ نُسْقِيكُمْ مِمَّا فِي بُطُونِهِ مِنْ بَيْنِ

اور تمھارے واسطے چوپایوں میں سوچنے کی جگہ ہے، پلاتے ہیں تم کو اس کے پیٹ کی چیزوں میں

فَرْتٍ وَدَمٍ لَبَنًا خَالِصًا سَائِغًا لِلشَّارِبِينَ (۶۶)

سے گوبر اور لہو کے بیچ میں سے دودھ شہرا خوشگوار پینے والوں کے لئے۔

خلاصہ تفسیر

اور (نیز) تمھارے لئے مواشی میں بھی غور درکار ہے (دیکھو) ان کے پیٹ میں جو گوبر اور خون (کا مادہ) ہے اس کے درمیان میں سے (دودھ کا مادہ کہ ایک حصہ خون کا ہے، بعد منعم کے جدا کر کے تھن کے مزاج سے ان کا رنگ بدل کر اس کو) صاف اور نکلے میں آسانی سے اترنے والا دودھ (بنا کر) ہم تم کو پینے کو دیتے ہیں۔

معارف و مسائل

بُطُونِهِ کی ضمیر اَنْعَام کی طرف راجح ہے لفظ اَنْعَام جمع مونث ہونے کا تقاضا یہ تھا کہ بُطُونُہَا کہا جاتا جیسا کہ سورۃ مؤمنون میں اسی طرح نُسْقِيكُمْ مِمَّا فِي بُطُونِہَا فرمایا گیا ہے۔

قربلی نے اس کی توبیہ یہ کی ہے کہ سورۃ مؤمنون میں معنی جمع کی رعایت کر کے ضمیر مؤنث لائی گئی، اور سورۃ نحل میں لفظ جمع کی رعایت سے ضمیر مذکر استعمال ہوئی، اور اورات عرب میں اس کی نظیریں بے شمار ہیں کہ لفظ جمع کی طرف ضمیر مذکر راجع کی جاتی ہے۔

گوہر اور خون کے درمیان سے صاف دودھ نکالنے کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ جانور جو گھاس کھاتا ہے جب وہ اس کے معدہ میں جمع ہو جاتی ہے تو معدہ اس کو پچاتا ہے معدہ کے اس عمل سے غذا کا فضلہ نیچے بیٹھ جاتا ہے اور دودھ ہو جاتا ہے، اور اس کے اوپر خون پھوٹتا ہے یہ کام جگر کے سپرد کیا ہے کہ ان تینوں قسموں کو الگ الگ ان کے مقامات میں تقسیم کر دیتا ہے، خون کو الگ کر کے رگوں میں منتقل کر دیتا ہے، اور دودھ کو الگ کر کے جانور کے عضلات میں پہنچا دیتا ہے اور اب معدہ میں صرف فضلہ باقی رہ جاتا ہے جو گوہر کی صورت میں نکلتا ہے۔ مسئلہ:۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ لذیذ اور شیریں کھانے کا استعمال زہر کے خلاف نہیں ہے جبکہ اس کو حلال طریقے سے حاصل کیا گیا ہو، اور اس میں اسراف اور فضول خرچی نہ کی گئی ہو، حضرت حسن بصریؒ نے ایسا ہی فرمایا ہے (قربلی)

مسئلہ:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم کوئی کھانا کھاؤ تو یہ کہو اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْهِ وَ اطْعِمْنَاْ خَيْرًا مِنْْهُ رَیْنِ یا اللہ اس میں ہمارے لئے برکت خدا فرما اور آئندہ اس سے اچھا کھانا نصیب فرما۔ اور

فرمایا کہ جب دودھ پیو تو یہ کہو اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْهِ وَ زِدْنَا مِنْهُ رَیْنِ یا اللہ ہمارے لئے اس میں برکت دیجئے اور زیادہ عطا فرمائیے، اس سے بہتر کا سوال اس لئے نہیں کیا کہ انسانی غذا میں دودھ سے بہتر کوئی دوسری غذا نہیں ہے، اسی لئے قدرت نے ہر انسان و حیوان کی پہلی غذا دودھ ہی بنائی ہے جو ماں کی پھاتیوں سے اسے ملتی ہے (قربلی)

وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُونَ مِنْهُ سَكَرًا

اور میوؤں سے کھجور کے اور انگور کے بناتے ہو اس سے نشہ اور

وَرِزْقًا حَسَنًا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ يَعْقِلُوْنَ (۶۷)

روزی خاصی اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے واسطے جو سمجھتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

اور نیز، کھجور اور انگوروں کی حالت میں غور کرنا چاہئے کہ ان کے پھلوں سے تم لوگ

نشہ کی چیز اور عمدہ کھانے کی چیزیں (جیسے خمرائے خشک و کشمش اور شربت اور سرکہ) بناتے ہو بیشک اس میں کوئی توحید اور منعم ہونے کی، ان لوگوں کے لئے بڑی دلیل ہو جو عقل (سلیم) رکھتے ہیں۔

معارف و مسائل

پہلی آیتوں میں حق تعالیٰ کی اُن نعمتوں کا ذکر کیا ہوا انسانی غذائیں پیدا کرنے میں عجیب و غریب صنعت و قدرت کا مظہر ہیں، اس میں پہلے دودھ کا ذکر کیا جس کو قدرت نے حیوان کے پیٹ میں خون اور فضلہ کی آلائشوں سے الگ کر کے صاف ستھری غذا انسان کے لئے عطا کر دی جس میں انسان کو کسی مزید صنعت کی ضرورت نہیں، اسی لئے یہاں لفظ **لَسْقٰتِکُمْ** استعمال فرمایا کہ ہم نے پلایا دودھ۔

اس کے بعد فرمایا کہ کھجور اور انگور کے کچھ پھلوں میں سے بھی انسان اپنی غذا اور نفع کی چیزیں بناتا ہے، اس میں اشارہ اس طرف ہوا کہ کھجور اور انگور کے پھلوں سے اپنی غذا اور منفعت کی چیزیں بنانے میں انسانی صنعت کا بھی کچھ دخل ہے، اور اسی دخل کے نتیجہ میں دو طرح کی چیزیں بنائی گئیں، ایک نشہ آور چیز جس کو خمر یا شراب کہا جاتا ہے، دوسری رزق حسن یعنی عمدہ رزق کہ کھجور اور انگور کو تروتازہ کھانے میں استعمال کریں یا خشک کر کے ذخیرہ کر لیں۔ مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے کھجور اور انگور کے پھل انسان کو دیدیئے، اور اس سے اپنی غذا وغیرہ بنانے کا اختیار بھی دیدیا، اب یہ اس کا انتخاب ہے کہ اس سے کیا بنا نشہ آور چیز بنا کر عقل کو خراب کرے یا غذا بنا کر قوت حاصل کرے۔

اس تفسیر کے مطابق اس آیت سے نشہ آور چیز یعنی شراب کے حلال ہونے پر کوئی استدلال نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہاں مقصود قدرت کے عطیات اور ان کے استعمال کی مختلف صورتوں کا بیان ہے، جو ہر حال میں نعمت خداوندی ہے جیسے تمام غذائیں اور انسانی منفعت کی چیزیں کہ ان کو بہت سے لوگ ناجائز طریقوں پر بھی استعمال کرتے ہیں مگر کسی کے غلط استعمال سے اصل نعمت تو نعمت ہونے سے نہیں نکل جاتی، اس لئے یہاں یہ تفصیل بتلانے کی ضرورت نہیں کہ ان میں کونسا استعمال حلال ہے کونسا حرام، تاہم ایک لطیف اشارہ اس میں بھی اس طرف کر دیا گیا کہ **تَسکّر** کے مقابل **رِزْقِ حَسَنٍ** رکھا جس سے معلوم ہوا کہ **تَسکّر** اچھا رزق نہیں ہے، **تَسکّر** کے معنی جہیز مفسرین کے نزدیک نشہ آور چیز کے ہیں (روح الدعائی، قولی جہیز) لہٰذا بعض علماء نے اس کے معنی سرکہ یا بے نشہ نبیذ کے بھی لئے ہیں (جصاص و قرطبی) مگر اس جگہ اس اختلاف کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں ۱۲ منہ

یہ آیات باتفاقِ امدت مکی ہیں اور شراب کی حرمت اس کے بعد مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی، نزولِ آیت کے وقت اگرچہ شراب حلال تھی، اور مسلمان عام طور پر پیتے تھے، مگر اس وقت بھی اس آیت میں اشارہ اس طرف کر دیا گیا کہ اس کا پینا اچھا نہیں، بعد میں صراحتاً شراب کو شدت کے ساتھ حرام کرنے کے لئے قرآنی احکام نازل ہو گئے (ہذا ملخص ما فی الجصاص والقربلی)

وَأَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنِ اتَّخِذِي مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا وَمِنَ

اور حکم دیا تیرے رب نے شہد کی مکھی کو کہ بنائے پہاڑوں میں گھر اور درختوں میں

الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُونَ ﴿٦٨﴾ ثُمَّ كَلَّيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ فَاسْلُكِي

اور جہاں النیاں باندبتے ہیں، پھر کھا ہر طرح کے میوؤں سے پھر چل

سُبُلَ رَبِّكِ ذُلَالًا يَخْرُجُ مِنْ بَطْنِهَا شَرَابٌ مُخْتَلِفٌ

راستوں میں اپنے رب کے شاخڑی ہیں نکلتی ہر ان کے پیٹ میں سے پینے کی چیز جس کے مختلف

الْوَانِ فِيهِ شِفَاءٌ لِلنَّاسِ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّمَن يَخْشَىٰ

رنگ ہیں اس میں مرض اچھے ہوتے ہیں لوگوں کے، اس میں نشانی ہے ان لوگوں کیلئے

يَتَفَكَّرُونَ ﴿٦٩﴾

جو دھیان کرتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

اور یہ بات بھی غور کے قابل ہے کہ آپ کے رب نے شہد کی مکھی کے جی میں یہ بات ڈالی کہ تو پہاڑوں میں گھر (یعنی چھتہ) بنالے اور درختوں میں (بھی) اور لوگ جو عمارتیں بناتے ہیں ان میں (بھی) چھتہ لگالے چنانچہ ان سب موقعوں پر وہ چھتہ لگاتی ہے (پھر ہر قسم کے مختلف) پھلوں سے (جو چھتہ کو مرغوب ہوں) اچھستی پھیر، پھر (چوس کر) چھتہ کی طرف واپس آنے کے لئے، اپنے رب کے راستوں میں چل جو (تیرے لئے باعتبار چھنے کے) ادنیٰ درہنے کے، آسان ہیں، (چنانچہ بڑی بڑی درہے راستہ بھولے ہوئے اپنے چھتے کو لوٹ آتی ہے، پھر جب بچوس کر اپنے چھتہ کی طرف لوٹتی ہے تو) اس کے پیٹ میں سے پینے کی ایک چیز نکلتی ہو (یعنی شہد) جس کی رنگتیں مختلف ہوتی ہیں (اس میں رنگوں کی بہت سی بیماریوں) کیلئے شفا ہے (بھی) ان لوگوں کیلئے (توحید کی اور نعم ہونیکی) بڑی دلیل ہے جو چھتے ہیں۔

معارف ومسائل

آؤ سچی، وہی یہاں اپنے اصطلاحی مفہوم میں نہیں ہی، بلکہ لغوی معنی میں ہے، وہ یہ کہ مکمل مخاطب کو کوئی خاص بات غرضی طور پر اس طرح سمجھا دے کہ دوسرا شخص اس بات کو نہ سمجھ سکے **التَّحَلُّل**، شہد کی مکھی اپنی عقل و فراست اور حسن تدبیر کے لحاظ سے تمام حیوانات میں ممتاز جانور ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو خطاب بھی امتیازی شان کا کیا ہے، باقی حیوانات کے بارے میں تو قانون کلی کے طریقہ پر **أَلَمْ يَخْلُقْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ** فرمایا، لیکن اس نکتہ ہی مخلوق کے بارے میں خاص کر کے آؤ سچی **رَبُّكُمْ** فرمایا جس سے اشارہ اس بات کی طرف کر دیا کہ یہ دوسرے حیوانات بہ نسبت عقل و شعور اور سوچ بوجھ میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہیں۔ شہد کی مکھیوں کی فہم و فراست کا اندازہ ان کے نظام حکومت سے بخوبی ہوتا ہے، اس ضعیف جانور کا نظام زندگی انسانی سیاست و حکمرانی کے اصول پر چلتا ہے، تمام نظم و نسق ایک بڑی مکھی کے ہاتھ میں ہوتا ہے، جو تمام مکھیوں کی حکمران ہوتی ہے، اس کی تنظیم اور تقسیم کار کی وجہ سے پورا نظام صحیح سالم چلتا رہتا ہے، اس کے عجیب و غریب نظام اور حکم قوانین و ضوابط کو دیکھ کر انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے، خود یہ ”ملکہ“ تین ہفتوں کے عرصہ میں چھ ہزار سے بارہ ہزار تک انڈے دیتی ہے، یہ اپنی قد وقامت اور وضع و قطع کے لحاظ سے دوسری مکھیوں سے ممتاز ہوتی ہو بلکہ تقسیم کار کے اصول پر اپنی رعایا کو مختلف امور پر مامور کرتی ہے، ان میں سے بعض دُباؤں کے فرائض انجام دیتی ہیں، اور کسی نامعلوم اور خارجی فرد کو اندر داخل نہیں ہونے دیتی، بعض انڈوں کی حفاظت کرتی ہیں، بعض نابالغ بچوں کی تربیت کرتی ہیں، بعض معمری اور انجینئرنگ کے فرائض ادا کرتی ہیں، ان کے تیار کردہ اکثر چھتوں کے خانے بیس ہزار سے تیس ہزار تک ہوتے ہیں، بعض موم جمع کر کے معماروں کے پاس پہنچاتی رہتی ہیں جن سے وہ اپنے مکانات تعمیر کرتے ہیں یہ موم نباتات پر جمے ہوئے سفید قسم کے سفوف سے حاصل کرتی ہیں، گنے پر یہ مادہ بکثرت نظر آتا ہے، ان میں سے بعض مختلف قسم کے پھولوں اور پھلوں پر بیٹھ کر اس کو پختی میں لے جاتا ہے، ان کے پیٹ میں شہد میں تبدیل ہو جاتا ہے، یہ شہد ان کی اور ان کے بچوں کی غذا ہے، اور یہی ہم سب کے لئے بھی لذت و غذا کا جو ہر اور دوا و شفاء کا نسخہ ہے، یہ مختلف پارٹیاں نہایت سرگرمی سے اپنے اپنے فرائض سرانجام دیتی ہیں اور اپنی ”ملکہ“ کے حکم کو دل و جان سے قبول کرتی ہیں، ان میں سے اگر کوئی گندگی پر بیٹھ جائے تو چھتے کے دربان اسے باہر روک لیتے ہیں، اور ملکہ اس کو قتل کر دیتی ہے، ان کے اس حیرت انگیز نظام اور حسن کارکردگی کو دیکھ کر انسان

حیرت میں پڑ جاتا ہے (از الجواہر)

مِیۡوَاتًا۔ اُدْحٰی رَبُّکَ سے جو ہدایت دی گئی ہے ان میں سے یہ پہلی ہدایت ہے جس میں گھر بنانے کا ذکر ہے، یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ ہر جانور اپنے رہنے سہنے کے لئے گھر تو بناتا ہی ہے، پھر اس اہتمام سے ”گھروں“ کی تعمیر کا حکم مکھیوں کو دینے میں کیا خصوصیت ہے، پھر یہاں لفظ ”مِیۡوَاتًا“ کا استعمال فرمایا جو عموماً انسانی رہائش گاہوں کے لئے بولا جاتا ہے، اس سے اشارہ ایک تو اس طرف کر دیا کہ مکھیوں کو چونکہ شہد تیار کرنا ہے، اس کے لئے پہلے سے ایک محفوظ گھر بنالیں، دوسرا اس طرف اشارہ کر دیا کہ جو گھر یہ بنائیں گی وہ عام جانوروں کے گھروں کی طرح نہیں ہوں گے، بلکہ ان کی ساخت و بناوٹ غیر معمولی قسم کی ہوگی، چنانچہ ان کے گھر عام جانوروں کے گھروں سے ممتاز ہوتے ہیں، جن کو دیکھ کر انسانی عقل بھی ششدر رہ جاتی ہے، اُن کے گھر مستطیل شکل کے ہوتے ہیں، پرکار اور مسطح سے بھی اگر ان کی پیکش کی جائے تو بال برابر بھی فرق نہیں، ہتھامس در شکل کے علاوہ وہ دوسری کسی شکل مثلاً مربع اور مئیس وغیرہ کو اس لئے اختیار نہیں کرتیں کہ ان کے بعض کونے بیکار رہ جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مکھیوں کو محض گھر بنانے کا حکم نہیں دیا بلکہ اس کا مکمل وقوع بھی بتلادیا کہ وہ کسی بلندی پر ہونا چاہئے، کیونکہ ایسے مقامات پر شہد کو تازہ اور صاف پسنی ہوتی ہو اجنبی مٹی پر وہ گندمی ہوا سے بچارہتا ہے، اور توڑ پھوڑ سے بھی محفوظ رہتا ہے، چنانچہ فرمایا:

مِنَ الْجِبَالِ مِیۡوَاتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَّمِمَّا یَحِیۡ شَوۡنَ یَعۡنِ اِنۡ لَّکُمۡ دُلۡلٌ کِیۡ تَعۡبِرُ بِہَا وُۡلُ وَاخۡتَوٰنَ اور بلند عمارتوں پر ہونی چاہئے، تاکہ شہد بالکل محفوظ طریقہ سے تیار ہو سکے۔

ثُمَّ یَحۡضِیۡ مِّنۡ کُلِّ الشَّجَرِۃِ یَہِیۡ ہِدٰیۃً سبۃً جس میں مکھی کو حکم دیا جا رہا ہے کہ اپنی رغبت اور پسند کے مطابق پھل پھول سے رس چوسے، یہاں مِّنۡ کُلِّ الشَّجَرِۃِ فرمایا، لیکن بظاہر یہاں لفظ ”کُلِّ“ سے دنیا بھر کے پھل پھول مراد نہیں ہیں، بلکہ جن تک آسانی سے اس کی رسائی ہو سکے، اور مطلب جس سے ہو سکے، ”کُلِّ“ کا یہ لفظ مکمل سبب کے واقعہ میں بھی وارد ہوا کہ دَاوۡتِیَّتَ مِّنۡ کُلِّ شَیۡءٍ اور ظاہر ہے کہ وہاں بھی استغراق کُلِّ مراد نہیں ہے، کہ مکمل سبب کے پاس ہوائی جہاز اور ریل موٹر ہونا بھی لازم آئے، بلکہ اس وقت کی تمام ضروریات و مناسبات مراد ہیں، یہاں بھی مِّنۡ کُلِّ الشَّجَرِۃِ سے یہی مراد ہے، — یہ مکھی ایسے ایسے لطیف اور قیمتی اجزاء چوستی ہے کہ آج کے سائنسی دور میں مشینوں سے بھی وہ ہر نہیں نکالا جاسکتا۔

فَاَنۡسَلِکِیۡ سُبۡلَ رَبِّکَ ذٰلَکَ، یہ مکھی کو تیسری ہدایت دی جا رہی ہے کہ اپنے رب کے ہموار کئے ہوئے راستوں پر چل پڑ، یہ جب گھر سے دور دراز مقامات پر پھل پھول کو رس چوسنے

کے لئے نہیں جاتی ہے، تو بلاشبہ اس کا اپنے گھر میں واپس آنا مشکل ہونا چاہئے تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے راہوں کو آسان بنا دیا ہے، چنانچہ وہ میلوں دور جاتی ہے اور بغیر بھولے بھٹکے اپنے گھر واپس پہنچ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فضا میں اس کے لئے راستے بنا دیئے ہیں، کیونکہ زمین کے پچھڑے دار راستوں میں بھٹکنے کا خطرہ ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے فضا کو اس حقیر و ناتواں مکھی کے لئے مسخر کر دیا، تاکہ وہ کسی روک ٹوک کے بغیر اپنے گھر آسانی سے آجاسکے۔

اس کے بعد وہی کے اس حکم کا جو حقیقی ثمرہ تھا، اس کو بیان فرمایا: **يَخْرُجُ مِنْ بَطْنِهَا شَيْءٌ اَبْشَرٌ مِنْ دُمِّهَا وَ لَوْ اَنَّ فِيهِ شِفَاؤٌ لِّلنَّاسِ لَكُنَّا مِنْكُمْ** اس کے پیٹ میں سے مختلف رنگ کا شے دب نکلتا ہے، جس میں قصاصے لئے شفا ہے، "رنگ کا اختلاف غذا اور موسم کے اختلاف کی بنا پر ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر کسی خاص علاقے میں کسی خاص پھل پھول کی کثرت ہو تو اس علاقہ کے شہد میں اس کا اثر روزانہ ضرور ہوتا ہے، شہد عموماً چونکہ سیال مادہ کی شکل میں ہوتا ہے، اس لئے اس کو شراب (پینے کی چیز) فرمایا، اس جملے میں بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور قدرت کا اعلان کی قاطع دلیل موجود ہے، کہ ایک چھوٹے سے جانور کے پیٹ سے کیسا منفعت بخش اور لذیذ شے دب نکلتا ہے، حالانکہ وہ جانور خود زہریلا ہے، زہر میں سے یہ تریاق واقعی اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی عجیب مثال ہے، پھر قدرت کی یہ بھی عجیب صنعت گری ہے کہ دودھ دینے والے حیوانات کا دودھ موسم اور غذا کے اختلاف سے سرخ و زرد نہیں ہوتا اور مکھی کا شہد مختلف رنگوں کا ہو جاتا ہے۔

فِيهِ شِفَاؤٌ لِّلنَّاسِ، شہد جہاں قوت بخش غذا اور لذت و طعم کا ذریعہ ہے، وہاں امراض کے لئے نسخہ شفا بھی ہے، اور کیوں نہ ہو، خالق کائنات کی یہ لطیف گشتی مشین جو ہر قسم کے پھل پھول سے مقوی عرق اور پاکیزہ جوہر کشید کر کے اپنے محفوظ گھروں میں ذخیرہ کرتی ہو اگر جراثیمی بوٹیوں میں شفا و دوا کا سامان ہے تو ان کے جوہر میں کیوں نہ ہوگا، بلغمی امراض میں بلا واسطہ اور دوسرے امراض میں دوسرے اجزاء کے ساتھ مل کر بطور دوا شہد کا استعمال ہوتا ہے، اطباء مجبوزوں میں بطور خاص اس کو شامل کرتے ہیں، اس کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ نہ وہ بھی خراب نہیں ہوتا اور دوسری اشیاء کی بھی طویل عرصہ تک حفاظت کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہزار ہا سال سے اطباء اس کو انکلیل کی جگہ استعمال کرتے آئے ہیں، شہد مہل ہے اور پیٹ سے فاسد مادہ نکالنے میں بہت مفید ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک صحابی نے اپنے بھائی کی بیماری کا حال بیان کیا تو آپ نے اسے شہد پلانے کا مشورہ دیا، دوسرے دن پھر آکر اس نے بتلایا کہ بیماری بدستور ہے، آپ نے پھر وہی مشورہ دیا، تیسرے دن جب

اس نے پھر کہا کہ اب بھی کوئی فرق نہیں ہے تو آپ نے فرمایا: **وَكَذَبَ بَطْنُ أَبِي لَهَبٍ** اللہ کا قول بلا ریب سچا ہے، پھر یہ بھائی کا بیت بھولتا ہے۔ "مرا یہ ہو کہ دوا کہ قصور نہیں مگر اس کے میزان خاص کی وجہ سے جلدی اثر ظاہر نہیں ہوا، اس کے بعد پھر پلایا تو یہ رتھ درست ہو گیا۔

یہاں قرآن کریم میں شفا کا ذکر ہے، اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اس کا ہر مرض کے لئے تو شفا ہوتا معلوم نہیں ہوتا، لیکن شفا کی توفیق جو تعظیم کے لئے ہے اس بات پر ضرور دلالت کرتی ہے کہ شفا کی شفا عظیم اور ممتاز نوعیت کی ہے اور اللہ تعالیٰ کے بعض اہل اول بندے

وہ بھی ہیں جن کو شفا کے کسی بھی مرض کے لئے شفا ہونے میں کوئی شبہ نہیں ان کو اپنے رب کے قول کے اس ظاہر پر اس قدر تسلیم یقین اور مضبوط اعتقاد ہے کہ وہ پھول سے اور آنکھ کا علاج بھی شفا سے کرتے ہیں اور جسم کے دوسرے امراض کا بھی۔ حضرت ابن عباس کے

متعلق روایات میں ہے کہ ان کے بدن پر اگر پھوڑا بھی نکل آتا تو اس پر شفا کا ایسا کر کے علاج کرتے، بعض لوگوں نے ان سے اس کی وجہ پوچھی تو جواب میں فرمایا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس کے متعلق یہ نہیں فرمایا **فِيهِ شِفَاءٌ لِّلنَّاسِ** (قرآن)

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ دسیا ہی معاملہ کرتے ہیں جیسا ان بندوں کا اپنے رب کے متعلق اعتقاد ہوتا ہے، حدیث قدسی میں فرمایا: **اِذَا عَنِ غُلَّتِ عَيْنُ عَبْدٍ** یعنی حق تعالیٰ نے فرمایا کہ بندہ جو کچھ مجھ سے گمان رکھتا ہے میں اس کے پاس ہوتا ہوں یعنی اس کے مطابق کر دیتا ہوں۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا ملک کی مذکورہ بالا مثالیں بیان فرمانے کے بعد انسان کو پھر غور و فکر کی دعوت دی ہے، کہ قدرت کی ان مثالوں میں غور و فکر کر کے تو دیکھ لو، اللہ تعالیٰ مردہ زمین کو پانی برسا کر زندہ کر دیتا ہے، وہ غلات و نبات و خجاست کے درمیان سے تمھارے لئے سبب و شفا اور خوشگوار و دودھ کی نابیاں بہاتا ہے، وہ انگور و کھجور کے درختوں پر شیریں پھل پیدا کرتا ہے، جن سے تم بڑے شہزادے اور مہرے دار مرتبے بناتے ہو، وہ ایک چھوٹے سے نہریے جادو کے ذریعہ بھارت کے لئے لذت و طعم اور غذا و شفا کا بہترین سامان مہیا کرتا ہے۔ کیا اب بھی تم دیوی،

دیوتاؤں کو پکارو گے؟ کیا اب بھی تمھاری عبادت و ذرا اپنے خالق و مالک کے بھائے پتھر اور لکڑی کی بے جان مورتیوں کے لئے ہوگی؟ اور خوب سمجھ لو! کیا یہ بھی تمھاری عقل میں آ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ اندھے، بہرے اور بے شعور مادے کی کرشمہ سازی ہو؟ نسبتاً کارگیری کے یہ بے شمار شاہکار، حکمت و تدبیر کے یہ حیرت انگیز کارنامے اور عقل و دانش

کے یہ بہترین فیصلے اپنی زبان حال سے پکار پکار کر گویا ہیں کہ ہمارا ایک خالق ہے، یکتا و حکمت والا خالق تو ہی عبادت و وفار کا مستحق ہے، وہی شکل کشا ہے، اور شکر و حمد اسی کو سزاوار ہے۔

(۱) آیت سے معلوم ہوا کہ عقل و شعور انسانوں کے علاوہ دوسرے جانداروں میں بھی ہے **وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يَسْبِيحُ بِحَمْدِهِ**، البتہ عقل کے درجات مختلف ہیں

انسانوں کی عقل تمام ذی حیات اشیاء کی عقلوں سے زیادہ کامل ہے، اسی وجہ سے وہ احکام شرعیہ کا مکلف ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر جنوں کی وجہ سے انسان کی عقل میں فتور آجائے تو دوسری مخلوقات کی طرح وہ بھی مکلف نہیں رہتا۔

(۲) شہد کی مکھی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی فضیلت میں حدیث وارد ہوئی

ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

الَّذِي بَاتَ مُحْكِمًا فِي الشَّيْءِ
يَجْعَلُهُ عَذَابًا لِأَهْلِ النَّارِ
إِلَّا النَّحْلَ،

(لوادرا اصول بحوالہ قوطبی)

یعنی دوسری ایذا رساں جانداروں کی طرح مکھیوں کی بھی تمام قسمیں جہنم میں جاتیں گی، جو وہاں چہنیوں پر بطور عذاب مستعد کر دی جائیں گی، مگر شہد کی مکھی جہنم میں نہیں جاتے گی۔

نیز ایک حدیث میں آپ نے اس کو مارنے سے منع فرمایا ہے۔ (ابوداؤد)

(۳) ابابار کا اس میں کلام ہے کہ شہد کی مکھی کا فضلہ ہے، یا اس کا لعاب ہے، ارسطاطالیس نے شیشے کا ایک نفیس جہتہ بنا کر مکھیوں کو اس میں بند کر دیا تھا، وہ ان کے نظام کار کو جاننا چاہتا تھا، لیکن ان مکھیوں نے سب سے پہلے برتن کے اندرونی حصہ پر موم اور کیچڑ کا پردہ چڑھا دیا اور جب تک پوری طرح پردہ پوش نہیں ہو گئیں اُس وقت تک اپنا کام شروع نہیں کیا۔

حضرت علی کریم اللہ وجہہ نے دنیا کی حقارت کی مثال دیتے ہوئے فرمایا،

أَشْرَفُ لِبَاسٍ بَنِي آدَمَ فِيهِ
لُعَابُ دَوْدَ وَ أَشْرَفُ
شَيْءٍ أَبَدٍ رَجِيمٌ نَحْلِي،

”انسان کا بہترین ریشی لباس اس کا شیشہ کے ایک چھوٹے سے کیڑے کا لعاب اور اس کا نفیس لذت بخش مشروب مکھی کا فضلہ“

(۴) فیہ شفاء للناس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دوا سے مرض کا علاج کرنا جائز ہے،

اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بطور انعام ذکر کیا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے وَ نَزَّلَ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ،

حدیث میں دوا استعمال کرنے اور علاج کرنے کی ترغیب آئی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے

بعض حضرات نے سوال کیا کہ کیا ہم دوا استعمال کریں؟ آپ نے فرمایا کیوں نہیں، علاج کر لیا کرو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے جو بھی مرض پیدا کیا ہے اس کے لئے دوا بھی پیدا فرمائی ہے، مگر ایک مرض کا علاج نہیں، انہوں نے سوال کیا وہ مرض کونسا ہے؟ آپ نے فرمایا بڑھا ہوا دوا اور دارالترندی بحوالہ قرطبی

حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ سے بھی ایک روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یہ جو ہم بھٹاڑ پھونک کا عمل کرتے ہیں یا دوا سے اپنا علاج کرتے ہیں، اسی طرح بچاؤ اور حفاظت کے جو انتظامات کرتے ہیں کیا یہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کو بدل سکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا یہ بھی تو تقدیر الہی ہی کی سورتیں ہیں۔ غرض یہ کہ علاج کرنے اور دوا استعمال کرنے کے جواز پر تمام علماء متفق ہیں، اور اس سلسلے میں بے شمار احادیث و آثار وارد ہوئے ہیں، حضرت ابن عمرؓ کی اولاد میں اگر کسی کو بچھو کاٹ لیتا تھا تو اسے تریاق پلاتے تھے، اور بھٹاڑ پھونک سے اس کا علاج فرماتے، آپ نے لقوہ کے مریض پر داغ لگا کر اس کا علاج کیا (قرطبی)

بعض صوفیاء کے متعلق منقول ہے کہ وہ علاج کو پسند نہیں کرتے تھے، اور حضرت صحابہ میں سے بھی بعض کے عمل سے یہ ظاہر ہوتا ہے، مثلاً روایت ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیمار ہو گئے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان کی عیادت کے لئے تشریف لائے اور ان سے پوچھا، آپ کو کیا شکایت ہے؟ انہوں نے جواب دیا مجھے اپنے گناہوں کی فکر ہے، حضرت عثمانؓ نے فرمایا پھر کس چیز کی خواہش ہے؟ فرمایا میں اپنے رب کی رحمت کا طلب گار ہوں، حضرت عثمانؓ نے فرمایا آپ پسند کریں تو میں طبیب کو بول لیتا ہوں؟ انہوں نے جواب دیا، طبیب ہی نے تو مجھے لٹایا ہے (یہاں مجازی طور پر طبیب مراد اللہ تعالیٰ شانہ ہیں) لیکن اس قسم کے واقعات اس بات کی دلیل نہیں کہ یہ حضرات علاج کو مکروہ سمجھتے تھے، ہو سکتا ہے کہ اس وقت ان کے ذوق کو گوارہ نہیں تھا، اس لئے طبیعت کے قبول نہ کرنے کی وجہ سے انہوں نے پسند نہیں کیا، یہ وقتی طور پر غلبہ حال کی ایک کیفیت ہوتی ہے جس کو علاج کے ناجائز یا مکروہ ہونے کی دلیل نہیں بنایا جاسکتا، حضرت عثمانؓ کا حضرت ابن مسعودؓ سے درخو است کرنا کہ میں آپ کے لئے طبیب لے آتا ہوں خود اس بات کی دلیل ہے کہ علاج جائز ہے، بلکہ بعض صورتوں میں یہ واجب بھی ہو جاتا ہے۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفَّيْكُمْ فَمَنْ يُرِدْ اِلٰى اَرْضٍ لّٰ

اور اللہ نے تم کو پیدا کیا پھر تم کو موت دیتا ہے اور کوئی تم میں سے پہنچا جاتا ہے

الْعَصْرِ لِكٰى لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمِ شَيْءٍ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ (۷۰)

کو تاکہ سمجھنے کے پیچھے اب کچھ نہ سمجھے، اللہ خبردار ہے قدرت والا

۹
ع
۱۵

خلاصہ تفسیر

اور اپنی حالت بھی سوچنے کے قابل ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو (اول) پیدا کیا پھر تم کو ختم ہونے پر تمہاری جان قبض کرنا ہے (جن میں بعض تو ہوش و حواس میں چلتے ہاتھ پاؤں اٹھ جاتے ہیں) اور بعض تم میں وہ ہیں جو ناکارہ ہو کر پہنچ جاتے ہیں (جن میں نہ قوت جسمانیہ رہی نہ قوت عقلیہ رہے) جس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ ایک چیز سے باخبر ہو کر پھر بے خبر ہو جاتا ہے (جیسا کہ اکثر ایسے بڑھوں کو دیکھا جاتا ہے کہ ابھی ان کو ایک بات بتلائی اور ابھی بھول گئے اور پھر اس کو پوچھ رہے ہیں) بے شک اللہ تعالیٰ بڑے علم والے بڑی قدرت والے ہیں (علم سے ہر ایک مسامت جانتے ہیں، اور قدرت سے ویسا ہی کر دیتے ہیں، اس لئے حیات و وفات کی حالتیں مختلف کر دیں، پس یہ بھی دلیل ہے توحید کی) :

معارف و مسائل

اس سے قبل اللہ تعالیٰ نے پانی، نباتات، چوپائے اور شہر کی مکھن کے مختلف احوال بیان فرما کر انسان کو اپنی قدرت کا ملہ اور مخلوق کے لئے اپنے انعامات پر متنبہ کیا، اب ان آیات سے اس کو اپنے اندرونی حالات پر غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں کہ انسان کچھ نہ تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کو وجود کی دولت سے نوازا پھر جب پایا موت بھیج کر وہ نعمت ختم کر دی، اور بعضوں کو تو موت سے پہلے ہی پیرانہ سالی کے ایسے درجہ میں پہنچا دیتے ہیں کہ ان کے ہوش و حواس ٹھکانے نہیں رہتے، ان کے ہاتھ پاؤں کی طاقت ختم ہو جاتی ہے، نہ وہ کوئی بات سمجھ سکتے ہیں، اور نہ سمجھی ہوئی یاد رکھ سکتے ہیں، یہ آفاقی اور انفسی تغیر و تبدل اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ علم و قدرت اسی ذات کے خزانہ میں ہے جو خالق و مالک ہے۔

وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ، مَنْ يُّرَدُّ کے لفظ سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ انسان پر پہلے بھی ایک ضعف اور کمزوری کا وقت گزر چکا ہے، اس کے بچپن کا ابتدائی دور تھا، جس

یہ کسی سوجھ بوجھ کا مالک نہ تھا، اس کے قوی بالکل ضعیف و ناتواں تھے، یہ اپنی بھوک پیاس کو دور کرنے اور اپنے آٹھنے بیٹھنے میں غیروں کا محتاج تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو جوانی عطا کی یہ اس کی ترقی کا زمانہ ہے، پھر رفتہ رفتہ اس کو بڑھاپے کے ایسے درجہ میں پہنچا دیتے ہیں جس میں یہ بالکل اسی طرح کمزوری، ضعیف اور اضمحلال کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے جیسا کہ بچپن میں تھا۔

أَرَادَ لِي الْعُمُرِ، اس سے مراد پیرانہ سالی کی وہ عمر ہے جس میں انسان کے تمام جسمانی اور دماغی قوی ختم ہو جاتے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس عمر سے پناہ مانگتے تھے، ارشاد:

اللَّهُمَّ إِنِّي أَخُوذُ بِكَ مِنْ	یعنی یا اللہ میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں
سُوْرَةِ الْعُمُرِ فِي رَوَايَةٍ	بڑی عمر سے، اور ایک روایت میں ہو کہ پناہ
بِقَوْلِهِ أَنِّي أَرَادَ لِي الْعُمُرِ	مانگتا ہوں ارذلِ عمر سے

ارذلِ العمر کی تعریف میں کوئی تصریح نہیں ہے، البتہ مذکورہ تعریف راجح معلوم ہوتی ہے، جس کی طرف قرآن نے بھی لکھلا يَعْلَمَ بَعْدَ عَلْمِهِ شَيْئًا سے اشارہ کیا ہے، کہ وہ ایسی عمر ہے جس میں ہوش و ہوا اس باقی نہیں رہتے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمام معلومات بھول جاتا ہے۔

ارذلِ العمر کی تعریف میں اور بھی اقوال ہیں، بعض نے انسی سال کی عمر کو ارذلِ العمر قرار دیا ہے اور بعض نے نوے سال کو، حضرت علیؓ نے بھی پچتر سال کا قول منقول ہے،
رسمیں بحوالہ مظہری

لِكَيْلَا يَعْلَمَ بَعْدَ عَلْمِهِ شَيْئًا، پیرانہ سالی کے انتہائی درجہ میں پہنچنے کے بعد آدمی میں نہ قوتِ جسمانی رہتی ہے اور نہ ہی عقلیہ جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ایک چیز سے باخبر ہو کر پھر بے خبر ہو جاتا ہے، وہ تمام معلومات بھول کر بالکل کھل کے بچے کی مانند ہو جاتا ہے، جس کو نہ علم نہ خبر ہے اور نہ ہی فہم و فراست، حضرت عکرمہؓ فرماتے ہیں کہ قرآن پڑھنے والے کی یہ حالت نہیں ہوگی۔
 إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ قَدِيرٌ يَوْمَ تُبْشَرُ السَّاعَةَ بِشَيْءٍ اللَّهُ تَعَالَى بڑے علم والے، بڑی قدرت والے ہیں۔

علم سے ہر شخص کی عمر کو جانتے ہیں اور قدرت سے جو چاہتے ہیں کہتے ہیں، اگرچہ ہیں تو طاقت ور نوجوان پر ارذلِ العمر کے آثار طاری کر دیں، اور چاہیں تو سو سال کا معمر انسان بھی طاقت ور جوان رہے، یہ سب کچھ اسی ذات کے دستِ قدرت میں ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔

وَاللَّهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ فَمَا الَّذِي يُرَى

اور اللہ نے بڑائی دی تم میں ایک کو ایک پر روزی میں، سو جن کو

فَضِّلُوا بَرَّادِي رِزْقِهِمْ عَلَى مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيهِ

بڑائی دی وہ نہیں پہنچا دیتے اپنی روزی ان کو جن کے مالک اُن کے ہاتھ ہیں کہ وہ سب

سَوَاءٌ أَفَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ ﴿۷۱﴾

اس میں برابر ہو جائیں، کیا اللہ کی نعمت کے منکر ہیں۔

خلاصہ تفسیر

اور راہباتِ توحید کے ساتھ شرک کی قباحت ایک باہمی معاملہ کے ضمن میں سنو کہ اللہ تعالیٰ نے تم میں بعضوں کو بعضوں پر رزق رکے (باب) میں فضیلت دی ہے (مثلاً کسی کو غنی اور غلاموں کا مالک بنایا کہ ان کے ہاتھ سے ان غلاموں کو بھی رزق پہنچتا ہے اور کسی کو غلام بنا دیا، کہ اس کو مالک ہی کے ہاتھ سے رزق پہنچتا ہے، اور کسی کو نہ ایسا غنی بنایا کہ دوسرے غلاموں کو نہ غلام بنایا کہ اس کو کسی مالک کے ہاتھ سے پہنچے) سو جن لوگوں کو (رزق میں خاص) فضیلت دی گئی ہے کہ ان کے پاس مال بھی ہو اور غلام بھی ہیں، وہ (لوگ) اپنے حصہ کا مال اپنے غلاموں کو اس طرح بھی دینے والے نہیں کہ وہ (مالک و مملوک) سب اس میں برابر ہو جائیں (کیونکہ اگر غلام رکھ کر دیا تو مال ان کی ملک ہی نہ ہوگا، بلکہ بدستور یہی مالک رہیں گے، اور اگر آزاد کر کے دیا تو مساوات ممکن ہی مگر وہ غلام نہ رہیں گے، پس غلامی اور مساوات ممکن نہیں، اسی طرح یہ بُت وغیرہ جب باعترافِ مشرکین خدا تعالیٰ کے مملوک ہیں، تو باوجود مملوک ہونے کے معبودیت میں خدا کے مماثل کیسے ہو جائیں گے، اس میں شرک کی انتہائی تقبیح ہے کہ جب تمھارے غلام تمھارے شریکِ رزق نہیں ہو سکتے تو اللہ تعالیٰ کے غلام اس کے شریکِ الوہیت کیسے ہو سکتے ہیں) کیا (یہ معنائیں سن کر) پھر بھی (خدا کے تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتے ہیں جس سے عقلاً یہ لازم آتا ہے کہ) خدا تعالیٰ کی نعمت کا (یعنی اس بات کا کہ خدا نے نعمت دی ہے) انکار کرتے ہیں؟

معارف و مسائل

اس سے پہلی آیات میں حق تعالیٰ نے اپنے علم و قدرت کے اہم مظاہر اور انسان پر مبذول ہونے والی نعمتوں کا تذکرہ فرما کر اپنی توحید کے فطری دلائل بیان فرمائے ہیں، جن کو دیکھ کر ادنیٰ سمجھ بوجھ والا آدمی بھی کسی مخلوق کو حق تعالیٰ کے ساتھ اس کی صفاتِ علم و قدرت وغیرہ میں شریک نہیں مان سکتا، اس آیت میں اسی مضمونِ توحید کو ایک باہمی معاملہ کی مثال سے واضح

کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے انسانی مصالح کے پیش نظر رزق میں سب انسانوں کو برابر نہیں کیا، بلکہ بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے، اور مختلف درجات قائم فرمائے، کسی کو ایسا غنی بنادیا جو ساز و سامان کا مالک ہو، چشم و خدم، غلام و خدمتگار رکھتا ہے، وہ خود بھی اپنی منشاء کے مطابق خرچ کرتا ہے، اور غلاموں، خدمتگاروں کو بھی اس کے ہاتھ سے رزق پہنچتا ہوا اور کسی کو غلام و خدمتگار بنادیا کہ وہ دوسروں پر تو کیا خرچ کرتے ان کا اپنا خرچ بھی دوسروں کے ذریعہ پہنچتا ہے، اور کسی کو متوسط الحال بنایا، نہ اتنا غنی کہ دوسروں پر خرچ کرے، نہ اتنا فقیر و محتاج کہ اپنی ضروریات میں بھی دوسروں کا دست نگر ہو۔

اس قدرتی تقسیم کا یہ اثر سب کے مشاہدہ میں ہے کہ جس کو رزق میں فضیلت دی گئی اور غنی بنایا گیا وہ کسی اس کو گوارا نہیں کرتا کہ اپنے مال کو اپنے غلاموں، خدمتگاروں میں اس طرح تقسیم کر دے کہ وہ بھی مال میں اس کے برابر ہو جائیں۔

اس مثال سے سمجھو کہ جب مشرکین بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ بت اور دوسری مخلوقات جن کی وہ پرستش کرتے ہیں سب اللہ تعالیٰ کی مخلوق و مملوک ہیں تو یہ کیسے تجویز کرتے ہیں کہ یہ مخلوق و مملوک اپنے خالق و مالک کے برابر ہو جائیں، کیا یہ لوگ یہ سب نشانیاں دیکھ کر اور یہ مضامین سن کر پھر بھی خدا تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک اور برابر قرار دیتے ہیں، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار کرتے ہیں، کیونکہ اگر یہ اقرار ہوتا کہ یہ سب نعمتیں صرف اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہیں ان میں کسی خود تراشیدہ بت کا یا کسی انسان اور جن کا کوئی دخل نہیں ہے تو پھر ان چیزوں کو اللہ تعالیٰ کے برابر کیسے قرار دیتے؟

یہی مضمون سورۃ روم کی اس آیت میں بھی ارشاد ہوا ہے:

صَرَبَ نَکُمْ مَثَلًا مِّنْ أَنْفُسِكُمْ هَلْ لَّکُمْ مِّنْ مَّا مَلَکَتْ أَيْمَانُکُمْ مِّمَّا شَرَّ کَاۤءِفٍ مَّا دَرَسْنَا فَنَکُمْ فَانْتُمْ فِیۡہِ سَوَآءٌ (سورۃ روم آیت ۲۸) ”تھارے لئے تم ہی میں سے ایک مثال دی ہے، جو لوگ تمہارے زیر دست ہیں کیا وہ ہمارے دیئے ہوئے رزق میں تمہارے شریک ہیں کہ تم اس میں برابر ہو گئے ہو؟“

اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ تم اپنے مملوک غلاموں اور خدمتگاروں کو اپنے برابر کرنا پسند نہیں کرتے تو اللہ کے لئے یہ کیسے پسند کرتے ہو کہ وہ اور اس کی مخلوق و مملوک چیزیں اس کے برابر ہو جائیں۔

معاش میں درجات کا اختلاف	اس آیت میں واضح طور پر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ فقر و غنی اور معیشت
انسانوں کے لئے رحمت ہے	میں انسانوں کے مختلف درجات ہونا کہ کوئی غریب ہو کوئی امیر

کوئی متوسط الحال یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں، حق تعالیٰ کی حکمت بالغہ کا تقاضا ہے اور انسانی مصالح کا مقتضی اور انسانوں کے لئے رحمت ہے، اگر یہ صورت نہ رہے اور مال و سامان میں سب انسان برابر ہو جائیں تو نظام عالم میں خلل اور فساد پیدا ہو جائے گا، اسی لئے جب دنیا آباد ہوئی کسی دور اور کسی زمانے میں سب انسان مال و متاع کے اعتبار سے مساوی نہیں ہوئے، اور نہ ہو سکتے ہیں، اور اگر کہیں زبردستی ایسی مساوات پیدا کر بھی دی جائے تو چند ہی روز میں تمام انسانی کاروبار میں خلل اور فساد کا مشاہدہ ہو جائے گا، حق تعالیٰ نے جیسے تمام انسانوں کو عقل و دماغ اور قوت و طاقت اور صلاحیت کار میں مختلف مزاہدوں پر تقسیم کیا ہے، اور ان میں ادنیٰ، اعلیٰ، متوسط کی اقسام ہیں، جس کا کوئی صاحب عقل انکار نہیں کر سکتا، اسی طرح یہ بھی ناگزیر ہے کہ مال و متاع میں بھی یہ مختلف درجات قائم ہوں کہ ہر شخص اپنی اپنی صلاحیت کے اعتبار سے اس کا صلہ پائے، اور اگر اہل صلاحیت اور نااہل کو برابر کر دیا گیا تو اہل صلاحیت کی جو مشکلی ہوگی، جب محیشت میں اس کو نااہلوں کے برابر ہی رہنا ہے تو وہ کو نسا داعیہ ہے جو اسے جدوجہد اور فکر و عمل پر مجبور کرے، اس کا لازمی نتیجہ صلاحیت کار کو برباد کرنا ہوگا۔

ارشادِ دولت کے | البتہ خائن کائنات نے جہاں عقلی اور جسمانی قوتوں میں بعض کو بعض پر فضیلت
 خلا قرآنی احکام | دی اور اس کے تابع رزق اور مال میں تفاوت قائم فرمایا، وہیں معاش کا یہ
 نظام محکم بھی قائم فرمایا کہ ایسا نہ ہونے پائے کہ دولت کے خزانوں اور کسب معاش کے مرکزوں
 پر چند افراد یا کوئی خاص جماعت قبضہ کر لے، دوسرے اہل صلاحیت کے کام کرنے کا میدان ہی باقی
 نہ رہے کہ وہ اپنی عقلی اور جسمانی صلاحیتوں سے کام لے کر معاش میں ترقی کر سکیں، اس کے لئے
 قرآن کریم سورہ حشر میں ارشاد فرمایا: **لَا يَكُونُ دُولًا كَبَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مُتَنَكِّمًا** یعنی
 ہم نے تقسیم دولت کا قانون اس لئے بنایا کہ دولت صرف سرمایہ داروں میں منحصر ہو کر نہ رہ جائے
 آج کل دنیا کے معاشی نظاموں میں جو افراتفری پھیلی ہوئی ہے وہ اس ربانی قانونِ حکمت
 کو نظر انداز کرنے ہی کا نتیجہ ہے، ایک طرف سرمایہ دارانہ نظام ہے جس میں دولت کے مرکزوں پر
 سود و قمار کے راستے سے چند افراد یا جماعتیں قابض ہو کر باقی ساری مخلوق کو اپنا معاشی غلام
 بنانے پر مجبور کر دیتی ہیں، ان کے لئے بجز غلامی اور مزدوری کے کوئی راستہ اپنی ضروریات
 حاصل کرنے کے لئے نہیں رہ جاتا، وہ اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کے باوجود صنعت و تجارت کے میدان
 میں قدم نہیں رکھ سکتے۔

سرمایہ داروں کے اس ظلم و جور کے ردِ عمل کے طور پر ایک متضاد نظام اشتراکیت کمیونزم
 یا سوشلزم کے نام سے وجود میں آتا ہے جس کا نعرہ غریب و امیر کے تفاوت کو ختم کرنا اور سب

میں مساوات پیدا کرنا ہے، ظالمانہ سرمایہ داری کے مظالم سے تنگ آتے ہوئے عوام اس نعرہ کے پیچھے لگ جاتے ہیں، مگر چند ہی روز میں وہ مشاہدہ کر لیتے ہیں کہ یہ نعرہ محض فریب تھا، معاشی مساوات کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوا، اور غریب اپنی غربت اور فقر و فاقہ کے ساتھ بھی جو ایک انسانی احترام رکھتا تھا اپنی مرضی کا مالک تھا، یہ احترام انسانیت بھی ہاتھ سے جاتا رہا، نظام اشتراکیت میں انسان کی کوئی قدر قیمت مشین کے ایک پیرزے سے زائد نہیں، کسی جائداد کی ملکیت کا تو وہاں تصور ہی نہیں ہو سکتا، اور جو معاملہ وہاں ایک مزدور کے ساتھ کیا جاتا ہے اس پر غور کریں تو وہ کسی چیز کا مالک نہیں، اس کی اولاد اور بیوی بھی اس کی نہیں، بلکہ سب ریاست کی مشین کے گل پیرزے ہیں جن کو مشین ہسٹارٹ ہوتے ہی اپنے کام پر لگ جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں، ریاست کے مفروضہ مقاصد کے سوا اس کا کوئی ضمیمہ ہے نہ آواز، ریاست کے جبر و تشدد اور ناقابل برداشت محنت سے کرنا ایک بغاوت شمار ہوتا ہے، جس کی سزا موت ہے، خدا تعالیٰ اور مذہب کی مخالفت اور خالص مادہ پرستی نظام اشتراکیت کا بنیادی اصول ہے۔

یہ وہ حقائق ہیں جن سے کوئی اشتراکی انکار نہیں کر سکتا، ان کے پیشواؤں کی کتابیں اور اعمال نامے اس کے شاہد ہیں، کہ ان کے حوالوں کو جمع کرنا بھی ایک مستقل کتاب بنائیکے مترادف ہے۔ قرآن حکیم نے ظالمانہ سرمایہ داری اور استغناء اشتراکیت کی دونوں انتہاؤں کے درمیان افراط و تفریط سے پاک ایک ایسا نظام بنایا ہے کہ رزق اور دولت میں فطری تفاوت کے باوجود کوئی فرد یا جماعت عامہ مخلوق کو اپنا غلام نہ بنا سکے، اور مستوعی گرائی اور قسط میں مبتلا نہ کر سکے، سود اور بچے کو حرام قرار دے کر ناجائز سرمایہ داری کی بنیاد منہدم کر دی، پھر ہر مسلمان کے مال میں غریبوں کا حق متعین کر کے شریک کر دیا، جو غریبوں پر احسان نہیں، بلکہ ادائی فرض ہے، آیت فی أموالہم حق معلوم للسائل والمخروء، اس پر شاہد ہے، پھر مرنے کے بعد مرنے والے کی تمام ملکیت کو افراد خاندان میں تقسیم کر کے ارتکاز دولت کا خاتمہ کر دیا، قدرتی چشموں، سمندروں اور پہاڑی جنگلوں کی خود رو پیداوار کو تمام خلق خدا کا مشترک سرمایہ قرار دے دیا، جس پر کسی فرد یا جماعت کا قبضہ مالکانہ جائز نہیں، جب کہ سرمایہ داری نظام میں یہ سب چیزیں صرف سرمایہ داروں کی ملکیت قرار دیدی گئی ہیں۔

چونکہ علی عملی صلاحیتوں کا متفاوت اور مختلف ہونا ایک امر فطری ہے، اور تحصیل معاش بھی انہی صلاحیتوں کے تابع ہے، اس لئے مال و دولت کی ملکیت کا متفاوت ہونا بھی عین تقاضائے حکمت ہے، جس کو دنیا کا کچھ بھی عقل و شعور ہو وہ اس کا انکار نہیں کر سکتا اور مساوات کے نعرے لگانے والے بھی چند قدم چلنے کے بعد اس مساوات کے دعوے

کو چھوڑنے اور محیشت میں تفاوت و تفاضل پیدا کرنے پر مجبور ہو گئے۔

خرد شیفت نے ۵ مئی ۱۹۶۱ء کو سپریم سویت کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا:
”ہم اجرتوں میں فرق مٹانے کی تحریک کے سختی سے مخالف ہیں، ہم اجرتوں میں مساوات قائم کرنے اور ان کے ایک سطح پر لانے کے کھلے بندوں مخالف ہیں، یہ لینن کی تعلیم ہے اس کی تعلیم یہ تھی کہ سوشلسٹ سماج میں مادی شرکت کا پورا لحاظ رکھا جائے گا۔“

(سویت ورلڈ، ص ۳۴۶)

معاشی مساوات کے خواب کی یہ تعبیر عدم مساوات تو ابتداء ہی سے سامنے آگئی تھی، مگر دیکھتے ہی دیکھتے یہ عدم مساوات اور امیر و غریب کا تفاوت اشتراکی مملکت روس میں عام سرمایہ دار ملکوں سے بھی آگے بڑھ گیا۔

لیون شیڈ وکھتا ہے:

”شاید ہی کوئی ترقی یافتہ سرمایہ دار ملک ایسا ہو جہاں مزدوروں کی اجرتوں میں اتنا

تفاوت ہو جتنا روس میں ہے۔“

واقعات کی ان چند مثالوں نے آیت مذکورہ وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضُكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ کی جبری تصدیق منکرین کی زبانوں سے کرا دی وَاللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ، یہاں اس آیت کے تحت تو صرف اتنا ہی بیان کرنا تھا کہ رزق و مال میں تفاوت قدرتی اور فطری اور عین مصالح انسانی کے مطابق ہو، باقی تقسیم دولت کے اسلامی اصول اور سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں سے اس کا امتیاز تو انشاء اللہ تعالیٰ سورہ زخرف پارہ نمبر ۲۵ آیت نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّحْيٰتَهُمَّ کے تحت میں آئے گا، اور اس موضوع پر احقر کا ایک مستقل رسالہ ”اسلام کا نظام تقسیم دولت“ کے نام سے شائع ہو چکا ہے اس کا مطالعہ بھی کافی ہے۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُم مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ

اور اللہ نے پیدا کیں تمہارے واسطے تمہاری ہی قسم سے عورتیں اور دیے تم کو تمہاری

اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَلَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبَاتِ اَفَبَا بَاطِلٍ

عورتوں سے بیٹے اور پوتے اور کھانے کو دین تم کو ستھری چیزیں سو کیا جھوٹی

يُوْمِعُونَ وَيَنْعَمَتِ اللّٰهُ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ۝۲۱ وَيَعْبُدُوْنَ

باتیں مانتے ہیں اور اللہ کے فضل کو نہیں مانتے، اور پوجتے ہیں

مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

اللہ کے سوائے ایسے کو جو مختار نہیں ان کی روزی کے آسمان اور زمین سے

شَيْءًا وَلَا يَسْتَطِيعُوْنَ ۝۳۳ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ اَمْثَالَ اِنْ

کچھ بھی اور نہ قدرت رکھتے ہیں، سو مت چسپاں کر دو اللہ پر مثالیں، بیشک

اللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۳۴ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا

اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے، اللہ نے بتلایا ایک مثال ایک بندہ

مَمْلُوْكًا لَا يَقْدِرُ عَلٰی شَيْءٍ وَّمِنْ رَّزْقِنَا مِثْلًا حَسَنًا فَمِمَّا

پرایا مال نہیں قدرت رکھتا کسی چیز پر اور ایک جس کو ہم نے روزی دی اپنی طرف کا بھی روزی

يَنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا هَلْ يَسْتَوِيْنَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ

وہ خرچ کرتا ہے اس میں چھپا کر اور سب کے روبرو، کہیں برابر ہوتے ہیں، سب تعریف اللہ کو ہو، پر

اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۳۵ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ

بہت لوگ نہیں جانتے، اور بتلایا اللہ نے ایک دوسری مثال دو مرد ہیں

اَحَدُهُمَا اَبْكَمٌ لَا يَقْدِرُ عَلٰی شَيْءٍ وَهُوَ كَلٌّ عَلٰی مَوْلَاهُ

ایک گونگا کچھ کام نہیں کر سکتا، اور وہ بھاری ہے اپنے صاحب پر

اٰیْنَمَا يُوْجِّهْهُ لَا يٰتِ بِخَيْرٍ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ لَا وَمَنْ يَّامُرُ

جس طرف اس کو بھیجے نہ کرے لائے کچھ بھلائی، کہیں برابر ہو وہ اور ایک وہ شخص جو حکم

بِالْعَدْلِ وَهُوَ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۳۶

کرتا ہے انصاف سے اور ہے سیدھی راہ پر۔

خلاصہ تفسیر

اور (مجموعہ دلائل قدرت و وجوہ نعمت کے ایک بڑی نعمت اور دلیل قدرت اللہ تعالیٰ کی خود مختار وجود و بقا شخصی و نوعی ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے تم ہی میں سے (یعنی تمہاری جنس اور نوع سے) تمہارے لئے بیسیاں بنائیں اور (پھر) ان بیسیوں سے تمہارے بیٹے اور پوتے پیدا کئے

(کہ یہ بقاء نوعی ہے) اور تم کو اچھی اچھی چیزیں کہنے (پینے) کو دیں (کہ یہ بقاء شخص ہوا چونکہ
 بقاء موقوف ہے وجود پر اس میں اس کی طرف بھی اشارہ ہو گیا) کیا (یہ سب دلائل و نعم سنکر)
 پھر بھی بے بنیاد چیز پر یعنی بتوں وغیرہ پر جن کے معبود ہونے کی کوئی دلیل نہیں بلکہ خلاف دلیل
 ہو) ایمان رکھیں گے اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری (بے قدری) کرتے رہیں گے، اور
 (مطلب اس ناشکری کا یہ ہے کہ) اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت کرتے رہیں گے
 جو ان کو نہ آسمان میں سے رزق پہنچانے کا اختیار رکھتی ہیں اور نہ زمین میں سے (یعنی نہ بارش
 برسانے کا ان کو اختیار ہے نہ زمین سے کچھ پیدا کرنے کا) اور نہ (اختیار حاصل کرنے کی)
 قدرت رکھتے ہیں (اس کی نفی سے زیادہ مبایض ہو گیا، کیونکہ بعض دفعہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک
 شخص بالفعل تو با اختیار نہیں ہے، لیکن جہد و جد سے اختیارات حاصل کر لیتا ہے، اس لئے اس
 کی بھی نفی فرمادی) سو (جب شرک کا بطلان ثابت ہو گیا تو) تم اللہ تعالیٰ کے لئے مثالیں مت
 گھڑو (کہ اللہ تعالیٰ کی مثال بادشاہان دنیا کی سی ہے کہ ہر شخص ان سے عرض حاجت نہیں
 کر سکتا، اس لئے اس کے نائب ہوتے ہیں کہ عوام ان سے عرض حاجت کرتے ہیں، پھر وہ
 سلاطین سے عرض کرتے ہیں کذا فی الکبیر و یؤخذ من قولہ مَا نَعْبُدُہُمْ إِلَّا لَیْقُرَّ بُونَا
 وَہُوَ لَا یَشْفَعَاؤُنَا عِندَ اللّٰہِ) اللہ تعالیٰ (خوب) جانتے ہیں (کہ ایسی مثالیں ممکن نہیں ہیں)
 اور تم (بوجہ عدم تدبیر کے) نہیں جانتے (اس لئے جو چاہتے ہو تک ڈالتے ہو اور) اللہ تعالیٰ
 (شرک کے بطلان ظاہر کرنے کے لئے) ایک مثال بیان فرماتے ہیں کہ (فرض کرو) ایک (تو)
 غلام ہے (کسی کا) ملوک کہ (اموال و تصرفات میں سے) کسی چیز کا (بلا اجازت آقا) اختیار
 نہیں رکھتا اور (دوسرا) ایک شخص ہے جس کو ہم نے اپنے پاس سے خوب روزی شے (بھی تو
 اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ) جس طرح چاہتا ہے جہاں چاہتا ہے (خرچ کرتا ہے) اس کو
 کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں) کیا اس قسم کے شخص آپس میں برابر ہو سکتے ہیں (بس جب مالک
 مجازی و مملوک مجازی برابر نہیں ہو سکتے، تو مالک حقیقی و مملوک حقیقی تو کب برابر ہو سکتے ہیں
 اور استحقاق عبادت موقوف ہے مساوات پر اور وہ ہے نہیں) ساری تعریفیں اللہ ہی
 کے لائق ہیں (کیونکہ کامل الذات والصفات وہی ہیں، پس معبود بھی وہی ہو سکتا ہے، مگر
 پھر بھی شرکین غیر اللہ کی عبادت نہیں چھوڑتے) بلکہ ان میں اگر (تو بوجہ عدم تدبیر کے) جانتے
 ہی نہیں (اور چونکہ عدم علم کا سبب خود ان کا عدم تدبیر ہے اس لئے معذور نہ ہوں گے) اور اللہ
 تعالیٰ (اس کی توفیق کے لئے) ایک اور مثال بیان فرماتے ہیں کہ (فرض کرو) دو شخص ہیں جن میں
 ایک تو (علاوہ غلام ہونے کے) گونگا (بہرا بھی) ہے (اور بوجہ بہرے اندر سے بے عقل ہو گیا)

کوئی کام نہیں کر سکتا اور (اس وجہ سے) وہ اپنے مالک پر وبال جان ہے (کہ وہ مالک ہی اس کے سائے کام کرتا ہے اور) وہ (مالک) اس کو جہاں بھیجتا ہے کوئی کام درست کر کے نہیں لاتا، (یعنی خود تو کیا کرتا دوسروں کی تعلیم سے بھی اس سے کوئی کام درست نہیں ہوتا سو) کیا یہ شخص اور ایسا شخص باہم برابر ہو سکتے ہیں جو اپنی باتوں کی تعلیم کرتا ہو (جس سے اس کا ناطق، عاقل، صاحب قوت علیہ ہونا معلوم ہوتا ہے) اور خود بھی (ہر امر میں) معتدل طریقہ پر (چلتا) ہو، (جس سے قوتِ عملیہ منتظمہ معلوم ہوتی ہے، جب مخلوق مخلوق میں باوجود اشتراکِ ماہیت و اشتراکِ اوصاف کے یہ تفاوت ہے تو کہا مخلوق و خالق، اور لایق قدر کے ترجمہ میں بلا اجاز آفاقی قید سے جو سابقہ آیات میں فقہی شبہات مندرج ہو گئے، اور کوئی دوسرے میں نہ پڑے کہ شاید معبود غیر اللہ کو بھی اذن ہو گیا ہو، جواب یہ ہے کہ ربوبیت کے لئے کسی کو اذن نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہے)۔

معارف و مسائل

جَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا، اس آیت میں ایک اہم نعمت کا ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہی جنس اور قوم میں سے تمہاری بیبیاں بنائیں تاکہ باہمی موانست بھی پوری ہو، اور نسلِ انسانی کی شرافت و بزرگی بھی قائم رہے۔

دوسرا اشارہ اس طرف بھی ہو سکتا ہے کہ تمہاری بیبیاں تمہاری ہی جنس کی ہیں، انکی ضروریات اور جذبات بھی تمہارے ہی جیسے ہیں، ان کی رعایت تم پر لازم ہے۔
وَجَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ بَنِينَ وَحَفَظَ، یعنی تمہاری بیبیوں سے تم نے تمہارے بیٹے پوتے پیدا کئے۔

یہاں یہ بات قابلِ نظر ہے کہ اولاد تو ماں باپ دونوں ہی سے مل کر پیدا ہوتی ہے، اس آیت میں اس کو صرف ماں سے پیدا کرنے کا ذکر فرمایا ہے، اس میں اشارہ ہے کہ بچہ کی تولید و تخلیق میں بہ نسبت باپ کے ماں کا دخل زیادہ ہے، باپ سے تو صرف ایک قطرہ بے جان نکلتا ہے اس قطرہ پر مختلف قسم کے دور گزرتے ہوئے انسانی شکل میں تبدیل ہونا اور اس میں جان پڑنا قدرت کے ان سارے تخلیقی کارناموں کا محض تو ماں کا پیٹ ہی ہے، اسی لئے حدیث میں ماں کے حق کو باپ کے حق پر مقدم رکھا گیا ہے۔

اس جملے میں بیٹوں کے ساتھ پوتوں کا ذکر فرمانے میں اس طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے کہ اس جوڑے بنانے کا اصل مقصد نسلِ انسانی کی بقا ہے کہ اولاد پھر اولاد کی اولاد ہوتی رہے، تو یہ انسان کی بقا نوعی کا سامان ہوا۔

پھر وَذَرَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبَاتِ میں اس کی بقا شخص کی بقاء کے سامان کا ذکر فرمادیا کہ انسان پیدا ہو جائے تو پھر اس کی بقا شخص کے لئے غذا کی ضرورت ہے، وہ بھی حق تعالیٰ نے مہیا فرمادی، آیت میں لفظ حَفَظَہ کے اسلی معنی مددگار اور خدمت گزار کے ہیں، اولاد کے لئے یہ لفظ استعمال کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ اولاد کو اپنے ماں باپ کا خادم ہونا چاہیو (قرطبی) فَلَا تَضُرُّهُمُ إِلَٰهٌ مِّثَالُ يَوْمَئِذٍ میں ایک اہم حقیقت کو واضح فرمایا ہے، جس سے غفلت برتنا ہی تمام کافرانہ شکوک و شبہات کو جنم دیتا ہے، وہ یہ ہے کہ عام طور پر لوگ حق تعالیٰ کو اپنے بنی نوع انسان پر قیاس کر کے ان میں سے اعلیٰ ترین انسان مثلاً بادشاہ و فرمانروا کو اللہ تعالیٰ کی مثال قرار دیتے ہیں، اور پھر اس غلط بنیاد پر اللہ تعالیٰ کے نظام قدرت کو بھی انسانی بادشاہوں کے نظام پر قیاس کر کے یہ کہنے لگتے ہیں کہ جس طرح کسی سلطنت حکومت میں اکیلا بادشاہ سارے ملک کا انتظام نہیں کر سکتا، بلکہ اپنے ماتحت وزراء اور دوسرے افسروں کو اختیارات سپرد کر کے ان کے ذریعہ نظم و ملکت چلایا جاتا ہے، اسی طرح یہ بھی ہونا چاہئے کہ خدا تعالیٰ کے ماتحت کچھ اور موجود بھی ہوں جو اللہ کے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹائیں، یہی تمام بُت پرست اور مشرکین کا عام نظریہ ہے، اس جملے نے ان کے شبہات کی جڑ قطع کر دی کہ اللہ تعالیٰ کے لئے مخلوق کی مثالیں پیش کرنا خود بے عقلی ہے، وہ مثال و تمثیل اور ہمارے وہم و گمان سے بالاتر ہے۔

آخری دو آیتوں میں انسان کی جو دو مثالیں دی گئی ہیں، ان میں سے پہلی مثال میں تو آقا اور غلام یعنی مالک اور مملوک کی مثال دے کر بتلایا کہ جب یہ دونوں ایک ہی جنس ایک ہی نوع کے ہوتے ہوئے آپس میں برابر نہیں ہو سکتے تو کسی مخلوق کو خدا تعالیٰ کے ساتھ کیسے برابر ٹھہراتے ہو۔

اور دوسری مثال میں ایک طرف ایک انسان ہے، جو لوگوں کو عدل و انصاف اور اچھی باتیں سکھاتا ہے، جو اس کی قوتِ علمیہ کا کمال ہے، اور خود بھی معتدل اور سیدھے راستہ پر چلتا ہے، جو اس کی قوتِ عملیہ کا کمال ہے، اس علمی اور عملی قوت میں مکمل انسان کے بالمقابل وہ انسان ہے جو نہ خود اپنا کام کر سکتا ہے نہ کسی دوسرے کا کوئی کام درست کر سکتا ہے، یہ دونوں قسم کے انسان ایک ہی جنس ایک ہی نوع ایک ہی برادری کے ہونے کے باوجود آپس میں برابر نہیں ہو سکتے، تو خالق و مالک کائنات جو حکیم مطلق اور قادر مطلق اور علیم وخبیر ہے اس کے ساتھ کوئی مخلوق کیسے برابر ہو سکتی ہے۔

وَلِلَّهِ خَبِيرٌ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا أَمْرُ السَّاعَةِ إِلَّا كَلِمَةٍ

اور اللہ ہی کے پاس ہیں مجید آسمانوں اور زمین کے اور قیامت کا کام تو ایسا ہی جیسے لپک

الْبَصَرِ أَوْ هُوَ أَقْرَبُ إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝۷۰ وَاللَّهُ أَخْرَجَكُمْ

ننگاہ کی یا اس سے بھی قریب اللہ ہر چیز پر قادر ہے ، اور اللہ نے تم کو نکالا

مِّنْ بَطْنِ أُمِّهِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ

تمہاری ماں کے پیٹ سے نہ جانتے تھے تم کس چیز کو اور دیتے تم کو کان اور

الْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝۷۱ أَلَمْ يَرَوْا إِلَى

آنکھیں اور دل ، تاکہ تم احسان مانو ، کیا نہیں دیکھے

الطَّيْرِ مَسْجَرَاتٍ فِي بَوَاسِطِ السَّمَاءِ مَا يَسْكُنُهُنَّ إِلَّا اللَّهُ إِنَّ فِي

اڑتے جانور حکم کے باندھے ہوئے آسمان کی ہوائیں کوئی نہیں تھا رہا ان کو سوا اللہ کے اس میں

ذَٰلِكَ لَا يَتْلُوهُمْ إِلَّا قَوْمٌ مُّؤْمِنُونَ ۝۷۲ وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُم مِّنْ بُيُوتِكُمْ

نشانیاں ہیں اُن لوگوں کو جو یقین لاتے ہیں ، اور اللہ نے بنادیے تم کو تمہارے گھر

سَكَنًا وَجَعَلَ لَكُم مِّنْ جُلُودِ الْأَنْعَامِ بُيُوتًا تَسْتَخِفُّونَهَا يَوْمَ

بسنے کی جگہ اور بنادیے تم کو چمپاؤں کی کھال سے ڈیرے جو ہلکے رہتے ہیں تم پر جس دن

ظَعِنَكُمْ وَيَوْمَ إِقَامَتِكُمْ ۝۷۳ وَمِنْ أَصْوَابِهَا وَأَوْبَارُهَا وَأَشْعَارُهَا

سفر میں ہو اور جس دن گھریں ہو ، اور بھیڑوں کی آون سے اور اونٹوں کی ہریوں اور کبریوں کی بالوں

أَنَّا نَأْتِيهِمْ مِّنَ السَّمَاءِ بِمَاءٍ نَّحْيِي بِهِ الْبَلَاحَ وَالْجَبَالَ ۝۷۴ وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُم مِّنْهَا خَلْقَ ظِلَافٍ

سے کتنے اسباب استعمال کی چیزیں وقت مقرر تک ، اور اللہ نے بنادیئے تمہارے واسطے اپنی بنائی ہوئی چیزوں کے سے

وَجَعَلَ لَكُم مِّنَ الْجِبَالِ أَكْنَافًا وَجَعَلَ لَكُم سَرَابِیلَ تَقِيْكُمْ

اور بنا دیں تمہارے واسطے پہاڑوں میں چھپنے کی جگہیں اور بنادیئے تم کو کرتے جو بچاؤ ہیں

الْحَرِّ وَسَرَابِیلَ تَقِيْكُمْ بِأَسْكُمْ ۝۷۵ كَذَٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ

گرمی میں اور کرتے جو بچاؤ ہیں لڑائی میں ، اسی طرح پورا کرتا ہی اپنا احسان تم پر

لَعَلَّكُمْ تَسْلِمُونَ ﴿۸۱﴾ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاءُ الْمُبِينُ ﴿۸۲﴾ يَعْرِفُونَ

تاکہ تم حکم مانو ، پھر اگر پھر جائیں تو تیرا کام تو یہی ہو کھول کر سنا دینا ، پہچانتے ہیں

نَصَّتَ اللَّهُ لَكَ لِتَذَكَّرُ وَنَهَا وَأَكْثَرُهُمُ الْكَافِرُونَ ﴿۸۳﴾

اللہ کا احسان پھر منکر ہو جاتے ہیں اور بہت ان میں ناشکر ہیں ۔

خلاصہ تفسیر

۱۔ آسمانوں اور زمین کی تمام پوشیدہ باتیں جو کسی کو معلوم نہیں باعتبار علم کے اللہ ہی کے ساتھ خاص ہیں (توصیف علم میں وہ کامل ہیں) اور قدرت میں ایسے کامل ہیں کہ ان غیوب میں سے جو ایک امر عظیم (یعنی قیامت) اس کا معاملہ بس ایسا (جھٹ پٹ) ہو گا جیسے آنکھ جھپکنا، بلکہ اس سے بھی جلدی قیامت کے معاملہ سے مراد ہے۔ مژدوں میں جان پڑنا اور اس کا بہ نسبت آنکھ جھپکنے کے جلدی ہونا ظاہر ہے، کیونکہ آنکھ جھپکنا حرکت ہے اور حرکت زمانی ہوتی ہے، اور جان پڑنا آتی ہے، اور آتی ظاہر ہے کہ زمانی سے اُترے ہوئے ہے، اور اس پر تعجب نہ کیا جائے کیونکہ یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتے ہیں (اور اثبات قدرت کے لئے تخصیص قیامت کی شاید اس وجہ سے کی ہو کہ وہ منجملہ غیوب خاصہ کے بھی ہے، اس لئے وہ علم اور قدرت دونوں کی دلیل ہے، قبل الوقوع تو علم اور بعد الوقوع قدرت کی) اور منجملہ دلائل قدرت و وجہ نعمت یہ امر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو تمھاری ماؤں کے پیٹ سے اس حالت میں نکالا کہ تم کچھ بھی نہ جانتے تھے (اس درجہ کا نام فلاسفہ کی اصطلاح میں عقل ہیولانی ہے) اور اس نے تم کو کان دیئے اور آنکھ اور دل تاکہ تم شکر کرو (ہستدلال علی القدرت کے لئے) کیا لوگوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا کہ آسمان کے (تِلے) فضاء میں (قدرت کے) مسخر ہو رہے ہیں (یعنی) انکو (اس جگہ) کوئی نہیں تھامتا بجز اللہ کے (ورنہ ان کے اجسام کا ثقیل ہونا اور مادہ ہوا کا رقیق و لطیف ہونا طبعاً مقتضی اس کو ہے کہ نیچے گر پڑیں، اس لئے اس امر مذکور میں) ایمان والوں کے لئے (قدرت الہیہ کی) چند دلیلیں (موجود) ہیں (چند نشانیاں اس لئے فرمایا کہ پرندوں کو خاص وضع پر پیدا کرنا جس سے اڑنا ممکن ہو، ایک دلیل ہی، پھر فضاء کو ایسے طرز پر پیدا کرنا جس میں اڑنا ممکن ہو دوسری دلیل ہے، پھر بالفعل اس طیران کا وقوع تیسری دلیل ہے اور جن اسباب کو طیران میں دخل ہے وہ سب اللہ ہی کے پیدا کئے ہوئے ہیں، پھر ان اسباب پر سبب یعنی طیران کا مرتب ہو جانا یہ بھی مشیت الہی ہے، ورنہ اکثر ایسا بھی

ہوتا ہے کہ کس چیز کے اسباب موجود ہوتے ہوئے بھی وہ وجود میں نہیں آتی، اس لئے مَا يُمْسِكُهُنَّ^{۱۶} فرمایا گیا، اور نجلہ وجہ نعمت و دلائل قدرت یہ امر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے واسطے (حالتِ حاضر میں) تمہارے گھر میں رہنے کی جگہ بنائی (اور حالتِ سفر میں) تمہارے لئے جانوروں کی کھال کے گھ (یعنی خیمے) بنائے جن کو تم اپنے کوچ کے دن اور مقام (کرنے) کے دن ہلکا چلکا پاتے ہو (اور اس وجہ سے اس کا لادنا اور نصب کرنا سب سہل معلوم ہوتا ہے) اور ان (جانوروں) کے اُون اُنکے رُودل اور ان کے بالوں سے (تمہارے) گھر کا سامان اور فائدے کی چیزیں ایک مدت تک کے لئے بنائیں (مدت تک اس لئے فرمایا کہ عادۃً یہ سامان بہ نسبت رُودلی کے کپڑوں کے دیر پا ہوتا ہے، اور نجلہ دلائل قدرت و وجہ نعمت کے ایک یہ ہو کہ) اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے اپنی بعض مخلوقات کے سائے بنائے (جیسے درخت و مکانات وغیرہ) اور تمہارے لئے پہاڑوں میں پناہ کی جگہیں بنائیں (یعنی غار وغیرہ جس میں گرمی سردی، بارش، موذی شمن جانور آدمی سے محفوظ رہ سکتے ہو) اور تمہارے لئے ایسے کُرتے بنائے جو گرمی سے تمہاری حفاظت کریں اور ایسے کُرتے (بھی) بنائے جو تمہاری آپس کی لڑائی (میں زخم لگنے) سے تمہاری حفاظت کریں (مادہ اس سے زیر ہیں) اللہ تعالیٰ تم پر اسی طرح کی اپنی نعمتیں پوری کرتا ہے کہ تم (ان نعمتوں کے مشکریہ میں) فرمانبردار رہو، (اور ہر چند کہ مذکورہ نعمتوں میں بعض مصنوعات عباد بھی ہیں، مگر ان کا مادہ اور ان کے بنانے کا سلیقہ تو اللہ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے، اس لئے منعم حقیقی وہی ہیں پھر ان نعمتوں کے بعد بھی) اگر یہ لوگ ایمان سے اعراض کریں (تو آپ غم نہ کریں آپ کا کوئی نقصان نہیں کیونکہ) آپ کے ذمہ تو صرف صاف صاف پہنچا دینا ہے (اور ان کے اعراض کی وجہ یہ نہیں کہ وہ ان نعمتوں کو پہچانتے نہیں، بلکہ وہ لوگ) خدا کی نعمتوں کو تو پہچانتے ہیں مگر پہچان کر پھر (برتاؤ میں) اس کے منکر ہوتے ہیں (کہ جو برتاؤ منعم کے ساتھ چاہئے تھا یعنی عبادت و طاعت وہ دوسرے کے ساتھ کرتے ہیں) اور زیادہ ان میں ایسے ہی ناشکرے ہیں:

معارف و مسائل

قوله تعالى لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا، اس میں اشارہ ہے کہ علم انسان کا ذاتی ہنر نہیں، پیدائش کے وقت وہ کوئی علم و ہنر نہیں رکھتا، پھر ضرورتِ انسانی کے مطابق اس کو کچھ کچھ علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلا واسطہ سکھایا جاتا ہے، جس میں نہ ماں باپ کا دخل ہے نہ کسی معلم کا، سب پہلے اس کو روزنا سکھایا، اس کی یہی صفت اس وقت اس کی تمام ضروریات ہنیا کرتی ہے، بھوک پیاس لگے تو وہ روتا ہے، سردی گرمی لگے تو رو دیتا ہے، کوئی اور تکلیف

پہونچے تو رو دیتا ہے، قدرت نے اس کی ضروریات کے لئے ماں باپ کے دلوں میں خاص اُلفت ڈال دی کہ جب بچے کی آواز سنیں تو وہ اس کی تکلیف کے پہچاننے اور اس کے دور کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں، اگر بچے کو منجانب اللہ یہ رونے کی تعلیم نہ دی جاتی تو اس کو کون یہ کام سکھا سکتا کہ جب کوئی ضرورت پیش آئے تو اس طرح چلایا کرے، اس کے ساتھ ہی اس کو اللہ تعالیٰ نے الہامی طور پر یہ بھی سکھا دیا کہ اپنی غذا کو ماں کی چھاتی سے حاصل کرنے کے لئے اپنے مسوڑھوں اور ہونٹوں سے کام لے، اگر یہ تعلیم فطری اور بلا واسطہ نہ ہوتی تو کس محکم کی مجال تھی جو اس نو مولود کو منہ چلانا اور چھاتی کو چوسنا سکھا دیتا، اسی طرح جوں جوں اس کی ضروریات بڑھتی گئیں قدرت نے اس کو بلا واسطہ ماں باپ کے خود بخود سکھا دیا، کچھ عرصہ کے بعد اس میں یہ سلیقہ پیدا ہونے لگتا ہے کہ ماں باپ اور دوسرے اس کے آرمیوں کی بات سن کر یا کچھ چیزوں کو دیکھ کر کچھ سمجھنے لگتا ہے، اور پھر ان سنی ہوئی آوازوں اور دیکھی ہوئی چیزوں کو سوچنے سمجھنے کا سلیقہ پیدا ہوتا ہے۔

اسی لئے آیت مذکورہ میں لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا کے بعد فرمایا وَجَعَلْنَا لَكُمْ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ، یعنی اگرچہ ابتداءً پیدائش میں انسان کو کسی چیز کا علم نہیں تھا، مگر قدرت نے اس کے وجود میں علم حاصل کرنے کے عجیب و غریب قسم کے آلات نصب کر دیئے تھے، ان آلات میں سب پہلے سمیع یعنی سننے کی قوت کا ذکر فرمایا، جس کی تقدیم کی وجہ شاید یہ ہو کہ انسان کا سب سے پہلا علم اور سب سے زیادہ علم کانوں ہی کے رستہ سے آتا ہے، شروء میں آنکھ تو بند ہوتی ہے مگر کان سنتے ہیں، اور اس کے بعد بھی اگر غور کیا جائے تو انسان کو اپنی پوری عمر میں جس قدر معلومات حاصل ہوتی ہیں ان میں سب سے زیادہ کانوں سے سنی ہوئی ہوتی ہیں، آنکھ سے دیکھی ہوئی معلومات اس کی نسبت سے بہت کم ہوتی ہیں۔

ان دونوں کے بعد نمبر ۳ معلومات کا ہے جن کو انسان اپنی سنی اور دیکھی ہوئی چیزوں میں غور و فکر کر کے معلوم کرتا ہے، اور یہ کام تشرافی ارشادات کے مطابق انسان کے قلب کا ہے، اس لئے تیسرے نمبر میں أَفْئِدَةً فرمایا، جو فؤاد کی جمع ہے، جس کے معنی قلب کے ہیں، فلاسفہ نے عام طور پر سمجھ بوجھ اور ادراک کا مرکز انسان کے دماغ کو قرار دیا ہے، مگر ارشاد تشرافی سے معلوم ہوا کہ دماغ کو اگرچہ اس ادراک میں دخل ضرور ہے، مگر علم و ادراک کا اصلی مرکز قلب ہے۔

اس موقع پر حق تعالیٰ نے سننے، دیکھنے، اور سمجھنے کی قوتوں کا ذکر فرمایا ہے، گویا بی اور زبان کا ذکر نہیں فرمایا، کیونکہ نطق اور گویائی کو حصولِ علم میں دخل نہیں، بلکہ وہ اظہارِ علم کا ذریعہ ہیں، اس کے علاوہ امام تشریفی نے فرمایا کہ لفظ سمیع کے ساتھ نطق بھی ضمناً آگیا، کیونکہ تجربہ شاہد ہے کہ جو شخص سنتا ہے وہ بولتا بھی ہے، گویا جو بولنے پر قادر نہیں وہ کانوں سے بھی بہرا ہوتا ہے، اور

شاید اس کے نہ بولنے کا سبب ہی یہ ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی آواز سنتا نہیں، جس کو سن کر بولنا سکے، واللہ اعلم۔
 وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُم مِّنْ بُيُوتِكُمْ سَكَنًا، بیوت کی جمع ہے، جس مکان میں رات گزاری جا سکے
 اس کو بیت کہتے ہیں، امام قسطلانی نے اپنی تفسیر میں فرمایا:

کُلُّ مَا عَلَاكَ فَاعْلَمْتَ فَهُوَ سَقِفٌ	”جو چیز تمھارے سر سے بلند ہو اور تم پر
وَسَمَاءٌ، وَكُلُّ مَا أَقْلَكَ فَهُوَ	سایہ کرے وہ چھت یا سماء کہلاتی ہے، اور
أَرْضٌ وَكُلُّ مَا سَتَرَكُم مِّنْ	جو چیز تمھارے وجود کو اپنے اوپر اٹھائے
جِهَانِكُمُ الْأَرْضُ فَهُوَ حِجَارٌ	وہ زمین ہے، اور جو چیز چاروں طرف سے
فَإِذَا انْظَلَمَتْ وَالصَّلَاتُ فَهُوَ	تمھارا پردہ کر دے وہ دیواریں ہیں اور جب
بَيْتٌ،	سب چیزیں جمع ہو جائیں تو وہ بیت ہے۔“

گھر بنانے کا اصل مقصد اس میں حق تعالیٰ نے انسان کے بیت یعنی گھر کو سکون فرما کر گھر بنانے کا فلسفہ
 قلب جسم کا سکون ہے اور حکمت واضح فرمادی کہ اس کا اصل مقصد جسم اور قلب کا سکون ہے،
 عَادَةُ انسان کا کسب و عمل گھر سے باہر ہوتا ہے، جو اس کی حرکت سے وجود میں آتا ہے، اس کے گھر کا
 اصلی منشا یہ ہے کہ جب حرکت و عمل سے تھک جائے تو اس میں جا کر آرام کرے، اور سکون حاصل کرے
 اگرچہ بعض اوقات انسان اپنے گھر میں بھی حرکت و عمل میں مشغول رہتا ہے مگر یہ عادت کم ہے۔
 اس کے علاوہ سکون اصل میں قلب و دماغ کا سکون ہے، وہ انسان کو اپنے گھر میں ہی حاصل
 ہوتا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ انسان کے مکان کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ اس میں سکون
 ملے، آج کی دنیا میں تعمیرات کا سلسلہ اپنے عروج پر ہے، اور ان میں ظاہری ٹیپ ٹاپ پر بے حد
 خرچ بھی کیا جاتا ہے، لیکن ان میں ایسے مکانات بہت کم ہیں جن میں قلب اور جسم کا سکون حاصل ہو
 بعض اوقات تو مصنوعی تکلفات خود ہی آرام و سکون کو برباد کر دیتے ہیں، اور وہ بھی نہ ہو تو گھر
 میں جن لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے وہ اس سکون کو ختم کر دیتے ہیں، ایسے عالی شان مکانات سے وہ
 بھگی اور بھونپڑی اچھی ہے جس کے رہنے والے کے قلب و جسم کو سکون حاصل رہا ہو۔

قرآن کریم ہر چیز کی رُوح اور اصل کو بیان کرتا ہے، انسان کے گھر کا اصل مقصد اور سب سے
 بڑی غرض و غایت سکون کو قرار دیا، اسی طرح ازدواجی زندگی کا اصل مقصد بھی سکون قرار دیا کہ
 لَتَسْكُنُوا إِلَيْهَا، جس ازدواجی زندگی سے یہ مقصد حاصل نہ ہو وہ اس کے اصل فائدے سے محروم
 ہے، آج کی دنیا میں ان چیزوں میں رسمی اور غیر رسمی تکلفات اور ظاہری ٹیپ ٹاپ کی حد
 نہیں رہی، اور مغربی تمدن و معاشرت نے ان چیزوں میں ظاہری زیب و زینت کے سارے
 سامان جمع کر دیئے، مگر سکون قلب و جسم سے قطعاً محروم کر ڈالا۔

قَوْلُهُ مِنْ جُلُودِ الْإِنْعَامِ دَقُولُهُ مِنْ أَصْوَابِهَا وَأَقْبَارِهَا، سے ثابت ہوا کہ جانوروں کی کھال اور بال اور اون سب کا استعمال انسان کے لئے حلال ہے، اس میں یہ بھی قید نہیں کہ جانور مذکور ہو یا ممدوار اور نہ یہ قید ہے کہ اس کا گوشت حلال ہے یا حرام، ان سب قسم کے جانوروں کی کھال دباغت دے کر استعمال کرنا حلال ہے، اور بال اور اون پر تو جانور کی موت کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا، وہ بغیر کسی خاص صنعت کے حلال اور جائز ہے، امام اعظم ابو حنیفہؒ کا یہی مذہب ہے، البتہ خزیر کی کھال اور اس کے تمام اجزاء ہر حال میں نجس اور ناقابل انتفاع ہیں۔

سَرَابِيلٌ تَقِيكُمُ الْحَرَّ، یہاں انسان کو گرتے کی غرض گرمی سے بچانے کو فرمایا ہے، حالانکہ گرتہ انسان کو گرمی اور سردی دونوں سے بچاتا ہے، اس کا ایک جواب تو امام قرطبیؒ اور دوسرے مفسرین نے یہ دیا ہے کہ متران حکیم عربی زبان میں آیا ہے، اس کے اولین مخاطب عرب ہیں، اس لئے اس میں عرب کی عادات و ضروریات کا لحاظ رکھ کر کلام کیا گیا ہو، عرب ایک گرم ملک ہے، وہاں برف باری اور سردی کا تصور ہی شکل ہے، اس لئے گرمی سے بچانے کے ذکر پر اکتفا کیا گیا، حضرت تھانویؒ نے بیان متران میں فرمایا کہ قرآن کریم نے اسی سورۃ کے شروع میں لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ فرما کر لباس کے ذریعہ سردی بچنے اور گرمی حاصل کرنے کا ذکر پہلے کر دیا تھا، اس لئے یہاں صرف گرمی دفع کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَرِيذًا تُمْرُّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا

اور جس دن کھڑا کریں ہم ہر فرقہ میں ایک بتلانیوالا پھر حکم نہ ملے منکروں کو

وَلَا لَهُمْ يُسْتَعْتَبُونَ ﴿١٣﴾ وَإِذَا أَرَأَى الَّذِينَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ

اور نہ ان سے توبہ لی جائے، اور جب دیکھیں گے ظالم عذاب کو پھر

فَلَا يَخَفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يَنْظُرُونَ ﴿١٤﴾ وَإِذَا أَرَأَى الَّذِينَ

ہلکا نہ ہو گا ان سے اور نہ ان کو ڈھیل ملے، اور جب دیکھیں

أَشْرَكَوا شُرَكَاءَهُمْ قَالُوا رَبَّنَا هَؤُلَاءِ شُرَكَاءُنَا الَّذِينَ

مشرک اپنے شریکوں کو بولیں اے رب یہ ہمارے شریک ہیں جن کو

میں

كُنَّا نَدْعُوا مِنْ دُونِكَ ۚ فَاَلْقُوا إِلَيْنَا الْقَوْلَ إِنَّكُمْ لَكُنْتُمْ بِهِ

ہم پکارتے تھے تیرے سوا تب وہ ان پر ڈالیں گے بات کہ تم جھوٹے ہو،

وَالْقَوَا إِلَى اللَّهِ يَوْمَئِذٍ سَلَامٌ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ

اور آپڑیں اللہ کے آگے اس دن عاجز ہو کر اور بھول جائیں جو جھوٹ باندھتے تھے،

الَّذِينَ كَفَرُوا وَاصْطَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ زِدْنَاهُمْ عَذَابًا فَوْقَ

جو لوگ منکر ہوئے ہیں اور روکتے رہے ہیں اللہ کی راہ سے ان کو ہم بڑھا دیں گے عذاب پر

الْعَذَابِ بِمَا كَانُوا يُفْسِدُونَ ۝۸۹ وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِي كُلِّ أُمَّةٍ

عذاب بدلہ اس کا جو شرارت کرتے تھے، اور جس دن کھڑا کریں گے ہم ہر فرقہ میں

شَهِيدًا عَلَيْهِمْ مِنْ أَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيدًا عَلَى هَؤُلَاءِ مَا

ایک بتلانے والا ان پر انہی میں کا اور تجھ کو لائیں بتلانے کو ان لوگوں پر،

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تَبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً

اور اتاری ہم نے تجھ پر کتاب کھلا بیان ہر چیز کا اور ہدایت اور رحمت

وَبُشْرَى لِلْمُسْلِمِينَ ۝۹۰

اور خوش خبری حکم ماننے والوں کے لئے۔

خلاصہ تفسیر

اور (وہ دن یاد کرنے کے قابل ہو) جس دن ہم ہر ہر امت میں سے ایک ایک گواہ (کہ اس

امت کا پیغمبر ہو گا) قائم کریں گے (جو ان کے اعمال سنیۃ کی شہادت دیں گے) پھر ان کافروں کو

(عذر و معذرت کرنے کی) اجازت نہ دی جائے گی اور نہ ان سے حق تعالیٰ کے راضی کرنے کی

فرمائش کی جائے گی (یعنی ان سے یوں نہ کہا جائے گا کہ تم تو بہ یا کوئی عمل کر کے اللہ کو خوش کر دو،

وجہ اس کی ظاہر ہے کہ آخرت دارا بجز اس ہے دارالعمل نہیں) اور جب ظالم (یعنی کافر) لوگ عذاب

کو دیکھیں گے (یعنی اس میں پڑیں گے) تو وہ عذاب نہ ان سے ہلکا کیا جائے گا اور نہ وہ (اس میں)

کچھ ہلکت دیئے جائیں گے (کہ چند روز کے بعد وہ عذاب جاری کیا جائے) اور جب مشرک لوگ

اپنے شرکیوں کو (جن کو خدا کے سوا پوجتے تھے) دیکھیں گے تو بطور اقرار جرم کے کہیں گے کہ

اے ہمارے پروردگار! وہ ہمارے شریک یہی ہیں کہ آپ کو چھوڑ کر ہم ان کو پوجا کرتے تھے سو وہ (شرکاء ڈریں گے کہ کہیں ہماری کم بختی نہ آجائے اس لئے) وہ ان کی طرف کلام کو متوجہ کریں گے کہ تم جھوٹے ہو اصل مطلب ان کا یہ ہو گا کہ ہمارا ہتھارا کوئی تعلق نہیں جس سے مقصود اپنی حفاظت ہے اب خواہ یہ مطلب ان کا صحیح ہو جیسا اگر مقبولین مثل ملائکہ و انبیاء علیہم السلام کے یہ بات کہیں توضیح ہے، کقولہ تعالیٰ بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِنَّ اور خواہ یہ غلط ہو جیسے خود شیاطین کہنے لگیں، اور خواہ ان کو صحیح غلط ہونے کی خبر ہی نہ ہو، جیسے اصنام و اشجار وغیرہ کہنے لگیں) اور یہ مشرک اور کافر لوگ اس روز اللہ کے سامنے اطاعت کی باتیں کرنے لگیں گے اور جو کچھ (دنیا میں) افتراء پر دازیاں کرتے تھے (اس وقت) وہ سب گم ہو جائیں گے (اور ان میں) جو لوگ (خود بھی) کفر کرتے تھے (اور دوسروں کو بھی) اللہ کی راہ (یعنی دین) سے روکتے تھے اُن کے لئے ہم ایک سزا پر رک کفر کے مقابلہ میں ہوگی، دوسری سزا بمقابلہ ان کے فساد کے (کہ راہ خدا سے روکتے تھے) بڑھادیں گے۔

اور (وہ دن بھی یاد کرنے اور لوگوں کے ڈرنے کا ہی) جس دن ہم ہر امت کے ایک ایک گواہ جو انہی میں کا ہو گا ان کے مقابلہ میں قائم کریں گے (مراد اس امت کا نبی ہے اور انہی میں کا ہونا عام ہے خواہ باعتبار شرکت نسب کے ہو خواہ باعتبار شرکت سکنا کے ہو) اور ان لوگوں کے مقابلہ میں آپ کو گواہ بنا کر لائیں گے (اور اس اخبار شہادت سے جو آپ کی رسالت کا انجا مفہوم ہوتا ہے، اسکی دلیل یہ ہے کہ) ہم نے آپ پر قرآن اتارا ہے جو (علاوہ ہجر ہونے کے) جو کہ مدار ہے اثبات رسالت کا اُن خوبیوں کا جامع ہے) کہ تمام (دین کی) باتوں کا دبا سطر یا بلا واسطہ عامۃ الناس کے لئے) بیان کرنے والا ہے اور (خاص) مسلمانوں کے واسطے بڑی ہدایت اور بڑی رحمت اور (ایمان پر) خوشخبری سنانے والا ہے ۛ

معارف و مسائل

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّمَنْ شَاءَ ۚ اِس میں کتاب یعنی قرآن کو ہر چیز کا بیان فرمایا گیا ہے، مراد اس سے دین کی سب چیزیں اور باتیں ہیں، کیونکہ وحی و نبوت کا مقصد انہی چیزوں سے متعلق ہے، اس لئے معاشی فنون اور ان کے مسائل کو قرآن میں ڈھونڈنا ہی غلط ہے، اگر کہیں کوئی ضمنی اشارہ آجائے تو وہ اس کے منافی نہیں، رہا یہ سوال کہ قرآن کریم میں دین کے بھی سب مسائل مذکور نہیں تو تِبْيَانًا لِّمَنْ شَاءَ کہنا کیسے درست ہوگا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم میں اصول تو تمام مسائل کے موجود ہیں، انہی کی روشنی میں احادیث رسول اللہ ان مسائل کا بیان کرتی ہیں، اور کچھ تفصیلات کو اجماع و قیاس شرعی

کے سپرد کر دیا جاتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع و قیاس سے جو مسائل نکلے ہیں وہ بھی ایک حیثیت سے قرآن ہی کے بیان کئے ہوئے ہیں۔

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَايَ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ

اللَّهُ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿۹﴾

اللہ حکم کرتا ہے انصاف کرنے کا اور بھلائی کرنے کا اور قربت والوں کے دینے کا اور منع کرتا ہے فحشاء و منکر و بغی سے تاکہ تم کو سمجھاتا ہے تاکہ تم یاد رکھو۔

خلاصہ تفسیر

بیشک اللہ تعالیٰ (قرآن میں) اعتدال اور احسان اور اہل قربت کو دینے کا حکم فرماتے ہیں اور کھلی بُرائی اور مطلق بُرائی اور کسی پر ظلم (اور زیادتی) کرنے سے منع فرماتے ہیں (اور) مامورات و منہیات مذکورہ میں تمام اعمال صالحہ اور ستیہ آگئے، اس جامعیت کی وجہ سے قرآن کا تبیان ہونا صاف ظاہر ہے اور اللہ تعالیٰ تم کو (امور مذکورہ کی) اس لئے نصیحت فرماتے ہیں کہ تم نصیحت قبول کرو (اور عمل کرو، کیونکہ ہدٰی اور رحمت اور بشاری ہونا اسی پر موقوف ہے)؛

معارف و مسائل

یہ آیت قرآن کریم کی جامع ترین آیت ہے، جس میں پوری اسلامی تعلیمات کو چند الفاظ میں سمودیا گیا ہے، اسی لئے سلف صالحین کے عہد مبارک سے آج تک دستور چلا آ رہا کہ جمعہ وعیدین کے خطبوں کے آخر میں یہ آیت تلاوت کی جاتی ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کی جامع ترین آیت سورۃ نحل میں یہ ہے: إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ (ابن کثیر)

اور حضرت اکثم بن صیفی رضی اللہ عنہ تو اسی آیت کی بناء پر اسلام میں داخل ہوئے، امام ابن کثیر نے حافظ حدیث ابویعلیٰ کی کتاب معارف الصحابہ میں سند کے ساتھ یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ اکثم بن صیفی اپنی قوم کے سردار تھے، جب ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت اور اشاعت اسلام کی خبر ملی تو ارادہ کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں، مگر قوم کے لوگوں نے کہا کہ آپ ہم سب کے بڑے ہیں، آپ کا خود جانا مناسب نہیں، اکثم نے کہا کہ اچھا تو قبیلہ کے دو آدمی منتخب کرو جو وہاں جائیں، اور حالات کا جائزہ لے کر مجھے بتلائیں، یہ دونوں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم اکثم بن صیفی کی طرف سے دو باتیں دریافت کرنے کے لئے آئے ہیں، اکثم کے دو سوال یہ ہیں؛

مَنْ أَنْتَ وَمَا أَنْتَ ، | آپ کون ہیں اور کیا ہیں ؟

آپ نے ارشاد فرمایا کہ پہلے سوال کا جواب تو یہ ہے کہ میں محمد بن عبد اللہ ہوں اور دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں، اس کے بعد آپ نے سورۃ نحل کی یہ آیت تلاوت فرمائی: إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ الْآيَةِ ان ۱۰۰ فَوَلِّ قاصدوں نے درخواست کی کہ یہ جملے ہمیں پھر سنائیے، آپ اس آیت کی تلاوت کرتے رہے یہاں تک کہ ان قاصدوں کو آیت یاد ہو گئی قاصد واپس اکثم بن صیفی کے پاس آئے اور بتلایا کہ ہم نے پہلے سوال میں یہ چاہا تھا کہ آپ کا نسب معلوم کریں، مگر آپ نے اس پر زیادہ توجہ نہ دی صرف باپ کا نام بیان کر دینے پر اکتفا کیا، مگر جب ہم نے دوسروں سے آپ کے نسب کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ وہ بڑے عالی نسب شریف ہیں، اور پھر بتلایا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں کچھ کلمات بھی سنائے تھے وہ ہم بیان کرتے ہیں۔

ان قاصدوں نے آیت مذکورہ اکثم بن صیفی کو سنائی، آیت سنتے ہی اکثم نے کہا کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مکارم خلاق کی ہدایت کرتے ہیں اور بُرے اور رذیل اخلاق سے روکتے ہیں، ہم سب اُن کے دین میں داخل ہو جاؤ تاکہ تم دوسرے لوگوں سے مقدم اور آگے رہو، پیچھے تابع بن کر نہ رہو (ابن کثیر)

اسی طرح حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ شروع میں میں نے لوگوں کے کہنے سننے سے شرما کر ہی اسلام قبول کر لیا تھا، مگر میرے دل میں اسلام راسخ نہیں تھا، یہاں تک کہ ایک روز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا، اچانک آپ پر نزل وحی کے آثار ظاہر ہوئے، اور بعض عجیب حالات کے بعد آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا قاصد میرے پاس آیا، اور یہ آیت مجھ پر نازل ہوئی، حضرت عثمان بن مظعونؓ فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کو دیکھ کر اور آیت سن کر میرے دل میں ایمان مضبوط و مستحکم ہوا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت میرے دل میں گھر کر گئی، (ابن کثیر نے یہ واقعہ نقل کر کے فرمایا کہ اسناد اس کی جید ہے)۔

اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت ولید بن مغیرہ کے سامنے تلاوت فرمائی تو اس کا تاثر یہ تھا جو اس نے اپنی قوم قریش کے سامنے بیان کیا؛

وَاللّٰهُ اِنَّ لَهُ لِحَلَاوَةً وَّادَاتٍ | خدا کی قسم اس میں ایک خاص حلاوت ہے اور

عَلَيْهِ لَطَافَةٌ دَانِ اَصْلُهُ مُؤَرَّقٌ
 دَاعِلُهُ مُشْتَرِكٌ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ بَشَرٍ

اس کے اور ایک خاص ذوق اور نور ہے اس کی جڑ
 شاخیں اور پتی نکلنے والے ہیں اور شاخوں پر پھیل گئے

والا ہے، یہ کسی انسان کا کلام ہرگز نہیں ہو سکتا۔

تین چیزوں کا حکم اور اس آیت میں حق تعالیٰ نے تین چیزوں کا حکم دیا ہے، عدل، احسان، اور اس قربت
 تین چیزوں کی ممانعت کو بخشش، اور تین چیزوں سے منع فرمایا ہے، فحش کام، اور ہر برا کام، اور ظلم و
 تعدی، ان تین الفاظ کی شرعی مفہوم اور اس کے حدود کی تشریح یہ ہے:

عَدْلٌ، اس لفظ کے اصلی اور لغوی معنی برابر کرنے کے ہیں، اسی کی مناسبت سے حکام
 کا لوگوں کے نزاعی مقدمات میں انصاف کے ساتھ فیصلہ عدل کہلاتا ہے، وسترآن کریم میں
 اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ اس معنی کے لئے آیا ہے، اور اسی لحاظ سے لفظ عدل افراط و تفریط
 کے درمیان اعتدال کو بھی کہا جاتا ہے، اور اسی کی مناسبت سے بعض ائمہ تفسیر نے اس جگہ
 لفظ عدل کی تفسیر ظاہر و باطن کی برابری سے کی ہے، یعنی جو قول یا فعل انسان کے ظاہری اعضا
 سے سرزد ہو باطن میں بھی اسکا وہی اعتقاد اور حال ہو، اور اصل حقیقت یہی ہے کہ یہاں لفظ
 عدل اپنے عام معنی میں ہے، جو ان سب صورتوں کو شامل ہے، جو مختلف ائمہ تفسیر سے منقول
 ہیں، ان میں کوئی تضاد یا اختلاف نہیں۔

اور ابن عربی نے فرمایا کہ لفظ عدل کے اصلی معنی برابری کرنے کے ہیں، پھر مختلف
 نسبتوں سے اس کا مفہوم مختلف ہو جاتا ہے، مثلاً ایک مفہوم عدل کا یہ ہے کہ انسان اپنے نفس
 اور اپنے رب کے درمیان عدل کرے، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کے حق کو اپنے
 حظ نفس پر اور اس کی رضا جوئی کو اپنی خواہشات پر مقدم جانے، اور اس کے احکام کی تعمیل
 اور اس کی ممنوعات و محرمات سے مکمل اجتناب کرے۔

دوسرا عدل یہ ہے کہ آدمی خود اپنے نفس کے ساتھ عدل کا معاملہ کرے، وہ یہ ہے کہ
 اپنے نفس کو ایسی تمام چیزوں سے بچائے جس میں اس کی جسمانی یا روحانی ہلاکت ہو، اس کی
 ایسی خواہشات کو پورا نہ کرے جو اس کے لئے انجام کار مضر ہوں، اور قناعت و صبر سے کام
 لے، نفس پر بلا وجہ زیادہ بوجھ نہ ڈالے۔

تیسرا عدل اپنے نفس اور تمام مخلوقات کے درمیان ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ
 تمام مخلوقات کے ساتھ خیر خواہی اور ہمدردی کا معاملہ کرے، اور کسی ادنیٰ عالم میں
 کسی سے خیانت نہ کرے، سب لوگوں کے لئے اپنے نفس سے انصاف کا مطالبہ کرے، کسی
 انسان کو اس کے کسی قول و فعل سے ظاہر یا باطناً کوئی ایذا اور تکلیف نہ پہنچے۔

اسی طرح ایک عدل یہ ہے کہ جب دو فریق اپنے کسی معاملہ کا محاکمہ اس کے پاس لائیں تو فیصلہ میں کسی کی طرف میلان کے بغیر حق کے مطابق فیصلہ کرے، اور ایک عدل یہ بھی ہو کہ ہر معاملہ میں افراط و تفریط کی راہوں کو چھوڑ کر میانہ روی اختیار کرے، ابو عبد اللہ رازیؒ نے یہی معنی اختیار کر کے فرمایا ہو کہ لفظ عدل میں عقیدہ کا اعتدال، عمل کا اعتدال، اخلاق کا اعتدال سب شامل ہیں (بحر محیط)

امام قرطبیؒ نے عدل کے مفہوم میں اس تفصیل کا ذکر کر کے فرمایا کہ یہ تفصیل بہت بہتر ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس آیت کا صرف لفظ عدل تمام اعمال و اخلاقِ حسنہ کی پابندی اور برے اعمال و اخلاق سے اجتناب کو حاوی اور جامع ہے۔

الاحسان، اس کے اہل لغوی معنی اچھا کرنے کے ہیں، اور اس کی دو قسمیں ہیں، ایک یہ فعل یا خلق و عبادت کو اپنی ذات میں اچھا اور مکمل کرے، دوسرے یہ کہ کسی دوسرے شخص کے ساتھ اچھا سلوک اور عمدہ معاملہ کرے، اور دوسرے معنی کے لئے عربی زبان میں لفظ احسان کے ساتھ حرف الی استعمال ہوتا ہے، جیسا ایک آیت میں احسن کما احسن اللہ الیک فرمایا ہے۔

امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ آیت میں یہ لفظ اپنے عام مفہوم کے لئے مستعمل ہوا ہے، اس لئے احسان کی دونوں قسموں کو شامل ہے، پھر پہلی قسم کا احسان یعنی کسی کام کو اپنی ذات میں اچھا کرنا یہ بھی عام ہے عبادات کو اچھا کرنا، اعمال و اخلاق کو اچھا کرنا، معاملات کو اچھا کرنا۔

حضرت جبریلؑ کی مشہور حدیث میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احسان کے جو معنی بیان فرمائے ہیں، وہ احسان عبادت کے لئے ہے، اس ارشاد کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم خدا تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو، اور اگر حضور کا یہ درجہ نصیب نہ ہو تو اتنی بات کا یقین تو ہر شخص کو ہونا ہی چاہئے کہ حق تعالیٰ اس کے عمل کو دیکھ رہے ہیں، کیونکہ یہ تو اسلامی عقیدہ کا اہم جزو ہے کہ حق تعالیٰ کے علم و بصر کائنات کا کوئی ذرہ خارج نہیں رہ سکتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ دوسرا حکم اس آیت میں احسان کا آیا ہے، اس میں عبادت کا احسان حدیث کی تشریح کے مطابق بھی داخل ہے، اور تمام اعمال، اخلاق، عبادت کا احسان یعنی ان کو مطلوبہ صورت کے مطابق بالکل صحیح و درست کرنا بھی داخل ہے، اور تمام مخلوقات کی نسبت اچھا سلوک کرنا بھی داخل ہو خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر، انسان ہو یا حیوان۔

اہم قرطبی نے فرمایا کہ جس شخص کے گھر میں اس کی بیوی کو اس کی خوراک اور ضروریات نہ ملیں اور جس کے بچے میں بند پرندوں کی پوری خبر گیری نہ ہوتی ہو وہ کتنی ہی عبادت کرے عسین میں شمار نہیں ہوگا۔

اس آیت میں اذل عدل کا حکم دیا گیا پھر احسان کا بعض ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ عدل تو یہ ہے کہ دوسرے کا حق پورا پورا اس کو دیدے اور اپنا وصول کر لے، نہ کم نہ زیادہ، اور کوئی تکلیف تمہیں پہنچا کر تو ٹھیک اتنی ہی تکلیف تم اس کو پہنچاؤ نہ کم نہ زیادہ، اور احسان یہ کہ دوسرے کو اس کے اصل حق سے زیادہ دے دو اور اپنے حق میں چشم پوشی کرو، کہ کچھ کم ہو جائے تو بخوشی قبول کر لو، اسی طرح دوسرا کوئی تمہیں ہاتھ یا زبان سے ایذا پہنچائے تو تم برابر کا انتقام لینے کے بجائے اس کو معاف کر دو، بلکہ برائی کا بدلہ بھلائی سے دو اسی طرح عدل کا حکم تو فرض و واجب کے درجہ میں ہوا اور احسان کا حکم نفلی اور تبرع کے طور پر ہوا۔ ایتام ذی القربی، تیسرا حکم جو اس آیت میں دیا گیا ہے وہ ایتام ذی القربی ہے، ایتام کے معنی اعطاء یعنی کوئی چیز دینے کے ہیں، اور لفظ قربی کے معنی قرابت اور رشتہ داری کے ہیں، ذی القربی کے معنی رشتہ دار، ذی رحم، ایتام ذی القربی کے معنی ہو کر رشتہ دار کو کچھ دینا یہاں اس کی تصریح نہیں فرمائی کہ کیا چیز دینا، لیکن ایک دوسری آیت میں اس کا مفعول مذکور ہے فَاَتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ، یعنی دور رشتہ دار کو اس کا حق ظاہر یہی ہے کہ یہاں بھی یہی مفعول مراد ہے، کہ رشتہ دار کو اس کا حق دیا جائے، اس حق میں رشتہ دار کو مال دے کر مالی خدمت کرنا بھی داخل ہے، اور جسمانی خدمت بھی، بیمار پرسی اور خبر گیری بھی، زبانی تسلی و ہمدردی کا اظہار بھی، اور اگرچہ لفظ احسان میں رشتہ دار دل کا حق ادا کرنا بھی داخل تھا مگر اس کو اس کی زیادہ اہمیت بتلانے کے لئے علیحدہ بیان فرمایا گیا۔

یہ تین حکم ایجابی تھے، آگے تین ممانعت و حرمت کے احکام ہیں:-

وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ، یعنی اللہ تعالیٰ منع کرتا ہے فحشاء اور منکر اور بغی سے، فحشاء ہر ایسے بُرے فعل یا قول کو کہا جاتا ہے جس کی بُرائی کھلی ہوئی اور واضح ہو، ہر شخص اس کو بُرا سمجھے، اور منکر وہ قول و فعل ہے جس کے حرام و ناجائز ہونے پر اہل شرع کا اتفاق ہو، اس لئے اجتہادی اختلافات میں کسی جانب کو منکر نہیں کہا جاسکتا، اور لفظ منکر میں تمام گناہ ظاہری اور باطنی، عملی اور اخلاقی سب داخل ہیں، اور بغی کے اصلی معنی حد سے تجاوز کرنے کے ہیں، مراد اس سے ظلم و عدوان ہے، یہاں اگرچہ لفظ منکر کے مفہوم میں فحشاء بھی داخل ہے اور بغی بھی، لیکن فحشاء کو اس کی انتہائی بُرائی اور شاعت کی وجہ سے الگ کر کے بیان فرمایا اور مقدم کیا، اور بغی کو اس لئے الگ بیان کیا کہ اس کا اثر دوسروں

تک متعدی ہوتا ہے اور بعض اوقات یہ تعدی باہمی جنگ و جدل تک یا اس سے بھی آگے عالمی فساد تک پہنچ جاتی ہے۔

حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ظلم کے سوا کوئی گناہ ایسا نہیں جس کا بدلہ اور عذاب جلد دیا جاتا ہو، اس سے معلوم ہوا کہ ظلم پر آخرت کا عذاب شدید تو ہونا ہی ہے اس سے پہلے دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ ظالم کو سزا دیتے ہیں، اگرچہ وہ یہ نہ سمجھے کہ یہ فلاں ظلم کی سزا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے مظلوم کی مدد کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

اس آیت نے جو چھ حکم ایجابی اور تحریمی دیے ہیں اگر غور کیا جائے تو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی مکمل فلاح کا نسخہ اکیسے ہیں رزقنا اللہ تعالیٰ اتباع۔

وَأَوْفُوا بِعَهْدِ اللَّهِ إِذَا عَاهَدْتُمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْأَيْمَانَ بَعْدَ

اور پورا کرو عہد اللہ کا جب آپس میں عہد کرو اور نہ توڑو قسموں کو پکا کرنے

تُرَكِّيدَ هَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللَّهَ عَلَيْكُمْ كَفِيلًا إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا

کے بعد اور تم نے کیا ہر اللہ کو اپنا ضامن اللہ جانتا ہے جو تم

تَفْعَلُونَ ۝ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَقَضَتْ غَزْلَهُمَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ

کرتے ہو، اور مت رہو جیسے وہ عورت کہ توڑا اس نے اپنا سوت کا تا ہوا محنت کے بعد

أَنْكَاثًا تَتَخِذُونَ أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ أَنْ تَكُونَ أُمَّةٌ

ملکڑے ملکڑے کہ ٹھہراؤ اپنی قسموں کو دخل دینے کا بہانہ ایک دوسرے میں اس واسطے کہ ایک فرقہ ہو

أَرْبَى مِنْ أُمَّةٍ إِنْهَا يَلُوكُمُ اللَّهُ بِهِ وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ

چڑھا ہوا دوسرے سے یہ تو اللہ پر بکھتا ہر تم کو اس سے اور آئندہ کھول دے گا اللہ تم کو

الْقِيَمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ۝ (۹۲) وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ

قیامت کے دن، جس بات میں تم جھگڑ رہے تھے، اور اللہ چاہتا تو سب کو

أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَٰكِنْ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ ۝

ایک ہی فرقہ کر دیتا لیکن راہ بھلاتا ہے جسکو چاہی اور بھٹاتا ہے جسکو چاہی،

وَلْتَسْكُنَنَّ عِمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۹۳﴾ وَلَا تَتَّخِذُوا أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا

اور تم سے بڑھ ہوگی جو کام تم کرتے تھے ، اور نہ تمہارا اپنی قسموں کو دھوکا ،

بَيْنَكُمْ فَتْرًا قَدْ بَعَثَ تَبَرَّهَا وَتَدُّوْا السُّعْيَ بِمَا صَدَدْتُمْ

آپس میں کہ دُک نہ جائے کسی کا پاؤں بٹنے کے پیچھے اور تم چھو سزا اس بات پر کہ تم نے روکا

عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۹۴﴾ وَلَا تَشْتَرُوا بِعَهْدِ

اللہ کی راہ سے اور تم کو بڑا عذاب ہو ، اور نہ لو اللہ کے عہد پر

اللَّهِ ثَمَنًا قَلِيلًا إِنَّمَا عِنْدَ اللَّهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنْتُمْ

مول تھوڑا سا ، بیشک جو اللہ کے یہاں ہو وہی بہتر ہے تمہارے حق میں اگر تم

تَعْلَمُونَ ﴿۹۵﴾ مَا عِنْدَ كُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ بَاقٍ وَلَنَجْزِيَنَّهُنَّ

جانتے ہو ، جو تمہارے پاس ہو ختم ہو جائے گا اور جو اللہ کے پاس ہو کبھی ختم نہ ہوگا ، اور ہم بدلہ میں دیں گے

الَّذِينَ صَبَرُوا وَأَجْرُهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۹۶﴾

صبر کرنے والوں کو ان کا حق اچھے کاموں پر جو کرتے تھے ۔

خلاصہ تفسیر

ایفاء عہد کا حکم اور عہد شکنی کی مذمت اور تم اللہ کے عہد کو یعنی جس عہد کے پورا کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اس کو پورا کرو اور اس سے وہ نکل گیا جو خلاف شرع عہد ہو اور باقی سب عہود مشروع و عہد متعلق حقوق اللہ کے ہوں یا متعلق حقوق العباد کے ہوں اس میں داخل ہو گئے ، جبکہ تم اس کو (تخصیصاً یا تعیناً) اپنے ذمہ نہ کر لو (تخصیصاً یہ کہ صراحۃً کسی کام کا ذمہ لے لیا اور تعیناً یہ کہ ایمان لاؤ تو تمام احکام و اجبہ کی ذمہ داری اس کے ضمن میں آگئی) اور بالخصوص جن عہود میں قسم بھی کھائی ہو وہ زیادہ قابل اہتمام ہیں ، سو ان میں (قسموں کو بعد ان کے مستحکم کرنے کے) یعنی اللہ کا نام لے کر قسم کھانے کے) مت توڑو اور تم ان قسموں کی وجہ سے ان عہود میں (اللہ تعالیٰ کو گواہ بھی بنا چکے ہو) یہ قیدیں بعد تو کُیڈ رہا اور قَدْ جَعَلْتُمْ ، قید واقعی ہیں و فاء عہد پر تنبیہ کے لئے تھوڑے کی گئی ، بیشک اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے جو کچھ تم کرتے ہو (خواہ وہ فاء یا عہد شکنی پس اسی کے موافق تم کو جزا و سزا دے گا) اور تم (نقض عہد کر کے) اس رکنہ میں رہنے والی پاکل (عورت کے

مشابہ مت بنو جس نے اپنا سوت کاتے پیچھے بوٹی بوٹی کر کے نوچ ڈالا کہ اس کی طرح (تم رہیں) اپنی قسموں کو بعد رستی کے توڑ کر ان کو آپس میں فساد ڈالنے کا ذریعہ بنانے لگو (کیونکہ قسم و عہد توڑنے سے موافقین کو بے اعتباری اور مخالفین کو براہِ نیکی سبھا ہوتی ہے، اور یہ اصل ہو فساد کی اور توڑنا بھی محض اس وجہ سے کہ) ایک گروہ دوسرے گروہ سے (کثرت یا ثروت میں) بڑھ جائے یعنی مثلاً کفار کے دو گروہ ہوں میں باہم مخالفت ہو اور تمھاری ایک سے صلح ہو جائے پھر دوسری طرف پلہ جھکتا ہو ادیکھ کر جس گروہ سے صلح کی تھی اس سے غدر کر کے دوسرے گروہ سے سازش کر لے، یا مثلاً کوئی مسلمان ہو کر مسلمانوں میں شامل ہو اور پھر کافروں کی طرف زور دیکھا تو عہدِ اسلام کو توڑ کر مرتد ہو جائے، اور یہ جو ایک گروہ دوسرے سے بڑھا ہوا ہوتا ہے یا دوسری کسی جماعت کے شامل ہو جانے سے بڑھ جاتا ہے، تو بس اس (زائد ہونے) سے اللہ تعالیٰ تمھاری آزمائش کرتا ہے کہ دیکھیں دفا بہرہ کرتے ہو یا جھکتا پلہ دیکھ کر اُدھر دھل جاتے ہو اور جن چیزوں میں تم اختلاف کرتے رہے (اور مختلف راہیں چلتے رہے) قیامت کے دن ان سب (کی حقیقت) کو تمھارے سامنے (عملاً) ظاہر کر دے گا کہ حق والوں کو جزاء اور باطل والوں کو سزا ہو جائے گی، آگے اس اختلاف کی حکمت بطور جملہ معترضہ کے اجمالاً بیان فرماتے ہیں، اور ہر چند کہ اللہ تعالیٰ کو یہ بھی قدرت تھی کہ اختلاف نہ ہونے دیتے، چنانچہ اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو تم سب کو ایک ہی طریقہ کا بنا دیتا لیکن، بمقتضائے حکمت جس کی تفصیل نہیں یہاں ضروری نہیں، جس کو چاہتے ہیں بے راہ کر دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں راہ پر ڈال دیتے ہیں (چنانچہ منجملہ ہدایت کے دفائے عہد اور منجملہ ضلالت کے نقض عہد بھی ہیں) اور یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ جیسے دنیا میں گمراہوں کو پوری سزا نہیں ہوتی ایسے ہی آخرت میں مطلق العنان رہیں گے ہرگز نہیں بلکہ قیامت میں تم سے تمھارے سب اعمال کی ضرور باز پرس ہوگی اور جیسا نقض عہد و قسم سے محسوس ضرر ہوتا ہے جس کا اذ پر بیان تھا، اسی طرح اس سے معنوی ضرر بھی ہوتا ہے، آگے اسی کا ذکر ہے یعنی تم اپنی قسموں کو آپس میں فساد ڈالنے کا ذریعہ مت بناؤ (یعنی قسموں اور عہدوں کو مت توڑو، کہہی اس کو دیکھ کر کسی اور کا قدم جمنے کے بعد نہ پھسل جائے، یعنی دوسرے بھی تمھاری تقلید کریں، اور عہد شکنی کرنے لگیں) پھر تم کو اس سبب سے کہ تم (دوسروں کے لئے) راہِ خدا سے مانع ہوؤ (تکلیف بھگتنا پڑے) (کیونکہ دفا بہرہ راہِ خدا ہے تم اس کے توڑنے کے سبب بن گئے اور یہی وہ معنوی ضرر کہ دوسروں کو بھی عہد شکن بنایا اور تکلیف یہ ہوگی کہ اس حالت میں تم کو بڑا عذاب ہو گا اور (جس طرح گروہ غالب میں شامل ہو کر جاہ حاصل کرنے کی غرض سے نقض عہد

منسوع ہے جس کا اذہر ذکر ہوا اسی طرح تحصیل مال کی غرض سے جو عہد توڑا ہو اس کی ممانعت فرماتے ہیں کہ (اور تم لوگ عہد خداوندی کے عوض میں دنیا کا) تھوڑا سا فائدہ مست حاصل کرو اور عہد خداوندی کے معنی تو شروع آیت میں معلوم ہوئے اور ثمن قلیل سے مراد وہ نیلے ہے کہ باوجود کثیر ہونے کے بھی قلیل ہی ہے، اس کی حقیقت اس طرح بیان فرمائی کہ (پس اللہ کے پاس جو چیز ہے (یعنی ذخیرہ آخرت) وہ تمھارے لئے (مبارک دنیوی سے) بدرجہا بہتر ہے اگر تم سمجھنا چاہو (پس متارح آخرت کثیر ہوئی اور متارح دنیوی خواہ کتنی بھی ہو قلیل ہوئی) اور (علاوہ تفاوت قلیل و کثیر کے دوسرا تفاوت یہ بھی ہے کہ) جو کچھ تمھارے پاس (دنیا میں) ہے وہ (ایک روز) ختم ہو جائے گا، خواہ زوال سے یا موت سے) اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ دائم رہے گا اور جو لوگ (دفعے عہد وغیرہ احکام دین پر) ثابت قدم ہیں ہم ان کے اچھے کاموں کے عوض میں ان کا اجر (یعنی نعمت) باقیہ مذکورہ) ان کو ضرور دیں گے (پس دفعے عہد کر کے دولت کثیرہ غیر فانیہ کو حاصل کرو اور قلیل فانی کے لئے نقصان عہد مت کرو)

معارف و مسائل

عہد شکنی حرام ہے | لفظ عہد ان تمام معاملات و معاہدات کو شامل ہے جن کا زبان سے الزام کیا جائے یعنی اس کی ذمہ داری لی جائے خواہ اس پر قسم کھائے یا نہ کھائے، خواہ وہ کسی کام کے کرنے سے متعلق ہو یا نہ کرنے سے۔

اور یہ آیات درحقیقت آیت سابقہ کی تشریح و تکمیل ہیں، آیت سابقہ میں عدل و احسان کا حکم تھا، لفظ عدل کے مفہوم میں ایفاء عہد بھی داخل ہے (قرطبی) کسی سے عہد معاہدہ کرنے کے بعد عہد شکنی کرنا بڑا گناہ ہے، مگر اس کے توڑنے پر ہوئی کفارہ معتبر نہیں، بلکہ آخرت کا عذاب ہے، حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قیامت کے روز عہد شکنی کرنے والے کی پشت پر ایک جھنڈا نصب کر دیا جائے گا، جو میدانِ حشر میں اس کی رسوائی کا سبب بنے گا۔

اسی طرح جس کام کی قسم کھائی اس کے خلاف کرنا بھی گناہ کبیرہ ہے، آخرت میں وبال عظیم ہے اور دنیا میں بھی اس کی خاص صورتوں میں کفارہ لازم ہوتا ہے (قرطبی)

اَنْ تَكُونُ اُمَّةً مِّنْ اُمَّةٍ، اس آیت میں مسلمانوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ جس جماعت سے تمھارا معاہدہ ہو جائے اس معاہدہ کو دنیوی اغراض و منافع کے لئے نہ توڑو مثلاً تمھیں یہ محسوس ہو کہ جس جماعت یا پارٹی سے معاہدہ ہوا ہے یہ کمزور اور تعداد میں قلیل ہے،

یا مال کے اعتبار سے مفلس ہو، اور اس کے بالمقابل دوسری جماعت کثیر اور قوی ہے، یا مال دولت والی ہے، تو صرف اس طرح سے کہ قوی اور مالدار پارٹی میں شامل ہو جانے سے منافع زیادہ ہوں گے، پہلی جماعت کا عہد توڑنا جائز نہیں، بلکہ اپنے عہد پر قائم رہے اور نفع و ضرر کو خدا تعالیٰ کے سپرد کرے، البتہ جس جماعت یا پارٹی سے عہد کیا ہے، وہ اگر خلاف شرع امور کا ارتکاب کرے اور کرائے تو اس کا عہد توڑ دینا واجب ہے، بشرطیکہ واضح طور پر ان کو جتلا دیا جائے کہ ہم اب اس عہد کے پابند نہیں رہیں گے، جیسا کہ آیت فَاَنْتَبِہْ اَلَيْهِمْ عَلٰی سَوَآءٍ میں مذکور ہے۔

آخر آیت میں مذکورہ صورت حال کو مسلمان کی آزمائش کا ذریعہ بتلایا گیا ہے، کہ حق تعالیٰ اس کا امتحان لیتے ہیں، کہ یہ اپنے نفس کی اغراض و خواہشات کا تابع ہو کر عہد کو توڑ دیتا ہے، یا اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں نفسانی جذبات کو قربان کرتا ہے۔

کسی کو دھوکہ دینے کے لئے قسم کھانے اَوْ لَا تَخِيْلُ وَاٰيٰمًا كَثْرَةً خَلًا، اس آیت میں ایک اور عظیم میں سلب ایمان کا خطرہ ہے گناہ اور وبال سے بچانے کی ہدایت ہے، وہ یہ کہ قسم کھاتے

وقت ہی سے اس قسم کے خلاف کرنے کا ارادہ ہو صرف مخاطب کو فریب دینے کے لئے قسم کھائی جائے تو یہ عام قسم توڑنے سے زیادہ خطرناک گناہ ہے، جس کے نتیجہ میں یہ خطرہ ہے کہ ایمان کی دولت ہی سے محروم ہو جائے، فَتَنْزِلَ قَدَمٌ بَعْدَ ثُبُوتِهَا، کا یہی مطلب (قرآنی رشوت لینا سخت حرام) وَلَا تَشْكُرُوْا بَعْدَ اِيْتِنَانِكُمْ اَللّٰهُ ثُمَّ قَلِيْلًا، یعنی اللہ کے عہد کو تھوڑی سی اور اللہ سے عہد شکنی ہے قیمت کے بدلے میں نہ توڑو، یہاں تھوڑی سی قیمت سے مراد دنیا اور

اس کے منافع ہیں وہ مقدار میں کتنے بھی بڑے ہوں، آخرت کے منافع کے مقابلہ میں ساری دنیا اور اس کی ساری دولتیں بھی قلیل ہی ہیں، جس نے آخرت کے بدلے میں دنیا لے لی اس نے انتہائی خسارہ کا سودا کیا، کہ ہمیشہ رہنے والی اعلیٰ ترین نعمت و دولت کو بہت جلد فتنہ ہونے والی گھٹیا قسم کی چیز کے عوض بیچ ڈالنا کوئی سمجھے بوجھ والا انسان گوارا نہیں کر سکتا۔ ابن عطیہ نے فرمایا کہ جس کام کا پورا کرنا کسی شخص کے ذمہ واجب ہو وہ اللہ کا عہد اس کے ذمہ ہے، اس کے پورا کرنے پر کسی سے معاوضہ لینا اور بغیر لئے نہ کرنا اللہ کا عہد توڑنا ہے اس طرح جس کام کا نہ کرنا کسی کے ذمہ واجب ہے کسی سے معاوضہ لے کر اس کو کر دینا یہ بھی اللہ کا عہد توڑنا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ رشوت کی مروجہ قسمیں سب حرام ہیں، جیسے کوئی سرکاری ملازم کسی کام کی تنخواہ حکومت سے پاتا ہے تو اس نے اللہ سے عہد کر لیا ہے کہ یہ تنخواہ لے کر مفوضہ

خدمت پوری کر دی گئی، اب اگر وہ اس کے کرنے پر کسی سے معاوضہ مانگے اور بغیر معاوضہ اس کو ملا کر تو یہ عبد اللہ کو توڑ رہا ہے، اسی طرح جس کام کا اس کو نفع کی طرف سے اختیار نہیں اس کو رشوت لے کر کر ڈالنا بھی اللہ سے عہد شکنی ہے (بحر محیط)
رشوت کی جامع تعریف | ابن عطیہ کے اس کلام میں رشوت کی جامع مانع تعریف بھی آگئی، جو تفسیر بحر محیط کے الفاظ میں یہ ہے:

اخذ الاموال علی فعل ما	یعنی جس کام کا کرنا اس کے ذمہ واجب
يجب علی الاخذ فعله او فعل	ہے اس کے کرنے پر معاوضہ لینا جس
ما يجب عليه تركه	کام کا چھوڑنا اس کے ذمہ لازم ہے اس کے

کرنے پر معاوضہ لینا رشوت ہے (تفسیر بحر محیط، ص ۵۳۳ ج ۵)

اور پوری دنیا کی ساری نعمتوں کا قلیل ہونا اگلی آیت میں اس طرح بیان فرمایا:
 مَا عِنْدَکُمْ یَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ، یعنی جو کچھ تمہارے پاس ہے (مراد اس سے دنیوی منافع ہیں) وہ سب ختم اور فنا ہونے والا ہے، اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے (مراد اس سے آخرت کا ثواب و عذاب ہے) وہ ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔

دنیائی راحت و کلفت، دوستی، دشمنی	مَا عِنْدَکُمْ کے لفظ سے عام طور پر ذہن صرف مال و منافع کی طرف جاتا ہے، استاذ محترم مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ لفظ مَا لغت کے اعتبار سے عام ہے، اور عموم کے معنی مراد لینے سے کوئی امر شرعی مانع نہیں،
سب فنا ہونے والے ہیں اور ان کے ثمرات و نتائج جو اللہ کے پاس ہیں وہ باقی رہنے والے ہیں	

اس لئے اس میں دنیا کا مال و منافع بھی داخل ہے، اور اس میں پیش آنے والے تمام حالات و معاملات، خوشی اور غم، سچ اور راحۃ، بیماری اور صحت، نفع اور نقصان کسی کی دوستی یا دشمنی یہ سب چیزیں شامل ہیں کہ سب کی سب فنا ہونے والی ہیں، البتہ ان حالات و معاملات پر جو آثار مرتب ہونے والے ہیں اور قیامت میں اُن پر عذاب و ثواب ہونے والا ہے وہ سب باقی رہنے والے ہیں، فنا ہو جانے والے حالات و معاملات کی دھن میں لگا رہنا اور اپنی زندگی اور اس کی توانائی کو اسی کی فکر میں لگا کر دائمی عذاب و ثواب سے غفلت برتن کسی ذی عقل کا کام نہیں ہے

دوران بقاء چوباد صحرانگہشت	تلخی و خوشی و زشت و زیبانگہشت
پنداشت ستمگر کہ جہاں برما کرد	برگردن دے بہاند و برما بگہشت

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً

جس نے کیا نیک کام مرد ہو یا عورت اور وہ ایمان پر ہو تو اس کو ہم زندگی دیں گے ایک

طیبہؕ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُم بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۹۷﴾

ایسی زندگی اور بدلے میں دیں گے اُن کو حق اُن کا بہتر کاموں پر جو کرتے تھے ۔

خلاصہ تفسیر

(اس سے پہلی آیات میں ایفاء عہد کی تاکید اور عہد شکنی کی مذمت کا بیان تھا جو ایک خاص عمل ہے اس آیت میں تمام اعمال صالحہ اور عاملین صالحین کا عمومی بیان ہے، مضمون آیت کا یہ ہے، کہ آخرت کا اجر و ثواب اور دنیا کی برکات صرف ایفاء عہد میں منحصر نہیں اور نہ کسی عال کی تخصیص، بلکہ قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جو شخص بھی کوئی نیک کام کیے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ صاحب ایمان ہو، کیونکہ کافر کے اعمال صالحہ مقبول نہیں، تو ہم اس شخص کو دنیا میں تو بالطف زندگی دیں گے اور آخرت میں، ان کے اچھے کاموں کے عوض میں اُن کا اجر دیں گے۔

معارف و مسائل

حیات طیبہ کیا چیز ہے؟ [جمہور مفسرین کے نزدیک یہاں حیات طیبہ مراد دنیا کی پاکیزہ اور بالطف زندگی ہے، اور بعض ائمہ تفسیر نے اس سے آخرت کی زندگی مراد لی ہے، اور جمہور کی تفسیر کے مطابق بھی اس سے یہ مراد نہیں کہ اس کو کبھی فقر و فاقہ یا بیماری پیش نہ آئے گی، بلکہ مراد یہ ہے کہ مؤمن کو اگر کبھی معاشی تنگی یا کوئی تکلیف بھی پیش آتی ہے تو دو چیزیں اس کو پریشان نہیں ہونے دیتیں، ایک قناعت اور سادہ زندگی کی عادت جو تنگدستی میں بھی چل جاتی ہے، دوسرے اس کا یہ عقیدہ کہ مجھے اس تنگی اور بیماری کے بدلے میں آخرت کی عظیم الشان دائمی نعمتیں ملنے والی ہیں، بخلاف کافر و فاجر کے کہ اگر اس کو تنگدستی اور بیماری پیش آتی ہے، تو اس کے لئے کوئی تسلی کا سامان نہیں ہوتا، عقل و ہوش کھو بیٹھتا ہے، بعض اوقات خودکشی کی نوبت آ جاتی ہے، اور اگر اس کو فراخی عیش بھی نصیب ہو تو اس کو زیادتی کی حرص کسی وقت چین سے نہیں بیٹھنے دیتی، وہ کروڑ پتی ہو جاتا ہے، تو ارب پتی بننے کی فکر اس کے عیش کو خراب کرتی رہتی ہے۔

ابن عطیہؒ نے فرمایا کہ مؤمنین صالحین کو حق تعالیٰ دنیا میں بھی وہ فرحت و انبساط اور پُر لطف زندگی عطا فرماتے ہیں جو کسی حال میں متغیر نہیں ہوتی، تندرستی اور فراخ دستی کے وقت

تو ان کی زندگی کا پُر لطف ہونا ظاہر ہے ہی، خصوصاً اس بنا پر کہ بلا ضرورت مال کو بڑھانے کی حرص ان میں نہیں ہوتی جو انسان کو ہر حال میں پریشان رکھتی ہے، اور اگر تنگ دستی یا بیماری بھی پیش آئے تو اللہ تعالیٰ کے دُعاؤں پر اُن کا مکمل یقین اور مشکل کے بعد آسانی، کلفت کے بعد راحت ملنے کی قوی اُمید ان کی زندگی کو بے لطف نہیں ہونے دیتی، جیسے کاشت کار کھیت بولے اور اس کی پرورش سے دقت اس کو کتنی ہی تکلیفیں پیش آجائیں سب کو اس لئے راحت محسوس کرتا ہے کہ چند روز کے بعد اس کا بڑا صلہ اس کو ملنے والا ہے، تاجر اپنی تجارت میں، ملازم اپنی ڈیوٹی ادا کرنے میں کیسی کیسی مُنت و مشقت بلکہ بعض اوقات ذلت بھی برداشت کرتا ہے، مگر اس لئے خوش رہتا ہے کہ چند روز کے بعد اس کو تجارت کا بڑا نفع یا ملازمت کی تنخواہ ملنے کا یقین ہوتا ہے، مومن کا بھی یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ مجھے ہر تکلیف پر اجر مل رہا ہے اور آخرت میں اس کا بدلہ دائمی عظیم الشان نعمتوں کی صورت میں ملے گا، اور دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی، اس لئے یہاں کے سچ و راحت اور سرد و گرم سب کو آسانی سے برداشت کر لیتا ہے، اُس کی زندگی ایسے حالات میں بھی مشورش اور بے لطف نہیں ہوتی، یہی وہ حیاتِ طیبہ ہے جو مومن کو دنیا میں نقد ملتی ہے۔

فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ①

سوجب تو پڑھنے لگے قرآن تو پناہ لے اللہ کی شیطان مردود سے

إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ②

اس کا زور نہیں چلتا اُن پر جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں

إِنَّمَا سُلْطَانُهُ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَكَّلُونَهُ وَالَّذِينَ هُم

اس کا زور تو اپنی پر ہے جو اس کو رفیق سمجھتے ہیں اور جو اس کو

بہ مشرکون ③

شریک مانتے ہیں۔

رابطِ آیات | سابقہ آیات میں اول ایفاء عہد کی تاکید اور مطلقاً اعمالِ صالحہ کی تاکید و ترغیب کا بیان آیا ہے، انسان کو ان احکام میں غفلت اغواءِ شیطانی سے پیدا ہوتی ہے،

اس لئے اس آیت میں شیطانِ رحیم سے پناہ مانگنے کی تعلیم دی گئی ہے جس کی ضرورت ہر نیک عمل میں ہے، مگر اس آیت میں اس کو خاص طور سے قرأتِ قرآن کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، اس تخصیص کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ تلاوتِ قرآن ایک ایسا عمل ہے جس سے خود شیطان بھاگتا ہے ۵

دیو بگریز دازاں قوم کہ قرآن خوانند

اور بعض خاص آیات اور سورتیں بالخاصہ شیطانی اثرات کو زائل کرنے کیلئے مجرب ہیں جن کا مؤثر و مفید ہونا نصوصِ شرعیہ سے ثابت ہو (بیانِ قرآن) اس کے باوجود جب تلاوتِ قرآن کے ساتھ شیطان سے تعوذ کا حکم دیا گیا تو دوسرے اعمال کے ساتھ اور بھی زیادہ ضروری ہو گیا۔ اس کے علاوہ خود تلاوتِ قرآن میں شیطانی وساوس کا بھی خطرہ رہتا ہے، کہ تلاوت کے آداب میں کمی ہو جائے، تدبیر و تفکر اور خشوع و خضوع نہ رہے تو اس کے لئے بھی وساوسِ شیطانی سے پناہ مانگنا ضروری سمجھا گیا (ابن کثیر، مظهری وغیرہ)

خلاصہ تفسیر

(اور جب عمل صالح کی فضیلت معلوم ہوئی، اور کبھی کبھی شیطان اس میں خلل ڈالتا ہو، کبھی دفا سے بھر میں بھی خلل ڈالتا ہے اور کبھی دوسرے عمل مثل قرأتِ قرآن میں بھی) تو اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ اور آپ کے واسطے آپ کی امت سن لیں کہ جب آپ (کیسا ہی نیک کام کرنا چاہیں حتیٰ کہ) قرآن پڑھنا چاہیں تو شیطان مردود کے شر سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کریں (اصلاً تو دل سے خدا پر نظر رکھنا ہے اور یہی حقیقت استعاذہ کی واجب ہے) اور قرأت میں پڑھ لینا زبان سے بھی مستنون ہے، اور پناہ مانگنے کا حکم ہم اس لئے دیتے ہیں کہ یقیناً اس کا قابو ان لوگوں پر نہیں چلتا جو ایمان رکھتے ہیں، اور اپنے رب پر (دل سے) بھروسہ رکھتے ہیں، بس اس کا قابو تو صرف ان ہی لوگوں پر چلتا ہے جو اس سے تعلق رکھتے ہیں اور ان لوگوں پر (چلتا ہے) جو کہ اللہ کے سنا شرک کرتے ہیں۔

معارف و مسائل

ابن کثیر نے مقدمہ تفسیر میں فرمایا کہ انسان کے دشمن دو قسم کے ہیں، ایک خود نوعِ انسانی میں سے جیسے عام کفار، دوسرے جنات میں سے جو شیطانِ نافرمان ہیں، پہلی قسم کے دشمن کے ساتھ اسلام نے جہاد و قتال کے ذریعہ مدافعت کا حکم دیا ہے، مگر دوسری قسم کے لئے صرف اللہ سے پناہ مانگنا حکم ہوا ہے کہ یہی قسم کا دشمن اپنی ہی جنس و نوع سے ہے اس کا حملہ ظاہر ہو کر ہوتا ہے اس لئے اس سے جہاد و قتال فرض کر دیا گیا، اور دشمنِ شیطانی نظر نہیں آتا، اس کا حملہ بھی انسان پر نامناسب

نہیں ہوتا، اس لئے اس کی مداخلت کے لئے ایک ایسی ذات کی پناہ لینا واجب کیا گیا جو نہ انسان کو فدا کرتی ہے نہ شیطان کو، اور شیطان کی مداخلت کو بحوالہ بخدا تعالیٰ کرنے میں یہ بھی مصلحت ہو کہ جو اس سے مغلوب ہو جائے وہ اللہ کے نزدیک راندہ درگاہ اور ترقی عذاب ہو، بخلاف عدو انسانی یعنی کفار کے مقابلہ میں کوئی شخص مغلوب ہو جائے یا مارا جائے تو وہ شہید اور ترقی ثواب ہے، اس لئے عدو انسانی کا مقابلہ اعضا و جوارح کی تباہی و حال میں نفع ہی نفع ہے، یا دشمن غالب کرے اسکی قوت کو ختم کر دیکر یا پھر خود شہید کر دے اللہ بوجہ ہوگا۔

مسئلہ :- تلاوت قرآن سے پہلے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ کا پڑھنا اس آیت کی تعمیل کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، مگر کبھی کبھی اس کا ترک کرنا بھی احادیث صحیحہ سے ثابت ہے، اس لئے جمہور علماء امت نے اس حکم کو واجب نہیں بلکہ سنت قرار دیا ہے، اور ابن جریر طبری نے اس پر اجماع امت نقل کیا ہے، اس معاملے میں روایات حدیث قولی اور عملی تلاوت سے پہلے اکثر حالات میں اَعُوْذُ بِاللّٰهِ پڑھنے کی اور بعض حالات میں نہ پڑھنے کی یہ سب ابن کثیر نے اپنی تفسیر کے شروع میں مبسوط ذکر کی ہیں۔

مسئلہ :- نماز میں تعوذ (یعنی اَعُوْذُ بِاللّٰهِ) صرف پہلی رکعت کے شروع میں پڑھا جا یا ہر رکعت کے شروع میں، اس میں ائمہ فقہاء کے اقوال مختلف ہیں، امام اعظم ابو حنیفہ کے نزدیک صرف پہلی رکعت میں پڑھنا چاہئے، اور امام شافعی ہر رکعت کے شروع میں پڑھنے کو مستحب قرار دیتے ہیں، دونوں کے دلائل تفسیر مظہری میں مبسوط لکھے گئے ہیں (ص ۴۹ ج ۵)

مسئلہ :- تلاوت قرآن نماز میں ہو یا خارج نماز دونوں صورتوں میں تلاوت سے پہلے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ پڑھنا سنت ہے، مگر ایک دفعہ پڑھ لیا تو آگے جتنا پڑھتا رہے وہی ایک تعوذ کافی ہے، البتہ تلاوت کو درمیان میں چھوڑ کر کسی دنیوی کام میں مشغول ہو گیا اور پھر دوبارہ شروع کیا، تو اس وقت دوبارہ تعوذ اور بسم اللہ پڑھنا چاہئے۔

مسئلہ :- تلاوت قرآن کے علاوہ کسی دوسرے کلام یا کتاب پڑھنے سے پہلے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ پڑھنا سنت نہیں، وہاں صرف بسم اللہ پڑھنا چاہئے، (در مختار، شامی)

البتہ مختلف اعمال اور حالات میں تعوذ کی تعلیم حدیث میں منقول ہے، مثلاً جب کسی کو غصہ زیادہ آئے تو حدیث میں ہے کہ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ پڑھنے سے شدت غصہ فرو ہو جاتی ہے (ابن کثیر)

نیز حدیث میں ہے کہ بیت الخلاء میں جانے سے پہلے اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخُبْثِ وَالْخَبَائِثِ، پڑھنا مستحب ہے (شامی)

اللہ تعالیٰ پر ایمان و توکل | اس آیت میں یہ واضح کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو ایسی قوت نہیں دی کہ وہ کسی بھی انسان کو ہرانی پر مجبور و بے اختیار کر دے، انسان خود اپنے اختیار و قدرت کو غفلت یا کسی غرض نفسانی سے استعمال نہ کرے تو یہ اس کا قصور ہے، اسی لئے فرمایا کہ جو لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اپنے احوال و اعمال میں اپنی قوت و ارادگی کے بجائے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہیں کہ وہی ہر خیر کی توفیق دینے والا اور ہر شر سے بچانے والا ہے، ایسے لوگوں پر شیطان کا تسلط نہیں ہوتا، ہاں جو اپنے اغراض نفسانی کے سبب شیطان ہی سے دوستی کرتے ہیں، اُسی کی باتوں کو پسند کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ غیرو کو شریک ٹھہراتے ہیں اُن پر شیطان مسلط ہو جاتا ہے کہ کسی خیر کی طرف نہیں جانے دیتا، اور ہر ہرانی میں وہ آگے آگے ہوتے ہیں۔

یہی مضمون سورۃ حجرات کی آیت کا ہے جس میں شیطان کے دعوے کے مقابلہ میں خودی تعالیٰ نے یہ جواب دیدیا ہے: **إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِينَ**، یعنی میرے خاص بندوں پر تیرا تسلط نہیں ہو سکتا ہاں اس پر ہو گا جو خود ہی گمراہ ہو اور تیرا اتباع کرنے لگے۔

وَإِذَا بَدَّلْنَا آيَةً مَّكَانَ آيَةٍ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُنْزِلُ قَالُوا إِنَّمَا

اور جب ہم بدلتے ہیں ایک آیت کی جگہ دوسری آیت اور اللہ خوب جانتا ہی ہوتا انا کہہ رہے ہیں تو تو

أَنْتَ مُفْتَرٍ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝۱۱ قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ

بنالاتا ہی یہ بات نہیں، بڑا کثروں کو اُن میں خبر نہیں، تو کہہ اس کو اتارا ہے پاک

الْقُدُّسُ مِنْ رَبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِينَ آمَنُوا وَهُدًى وَ

فرشتے نے تیرے رب کی طرف سے بلاشبہ تاکہ ثابت کرے ایمان والوں کو اور ہدایت اور

بَشْرًا لِلْمُسْلِمِينَ ۝۱۲ وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنْهُمْ يَقُولُونَ إِنَّمَا يُعَلِّمُهُ

خوش خبری مسلمانوں کے واسطے، اور ہم کو خوب معلوم ہے کہ وہ کہتے ہیں اس کو سکھاتا ہے،

بَشَرٌ مِّمَّنْ لِسَانُ الَّذِي يُلْحِدُونَ إِلَيْهِ أَعْجَبِيْهُمْ وَهُمْ لَشَانٌ

ایک آدمی، جس کی طرف تعریف کرتے ہیں اس کی زبان ہی عجیبی اور یہ قرآن زبان

عَرَبِيٍّ مُّبِينٌ ۝۱۰۴ إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ لَا يَهْدِيهِمُ

عربی ہے صاف ، وہ لوگ جن کو اللہ کی باتوں پر یقین نہیں ان کو اللہ راہ

اللَّهُ وَلَهُمَّ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝۱۰۵ إِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِينَ لَا

نہیں دیتا اور ان کے لئے عذاب دردناک ہو، جھوٹ تو وہ لوگ بناتے ہیں جن کو یقین

يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ جَ وَاولئك هم الكاذِبُونَ ۝۱۰۶

نہیں اللہ کی باتوں پر اور وہی لوگ جھوٹے ہیں

خلاصہ تفسیر

رَبِّهِ آيَاتِ | اس سے پہلی آیت میں تلاوت قرآن کے وقت اعوذ باللہ پڑھنے کی ہدایت تھی، جس میں اشارہ ہے کہ شیطان تلاوت کے وقت انسان کے دل میں دوسرے ڈالتا ہے، مذکور آیات میں اسی طرح کے دساوس شیطان کا جواب ہے۔

نبوت پر کفار کے شبہات

کا جواب صحیح تہرید | اور جب ہم کسی آیت کو بجائے دوسری آیت کے بدلتے ہیں (یعنی ایک

آیت کو لفظاً یا معنی منسوخ کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم بھیج دیتے ہیں) اور حالانکہ اللہ تعالیٰ

جو حکم پہلی مرتبہ یا دوسری مرتبہ بھیجتا ہے (اس کی مصلحت و حکمت کو) وہی خوب جانتا ہے

کہ جن کو حکم دیا گیا ہے ان کے حالات کے اعتبار سے ایک وقت میں مصلحت کچھ تھی، پھر حالت

بدل جانے سے مصلحت اور حکمت دوسری ہو گئی، تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ (معاذ اللہ) آپ (خدا پر)

افتراء کرنے والے ہیں کہ اپنے کلام کو اللہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں، ورنہ اللہ کا حکم ہوتا تو

اس کے بدلنے کی کیا ضرورت تھی، کیا اللہ تعالیٰ کو پہلے علم نہ تھا۔ اور یہ لوگ اس پر غور نہیں کرتے کہ

بعض اوقات سب حالات کا علم ہونے کے باوجود پہلی حالت پیش آنے پر پہلا حکم دیا جاتا ہے

اور دوسری حالت پیش آنے کا اگرچہ اس وقت بھی علم ہے مگر بتقاضائے مصلحت اس دوسری

حالت کا حکم اس وقت بیان نہیں کیا جاتا، بلکہ جب وہ حالت پیش آجاتی ہے اس وقت بیان

کیا جاتا ہے، جیسے طبیب ڈاکٹر ایک دوا تجویز کرتا ہے، اور وہ جانتا ہے کہ اس کے استعمال

سے حالت بدلے گی، اور پھر دوا دوسری دی جائے گی، مگر حیرت کو ابتداء میں سب تفصیل نہیں

بتلاتا، یہی حقیقت نسخ احکام کی ہے جو قرآن و سنت میں ہوتا ہے، جو حقیقت سے واقف

نہیں وہ باغواں شیطانی نسخ کا انکار کرنے لگتے ہیں، اسی لئے اس کے جواب میں حق تعالیٰ نے

فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مضری نہیں، بلکہ انہی میں اکثر لوگ جاہل ہیں (کہ احکام میں نسخ کو بلا کسی دلیل کے کلام الہی ہونے کے خلاف سمجھتے ہیں) آپ (ان کے جواب میں) فرمادیتے (کہ یہ کلام میرا بنایا ہوا نہیں بلکہ اس کو) روح القدس (یعنی جبرئیل علیہ السلام) آپ کے رب کی طرف سے حکمت کے موافق لاتے ہیں (اس لئے یہ اللہ کا کلام ہے اور اس میں احکام کی تبدیلی، مقتضائے حکمت و مصلحت ہو اور یہ کلام اس لئے بھیجا گیا ہے) تاکہ ایمان والوں کو ایمان پر ثابت قدم رکھے اور ان مسلمانوں کے لئے ہدایت اور خوش خبری (کا ذریعہ) ہو جائے (اس کے بعد کفار کے ایک اور لغو شبہ کا جواب ہے) اور ہم کو معلوم ہے کہ یہ لوگ (ایک دوسری غلط بات) یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کو تو آدمی سکھاتا ہے (اس سے مراد ایک عجمی روم کا بابرشندہ لوہار ہے جس کا نام بلعام یا مقیس تھا، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں جی لگا کر سنتا تو حضورؐ کبھی اس کے پاس جاتے تو اور وہ کچھ انجیل وغیرہ کو بھی جانتا تھا، اس پر کافروں نے یہ بات چلتی کی کہ یہی شخص حضورؐ کو قرآن کا کلام سکھاتا ہے، انذا فی الدر المنثور، اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب دیا کہ قرآن مجید تو مجموعہ افسانہ و معانی کا نام ہے تم لوگ اگر قرآن کریم کے معانی اور معارف کو نہیں پہچان سکتے تو کم از کم یہ زبان کی معیاری فصاحت و بلاغت سے تو ناواقف نہیں ہو تو اتنا تو تمہیں سمجھنا چاہئے کہ اگر بالحدیث قرآن کے معانی اس شخص نے سکھلا دیئے ہوں تو کلام کے الفاظ اور ان کی ایسی فصاحت و بلاغت جس کا مقابلہ کرنے سے پورا عرب عاجز ہو گیا یہ کہاں سے آگئی، کیونکہ جس شخص کی طرف اس کی نسبت کرتے ہیں اس کی زبان تو عجمی ہے اور یہ قرآن صاف عربی ہے۔

رکوعی عجمی بیچارہ ایسی عبارت کیسے بنا سکتا ہے، اور اگر کہا جائے کہ عبارت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنائی ہوگی تو اس کا واضح جواب اس مخدّی (چیلنج) سے پوری طرح ہو چکا ہے جو سورۃ بقرہ میں آچکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باذن خداوندی اپنی نبوت اور قرآن کی حقانیت کا معیار اسی کو قرار دیا تھا، کہ اگر تمہارے کہنے کے مطابق یہ انسان کا کلام ہو تو تم بھی انسان ہو اور پوری فصاحت و بلاغت کے مدعی ہو تو تم اس جیسا کلام زیادہ نہیں تو ایک آیت ہی کی برابر لکھ لاؤ، مگر سارا عرب باوجود اس کے آپ کے مقابلہ میں اپنا سب کچھ جان مال قربان کرنے کو تیار تھا، مگر اس چیلنج کو قبول کرنے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی، اس کے بعد منکرین نبوت اور قرآن پر ایسے اعتراضات کرنے والوں پر وعید و تہدید ہے کہ جو لوگ اللہ کی آیتوں پر ایمان نہیں لاتے ان کو اللہ تعالیٰ کبھی راہ پر ہلا نہیں دے گا اور ان کے لئے دردناک سزا ہوگی (اور یہ لوگ جو نعوذ باللہ آپ کو مفتری کہتے ہیں) جھوٹا فرما کر دالے تو یہی لوگ ہیں جو اللہ کی آیتوں پر ایمان نہیں رکھتے اور یہ لوگ ہیں پورے جھوٹے۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖۙ اِلَّا مَنۡ اُكْرِهَٓةً وَّ قَلْبُهٗ

جو کوئی منکر ہو اللہ سے یقین لانے کے پیچھے مگر وہ نہیں جس پر زبردستی کی گئی اور اس کا

مُطْمَئِنِّۢنٌۙ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مِّنۡ شَيْءٍۙ بِالْكَفْرِ صَدْرًا

دل برقرار ہے ایمان پر لیکن جو کوئی دل کھول منکر ہوا

فَعَلِيْهِمْ غَضَبٌۭ مِّنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ عَذَابٌۭ عَظِيْمٌۙ ۝۱۰۶ ذٰلِكَ

سوان پر غضب ہے اللہ کا اور ان کو بڑا عذاب ہے ۱۰۶

بِاَنَّهُمْ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلٰى الْاٰخِرَةِ ۗ وَاَنَّ اللّٰهَ

اس واسطے کہ انھوں نے عزیز رکھا دنیا کی زندگی کو آخرت سے اور اللہ

لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِيْنَ ۝۱۰۷ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى

رہتہ نہیں دیتا منکر لوگوں کو، یہ وہی ہیں کہ ہر کردی اللہ نے ان کے

قُلُوْبِهِمْ وَاَسْمَعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝۱۰۸

دل پر اور کانوں پر اور آنکھوں پر اور یہی ہیں بے ہوش

لَا جَرَءَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۱۰۹

خود ظاہر ہے کہ آخرت میں یہی لوگ خراب ہیں۔

خلاصہ تفسیر

جو شخص ایمان لانے کے بعد اللہ کے ساتھ کفر کرے اس میں کفر بالرسول اور انکار قیامت وغیرہ سب داخل ہیں، مگر جس شخص پر رکافروں کی طرف سے زبردستی کی جائے رک اگر تو کفر کا فلاں کلام یا فلاں قول نہیں کرے گا تو ہم تجھ کو قتل کر دیں گے مثلاً اور حالات سے اس کا اندازہ بھی ہو کہ وہ ایسا کر سکتے ہیں، بشرطیکہ اس کا قلب ایمان پر مطمئن ہو یعنی عقیدے میں کوئی فتور نہ آئے اور اس قول و فعل کو سخت گناہ اور برا سمجھتا ہو تو وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہے کہ اس کا ظاہری طور پر کلمہ کفر یا فعل کفر میں مبتلا ہو جانا ایک عذر کی بنا پر ہو، اس لئے جو وعید ارتداد کی آگے آرہی ہے وہ ایسے شخص کے لئے نہیں، لیکن ہاں جو جی کھول کر یعنی اس کفر کو صحیح اور مستحسن سمجھ کر کفر کرے تو ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوگا، اور

ان کو بڑی سزا ہوگی (اور) یہ (مغضب و عذاب) اس سبب سے ہوگا کہ انھوں نے دینی زندگی کو آخرت کے مقابلہ میں عزیز رکھا، اور اس سبب سے ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ایسے کافر لوگوں کو دوزخ دنیا کو ہمیشہ آخرت پر ترجیح دیں) ہدایت نہیں کیا کرتا (یہ دو سبب الگ الگ نہیں بلکہ مجموعہ سبب ہے) جمل اس کا یہ ہے کہ عزم فعل کے بعد عاده اللہ یہ ہے کہ خلق فعل ہوتا ہے جس پر صد و رفع مرتب ہوتا ہے، یہاں استخبروا سے ہم اور لایہدی سے خلق کی طرف اشارہ ہے، اور اس مجموعہ پر فعل قبیح کا صد مرتب ہے، یہ وہ لوگ ہیں کہ دنیا میں ان کے اصرار علی الکفر کی حالت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر اور آنکھوں پر پتھر لگا دی ہو اور یہ لوگ (انجام سے) بالکل غافل ہیں (اس لئے) لازمی بات ہے کہ آخرت میں یہ لوگ بالکل گھٹائے میں رہیں گے۔

معارف و مسائل

مسئلہ: اس آیت سے ثابت ہوا کہ جس شخص کو کلمہ کفر کہنے پر اس طرح مجبور کر دیا گیا کہ اگر یہ کلمہ نہ کہے تو اس کو قتل کر دیا جائے، اور یہ بھی بظن غالب معلوم ہے کہ دہکی دینے والے کو اس پر پوری قدرت حاصل ہے تو ایسے اکراہ کی حالت میں اگر وہ زبان سے کلمہ کفر کہہ دے، مگر اس کا دل ایمان پر جما ہوا ہو اور اس کلمہ کو باطل اور بُرا جانتا ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں، اور نہ اس کی بیوی اس پر حرام ہوگی (قطبی و مظہری)۔

یہ آیت اُن صحابہ کرام کے بارے میں نازل ہوئی جن کو مشرکین نے گرفتار کر لیا تھا، اور کہا تھا کہ یادہ کفر خستیا کر س ورنہ قتل کر دیئے جائیں گے۔

یہ گرفتار ہونے والے حضرات حضرت عمار اور ان کے والدین یا سہ اور سمیہ اور سہیب اور بلال اور خباب رضی اللہ عنہم تھے، جن میں سے حضرت یاسر اور ان کی زوجہ سمیہ نے کلمہ کفر بولنے سے قطعی انکار کیا، حضرت یاسر کو قتل کر دیا گیا، اور حضرت سمیہ کو دو اونٹوں کے درمیان باندھ کر ان کو دوڑایا گیا، جس سے اُن کے دو ٹکڑے الگ الگ ہو کر شہید ہوئیں، اور یہی دو بزرگ ہیں جن کو اسلام کی خاطر سب سے پہلے شہادت نصیب ہوئی، اسی طرح حضرت خباب نے کلمہ کفر بولنے سے قطعی انکار کر کے بڑے اطمینان کے ساتھ قتل کئے جانے کو قبول کیا، ان میں سے حضرت عمار نے جان کے خوف سے زبانی اقرار کفر کا کر لیا، مگر دل ان کا ایمان پر مطمئن اور جما ہوا تھا، جب یہ دشمنوں سے رہائی پا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو بڑے بیخ و غم کے ساتھ اس واقعہ کا اظہار کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا کہ جب تم یہ کلمہ بول رہے تھے تو تمہارے دل کا کیا حال تھا، انھوں نے عرض کیا کہ دل تو ایمان پر مطمئن اور جما ہوا تھا، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مطمئن

کیا کہ تم پر اس کا کوئی وبال نہیں، آپ کے اس فیصلہ کی تصدیق میں یہ آیت نازل ہوئی (قرطبی مظہری)۔
 اکراہ کی تعریف و تحدید | اکراہ کے لفظی معنی یہ ہیں کہ کسی شخص کو ایسے قول یا فعل پر مجبور کیا جائے جس کے
 کہنے یا کرنے پر وہ راضی نہیں، پھر اس کے دو درجے ہیں، ایک درجہ اکراہ کا یہ ہے کہ وہ دل سے تو اس پر
 آمادہ نہیں مگر ایسا بے اختیار و بے قابو بھی نہیں کہ انکار نہ کر سکے، یہ فقہاء کی اصطلاح میں اکراہ غیر مطلق
 کہلاتا ہے، ایسے اکراہ سے کوئی کلمہ کفر کہنا یا کسی حرام فعل کا ارتکاب کرنا جائز نہیں ہوتا، البتہ
 بعض جزئی احکام میں اس پر بھی کچھ آثار مرتب ہوتے ہیں جو کتب فقہ میں مفصل مذکور ہیں۔
 دوسرا درجہ اکراہ کا یہ ہے کہ وہ مصلوب الاختیار کر دیا جائے کہ اگر وہ اکراہ کرنے والوں کے
 کہنے پر عمل نہ کرے تو اس کو قتل کر دیا جائے گا یا اس کا کوئی عضو کاٹ دیا جائے گا، یہ فقہاء کی اصطلاح میں
 اکراہ مطلق کہلاتا ہے جس کے معنی ہیں ایسا اکراہ جو انسان کو مصلوب الاختیار اور مجبور محض کرنے کے
 ایسے اکراہ کی حالت میں کلمہ کفر کا زبان سے کہہ دینا بشرطیکہ قلب ایمان پر مطمئن ہو جائز ہے،
 اسی طرح دوسرے انسان کو قتل کرنے کے علاوہ اور کوئی حرام فعل کرنے پر مجبور کر دیا جائے تو
 اس میں بھی کوئی گناہ نہیں ہوگا۔

مگر دونوں قسم کے اکراہ میں شرط یہ ہے کہ اکراہ کرنے والا جس کام کی دھمکی دے رہا ہے
 وہ اس پر قادر بھی ہو اور جو شخص مستلاب ہے اس کو غالب گمان یہ ہو کہ اگر میں اس کی بات نہ
 مانوں گا تو جس چیز کی دھمکی دی رہا ہو وہ اس کو ضرور کر ڈالے گا (مظہری)۔
 مسئلہ: معاملات دو قسم کے ہیں، ایک وہ جن میں دل سے رضامند ہونا ضروری
 ہے، جیسے خرید و فروخت و ہبہ وغیرہ کہ ان میں دل سے رضامند ہونا معاملہ کے لئے شرط ہے
 بنصرہ قرآن اَلَا اَنْ تَكُوْنَتْ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا، یعنی کسی دوسرے شخص کا مال
 حلال نہیں ہو تا جب تک تجارت وغیرہ کا معاملہ طرفین کی رضامندی سے نہ ہو، اور حدیث
 میں ہے:

یعنی کسی سلمان کا مال اس وقت تک
 حلال نہیں جب تک وہ خوش دلی سے
 اس کے دینے پر راضی نہ ہو۔

لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اِلَّا
 بِطِبْيِ نَفْسٍ مِّنْهُ
 ۝۱۱۰

ایسے معاملات اگر اکراہ کے ساتھ کرائے جائیں تو شرعاً ان کا کوئی اعتبار نہیں، اکراہ
 کی حالت سے نکلنے کے بعد اس کو اختیار ہو گا کہ بحالت اکراہ جو بیع یا ہبہ وغیرہ کیا تھا اس کو اپنی
 رضا سے باقی رکھے یا فسخ کر دے۔

اور کچھ معاملات ایسے بھی ہیں جن میں صرف زبان سے الفاظ کہہ دینے پر مدار ہے، دل

کا قصد و ارادہ یا رضا و خوشی شرطِ معاملہ نہیں، مثلاً نکاح، طلاق، رجعت، عتاق وغیرہ، ایسے معاملہ کے متعلق حدیث میں ارشاد ہے، ثَلَاثُ جَدَّ هُنَّ جَدٌّ وَ هُنَّ لَهُنَّ جَدُّ النِّكَاحِ وَالطَّلَاقِ وَالرَّجْعَةِ، رواہ ابوداؤد والترمذی وحسنہ یعنی اگر دو شخص زبان سے نکاح کا ایجاب و قبول شرائط کے مطابق کر لیں یا کوئی شوہر اپنی بیوی کو زبان سے طلاق دیدے، یا طلاق کے بعد زبان سے رجعت کرے، خواہ وہ بطور منہی مذاق کے ہو دل میں ارادہ نکاح یا طلاق یا رجعت کا نہ ہو پھر بھی محض الفاظ کے کہنے سے نکاح منعقد ہو جائے گا، اور طلاق پڑ جائے گی، نیز رجعت صحیح ہو جائے گی (منظری)

امام اعظم ابو حنیفہ، شعبی، زہری، نخعی اور قتادہ رحمہم اللہ کے نزدیک طلاق ٹکرہ کا بھی یہی حکم ہے کہ حالتِ اکراہ میں اگرچہ وہ طلاق دینے پر دل سے آمادہ نہیں تھا مجبور ہو کر الفاظِ طلاق کہہ دیتے، اور وقوعِ طلاق کا تعلق صرف الفاظِ طلاق ادا کر دینے سے ہے، دل کا قصد و ارادہ شرط نہیں، جیسا کہ حدیث مذکور سے ثابت ہے، اس لئے یہ طلاق واقع ہو جائے گی۔

مگر امام شافعی اور حضرت علی اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کے نزدیک حالتِ اکراہ کی طلاق واقع نہ ہوگی، کیونکہ حدیث میں ہے:

رُفِعَ عَنْ أُمَّتِي الْخَطَأُ وَالنِّسْيَانُ وَ مَا اسْتُكْرِهُوَ أَعْلَيْهِ، رواہ الطبرانی عن ثوبانؓ	”یعنی میری امت سے خطا اور نسیان اور جس چیز پر ان کو مضطرب ہو کر دیا جائے سب اٹھا دیئے گئے“
--	--

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک یہ حدیث احکامِ آخرت کے متعلق ہے، کہ خطا یا نسیان سے یا اکراہ کی حالت میں جو کوئی قول و فعل شریعت کے خلاف کر لیا اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا، باقی رہے احکامِ دنیا اور وہ نتائج جو اس فعل پر مرتب ہو سکتے ہیں ان کا وقوع تو محسوس، شاہد ہے، اور دنیا میں اس وقوع پر جو آثار و احکام مرتب ہوتے ہیں وہ ہو کر رہیں گے، مثلاً کسی نے کسی کو خطا قتل کر دیا تو اس کو قتل کا گناہ اور آخرت کی سزا تو بے شک نہ ہوگی، مگر جس طرح قتل کا محسوس اثر مقتول کی جان چلا جانا واقع ہے اسی طرح اس کا یہ شرعی اثر بھی ثابت ہوگا کہ اس کی بیوی عدت کے بعد نکاح ثانی کر سکے گی، اس کا مال وراثت میں تقسیم ہو جائے گا، اسی طرح جب الفاظِ طلاق یا نکاح یا رجعت زبان سے ادا کر دیئے تو ان کا شرعی اثر بھی ثابت ہو جائے گا (منظری و ترمذی واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم)

ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ هَاجَرُوا مِنَّا بَعْدَ مَا فُتِنُوا أَنَّهُمْ جَاهِدُوا

پھر بات یہ ہے کہ تیرا رب ان لوگوں پر کہ انھوں نے وطن چھوڑا ہی بعد اس کے کہ مصیبت اٹھائی پھر جہاد کرتے

وَصَبَرُوا إِنَّ رَبَّكَ مِنَ الْبَعْدِ هَا تَعْفُوهُمْ رَحِيمٌ ۝۱۱۰ يَوْمَ تَأْتِي

رہی اور قائم رہی بیشک تیرا رب ان باتوں کے بعد بخشنے والا مہربان ہے، جس دن آئے گا

كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَفْسِهَا وَتُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ

ہر کسی جواب سوال کرتا اپنی طرف سے اور پورا ملے گا ہر کسی کو جو اس نے کمایا اور ان پر

لَا يُظْلَمُونَ ۝۱۱۱ وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ آمِنَةً

ظلم نہ ہوگا، اور بتلائی اللہ نے ایک مثال ایک بستی تھی، حسین

مُطْمَئِنَّةً يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ

امن سے چلی آتی تھی اس کو روزی فراغت کی ہر جگہ سے پھر ناشکری کی اللہ کے

اللَّهِ فَأَذَاقَهَا اللَّهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ۝۱۱۲

احسانوں کی پھر چکھایا اس کو اللہ نے مزہ کہ انکے تن کے کپڑے ہو گئے بھوک اور ڈر بدلہ اس کا جو وہ کرتے تھے۔

وَلَقَدْ جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوهُ فَأَخَذَهُمُ

اور ان کے پاس پہنچ چکا رسول انہی میں کا پھر اس کو جھٹلایا پھر آپکڑا ان کو

الْعَذَابُ وَهُمْ ظَالِمُونَ ۝۱۱۳

عذاب نے اور وہ گنہگار تھے۔

خلاصہ تفسیر

پہلی آیات میں کفر پر وعید کا ذکر تھا، خواہ کفر اصلی ہو یا ارتداد کا کفر، اس کے بعد کی مذکورہ تین آیتوں میں سے پہلی آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ ایمان ایسی دولت ہے کہ جو کافر یا مرتد سچا ایمان لے آئے اس کے پچھلے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

دوسری آیت میں قیامت کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ یہ جزاء و سزا سب قیامت کے بعد ہی ہونے والی ہے، تیسری آیت میں یہ بتلایا گیا کہ کفر و معاصی کی اصلی سزا تو قیامت کے بعد

ہی ملے گی، مگر بعض گناہوں کی سزا دنیا میں بھی کچھ مل جاتی ہے، تینوں آیتوں کی مختصر تفسیر یہ ہے:-
 پھر (اگر کفر کے بعد یہ لوگ ایمان لے آویں تو) بیشک آپ کا رب ایسے لوگوں کے لئے
 کہ جنہوں نے مبتلا بہ کفر ہونے کے بعد (ایمان لا کر) ہجرت کی پھر جہاد کیا، اور (ایمان پر قائم
 رہے تو آپ کا رب (ایسے لوگوں کے لئے) ان (اعمال) کے بعد بڑی مغفرت کرنے والا بڑی رحمت
 کرنے والا ہے (یعنی ایمان اور اعمال صالحہ کی برکت سے سب پچھلے گناہ معاف ہو جاویں گے
 اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ان کو جنت میں بڑے بڑے درجے ملیں گے، کفر سے پہلے کے
 گناہ تو صرف ایمان سے معاف ہو جاتے ہیں، جہاد وغیرہ اعمال صالحہ بشرط معافی نہیں، لیکن
 اعمال صالحہ درجاتِ جنت ملنے کے سبب ہیں، اس لئے اس کے ساتھ ذکر کر دیا گیا،
 اور یہ جزاء و سزا مذکور اس روز واقع ہوگی) جس روز ہر شخص اپنی اپنی طرف داری
 میں گفتگو کرے گا (اور دوسروں کو نہ پوچھے گا) اور ہر شخص کو اس کے کئے کا پورا بدلہ ملے گا (یعنی
 نیکی کے بدلے میں کمی نہ ہوگی، گو اللہ کی رحمت سے زیادتی ہو جانے کا امکان ہے، اور بدی کے بدلے
 میں زیادتی نہ ہوگی، ہاں یہ ممکن ہو کہ رحمت سے اس میں کچھ کمی ہو جائے، یہی مطلب ہے اس کا
 کہ، اُن پر ظلم نہ کیا جائے گا (اس کے بعد یہ بتلایا گیا ہے کہ اگرچہ کفر و معصیت کی پوری سزا
 حشر کے بعد ہوگی، مگر کبھی دنیا میں بھی اس کا وبال عذاب کی صورت میں آجاتا ہے) اور اللہ
 تعالیٰ ایک بستی والوں کی حالت عجیبہ بیان فرماتے ہیں کہ وہ (بڑے) امن و اطمینان میں رہتے
 تھے (اور) ان کے کھانے پینے پہننے کی چیزیں بڑی فراغت سے ہر چار طرف سے ان کے پاس
 پہنچا کرتی تھیں (ان لوگوں نے اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا نہ کیا بلکہ) انہوں نے خدا کی نعمتوں
 کی بے قدری کی (یعنی کفر و شرک اور معصیت میں مبتلا ہو گئے) اس پر اللہ تعالیٰ نے اُن کو ان
 کی حرکتوں کے سبب ایک محیط قحط اور خوف کا مزہ چکھایا (کہ مال و دولت کی فراوانی سلب
 ہو کر قحط اور بھوک میں مبتلا ہو گئے، اور دشمنوں کا خوف مسلط کر کے ان کی بستیوں کا
 امن و اطمینان بھی سلب کر لیا) اور (اس سزا میں حق تعالیٰ کی طرف سے کچھ جلدی نہیں کنگی
 بلکہ اول اس کی تنبیہ و اصلاح کے واسطے) ان کے پاس اپنی میں کا ایک رسول بھی (منجانب
 اللہ) آیا (جس کے صدق و دیانت کا حال خود اپنی قوم میں ہونے کی وجہ سے ان کو پوری طرح
 معلوم تھا) سو اس رسول (کو بھی) انہوں نے جھوٹا بتایا تب ان کو عذاب نے آپکڑا جب کہ وہ بالکل ہی
 ظلم پر مکر باندھنے لگے :-

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

معارف ومسائل

آخری آیت میں بھوک اور خوف کا مزد چکھانے کے لئے لفظ لباس استعمال فرمایا کہ لباس بھوک اور خوف کا ان کو چکھایا گیا، حالانکہ لباس چکھنے کی چیز نہیں، مگر یہاں لباس کا لفظ محیط اور ہمہ گیر ہونے کے لئے تشبیہا استعمال ہوا ہے، کہ یہ بھوک اور خوف اُن سب کے سب پر ایسا چھا گیا کہ جس طرح لباس بدن کے ساتھ لازم ملزوم ہو جاتا ہے، یہ بھوک اور خوف بھی ان پر اسی طرح مسلط کر دیتے گئے۔

یہ مثال جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے بعض ائمہ تفسیر کے نزدیک تو عام مثال ہے، کسی خاص بستی سے اس کا تعلق نہیں، اور اکثر حضرات نے اس کو مکہ مکرمہ کا واقعہ تفسیر دیا کہ وہ سات سال تک شدید قحط میں مبتلا رہے، کہ مردار جانور اور گتے اور غلامتیں کھانے پر مجبور ہو گئے، اور مسلمانوں کا خوف اُن پر مسلط ہو گیا، پھر مکہ کے سرداروں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ کفر و نافرمانی کے قصور دار تو مرد ہیں، عورتیں، بچے تو بے قصور ہیں، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے مدینہ طیبہ سے کھانے وغیرہ کا سامان بھجوا دیا۔ (مظہری)

اور ابو سفیان نے بحالت کفر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ تو صلہ رحمی اور عفو و درگزر کی تعلیم دیتے ہیں، یہ آپ کی قوم ہلاک ہوئی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ یہ قحط ہم سے دور ہو جائے، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے دعا فرمائی اور قحط ختم ہوا (تطبی)

فَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ حَلَالًا طَيِّبًا وَاشْكُرُوا لِعِمَّتِ اللَّهِ

سو کھاؤ جو روزی دی تم کو اللہ نے حلال اور پاک اور شکر کرو اللہ کے احسان کا

إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ۖ إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ

اگر تم اسی کو پوجتے ہو، اللہ نے تو یہی حرام کیا ہے تم پر مردار اور

الْدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أَهْلَ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ فَمَنْ اضْطَرَّ

لہو اور سور کا گوشت اور جس پر نام پکارا اللہ کے سوا کسی اور کا، پھر جو کوئی ناچار ہو جائے

غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ وَلَا تَقُولُوا لِمَا

نہ زور کرتا ہو نہ زیادتی تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے، اور مت کہو اپنی زبانوں کے

تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَذَا حَلَالٌ وَهَذَا حَرَامٌ لِتَفْتَرُوا

جھوٹ بنالینے سے کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے کہ اللہ پر

عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ

بہتان باندھو، بیشک جو بہتان باندھتے ہیں اللہ پر ان کا

لَا يُفْلِحُونَ ﴿۱۱۶﴾ مَتَاعٌ قَلِيلٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۱۷﴾ وَعَلَى

بھلا نہ ہوگا، کھوڑا سا فائدہ اٹھالیں، اور ان کے واسطے عذاب دردناک ہے، اور جو

الَّذِينَ هَادُوا وَآخَرُ مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَمَا

لوگ یہودی ہیں ان پر حرام کیا تھا جو تجھ کو پہلے سنا چکے، اور ہم نے

ظَلَمْنَاهُمْ وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿۱۱۸﴾ ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ

ان پر ظلم نہیں کیا پر وہ اپنے اوپر آپ ظلم کرتے تھے، پھر بات یہ ہے کہ تیرا رب

لِلَّذِينَ عَمِلُوا السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ وَ

ان لوگوں پر جنہوں نے بُرائی کی نادانی سے پھر توبہ کی اس کے پیچھے اور

أَصْلَحُوا إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۱۱۹﴾

سودارا اپنی آپ کو، سو تیرا رب ان باتوں کے پیچھے بخشنے والا مہربان ہے۔

خلاصہ تفسیر

پہلی آیت میں اللہ جل شانہ کی نعمتوں پر کفار کی ناشکری اور اس کے عذاب کا ذکر تھا، مذکورہ آیات میں اول تو مسلمانوں کو اس کی ہدایت کی گئی کہ وہ ناشکری نہ کریں، اللہ تعالیٰ نے جو حلال نعمتیں ان کو دی ہیں ان کو شکر کے ساتھ استعمال کریں، اس کے بعد یہ ارشاد فرمایا کہ کفار و مشرکین نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کی ایک خاص صورت یہ بھی اختیار کر رکھی تھی کہ بہت سی چیزیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اُن کے لئے حلال کیا تھا، اپنی طرف سے ان کو حرام کہنے لگے، اور بہت سی چیزیں جن کو اللہ نے حرام کہا تھا ان کو حلال کہنے لگے، مسلمانوں کو اس پر تنبیہ فرمائی کہ وہ ایسا نہ کریں، کسی چیز کا حلال یا حرام کرنا صرف اس ذات کا حق ہے جس نے ان کو پیدا کیا ہے اپنی طرف سے ایسا کرنا خدائی اختیارات میں دخل دینا اور اللہ تعالیٰ پر افسوس کرنا

آخر میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جن لوگوں نے جہالت سے اس طرح کے جرائم کئے ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں، اگر وہ توبہ کر لیں اور صحیح ایمان لے آئیں تو اللہ تعالیٰ سب گناہ بخش دیں گے، مختصر تفسیر آیات کی یہ ہے:-

سو جو چیزیں تم کو اللہ نے حلال اور پاک دی ہیں ان کو (حرام نہ سمجھو کہ یہ مشرکین کی جاہلانہ رسم ہو بلکہ) ان کو کھاؤ اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر کرو اگر تم (اپنے دعوے کے مطابق) اسی کی عبادت کرتے ہو، تم پر تو (منجملہ اُن چیزوں کے جن کو تم حرام کہتے ہو، اللہ تعالیٰ نے) صرف مُردار کو حرام کیا ہے، اور خون کو اور خنزیر کے گوشت (وغیرہ) کو اور جس چیز کو غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو، پھر جو شخص کہ (مارے فاقہ کے) بالکل بے قرار ہو جائے، بشرطیکہ طالب لذت نہ ہو، اور نہ حد (ضرورت) سے تجاوز کرنے والا ہو تو اللہ تعالیٰ (اس کے لئے) اگر وہ ان چیزوں کو کھالے، بخش دینے والا ہے بانی کرنے والا ہے، اور جن چیزوں کے متعلق محض تمہارا جھوٹا زبانی دعوٰی ہے، (اور اس پر کوئی دلیل صحیح قائم نہیں) اُن کے متعلق یوں نہ کہہ دیا کرو کہ فلاں چیز حلال اور فلاں حرام ہے (جیسا کہ یارۃ ہشتم کے راجع کے قریب آیات وَجَعَلُوا لِلّٰهِ میں ان کے ایسے جھوٹے دعوے آچکے ہیں) جس کا حاصل یہ ہو گا کہ اللہ پر جھوٹی بہمت لگاؤ گے (کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تو ایسا نہیں کہا، بلکہ اس کے خلاف فرمایا ہے) بلاشبہ جو لوگ اللہ پر جھوٹ لگاتے ہیں وہ فلاح نہ پائیں گے، (خواہ دنیا و آخرت دونوں میں یا صرف آخرت میں) یہ (دنیا میں) چند روزہ عیش ہے (اور آگے مرنے کے بعد) اُن کے لئے دردناک سزا ہے اور (یہ مشرکین ملتِ ابراہیمی کے متبع ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں حالانکہ ان کی شریعت میں تو یہ چیزیں حرام نہ تھیں، جن کو انھوں نے حرام قرار دیدیا ہے، البتہ بہت زمانے کے بعد اُن اشیاء میں سے) صرف یہودیوں پر ہم نے وہ چیزیں حرام کر دی تھیں جن کا بیان ہم اس کے قبل سورۃ النعام میں، آپ سے کر چکے ہیں (اور ان کی تحریم میں بھی) ہم نے اُن پر (صورۃ بھو) کوئی زیادتی نہیں کی لیکن وہ خود ہی اپنے اوپر (انبیاء کی مخالفت کر کے) زیادتی کیا کرتے تھے (تو معلوم ہوا کہ اشیاء طیبہ کو بالقصد تو کبھی حرام نہیں کیا گیا اور شریعتِ ابراہیمی میں کسی وقتی ضرورت کی وجہ سے بھی نہیں ہوتی پھر یہ تم نے کہاں سے گھڑ لیا)۔

پھر آپ کا رب ایسے لوگوں کے لئے جنھوں نے جہالت سے بُرا کام (خواہ کچھ بھی ہو) کر لیا پھر اس کے بعد توبہ کر لی اور (آئندہ کے لئے) اپنے اعمال درست کر لئے تو آپ کا رب اس کے بعد بڑی مغفرت کرنے والا بڑی رحمت کرنے والا ہے۔

معارف مسائل

خرات مذکورہ میں حصر | اس آیت میں لفظ ائمتا سے معلوم ہوتا ہے کہ حرام چیزیں صرف یہی چار
اضافی ہر حقیقی نہیں | ہیں جو آیت میں مذکور ہیں اور اس سے زیادہ صریح طور پر آیت قُلْ لَا
أَجِدُ فِيمَا أُوحِيَ إِلَيَّ مَكْرَمًا إِلَّا يَهُودٌ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان چیزوں کے سوا کوئی چیز حرام
نہیں، حالانکہ قرآن و سنت کی تصریحات کے مطابق باجماع امت اور بھی بہت سی چیزیں
حرام ہیں، اس اشکال کا جواب خود انہی آیات کے سیاق و سباق پر غور کرنے سے معلوم ہو جاتا
ہے کہ اس جگہ عام حرام و حلال کا بیان کرنا مقصود نہیں، بلکہ مشرکین جاہلیت نے جو بہت سی
چیزوں کو اپنی طرف سے حرام کر لیا تھا، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی حرمت کا حکم نہیں دیا تھا
ان کا بیان کرنا مقصود ہی، کہ تمہاری حرام کردہ اشیاء میں سے اللہ کے نزدیک صرف یہی چیزیں
حرام ہیں، اس آیت کی مکمل تفسیر اور ان چاروں محرمات کے احکام کا مفصل بیان سورہ
بقرہ کی آیت نمبر ۱۷۳ میں معارف القرآن جلد اول صفحہ ۳۵۸ سے صفحہ ۳۷۰ تک آچکا ہے
وہاں دیکھ لیا جائے۔

توبہ سے گناہ کی معافی کا ہے | آیت ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ عَمِلُوا السُّوءَ بِجَهَالَةٍ میں لفظ اہل
خواہ بے سمجھی سے کری یا جان بوجھ کر | نہیں بلکہ جهالت استعمال فرمایا ہے، جهل تو علم کے بالمقابل آتا ہے،
بے علی بے سمجھی کے معنی میں ہے، اور جهالت کا لفظ جاہلانہ حرکت کے لئے بولا جاتا ہے، اگرچہ
جان بوجھ کر کرے، اس سے معلوم ہو گیا کہ توبہ سے گناہ کی معافی بے سمجھی یا بے اختیاری کے ساتھ
مقتد نہیں۔

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ

اصل میں ابراہیم تھا راہ ڈالنے والا فرمانبردار اللہ کا سب ایک طرف ہو کر، اور نہ تھا شرک

الْمُشْرِكِينَ ۝۱۲۰ شَاكِرًا لِأَنْعُمِهِ اجْتَبَاهُ وَهَدَاهُ إِلَى صِرَاطٍ

کرنے والوں میں، حق ماننے والا اس کے احسانوں کا، اس کو اللہ نے چن لیا اور چلایا سیدھی

مُسْتَقِيمٍ ۝۱۲۱ وَاتَّيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ

راہ پر، اور دی ہم نے دنیا میں اس کو خوبی اور وہ آخرت میں

لَمِنَ الصَّالِحِينَ ﴿۱۲۲﴾ ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنْ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا

اچھے لوگوں میں ہے ، پھر حکم بھیجا تجھ کو ہم نے کہ چل دین ابراہیم پر جو ایک طرہ کا تھا

وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۱۲۳﴾ إِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِينَ

اور نہ تھا وہ شرک کرنے والوں میں ، ہفتہ کا دن جو مقرر کیا سوانہی پر جو اس

اِخْتَلَفُوا فِيهِ وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ بَيْنَهُم رِيَوْمَ الْقِيَمَةِ فِيمَا كَانُوا

میں اختلاف کرتے تھے ، اور تیرا رب حکم کرے گا ان میں قیامت کے دن جس بات میں

فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿۱۲۴﴾

اختلاف کرتے تھے ۔

خلاصہ تفسیر

رابط آیات | پہلی آیات میں اصول شرک و کفر یعنی انکار توحید و انکار رسالت پر رد اور کفر و شرک کے بعض فروع ، یعنی تحلیل حرام اور تحریم حلال پر رد و ابطال کی تفصیل تھی ، اور مشرکین مکہ مکرمہ جو قرآن کریم کے پہلے اور بلا واسطہ مخاطب تھے ، اپنے کفر و بت پرستی کے باوجود دعویٰ یہ کرتے تھے کہ ہم ملت ابراہیمی کے پابند ہیں ، اور ہم جو کچھ کرتے ہیں یہ سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیمات ہیں ، اس لئے مذکورہ چار آیتوں میں ان کے اس دعوے کی تردید اور انہی کے مسلمات سے ان کے جاہلانہ خیالات کا ابطال اس طرح کیا گیا کہ مذکورہ پانچ آیتوں میں سے پہلی آیت میں حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تمام اقوام عالم کا مسلم مقتدا ہونا بیان فرمایا ، جو نبوت و رسالت کا اعلیٰ مقام ہے ، اس سے ان کا عظیم الشان نبی و رسول ہونا ثابت ہوا ، اس کے ساتھ ہی مآکان من المشرکین سے ان کا کامل توحید پر ہونا بیان فرمایا ۔

اور دوسری آیت میں ان کا شکر گزار اور صراطِ مستقیم پر ہونا بیان فرمایا کہ ان کو تنبیہ کی کہ تم اللہ تعالیٰ کی ناشکری کرتے ہوئے اپنے کو ان کا متبع کس زبان سے کہتے ہو ؟

تیسری آیت میں ان کا دنیا و آخرت میں کامیاب و بامراد ہونا اور چوتھی آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کے اثبات کے ساتھ آپ کا صحیح ملت ابراہیم کا پابند ہونا بیان فرمایا کہ یہ ہدایت کی گئی کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور آپ کی اطاعت کے بغیر یہ دعویٰ صحیح نہیں ہو سکتا ۔

پانچویں آیت اِنَّمَا جَعَلَ الْمُشْكَبَتِ میں اشارۃً یہ بیان فرمایا کہ ملتِ ابراہیمی میں اشیاء طیبہ حرام نہیں تھیں جن کو تم نے خود اپنے اوپر حرام کر لیا ہے، مختصر تفسیر آیات مذکورہ کی یہ ہے :-

بیشک ابراہیم (علیہ السلام جن کو تم بھی مانتے ہو) بڑے مقتدار (یعنی نبی اولوالعزم اور اُمتِ عظیمہ کے متبوع و مقتدا) اللہ تعالیٰ کے پاس سے فرمانبردار تھے (ان کا کوئی عقیدہ یا عمل اپنی خواہش نفسانی سے نہ تھا، پھر تم اس کے خلاف محض اپنے نفس کی پیروی سے اللہ کے حرام کو حلال اور حلال کو حرام کیوں ٹھہراتے ہو، اور وہ) بالکل ایک (خدا) کی طرف ہو رہے تھے، (اور مطلب ایک طرف ہونے کا یہ ہے کہ) وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے (تو پھر تم شرک کیسے کرتے ہو اور وہ) اللہ کی نعمتوں کے (بڑے) شکر گزار تھے (پھر تم شرک و کفر میں مبتلا ہو کر ناشکری کیوں کرتے ہو، غرض ابراہیم علیہ السلام کی یہ شان اور طریقہ تھا اور وہ ایسے مقبول تھے کہ) اللہ تعالیٰ نے ان کو منتخب کر لیا تھا اور ان کو سیدھے راہ پر ڈال دیا تھا، اور ہنوز ان کو دنیا میں بھی خوبیاں (مثل نبوت و رسالت میں منتخب ہونا اور ہدایت پر ہونا وغیرہ) دی تھیں اور وہ آخرت میں بھی راعی درجہ کے) اچھے لوگوں میں ہوں گے (اس لئے تم سب کو انہی کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے، اور وہ طریقہ اب منحصر ہے طریقہ مندرجہ میں، جس کا بیان یہ ہے کہ) پھر ہم نے آپ کے پاس وحی بھیجی کہ آپ ابراہیم کے طریقہ پر جو کہ بالکل ایک (خدا) کی طرف ہو رہے تھے چلئے (اور چونکہ اس زمانہ کے وہ لوگ جو ملتِ ابراہیمی کے اتباع کے مدعی تھے کچھ نہ کچھ شرک میں مبتلا تھے، اس لئے مکرر فرمایا کہ) وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے (تاکہ بت پرستوں کے ساتھ یہود و نصاریٰ کے موجودہ طریقہ پر بھی رد ہو جائے جو شرک سے خالی نہیں، اور چونکہ یہ لوگ تحریم طہیات کی جاہلانہ و مشرکانہ رسوم میں مبتلا تھے، اس لئے فرمایا کہ) بس ہفتہ کی تعظیم (یعنی ہفتہ کے روز پھل کے ٹکڑاؤں کی قربان) جو تحریم طہیات کی ایک فرد ہے وہ تو صرف انہی لوگوں پر لازم کی گئی تھی جنہوں نے اس میں (عملاً) خلاف کیا تھا (کہ کسی نے مانا اور عمل کیا، کسی نے اس کے خلاف کیا، مراد اس سے یہودی ہیں، کہ تحریم طہیات کی یہ صورت مثل دوسری صورتوں کے صرف یہود کے ساتھ مخصوص تھی، ملتِ ابراہیمی میں یہ چیزیں حرام نہیں تھیں، آگے احکامِ اہلیم میں اختلاف کرنے کے متعلق فرماتے ہیں کہ) بیشک آپ کا رب قیامت کے دن ان میں باہم (عملاً) فیصلہ کر دے گا جس بات میں یہ (دنیا میں) اختلاف کیا کرتے تھے۔

معارف و مسائل

لفظ اُمت چند معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے، مشہور معنی جماعت اور قوم کے ہیں،

حضرت ابن عباسؓ سے اس جگہ بھی معنی منقول ہیں، اور ارادہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام تنہا ایک فرد ایک امت اور قوم کے کمالات و فضائل کے جامع ہیں، اور ایک معنی لفظ امت کے مقتدرائے قوم اور جامع کمالات کے بھی آتے ہیں، بعض مفسرین نے اس جگہ بھی معنی لئے ہیں اور قانت کے معنی تابع فرمان کے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام ان دونوں وصفوں میں خاص امتیاز رکھتے ہیں، مقتدا ہونے کا تو یہ عالم ہے کہ پوری دنیا کے تمام مشہور مذاہب کے لوگ سب آپ پر اعتقاد رکھتے ہیں، اور آپ کی ملت کے اتباع کو عورت و فخر جانتے ہیں، یہود، نصاریٰ، مسلمان تو ان کی تعظیم و تکریم کرتے ہی ہیں، اکثر کلمین عرب بت پرستی کے باوجود اس بت شکن کے معتقد اور ان کی ملت پر چلنے کو اپنا فخر جانتے ہیں اور قانت و مطیع ہونے کا خاص امتیاز ان امتحانات سے واضح ہو جاتا ہے جن سے اللہ کے یہ خلیل گزرے ہیں، آتش فرود، اہل و عیال کو لقمہ و دق جنگل میں چھوڑ کر چلے جانے کا حکم، پھر آرزوں سے حاصل ہونے والے بیٹے کی تیرابی پر آمادگی یہ سب وہ امتیازات ہیں جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو ان القاب سے معزز فرمایا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق تعالیٰ نے جو شریعت و احکام حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عطا کئے ملت ابراہیمی کا اتباع فرمائے تھے، خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت بھی بعض خاص احکام کے علاوہ اس کے مطابق رکھی گئی، اور اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء و رسل سے افضل ہیں، مگر یہاں افضل کو مفضول کے اتباع کا حکم دینے میں دو حکمتیں ہیں، اول تو یہ کہ وہ شریعت پہلے دنیا میں آچکی ہے، اور علوم و معارف ہو چکی ہے، آخری شریعت بھی چونکہ اس کے مطابق ہونے والی تھی، اس لئے اس کو اتباع کے لفظ سے تعبیر کیا گیا کہ دوسرے بقول علامہ زبیدی یہ حکم اتباع بھی جملہ اکرام و اعزاز خلیل اللہ کے ایک خاص اعزاز ہے، اور اس کی خصوصیت کی طرف لفظ شریعت سے اشارہ کر دیا گیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے تمام فضائل و کمالات ایک طرف اور ان سب پر قائم یہ کمال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی سب سے افضل رسول و حبیب کو ان کی ملت کے اتباع کا حکم فرمایا۔

ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ

بملا اپنے رب کی راہ پر اپنی باتیں سمجھا کر اور نصیحت سنا کر بخوبی طرح اور الزام

بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ

دے ان کو جس طرح بہتر ہو تیرا رب ہی بہتر جانتا ہے ان کو جو بھول گیا اس کی راہ سے

وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿۱۲۵﴾ وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ

اور وہی بہتہ جانتا ہو ان کو جو راہ پر ہیں ، اور اگر بدلہ لو تو بدلہ لو اسی قدر جس قدر کہ تم کو تکلیف

پہنچائی جائے ، اور اگر صبر کرو تو یہ بہتر ہے صبر کرنے والوں کو ، اور تو صبر کرو اور تجھ سے صبر ہو سکے

بہنچائی جائے ، اور اگر صبر کرو تو یہ بہتر ہے صبر کرنے والوں کو ، اور تو صبر کرو اور تجھ سے صبر ہو سکے

إِلَّا بِاللَّهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ ﴿۱۲۶﴾

اللہ ہی کی مدد سے اور نہ اُن پر غم کھا اور تنگ مت ہو ان کے فریب سے ،

إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَالَّذِينَ هُمْ وَحُشُونُ ﴿۱۲۷﴾

اللہ ساتھ ہو اُن کے جو پرہیزگار ہیں اور جو نیکی کرتے ہیں ۔

۱۶
ع
۲۲

خلاصہ تفسیر

رابط آیات سابقہ آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کے اثبات سے مقصود یہ تھا کہ امت آپ کے احکام کی تعمیل کر کے رسالت کے حقوق ادا کریں ، مذکورہ آیات میں خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ادا سے رسالت کے حقوق اور آداب کی تعلیم ہے جس کے عزم میں تمام مومنین شریک ہیں ، مختصر تفسیر یہ ہے :-

آپ اپنے رب کی راہ (یعنی دین اسلام) کی طرف (لوگوں کو) حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ بلائیے ، حکمت سے وہ طریقہ دعوت مراد ہے جس میں مخاطب کے احوال کی رعایت سے ایسی تدبیر اختیار کی گئی ہو جو مخاطب کے دل پر اثر انداز ہو سکے ، اور نصیحت سے مراد یہ ہے کہ خیر خواہی بھڑکی کے جذبہ سے بات کہی جائے ، اور اچھی نصیحت سے مراد یہ ہے کہ عنوان بھی نرم ہو ، دل خراش تو ہین آمیز نہ ہو ، اور اُن کے ساتھ اچھے طریقہ سے بحث کیجئے (یعنی اگر بحث مباحثہ کی نوبت آجائے تو وہ بھی شدت اور خشونت سے اور مخاطب پر الزام تراشی اور بے انصافی سے خالی ہونا چاہئے ، بس اتنا کام آپ کا ہے ، پھر اس تحقیق میں نہ پڑئیے کہ کس نے مانا کس نے نہیں مانا ، یہ کام خدا تعالیٰ کا ہے پس) آپ کا رب خوب جانتا ہے اس شخص کو بھی جو اس کے راستے سے گم ہو گیا اور وہی راہ پر چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے اور اگر کبھی مخاطب علمی بحث و مباحثہ کی حد سے آگے بڑھ کر غلی جہال اور ہاتھ یا زبان سے ایذا پہنچانے لگیں تو اس میں آپ کو اور آپ کے متبعین کو برا لینا بھی جائز ہے اور صبر کرنا بھی پس اگر (پہلی صورت اختیار کر دیجئے)

بدل لینے لگو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنا تمہارے ساتھ برتاؤ کیا گیا ہے (اس سے زیادتی نہ کرو) اور اگر (دوسری صورت یعنی ایذاؤں پر) صبر کرو تو وہ (صبر کرنا) صبر کرنے والوں کے حق میں بہت ہی اچھی بات ہے کہ مخالف پر بھی اچھا اثر پڑتا ہے اور دیکھنے والوں پر بھی اور آخرت میں موجب اجر عظیم ہے) اور (صبر کرنا اگرچہ سبھی کے لئے بہتر ہے، مگر آپ کی عظمتِ شان کے لحاظ سے آپ کو خصوصیت کے ساتھ حکم ہے کہ آپ انتقام کی صورت اختیار نہ کریں بلکہ) آپ صبر کیجئے اور آپ کا صبر کرنا خدا ہی کی توفیقِ خاص سے ہے (اس لئے آپ اطمینان رکھیں کہ صبر میں آپکو دشواری نہ ہوگی) اور ان لوگوں (یعنی ان کے ایمان نہ لانے پر یا مسلمانوں کو ستانے) پر غم نہ کیجئے اور جو کچھ یہ تدبیریں کیا کرتے ہیں اس سے تشدد نہ ہو جتنے ان کی مخالفت تدبیروں سے آپ کا کوئی ضرر نہ ہوگا، کیونکہ آپ کو احسان اور تقویٰ کی صفات حاصل ہیں اور اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے (یعنی ان کا مددگار ہوتا ہے) جو یہ ہیزگار ہوتے ہیں اور نیک کردار ہوتے ہیں ۛ

معارف و مسائل

دعوت و تبلیغ کے اصول | اس آیت میں دعوت و تبلیغ کا مکمل نصاب، اس کے اصول اور آداب کی پوری تفصیل چند کلمات میں سمیٹی ہوئی ہے، تفسیر قرطبی میں ہے کہ حضرت ہرم ابن حیانؓ کی موت کا وقت آیا تو عزیزوں نے درخواست کی کہ ہمیں کچھ وصیت فرمائیے، تو فرمایا کہ وصیت تو لوگ اموال کی کیا کرتے ہیں وہ میرے پاس ہے نہیں، لیکن میں تم کو اللہ کی آیات خصوصاً سورۃ نحل کی آخری آیتوں کی وصیت کرتا ہوں، کہ ان پر ضبطِ دل سے قائم رہو، وہ آیات یہی ہیں جو اوپر مذکور ہوئیں۔

دعوت کے اختطیٰ حنی بلانے کے ہیں، انبیاء علیہم السلام کا پہلا فرض منصبی لوگوں کو اللہ کی طرف بلانا ہے، پھر تمام تعلیماتِ نبوت و رسالت اسی دعوت کی تشریحات ہیں، مسترآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص صفت داعی الی اللہ ہونا ہے، وَدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاَدْبِهِ وَرِسَالَةٍ اَجَامُنِيرًا (احزاب ۴۶) يَا قَوْمَنَا اَحْبِبُّوْا اِلٰهِي (احقاف ۳۱) اُمت پر بھی آپ کے نقشِ قدم پر دعوت الی اللہ کو فرض کیا گیا ہے، سورۃ آل عمران میں ارشاد ہے:

تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونا چاہئے جو لوگوں کو خیر کی طرف دعوت دین (یعنی) نیک کاموں کا حکم کریں اور بُرے کاموں سے منع کریں

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ اُمَّةٌ يَدْعُوْنَ
اِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوفِ
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران ۱۰۴)

اور ایک آیت میں ارشاد ہے :-

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا
إِلَى اللَّهِ

”گفتار کے اعتبار سے اس شخص سے اچھا
کون ہو سکتا ہے جس نے لوگوں کو اللہ کی طرف بلایا“

تعبیر میں کبھی اس لفظ کو دعوت الی اللہ کا عنوان دیا جاتا ہے، اور کبھی دعوت الی الخیر کا اور کبھی دعوت الی السبیل اللہ کا، حاصل سب کا ایک ہی، کیونکہ اللہ کی طرف بلانے سے اس کے دین اور معاملہ مستقیم ہی کی طرف بلانا مقصود ہے۔

إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ، اس میں اللہ جل شانہ کی خاص صفت رب، اور پھر اس کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اضافت میں اشارہ ہے کہ دعوت کا کام صفت ربوبیت اور تربیت سے تعلق رکھتا ہے، جس طرح حق تعالیٰ جل شانہ نے آپ کی تربیت فرمائی، آپ کو بھی تربیت کے انداز سے دعوت دینا چاہئے، جس میں مخاطب کے حالات کی رعایت کر کے وہ طرز اختیار کیا جائے کہ مخاطب پر بار نہ ہو، اور اس کی تاثیر زیادہ سے زیادہ ہو، خود لفظ دعوت بھی اس مفہوم کو ادا کرتا ہے کہ پیغمبر کا کام صرف اللہ کے احکام پہنچا دینا اور سنا دینا نہیں بلکہ لوگوں کو ان کی تعمیل کی طرف دعوت دینا ہے، اور ظاہر ہے کہ کسی کو دعوت دینے والا اس کے ساتھ ایسا خطاب نہیں کیا کرتا، جس سے مخاطب کو وحشت و نفرت ہو یا جس میں اس کے ساتھ استہزاء و تمسخر کیا گیا ہو۔

بِأَنحُكْمَةٍ، لفظ حکمت قرآن کریم میں بہت سے معانی کے لئے استعمال ہوا ہے، اس جگہ بعض ائمہ تفسیر نے حکمت سے ”اد قرآن کریم بعض نے قرآن و سنت بعض نے حجت قطعیہ قرار دیا ہے، اور روح المعانی نے بحوالہ بحر محیط حکمت کی تفسیر یہ کی ہے:

انہا الکلام الصواب الواقع
من النفس اجمل موقع (روح)

”یعنی حکمت اس درست کلام کا نام ہے
جو انسان کے دل میں اتر جائے“

اس تفسیر میں تمام اقوال جمع ہو جاتے ہیں، اور صاحب روح البیان نے بھی تفسیر یہی مطالب ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ ”حکمت سے مراد وہ بصیرت ہے جس کے ذریعہ انسان مقتضیات احوال کو معلوم کر کے اس کے مناسب کلام کرے، وقت اور موقع ایسا تلاش کرے کہ مخاطب پر بار نہ ہو، نرمی کی جگہ نرمی اور سختی کی جگہ سختی اختیار کرے، اور جہاں یہ سمجھے کہ صراحت کہنے میں مخاطب کو شرمندگی ہوگی، وہاں اشارات سے کلام کرے، یا کوئی ایسا عنوان اختیار کرے کہ مخاطب کو نہ شرمندگی ہو اور نہ اس کے دل میں اپنے خیال پر جھنے کا تعصب پیدا ہو۔“

الْمَوْعِظَةُ، موعظہ اور وعظہ کے لغوی معنی یہ ہیں کہ کسی خیر خواہی کی بات کو ایسی طرح کہا جائے کہ اس سے مخاطب کا دل قبولیت کے لئے نرم ہو جائے، مثلاً اس کے ساتھ قبول کرنے کے ثواب و نواہد اور نہ کرنے کے عذاب و مناسد ذکر کئے جائیں (قاموس و مفردات راغب) الْحَسَنَةُ کے معنی یہ ہیں کہ بیان اور عنوان بھی ایسا ہو جس سے مخاطب کا قلب مطمئن ہو، اس کے مشکوک و شبہات دور ہوں، اور مخاطب یہ محسوس کرے کہ آپ کی اس میں کوئی غرض نہیں صرف اس کی خیر خواہی کے لئے کہہ رہے ہیں۔

الْمَوْعِظَةُ کے لفظ سے خیر خواہی کی بات مؤثر انداز میں کہنا تو واضح ہو گیا تھا، مگر خیر خواہی کی بات بعض اوقات دل خراش عنوان سے یا اس طرح بھی کہی جاتی ہے جس سے مخاطب اپنی اپنی محسوس کرے (روح المعانی) اس طریقہ کو چھوڑنے کے لئے لفظ حَسَنَہ کا اضافہ کر دیا گیا۔ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ، لفظ جادل، مجادلہ سے مشتق ہے، اس جگہ مجادلہ سے مراد بحث و مناظرہ ہے، اور بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ سے مراد یہ ہے کہ اگر دعوت میں کہیں بحث و مناظرہ کی ضرورت پیش آجائے تو وہ مباحثہ بھی اچھے طریقہ سے ہوتا چاہئے، روح المعانی میں ہے کہ اچھے طریقہ سے یہ مراد ہے کہ گفتگو میں لطافت اور نرمی اختیار کی جائے، دلائل ایسے پیش کر جائیں جو مخاطب آسانی سے سمجھ سکے، دلیل میں وہ مقدمات پیش کئے جائیں جو مشہور و معروف ہوں تاکہ مخاطب کے مشکوک و درہوں، اور وہ ہٹ دھرمی کے رستہ پر نہ پڑ جائے، اور قرآن حکیم کی دوسری آیات اس پر شاہد ہیں، کہ یہ احسان فی المجادلہ صرف مسلمانوں کے ساتھ نہیں، اہل کتاب کے بارے میں تو خصوصیت کے ساتھ قرآن کا ارشاد ہے، وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ، اور دوسری آیت میں حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو قَوْلًا لَّذًا کہ فرمائی کہ ایت دے کر یہ بھی بتلا دیا کہ فرعون جیسے سرکش کافر کے ساتھ بھی یہی معاملہ کرنا ہے۔

آیت مذکورہ میں دعوت کے لئے تین چیزوں کا ذکر ہے۔
دعوت کے اصول و آداب | اول حکمت، دوسرے موعظہ حسنہ، تیسرے مجادلہ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ، بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ یہ تین چیزیں مخاطبین کی تین قسموں کی بناء پر ہیں، دعوت بالحکمۃ، اہل علم و فہم کے لئے، دعوت بالموعظہ، عوام کے لئے، مجادلہ ان لوگوں کے لئے جن کے دلوں میں مشکوک و شبہات ہوں، یا جو عناد اور ہٹ دھرمی کے سبب بات ماننے سے منکر ہوں۔
 سیدہ حضرت حکیم الامتہ تھانویؒ نے بیان القرآن میں فرمایا کہ ان تین چیزوں کے مخاطب الگ الگ تین قسم کی جماعتیں ہونا سیاق آیت کے لحاظ سے بعید معلوم ہوتا ہے، اور آیت

ظاہر یہ ہے کہ یہ آداب دعوت ہر ایک کے لئے استعمال کرنے میں، کہ دعوت میں سب سے پہلے حکمت سے مخاطب کے حالات کا جائزہ لے کر اس کے مناسب کلام تجویز کرنا ہے، پھر اس کلام میں خیر خواہی و ہمدردی کے جذبہ کے ساتھ ایسے شواہد اور دلائل سامنے لانا ہے جن سے مخاطب مطمئن ہو سکے، اور طرز بیان و کلام ایسا مشفقانہ اور نرم رکھنا ہے کہ مخاطب کو اس کا یقین ہو جائے کہ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں میری ہی مصلحت اور خیر خواہی کے لئے کہہ رہے ہیں، مجھے شرمندہ کرنا یا میری حیثیت کو مجروح کرنا ان کا مقصد نہیں۔

البتہ صاحب روح المعانی نے اس جگہ ایک نہایت لطیف نکتہ یہ بیان فرمایا کہ آیت کے نسق سے معلوم ہوتا ہے کہ اصول دعوت اصل میں دو ہی چیزیں ہیں، حکمت اور موعظت، تیسری چیز مجادلہ، اصول دعوت میں داخل نہیں، ہاں طریق دعوت میں کبھی اس کی بھی ضرورت پیش آجاتی ہے۔

صاحب روح المعانی کا استدلال اس پر یہ ہے کہ اگر یہ تینوں چیزیں اصول دعوت ہوں تو مقتضائے مقام یہ تھا کہ تینوں چیزوں کو عظمت کے ساتھ اس طرح بیان کیا جاتا، بالحدیث والموعظۃ الحسنۃ والجدال الحسن، مگر قرآن حکیم نے حکمت و موعظت کو تو عظمت کے ساتھ ایک ہی نسق میں بیان فرمایا اور مجادلہ کے لئے الگ جملہ بجا دیا ﴿لَقَدْ هَمَمْنَا بِاللَّيْلِ﴾ اختصار کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مجادلہ فی العلم دراصل دعوت الی اللہ کا رکن یا شرط نہیں بلکہ طریق دعوت میں پیش آنے والے معاملات کے منطوق ایک ہدایت ہے، جیسا کہ اس کے بعد کی آیت میں صبر کی تلقین فرمائی ہے، کیونکہ طریق دعوت میں لوگوں کی ایذاؤں پر صبر کرنا ناگزیر ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اصول دعوت دو چیزیں ہیں، حکمت اور موعظت، جن سے کوئی دعوت خالی نہ ہونا چاہئے، خواہ علماء و خواص کو ہو یا عوام الناس کو، البتہ دعوت میں کسی وقت ایسے لوگوں سے بھی سابقہ پڑ جاتا ہے جو شکوک و ادہام میں مبتلا اور داعی کے ساتھ بحث مباحثہ پر آمادہ ہیں تو ایسی حالت میں مجادلہ کی تعلیم دی گئی، مگر اس کے ساتھ بالائی ہی احسن کی تکرار کر بتلادیا کہ جو مجادلہ اس شرط سے خالی ہو اس کی شریعت میں کوئی حیثیت نہیں۔

دعوت الی اللہ کے | دعوت الی اللہ دراصل انبیاء علیہم السلام کا منصب ہے، امت کے پیغمبرانہ آداب | علماء اس منصب کو ان کا نائب ہونے کی حیثیت سے استعمال کرتے ہیں

تو لازم یہ ہے کہ اس کے آداب اور طریقے بھی انہی سے سیکھیں، جو دعوت ان طریقوں پر نہ رہے وہ دعوت کے بجائے عداوت اور جنگ و جدال کا موجب ہو جاتی ہے۔

دعوت پیغمبرانہ کے اصول میں جو ہدایت قرآن کریم میں حضرت موسیٰ و ہارون کے لئے نقل کی گئی ہے کہ فَقُولَا لَنَا لَعَلَّهَا يَتَنَكَّرُ اَوْ يَخْشَىٰ، یعنی فرعون سے نرم بات کرو شاید وہ سمجھ لے یا ڈر جائے۔ یہ ہر داعی حق کو ہر وقت سامنے رکھنا ضروری ہے کہ فرعون جیسا سرکش کافر جس کی موت بھی علیہا آہی میں کفر ہی پر ہونے والی تھی اس کی طرف بھی جب اللہ تعالیٰ اپنے داعی کو بھیجتے ہیں تو نرم گفتار کی ہدایت کے ساتھ بھیجتے ہیں، آج ہم جن لوگوں کو دعوت دیتے ہیں وہ فرعون سے زیادہ گمراہ نہیں، اور ہم میں سے کوئی موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے برابر داعی نہیں، تو جو حق اللہ تعالیٰ نے اپنے دونوں پیغمبروں کو نہیں دیا کہ مخاطب کے سخت کلامی کریں اس پر فکے کریں، اس کی توہین کریں، وہ حق ہمیں کہاں سے حاصل ہو گیا۔

فترآن کریم انبیاء علیہم السلام کی دعوت و تبلیغ اور کفار کے مجادلات سے بھرا ہوا ہے اس میں کہیں نظر نہیں آتا کہ کسی اللہ کے رسول نے حق کے خلاف ان پر طعن زنی کر نیوالوں کے جواب میں کوئی ثقیل کلمہ بھی بولا ہو، اس کی چند مثالیں دیکھئے:-

سورۃ اعراف کے ساتویں رکوع میں آیات ۵۹ سے ۶۷ تک دو پیغمبر حضرت نوح اور حضرت ہود علیہما السلام کے ساتھ ان کی قوم کے مجادلے اور سخت سخت الزامات کے جواب میں ان بزرگوں کے کلمات قابل ملاحظہ ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے وہ اولوالعزم پیغمبر ہیں جن کی طول عمر دنیا میں مشہور ہے، سارے نو سو برس تک اپنی قوم کی دعوت و تبلیغ، اصلاح و ارشاد میں دن رات مشغول رہے، مگر اس بد بخت قوم میں سے معدودے چند کے علاوہ کسی نے ان کی بات نہ مانی، اور تو اور خود ان کا ایک لڑکا اور بیوی کافروں کے ساتھ لگے رہے، ان کی جگہ آج کا کوئی مری دعوت و اصلاح ہوتا تو اس قوم کے ساتھ اس قالب و لچہ کیسا ہوتا، اندازہ لگائیے، پھر دیکھتے کہ ان کی تمام ہمدردی و خیر خواہی کی دعوت کے جواب میں قوم نے کیا کہا:-

اِنَّا لَنَرُكَ فِي ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝
(اعراف)

”ہم تو آپ کو کھلی ہوئی گمراہی میں پاتے ہیں“

اور اللہ کے پیغمبر بجاتے اس کے کہ اس سرکش قوم کی گمراہیوں، بدکاریوں کا پتہ چاک کرتے جواب میں کیا فرماتے ہیں:-

يَقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ
رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الطَّٰغِيْنَ ۝
میرے بھائیو! مجھ میں کوئی گمراہی نہیں
میں تو رب الطغیوں کا رسول اور قاصد ہوں
(تمہارے فائدہ کی باتیں بتلاتا ہوں)

ان کے بعد آنے والے دو ستر اللہ کے رسول حضرت ہود علیہ السلام کو ان کی قوم نے
مہجرات دیکھنے کے باوجود ازراہ عناد کہا کہ آپ نے اپنے دھوے پر کوئی دلیل پیش نہیں کی،
اور ہم آپ کے کہنے سے اپنے معبودوں (بتوں) کو چھوڑنے والے نہیں، ہم تو یہی کہتے ہیں کہ
تم نے جو ہمارے معبودوں کی شان میں بے ادبی کی ہے، اس کی وجہ تم جنوں میں مبتلا ہو گئے ہو
حضرت ہود علیہ السلام نے یہ سب کچھ سن کر جواب دیا:

إِنِّي أَسْرِمُ اللَّهَ وَاشْهَدُوا
أَنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ ۝

یعنی میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں اور تم
بھی گواہ رہو کہ میں اُن بتوں سے بری ہوں

بیزار ہوں جن کو تم اللہ کا شریک مانتے ہو (سورۃ ہود)

اور سورۃ اعراف میں ہے کہ ان کی قوم نے اُن کو کہا:-

إِنَّا كُنَّا بِكَ فِي سَفَاهَةٍ
وَإِنَّا نَنُكَرُكَ مِنَ الْكَافِرِينَ ۝

”ہم تو آپ کو بیوقوفی میں مبتلا سمجھتے
ہیں، اور ہمارا خیال یہ ہے کہ آپ جھوٹ
بولنے والوں میں سے ہیں“

(اعراف)

قوم کے اس دل آزار خطاب کے جواب میں اللہ کے رسول ہود علیہ السلام نے ان پر
کوئی فقرہ کسے ہیں انہ ان کی بے راہی اور کذب و افتراء علی اللہ کی کوئی بات کہتے ہیں جواب
کیا ہے صرف یہ کہ:-

يَقَوْمُ لَيْسَ بِي سَفَاهَةٌ وَلَكِنِّي
رَسُولٌ مِّنْ رَبِّ الْغَالِيينَ ۝

”اے میری برادری کے لوگو! مجھ میں کوئی
بے وقوفی یا کم عقلی نہیں، میں تو رب الغالین
کا رسول ہوں“

(اعراف)

حضرت شعیب علیہ السلام نے قوم کو حسب دستور انبیاء اللہ کی طرف دعوت دی اور
ان میں جو بڑا عیب ناپ تول میں کمی کرنے کا تھا اس سے باز آنے کی ہدایت فرمائی، تو ان کی
قوم نے تمسخر کیا، اور توہین آمیز خطاب کیا:-

يٰشُعَيْبُ أَصَلَّيْكَ تَأْمُرُكَ
أَنْ تَتْرَكَ مَا يُحِبُّ آبَاؤُنَا
أَوْ أَنْ تَفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا مَا
نَشَاءُ إِنَّكَ لَأَنْتَ الْحَلِيمُ
الَّذِي شِئِدُ ۝

”اے شعیب! کیا تمہاری نماز تمہیں یہ
حکم دیتی ہو کہ ہم اپنے باپ دادا کے معبودوں
کو چھوڑ دیں، اور یہ کہ جن اموال کے ہم
مالک ہیں ان میں اپنی مرضی کے موافق جو
چاہیں نہ کریں، واقعی آپ میں بڑے
عقل مندین پر چلنے والے“

تیسری

انہوں نے ایک قویہ طعنہ دیا کہ تم جو نماز پڑھتے ہو وہی تمہیں بے وقوفی کے کٹا سکتا ہے دوسرے یہ کہ مال ہمارے ہیں، ان کی خرید و فروخت کے معاملات میں تمہارا یا خدا کا کیا دخل ہو، ہم جس طرح چاہیں ان میں تصرف کا حق رکھتے ہیں، تیسرا جملہ تمہیں وسوسہ دے گا کہ آپ ہیں بڑے عقلمند بہت دین پر چلنے والے۔

معلوم ہوا کہ یہ لادینی معاشیات کے پجاری صرف آج نہیں پیدا ہوئے ان کے بھی کچھ اسلاف ہیں جن کا نظریہ وہی تھا جو آج کے بعض نام کے مسلمان کہہ رہے ہیں، کہ ہم مسلمان ہیں اسلام کو مانستے ہیں، مگر معاشیات میں ہم سوشل ازم کو اختیار کرتے ہیں، اس میں اسلام کا کیا دخل ہے، یہ حال اس ظالم قوم کے اس منحرف پن اور دل آزار گفتگو کا جواب اللہ کا رسول کیا دیتا ہے، دیکھئے:-

قَالَ لِقَوْمٍ أَرَاءَ يُسَمُّونَ إِنَّ كُنْتُمْ
عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي وَرَزَقْنِي مِّنْهُ
رِزْقًا حَسَنًا وَمَا أَرِيدُ أَنْ
أُخَالِفَكُم إِلَىٰ مَا أَتُخْسِمُ عَنْهُ
لَئِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ
وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ عَلَيْهِ
تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ۝
(سورۃ ہود، آیت ۸۸)

”اے میری قوم! بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر میں
اپنے رب کی طرف سے دلیل پر قائم ہوں
اور اس نے مجھ کو اپنی طرف سے عمدہ
دولت یعنی نبوت دی ہو تو پھر میں کیسے
اس کی تبلیغ نہ کروں، اور میں خود بھی تو اس
کے خلاف کوئی عمل نہیں کرتا، جو تمہیں بتلا
ہوں، میں تو صرف اصلاح چاہتا ہوں،
جہاں تک میری قدرت میں ہے اور مجھ کو

جو کچھ اصلاح اور عمل کی توفیق ہو جاتی ہے وہ صرف اللہ ہی کی مدد سے ہے، میں اسی پر
بھروسہ رکھتا ہوں، اور تمام امور میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی طرف بھیجنے کے وقت جو نرم گفتار کی ہدایت منجانب اللہ
دی گئی تھی اس کی پوری تعمیل کرنے کے باوجود فرعون کا خطاب حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ تھا،

قَالَ أَلَمْ نُرَبِّكَ فِتْنًا وَلَئِنَّا
وَلَبِثْتَ فِتْنًا مِّنْ عَمْرٍكَ
سِنِينَ ۝ وَفَعَلْتَ فَعَلَتَكَ
الَّتِي فَعَلْتَ وَأَنْتَ مِنَ
الْكَاذِبِينَ ۝

”فرعون کہنے لگا (اے تم ہو) کیا ہم نے تم کو
بچپن میں پرورش نہیں کیا، اور تم اس عمر
میں برسوں ہمارے پاس رہا سہل کئے، اور
تم نے اپنی وہ حرکت بھی کی تھی جو کی تھی
یعنی قبلی کو قتل کیا تھا، اور تم بڑے
ناشکرے ہو۔“

(سورۃ شعراء)

اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اپنا یہ احسان بھی جتلا یا کہ بچپن میں ہم نے تجھے پالا ہی، پھر یہ احسان بھی جتلا یا کہ بڑے ہونے کے بعد بھی کافی مدت تک تم ہمارے پاس رہے، پھر یہ عتاب کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے جو ایک قبلی بغیر ارادہ قتل کے مارا گیا تھا اس پر غصہ و ناراضی کا اظہار کر کے یہ بھی کہا کہ تم کافروں میں سے ہو گئے۔

یہاں کافروں میں سے ہونے کے لغوی معنی بھی ہو سکتے ہیں یعنی ناشکری کرنے والا، جس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم نے تو تم پر احسانات کئے اور تم نے ہمارے ایک آدمی کو مار ڈالا جو احسان کی ناشکری تھی، اور اصطلاحی معنی بھی ہو سکتے ہیں، کیونکہ فرعون خود خدائی کا دعویٰ کرتا تھا، تو جو اس کی خدائی کا مستکر ہوا وہ کافر ہوا۔

اب اس موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جواب سنتے، جو پیغمبرانہ آداب دعوت اور پیغمبرانہ اخلاق کا شاہکار ہے، کہ اس میں سب سے پہلے تو اس کمزوری اور کوتاہی کا اعتراف کر لیا جو ان سے سرزد ہو گئی تھی، یعنی اسرائیلی آدمی سے لڑنے والے قبلی کو ہٹانے کے لئے ایک آدمی اس کے مارا تھا جس سے وہ مر گیا، تو گو یہ قتل عداۃ ارادۃ نہیں تھا، مگر کوئی دینی تقاضا بھی نہیں تھا، بلکہ شریعت موسوی کے لحاظ سے بھی وہ شخص قتل کا مستحق نہیں تھا، اس لئے پہلے یہ اعتراف فرمایا:-

یعنی میں نے یہ کام اُس وقت کیا تھا،
جبکہ میں ناواقف تھا»

فَعَلَّيْهَا إِذْ أَتَا مِنَ الْقَبَلِ
(سورۃ شعراء)

مراد یہ ہے کہ یہ فعل عطا نبوت سے پہلے سرزد ہو گیا تھا، جب کہ مجھے اس بارہ میں اللہ کا کوئی حکم معلوم نہیں تھا، اس کے بعد فرمایا:

”پھر مجھ کو ڈر لگا تو میں تمہارے یہاں سے
مفرد رہ گیا، پھر مجھ کو میرے رب نے
دشمنی عطا فرمائی، اور مجھ کو اپنی غیبت
میں شامل کر دیا»

فَقَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ
فَوَهَبَ لِي رَبِّي حُكْمًا وَجَعَلَنِي
مِنَ الْمُتَرَسِّلِينَ هـ
(سورۃ شعراء)

پھر اس کے احسان جتلانے کا جواب یہ دیا کہ تمہارا یہ احسان جتنا نیک نہیں، کیونکہ میری پرورش کا معاملہ تمہارے ہی ظلم و عدوان کا نتیجہ تھا، کہ تم نے اسرائیلی بچوں کے قتل کا حکم دے رکھا تھا، اس لئے والدہ نے مجبور ہو کر مجھے دریا میں ڈالا اور تمہارے گھر تک پہنچنے کی نوبت آئی، فرمایا:

رہا احسان جتلا نا پرورش کا سورہ

وَذَلِكَ نَحْمَدُكُمْ عَلَيْهَا أَنْ

عَبْدُكَ بَنِي إِسْرَٰءِيلَ ۝

(سورۃ شعراء)

وہ نعمت ہی جس کا تو مجھ پر احسان رکھتا ہے
کہ تو نے بنی اسرائیل کو سخت ذلت میں ڈال
رکھا تھا ۝

اس کے بعد فرعون نے جب سوال کیا وَمَا رَبُّ الْعَالَمِينَ، یعنی رب العالمین کون ہے اور کیا ہے؟ تو جواب میں فرمایا کہ وہ رب ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس سب کا، اس پر فرعون نے بطور استہزاء کے حاضرین سے کہا اَلَا تَسْمَعُونَ، یعنی تم سن رہی ہو کہ یہ کیسی بے عقلی کی باتیں کہہ رہے ہیں، اس پر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

رَبُّكُمْ وَرَبُّ آبَائِكُمُ
الْأَوَّلِينَ ۝

یعنی تمہارا اور تمہارے باپ داداؤں کا
بھی وہی رب پروردگار ہے ۝

اس پر فرعون نے جھجھلا کر کہا:

إِنَّ رَسُولَكُمْ الَّذِي أُرْسِلَ
إِلَيْكُمْ لَمَجْنُونٌ ۝

یعنی یہ جو تمہاری طرف اللہ کے رسول ہے
کامدعی ہے وہ دیوانہ ہے ۝

مجنون دیوانہ کا خطاب دینے پر بھی موسیٰ علیہ السلام بجائے اس کے کہ ان کا دیوانہ ہونا، اور اپنا عقل ہونا ثابت کرتے اس طرف کوئی التفات ہی نہیں کیا، بلکہ اللہ رب العالمین کی ایک اور صفت بیان فرمادی:-

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَ
مَا يَدْرِيكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْقِلُونَ ۝

وہ رب ہے مشرق و مغرب کا اور جو کچھ
ان کے درمیان ہے اگر تم کو کچھ عقل ہو ۝

یہ ایک طویل مکالمہ ہے جو فرعون کے دربار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے درمیان ہو رہا ہے، جو سورۃ شعراء کے تین رکوع میں بیان ہوا ہے، اللہ کے مقبول رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس مکالمہ کو اول سے آخر تک دیکھتے، نہ کہیں جذبات کا انہما رہے نہ اس کی بدگوئی کا جواب ہے، نہ اس کی سخت کلامی کے جواب میں کوئی سخت کلام ہے، بلکہ مسلسل اللہ جل جلالہ کی صفات کمال کا بیان ہے، اور تبلیغ کا سلسلہ جاری ہے۔

یہ مختصر سا مضمون ہے انبیاء علیہم السلام کے مجادلات کا جو اپنے محاند اور رضوی قوم کے مقابلہ میں کئے گئے ہیں، اور مجادلہ بالحق ہی احسن جو قرآن کی تعلیم ہے اس کی عملی تشریح ہے۔ مجادلات کے علاوہ دعوت و تبلیغ میں ہر مخاطب اور ہر موقع کے مناسب کلام کرنے میں حکیمانہ اصول اور عنوان و تعبیر میں حکمت و مسرت کی رعایتیں بھی جو انبیاء علیہم السلام نے اختیار فرمائی ہیں، اور دعوت الی اللہ کو مقبول و مؤثر اور پائیدار بنانے کے لئے جو طرز عمل

اختیار فرمایا ہے وہی دراصل دعوت کی روح ہے، اس کی تفصیلات تو تمام تعلیمات نبوی علیہ السلام میں پھیل ہوئی ہیں، منولے کے طور پر چند چیزیں دیکھتے:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت و تبلیغ اور وعظ و نصیحت میں اس کا بڑا لحاظ رہتا تھا کہ مخاطب پر بار نہ پڑے پاسے صحابہ کرام جیسے عشاق رسول جن سے کسی وقت بھی اس کا احتمال نہ تھا کہ وہ آپ کی باتیں سننے سے اکتا جائیں گے، ان کے لئے بھی آپ کی عادت یہ تھی کہ وعظ و نصیحت روزانہ نہیں بلکہ ہفتہ کے بعض دنوں میں فرماتے تھے، تاکہ لوگوں کے کاروبار کا حرج اور ان کی طبیعت پر بار نہ ہو۔

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہفتہ کے بعض ایام ہی میں وعظ فرماتے تھے تاکہ ہم اکتانہ جائیں، اور دوسروں کو بھی آپ کی طرف سے یہی ہدایت تھی۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

نَبِّئْ ذَا ذَا لَ تَغِيْسُ ذَا وَ كَثِيْرًا
وَلَا تُنْفِسْ ذَا

”لوگوں پر آسانی کرو دشواری نہ پیدا کرو اور ان کو اللہ کی رحمت کی خوشخبری سنناؤ، مایوس یا متنفر نہ کرو“

(صحیح بخاری، کتاب العلم)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ہمیں چاہئے کہ ربانی، حکماء، علماء اور فقہاء بنوں، صحیح بخاری میں یہ قول نقل کر کے لفظ ربانی کی یہ تفسیر فرمائی کہ جو شخص دعوت و تبلیغ اور تعلیم میں تربیت کے اصول کو ملحوظ رکھ کر پہلے آسان آسان باتیں بتلائے، جب لوگ اس کے عادی ہو جائیں تو اس وقت دوسرے احکام بتلائے جو ابتدائی مرحلے میں مشکل ہوتے تو عالم ربانی ہے، آجکل جو وعظ و تبلیغ کا اثر بہت کم ہوتا ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ عموماً اس کام کے کرنے والے ان اصول و آداب کی رعایت نہیں کرتے، لمبی تقریریں، وقت بے وقت نصیحت، مخاطب کے حالات کو معلوم کئے بغیر اس کو کسی کام پر مجبور کرنا ان کی عادت بن گئی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت و اصلاح کے کام میں اس کا بھی بڑا اہتمام تھا کہ مخاطب کی تسکلی یا رسوائی نہ ہو، اسی لئے جب کسی شخص کو دیکھتے کہ کسی غلط اور بُرے کام میں مبتلا ہے تو اس کو براہ راست خطاب کرنے کے بجائے مجمع عام کو مخاطب کر کے فرماتے تھے

مَا بَأْسَ أَقْوَامٍ يَفْعَلُونَ
کَذٰ

”لوگوں کو کیا ہو گیا کہ منلاں کام کرتے ہیں“

اس عام خطاب میں جس کو نشانہ اصل مقصود ہوتا وہ بھی سن لیتا، اور دل میں شرمندہ

ہو کر اس کے چھوڑنے کی فکر میں لگ جاتا تھا۔

انبیاء علیہم السلام کی عام عادت یہی تھی کہ مخاطب کو شرمندگی سے بچاتے تھے، اسی لئے بعض اوقات جو کام مخاطب سے سرزد ہوا ہے اس کو اپنی طرف منسوب کر کے اصلاح کی کوشش فرماتے، سورۃ یسین میں ہے وَمَا لِيَ لَا أَعْبُدُ الَّذِي فَطَرَنِي، یعنی مجھے کیا ہو گیا کہ میں اپنے پیدا کرنے والے کی عبادت نہ کروں، ظاہر ہے کہ یہ قاصدِ رسول تو ہر وقت عبادت میں مشغول تھے، سنانا اس مخاطب کو تھا جو مشغولِ عبادت نہیں ہے، مگر اس کام کو اپنی طرف منسوب فرمایا۔

اور دعوت کے معنی دوسرے کو اپنے پاس بلانا ہے، محض اس کے عیب بیان کرنا نہیں، اور یہ بلانا اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ متکلم اور مخاطب میں کوئی اشتراک ہو، اسی لئے قرآن عزیز میں انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا عنوان اکثر یَقْدِمُ سے شروع ہوتا ہے، جس میں برادرانہ رشتہ کا اشتراک پہلے جتا کر آگے اصلاحی کلام کیا جاتا ہے، کہ ہم تم کو ایک ہی برادری کے آدمی ہیں، کوئی منافرت نہیں ہونی چاہئے، یہ کہہ کر ان کی اصلاح کا کام شروع فرماتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعوت کا خطا ہر قتل شاہِ روم کے نام بھیجا، اس میں اول تو شاہِ روم کو ”عظیم الروم“ کے لقب سے یاد فرمایا، جس میں اس کا جائز اکرام ہے، کیونکہ اس میں اس کے عظیم ہونے کا اقرار بھی ہے، مگر رومیوں کے لئے اپنے لئے نہیں، اس کے بعد ایمان کی دعوت اس عنوان سے دی گئی:-

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى
كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ
أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ،
(سورۃ آل عمران)

”اے اہل کتاب! اس کلمہ کی طرف جلدی
سے آ جاؤ، جو ہمارے اور تمہارے درمیان
مشترک ہو، یعنی یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی
عبادت نہیں کریں گے“

جس میں پہلے آپس کا ایک مشترک نقطہ وحدت ذکر کیا کہ توحید کا عقیدہ ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے، اس کے بعد عیسائیوں کی غلطی پر متنبہ فرمایا۔

تعلیماتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دھیان دیا جائے تو ہر تعلیم و دعوت میں اسی طرح کے آداب و اصول ملیں گے، آجکل اول تو دعوت و اصلاح اور امر بالمعروف نہی عن المنکر کی طرف دھیان ہی نہ رہا، اور جو اس میں مشغول بھی ہیں انہوں نے صرف بحث و مباحثہ اور مخالف پر الزام تراشی، فقہائے کئے اور اس کی تحقیر و توہین کرنے کو دعوت و تبلیغ سمجھ لیا ہے، جو خلاف سنت ہونے کی وجہ سے کبھی مؤثر و مفید نہیں ہوتا، وہ سمجھتے رہتے ہیں کہ ہم نے

اسلام کی بڑی ندرت کی، اور حقیقت میں وہ لوگوں کو متغیر کرنے کا سبب بن رہے ہیں۔
 مردجہ مجادلات کی دینی | آیت مذکورہ کی تفسیر میں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اصل مقصود شرع و دعوت
 اور دنیوی مضمراتیں | الی اللہ ہے، جس کے دو اصول ہیں، حکمت اور موعظت حسنہ، مجادلہ
 کی صورت کبھی سر آ پڑے تو اس کے لئے بھی احسن کی قید لگا کر اجازت دیدی گئی ہے، مگر
 وہ حقیقت دعوت کا کوئی شعبہ نہیں، بلکہ اس کے منفی پہلو کی ایک تہ پر ہے جس میں قرآن کریم
 نے بالنتیجہ ہی احسن کی قید لگا کر جس طرح یہ بتلادیا ہے کہ وہ نرمی، خیر خواہی اور ہمدردی
 کے جذبے سے ہونا چاہئے اور اس میں دلائل و اضمحہ مخاطب کے مناسب حال بیان کرنا چاہئے
 مخاطب کی توہین و تنقیہ سے گلی اجتناب کرنا چاہئے، اسی طرح اس کے احسن ہونے کے لئے
 یہ بھی ضروری ہے کہ وہ خود تکلم کے لئے مضر نہ ہو جائے، کہ اس میں اخلاق و ذلیہ حسد، بغض،
 تکبر، جاہ پسندی وغیرہ پیدا نہ ہو جائیں، جو باطنی گناہ کبیرہ ہیں، اور آجکل کے بحث و مباحثہ
 مناظرہ، مجادلہ میں شاذ و نادر ہی کوئی اللہ کا بندہ ان سے نجات پاسے تو ممکن ہے ورنہ عادتاً
 ان سے بچنا سخت دشوار ہے۔

امام غزالیؒ نے فرمایا کہ جس طرح شراب اُمّ الجبائش ہے کہ خود بھی بڑا گناہ ہے
 اور دوسرے بڑے بڑے جسمانی گناہوں کا ذریعہ بھی ہے، اسی طرح بحث و مباحثہ میں جب
 مقصود مخاطب پر غلبہ پانا اور اپنا علیٰ تفوق لوگوں پر ظاہر کرنا ہو جائے تو وہ بھی باطن کیلئے
 اُمّ الجبائش ہے، جس کے نتیجے میں بہت سے روحانی جرائم پیدا ہوتے ہیں، مثلاً حسد، بغض، تکبر
 غیبت، دوسرے کے عیوب کا تجسس، اس کی بُرائی سے خوش اور بھلائی سے رنجیدہ ہونا، قبول
 حق سے استکبار، دوسرے کے قول پر انصاف و اعتدال کے ساتھ غور کرنے کے بجائے جواب ہی
 کی فکر خواہ اس میں قرآن و سنت میں کیسی ہی تاویلات کرنا پڑیں۔

یہ تو وہ مہلکات ہیں جن میں باوقار علماء ہی مبتلا ہوتے ہیں، اور معاملہ جب ان کے متبعین
 میں پہنچتا ہے تو دست و گریبان اور جنگ و جدال کے معرکے گرم ہو جاتے ہیں، انا للہ
 حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا:-

”علم تو اہل علم و فضل کے مابین ایک رحم متصل (رشتہ اخوت و برادری)
 ہے، تو وہ لوگ جنہوں نے علم ہی کو عداوت بنا لیا ہے، وہ دوسروں کو اپنے
 مذہب کی اقتدار کی دعوت کس طرح دیتے ہیں، اُن کے پیش نظر دوسرے پر
 غلبہ پانا ہی ہے تو پھر اُن سے باہمی انس و مودت اور مروت کا تصور کیسے کیا
 کیا جاسکتا ہے، اور ایک انسان کے لئے اس سے بڑھ کر شر اور بُرائی اور

کیا ہوگی کہ وہ اس کو منافقین کے اخلاق میں مبتلا کر دے، اور وہ منین و متقین کے اخلاق سے محروم کر دے؟

امام غزالی نے فرمایا کہ علم دین اور دعوت حق میں اشتغال رکھنے والا یا تو اصول صحیح کے تابع اور مہلک خطرات سے بچتا رہ کر معاشرت ابدی حاصل کر لیتا ہے یا پھر اس مقام سے گرتا ہے تو شقاوت ابدی کی طرف جاتا ہے، اس کا درمیان میں رہنا بہت مستبعد ہے، کیونکہ جو علم نافع نہ ہو وہ عذاب ہی ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

أَشَدُّ النَّاسِ عَذَابًا يَوْمَ الْقِيَمَةِ
عَالِمٌ لَمْ يَنْفَعَهُ اللَّهُ بِعِلْمِهِ

”سب سے زیادہ عذاب میں قیامت کے دن وہ عالم ہوگا جس کے علم سے اللہ تعالیٰ نے اس کو نفع نہ بخشا ہو۔“

ایک دوسری حدیث صحیح میں ہے:-

لَا تَتَعَلَّمُوا الْعِلْمَ لِشَبَاهَتِهِ
الْعِلْمَاءَ وَلِشَمَارِ وَابِهِ السُّفَهَاءَ
وَلِتَصْرِفُوا ابْنَهُ وَجُودَ النَّاسِ
إِلَيْكُمْ فَمَنْ فَعَلَ ذَلِكَ فَهُوَ
فِي النَّارِ (ابن تیمیہ ج ۱ ص ۱۸۱)

”علم دین کو اس غرض سے نہ سیکھو کہ اس کے ذریعہ دوسرے علماء کے مقابلہ میں فخر و عزت حاصل کرو یا کم علم لوگوں سے بھگڑو کرو یا اس کے ذریعہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف کر دو اور جو ایسا کرے گا وہ آگ میں ہے۔“

اسی لئے ائمہ فقہاء اور اہل حق کا مسلک اس معاملے میں یہ تھا کہ علمی مسائل میں جھگڑا اور جدال ہرگز جائز نہیں تھے، دعوت حق کے لئے اتنا کافی ہے کہ جس کو خطا پر سمجھے اس کو نرمی اور نہایتی کے عنوان سے دلائل کے ساتھ اس کی خطا پر متنبہ کر دے، پھر وہ قبول کر لے تو بہتر ورنہ سکوت اختیار کرے، جھگڑے اور بدگوئی سے کلی امتراز کرے، حضرت امام مالک کا ارشاد ہے:-

كَانَ مَالِكٌ يَقُولُ الْهَرَاءُ وَ
الْجِدَالُ فِي الْعِلْمِ يَنْهَبُ
بُزُرَ الْعِلْمِ عَنْ قُلُوبِ الْعِبَادِ
وَقِيلَ لَهُ رَجُلٌ لَهُ عِلْمٌ
بِالسُّنَنِ فَهَلْ يُجَادِلُ عَنْهَا
قَالَ لَا وَلَئِنْ يُخْبِرُ بِالسُّنَنِ
فَإِنْ قُبِلَ مِنْهُ وَإِلَّا سَكَتَ
(اربع المسالك شرح مؤطا ص ۱۱۱)

”امام مالک نے فرمایا کہ علم میں جھگڑا اور جدال نور علم کو انسان کے قلب سے نکال دیتا ہے کسی عرض کیا کہ ایک شخص جس کو سنت کا علم ہو کیا وہ حفاظت سنت کیلئے جدال کر سکتا ہے؟ فرمایا نہیں، بلکہ اس کو چاہئے کہ مخاطب کو صحیح بات سے آگاہ کر دے، پھر وہ قبول کر لے تو بہتر ورنہ سکوت اختیار کرے۔“

اس زمانے میں دعوت و اصلاح کا کام پوری طرح مؤثر نہ ہونے کے دو سبب ہیں۔ ایک تو یہ کہ فسادِ زمانہ اور حرام چیزوں کی کثرت کے سبب عام طور پر لوگوں کے قلوب سخت اور آخرت سے غافل ہو گئے ہیں، اور قبولِ حق کی توفیق کم ہو گئی ہے، اور بعض تو اس قہر میں مبتلا ہیں جس کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی کہ آخر زمانے میں بہت سے لوگوں کے قلوب اندھ ہو جائیں گے، بھلے مجرے کی پہچان اور جائز و ناجائز کا امتیاز ان کے دل سے اٹھ جائے گا۔ اور دوسرا سبب یہ کہ اعلیٰ المردود اور نبی عربیہ کے اسرار اور دعوتِ حق کے فرائض سے غفلت عام ہو گئی ہے، عوام کا تو کیا ذکر خواص علماء و صلحا میں اس ضرورت کا احساس بہت کم ہے، یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ اپنے اعمال درست کر لئے جائیں تو یہ کافی ہے خواہ ان کی اولاد، بیوی، بھائی، دوست احباب کیسے ہی گناہوں میں مبتلا رہیں ان کی اصلاح کی فکر گویا ان کے ذمہ ہی نہیں، حالانکہ قرآن و حدیث کی نصوص صریحہ ہر شخص کے ذمہ اپنے اہل و عیال اور متعلقین کی اصلاح کو فرض قرار دے رہی ہیں ﴿وَأَنفُسُكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا﴾ اور پھر اگر کچھ لوگ دعوت و اصلاح کے فریضہ کی طرف توجہ دیتے بھی ہیں تو وہ قرآنی تعلیمات اور دعوتِ پیغمبرانہ کے اصول و آداب سے نا آشنا ہیں بے سوچے سمجھے جس کو جس وقت جو چاہا کہہ ڈالا، اور یہ سمجھ بیٹھے کہ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے، حالانکہ طائرِ عمل سنتِ انبیاء کے خلاف ہونے کی وجہ سے لوگوں کو دین اور احکامِ دین پر عمل کرنے سے اور زیادہ دور پھینک دیتا ہے۔

خصوصاً جہاں کسی دوسرے پر تنقید کی نوبت آئے تو تنقید کا نام لے کر تنقید اور استہزاء و تمسخر تک پہنچ جاتے ہیں، حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا:

”ہیں شخص کو کسی غلطی پر متنبہ کرنا ہے، اگر تم نے کوئی نہائی میں نرمی کے ساتھ سمجھایا تو یہ نصیحت ہے، اور اگر علانیہ لوگوں کے سامنے اس کو رسوا کیا تو یہ فضیحت ہے۔“

آجکل تو ایک دوسرے کے عیوب کو اخباروں، اشتہاروں کے ذریعے منظرِ عام پر لانے کو دین کی خدمت سمجھ لیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے دین اور اس کی دعوت کی صحیح بصیرت اور آداب کے مطابق اس کی خدمت کی توفیق عطا فرمائیں۔

یہاں تک دعوت کے اصول اور آداب کا بیان ہوا، اس کے بعد فرمایا:

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَا فِي صُلُوحِ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالسُّعْتِ فِيهِ يَبْلُغُ
 داعیانِ دین کی تسلی کے لئے ارشاد فرمایا ہے، کیونکہ مذکور الصدر آدابِ دعوت کو استعمال کرنے کے باوجود جب مخاطب حق بات کو قبول نہ کرے تو طبعی طور پر انسان کو سخت صدمہ پہنچتا ہے، اور بعض اوقات اس کا یہ اثر بھی ہو سکتا ہے کہ دعوت کا فائدہ نہ دیکھ کر آدمی پر مایوسی طاری

ہو جائے اور کام ہی چھوڑ بیٹھے، اس لئے اس جگہ میں یہ فرمایا کہ آپ کا کام صرف دعوتِ حق کو قبول
 صیغہ کے مطابق ادا کر دینا ہے، آگے اس کو قبول کرنا یا نہ کرنا اس میں نہ آپ کا کوئی دخل ہے نہ آپ کی
 ذمہ داری، وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے، وہی جانتا ہے کہ کون گمراہ رہے گا، اور کون ہدایت
 پائے گا، آپ اس فکر میں نہ پڑیں، اپنا کام کرتے رہیں اس میں ہرست نہ ہاریں مایوس نہ ہوں اس
 سے معلوم ہوا کہ یہ جملہ بھی آدابِ دعوت ہی کا مکملہ ہے۔

داعیِ حق کو کوئی ایذا پہونچائے | اس کے بعد کی تین آیتوں میں داعیانِ حق کے لئے ایک اور اہم
 توبہ لینا بھی جائز ہے مگر صبرِ بہتر | ہدایت ہے، وہ یہ کہ بعض اوقات ایسے سخت دل جاہلوں سے
 سابقہ پڑتا ہے کہ ان کو کتنی ہی نرمی اور خیر خواہی سے بات سمجھائی جائے وہ اس پر بھی مشتعل ہو جاتے
 ہیں، زبان و راز می کر کے ایذا پہونچاتے ہیں، اور بعض اوقات اس سے بھی تجاوز کر کے ان کو جسمانی
 تکلیف پہونچانے بلکہ قتل تک سے بھی گریز نہیں کرتے، ایسے حالات میں دعوتِ حق دینے والوں کو
 کیا کرنا چاہئے۔

اس کے لئے وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ اِلٰہِیْنَ | اس کے بعد کی تین آیتوں میں داعیانِ حق کے لئے ایک اور اہم
 کرے آپ کو بھی اس اپنا بدلہ لینا جائز ہے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ بدلہ لینے میں مقتِ رارِ ظلم سے
 تجاوز نہ ہو، جتنا ظلم اس نے کیا ہے، اتنا ہی بدلہ لیا جائے اس میں زیادتی نہ ہونے پائے۔
 اور آخر آیت میں مشورہ دیا کہ اگرچہ آپ کو انتقام لینے کا حق ہو لیکن صبر کریں اور انتقام
 نہ لیں تو یہ بہتر ہے۔

آیات مذکورہ کا شانِ نزول | یہوذا بن نسطور کے نزدیک یہ آیت مدنی ہے، غزوہٴ احد میں ستر مسیحیہ کی
 اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم | شہادت اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو قتل کر کے مشلہ کرنے کے واقعہ
 صحابہ کی طرف سے تعمیلِ حکم | میں نازل ہوئی، صحیح بخاری کی روایت اسی کے مطابق ہے، دارقطنی نے
 بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ:

”غزوہٴ احد میں جب مشرکین ٹوٹ گئے تو صحابہ کرام میں سے ستر اکابر کی لاشیں
 سامنے آئیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علمِ محترم حضرت حمزہؓ بھی
 تھے، چونکہ مشرکین کو ان پر بڑا غیظ تھا، اس لئے ان کو قتل کرنے کے بعد ان کی
 لاش پر اپنا غصہ اس طرح نکالا کہ ان کی ناک، کان، اور دوسرے اعضا کاٹے
 گئے، پیٹ چاک کیا گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس منظر سے سخت صدمہ
 پہنچا، اور آپؐ نے فرمایا کہ میں حمزہؓ کے بدلے میں مشرکین کے ستر آدمیوں کا اسی
 طرح مشلہ کروں گا، جیسا انہوں نے حمزہؓ کو کیا ہے، اس واقعہ میں یہ تین آیات

نازل ہوئیں، وَاِنْ عَاقِبْتُمْۙ (الذی تفسیر قرطبی) بعض روایات میں ہے کہ دوسرے

حضرات صحابہ کے ساتھ بھی ان ظالموں نے اسی طرح کا معاملہ مشلہ کرنے کا کیا تھا۔

(کنز الداہ الترمذی و احمد و ابن خزیمہ و ابن حبان فی صحیحہما عن ابی بن کعبؓ)

اس میں چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرط غم سے بلا لحاظ اعداد ان صحابہ کے بدلے میں شہرکین کے مشلہ کرنے کا عزم فرمایا تھا، جو اللہ کے نزدیک اس اصول عدل و مساوات کے مطابق نہ تھا جس کو آپ کے ذریعے دنیا میں قائم کرنا منظور تھا، اس لئے ایک تو اس پر تنبیہ فرمایا گیا کہ بدلہ لینے کا حق تو ہے، مگر اسی مفت راز اور پیمانہ پر جس مقدار کا ظلم ہے، بلا لحاظ اعداد چند کا بدلہ شہر سے لینا درست نہیں، دوسرے آپ کو مکارم اخلاق کا نمونہ بنانا مقصود تھا، اس لئے یہ نصیحت کی گئی کہ برابر برابر بدلہ لینے کی اگرچہ اجازت ہے، مگر وہ بھی پیوڑ دو اور مجرموں پر احسان کر دو تو یہ زیادہ بہتر ہے۔

اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب ہم صبر ہی کریں گے، کسی ایک بھی بدلہ نہیں لیں گے، اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کر دیا (منظہری عن البخاری) فتح مکہ کے موقع پر جب یہ تمام شہرکین مغلوب ہو کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے قبضہ میں تھے، یہ موقع تھا کہ اپنا وہ عزم دارادہ پورا کر لیتے جو غزوۂ اُحہ کے وقت کیا تھا، مگر آیات مذکورہ کے نزول کے وقت ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ارادے کو پیوڑ کر صبر کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے، اس لئے فتح مکہ کے وقت ان آیات کے مطابق صبر کا عمل ختم کیا گیا، شاید اسی بنا پر بعض روایات میں یہ مذکور ہوا ہے کہ یہ آیتیں فتح مکہ کے وقت نازل ہوئی تھیں، اور یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ ان آیات کا نزول مکرر ہوا ہو، اول غزوۂ اُحہ میں نازل ہوئیں اور پھر فتح مکہ کے وقت دوبارہ نازل ہوئیں (مکاحکاء المنظہری عن ابن الحصار)

مسئلہ: اس آیت نے بدلہ لینے میں مساوات کا قانون بتایا ہے، اسی لئے حضرات فقہاء نے فرمایا کہ جو شخص کسی کو قتل کر دے اس کے بدلے میں قاتل کو قتل کیا جائے گا، جو زخمی کر دے تو اتنا ہی زخم اس کرنے والے کو لگایا جائے گا جو کسی کا ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے پھر قتل کر ڈالے تو وہی مقتول کو حق دیا جائے گا کہ وہ بھی پہلے قاتل کا ہاتھ پاؤں کاٹے پھر قتل کر دے۔ البتہ اگر کسی نے پتھر مار کر کسی کو قتل کیا یا تیروں سے زخمی کر کے قتل کیا تو اس میں نوعیت قتل کی سبب مقدار متعین نہیں کی جاسکتی کہ کتنی ضربوں سے یہ قتل واقع ہوا ہے، اور مقتول کو کتنی تکلیف پہنچی ہے، اس معاملہ میں تحقیقی مساوات کا کوئی پیمانہ نہیں ہے، اس لئے اس کو تلوار ہی سے قتل کیا جائے گا (جصاص)

مسئلہ: آیت کا نزول اگرچہ جسمانی تکالیف اور جسمانی نقصان پہنچانے کے متعلق ہوا ہے مگر الفاظ عام ہیں جس میں مالی نقصان پہنچانا بھی داخل ہے، اسی لئے حضرات فقہاء نے فرمایا کہ جو شخص کسی سوار اس کا مال غصب کرے تو اس کو بھی حق حاصل ہے کہ اپنے حق کے مطابق اس سے مال چھین لے، یا چوری کر کے میلے بٹلے جو مال لیا ہو وہ اپنی حق کی جنس سے مثلاً نقد روپیہ لیا ہو تو اس کے بدلے میں اتنا ہی نقد روپیہ اسے غصب یا چوری کے ذریعے لے سکتا ہے، غلہ، کپڑا وغیرہ لیا ہے تو اسی طرح کا غلہ، کپڑا لے سکتا ہے، مگر ایک جنس کے بدلے میں دوسری جنس نہیں لے سکتا، مثلاً روپے کے بدلے میں کپڑا یا کوئی دوسری استعمالی چیز زبردستی نہیں لے سکتا، اور بعض فقہاء نے مطلقاً اجازت دی ہے، خواہ جنس حق سے ہو یا کسی دوسری جنس سے، اس مسئلہ کی کچھ تفصیل قرطبی نے اپنی تفسیر میں لکھی ہے، اور تفصیلی بحث کتب فقہ میں مذکور ہے۔

آیت **وَلَا تَقْبِضُوا مِمَّنْ قَامَ قَانُونٌ** میں مذکور تھا جس میں سب مسلمانوں کے لئے برابر کا بدلہ لینا جائز ہے مگر صبر کرنا افضل و بہتر بتلایا گیا ہے، اس کے بعد کی آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خصوصی خطاب فرما کر صبر کرنے کی تلقین و ترغیب دی گئی ہے، کیونکہ آپ کی شانِ عظیم اور منصبِ بلند کے لئے دوسروں کی نسبت سے وہی زیادہ موزوں و مناسب ہے، اس لئے فرمایا **وَأَصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ**، یعنی آپ تو انتقام کا ارادہ ہی نہ کریں، صبر ہی کو اختیار کریں اور ساتھ ہی یہ بھی بتلادیا کہ آپ کا صبر اللہ ہی کی مدد سے ہوگا، یعنی صبر کرنا آپ کے لئے آسان کر دیا جائے گا۔

آخری آیت میں پھر ایک عام قاعدہ اللہ تعالیٰ کی نصرت و امداد حاصل ہونے کا یہ بتلادیا :-
إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَالَّذِينَ هُمْ مِّنْ حِسْرَتِهِ

جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد ان لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو دو صفتوں کے حامل ہوں، ایک تقویٰ دوسرے احسان، تقویٰ کا حاصل نیک عمل کرنا اور احسان کا مفہوم اس جگہ خلقِ خدا تعالیٰ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا ہی، یعنی جو لوگ شریعت کے تابع اعمالِ صالحہ کے پابند ہوں اور دوسروں کے ساتھ احسان کا معاملہ کرتے ہوں، حق تعالیٰ ان کے ساتھ ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ کی معیت (نصرت) حاصل ہو اس کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے :-

اللہ سورۃ نحل کی تفسیر آج ۲۵ شعبان ۱۳۸۹ھ شبِ شنبہ میں پوری ہوئی۔

وَبِاللَّهِ الْحَمْدُ أَوَّلًا وَآخِرًا وَظَاهِرًا وَبَاطِنًا

سورۃ نحل تمام شد

سُورَةُ بَنِي إِسْرَءِيلَ

سُورَةُ بَنِي إِسْرَءِيلَ

سُورَةُ بَنِي إِسْرَءِيلَ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ مِائَةٌ وَاحِدٌ وَعِشْرَةُ آيَةٍ وَاثْنَا عَشَرَ رُكُوعًا

سورہ بنی اسرائیل مکہ میں اُتری اور اس کی ایک سو گیارہ آیتیں ہیں اور بارہ رکوع

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

سُبْحَنَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِنَ الْمَسْجِدِ

پاک ذات ہے جو لے گیا اپنے بندہ کو راتوں رات مسجد

الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَا الَّذِي بَرَكْنَا حَوْلَهُ

حرام سے مسجد اقصیٰ تک جس کو گھیر رکھا ہے ہماری برکت نے تاکہ

لِنُزِيلَهُ مِنْ ابْنِائِهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ①

و کھلائیں اس کو کچھ اپنی قدرت کے نمونے وہی ہے سنے والا دیکھنے والا۔

خلاصہ تفسیر

وہ ذات پاک ہے جو اپنے بندہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو شب کے وقت مسجد حرام (یعنی مسجد کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (یعنی بیت المقدس) تک جس کے آس پاس (کہ ملک شام ہے) ہم نے (دینی اور دنیوی) برکتیں کر رکھی ہیں (دینی برکت یہ ہے کہ وہاں بکثرت انبیاء مدفون ہیں اور دنیوی برکت یہ ہے کہ وہاں باغات اور نہروں، چشموں اور پیداوار کی کثرت ہے۔ غرض اُس مسجد اقصیٰ تک عجیب طور پر اس واسطے) لے گیا تاکہ ہم ان کو اپنے کچھ عجائبات قدرت دکھلا دیں (جن میں بعض تو خود وہاں کے متعلق ہیں مثلاً اتنی بڑی مسافت کو بہت تھوڑے سے وقت میں طے کر لینا اور سب انبیاء سے ملاقات کرنا اور ان کی باتیں سننا وغیرہ اور بعض آگے کے متعلق ہیں۔ مثلاً آسمانوں پر جانا اور وہاں کے

عجائبات کا مشاہدہ کرنا، بیشک اللہ تعالیٰ بڑے سننے والے بڑے دیکھنے والے ہیں (چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کو سنتے اور احوال کو دیکھتے تھے اس کے مناسب اُن کو یہ خاص امتیاز اور اعزاز بخشا اور اپنے قرب خاص کا وہ مقام عطا کیا جو کسی کو نہیں ملا)

معارف و مسائل

اس آیت میں واقعہ معراج کا بیان ہے جو ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خصوصی اعزاز اور امتیازی معجزہ ہے لفظ اسراری اسرار سے مشتق ہے جسکے لغوی معنی رات کو لیجانا ہیں اس کے بعد کَلِمًا کے لفظ سے صراحت بھی اس مفہوم کو واضح کر دیا اور لفظ لَيْلًا کے نکرہ لانے سے اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ اس تمام واقعہ میں پوری رات بھی صرف نہیں بلکہ رات کا ایک حصہ صرف ہوا ہے مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کا سفر جس کا ذکر اس آیت میں ہے اس کو اسرار کہتے ہیں اور یہاں سے ہے جو سفر آسمانوں کی طرف ہوا اس کا نام معراج ہے اسرار اس آیت کی نفسِ قطعی سے ثابت ہے اور معراج کا ذکر سورہ نجم کی آیات میں ہے اور احادیث متواترہ سے ثابت ہے بَعْدَ لَيْلٍ اس مقام اعزاز و اکرام میں لفظ بَعْدَ لَيْلٍ ایک خاص مجہولیت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ حق تعالیٰ کسی کو خود فرمادیں کہ یہ میرا بند ہے اس سے بڑھ کر کسی بشر کا بڑا اعزاز نہیں ہو سکتا حضرت حسن دہلوی نے خوب فرمایا ہے

بند حسن بعد زبان گفت کہ بندہ تو ام تو زبان خود بگو بندہ تو از کیستی

یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک دوسری آیت میں عِبَادَ اللَّهِ الَّذِينَ يُبْتَغُونَ فرمایا کہ اپنے مقبولان بارگاہ کا اعزاز بڑھانا مقصود ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انسان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ اللہ کا عبدِ کامل بن جائے اس لئے کہ خصوصی اعزاز کے مقام پر آپ کی بہت سی صفات کمال میں سے صفت عبدیت کو اختیار کیا گیا اور اس لفظ سے ایک بڑا فائدہ بھی مقصود ہے کہ اس حیرت انگیز سفر سے جس میں اول سے آخر تک سب فوق العادات معجزات ہیں کسی کو خدائی کا دم نہ ہو جائے جیسے عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھانے جانے سے عیسائیوں کو دھوکہ لگا ہے اس لئے لفظ عَبْدٌ کہہ کر یہ بتلادیا کہ ان تمام صفات و کمالات اور معجزات کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے ہی ہیں خدا نہیں۔ معراج کے جسمانی ہونے پر قرآن | قرآن مجید کے ارشادات اور احادیث متواترہ سے جگہ ذکر آئے آتا ہے ثابت ہے سنت کے دلائل اور اجماع | کہ اسرار و معراج کا تمام سفر صرف روحانی نہیں تھا بلکہ جسمانی تھا جیسے عام انسان سفر کرتے ہیں قرآن کریم کے پہلے ہی لفظ سُجَّدَ میں اس طرف اشارہ موجود ہے کیونکہ یہ لفظ تعجب اور کسی عظیم الشان امر کے لئے استعمال ہوتا ہے اگر معراج صرف روحانی بطور خواب کے ہوتی تو اس میں کوئی عجیب بات ہے خواب تو ہر مسلمان بلکہ ہر انسان دیکھ سکتا ہے کہ میں آسمان پر گیا فلاں

فلاں کام کئے۔

دوسرا اشارہ لفظ جَد سے اسی طرف ہے کیونکہ عِبْد صرف روح نہیں بلکہ جسم و روح کے مجموعہ کا نام ہے اس کے علاوہ۔

واقعہ معراج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اُمّ ہانی رضی اللہ عنہا کو بتلایا تو انہوں نے حضور کو یہ خبر دیا کہ آپ اس کا کسی سے ذکر نہ کریں ورنہ لوگ اور زیادہ تکذیب کریں گے اگر معاملہ خواب کا ہوتا تو اس میں تکذیب کی کیا بات تھی۔

پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں پر اس کا اظہار کیا تو کفار مکہ نے تکذیب کی اور مذاق اڑایا یہاں تک کہ بعض تو مسلم اس خبر کو شکر مقرر ہو گئے اگر معاملہ خواب کا ہوتا تو ان معاملات کا کیا امکان تھا اور یہ بات اس کے منافی نہیں کہ آپ کو اس سے پہلے اور بعد میں کوئی معراج روحانی بصورت خواب بھی ہوئی ہو جو ہر امت کے نزدیک آیت قرآن **وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي آتَيْنَاكَ** میں **رُؤْيَا** سے مراد رویت ہے مگر اس کو بلفظ **رُؤْيَا** رجو اکثر خواب دیکھنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے) تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس معاملہ کو تشبیہ کے طور پر ڈرڈیا کہا گیا ہو کہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی خواب دیکھ لے اور اگر رُؤْيَا کے معنی خواب ہی کے لئے جائیں تو یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ واقعہ معراج جسمانی کے علاوہ اس سے پہلے یا پیچھے یہ معراج روحانی بطور خواب بھی ہوئی ہو اس لئے حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عائشہؓ ام المومنین رضی اللہ عنہما سے جو اس کا واقعہ خواب ہونا منقول ہے وہ بھی اپنی جگہ صحیح ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ معراج جسمانی نہ ہوئی ہو۔

تفسیر قرطبی میں ہے کہ احادیث اسرار کی متواتر ہیں اور نقاش نے میں صحابہ کرام کی روایات اس باب میں نقل کی ہیں اور قاضی عیاض نے شفا میں اور زیادہ تفصیل دی ہے۔ (قرطبی)

اور امام ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں ان تمام روایات کو پوری حرج و تعدیل کے ساتھ نقل کیا ہے پھر کہیں صحابہ کرام کے اسماء ذکر کئے ہیں جن سے یہ روایات منقول ہیں ان کے اسماء یہ ہیں۔ حضرت عمر ابن خطاب علی مرتضیٰ ابن مسعود۔ ابوذر غفاری۔ مارک بن صعصعہ۔ ابو ہریرہ۔ ابو سعید۔ ابن عباس۔ شداد بن ادس۔ ابی بن کعب۔ عبد الرحمن بن قریظ۔ ابو الجحیم۔ ابو ایلہ۔ عبد اللہ بن عمر۔ جابر بن عبد اللہ۔ حذیفہ بن یمان۔ بکر بن عبد ربیع۔ ابو ایوب انصاری۔ ابو امامہ۔ سمرہ بن جندب۔ ابو انصاری۔ صہیب بن الرومی۔ ام ہانی۔ عائشہ۔ ام المؤمنین۔ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہم اجمعین اس کے بعد ابن کثیر نے فرمایا۔

فَحَدِيثُ الْأَسْرَاءِ أَجْمَعِ

المسلمون واعرض عنه الزنادقة
اجماع ہے صرف محمد و زید بنی لوگوں نے اس

والملاحدون۔ (ابن کثیر) کو نہیں مانا۔

مختصر واقعہ معراج ابن کثیر کی روایت سے

امام ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں آیت مذکورہ کی تفسیر اور احادیث متعلقہ کی تفصیل بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ حق بات یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سفر اسرار بیداری میں پیش آیا خواب میں نہیں بلکہ مکہ مکرمہ سے بیت المقدس تک یہ سفر برافقہ پر ہوا۔ جب دروازہ بیت المقدس پر پہنچے تو برافقہ کو دروازہ کے قریب باندھ دیا اور آپ مسجد بیت المقدس میں داخل ہوئے اور اس کے قباہ کی طرف تہیۃ المسجد کی دو رکعتیں ادا فرمائیں اس کے بعد ایک زینہ لایا گیا جس میں نیچے سے اوپر جانے کے درجے بنے ہوئے تھے اس زینہ کے ذریعہ آپ پہلے آسمان پر تشریف لے گئے اس کے بعد باقی آسمانوں پر تشریف لے گئے (اس زینہ کی حقیقت تو اللہ تعالیٰ کو ہی معلوم ہے کہ کیا اور کیسا تھا) جہاں بھی زینہ کی بہت سی قسمیں دنیا میں رائج ہیں ایسے زینے بھی ہیں جو حرکت میں ہفت کی صورت کے زینے بھی ہیں اس جزائے زینہ کے متعلق کسی شک و شبہ میں پڑنے کا کوئی مقام نہیں ہر آسمان میں وہاں کے فرشتوں نے آپ کا استقبال کیا اور ہر آسمان میں ان انبیاء علیہم السلام سے ملاقات ہوئی جن کا مقام کسی معین آسمان میں ہے مثلاً چھٹے آسمان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ساتویں میں حضرت خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی پھر آپ ان تمام انبیاء علیہم السلام کے مقامات سے بھی آگے تشریف لے گئے اور ایک ایسے میدان میں پہنچے جہاں قلم تقدیر کے کھینچنے کی آواز سنائی دے رہی تھی اور آپ نے سدرۃ المنتہیٰ کو دیکھا جس پر اللہ جل شانہ کے حکم سے سونے کے پردے اور مختلف رنگ کے پردے گر رہے تھے اور جس کو اللہ کے فرشتوں نے گھیرا ہوا تھا اسی جگہ حضرت جبریل امین کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اصلی شکل میں دیکھ جن کے چہرہ سوز و غم تھے اور وہیں پر ایک رفعت بزرگ کا دیکھا جس نے حق کو گھیرا ہوا تھا۔ رفعت بزرگ ہر رنگ کی پانکی اور آپ نے بیت المعمور کو بھی دیکھا جس کا پاس بانی کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام دیوار سے لگائے بیٹھے ہوئے تھے اس بیت المعمور میں روزانہ ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں جس کی بار بار دوبارہ دعا ہونے کی قیامت تک نہیں آتی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت اور دوزخ کا بچشم خود معائنہ فرمایا۔ اس وقت آپ کی امت پر اول پچاس نمازوں کے فرض ہونے کا حکم ملا پھر تھنیف کر کے پانچ کر دیگئیں اس سے تمام عبادات کے اندر نماز کی خاص اہمیت اور فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

اس کے بعد آپ واپس بیت المقدس میں اترے اور جن انبیاء علیہم السلام کیساتھ مختلف آسمانوں میں ملاقات ہوئی تھی وہ بھی آپ کے ساتھ اترے (گویا آپ کو نصرت کرنے کے لئے بیت المقدس تک ساتھ آئے) اس وقت آپ نے نماز کا وقت ہو جانے پر سب انبیاء علیہم السلام کے ساتھ نماز ادا فرمائی یہ بھی احتمال ہے کہ یہ نماز اسی دن صبح کی نماز ہو۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ امامت انبیاء کا واقعہ بعض حضرات کے نزدیک آسمان پر جانے سے پہلے پیش آیا ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ واقعہ واپسی کے بعد ہوا کیونکہ

آسمانوں پر انبیاء علیہم السلام سے ملاقات کے واقعہ میں یہ بقول ہے کہ سب انبیاء سے جبریل امین نے آپ کا تعارف کرایا۔ اگر واقعہ امامت پہلے ہو چکا ہوتا تو یہاں تعارف کی ضرورت نہ ہوتی اور یوں بھی ظاہر ہے کہ اس سفر کا اصل مقصد ملازمتی میں جانے کا تھا پہلے اسی کو پورا کرنا اقرب معلوم ہوتا ہے پھر جب اس اصل کام سے فراغت ہوئی تو تمام انبیاء علیہم السلام آپ کے ساتھ مشایعت (رخصت) کے لئے بیت المقدس تک آئے اور آپ کو جبریل امین کے اشارہ سے سب کا امام بنا کر آپ کی سیادت اور سب پر فضیلت کا عملی ثبوت دیا گیا۔

اس کے بعد آپ بیت المقدس سے رخصت ہوئے اور براق پر سوار ہو کر اندھیرے وقت میں مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

واقعہ حیرانہ کے متعلق تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ حافظ ابو نعیم اسماعیلی نے اپنی کتاب دلائل النبوة میں محمد بن عمر واندلسی کی سند سے روایت محمد بن کعب قرظی یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہ روم قیصر کے پاس اپنا نام مبارک دیکر حضرت وحید ابن خلیفہ رضی اللہ عنہ کو بھیجا اس کے بعد حضرت وحید رضی اللہ عنہ کے خط پہنچانے اور شاہ روم تک پہنچنے اور اس کے صاحب عقل و فراست ہونے کا تفصیلی واقعہ بیان کیا۔ جو صحیح بخاری اور حدیث کی سب معتبر کتب میں موجود ہے جس کے آخر میں ہے کہ شاہ روم ہر قل نے نامہ مبارک پڑھنے کے بعد آؤفتا صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کی تحقیق کرنے کے لئے عرب کے ان لوگوں کو جمع کیا جو اس وقت ان کے ملک میں بغرض تجارت آئے ہوئے تھے شاہی حکم کے مطابق ابوسفیان ابن حرب اور ان کے رفقاء جو اس وقت مشہور تجارتی قافلہ لے کر شام میں آئے ہوئے تھے وہ حاضر کئے گئے شاہ ہر قل نے ان سے وہ سوالات کئے جنکی تفصیل صحیح بخاری و مسلم وغیرہ میں موجود ہے۔ ابوسفیان کی دلی خواہش یہ تھی کہ وہ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کچھ ایسی باتیں بیان کریں جن سے آپ کی حقارت اور بے حیثیت ہونا ظاہر ہو مگر ابوسفیان کہتے ہیں کہ مجھے اپنے اس ارادہ سے کوئی چیز اس کے سوا مانع نہیں تھی کہ مبادا میری زبان سے کوئی ایسی بات نکل جائے جس کا جھوٹ ہونا کھل جائے اور میں بادشاہ کی نظر سے گر جاؤں اور میرے ساتھی بھی ہمیشہ مجھے جھوٹا ہونے کا طعنہ دیا کریں۔ البتہ مجھے اس وقت خیال آیا کہ اس کے سامنے واقعہ معراج بیان کروں جس کا جھوٹ ہونا

صحیح واندلسی ر کور وایت حدیث میں محدثین نے شیخ کہا لیکن امام ابن کثیر جیسے نقاط محدث نے ان کی روایت کو نقل کیا ہے اس لئے کہ اس معاملہ کا تقاضا سلطان و حرام نہیں اور ایسے تاریخی معاملات میں انکی روایت معتبر ہے۔ ۱۲۔ منہ

بادشاہ خود سمجھ لیگا۔ تو میں نے کہا کہ میں ان کا ایک معاملہ آپ سے بیان کرتا ہوں جس کے متعلق آپ خود معلوم کر لینگے کہ وہ جھوٹ ہے۔ ہرقل نے پوچھا وہ کیا واقعہ ہے۔ ابوسفیان نے کہا کہ یہ مدعی نبوت یہ کہتے ہیں کہ وہ ایک رات میں مکہ مکرمہ سے نکلے اور آپ کی اس مسجد بیت المقدس میں پہنچے اور پھر اسی رات میں صبح سے پہلے مکہ مکرمہ میں ہمارے پاس پہنچ گئے۔

ایلیا (بیت المقدس) کا سب سے بڑا عالم اس وقت شاہ روم ہرقل کے سر ہانے پر قریب کھڑا ہوا تھا اس نے بیان کیا کہ میں اس رات سے واقف ہوں۔ شاہ روم اس کی طرف متوجہ ہوا اور پوچھا کہ آپ کو اسکا علم کیسے اور کیونکر ہوا اس نے عرض کیا کہ میری عادت تھی کہ میں رات کو اس وقت تک ہوتا نہیں تھا جب تک بیت المقدس کے تمام دروازے بند نہ کر دوں۔ اس رات میں نے حسب عادت تمام دروازے بند کر دیئے مگر ایک دروازہ مجھ سے بند نہ ہو سکا تو میں نے اپنے عملہ کے لوگوں کو بلایا انھوں نے ملکہ کو شیش کی مگر وہ ان سے بھی بند نہ ہو سکا دروازے کے کواڑ اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ہم کسی پہاڑ کو ہلا رہے ہیں میں نے عاجز ہو کر کارگیروں اور بنباروں کو بلوایا انھوں نے دیکھ کر کہا کہ ان کواڑوں کے اوپر دروازہ کی عمارت کا بوجھ ٹپ گیا ہے اب صبح سے پہلے اس کے بند ہونے کی کوئی تدبیر نہیں صبح کو ہم دیکھیں گے کہ کس طرح کیا جاوے۔ میں مجبور ہو کر لوٹ آیا اور دونوں کواڑ اس دروازے کے کھلے رہے۔ صبح ہوتے ہی میں پھر اس دروازہ پر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ دروازہ مسجد کے پاس ایک پتھر کی یٹھان میں روڑن کیا ہوا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہاں کوئی جانور باندھ دیا گیا ہے اس وقت میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا کہ آج اس دروازہ کو اللہ تعالیٰ نے شاید اس لئے بند ہونے سے روکا ہے کہ کوئی نبی یہاں آنے والے تھے اور پھر بیان کیا کہ اس رات آپ نے ہماری مسجد میں نماز ہی پڑھی ہے اس کے بعد اور تفصیلات بیان کی ہیں (ابن کثیر ص ۱۳ ج ۳)

اسرار و معراج | امام فخری نے اپنی تفسیر میں فرمایا کہ معراج کی تاریخ میں روایات بہت مختلف ہیں کی تاریخ | موسیٰ بن عقبہ کی روایت یہ ہے کہ یہ واقعہ ہجرت مدینہ سے چھ ماہ قبل پیش آیا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت خدیجہ ام المؤمنین کی وفات نمازوں کی فرضیت نازل ہونے سے پہلے ہو چکی تھی امام زہری فرماتے ہیں کہ حضرت خدیجہ کی وفات کا واقعہ بعثت نبوی کے سات سال بعد ہوا ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ واقعہ معراج بعثت نبوی سے پانچ سال بعد ہوا ہے۔ ابن اسحق کہتے ہیں کہ واقعہ معراج اس وقت پیش آیا جبکہ اسلام عام قبائل عرب میں پھیل چکا تھا ان تمام روایات کا حاصل یہ ہے کہ واقعہ معراج ہجرت مدینہ سے کئی سال پہلے کا ہے۔

حرلی کہتے ہیں کہ واقعہ اسرار و معراج ربیع الثانی کی تالیسویں شب میں ہجرت سے ایک سال پہلے ہوا ہے اور ابن قاسم ذہبی کہتے ہیں کہ بعثت سے اٹھارہ مہینے کے بعد یہ واقعہ پیش آیا ہے۔ حضرت

محدثین نے روایات مختلفہ ذکر کرنے کے بعد کوئی فیصلہ کن چیز نہیں لکھی اور مشہور عام طور پر یہ ہے کہ ماہِ رجب کی ستائیسویں شب، شبِ معراج ہے واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ | حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ دنیا کی سب سے پہلی مسجد کونسی ہے تو آپ نے فرمایا کہ ”مسجد حرام“ پھر میں نے عرض کیا کہ اس کے بعد کونسی تو آپ نے فرمایا ”مسجد اقصیٰ“ میں نے دریافت کیا کہ ان دونوں کے درمیان کتنی مدت کا فاصلہ ہے تو آپ نے فرمایا چالیس سال پھر فرمایا کہ مسجد کی ترتیب تو یہ ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے ساری زمین کو مسجد بنا دیا ہے جس جگہ نماز کا وقت آجائے وہیں نماز ادا کر لیا کرو۔ (رواہ مسلم)

امام تفسیر مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کی جگہ کو پوری زمین سے دو ہزار سال پہلے بنایا ہے اور اس کی بنیادیں ساتویں زمین کے اندر نکلتی ہوئی ہیں اور مسجد اقصیٰ کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے بنایا ہے (رواہ النسائی باسناد صحیح عن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما) (تفسیر قرطبی ص ۱۳ ج ۴)

اور مسجد حرام اس مسجد کا نام ہے جو بیت اللہ کے گھر دینی ہوئی ہے اور بعض اوقات پورے حرم کو بھی مسجد حرام سے تعبیر کیا جاتا ہے اس دوسرے معنی کے اعتبار سے دو روایتوں کا یہ تعارض بھی رفع ہو جاتا ہے کہ بعض روایات میں آپ کا اسرار کے لئے تشریف لیجانا حضرت ام ہانی کے مکان سے منقول ہے اور بعض میں حطیم بیت اللہ سے اگر مسجد حرام کے عام معنی لئے جائیں تو یہ مستبعد نہیں کہ پہلے آپ ام ہانی رضی اللہ عنہا کے مکان میں ہوں وہاں سے چل کر حطیم کعبہ میں تشریف لائے پھر وہاں سے سفر اسرار کی ابتدا ہوئی واللہ اعلم۔

مسجد اقصیٰ اور ملک | آیت میں بَرَكْنَا حَوْلَهُ میں حَوْل سے مراد پوری زمین شام ہے ایک حدیث شام کی برکات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عرش سے دریائے فرات تک مبارک زمین بنائی ہے اور اس میں سے فلسطین کی زمین کو تقدس خاص عطا فرمایا ہے (روح المعانی)

اس کی برکات دینی بھی ہیں اور دنیاوی بھی۔ دینی برکات تو یہ ہیں کہ وہ تمام انبیاء سابقین کا قبلہ اور تمام انبیاء کا مسکن و مدفن ہے اور دنیوی برکات اس کی زمین کا سبز ہونا اور اس میں عمدہ چشے، نہریں، باغات وغیرہ کا ہونا ہے۔

حضرت معاذ بن جبل فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے ملک شام تو تمام شہروں میں سے میرا منتخب خطہ ہے اور میں تیری طرف اپنے منتخب بندوں کو بھیجے گا۔ (قرطبی) اور مسند احمد میں حدیث ہے کہ دجال ساری زمین میں پھیرے گا مگر چار مسجدوں تک اس کی رسائی نہ ہوگی۔

مسجد مدینہ۔ مسجد مکہ مکرمہ۔ مسجد اقصیٰ۔ مسجد طور۔

وَآتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَجَعَلْنَاهُ هُدًى لِّبَنِي

اور دی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور کیا اُس کو ہدایت بنی اسرائیل

إِسْرَآءِيلَ إِلَّا تَتَّخِذُوا مِنْ دُونِي وَكِيلًا ۝۲

کے واسطے کہ نہ ٹھہراؤ میرے سوا کسی کو کارساز

ذَرِّ يَكُ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا

تم جو اولاد ہو اُن لوگوں کی جن کو چڑھایا ہم نے نوح کے ساتھ بے شک وہ تھا بندہ

شَكُورًا ۝۳

حق ماننے والا۔

خَلَاَصَةُ تَفْسِير

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب (یعنی توریت) دی اور ہم نے اُس کو بنی اسرائیل کے لئے (آلہ) ہدایت بنایا (جس میں) اور احکام کے ساتھ یہ توحید کا عظیم الشان حکم بھی تھا کہ تم میرے سوا (اپنا) کوئی کارساز مت قرار دو، اے اُن لوگوں کی نسل جن کو ہم نے نوح (علیہ السلام) کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا تھا (ہم تم سے خطاب کر رہے ہیں تاکہ اس نعمت کو یاد کرو کہ اگر ہم اُن کو کشتی پر سوار کر کے نہ بچاتے تو آج تم اُن کی نسل کہاں ہوتے اور نعمت کو یاد کر کے اس کا شکر کرو جس کی بڑی فرد توحید ہے اور وہ نوح (علیہ السلام) بڑے شکر گزار بندہ تھے (پس جب انبیاء شاکر کرتے رہے تو تم کیسے اُس کے تارک ہو سکتے ہو۔

وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَآءِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ

اور صاف کہہ سنایا ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں کہ تم خرابی کرو گے

فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوقًا كَبِيرًا ۝۴

دو بار اور سرکشی کرو گے بڑی سرکشی پھر جب

جَاءَ وَعْدُ أُولَٰئِكَ بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَا أُولِي بَأْسٍ

آیا پہلا وعدہ بھیجے ہم نے تم پر اپنے بندے سخت لڑائی

سَدِيدٍ فَجَاسُوا خِلَالَ الدِّيَارِ ۚ وَكَانَ وَعْدًا

والے پھر پھیل پڑے شہروں کے بیچ اور وہ وعدہ

مَفْعُولًا ۝ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنَاكُمْ

ہونا ہی تھا پھر ہم نے پیروی تمہاری باری ان پر اور قوت دی تم کو

بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَجَعَلْنَاكُمْ أَكْثَرَ نَفِيرًا ۖ ۝ إِنَّا أَحْسَنُكُمْ

مال سے اور بیوں سے اور اس سے زیادہ کر دیا تمہارا لشکر اگر بھلائی کی تم نے

أَحْسَنُكُمْ لَا تَنْفُسُكُمْ ۚ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلِمَ ۚ وَإِذَا جَاءَ

تو بھلا کیا اپنا اور اگر بُرائی کی تو اپنے لئے پھر جب پہنچا

وَعْدُ الْآخِرَةِ لِيَسُوءَ ۙ وَجُوهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ

وعدہ دوسرا بھیجے اور بندے کہ اُداس کر دیں تمہارے منہ اور گھس جائیں مسجد میں

كَمَا دَخَلُوهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَلِيُتَبِّرُوا مَا عَلَوْا تَتْبِيرًا ۝

جیسے گھس گئے تھے پہلی بار اور خراب کر دیں جس جگہ غائب ہوں پوری خرابی

عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يَسَّرَ لَكُمُ الدَّخَلَ ۚ وَإِنْ وَعْدُكُمْ فَكُلُوا

بمید نہیں تمہارے رب سے کہ رحم کرے تم پر اور اگر پھر وہی کرو گے تو ہم پھر وہی کریں گے اور

جَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ حَصِيرًا ۝

کیا ہے ہم نے دوزخ کو قید خانہ کافروں کا۔

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں (خواہ تو ریت میں یا دوسرے انبیاء بنی اسرائیل کے صحیفوں میں) یہ بات (بطور پیشین گوئی کے) بتلا دی تھی کہ تم سرزمینِ شام میں دو مرتبہ (گناہوں کی کثرت سے) خرابی کرو گے (ایک مرتبہ شریعت موسویہ کی مخالفت اور دوسری مرتبہ شریعت عیسویہ کی مخالفت) اور دوسروں پر بھی بڑا زور چلائے لگو گے (یعنی ظلم و زیادتی کرو گے)

اس طرح اَلْمُفْسِدَاتِ میں حقوق اللہ کے ضائع کرنے کی طرف اور اَلْمُتَعَلِّقَاتِ میں حقوق العباد و منافع کرنے کی طرف اشارہ ہے اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ دونوں مرتبہ سخت سزاؤں میں مبتلا کئے جاؤ گے، پھر جب ان دو مرتبہ میں سے پہلی مرتبہ کی معیاد آئے گی تو ہم تم پر اپنے ایسے بندوں کو مسلط کر دیں گے جو بڑے جنگجو ہوں گے پھر وہ (تمہارے) گھروں میں گھس پڑیں گے اور تم کو قتل و قید اور غارت کر دیں گے اور یہ وعدہ سزا ایک وعدہ ہے جو ضرور ہو گا کہ رہے گا پھر جب ہم اپنے کئے پر نادم و تائب ہو جاؤ گے تو ہم تم پر ان پر غلبہ کر دیں گے کہ جو قوم ان پر غالب آئے گی وہ تمہاری حامی ہو جائے گی اس طرح تمہارے دشمن اس قوم سے اور تم سے دونوں سے مغلوب ہو جائیں گے (اور مال اور بیٹوں سے جو قید اور غارت کئے گئے تھے) ہم تمہاری امداد کریں گے (یعنی یہ چیزیں تمکو واپس مل جائیں گی جن سے تمہیں قوت پہونچے گی) اور ہم تمہاری جماعت (یعنی تابعین) کو بڑھا دیں گے (پس جاہ و مال اور اولاد و متبعین سب میں ترقی ہوگی اور اس کتاب میں بطور نصیحت یہ بھی لکھا تھا کہ) اگر (اب آئندہ) اچھے کام کرتے رہو گے تو اپنے ہی نفع کے لئے اچھے کام کرو گے (یعنی دنیا و آخرت میں اس کا نفع حاصل ہوگا) اور اگر (پھر) تم بے کام کرو گے تو بھی اپنے ہی لئے ابرائی کرو گے یعنی پھر سزا ہوگی چنانچہ ایسا ہی ہوا جسکا آگے بیان ہے کہ پھر جب اذکورہ دو مرتبہ کے فساد میں سے (آخری مرتبہ کا وقت آئے گا) اور اس وقت تم شریعت عیسویہ کی مخالفت کرو گے، تو پھر ہم دوسروں کو تم پر مسلط کر دیں گے تاکہ وہ تمہیں مار مار کر تمہارا چہرہ بگاڑ دیں اور جس طرح وہ (پہلے) لوگ مسجد ربیت المقدس میں (لوٹ مار کے ساتھ) لگے تھے یہ (پہلے) لوگ بھی اس میں گھس پڑیں گے اور جس جس چیز پر ان کا زور چلے سب کو (ہلاک و) برباد کر ڈالیں۔ اور اس کتاب میں یہ بھی لکھا تھا کہ اگر اس دوسری مرتبہ کے بعد جب دور شریعت محمدیہ کا ہو تو مخالفت و تعصیت سے باز آکر شریعت محمدیہ کا اتباع کر لو تو، عجب نہیں (یعنی امید) بمعنی وعدہ ہے، کہ تمہارا رب تم پر رحم فرماوے اور تم کو ادبار و ذلت سے نکال دے، اور اگر تم پھر وہی شرارت کرو گے تو ہم بھی پھر وہی سزا کا برتاؤ کریں گے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں انھوں نے آپ کی مخالفت کی تو پھر قتل و قید اور ذلیل ہوئے یہ تو دنیا کی سزا ہو گئی، اور آخرت میں ہم نے جہنم کو (ایسے) کافروں کا جیلخانہ بنا ہی رکھا ہے۔

اس سے پہلی آیات جَعَلْنَا هَذِي لِبَنِي إِسْرَءِیْلَ میں احکام شرعیہ اور

رابط آیات

ہدایات الہیہ کے اتباع و اطاعت کی ترغیب تھی اور مذکورہ آیات میں ان کی مخالفت سے مزہیب و زجر کا مضمون ہے ان آیات میں بنی اسرائیل کے دو واقعے عبرت و نصیحت کے لئے ذکر کئے گئے کہ انھوں نے ایک مرتبہ معاصی اور حکم ربانی کی مخالفت میں انہماک کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دشمنوں کو ان پر مسلط کر دیا جنھوں نے ان کو تباہ کیا پھر ان کو کچھ تنبیہ ہو گئی اور شرارت

کم کر دی تو سنبھل گئے مگر کچھ عرصہ کے بعد پھر وہی شرارتیں اور بد اعمالیاں انہیں پھیل گئیں تو پھر اللہ تعالیٰ نے اُن کو اُن کے دشمن کے ہاتھ سے سزا دلوائی قرآن کریم میں دو واقعوں کا ذکر ہے مگر تاریخ میں اس طرح کے چھ واقعات مذکور ہیں۔

پہلا واقعہ | حضرت سلیمان علیہ السلام بانی مسجد انبسی کی وفات کے کچھ عرصہ کے بعد پیش آیا کہ بیت المقدس کے حاکم نے بے دینی اور بد عملی اختیار کر لی تو مگر کا ایک بادشاہ اس پر چڑھا آیا اور بیت المقدس کا مسلمان سونے چاندی کا لوٹ کر لے گیا مگر شہر اور مسجد کو مہدم نہ نہیں کیا۔

دوسرا واقعہ | اس سے تقریباً چار سو سال بعد کا ہے کہ بیت المقدس میں بسند واسے بعض یہودیوں نے بت پرستی شروع کر دی اور باقیوں میں نا اتفاقی اور باہمی جھگڑا سے ہوئے لگے اسکی غیبت سے پھر مصر کے کسی بادشاہ نے ان پر چڑھائی کر دی اور کسی قدر شہر اور مسجد کی عمارت کو بھی نقصان پہنچایا پھر انکی حالت کچھ سنبھل گئی۔

تیسرا واقعہ | اس کے چند سال بعد جب بخت نصر شاہ بابل نے بیت المقدس پر چڑھائی کر دی اور شہر کو فتح کر کے بہت سامان لوٹ لیا اور بہت سے لوگوں کو قیدی بنا کر لے گیا اور پہلے بادشاہ کے خاندان کے ایک فرد کو اپنے قائم مقام کی حیثیت سے اس شہر کا حاکم بنا دیا۔

چوتھا واقعہ | اس نے بادشاہ نے جو بت پرست اور بد عمل تھا بخت نصر سے بغاوت کی تو بخت نصر دوبارہ چڑھ آیا اور کشت و خون اور قتل و غارت کی کوئی حد نہ ٹیٹھ میں آگ لگا کر میدان کر دیا یہ حادثہ تعمیر مسجد سے تقریباً چار سو پندرہ سال کے بعد پیش آیا اس کے بعد یہودیوں نے جلا وطن ہو کر بابل چلے گئے جہاں نہایت ذلت و خواری سے رہتے ہوئے ستر سال گزر گئے اس کے بعد شاہ ایران نے شاہ بابل پر چڑھائی کر کے بابل فتح کر لیا پھر شاہ ایران کو ان جلا وطن یہودیوں پر رحم آیا اور انکو واپس ملک شام میں پہنچا دیا اور ان کا لوٹا ہوا سامان بھی واپس کر دیا اب یہودی اپنے اعمال بد اور مباحی سے تائب ہو چکے تھے یہاں نئے سرے سے آباد ہوئے تو شاہ ایران کے تعاد ان سے پھر مسجد اقصیٰ کو سابق نمونہ کے مطابق بنا دیا۔

پانچواں واقعہ | یہ پیش آیا کہ جب یہودیوں کو یہاں اطمینان اور آسودگی دوبارہ حاصل ہو گئی تو اپنے مانع کو قبول کئے اور پھر بد کاری اور بد اعمالی میں ہنمک ہو گئے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے ایک سو ستر سال پہلے یہ واقعہ پیش آیا کہ جس بادشاہ نے انطاکیہ آباد کیا تھا اس نے چڑھائی کر دی اور چالیس ہزار یہودیوں کو قتل کیا چالیس ہزار کو قیدی اور غلام بنا کر اپنے ساتھ لے گیا اور مسجد کی بھی بہت بڑی مٹی کی مگر عمارت مسجد کی بنی گئی مگر پھر اس بادشاہ کے جانشینوں نے شہر اور مسجد کو بادل میدان کر دیا اس کے کچھ عرصہ کے بعد بیت المقدس پر سلاطین روم کی حکومت ہو گئی انھوں نے مسجد کو پھر درست کیا اور اس کے آٹھ سال بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔

چھٹا واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صعود اور رفع جسمانی کے چالیس برس بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ یہودیوں نے اپنے حکمران سلاطین روم سے بغاوت اختیار کر لی رومیوں نے پھر شہر اور مسجد کو تباہ کر کے وہی حالت بنادی جو پہلے تھی اس وقت کے بادشاہ کا نام طیطس تھا جو نہ یہودی کی تختہ نہ نصرانی کیونکہ اس کے بہت روز کے بعد قسطنطین اول عیسائی ہوا ہے اور اس کے بعد سے حضرت عثمان خطابؓ کے زمانہ تک یہ مسجد ویران پڑی رہی یہاں تک کہ آپ نے اس کی تعمیر کرائی۔ یہ چھ واقعات تفسیر بیان القرآن میں بحوالہ تفسیر حقانی لکھے گئے ہیں۔

اب یہ بات کہ قرآن کریم نے جن دو واقعات کا ذکر کیا ہے وہ ان میں سے کون سے ہیں اس کی قطعی تعیین تو مشکل ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ انہیں سے جو واقعات زیادہ سنگین اور بڑے ہیں جنہیں یہودی شراوتیں بھی زیادہ ہوئیں اور سہل سمجھتی تھیں ان پر محمول کیا جائے اور وہ چوتھا اور چھٹا واقعہ ہے۔ تفسیر قرطبی میں یہاں ایک طویل حدیث مرفوعہ بروایت حذیفہ رضی اللہ عنہ نقل کی ہے اس سے بھی اس کی تعیین ہوتی ہے کہ ان دو واقعات سے مراد چوتھا اور چھٹا واقعہ ہے اس طویل حدیث کا ترجمہ یہ ہے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ بیت المقدس اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑی عظیم القدر مسجد ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ دنیا کے سب گھروں میں ایک ممتاز عظمت والا گھر ہے جسکو اللہ تعالیٰ نے سلیمان بن داؤد علیہما السلام کے لئے سونے چاندی اور جواہرات یا قوت و زور سے بنایا تھا اور یہ اس طرح کہ جب سلیمان علیہ السلام نے اس کی تعمیر شروع کی تو حق تعالیٰ نے جنات کو ان کے تالک کر دیا جنات نے یہ تمام جواہرات اور سونے چاندی جمع کر کے ان سے مسجد بنائی۔ حضرت حذیفہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ بیت المقدس سے یہ سونا چاندی اور جواہرات کہاں اور کس طرح گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور گناہوں اور بد اعمالیوں میں مبتلا ہو گئے انبیاء علیہم السلام کو قتل کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر عذاب فرمایا۔ بادشاہ کو سلاطین کو دیا جو بھوسے تھا اس نے سات سو برس بیت المقدس پر حکومت کی اور قرآن کریم میں بیت فِذا جَاءَ وَ عَصَا اُولٰٓئِہِمْ اٰمَنَّا عَلٰی کُلِّ عِبَادِ اَلنَّاسِ اُولٰٓئِہِمْ بَاۡسٌ مِّنْکَ بَلَدٌ سے یہی واقعہ مراد ہے۔ بخت نصر کا لشکر مسجد قدس میں داخل ہوا مردوں کو قتل اور عورتوں بچوں کو قید کیا اور بیت المقدس کے تمام اموال اور سونے چاندی جواہرات کو ایک لاکھ ستر ہزار ٹاڑیوں میں بھر کر لے گیا اور اپنے ملک بابل میں رکھ لیا۔ اور سو برس تک ان بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا کر طرح طرح کی بامشقت خدمت ذلت کے ساتھ ان سے لیتا رہا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے فارس کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ کو اس کے مقابلے کے لئے کھڑا کر دیا جس نے بابل کو فتح کیا اور باقیماندہ بنی اسرائیل کو تختہ کی قید سے آزاد کر لیا اور اپنے اموال وہ

بیت المقدس سے لایا تھا وہ سب واپس بیت المقدس میں پہنچا دیئے اور پھر بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ اگر تم پھر نافرمانی اور گناہوں کی طرف لوٹ جاؤ گے تو ہم بھی پھر قتل و قید کا عذاب تم پر لوٹا دیں گے آیت قرآن عسی ربکم ان یشحکم و ان عذابکم عندنا سے یہی مراد ہے۔

پھر جب بنی اسرائیل بیت المقدس میں لوٹ آئے (اور سب اموال و سامان بھی قبضہ میں آگیا، تو پھر معاصی اور بد اعمالیوں کی طرف لوٹ گئے اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان پر شاہِ روم قیصر کو تسلط کر دیا آیت فَاِذَا جَاءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسْكُوْا وُجُوْهُكُمْ سے یہی مراد ہے شاہِ روم نے ان لوگوں سے بڑی اور بڑی دونوں راستوں پر جنگ کی اور بہت سے لوگوں کو قتل اور قید کیا اور پھر تمام ان اموال بیت المقدس کو ایک لاکھ ستر ہزار گالیوں پر لا کر لے گیا اور اپنے کنیسہ الذہب میں رکھ دیا یہ سب اموال ابھی تک وہیں ہیں اور وہیں رہیں گے جہاں تک کہ حضرت ہمدانی پھر بنی اسرائیل کو بیت المقدس میں ایک لاکھ ستر ہزار کشتیوں میں واپس لائیں گے اور اسی جگہ اللہ تعالیٰ تمام اولین و آخرین کو جمع کر دیں گے۔ (الحديث بطوله رواد القبطي في تفسيره)

بیان القرآن میں ہے کہ دو واقعے جنگا ذکر قرآن میں آیا ہے اس سے مراد دو شریعتوں کی مخالفت ہے پہلی شریعت موسوی کی مخالفت اور پھر عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد شریعت عیسویہ کی مخالفت اس طرح پہلی مخالفت میں وہ سب واقعات درج ہو سکتے ہیں جو اوپر بیان کئے گئے ہیں، واقعات کی تفصیل کے بعد آیات مذکورہ کی تفسیر دیکھئے۔

معارف و مسائل

مذکور الصدر واقعات کا حاصل یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے متعلق حق تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمایا تھا کہ وہ جب تک اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریں گے دین و دنیا میں خائز المرام اور کامیاب رہیں گے اور جب کبھی دین سے انحراف کریں گے ذلیل و خوار کئے جاویں گے اور دشمنوں کا فردوس کے ہاتھوں ان پر مار ڈالی جائے گی اور صرف یہی نہیں کہ دشمن ان پر غالب ہو کر ان کی جان و مال کو نقصان پہنچائیں بلکہ ان کے ساتھ ان کا قبلہ جو بیت المقدس ہے وہ بھی اس دشمن کی زد سے محفوظ نہیں رہے گا ان کے کافر دشمن مسجد بیت المقدس میں گھس کر اس کی بے حرمتی اور توڑ پھوڑ کریں گے یہ بھی بنی اسرائیل کی سزا ہی کا ایک جز ہو گا۔ قرآن کریم نے ان کے دو واقعے بیان فرمائے پہلا واقعہ شریعت موسویہ کے زمانے کا ہے دوسرا شریعت عیسویہ کے زمانے کا ان دونوں میں بنی اسرائیل نے اپنے وقت کی شریعت الہیہ سے انحراف کر کے سرکشی اختیار کی تو پہلے واقعہ میں ایک مجوسی کافر بادشاہ کو ان پر اور بیت المقدس پر تسلط کر دیا گیا جسے تباہی مچائی اور دوسرے واقعہ میں ایک رومی بادشاہ کو

مسلط کیا جس نے ان کو قتل و غارت کیا اور بیت المقدس کو منہدم اور ویران کیا اسی کے ساتھ یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ دونوں مرتبہ حب بنی اسرائیل اپنی بد اعمالیوں پر نادم ہو کر تائب ہوئے تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے ملک و دولت اور آل و اولاد کو بحال کر دیا۔

ان دونوں واقعات کے ذکر کے بعد آخر میں اللہ تعالیٰ نے ان معاملات میں اپنا ضابطہ بیان فرمادیا **ذَانِ عُدُوٍّ عَدُوٍّ** نا یعنی اگر تم پھر نافرمانی اور سرکشی کی طرف لوٹو گے تو ہم پھر اس طرح کی سزا و عذاب تم پر لوٹا دیں گے یہ ضابطہ قیامت تک کے لئے ارشاد ہوا ہے اور اس کے مخاطب وہ بنی اسرائیل تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں موجود تھے جس میں اشارہ کر دیا گیا ہے کہ جس طرح پہلے شریعت موسویہ کی مخالفت سے اور دوسری مرتبہ شریعت عیسویہ کی مخالفت سے تم لوگ سزا و عذاب میں گرفتار ہوئے تھے اب تیسرا دور شریعت محمدیہ کا ہے جو قیامت تک چلیگا اس کی مخالفت کرنے کا بھی وہی انجام ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ان لوگوں نے شریعت محمدیہ اور اسلام کی مخالفت کی تو مسلمانوں کے ہاتھوں جلا وطن اور ذلیل و خوار ہوئے اور بالآخر ان کے قبلہ بیت المقدس پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہوا۔ فرق یہ رہا کہ پہلے بادشاہوں نے ان کو بھی ذلیل و خوار کیا تھا اور ان کے قبلہ بیت المقدس کی بے حرمتی بھی کی تھی اب مسلمانوں نے بیت المقدس فتح کیا تو مسجد بیت المقدس جو صدیوں سے منہدم اور غیر آباد پڑی تھی اس کو از سر نو تعمیر کیا اور اس قبلہ انبیاء کے احترام کو بحال کیا۔

واقعات بنی اسرائیل مسلمانوں کے لئے عبرت ہیں | بنی اسرائیل کے یہ واقعات قرآن کریم میں بیان کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں اور مسلمانوں کو سنانے سے بظاہر مقصد یہی ہے کہ مسلمان

بھی اس ضابطہ الہیہ سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ دنیا و دین میں ان کی عزت و شوکت اور مال و دولت اطاعت خداوندی کے ساتھ وابستہ ہیں جب وہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے انحراف کریں گے تو ان کے دشمنوں اور کافروں کو ان پر غالب اور مسلط کر دیا جائے گا جن کے ہاتھوں ان کے معابد و مساجد کی بے حرمتی بھی ہوگی۔

آجکل جو حادثہ فاجعہ بیت المقدس پر یہودیوں کے قبضہ کا اور پھر اس کو آگ لگانے کا سارے عالم اسلام کو پریشان کئے ہوئے ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ اسی قرآنی ارشاد کی تصدیق ہو رہی ہے مسلمانوں نے خدا و رسول کو بھلایا آخرت سے غافل ہو کر دنیا کی شان و شوکت میں لگ گئے اور قرآن و سنت کے احکام سے بیگانہ ہو گئے تو وہ ہی ضابطہ قدرت الہیہ سامنے آیا کہ کر وڑوں و عیالوں پر چن لاکھ یہودی غالب آگئے انھوں نے ان کی جان و مال کو بھی نقصان پہنچایا اور شریعت اسلام کی رو سے دنیا کی تین عظیم الشان مسجدوں میں سے ایک جو تمام انبیاء کا قبلہ رہا ہے وہ ان

سے چین لیا گیا اور ایک ایسی قوم غالب آگئی جو دنیا میں سب سے زیادہ ذلیل و خوار سمجھی جاتی رہی ہے یعنی یہود۔ اس پر مزید یہ مشاہدہ ہے کہ وہ قوم نہ خود اور نہ مسلمانوں کے مقابلہ میں کوئی حیثیت رکھتی ہے اور نہ مسلمانوں کے مجموعی موجودہ سامان حرب کے مقابلہ میں اس کی کوئی حیثیت ہے اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ واقعہ یہود کو کوئی عزت کا مقام نہیں دیتا البتہ مسلمانوں کے لئے ان کی سرکشی کی سزا ضرور ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ جو کچھ ہوا ہماری بد اعمالیوں کی سزا کے طور پر ہوا اور اس کا علاج بجز اس کے کچھ نہیں کہ ہم پھر اپنی بد اعمالیوں پر نادم ہو کر کبھی توبہ کریں احکام الہیہ کی اطاعت میں لگ جائیں یہ مسلمان نہیں غیرواں کی نقالی اور غیروں پر اعتماد کے گناہ عظیم سے باز آجائیں تو حسب وعدہ ربانی انشاء اللہ تعالیٰ بیت المقدس اور فلسطین پھر ہمارے قبضہ میں آئے گا مگر افسوس یہ ہے کہ آج کل کے عرب حکمران اور وہاں کے عام مسلمان اب تک بھی اس حقیقت پر متنبہ نہیں ہوئے وہ اب بھی غیروں کی امداد پر سہارا لگاتے ہوئے بیت المقدس کی واپسی کے پلان اور نقشہ بنا رہے ہیں جس کا بظاہر کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ فالی اللہ المشتکی۔

وہ اسلحہ اور سامان جس سے بیت المقدس اور فلسطین پھر مسلمانوں کو واپس مل سکتا ہے صرف اللہ تعالیٰ کی طرف انابت و رجوع، آخرت پر یقین، احکام شرعیہ کا اتباع اپنی معاشرت اور سیاست میں غیروں پر اعتماد اور ان کی نقالی سے اجتناب اور پھر اللہ پر بھروسہ کر کے خالص اسلامی اور شرعی جہاد ہے اللہ تعالیٰ ہمارے عرب حکمرانوں اور دوسرے مسلمانوں کو اس کی توفیق عطا فرمادیں۔ ایک عجیب معاملہ | اللہ تعالیٰ نے اس زمین میں اپنی عبادت کے لئے دو جگہوں کو عبادت کرنے والوں کا قبلہ بنایا ہے ایک بیت المقدس دوسرا بیت اللہ مگر قانون قدرت دونوں کے متعلق الگ الگ ہے بیت اللہ کی حفاظت اور کفار کا اس پر غالب نہ آنا یہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنی ذمہ لے لیا ہے اس کا نتیجہ وہ واقعہ نبیل ہے جو قرآن کریم کی سورہ نبیل میں ذکر کیا گیا ہے کہ مین کے نصرانی بادشاہ نے بیت اللہ پر چڑھائی کی تو اللہ تعالیٰ نے معہ اس کے ہاتھیوں کی فوج کے بیت اللہ کے قریب تک جانے سے پہلے ہی پرندے جا نوردوں کے ذریعہ ہلاک و برباد کر دیا۔

لیکن بیت المقدس کے متعلق یہ قانون نہیں بلکہ آیات مذکورہ سے معلوم ہوا ہے کہ جب مسلمان گمراہی اور محاسن میں مبتلا ہوں گے تو ان کی سزا کے طور پر ان سے یہ قبلہ بھی چھین لیا جائے گا اور کفار اس پر غالب آجائیں گے۔

مذکورہ صدر پہلے واقعہ میں قرآن کریم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جب اہل دین فتنہ و فساد پر اتر آئیں گے تو اللہ تعالیٰ ان پر اپنے ایسے بندوں کو مسلط کر دیگا جو ان کے گروں میں گھس کر ان کو قتل و غارت کریں گے اس جگہ قرآن کریم نے لفظ عباد اللہ کا ترجمہ بھی اللہ کے بندے ہیں مگر اس کے مقبول نہیں جو ان کے گروں میں گھس کر ان کو قتل و غارت کریں گے اس جگہ قرآن کریم نے لفظ عباد اللہ

فرمایا ہے عبادنا نہیں کہا حالانکہ وہ مختصر خواہمکت یہ ہے کہ کسی بندہ کی اضافت و نسبت اللہ کی طرف ہو جانا اس کے لئے سب سے بڑا اعزاز ہے جیسا کہ اسی سورۃ کے شروع میں اسٹری بعبدہ کے تحت میں یہ بتلایا جا چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو انتہائی اعزاز اور غایت قرب شب معراج میں نصیب ہوا قرآن نے اس واقعہ کے بیان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی یا کوئی صفت بیان کرنے کے بجائے صرف عبادہ کہہ کر یہ بتلادیا کہ انسان کا آخری کمال اور انتہائی ادنیٰ مقام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسکو اپنا بندہ کہہ کر نوازیں آیت مذکورہ میں جن لوگوں سے بنی اسرائیل کی سزا کا کام لیا گیا یہ خود بھی کافر تھے اس لئے حق تعالیٰ نے ان کو عبادنا کے لفظ سے تعبیر فرمانے کے بجائے اضافت و نسبت کو توڑ کر عبادنا فرمایا جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ تکوینی طور پر تو سارے ہی انسان اللہ کے بندے ہیں مگر بغیر ایمان کے مقبول بندے نہیں ہوتے جن کی نسبت و اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جا سکے۔

إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ

یہ قرآن بتلاتا ہے وہ راہ جو سب سے سیدھی ہے اور خوشخبری سنا رہا ہے ایمان والوں کو

الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا كَبِيرًا ⑤

جو عمل کرتے ہیں اچھے کہ ان کے لئے ہے ثواب بڑا

وَأَنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا

اور یہ کہ جو نہیں مانتے آخرت کو ان کے لئے تیار کیا ہے ہم نے عذاب

أَلِيمًا ⑥ وَيَذُحُّ الْإِنْسَانَ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ وَكَانَ

دردناک اور مانگتا ہے آدمی بُرائی جیسے مانگتا ہے بھلائی اور ہے

الْإِنْسَانُ عَجُولًا ⑦

انسان جلد باز۔

شروع سورت میں معجزہ معراج سے رسول کریم صلی اللہ

علیہ وسلم کی شان رسالت کا بیان تھا ان آیات میں معجزہ

ربط آیات

قرآن سے اسکا اثبات ہے۔

خلاصہ تفسیر

بلاشبہ یہ قرآن ایسے طریقہ کی ہدایت کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے (یعنی اسلام) اور اس طریقہ کے ماننے اور نہ ماننے والوں کی جزا و سزا بھی بتلاتا ہے کہ، اُن ایمان والوں کو جو نیک کام کرتے ہیں یہ خوشخبری دیتا ہے کہ ان کو بڑا بھاری ثواب ملے گا اور یہ بھی بتلاتا ہے کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم نے اُن کے لئے ایک دردناک سزا تیار کر رکھی ہے۔ اور (بعض) انسان (جیسے کفار ہیں) برائی (یعنی عذاب) کی ایسی دعا کرتا ہے جس طرح بھلائی کی دعا (کیجاتی ہے) اور انسان کچھ (کچھ طبعاً ہی) جلد باز (ہوتا) ہے۔

معارف و مسائل

طریق اقوام | قرآن جس طریقہ کی ہدایت کرتا ہے اُس کو اقوام کہا گیا ہے اقوام کی تفسیر یہ ہے کہ وہ راستہ جو منزل مقصود تک پہنچانے میں قریب بھی ہو، آسان بھی ہو، خطرات سے خالی بھی ہو، (قریبی) اس سے معلوم ہو کہ قرآن کریم انسانی زندگی کے لئے جو احکام دیتا ہے وہ ان تینوں اوصاف کے جامع ہیں اگرچہ انسان اپنی کوتاہ فہمی کی وجہ سے بعض اوقات اس راستہ کو دشوار یا پرخطر سمجھنے لگے لیکن رب العالمین جو کائنات کے ذرہ ذرہ کا علم رکھتا ہے اور ماضی و مستقبل اس کے سامنے یکساں ہے وہ ہی اس حقیقت کو جان سکتا ہے کہ انسان کا نفع کس کام اور کس صورت میں زیادہ ہے اور خود انسان چونکہ مجموعی حالات سے واقف نہیں وہ اپنے بھلے بُرے کو بھی پوری طرح نہیں پہچان سکتا۔

شاید اسی مناسبت سے مذکورہ آیات میں سے آخری آیت میں یہ ذکر فرمایا ہے کہ انسان تو بعض اوقات جلد بازی میں اپنے لئے ایسی دعا مانگ لیتا ہے جو اس کے لئے تباہی و بربادی کا سبب ہے اگر اللہ تعالیٰ اس کی ایسی دعا کو قبول فرمالیں تو یہ برباد ہو جائے۔ مگر اللہ تعالیٰ اکثر ایسی دعاؤں کو فوراً قبول نہیں فرمانا یہاں تک کہ خود انسان سمجھ لیتا ہے کہ میری یہ درخواست غلط اور میرے لئے سخت مضرت ہے اور آیت کے آخری جملہ میں انسان کی ایک طبعی کمزوری کو بطور ضابطہ کے بھی ذکر فرمایا کہ انسان اپنی طبیعت سے ہی جلد باز واقع ہوا ہے سرسری نفع نقصان پر نظر رکھتا ہے انجام بدی اور عاقبت اندیشی میں کوتاہی کرتا ہے فوری راحت چاہتے کھوڑی ہو اسکو بڑی اور دائمی راحت پر ترجیح دینے لگتا ہے اس تقریر کا حاصل یہ ہے کہ اس آیت میں عام انسانوں کی ایک طبعی کمزوری کا بیان ہے۔

اور بعض ائمہ تفسیر نے اس آیت کو ایک خاص واقعہ کے متعلق قرار دیا ہے وہ یہ کہ
نضر بن حارث نے اسلام کی مخالفت میں ایک مرتبہ یہ دعا بکری ڈالی۔ اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هَذَا
هُوَ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِكَ فَاقْطِعْ عَلَيْنَا حِجَابَ سَرَّةٍ مِّنَ السَّمَاءِ اَوْ اُنْتَابِ عَلٰى اَبِیْ عَلِیٍّ یعنی یا اللہ اگر آپ
کے نزدیک یہ اسلام ہی حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے یا کوئی اور دردناک عذاب بھیج دے۔
اس صورت میں انسان سے یہ خاص انسان یا جو اس کے ہم طبع ہوں مراد ہوں گے۔

وَجَعَلْنَا اللَّیْلَ وَالنَّهَارَ آيَتَيْنِ فَمَحَوْنَا آيَةَ اللَّیْلِ وَجَعَلْنَا

اور ہم نے بنائے رات اور دن دونوں نے پھر مٹا دیا رات کا نمونہ اور بنادیا

آيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوا فَضْلًا مِّنْ رَبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوا

دن کا نمونہ دیکھنے کو تاکہ تلاش کرو فضل اپنے رب کا اور تاکہ معلوم کرو

عَدَدَ السِّنِّينَ وَالْحِسَابَ ۚ وَكُلُّ شَيْءٍ فَضْلُنَا تَفْصِيلًا ۝۱۳

گنتی برسوں کی اور حساب اور سب چیزیں سنائیں ہم نے کھول کر

وَكُلِّ انْسَانٍ اَلْزَمْنَاهُ طَبْرِهٖ فِي عُنُقِهٖ ۚ وَخَرَجْ لَهُ يَوْمَ

اور جو آدمی ہے لگا دی ہو ہم نے اس کی ہر قسمت اس کی گردن سے اور نکال دکھائیں گے اس کو

الْقِيَمَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنشُورًا ۝۱۴ اِقْرَأْ كِتَابَكَ ۚ كَفٰی بِنَفْسِكَ

قیامت کے دن ایک کتاب کہ دیکھے گا اس کو کھلی ہوئی پڑھ لے کتاب اپنی تو ہی بس ہے

الْيَوْمَ عَلٰیكَ حَسِيبًا ۝۱۵ مَن اِهْتَدٰی فَاِنَّمَا يَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ

آج کے دن اپنا حساب لینے والا جو کوئی راہ پر آیا تو آیا اپنے ہی بھلے کو

وَمَن ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلٰیهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ

اور جو کوئی بہکا رہا تو بہکا رہا اپنے ہی بڑے کو اور کسی پر نہیں پڑتا بوجھ دوسرے

اُخْرٰی ۚ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰی تَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝۱۶

کا اور ہم نہیں ڈالتے بلا جب تک نہ بھیجیں کوئی رسول

خلاصہ تفسیر

ہم نے رات اور دن کو (اپنی قدرت کی) دو نشانیاں بنایا: سورات کی نشانی (یعنی خود رات) کو ہم نے دھندلا بنا دیا اور دن کی نشانی کو روشن بنایا کہ اس میں سب چیزیں بے تکلف دکھائی دیں، تاکہ (دن میں) اپنے رب کی روزی تلاش کرو اور رات اور دن کی آمد و رفت اور دونوں کے رنگ میں امتیاز کہ ایک روشن دوسرا اندھیرا ہے اور دونوں کی مقداروں میں اختلاف ہے (برسوں کا شمار اور دوسرے چھوٹے چھوٹے) حساب معلوم کر لو (جیسا کہ سورہ یونس کے پہلے رکوع میں بیان ہوا ہے) اور ہم نے ہر چیز کو خوب تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے و لوح محفوظ میں تو تمام کائنات کی مکمل تفصیل بغیر کسی استثناء کے ہے اور قرآن کریم میں تفصیل بقدر ضرورت ہے اس لئے یہ بیان دونوں کی طرف منسوب ہو سکتا ہے (اور ہم نے ہر عمل کرنے والے انسان کا عمل انیک ہو یا بد اس کے کئے کا ہار بنا رکھا ہے) (یعنی ہر شخص کا عمل اس کے ساتھ لازم و ملزوم ہے اور پھر قیامت کے دن اس کا اعمال نامہ اس کے (دیکھنے کے) واسطے نکال کر سامنے کر دیں گے جسکو وہ کھلا ہوا دیکھ لے گا اور اس سے کہا جاوے گا کہ لے، اپنا اعمال نامہ (خود) پڑھ لے آج تو خود ہی اپنا حساب جانچنے کے لئے کافی ہے (یعنی اس کی ضرورت نہیں کہ تیسرے اعمال کو کوئی دوسرا آدمی گناوے بلکہ تو خود ہی اپنا نامہ اعمال پڑھتا جا اور حساب لگاتا جا کہ تجھے کتنی سزا اور کتنی جزا ملنی چاہیے مطلب یہ ہے کہ اگرچہ ابھی عذاب سامنے نہیں آیا مگر وہ ٹلنے والا نہیں ایک وقت ایسا آنے والا ہے کہ انسان اپنے سب اعمال کو کھلی آنکھوں دیکھ لیگا، اور عذاب کی محبت اس پر قائم ہو جائے گی اور جو شخص (دنیا میں سیدھی) راہ پر چلتا ہے وہ اپنے ہی نفع کے لئے چلتا ہے اور جو شخص بے راہی اختیار کرتا ہے وہ بھی اپنے ہی نقصان کے لئے بے راہ ہوتا ہے (وہ اس وقت اس کا خمیازہ بھگتے گا کسی دوسرے کا کچھ نقصان نہیں کیونکہ ہمارا قانون یہ ہے کہ اور کوئی شخص کسی (کے گناہ) کا بوجھ نہ اٹھاوے گا اور جس کسی کو کوئی سزا دی جاتی ہے وہ اس پر محبت تمام کرنے کے بعد دی جاتی ہے کیونکہ ہمارا قانون یہ ہو کہ ہم (کبھی) سزا نہیں دیتے جب تک کسی رسول کو اس کی ہدایت کے لئے نہیں بھیج لیتے۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں اول رات اور دن کے اختلاف کو اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی نشانی قرار دیا اور پھر بتلایا کہ رات کو تاریک اور دن کو روشن کرنے میں بڑی حکمتیں ہیں۔ رات کے تاریک کرنے کی

حکمت تو اس جگہ بیان نہیں فرمائی۔ دوسری آیات میں مذکور ہے کہ رات کی تاریکی نیند اور آرام کے لئے مناسب ہے اور قدرت نے ایسا نظام بنا دیا ہے کہ ہر انسان اور جانور کو اسی راست کی تاریکی میں نیند آتی ہے پورا عالم یک وقت بخواب ہوتا ہے اگر مختلف لوگوں کی نیند کے مختلف اوقات ہوتے تو جاگنے والوں کے شور و شغب اور کام کاج کی وجہ سے سونے والوں کی نیند بھی حرام ہو جاتی۔

اور دن کو روشن کرنے کی اس جگہ دو حکمتیں بیان فرمائی ہیں اول یہ کہ دن کی روشنی میں آدمی اپنی روزی تلاش کر سکتا ہے محنت مزدوری صنعت و حرفت سب کے لئے روشنی کی ضرورت ہے دوسرے یہ کہ رات دن کی آمد و رفت سے سالوں اور برسوں کی تعداد معلوم کیا سکے کہ تین سو ساٹھ دن پورے ہونے پر مثلاً ایک سال پورا ہو گیا۔

اسی طرح دوسرے سب حسابات بھی رات دن کی آمد و رفت سے متعلق ہیں اگر رات دن کا یہ اختلاف نہ ہو تو مزدور کی مزدوری ملازم کی ملازمت معاملات کی میعادیں متعین کرنا سب مشکل ہو جائے گا۔

نامہ اعمال لکھنے کا ہار | یہ ہے کہ انسان کسی جگہ کسی حال میں رہے اس کا صحیفہ عمل اس کے ساتھ رہتا ہوئے کا مطلب ہے اس کا عمل لکھا جاتا رہتا ہے جب وہ مرتا ہے تو بند کر کے رکھ دیا جاتا ہے پھر قیامت کے روز یہ صحیفہ عمل ہر ایک کے ہاتھ میں دیدیا جائیگا کہ خود پڑھ کر خود ہی اپنے دل میں فیصلہ کر لے کہ وہ مستحق ثواب ہے یا مستحق عذاب حضرت قتادہؓ سے منقول ہے کہ اس روز بے پڑھا آدمی بھی نامہ اعمال پڑھ لیگا۔ اس موقع پر اصہبہ مانی نے بروایت حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز بعض لوگوں کا نامہ اعمال جب ان کے ہاتھ میں دیا جائے گا وہ دیکھے گا کہ اس کے بعض اعمال صالحوں کے لئے ہوئے نہیں ہیں تو عرض کرے گا کہ میرے پروردگار! میں میرے فلاں فلاں عمل درج نہیں ہیں تو حق تعالیٰ کی طرف سے جواب ملے گا کہ ہم نے اُن اعمال کو اس لئے مٹا دیا کہ تم لوگوں کی غیبت کیا کرتے تھے (منظہری)

بعثتِ رسل کے بغیر عذاب | اس آیت کی بناء پر بعض ائمہ فقہاء کے نزدیک ان لوگوں کو کفر کے باوجود نہ ہونے کی تشریح | کوئی عذاب نہیں ہوگا جن کے پاس کسی نبی اور رسول کی دعوت نہیں پہنچی اور بعض ائمہ کے نزدیک جو اسلامی عقائد عقل سے سمجھے جاسکتے ہیں مثلاً خدا کا وجود اس کی توحید وغیرہ پس جو لوگ اسکے منکر ہوں گے ان کو کفر پر عذاب ہوگا اگرچہ ان کو کسی نبی اور رسول کی دعوت نہ پہنچی ہو البتہ عام معاصی اور گناہوں پر سزا بغیر دعوت و تبلیغ انبیاء کے نہیں ہوگی اور بعض حضرات نے اس جگہ رسول سے مراد عام لی ہے خواہ وہ رسول نبی ہو خواہ انسانی عقل کہ وہ بھی ایک حیثیت سے اللہ

کا رسول ہی ہے۔

اولاد مشرکین کو عذاب نہ ہوگا
آیت لَا تَسِرُوا فِي الْأَرْضِ وَلَا تَمْسَسُوا بِأَيْدِيكُمْ الْأَشْيَاءَ الَّتِي فِيهَا تَكْفُرُونَ کے تحت تفسیر مظهری میں لکھا ہے کہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ مشرکین و کفار کی اولاد جو بالغ ہونے سے پہلے مر جائیں ان کو عذاب نہ ہوگا کیونکہ ماں باپ کے کفر سے وہ سزاوار کے مستحق نہیں ہوں گے۔ اس مسئلہ میں ائمہ فقہاء کے اقوال مختلف ہیں جنکی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں۔

وَإِذَا أَسْرَدْنَا أَنْ نُهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا

اور جب ہم نے چاہا کہ غارت کریں کسی بستی کو حکم بھیج دیا اُس کے عیش کرنے والوں کو پھر انھوں نے

فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَا هَاتِلًا مِيرًا ①۶ وَكَمْ

نا فرمانی کی اُس میں تب ثابت ہو گئی اُن پر بات پھر اٹھاڑ مارا ہم نے ان کو اٹھا کر اور بہت

أَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُونِ مِنْ بَعْدِ نُوحٍ ۖ وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ بِذُنُوبِ

غارت کر دیے ہم نے قرن نوح کے پیچھے اور کافی ہے تیرا رب اپنے بندوں کے گناہ

عِبَادِهِ خَيْرًا بَصِيرًا ①۷

جاننے والا دیکھنے والا -

اس سے پہلی آیات میں اس کا بیان تھا کہ حق تعالیٰ کی عادت یہ ہے کہ جب تک کسی قوم کے پاس انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی ہدایات نہ پہنچ جائیں اور پھر بھی وہ اطاعت نہ کریں اس وقت تک اُن پر عذاب نہیں بھیجتے مذکورہ آیات میں اس کے دوسرے رخ کا بیان ہے کہ جب کسی قوم کے پاس رسول اور اللہ کے پیغام پہنچ گئے اور پھر بھی انھوں نے سرکشی سے کام لیا تو اس پر عذاب عام بھیج دیا جاتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

اور جب ہم کسی بستی کو (جو اپنے کفر و نافرمانی کی وجہ سے بمقتضائے حکمتِ الہیہ ہلاک کرنے کے قابل ہو) ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اُس کو بعثتِ رسل سے پہلے ہلاک نہیں کرتے بلکہ پہلے کسی رسول کی موفقت (اس بستی) کے خوش عیش (یعنی امیر و رئیس) لوگوں کو (خصوصاً اور دوسرے عوام کو عموماً) ایمان و اطاعت کا حکم دیتے ہیں پھر جب (وہ لوگ) کہنا نہیں مانتے بلکہ وہاں شرارت مچاتے ہیں تب ان پر حجت تمام ہو جاتی ہے پھر اس بستی کو تباہ و غارت کر ڈالتے ہیں اور اسی عادت کے موافق ہم نے بہت سی

انہوں کو نوح (علیہ السلام) کے زمانہ کے بعد اُن کے کفر و معصیت کے سبب ہلاک کیا ہے (جیسے عاد و ثمود وغیرہ اور نوح علیہ السلام کی قوم کا غرق ہو کر ہلاک ہونا مشہور و معروف ہے اس لئے ہُنَّ بَعْلَانُوح پراکتھا کیا گیا خود قوم نوح کا ذکر نہیں کیا اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ شروع سورت میں آیت ذُرِّیَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مِمَّنْ نُوْجِہ میں لفظ حَمَلْنَا سے ملوفان نوح کی طرف اشارہ موجود ہے اس کو قوم نوح کی ہلاکت کا بیان قرار دیکر یہاں ما بعد نوح (علیہ السلام) کا ذکر فرمایا گیا، اور آپ کا رب اپنے بندوں کے گناہوں کا جاننے والا دیکھنے والا کافی ہے۔ (تو جیسا کسی قوم کا گناہ ہوتا ہے ویسی سزا دیتا ہے)

معارف و مسائل

ایک شبہ اور اسکا جواب | الفاظ آیت اِذَا اَسْرَدْنَا اور اس کے بعد اَسْرَدْنَا کے ظاہر سے یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ ان لوگوں کا ہلاک کرنا ہی مقصود خداوندی تھا اس لئے اُن کو اول بذریعہ انبیاء ایمان والہ امت کا حکم دینا پھر ان کے فسق و فجور کو عذاب کا سبب بنانا یہ سبب اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوا تو اس صورت میں یہ بیچارے معذور و مجبور ہوتے اس کے جواب کی طرف ترجمہ اور خلاصہ تفسیر کے ضمن میں یہ اشارہ آچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل و اختیار دیا اور عذاب و ثواب کے راستے متعین کر دیے جب کوئی اپنے اختیار سے عذاب ہی کے کام کا غم کرے تو عادت اللہ یہ ہے کہ وہ اسی عذاب کے اسباب بنتا کر دیتے ہیں تو اصلی سبب عذاب کا خود ان کا عزم اور قصد ہو کفر و معصیت کا نہ کہ محض ارادہ اس لئے وہ معذور نہیں ہو سکتے۔

آیت مذکورہ کی | لفظ اَسْرَدْنَا کا مشہور مفہوم وہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے یعنی حکم دیا ہے لیکن اس ایک دوسری تفسیر | آیت میں اس لفظ کی قراءتیں مختلف ہیں ایک قراءت میں جسکو ابو عثمان ہندی ابو رجاء ابو العالیہ اور مجاہد نے اختیار کیا ہے یہ لفظ بَشْدِیدِ مِیمِ آیا ہے یعنی اَسْرَدْنَا جسکے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہم نے امیر و حاکم بنا دیا خوش عیش سرمایہ دار لوگوں کو جو فسق و فجور میں مبتلا ہو گئے اور سب قوم کے لئے عذاب کا سبب بنے۔

اور حضرت علی و ابن عباس رضی کی ایک قراءت میں یہ لفظ اَسْرَدْنَا پڑھا گیا جس کی تفسیر انھیں حضرات سے اُسے ثرنا نقل کی گئی ہے یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر عذاب بھیجتے ہیں تو اس کی ابتدائی علامت یہ ہوتی ہے کہ اس قوم میں خوش عیش سرمایہ دار لوگوں کی کثرت کر دی جاتی ہے اور وہ اپنے فسق و فجور کے ذریعہ پورے قوم کو عذاب میں مبتلا کرنے کا سبب بن جاتے ہیں۔

انھیں سے پہلی قراءت کا حاصل تو یہ ہوا کہ ایسے خوش عیش سرمایہ داروں کو قوم کا حاکم بنا دیا جاتا ہے اور دوسری قراءت کا حاصل یہ ہے کہ قوم میں ایسے لوگوں کی کثرت کر دی جاتی ہے۔ ان دونوں سے یہ معلوم ہوا کہ عیش پسند لوگوں کی حکومت یا ایسے لوگوں کی قوم میں کثرت کچھ خوشی کی چیز نہیں

عذاب الہی کی علامت ہے حق تعالیٰ جب کسی قوم پر ناراض ہوتے ہیں اور اس کو عذاب میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں تو اس کی ابتدائی علامت یہ ہوتی ہے کہ اس قوم کے حاکم درجے ایسے لوگ بنادیتے جاتے ہیں جو عیش پسند، عیاش ہوں یا حاکم بھی نہ بنیں تو اس قوم کے افراد میں ایسے لوگوں کی کثرت کر دی جاتی ہے۔ دونوں صورتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ شہوات و لذات میں مست ہو کر اللہ کی نافرمانیاں خود بھی کرتے ہیں دوسروں کے لئے بھی اس کی راہ ہموار کرتے ہیں بالآخر ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آجانا ہے۔

مالداروں کا قوم پر اثر ہونا | آیت میں خوش عیش مالداروں کا خصوصیت سے ذکر کرنا اس طرف اشارہ ہے کہ نظری طور پر تمام اپنے مالداروں اور حاکموں کے اخلاق و اعمال سے متاثر ہوتے ہیں جب یہ لوگ بد عمل ہو جائیں تو پوری قوم بد بھی ہو جاتی ہے اس لئے جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت دیا ہے ان کو اس کی زیادہ فکر ہونا چاہئے کہ اپنے اعمال و اخلاق کی اصلاح کئے رہیں ایسا نہ ہو کہ یہ عیش پرستی میں پڑ کر اس سے غافل ہو جائیں اور پوری قوم ان کی وجہ سے غلط راستے پر پڑ جائے تو قوم کے اعمال بد کا وبال بھی ان پر پڑے گا۔

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ

جو کوئی چاہتا ہو پہلا گھر جلد دے دیں ہم اس کو اسی میں جتنا چاہیں جس کو چاہیں

ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مِنْ مَوْمًا مَدْحُورًا ۱۸ وَمَنْ

پھر ٹھہرایا ہے ہم نے اُس کے واسطے دوزخ داخل ہو گا اس میں اپنی برائی سن کر دھکیلا جا کر اور جس نے

أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ

چاہا پہلا گھر اور دوزخ کی اُس کے واسطے جو اُسکی دوزخ ہے اور وہ یقین پر ہے سو

كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا ۱۹ كَلَّا نَبْدُ هَؤُلَاءِ وَهَؤُلَاءِ مِنْ

ایسوں کی دوزخ ٹھکانے لگی ہے ہر ایک کو ہم پہنچائے جاتے ہیں ان کو اور ان کو تیرے

عَطَاءُ رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا ۲۰ أَنْظِرْ كَيْفَ

رب کی بخشش میں سے اور تیرے رب کی بخشش کسی نے نہیں روک لی دیکھ کیسا

فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۚ وَلِلْآخِرَةِ الْكِبْرُ وَرَجَبٌ وَ الْكِبْرُ تَفْضِيلًا ۲۱

بڑھا دیا ہم نے ایک کو ایک سے اور پہلا گھر میں تو اور بڑے درجے ہیں اور بڑی فضیلت

خلاصہ تفسیر

جو شخص اپنے نیک اعمال سے صرف دنیا کے نفع کی نیت رکھے گا، خواہ اس نے کہ وہ آخرت کا منکر ہے یا اس نے کہ آخرت سے غافل ہے، ہم ایسے شخص کو دنیا ہی میں جتنا چاہیں گے پھر یہ سب کے لئے نہیں بلکہ جس کے واسطے چاہیں گے فی الحال ہی دیدیں گے یعنی دنیا ہی میں کچھ جزا مل جاوے گی) پھر آخرت میں خاک نہ ملے گا بلکہ وہاں ہم اس کے لئے جہنم تجویز کر دیں گے وہ اس میں بد حال راندہ درگاہ ہو کر داخل ہوگا اور جو شخص اپنے اعمال میں آخرت کے ثواب کی نیت رکھے گا اور اس کے لئے جیسی کوشش کرنی چاہیے ویسی ہی کوشش بھی کرے گا (مطلب یہ ہے کہ ہر کوشش بھی مفید نہیں بلکہ کوشش صرف وہی مفید ہے جو شریعت اور سنت کے موافق ہو کیونکہ حکم ایسی ہی کوشش کا دیا گیا ہے جو عمل اور سعی شریعت و سنت کے خلاف ہو وہ مقبول نہیں) بشرطیکہ وہ شخص مومن بھی ہو سو ایسے لوگوں کی یہی مقبول ہوگی، غرض اللہ کے یہاں کامیابی کی شرطیں چار ہوتی ہیں اول نیت یعنی خالص ثواب آخرت کی نیت ہونا جس میں اغراض نفسانی شامل نہ ہوں دوسرے اس نیت کے لئے عمل اور کوشش کرنا صرف نیت و ارادہ سے کوئی کام نہیں ہوتا جب تک اس کے لئے عمل نہ کرے تیسرے تصحیح عمل یعنی سعی و عمل کا شریعت اور سنت کے مطابق ہونا کیونکہ مقصد کے خلاف سمت میں دوڑنا اور کوشش کرنا بجائے مفید ہونے کے مفقود ہے اور دوسرے دیتا ہے جو فنی شرط جو سب سے اہم اور سب کا مدار ہے وہ تصحیح عقیدہ یعنی ایمان ہے ان شرائط کے بغیر کوئی عمل اللہ کے نزدیک مقبول نہیں اور کفار کو دنیا کی نعمتیں حاصل ہونا ان کے اعمال کی مقبولیت کی علامت نہیں کیونکہ دنیا کی نعمتیں مقبولین بارگاہ کے لئے مخصوص نہیں بلکہ آپ کے رب کی عطا کردہ نبوی میں سے تو ہم ان مقبولین کی بھی امداد کرتے ہیں اور ان غیر مقبولین کی بھی (امداد کرتے ہیں) اور آپ کے رب کی عطا کردہ نبوی کسی پر بند نہیں آپ دیکھ لیجئے کہ ہم نے (اس نبوی عطا میں بارگاہ ایمان و کفر کے) ایک کو دوسرے پر کس طرح فوقیت دی ہے یہاں تک کہ اکثر کفار اکثر مومنین سے زیادہ نعمت و دولت رکھتے ہیں کیونکہ یہ چیزیں قابل وقعت نہیں) اور البتہ آخرت (جو مقبولین بارگاہ کے ساتھ خاص ہے وہ درجات کے اعتبار سے بہت بڑی ہے اور فضیلت کے اعتبار سے بھی اس لئے اہتمام اسی کا کرنا چاہیے)

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں اپنے عمل سے صرف دنیا کا ارادہ کرنے والوں کا اور ان کی سزا کا جو بیان

فرمایا ہے اس کے لئے تو الفاظ مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ استعمال فرمائے جو استمرار و دوام پر دلالت کرتے ہیں جسکا مطلب یہ ہے کہ یہ سزا جہنم صرف اس صورت میں ہے کہ اس کے ہر عمل میں ہر وقت صرف دنیا ہی کی غرض چھائی ہوئی ہو آخرت کی طرف کوئی دھیان ہی نہ ہو اور ارادہ آخرت کرنے اور اس کی جزاء کے بیان میں لفظ أَمَّا إِذَا الْأَخِرَةَ کا استعمال فرمایا جس کا مفہوم یہ ہے کہ مومن جس وقت بھی جس عمل میں آخرت کا ارادہ اور نیت کر لیا اسکا وہ عمل مقبول ہو جائے گا خواہ کسی دوسرے عمل کی نیت میں کوئی فساد بھی شامل ہو گیا ہو۔

پہلا حال صرف کافر مشرک آخرت کا ہو سکتا ہے اس لئے اسکا کوئی بھی عمل مقبول نہیں اور دوسرا حال مومن کا ہے اُس کا وہ عمل جو اخلاص نیت کے ساتھ آخرت کے لئے ہو اور باقی شرائط بھی موجود ہوں وہ مقبول ہو جائے گا اور اس کے بھی جس عمل میں اخلاص نہ ہو یا دوسری شرطیں مفقود ہوں وہ مقبول نہیں ہوگا۔

بدعت اور خود رائی کا عمل کتنا ہی اچھا نظر آئے مقبول نہیں ہے کہ ہر عمل اور ہر کوشش نہ مفید ہوتی ہے نہ عند اللہ مقبول بلکہ عمل و سعی وہی معتبر ہے جو مقصد (آخرت) کے مناسب ہو اور مناسب ہونا یا نہ ہونا یہ صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے ہی معلوم ہو سکتا ہے اس لئے جو نیک اعمال خود رائی اور منگھڑت طریقوں سے کئے جاتے ہیں جن میں بدعات کی عام رسوم شامل ہیں وہ دیکھنے میں کتنے ہی اچھے اور مفید نظر آئیں مگر آخرت کے لئے سعی مناسب نہیں اس لئے نہ وہ اللہ کے نزدیک مقبول ہیں اور نہ آخرت میں کار آمد۔

اور تفسیر المعانی نے سَعِيًّا کی تشریح میں سعی کے مطابق سنت ہونے کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ اس عمل میں انتقامت بھی ہو یعنی عمل مفید مطابق سنت بھی ہو اور اس پر انتقامت اور مداومت بھی ہو بد نظمی کے ساتھ کبھی کر لیا بھی نہ کیا اس سے پورا فائدہ نہیں ہوتا۔

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُومًا مَّخَذُورًا ۖ وَلَا ۚ

مت شہرا اللہ کے ساتھ دوسرا حاکم پھر بیٹھ رہے گا تو الزام کھا کر بیٹھ ہو کر

وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا

اور حکم کر چکا تیرا رب کہ نہ ہو جو اُس کے سوائے اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو

إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ

مگر پہنچ جائے تیرے سامنے بڑھاپے کو ایک ان میں سے یا دونوں تو نہ کہ

لَهُمَا أَفٍّ وَلَا تَنْهَرُهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا ۝۲۳ وَخُفِضَ

اُن کو ہوں اور نہ جھڑک اُن کو اور کہہ اُن سے بات ادب کی اور جھکا دے

لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا

اُن کے آگے کندھے عاجزی کر کر نیازمندی سے اور کہہ اے رب اُن پر رحم کر جیسا

رَبِّيَنِي صَغِيرًا ۝۲۴ رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا فِي نُفُوسِكُمْ وَإِنْ

پالا انہوں نے مجھ کو چھوٹا سا تمہارا رب خوب جانتا ہے جو تمہارے جی میں ہے اگر

تَكُونُوا صَالِحِينَ فَإِنَّهُ كَانَ لِلْأَوَّابِينَ غَفُورًا ۝۲۵

تم نیک ہو گے تو وہ رجوع کرنے والوں کو بخشتا ہے ۔

رابط آیات سابقہ آیات میں قبول اعمال کے لئے چن چنے رابطہ کا بیان آیا ہے جنہیں ایک شرط یہ بھی تھی کہ عمل مقبول وہی ہو سکتا ہے جو ایمان کے ساتھ ہو اور شریعت و سنت کے مطابق ہو۔ ان آیات میں ایسے ہی خاص خاص اعمال کی ہدایت کی گئی ہے جو شریعت کے بتلائے ہوئے احکام ہیں ان کی تعمیل آخرت کی فلاح اور ان کی خلاف ورزی آخرت کی ہلاکت کا سبب ہے اور چونکہ شرائط مذکورہ میں سب سے اہم شرط ایمان کی ہے اس لئے سب سے پہلا حکم بھی توحید کا بیان فرمایا۔ اس کے بعد حقوق العباد سے متعلقہ احکام ہیں۔

خلاصہ تفسیر

حکم اول توحید لَا تَجْعَلْ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ (اے مخاطب، اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود مت جو نہ کر یعنی شرک نہ کر) ورنہ تو بد حال ہے یا رومہ دگرا ہو کر بیٹھ رہے گا (آگے پہرا بیکی تاکید ہے، تیس رب نے سکھ کر دیا ہے کہ بجز اُس (معبود برحق) کے کسی کی عبادت مت کر یہ سچی آخرت کے طریقہ کی تفصیل ہے)

حکم دوم۔ ادا حقوق والدین وَ يَا نُؤَالِدَيْنِ إِحْسَانًا (اور تم اپنے ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کیا کرو اگر وہ تیرے پاس (ہوں اور) ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائیں، جس کی وجہ سے محتاج خدمت ہو جائیں اور جبکہ طبعاً ان کی خدمت کرنا بھاری معام ہو تو اس وقت بھی اتنا ادب کرو کہ ان کو کبھی (ہاں سے) ہوں بھی مت کہنا اور نہ اُن کو جھڑکنا اور اُن سے خوب ادب سے بات کرنا اور ان کے سامنے شفقت سے انکاری کے ساتھ جھکے رہنا اور ان کے لئے حق تعالیٰ

ہے، یوں دعا کرتے ہیں کہ میرے پروردگار ان دونوں پر رحمت فرمائیے جیسا انھوں نے تجھ کو بچپن (کی عمر) میں پالا پرورش کیا ہے۔ اور صرف اس ظاہری توقیر و تحظیم پر اکتفا مت کرنا دل میں بھی انکا ادب اور قصد الطاعت رکھنا کیونکہ تمہارا رب تمہارے دلوں کی بات کو خوب جانتا ہے (اور اسی وجہ سے تمہارے لئے اس کی تعمیل آسان کرنے کے واسطے ایک تنقیف کا حکم بھی سناتے ہیں کہ) اگر تم حقیقت میں دل ہی سے (سعادتمند ہو) اور غلطی یا تنک مزاجی یا دل تنگی سے کوئی ظاہری کوتاہی ہو جائے اور پھر نادان ہو کر معذرت کر لو، تو وہ توبہ کرنے والوں کی خطامعات کر دیتا ہے۔

معارف و مسائل

والدین کے ادب و احترام اور اطاعت کی بڑی اہمیت | امام قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے والدین کے ادب و احترام اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کو اپنی عبادت کے

ساتھ ملا کر واجب فرمایا ہے جیسا کہ سورہ لقمان میں اپنے شکر کے ساتھ والدین کے شکر کو ملا کر لازم فرمایا ہے اِنْ اَشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ (یعنی میرا شکر ادا کر اور اپنے والدین کا بھی) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ جل شانہ کی عبادت کے بعد والدین کی اطاعت سب سے اہم اور اللہ تعالیٰ کے شکر کی طرح والدین کا شکر گزار ہونا واجب ہے صحیح بخاری کی یہ حدیث بھی اسی پر شاہد ہے جس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے سوال کیا کہ ”اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب عمل کیا ہے“ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ”نماز اپنے وقت (مستحب) میں اُس نے پھر دریافت کیا کہ اس کے بعد کونسا عمل سب سے زیادہ محبوب ہے تو آپ نے فرمایا ”والدین کے ساتھ اچھا سلوک“ (قرطبی)

والدین کی اطاعت و خدمت کے فضائل و آیات حدیث میں | (۱) مسند احمد - ترمذی - ابن ماجہ - مستدرک حاکم میں بسند صحیح حضرت

نے فرمایا کہ ”باپ جنت کا درمیانی دروازہ ہے اب تمہیں اختیار ہے کہ اس کی حفاظت کرو یا ضائع کر دو (منظہری) (۲) اور جامع ترمذی - مستدرک حاکم میں حضرت عبداللہ ابن عمر کی روایت ہے اور حاکم نے اس روایت کو صحیح کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کی رضا باپ کی رضا میں ہے اور اللہ کی ناراضی باپ کی ناراضی میں۔

(۳) ابن ماجہ نے بروایت حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اولاد پر ماں باپ کا کیا حق ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ”وہ دونوں ہی تیری جنت یا دوزخ ہیں مطلب یہ ہے کہ ان کی اطاعت و خدمت جنت میں لیجاتی ہے اور ان کی بے ادبی اور ناراضی دوزخ میں۔“

(۴) یہی جی نے شعب الایمان میں اور ابن عساکر نے بروایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ کے لئے اپنے ماں باپ کا فرمانبردار رہا اس کے لئے جنت کے دو دروازے کھلے رہیں گے اور جو ان کا نافرمان ہو اس کے لئے جہنم کے دو دروازے کھلے رہیں گے اور اگر ماں باپ میں سے کوئی ایک ہی تھا تو ایک دروازہ (جنت یا دوزخ) کا کھلا رہیگا اس پر ایک شخص نے سوال کیا کہ یہ جہنم کی وعید کیا اس صورت میں بھی ہے کہ ماں باپ نے اس شخص پر ظلم کیا ہو تو آپ نے تین مرتبہ فرمایا **وَإِنْ ظَلَمَّا وَإِنْ ظَلَمَّا وَإِنْ ظَلَمَّا** یعنی ماں باپ کی نافرمانی اور ان کو ایذا رسانی پر جہنم کی وعید ہے خواہ ماں باپ نے ہی بڑے پر ظلم کیا ہو جس کا حاصل یہ ہے کہ اولاد کو ماں باپ سے انتقام لینے کا حق نہیں کہ انہوں نے ظلم کیا تو یہ بھی ان کی خدمت و اطاعت سے ہاتھ کھینچ لیں۔

(۵) یہی جی نے بروایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو خدمت گزار بیٹا اپنے والدین پر رحمت و شفقت سے نظر ڈالتا ہے تو ہر نظر کے بدلے میں ایک حج مقبول کا ثواب پاتا ہے، لوگوں نے عرض کیا کہ اگر وہ دن میں سو مرتبہ اس طرح نظر کرے، آپ نے فرمایا کہ ”ہاں سو مرتبہ بھی (ہر نظر پر یہی ثواب ملتا رہے گا)، اللہ تعالیٰ بڑا ہے (اس کے خزانے میں کوئی کمی نہیں ہے) والدین کی حق تلفی کی سزا آخرت سے پہلے دنیا میں بھی ملتی ہے“

(۶) یہی جی نے شعب الایمان میں بروایت ابی بکرہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر سب گناہوں کی سزا

تو اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں قیامت تک مؤخر کر دیتے ہیں بجز والدین کی حق تلفی اور نافرمانی کے کہ اس کی سزا آخرت سے پہلے دنیا میں بھی دیجاتی ہے (یہ سب روایات تفسیر ظہری سے نقل کی گئی ہیں)

والدین کی اطاعت کن چیزوں میں اس پر علماء و فقہاء کا اتفاق ہے کہ والدین کی اطاعت صرف جائز واجب ہے اور کہاں مخالفت کی گنجائش ہے کاموں میں واجب ہے ناجائز یا گناہ کے کام میں اطاعت واجب تو کیا جائز بھی نہیں حدیث میں ہے **لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ** (یعنی خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں)۔

والدین کی خدمت اور اچھے سلوک کے امام قرطبی نے اس مسئلہ کی شہادت میں حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کا یہ واقعہ صحیح بخاری سے نقل کیا ہے کہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے ان کا مسلمان ہونا ضروری نہیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استفتا کیا کہ میری والدہ جو مشرک ہے مجھ سے ملنے کے لئے آتی ہے کیا میرے لئے جائز ہے کہ میں اس کی خاطر مدارات کروں آپ نے فرمایا **”صِلِي أُمَّتَكَ“** (یعنی اپنی ماں کی صلہ رحمی اور خاطر مدارات کرو) اور کافراں باپ کے بارے میں خود قرآن کریم کا یہ ارشاد موجود ہے **وَصَاحِبُهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْشَرُ فَجَّارٍ** یعنی جس کے ماں باپ کافر ہوں اور اسکو بھی کافر سونے کا حکم

دیں تو ان کا اس معاملے میں حکم ماننا تو جائز نہیں مگر دنیا میں ان کے ساتھ حروف طریقہ کا برتاؤ کیا جائے
نظاہر ہے کہ حروف طریقہ سے یہی مراد ہے کہ ان کے ساتھ مدارات کا معاملہ کریں۔

مسئلہ: جب تک جہاد فرض عین نہ ہو جائے فرض کفایہ کے درجے میں رہے اس وقت تک کسی
لوگ کے لئے بغیر ان کی اجازت کے جہاد میں شریک ہو جانا جائز نہیں صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر
سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شریک جہاد ہونے کی اجازت
لینے کے لئے حاضر ہوا۔ آپ نے اس سے دریافت کیا کہ کیا تمہارے والدین زندہ ہیں اس نے عرض کیا
کہ ہاں زندہ ہیں آپ نے فرمایا ففیہما نجاً ہل یعنی بس تو اب تم ماں باپ کی خدمت میں رہو
جہاد کو مطلب یہ ہے کہ ان کی خدمت میں تمہیں جہاد کا ثواب مل جائے گا۔ دوسری روایت میں
اس کے ساتھ یہ بھی مذکور ہے کہ اس شخص نے یہ بیان کیا کہ میں اپنے ماں باپ کو روتا ہوا چھوڑ کر آیا ہوں
اس پر آپ نے فرمایا کہ جاد ان کو ہنسنا دجیسا کہ ان کو رلایا ہے یعنی ان سے جہاد کہہ دو کہ میں آپ کی مرضی کے
خلاف جہاد میں نہیں جاؤنگا۔ (قرطبی)

مسئلہ: اس روایت سے معلوم ہوا کہ جب کوئی چیز فرض عین یا واجب علی العین ہو کفایہ کے
درجہ میں ہو تو اولاد کے لئے وہ کام بغیر ماں باپ کی اجازت کے جائز نہیں امین کمال علم دین حاصل کرنا
اور تبلیغ دین کے لئے سفر کرنے کا حکم بھی شامل ہے کہ بقدر فرائض علم دین جسکو حاصل ہو وہ عالم بننے
کے لئے سفر کرے یا لوگوں کو تبلیغ و دعوت کے لئے سفر کرے تو بغیر اجازت والدین کے جائز نہیں۔
مسئلہ: والدین کے ساتھ جو حسن سلوک کا حکم قرآن و حدیث میں آیا ہے انہیں یہ بھی داخل
ہے کہ جن لوگوں سے والدین کی قرابت یا دوستی تھی ان کے ساتھ بھی حسن سلوک کا معاملہ کرے خصوصاً
ان کی وفات کے بعد صحیح بخاری میں بروایت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہاں کے ساتھ بڑا سلوک یہ ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے دوستوں کے
ساتھ اچھا سلوک کرے اور حضرت ابواسید بدری رضی اللہ عنہ نے نقل کیا ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے ساتھ بیٹھا تھا ایک انصاری شخص آیا اور سوال کیا یا رسول اللہ ماں باپ کے انتقال کے بعد بھی انکا
کوئی حق میرے ذمہ باقی ہے آپ نے فرمایا ہاں۔ ان کے لئے دعا اور استغفار کرنا اور جو عہد انہوں نے
کسی سے کیا تھا اس کو پورا کرنا اور ان کے دوستوں کا اکرام و احترام کرنا اور ان کے ایسے رشتہ داروں
کے ساتھ صلہ رحمی کا برتاؤ کرنا جنکا رشتہ قرابت حدت انہیں کے واسطے ہے والدین کے یہ حقوق
ہیں جو ان کے بعد بھی تمہارے ذمہ باقی ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ حضرت خدیجہ ام المومنین کی وفات کے بعد ان کی
ہامیوں کے پاس ہدیہ بھیجا کرتے تھے جس سے حضرت خدیجہ کا حق ادا کرنا مقصود تھا۔

والدین کے ادب کی رعایت | والدین کی خدمت و اطاعت والدین ہونے کی حیثیت سے کسی زمانے
خصوصاً بڑھاپے میں | اور کسی عمر کے ساتھ مقتد نہیں ہر حال اور ہر عمر میں والدین کے ساتھ چہچہا
سلوک واجب ہے لیکن واجبات و فریض کی ادائیگی میں جو حالات عادتہ و کاوٹ بنا کرتے ہیں ان حالات
میں قرآن حکیم کا عام اسلوب یہ ہے کہ احکام پر عمل کو آسان کرنے کے لئے مختلف پہلوؤں سے ذہنوں کی تربیت
کرتا ہے اور ایسے حالات میں تعمیل احکام کی پابندی کی مزید تاکید بھی۔

والدین کے بڑھاپے کا زمانہ جبکہ وہ اولاد کی خدمت کے محتاج ہو جائیں ان کی زندگی اولاد کے
رحم و کرم پر رہ جائے اس وقت اگر اولاد کی طرف سے ذرا سی بے رنجی بھی محسوس ہو تو وہ ان کے دل
کا زخم بن جاتی ہے۔ دوسری طرف بڑھاپے کے عوارض طبعی طور پر انسان کو چڑچڑاہٹا بنا دیتے ہیں تیسرے
بڑھاپے کے آخری دور میں جب عقل و فہم بھی جواب دینے لگتے ہیں تو ان کی خواہشات و مطالبات کچھ
ایسے بھی ہو جاتے ہیں جن کا پورا کرنا اولاد کے لئے مشکل ہوتا ہے قرآن حکیم نے ان حالات میں والدین
کی دلجوئی اور راحت رسانی کے احکام دینے کے ساتھ انسان کو اس کا زمانہ طفولیت یاد دلایا کہ
کسی وقت تم بھی بچے والدین کے اس سے زیادہ محتاج تھے جس قدر آج وہ تمہارے محتاج ہیں تو جس طرح
انہوں نے اپنی راحت و خواہشات کو اُس وقت تم پر قربان کیا اور تمہاری بے عقلی کی باتوں کو پیار کے
ساتھ برداشت کیا اب جبکہ ان پر محتاجی کا یہ وقت آیا تو عقل و شرافت کا تقاضا ہے کہ ان کے اس
سابقہ احسان کا بدلہ ادا کرو آیت میں گمراہی صغیراً سے اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور
آیات مذکورہ میں والدین کے بڑھاپے کی حالت کو پہنچنے کے وقت چند تاکیدیں احکام دیئے گئے ہیں
اول یہ کہ ان کو اُن بھی نہ کہے لفظ اُن سے مراد ہر ایسا کلمہ ہے جس سے اپنی ناگواری کا
اظہار ہو یہاں تک کہ ان کی بات سکر اس طرح لمبا سانس لینا جس سے اپنی ناگواری کا اظہار ہو وہ بھی اسی کلمہ
اُن میں داخل ہے ایک حدیث میں بروایت حضرت علی رضی اللہ عنہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ
ایذا رسانی میں اُن کہنے سے بھی کم کوئی درجہ ہوتا تو یقیناً وہ بھی ذکر کیا جاتا حاصل یہ ہے کہ جس چیز سے
ماں باپ کو کم سے کم بھی اذیت پہنچے وہ بھی ممنوع ہے۔

دوسرا حکم ہے وَلَا تَنْهَرُوهُمَا لَفْظِ نَهَرَ کے معنی جھڑکنے ڈانٹنے کے ہیں اس کا سبب ایذا ہونا ظاہر ہے
تیسرا حکم وَقُلْ لَّهْمَا فُلَا كَرْتُمَا ہے پہلے دو حکم متنی پہلو سے متعلق تھے جنہیں والدین کی ادنیٰ سے ادنیٰ بارخاط
کو رد کیا ہے اس تیسرے حکم میں مثبت انداز سے والدین کے ساتھ گفتگو کا ادب سکھایا گیا ہے کہ ان سے
محبت و شفقت کے نرم لہجے میں بات کی جائے حضرت سعید بن جبیر نے فرمایا بطریق کوئی غلام انہو تحت مزان آقا مبات کرنا ہو
چوتھا حکم وَ اخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذَّلِيلِ مِنَ التَّحَمُّنِ جس کا حاصل یہ ہے کہ ان کے
سامنے اپنے آپ کو عاجز و ذلیل آدمی کی صورت میں پیش کرے جیسے غلام آقا کے سامنے جناح کے معنی

بازد کے ہیں لفظی معنی یہ ہیں کہ والدین کے لئے اپنے بازو و ناجزی اور ذلت کے ساتھ جھکائے آہستہ میں
من الرحمة کے لفظ سے ایک تو اس پر متنبہ کیا کہ والدین کے ساتھ یہ معاملہ محض دکھاوے کا نہ ہو
بلکہ قلبی رحمت و عزت کی بنیاد پر ہو دوسرے شاید اشارہ اس طرف بھی ہے کہ والدین کے سامنے
ذلت کے ساتھ پیش آنا حقیقی عزت کا مقدمہ ہے کیونکہ یہ واقعی ذلت نہیں بلکہ اس کا سبب شفقت و
رحمت ہے۔

پانچواں حکم وَقُلْ رَبِّ اَرْحَمُهُمَا ہے جسکا حاصل یہ ہے کہ والدین کی پوری راحت
رسالی تو انسان کے بس کی بات نہیں اپنی مقدور بھر راحت رسالی کی فکر کے ساتھ ان کے لئے اللہ تعالیٰ
سے بھی دعا کرتا رہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان کی سب مشکلات کو آسان اور تکلیفوں کو دور فرمائے
یہ آخری حکم ایسا وسیع اور عام ہے کہ والدین کی وفات کے بعد بھی جاری رہے جس کے ذریعہ وہ ہمیشہ
والدین کی خدمت کر سکتا ہے۔

مسئلہ والدین اگر مسلمان ہوں تو ان کے لئے رحمت کی دعا ظاہر ہے لیکن اگر وہ مسلمان نہ ہوں تو ان کی
زندگی میں یہ دعا اس نیت سے جائز ہوگی کہ ان کو دنیوی تکلیف سے نجات ہو اور ایمان کی توفیق ہو مرنے
کے بعد ان کے لئے دعا رحمت جائز نہیں (قرطبی لمخصا)

ایک واقعہ عجیبہ قرطبی نے اپنی اسناد مفصل کے ساتھ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے
کہ ایک شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور شکایت کی کہ میرے باپ نے
میرا مال لے لیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اپنے والد کو بلا کر لاؤ اسی وقت جب رسول امین تشریف لائے اور
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ جب اس کا باپ آجائے تو آپ اس سے پوچھیں کہ وہ کلمات
کیا ہیں جو اس نے دل میں کہے ہیں خود اس کے کانوں نے بھی ان کو نہیں سنا جب یہ شخص اپنے والد
کو لیکر پہنچا تو آپ نے والد سے کہا کہ کیا بات ہے آپکا بیٹا آپ کی شکایت کرتا ہے کیا آپ چاہتے ہیں
کہ اس کا مال چھین لیں والد نے عرض کیا کہ آپ اس سے یہ سوال فرمائیں کہ میں اسکی پھوپھی خالہ یا اپنے
نفس کے سوا کہاں خرچ کرتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے یہ جبکہ مطلب یہ
تھا کہ اس حقیقت معلوم ہو گئی اب اور کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں اس کے بعد اس کے والد سے
دریافت کیا کہ وہ کلمات کیا ہیں جسکو ابھی تک خود تمہارے کانوں نے بھی نہیں سنا۔ اس شخص نے عرض کیا کہ
یا رسول اللہ میں ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ آپ پر ہمارا ایمان اور یقین بڑھاتا دیتے ہیں جو بات کسی نے نہیں سنی
اسکی آپ کو اطلاع ہو گئی جو ایک معجزہ ہے پھر اس نے عرض کیا کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ میں نے چند اشعار
دل میں کہے تھے جسکو میرے کانوں نے بھی نہیں سنا آپ نے فرمایا کہ وہ ہمیں سناؤ اس وقت اس نے یہ اشعار
ذیل سنائے۔

غَدًا وَنُكَ مَوْلُودًا وَمُنْتَكُ يَا فَعَا تُعَلِّ بِمَا أَجْنَى عَلَيْكَ وَتَنْهَلُ

میں نے تجھے بچپن میں غذا دی اور جوان ہونے کے بعد بھی تمہاری ذمہ داری اٹھائی
تمہارا سب کھانا پینا میری ہی کمائی سے تھا

إِذَا لَيْلَةٌ ضَاغَتْكَ بِالسُّقْمِ لَرَابِتْ لِسْمُكَ إِلَّا سَاهِرًا اتَّسَلَمُ

جب کسی رات میں تمہیں کوئی بیماری پیش آگئی تو میں نے تمام رات تمہاری بیماری
کے سبب بیداری اور بیقرازی میں گزاری

كَأَنِّي أَنَا الْمَطْرُوقُ دُونَكَ بِالذِّی طُرِقْتُ بِهِ دُونِي فَعِیْنِي تَهْمَلُ

گو یا کہ تمہاری بیماری مجھ ہی لگی ہے تمہیں نہیں جس کی وجہ سے میں تمام شب روتا رہا۔

تَخَافُ الرَّدَى نَفْسِي عَلَيْكَ وَأَنْهَى لَتَعْلَمَنَّ الْمَوْتَ وَقْتُ مَوْجَلُ

میرا دل تمہاری ہلاکت سے ڈرتا رہا حالانکہ میں جانتا تھا کہ موت کا ایک دن مقرر ہے پہلے مجھے نہیں ہو سکتا

فَلَمَّا بَلَغْتَ السِّنَّ وَالْغَايَةَ النَّیُّ إِلَيْهَا مَدَى مَا كُنْتَ فَيْكَ أَوْ قَبْلُ

پھر جب تم اس عمر اور اس حد تک پہنچ گئے جس کی میں تمنا کیا کرتا تھا۔

جَعَلْتُ جَزَائِي غَاطِظَةً وَفَطَاظَةً كَأَنَّكَ أَنْتَ الْمُنْعَمُ الْمُنْفَضِلُ

تو تم نے میرا بدلہ سختی اور سخت کلامی بنا دیا گو یا کہ تمہی مجھ پر احسان و انعام کر رہے ہو۔

فَلَيْتَكَ أَذْ لَمْ تَرَ حَقَّ أَبَوَيْ فَعَلْتَ كَمَا الْجَائِرُ الْمُصَاقِبُ يَفْعَلُ

کاش اگر تم سے میرے باپ ہونے کا حق ادا نہیں ہو سکتا تو کم از کم ایسا ہی کر لیتے جیسا

ایک شریعت پڑوسی کیا کرتا ہے

فَأَوْكَيْتَنِي حَقَّ الْجَوَارِ وَلَمْ تَكُنْ عَلَى بَمَالٍ دُونَ مَالِكَ تَبْخُلُ

تو کم از کم مجھے پڑوسی کا حق تو دیا ہوتا اور خود میرے ہی مال میں میرے حق میں بخل سے کام نہ لیا ہوتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اشعار سننے کے بعد بیٹے کا گریہ بیان پکڑ لیا اور فرمایا ۱۰ انت و

مَالِكَ لَا بَيْتَ یعنی جاتا تو بھی اور تیرا مال بھی سب باپ کا ہے تفسیر قرطبی ص ۲۴۷ ۱۱۰۲ یہ اشعار عربی

ادب کی مشہور کتاب حماسہ میں بھی نقل کئے گئے مگر ان کو امیہ ابن ابی الصلت شاعر کی طرف منسوب کیا

ہے اور بعض نے کہا کہ یہ عبدالاعلیٰ کے اشعار ہیں بعض نے انکی نسبت ابو العباس اُمّی کی طرف کی ہے (حاشیہ قرطبی)

مذکورہ آیات میں سے آخری آیت رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا فِي نُفُوسِكُمْ میں اس دل تگلی کو

رفع فرمادیا گیا ہے جو والدین کے ادب و تعظیم کے متعلقہ احکام مذکورہ سے اولاد کے دل میں پیدا ہو سکتی ہے کہ

والدین کے ساتھ ہر وقت رہنا ہے ان کے اور اپنے حالات بھی ہر وقت یکساں نہیں ہوتے کسی وقت زبان

سے کوئی ایسا کلمہ نکل گیا جو مذکور الصدر آداب کے خلاف ہو تو اس پر جہنم کی وعید ہے اس طرح گناہ

سے بچنا سخت مشکل ہوگا اس آیت میں اس قبیہ اور اس سے دشمنی کو دور کرنے کے لئے فرمایا کہ بغیر ارادہ بے ادبی کے کبھی کسی پریشانی یا غفلت سے کوئی کلمہ صادر نہ ہو جائے اور پھر اس سے توبہ کر لے تو اللہ تعالیٰ دلوں کے حال سے واقف ہیں کہ وہ کلمہ بے ادبی یا ایذا کے لئے نہیں کہا تھا وہ معاف فرمانے والے ہیں لفظ اوابین بمعنی توابین ہے حدیث میں بعد مغرب کی چھ رکعات اور اشراق کی نو افل کو صلوات الاوابین کہا گیا ہے جس میں اشارہ ہے کہ ان نمازوں کی توفیق انہیں لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو اوابین اور توابین ہیں۔

وَاتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا

اور دے قرابت والے کو اس کا حق اور محتاج کو اور مسکین کو اور مت

تَبَذَّ رُتْبًا ۝۲۶ اِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا اِخْوَانَ

اُڑا بے جا بے شک اڑانے والے بھائی ہیں

الشَّيْطَانِ ۝ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِلرَّبِّ كَفُورًا ۝۲۷

شیطانوں کے اور شیطان ہے اپنے رب کا ناشکر۔

خلاصہ تفسیر

ان دونوں آیتوں میں حقوق عباد کے متعلق دو مزید حکم مذکور ہیں اول والدین کے علاوہ دوسرے رشتہ داروں اور عام مسلمانوں کے حقوق۔ دوسرے خرچ کرنے میں فضول خرچی کی ممانعت مختصر تفسیر یہ ہے اور قرابت دار کو اس کا حق (مالی و غیر مالی) دیتے رہنا اور محتاج و مسافر کو بھی (ادنیٰ کے حقوق) دیتے رہنا اور مال کو بے موقع مست اڑانا بیشک بے موقع مال اڑانے والے شیطان کے بھائی بند ہیں (یعنی اس کے مشابہ ہوتے ہیں) اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکر ہے کہ حق تعالیٰ نے اس کو دولت عقل کی دی اس نے اس دولت عقل کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں خرچ کیا اس بطرح فضول خرچی کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے دولت مال کی دی مگر وہ اس کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں خرچ کرتے ہیں۔

معارف و مسائل

عام رشتہ داروں | پچھلی آیتوں میں والدین کے حقوق اور ان کے ادب و احترام کی تعلیم تھی اس کے حقوق کا اہتمام | آیت میں عام رشتہ داروں کے حقوق کا بیان ہے کہ ہر رشتہ کا حق ادا کیا جائے

جو کم سے کم ان کے ساتھ حسن معاشرت اور عمدہ سلوک ہے اور وہ اگر حاجت مند ہوں تو ان کی مالی امداد بھی اپنی وسعت کے مطابق اسیں داخل ہے اس آیت سے اتنی بات تو ثابت ہوگئی کہ ہر شخص پر اس کے عام رشتہ دار عزیزوں کا بھی حق ہے۔ وہ کیا اور کتنا ہے اس کی تفصیل مذکور نہیں مگر عام صلہ رحمی اور حسن معاشرت کا اسیں داخل ہونا واضح ہے امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ کے نزدیک اسی فرمان کے تحت جو رشتہ دار ذی رحم محرم ہو اگر وہ عورت یا بچہ ہے جن کے پاس اپنے گزارہ کا سامان نہیں اور کما سنے پر بھی قدرت نہیں اسی طرح جو رشتہ دار ذی رحم محرم ایسا ہی یا اندھا ہو اور اس کی ملک میں اتنا مال نہیں جس سے اس کا گزارہ ہو سکے تو ان کے جن رشتہ داروں میں اتنی وسعت ہے کہ وہ ان کی مدد کر سکتے ہیں ان پر ان سب کا نفقہ فرض ہے اگر ایک ہی درجہ کے کئی رشتہ دار صاحب وسعت ہوں تو ان سب پر تقسیم کر کے ان کا گزارہ نفقہ دیا جائے گا سورۃ بقرہ کی آیت **وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَٰلِكَ** سے بھی یہ حکم ثابت ہے (تفسیر مظہری) اس آیت میں اہل قرابت اور مسکین و مسافر کو مالی مدد دینے اور صلہ رحمی کرنے کو ان کا حق فرمایا کہ اس طرف اشارہ کر دیا کہ دینے والے کو ان پر احسان جتانے کا کوئی موقع نہیں کیونکہ ان کا حق اس کے ذمہ فرض ہے دینے والا اپنا فرض ادا کر رہا ہے کسی پر احسان نہیں کر رہا۔

تبذیر یعنی فضول خرچی | فضول خرچی کے معنی کو قرآن حکیم نے دو لفظوں سے تعبیر فرمایا ہے ایک تبذیر اور
کی ممانعت | دوسرے اسراف تبذیر کی ممانعت تو اسی آیت مذکورہ میں واضح ہے اسراف
کی ممانعت آیت **وَلَا تُسْرِفُوا** سے ثابت ہے بعض حضرات نے فرمایا کہ دونوں افظام معنی ہیں
کسی معصیت میں یا بے موقع بے محل خرچ کرنے کو تبذیر و اسراف کہا جاتا ہے اور بعض حضرات نے تفصیل کی
ہے کہ کسی گناہ میں یا بالکل بے موقع بے محل خرچ کرنے کو تبذیر کہتے ہیں اور جہاں خرچ کرنے کا جائز موقع تو ہو
مگر ضرورت زائد خرچ کیا جائے اسکو اسراف کہتے ہیں ایسے تبذیر نسبت اسراف کے اشد ہے تبذیر کو شیطان کا بھائی قرار دیا گیا
امام تفسیر حضرت مجاہد رحمہ نے فرمایا کہ اگر کوئی اپنا سارا مال حق کے لئے خرچ کر دے تو وہ تبذیر
نہیں اور اگر باطل کے لئے ایک **ھُلّا** (آدھ سیر) بھی خرچ کرے تو وہ تبذیر ہے۔ حضرت عبداللہ
ابن مسعود رحمہ نے فرمایا کہ فیہ حق میں بے موقع خرچ کرنے کا نام تبذیر ہے (مظہری) امام مالک رحمہ نے
فرمایا کہ تبذیر یہ ہے کہ انسان مال کو حائل تو حق کے مطابق کرے مگر خلاف حق خرچ کر ڈالے اور
اس کا نام اسراف بھی ہے اور یہ حرام ہے۔ (قرطبی)

امام قرطبی نے فرمایا کہ حرام و ناجائز کام میں تو ایک درہم خرچ کرنا بھی تبذیر ہے اور جائز و مباح
خواہشات میں حد سے زیادہ خرچ کرنا جس سے آئندہ محتاج فقیر ہو جانے کا خطرہ ہو جائے یہ بھی تبذیر
میں داخل ہے ہاں اگر کوئی شخص اصل راس المال کو محفوظ رکھتے ہوئے اس کے منافع کو اپنی جائز خواہشات
میں وسعت کے ساتھ خرچ کرتا ہے تو وہ تبذیر میں داخل نہیں (قرطبی ج ۱ ص ۱۴۴)

وَأَمَّا نَعُصِرُ ضَرْبَ عَنْهُمْ ابْتِغَاءَ رَحْمَةٍ مِّن رَّبِّكَ تَرْجُوهَا

اور اگر کبھی تنہا کرے تو ان کی طرف سے انتظار میں اپنے رب کی مہربانی کے جس کی ہجو

فَقُلْ لَهُمْ قَوْلًا مَّيْسُورًا ۲۸

تو قہ ہے تو کہہ دے اُن کو بات نرمی کی ۔

خلاصہ تفسیر

اس آیت میں حقوق العباد سے متعلق پانچوں حکم یہ دیا گیا ہے کہ اگر کسی وقت حاجتمندوں کو انکی ضرورت کے مطابق دینے کا انتظام نہ ہو سکے تو اس وقت بھی ان کو روکھا جو اب نہ دیا جائے بلکہ ہمدردی کے ساتھ آئندہ سہولت کی امید دلائی جائے۔ آیت کی تفسیر یہ ہے ۔

اور اگر کسی وقت تمہارے پاس ان لوگوں کو دینے کے لئے مال نہ ہو اور اس لئے تم کو اس رزق کے انتظار میں جسکی اپنے پروردگار سے توقع ہو (اس کے نہ آنے تک) اُن سے پہلو تہی کرنا پڑے تو (اتنا خیال رکھنا کہ اُن سے نرمی کی بات کہہ دینا یعنی دُجوئی کے ساتھ ان سے وعدہ کر لینا کہ انشاء اللہ تعالیٰ کہیں سے آئیگا تو دیں گے دل آزار جواب مت دینا)

معارف و مسائل

اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے واسطے سے پوری اُمت کی عجیب اخلاقی تربیت ہے کہ اگر کسی وقت ضرورت مند لوگ سوال کریں اور آپ کے پاس دینے کو کچھ نہ ہو اس لئے ان لوگوں سے اعراض کرنے پر مجبور ہو تو بھی آپ کا یہ اِض مستغنیانہ یا مخاطب کے لئے توہین آمیز نہ ہونا چاہئے بلکہ یہ پہلو تہی کرنا اپنے عجز و مجبوری کے اظہار کے ساتھ ہونا چاہئے۔

اس آیت کے شان نزول میں ابن زید کی روایت یہ ہے کہ کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مال کا سوال کیا کرتے تھے اور آپ کو معلوم تھا کہ ان کو دیا جائے گا تو یہ فساد میں خرچ کریں گے اس لئے آپ ان کو دینے سے انکار کر دیتے تھے کہ یہ انکار ان کو فساد سے روکنے کا ذریعہ ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی (قرطبی)

مسند سعید بن منصور میں بروایت مبارک بن حکم مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ کپڑا آیا تھا آپ نے اس کو مستحقین میں تقسیم فرمادیا اس کے بعد کچھ اور لوگ آئے جبکہ آپ فارغ ہو چکے تھے اور کپڑا ختم ہو چکا تھا ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْرُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ

اور نہ رکھ اپنا ہاتھ بندھا ہوا اپنی گردن کے ساتھ اور نہ کھول دے اس کو بائیں کھول دینا

الْبَسِطِ قَتَعْدَ مَا مَوَّاهُ حَسْرَةً ۚ (۲۹) إِنَّ مَرَبِّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ

پھر تو بیٹھ رستہ الزام کھایا ہوا تیرا رب کھول دیتا ہے روزی جس

لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا ۝ (۳۰)

کے واسطے چاہے اور تنگ بھی دہی کرتا ہے وہی ہے اپنے بندوں کو جاننے والا دیکھنے والا

خلاصہ تفسیر

اور نہ تو اپنا ہاتھ گردن ہی سے باندھ لے کہ انتہائی بخل سے بائیں ہاتھ خرچ کرنے سے روک لو، اور نہ بالکل ہی کھول دینا چاہیے کہ ضرورت سے زیادہ خرچ کر کے اسراف کیا جائے، ورنہ الزام خوردہ (اور) تنہی رست ہو کر بیٹھ رہو گے (اور کسی کے نفرد احتیاج پر اتنا اثر لیتا کہ اپنے کو پریشانی میں ڈال لو کوئی معقول بات نہیں کیونکہ) بلاشبہ تیرا رب جسکو چاہتا ہے زیادہ رزق دیتا ہے اور وہی جس پر چاہے تنگی کر دیتا ہے۔ بیشک وہ اپنے بندوں کی حالت اور ان کی محنت کو خوب جانتا ہے دیکھتا ہے سارے عالم کی حاجات پورا کرنا تو رب العالمین ہی کا کام ہے تم اس فکر میں کیوں پڑے کہ اپنے سے ہو سکے یا نہ ہو سکے اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال کر بسکی حاجتیں پوری ہی کر دو۔ یہ صورت اس لئے بیکار ہے کہ یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی بسکی حاجتیں پوری کر دینا تمہارے بس کی بات نہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی کسی کا غم نہ کرے اس کے لئے تدبیر نہ کرے بلکہ مطلب یہ ہے کہ سب کی حاجتیں پوری کرنا کسی انسان کے بس میں نہیں خواہ وہ اپنے اوپر کتنی ہی مصیبت برداشت کرنے کے لئے تیار رہے ہو کہ یہ کام تو صرف مالک کائنات ہی کا ہے کہ سب کی حاجتوں کو جانتا بھی ہے اور سب کی مصیبتوں سے بھی واقف ہے کہ کس وقت کس شخص کی کس حاجت کو کس مقدار میں پورا کرنا چاہیے اس لئے انسان کا کام تو صرف اتنا ہی ہے کہ میانہ روی سے کام لے نہ خرچ کرنے کے موقع میں بخل کرے اور نہ اتنا خرچ کرے کہ کل کو خود ہی فقیہ ہو جائے اور اہل دعیال جن کے حقوق اس کے ذمہ ہیں ان کے حقوق ادا نہ ہو سکیں اور بعد میں پچھتا نا پڑے۔

معارف و مسائل

خرچ کرنے میں اعتدال کی ہدایت | اس آیت میں بلا واسطہ مخاطب خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

اور آپ کے واسطے ہے پوری امت مخاطب ہے اور مفسود و افقصاد کی ایسی تعلیم ہے جو دوسروں کی اصلاح میں
 حائل بھی نہ ہو اور خود اپنے لئے بھی مصیبت نہ بنے اس آیت کے شان نزول میں ابن مردودیه نے بروایت
 حضرت عبداللہ بن مسعود اور بخاری نے بروایت حضرت جابر بن عبد اللہ ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ
 علیہ وسلم کی خدمت میں ایک لڑکا حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میری والدہ آپ سے ایک کرتے کا سوال کرتی ہیں اس
 وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی کرتا اس کے مواہب نہیں تھا جو آپ کے بدن مبارک پر تھا آپ نے
 لڑکے کو کہا کہ پھر کسی وقت آؤ جبکہ ہمارے پاس اتنی وسعت ہو کہ تمہاری والدہ کا سوال پورا کر سکیں لڑکا گھر
 گیا اور واپس آیا اور کہا کہ میری والدہ کہتی ہیں کہ آپ کے بدن مبارک پر جو کرتا ہے وہی عنایت فرمادیں یہ
 شکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بدن مبارک سے کرتہ اتار کر اس کے خواہے کو دیا آپ نے گنگہ بدن رہ
 گئے نماز کا وقت آیا حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان دی مگر آپ حسب عادت باہر تشریف نہ لائے تو لوگوں کو خبر
 ہوئی بعض لوگ اندر حاضر ہوئے تو دیکھا کہ آپ کرتے کے بغیر گنگہ بدن بیٹھے ہیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔
 اللہ کی راہ میں اتنا خرچ کرنا کہ خود اس آیت سے بظاہر اس طرح خرچ کرنے کی مانعت معلوم ہوتی ہے
 پریشانی میں پڑ جائے اس کا درجہ جس کے بعد خود مختار ہو جائے اور پریشانی میں پڑ جائے امام
 شافعی نے فرمایا کہ یہ حکم مسلمانوں کے عام حالات کے لئے ہے جو خرچ کرنے کے بعد تکلیفوں سے پریشانی
 ہو کہ پچھلے خرچ کئے ہوئے پر پچھتاہیں اور افسوس کریں قرآن کریم کے لفظ محسوس میں اس کی طاعت اشارہ
 موجود ہے (کنز العمال المظہری) اور جو لوگ اتنے بلند حوصلہ ہوں کہ بعد کی پریشانی سے نہ گھبرائیں اور اہل حقوق کے
 حقوق بھی ادا کر سکیں ان کے لئے یہ پابندی نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عام عادت
 یہ تھی کہ کل کے لئے کچھ ذخیرہ نہ کرتے تھے جو کچھ آج آیا آج ہی خرچ فرمادیتے تھے اور بسا اوقات بھوک اور فاقہ
 کی تکلیف بھی پیش آتی پیٹ پر پتھر باندھنے کی نوبت بھی آجاتی تھی اور صحابہ کرام میں بھی بہت سے ایسے حضرات
 ہیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اپنا سارا مال اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا آخرت
 صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ اسکو منع فرمایا نہ ان کو ملامت کی اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت کی مانعت ان لوگوں کے
 لئے ہے جو فقر و فاقہ کی تکلیف برداشت نہ کر سکیں اور خرچ کرنے کے بعد ان کو حسرت ہو کہ کاش ہم خرچ نہ کرتے یہ
 صورت ان کے پچھلے عمل کو ناسد کر دیگی اس لئے اس سے منع فرمایا گیا۔

خرچ میں بذلتی ممنوع ہے اور اس بات یہ ہے کہ اس آیت نے بذلتی کے ساتھ خرچ کرنے کو منع کیا ہے کہ آگے
 آنے والے حالات سے قطع نظر کر کے جو کچھ پاس ہے اُسے اسی وقت خرچ کر ڈالے کہ دوسرے صاحب
 حاجت لوگ آئیں اور کوئی دینی ضرورت اہم پیش آجائے تو اب اس سے نہ ذرت نہ رہے قرطبی نے اہل
 دنیا کے حقوق اس کے ذمہ واجب ہیں ان کے حق ادا کرنے سے عاجز ہو جائے (مفہم ہی) مخلوقاً محسوساً
 کے الفاظ کے متعلق تفسیر ظہری میں ہے کہ مخلوق کا تعلق پہلی حالت یعنی قبل سے ہے کہ اگر ہاں تو مخلوق سے بالکل

روک لے گا تو لوگ ملامت کریں گے اور محسوس اس کا تعلق کسی دوسری حالت سے ہے کہ خرچ کرنے میں اتنی زیادتی کرے کہ خود فقیر ہو جائے تو یہ محسوس یعنی تنہا ماندہ عاجز یا حسرت زدہ ہو جائے گا۔

وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةً إِمْلَاقٍ ۖ هُنَّ نَرَسٌ قَلِيلٌ

اور نہ مار ڈالو اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے ہم روزی دیتے ہیں ان کو اور

إِنَّا كُمْ إِن قَتَلْتُمْ ۖ كَانَ خَطَاً كَبِيرًا ۝۳۱

تم کو بے شک اُن کا مارنا بڑی خطا ہے۔

خلاصہ تفسیر

اور اپنی اولاد کو مفلسی کے اندیشہ سے قتل نہ کرو (کیونکہ سب کے رازق ہم ہیں) ہم ان کو بھی رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی اگر رازق تم ہوتے تو ایسی باتیں سوچتے بیشک ان کا قتل کرنا بڑا بھاری گناہ ہے۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں انسانی حقوق کے متعلق ہدایات کا ایک سلسلہ ہے یہ چھٹا حکم اہل جاہلیت کی ایک ظالمانہ عادت کی اصلاح کے لئے ہے زمانہ جاہلیت میں بعض لوگ ابتداء ولادت کے وقت اپنی اولاد خصوصاً بیٹیوں کو اس خوف سے قتل کر ڈالتے تھے کہ ان کے مصارف کا بار ہم پر پڑے گا۔ آیت مذکورہ میں حق تعالیٰ نے ان کی جہالت کو واضح کیا ہے کہ رزق دینے والے تم کو نہ یہ تو خالص اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے تمہیں بھی تو وہی رزق دیتا ہے جو تمہیں دیتا ہے وہی ان کو بھی دیگا تم کیوں اس فکر میں قتل اولاد کے مجرم بنتے ہو بلکہ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے رزق دینے میں اولاد کا ذکر مقدم کر کے اس طرف اشارہ فرمادیا ہے ہم پہلے ان کو پھر تمہیں دیں گے جس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس بندہ کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے اہل و عیال کا تکفل یا دوسرے غریبوں ضعیفوں کی امداد کرتا ہے تو اس کو اسی حساب سے دیتے ہیں کہ وہ اپنے ضروریات بھی پوری کر سکے اور دوسروں کی امداد بھی کر سکے۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے إِنَّمَا تَخْرُجُونَ وَتُؤْخَرُونَ بِضَعْفَائِكُمْ یعنی تمہارے ضعیف و کمزور طبقہ ہی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری امداد ہوتی ہے اور تمہیں رزق دیا جاتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ اہل و عیال کے تکفل والدین کو جو کچھ ملتا ہے وہ کمزور عورتوں بچوں کی خاطر ہی ملتا ہے مسئلہ قرآن کریم کے اس ارشاد سے اس معاملے پر بھی روشنی پڑتی ہے جس میں آج کی دنیا گرفتار

ہے کہ کثرت آبادی کے خوف سے غلبہ تولید اور منصوبہ بندی کو رواج دے رہی ہے اسکی بنیاد بھی اسی جاہلانہ فلسفہ پر ہے کہ رزق کا ذمہ دار اپنے آپ کو سمجھ لیا گیا ہے یہ معاملہ قتل اولاد کی برابر گناہ نہ سہی مگر اس کے مذموم ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزَّيْنٰۤی اِنَّہٗ كَانَ فَاَحِشَۃً وَّسَاءَ سَبِيْلًا ۝۳۲

اور پاس نہ جاؤ بدکاری کے وہ بے حیائی اور بُری راہ ہے۔

خلاصہ تفسیر

اور زنا کے پاس بھی مت کھٹکو (یعنی اس کے مبادی اور مقدمات سے بھی بچو) بلا شبہ وہ (خود بھی) بڑی بے حیائی کی بات ہے اور (دوسرے مفاسد کے اعتبار سے بھی) بُری راہ ہے کیونکہ اس پر عداوتیں اور فتنے اور بیخِ نسب مرتب ہوتے ہیں۔

معارف و مسائل

یہ ساتواں حکم زنا کی حرمت کے متعلق ہے جس کے حرام ہونے کی دو وجہ بیان کی گئی ہیں اول یہ کہ وہ بے حیائی ہے اور انسان میں حیا نہ رہی تو وہ انسانیت ہی سے محروم ہو جاتا ہے پھر اس کے لئے کسی بھلے بُرے کام کا امتیاز نہیں رہتا اسی معنی کے لئے حدیث میں ارشاد ہے اِذَا فَاتَكَ الْحَيَاءُ فَاتَّقِ مَآشَيْتَ یعنی جب تیری حیا ہی جاتی رہی تو کسی برائی سے رکاوٹ کا کوئی پردہ نہ رہا تو جو چاہو گے کرو گے اور اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حیا کو ایمان کا ایک اہم شعبہ قرار دیا ہے وَالْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِنَ الْاِيْمَانِ (بخاری) دوسری وجہ معاشرتی فساد ہے جو زنا کی وجہ سے اتنا پھیلتا ہے کہ اس کی کوئی حد نہیں رہتی اور اس کے نتائج بد بعض اوقات پورے قبیلوں اور قوموں کو برباد کر دیتے ہیں فقہ چوری، ڈاکہ قتل کی جتنی کثرت آج دنیا میں بڑھ گئی ہے اس کے حالات کی تحقیق کیجئے تو آدھے سے زیادہ واقعات کا سبب کوئی عورت و مرد نہ نکلتے ہیں جو اس جرم کے مرتکب ہوئے۔ اس جرم کا تعلق اگرچہ بلا واسطہ حقوق العباد سے نہیں مگر اس جگہ حقوق العباد سے متعلقہ احکام کے ضمن میں اس کا ذکر کرنا شاید اسی بنا پر ہو کہ یہ جرم بہت سے ایسے جرائم کا سانچہ لاتا ہے جس سے حقوق العباد متاثر ہوتے ہیں اور قتل و غارت گری کے ہنگامے برپا ہوتے ہیں۔ اسی لئے اسلام نے اس جرم کو تمام جرائم سے اشد قرار دیا ہے اس کی سزا بھی سارے جرائم کی سزائوں سے زیادہ سخت رکھی ہے کیونکہ یہ ایک جرم دوسرے سینکڑوں جرائم کو اپنے میں سموئے ہوئے ہے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ساتواں آسمان اور ساتواں زمینیں شادی شدہ

زنا کا پورا عنت کرتی ہیں اور جہنم میں ایسے لوگوں کی نذر مگنا ہوں سے ایسی سنت بدلو پھیلے گی کہ اہل جہنم بھی اس سے پریشان ہوں گے اور آگ کے عذاب کے ساتھ ان کی رسوائی جہنم میں بھی ہوتی رہے گی (رداۃ البزار عن بریدہ مظهری) ایک دوسری حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زنا کرنے والا زنا کرنے کے وقت مؤمن نہیں ہوتا، چوری کرنے والا چوری کرنے کے وقت مؤمن نہیں ہوتا اور شراب پینے والا شراب پینے کے وقت مؤمن نہیں ہوتا یہ حدیث بخاری و مسلم میں ہے اس کی شرح ابو داؤد کی روایت میں یہ ہے کہ ان جرائم کے کرنے والے جبوقت بتلائے جرم ہوتے ہیں تو ایمان ان کے قلب سے نکل کر باہر آجاتا ہے اور پھر جب اس سے لوٹ جاتے ہیں تو ایمان واپس آجاتا ہے (مظہری)

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ۚ وَمَنْ

اور نہ مارو اس جان کو جس کو منع کر دیا ہے اللہ نے مگر حق پر اور جو

قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لَوْلِيٍّ سُلْطَانًا فَلَا يَسْرِفُ

مارا گیا ظلم سے تو دیا ہم نے اس کے وارث کو زور سوحد سے نہ نکل جائے

فِي الْقَتْلِ ۚ إِنَّهُ كَانَ مَنصُورًا ﴿۲۲﴾

قتل کرنے میں اس کو مدد ملتی ہے -

خلاصہ تفسیر

اور جس شخص کے قتل کرنے کو اللہ تعالیٰ نے حرام فرمایا ہے اس کو قتل مت کرو ہاں مگر حق پر قتل کرنا درست ہے یعنی جب کسی شرعی حکم سے قتل کرنا واجب یا جائز ہو جائے تو وہ حرم اللہ میں داخل نہیں) اور جو شخص ناحق قتل کیا جائے تو ہم نے اس کے وارث (حقیقی یا حکمی) کو اختیار دیا ہے (قصاص لینے کا) سو اس کو قتل کے بارے میں حد (شرع) سے تجاوز نہ کرنا چاہیے یعنی قاتل پر قتل کا یقینی ثبوت بلا بغیر قتل نہ کرے اور اس کے اعزہ و اقارب وغیرہ کو جو قتل میں شریک نہیں ہیں محض جوش انتقام سے قتل نہ کرے اور قاتل کو بھی صرف قتل کرے ناک کمان یا ہاتھ پاؤں وغیرہ کاٹ کر نہ کرے۔ کیونکہ وہ شخص (قصاص میں حد سے تجاوز نہ کرنے کی صورت میں تو شرعاً) مدد کے قابل ہے (اور اس نے زیادتی کی تو پھر فریق ثانی مظلوم ہو کر اللہ کی مدد کا مستحق ہو جائے گا اس لئے ولی مقتول کو چاہیے کہ وہ اپنے منصور حق ہونے کی قدر کرے حد سے بڑھ کر اس نعمت حق کو ضائع نہ کرے)

معارف و مسائل

یہ آکھواں محکم قتل ناحق کی حرمت کے بیان میں ہے جسکا جرم عظیم ہونا دنیا کی ساری ہی جماعتوں اور مائتہوں اور فرقوں میں مسلم ہے حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ساری دنیا کی تباہی اس کے نزدیک اس سے اہم (ملکی) ہے کہ کسی مومن کو ناحق قتل کیا جائے (اور بعض روایات میں اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے ساتوں آسمان اور ساتوں زمینوں کے باشندے کسی مومن کے قتل ناحق میں شریک ہو جائیں تو ان سب کو اللہ تعالیٰ جہنم میں داخل کر دینگے۔ ابن ماجہ بسند حسن والبیہقی۔ از مظہری)۔

اور ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس شخص نے کسی مسلمان کے قتل میں قاتل کی امداد ایک کلمہ سے بھی کی تو میدانِ حشر میں جب وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوگا اس کی پیشانی پر لکھا ہوگا اَنْسَ مِنْ رَحْمَةِ اللّٰهِ (یعنی یہ شخص اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس کر دیا گیا ہے) (مظہری از ابن ماجہ واصبہانی)۔

اذہبی نے بروایت حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما حضرت معاویہؓ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر ایک گناہ کو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف کر دے مگر وہ آدمی جو حالت کفر میں مر گیا یا جس نے جان بوجھ کر قصد کسی مسلمان کو ناحق قتل کیا۔

قتل ناحق کی تفسیر | امام بخاری و مسلم نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی مسلمان کا خون حلال نہیں جو اللہ کے ایک ہونے اور میرے رسول ہونے کی شہادت دیتا ہو مجرتین صورتوں کے۔ ایک یہ کہ اس نے شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کیا ہو کہ اسکی شرعی مزایہ ہے کہ پھر اوکر کے اسکو مار دیا جائے، دوسرے وہ جسے کسی انسان کو ناحق قتل کیا ہو کہ اس کی تہذیب ہے کہ ولی مقتول اسکو قصاص میں قتل کر سکتا ہے (تیسرے وہ شخص جو دین اسلام سے مزند ہو گیا ہو کہ اس کی سزا بھی قتل ہے)۔

قصاص یعنی کا حق کسکو ہے | آیت مذکورہ میں بتلایا گیا ہے کہ یہ حق مقتول کے ولی کا ہے۔ اگر کسی ولی کوئی موجود نہیں تو اسلامی حکومت کے سربراہ کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ بھی ایک حیثیت سے سب مسلمانوں کا ولی ہے اسی لئے خلاصہ تفسیر میں ولی حقیقی یا حکی لکھا گیا ہے۔

ظلم کا جواب ظلم نہیں انصاف ہے | ظلم کا جواب ظلم نہیں انصاف ہے۔ مگر مگر کی سزائیں بھی انصاف کی رعایت میں بھی انصاف کی رعایت لازمی ہے جب تک ولی مقتول انصاف کے ساتھ اپنے مقتول کا انتقام شرعی قصاص کے ساتھ لینا چاہے تو قانون شریعت اس کے حق میں ہے یہ منصوص حق ہے اللہ تعالیٰ اس

کا مددگار ہے۔ اور اگر اس نے جوش انتقام میں شرعی قصاص سے تجاوز کیا تو اب یہ مظلوم کے بجائے ظالم ہو گیا اور ظالم اس کا مظلوم بن گیا اب معاملہ برعکس ہو جائے گا اللہ تعالیٰ اور اس کا قانون اب اس کی مدد کرنے کے بجائے دوسرے فریق کی مدد کرے گا کہ اس کو ظلم سے بچائے گا۔

جاہلیت عرب میں یہ بات عام تھی کہ ایک شخص قتل ہوا تو اس کے بدلہ میں قاتل کے خاندان یا ساتھیوں میں جو بھی ہاتھ لگے اس کو قتل کر دیتے تھے بعض جگہ یہ صورت ہوتی کہ جس کو قتل کیا گیا وہ قوم کا کوئی بڑا آدمی ہے تو اس کے بدلہ میں صرف ایک قاتل کو قصاصاً قتل کرنا کافی نہ سمجھا جاتا تھا بلکہ ایک نوحہ کے بدلہ دو تین یا اس سے بھی زیادہ آدمیوں کی جان لیجانی تھی بعض لوگ جوش انتقام میں قاتل کے صدمہ قتل کرنے پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ اس کی ناک کان وغیرہ کاٹ کر منسلک کر دیتے تھے یہ سب چیزیں اسلامی قصاص کی حد سے زائد اور حرام ہیں اس لئے آیت فَلَا يُبْرَأُ فِي الْقَتْلِ میں ان کو رد کیا گیا ہے۔

یاد رکھنے کے قابل ایک حکایت | بعض ائمہ مجتہدین کے سامنے کسی شخص نے حجاج بن یوسف پر کوئی الزام لگایا حجاج بن یوسف اسلامی تاریخ کا سب سے بڑا ظالم اور انتہائی بدنام شخص ہے جس نے ہزاروں مسایہ و تابعین کو ناحق قتل کیا ہے اس لئے عام طور پر اس کو بُرا کہنے کی برائی لوگوں کے ذہن میں نہیں رہتی جس بزرگ کے سامنے یہ الزام حجاج بن یوسف پر لگایا گیا انھوں نے الزام لگانے والے سے پوچھا کہ تمہارے پاس اس الزام کی کوئی سند یا شہادت موجود ہے انھوں نے کہا کہ نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ حجاج بن یوسف علیہ السلام سے ہزاروں مقتولین بے گناہ کا انتقام لے گا تو یاد رکھو کہ جو شخص حجاج پر کوئی ظلم کرتا ہے اس کو بھی انتقام سے نہیں چھوڑا جائے گا حجاج کا بدلہ اللہ تعالیٰ اس سے بھی لیں گے اللہ تعالیٰ کی عدالت میں کوئی جنبہ داری نہیں ہے کہ برے اور گناہگار بندوں پر درود کو آزاد چھوڑ دیں اور وہ جو چاہیں الزام و اہتمام لگا دیا کریں۔

وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ

اور پاس نہ جاؤ یتیم کے مال کے مگر جس طرح کہ بہتر ہو جب تک وہ پہنچے اپنی جوانی کو

وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا ۝۳۴ وَأَوْفُوا الْكَيْلَ إِذَا

اور پورا کرو عہد کو بے شک عہد کی پوری ہوگی اور پورا بھر دو ماپ جب

کُلْتُمْ وَزِنُوا بِالْقِسْطِ اسِ الْمُسْتَقِيمِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ۝۳۵

ماپ کر دینے لگو اور تولو سیدھی ترازو سے یہ بہتر ہے اور اچھا ہے اس کا انجام -

خلاصہ تفسیر

اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ (یعنی اس پر تصرف نہ کرو) مگر ایسے طریقہ سے جو کہ (شرعاً) مستحسن ہے یہاں تک کہ وہ اپنے سن بلوغ کو پہنچ جائے اور عہد (جائز) کو پورا کیا کرو بیشک عہد کی قیامت میں باز پرس ہونے والی ہے (عہد میں وہ تمام عہد بھی داخل ہیں جو بندہ نے اپنے اللہ سے کئے ہیں اور وہ بھی جو کسی انسان سے کئے ہیں) اور (ناپسے کی چیزوں کو) جب ناپ کر دو تو پورا ناپو اور (تو لے لے کی چیزوں کو) صحیح ترازو سے تول کر دو یہ (دنی نفسہ بھی) اچھی بات ہے اور انجام بھی اسکا اچھا ہے آخرت میں تو ثواب اور دنیا میں نیکنامی کی شہرت جو ترقی تجارت کا ذریعہ ہے)

معارف و مسائل

ان دو آیتوں میں تین حکم نواں۔ دسواں گیارہواں مالی حقوق کے متعلق مذکور ہیں سابقہ آیات میں بدنی اور جسمانی حقوق کا ذکر تھا یہ مالی حقوق کا بیان ہے۔ یتیموں کے مال میں احتیاط | ان میں پہلی آیت میں نواں حکم یتیموں کے اموال کی حفاظت اور انہیں احتیاط کا بے سمجھیں بڑی تاکید سے یہ فرمایا کہ یتیموں کے مال کے پاس بھی نہ جاؤ یعنی ان میں خلاف شرع یا بچوں کی مصلحت کے خلاف کوئی تصرف نہ ہونے پاوے یتیموں کے مال کی حفاظت اور انتظام جن کے ذمہ ہے ان پر لازم ہے کہ ان میں بڑی احتیاط سے کام لیں شرع یتیموں کی مصلحت کو دیکھ کر خرچ کریں اپنی خواہش یا بے فکری سے خرچ نہ کریں اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے جب تک کہ یتیم بچے جوان ہو کر اپنے مال کی حفاظت خود نہ کر سکیں جسکا ادنیٰ درجہ پندرہ سال کی عمر کو پہنچنا اور زیادہ اٹھارہ سال تک ہے۔

ناجائز طریقے پر کسی کا مال بھی خرچ کرنا جائز نہیں یہاں یتیموں کا خصوصیت سے ذکر اس لیے کیا کہ وہ تو خود کوئی حساب لینے کے قابل نہیں دوسروں کو اس کی خبر نہیں ہو سکتی جس جگہ کوئی انسان اپنے حق کا مطالبہ کرنے والا نہ ہو وہاں حق تعالیٰ کا مطالبہ اشد ہو جاتا ہے انہیں کو تا ہی عام لوگوں کے حقوق کی نسبت سے زیادہ گناہ ہو جاتی ہے۔

معاهدات کی تکمیل و تعمیل کا حکم | دسواں حکم عہد پورا کرنے کی تاکید ہے۔ عہد دو طرح کے ہیں ایک وہ جو بندہ اور اللہ کے درمیان ہیں جیسے ازل میں بندہ کا یہ عہد کہ بیشک اللہ تعالیٰ ہمارا رب ہے اس عہد کا لازمی اثر اس کے احکام کی اطاعت اور اس کی رضا جوئی ہوتا ہے۔ یہ عہد تو ہر انسان نے ازل میں کیا

ہے خواہ دنیا میں وہ مومن ہو یا کافر۔ دوسرا عہد مومن کا ہے جو شہادت ان لا الہ الا اللہ کے ذریعہ
کیا گیا ہے جسکا حاصل احکام الہیہ کا مکمل اتباع اور اس کی رضا جوئی ہے۔
دوسری قسم عہد کی وہ ہے جو انسان کسی انسان سے کرتا ہے جس میں تمام معاہدات سیاسی،
تجارتی، معاملاتی شامل ہیں جو افراد یا جماعتوں کے درمیان دنیا میں ہوتے ہیں۔

پہلی قسم کے تمام معاہدات کا پورا کرنا انسان پر واجب ہے اور دوسری قسم میں جو معاہدات
فلائع شرع نہ ہوں ان کا پورا کرنا واجب اور جو خلاف شرع ہوں ان کا فریق ثانی کو اطلاع کر کے ختم
کر دینا واجب ہے جس معاہدہ کا پورا کرنا واجب ہے اگر کوئی فریق پورا نہ کرے تو دوسرے کو حق ہے
کہ عدالت میں مراجعہ کر کے اسکو پورا کرنے پر مجبور کرے معاہدہ کی حقیقت یہ ہے کہ دو فریق کے درمیان
کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا عہد ہو اور جو کوئی شخص کسی سے یکطرفہ وعدہ کر لیتا ہے کہ میں آپکو
فلاں چیز دینگا یا فلاں وقت آپ سے ملوں گا یا آپ کا فلاں کام کر دینگا اس کا پورا کرنا بھی واجب ہے
اور بعض حضرات نے اسکو بھی عہد کے اس مفہوم میں داخل کیا ہے لیکن ایک فرق کے ساتھ کہ معاہدہ
فریقین کی صورت میں اگر کوئی خلاف درزی کرے تو دوسرا فریق اسکو بذریعہ عدالت تکمیل معاہدہ پر
مجبور کر سکتا ہے مگر یکطرفہ وعدہ کو عدالت کے ذریعہ جبراً پورا نہیں کر سکتا ہاں بلا عذر شرعی کے کسی سے
وعدہ کر کے جو خلاف درزی کرے گا وہ شرعاً گناہگار ہوگا حدیث میں اسکو عمل نفاق قرار دیا گیا ہے
اس آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا یعنی قیامت میں جیسے
فرائض و واجبات اور احکام الہیہ کے پورا کرنے یا نہ کرنے کا سوال ہوگا ایسا ہی باقی معاہدات کے
متعلق بھی سوال ہوگا یہاں حدیث اتنا کہہ کر چھوڑ دیا گیا کہ اس کا سوال ہوگا۔ آگے سوال کے بعد کیا ہونا
ہے اسکو مبہم رکھنے میں خطرہ کے عظیم ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

گیارہواں حکم لین دین کے معاملات میں ناپ تول پورا کرنے کی ہدایت اور اس میں
کمی کرنے کی ممانعت کا ہے جس کی پوری تفصیل سورۃ المطففین میں مذکور ہے۔
مسئلہ - حضرات فقہانہ فرمایا کہ آیت میں ناپ تول میں کمی کا جو حکم ہے اسکا حاصل یہ ہے کہ
جسکا جتنا حق ہے اس سے کم دینا حرام ہے اس لئے اس میں یہ بھی داخل ہے کہ کوئی ملازم اپنے منہ
اور غفرہ کام میں کمی کرے یا بنتا وقت دینا ہے اس سے کم دے یا مزدور اپنی مزدوری میں کام چھوڑ
کرے۔

ناپ تول میں کمی کی ممانعت | مسئلہ: اَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ تَفِيزُ سَحَرٍ مِّثْلٍ مِّثْلٍ
فرمایا کہ اس آیت میں ناپ تول پورا کرنے کی ذمہ داری بائع (بیچنے والے) پر ڈالی گئی ہے جس سے
معلوم ہو کہ ناپ تول پورا کرنے اور اس کو پورا کرنے کا ذمہ دار بائع ہے۔

آخر آیت میں آپ نول پر را کرنے کے مطلق فرمایا ذلک خیرٌ وَاَحْسَنُ تَاوِیلاً اس میں ناپ نول سچا اور برابر کرنے کے مطلق دو باتیں فرمیں ایک اس کا شیر (بہتر) ہونا اس کا حاصل یہ ہے کہ ایسا کرنا اپنی ذات میں اچھا اور بہتر بندہ بننے سے علاوہ عقلی اور طبعی طور پر بھی کوئی شرافت انسان ناپ نول کی کوئی کوئی اچھا نہیں سمجھ سکتا۔ دوسری بات یہ فرمانی کہ مال اور انجام اس کا بہتر ہے جس میں آخرت کا انجام اور حصول ثواب و جنت تو داخل ہے ہی اس کے ساتھ دنیا کے انجام کی بہتری کی طرف بھی اشارہ ہے کہ کسی تجارت کو اس وقت تک فروغ نہیں ہو سکتا جب تک بازار میں اسکی ساکھ اور اعتبار قائم نہ ہو اور وہ اس تجارتی دیانت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔

وَلَا تَقَفْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ

اور نہ تجھے جس بات کی خبر نہیں تھو کو بے شک کان اور آنکھ اور دل

كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ۝۳۷ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا

ان سب کی اس سے پوچھ ہوگی اور مت چل زمین پر اترتا ہوا

اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طَوْلًا ۝۳۸ كُلُّ ذٰلِكَ

تو بھاڑ نہ ڈالے گا زمین کو اور نہ پہنچے گا پہاڑوں تک لمبا ہو کر یہ جتنی باتیں ہیں

كَانَ سَيِّئُهُ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًُا ۝۳۹

ان سب میں بُری چیز ہے تیرے رب کی بیزاری۔

خلاصہ تفسیر

اور جس بات کی تجھ کو تحقیق نہ ہو اس پر غل مت کیا کرو (کیونکہ) کان اور آنکھ اور دل ہر شخص سے ان سب کی انیامت کے دن، پوچھ ہوگی (کہ) آنکھ اور کان کا استعمال کس کس کام میں کیا وہ کام اچھے تھے یا بُرے اور بے دلیل بات کا خیال دل میں کیوں بھایا، اور زمین پر اترتا ہوا مت چل (کیونکہ) تو (زمین پر زور سے پاؤں رکھ کر) نہ زمین کو بھاڑ سکتا ہے اور نہ اپنے بدن کو تان کر پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتا ہے (پھر اترنا غث، یہ سارے مذکورہ بے کام تیرے رب کے نزدیک بالکل ناپسند ہیں۔

معارف و مسائل

ان آیات میں دو حکم بار حواں اور تیر حواں عام معاشرت سے مطلق ہیں بار حواں حکم

میں بغیر تحقیق کے کسی بات پر عمل کرنے کی ممانعت فرمائی گئی ہے۔

یہاں یہ بات سامنے رکھنا ضروری ہے کہ تحقیق کے درجات مختلف ہوتے ہیں ایک ایسی تحقیق کہ یقین کامل کہ درجہ کو پہنچ جائے مخالف جانب کا کوئی شبہ بھی نہ رہے دوسرے یہ کہ گمان غالب کے درجہ میں آجائے اگرچہ جانب مخالف کا احتمال بھی موجود ہو۔ اس طرح احکام میں بھی دو قسم ہیں ایک قطعیات اور یشنیات ہیں جیسے عقائد اور اصول دین، انہیں پہلے درجہ کی تحقیق مطلوب ہے اس کے بغیر عمل کرنا جائز نہیں۔ دوسرے ظنیات جیسے فردی اعمال سے متعلق احکام، اس تفصیل کے بعد فقہی آیت مذکورہ کا یہ ہے کہ یقینی اور قطعی احکام میں تحقیق بھی درجہ اول کی ہو یعنی قطعیست اور یشنیات کامل کے درجہ کو پہنچ جائے اور جب تک ایسا ہو عقائد اور اصول اسلام میں اس تحقیق کا اعتبار نہیں اس کے مقتضی پر عمل جائز نہیں اور ظنی فردی امور میں دوسرے درجہ یعنی ظن غالب کے درجہ کی تحقیق کافی ہے۔ (بیان القرآن)

کان آنکھ اور دل کے متعلق | رَانَ السَّمُومُ وَالْغُفَاؤُكَ كَأَنَّكَ كَانَتْ عَنْهُ مَسْئُولًا۔ اس آیت قیامت کے روز سوال | میں بتلایا ہے کہ قیامت کے روز کان، آنکھ اور دل سے سوال کیا جائے گا

مطلب یہ ہے کہ کان اسے سوال ہوگا کہ تو نے عمر میں کیا کیا سنا آنکھ سے سوال ہوگا کہ تمام عمر میں کیا کیا دیکھا دل سے سوال ہوگا کہ تمام عمر دل میں کیسے کیسے خیالات پکائے اور کن کن چیزوں پر یقین کیا۔ اگر کان سے ایسی باتیں سنیں جنکا سننا شرعاً جائز نہیں تھا جیسے کسی کی غیبت یا حرام کھانا، بہانا وغیرہ یا آنکھ سے ایسی چیزیں دیکھیں جنکا دیکھنا شرعاً حلال نہ تھا جیسے غیر محرم عورت یا مرد لڑکے پر نظر بد کرنا وغیرہ یا دل میں کوئی ایسا عقیدہ جمایا جو قرآن و سنت کے خلاف ہو یا کسی کے متعلق اپنے دل میں بلا دلیل کوئی الزام قائم کر لیا تو اس سوال کے نتیجہ میں گرفتار عذاب ہوگا قیامت کے روز اللہ کی دہی ہوئی ساری ہی نعمتوں کا سوال ہوگا۔ لَسْتُمْ بِأَعْدِلَ عَنِ النِّعَمِ یعنی تم نے قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی سب نعمتوں کا سوال ہوگا، کان، آنکھ، دل ان نعمتوں میں سب سے زیادہ اہم ہیں اس لئے یہاں ان کا خصوصیت سے ذکر فرمایا گیا ہے۔

تفسیر قرطبی اور مظہری میں اس کا یہ مفہوم بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس سے پہلے جملہ میں جو یہ ارشاد کیا ہے کہ لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَبَسَ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ یعنی جس چیز کا تمہیں علم اور تحقیق نہیں اس پر عمل نہ کرو، اس کے متحمل کان، آنکھ اور دل سے سوال کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے بے تحقیق مثلاً کسی شخص پر کوئی الزام لگایا اور بلا تحقیق کسی بات پر عمل کیا اگر وہ ایسی چیز سے متعلق ہے جو کان سے نہ جانی ہو تو کان سے سوال ہوگا اور آنکھ سے دیکھنے کی چیز ہے تو آنکھ اور دل سے سمجھنے کی چیز ہے تو دل سے سوال ہوگا کہ شخص اپنے الزام اور اپنے دل میں جمائے ہوئے خیال میں سچا ہے یا جھوٹا اس پر انسان کے یا عناصر و خود شہادت دینگے جو شر کے میدان میں بے تحقیق الزام لگانے والے

اور بے تحقیق بالوں پر عمل کرنے والے کے لئے بڑی کڑی سزا ہے۔ اس کا سبب ہے کہ جیسا کہ سورہ لیس میں ہے اَلْيَوْمَ
نَخْتُمُ عَلَى الْمُشْرِكِينَ وَقَدْ اٰتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ اَنْ لَا يَحْلِلَ عَلَيْهِمْ جُلُودُ النَّاسِ وَنِصَابُهُمْ وَنُخَيِّرُ الْاِنْسَانَ اَيُّ شَيْءٍ يَشَاءُ
مَجْمُوعٍ كَثِيرٍ وَلَقَدْ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ اَنْ لَا يُشْرِكُوا بِاللّٰهِ شَيْئًا ۚ فَاُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْسِدُونَ
مجموعوں کے گنہگاروں پر مہر لگا کر بند کر دیں گے اور ان کے ہاتھ پائیوں کو اسی دیں گے کہ اس
نے ان اعضاء سے کیا کیا کام اچھے یا برے لئے ہیں۔

یہاں مکان، آئینہ اور دل کی تخیلیں شاید اس بنا پر کی گئی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ تو اس اور دل کا شعور و ادراک اس لئے بخشا ہے کہ جو خیالی یا عقیدہ دل میں آئے، ان کو اس اور ادراک کے ذریعہ اسکو جاننے سکے کہ یہ سچ ہے تو اس پر عمل کرے اور غلط ہے تو باز رہے۔ جو شخص ان سے کام لے لے بغیر بے فتنہ بالوں کی پیروی میں لگ گیا اس نے اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کی ناشکری کی۔

پھر وہ جو اس جن کے ذریعہ انسان مختلف چیزوں کو معلوم کرتا ہے پانچ ہیں۔ کان، آنکھ، ناک،
زبان کی قوتیں اور پورے بدن میں وہ احساس جس سے کسی چیز کا سرد و گرم وغیرہ ہونا معلوم ہوتا ہے مگر عادتاً زیادہ
معلومات انسان کو کان یا آنکھ سے ہوتی ہیں ناک سے سونگھنے اور زبان سے چکھنے۔ ہاتھ وغیرہ سے
چھونے کے ذریعہ جن چیزوں کا علم ہوتا ہے وہ سننے دیکھنے والی چیزوں کی نسبت سے بہت کم ہے
اس جگہ جو اس خمسہ میں سے صرف دو کے ذکر پر اکتفا کرنا تھا پیرس کی وجہ سے ہو چکا انہیں بھی کان کو
آنکھ پر مقدم کیا گیا ہے اور قرآن کریم کے دوسرے مواقع میں بھی جہاں کہیں ان دونوں چیزوں کا ذکر آیا ہے
انہیں کان ہی کو مقدم رکھا گیا ہے۔ اس کا سبب بھی ظاہر یہی ہے کہ انسان کی معلومات میں سب سے
بڑا حصہ کان سے سنی ہوئی چیزوں کا ہوتا ہے آنکھ سے دیکھی ہوئی چیزیں ان کی نسبت سے بہت کم ہیں
مذکورہ روایتوں میں سے دیکھ کر آیت میں تیر جو اس حکم پر ہے کہ زمین پر نازل کر نہ چلاؤ یعنی ایسی چال نہ
چلو جس سے کجراؤ، فخر و غرور، غیور و غرور ہو کہ یہ مختلف افعال ہے گویا زمین پر چل کر وہ زمین کو چلا دینا چاہتا
ہے جو اس کے بس میں نہیں اور شکر چسنے سے بہت اونچا ہونا چاہتا ہے اللہ تعالیٰ کے پہاڑ اس سے بہت
اوپر ہیں بکبر و دامن انسان کے دل نے تحقیق شریک یہ کہ یہ گناہ ہے انسان کے چال ڈھال میں جو
چیز میں بکبر پر دلالت کو سننے والی ہیں وہ بھی ناجائز نہیں بکبر از انداز سے چلنا خواہ زمین پر زور سے
نہ چلے اور تلوار اونچا نہ بنے ہر حال ناجائز ہیں کچھ کے معنی اپنے آپ کو دوسروں سے افضل والی سمجھنا اور
دوسروں کو اپنے مقابلہ میں کمتر و حقیر سمجھنا ہے حدیث میں اس پر سخت وعید دیا مذکور ہے۔

امام مسلم نے بروایت حضرت عیاض بن عمار رضی اللہ عنہما کی بات کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے پاس بذریعہ وحی یہ حکم بھیجا ہے کہ تو اس شخص اور اپنی اختیار کردہ کوئی آدمی کو دوسرے آدمی پر غرر اور اپنی برائی کا طرز اختیار نہ کرے اور کوئی کسی پر ظلم نہ کرے۔ (مظہری)

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت میں داخل

نہیں ہو گا وہ آدمی جس کے دل میں ذرہ کی برابر بھی کبر ہو گا (منظہری بحوالہ صحیح مسلم)
اور ایک حدیث ترمذی میں بروایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بڑائی میری چادر ہے اور عظمت میری ازار جو شخص مجھے انگوچینا
چاہے تو میں اس کو جہنم میں داخل کر دوں گا بچا در اور ازار سے مراد لباس ہے اور اللہ تعالیٰ مذہب ہے نہ
جسمانی جس کے لئے لباس درکار ہو اس لئے اس سے مراد اس جگہ اللہ تعالیٰ کی صفت کبریائی ہے جو شخص
اس صفت میں اللہ تعالیٰ کا شریک بننا چاہے وہ جہنمی ہے۔

اور ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کبر کر کے واسے نبی اس کے
دن چھوٹی چوٹیوں کے برابر انسانوں کی شکل میں اٹھائے جا دیں گے خیر ہر طرف سے ذلت و خواری
برسنتی ہوگی ان کو جہنم کے ایک جیلخانہ کی طرف ہانکا جائے گا جس کا نام بؤس ہے ان پر سب آنگوں سے
بڑی تیز آگ چڑھی ہوگی اور جینے کے لئے ان کو اہل جہنم کے بدن سے نکالا ہو اسیپ لہو دیا جائے گا (ترمذی)
بروایت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ (از منظہری)

اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے منبر پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
سے سنا ہے کہ جو شخص تواضع اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو سر بلند فرماتے ہیں تو وہ اپنے نزدیک تو چھپتا
مگر سب لوگوں کی نظروں میں بڑا ہوتا ہے اور جو شخص تکبر کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل کر دیتے ہیں تو وہ
خود اپنی نظر میں بڑا ہوتا ہے اور لوگوں کی نظریں وہ کٹے اور خمنہ پر سے بھی بدتر ہوتا ہے۔ (منظہری)
انکام مذکورہ کی تفصیل بیان کرنے کے بعد آخری سہ سببوں کی ذلت کا بیان فرمادیا۔
مذکورہ تمام برے کام اللہ کے نزدیک مکروہ و ناپسند ہیں۔

مذکورہ احکام میں جو محرمات و منہیات ہیں ان کا بڑا اور ناپسند ہونا ظاہر ہے مگر انہیں کچھ احکام ادا کر
بھی ہیں جیسے والدین اور اقرباء کے حقوق ادا کرنا اور وفا کے عہد و فیہ انہیں بھی چونکہ مقصود ان کی خدمت
سے بچنا ہے کہ والدین کی ایذا سے زنتہ داروں کی قطع رحمی سے نقصان عہد سے پرہیز کر دینے میں سب حرام
و ناپسند ہیں اسلئے مجموعہ کو مکروہ فرمایا گیا ہے (بیان القرآن)

تنبیہ مذکورہ پندرہ آیتوں میں جو احکام بیان کئے گئے ہیں وہ ایک حیثیت سے اس معنی و عمل کی
تشریح ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہوں جس کا ذکر اٹھارہ آیتوں سے پہلے آیا ہے وَتَسْعَىٰ لِمَا سَعَىٰ
جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ ہر معنی و عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول نہیں بلکہ صرف وہی جو رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کی سنت اور تعالیم کے مطابق ہو ان احکام میں اس مقبول معنی و عمل کے اہم ابواب کا ذکر آیا ہے
جس میں پہلے حقوق اللہ کا پھر حقوق العباد کا بیان ہے۔

یہ پندرہ آیتیں پوری تورات کا خلاصہ ہیں | حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ پوری تورات کے احکام

سورۃ بنی اسرائیل کی پندرہ آیتوں میں جمع کر دیئے گئے ہیں (منظہری)

ذٰلِكَ مِمَّا أَوْحَىٰ إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ

یہ ہے ان باتوں میں سے جو وحی کبھی تیرے رب نے تیری بات عقل کے کاموں سے اور نہ ظہر اللہ کے

اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ فَتُلْقَىٰ فِي جَهَنَّمَ مَلُومًا مَّدْحُورًا ۝۳۹

سورہ کسی اور کی بندگی بھڑے تو روزِ آخر میں الزام کھا کر دھکیلا جا کر

أَفَأَصْفَاكُمْ رَبُّكُم بِالْبَنِينَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلَائِكَةِ إِنَاثًا

کیا تم کو چین کر دے دیئے تمہارے رب نے بیٹے اور اپنے لئے کریم فرشتوں کو بیٹیاں

إِنَّا كُنَّا نَقُولُونَ قَوْلًا عَظِيمًا ۝۴۰ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ

تم کہتے ہو بھاری بات اور یہ کہہ کر سمجھایا ہم نے اس قرآن میں

لِيَذْكُرُوا وَمَا يُزِيدُهُمْ إِلَّا نُفُورًا ۝۴۱ قُلْ لَوْ كَانَ

تاکر وہ سوچیں اور ان کو زیادہ ہوتا ہے وہی پرکنا کہہ اگر جوتے اُس کے

مَعَهُ إِلَهَةٌ كَمَا يَقُولُونَ إِذًا لَّيُبْتَغُوا إِلَىٰ ذِي الْعَرْشِ

ساتھ اور حاکم جیسا یہ بتلاتے ہیں تو نکالتے صاحب عرش کی طرف

سَبِيلًا ۝۴۲ سُبْحَنَهُ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يَقُولُونَ عُلُوًّا كَبِيرًا ۝۴۳

راہ وہ پاک ہے اور برتر ہے اُن کی باتوں سے بے نہایت

نُسَبِّحُ لَهُ السَّمَوَاتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ وَإِنْ

اُس کی پاکی بیان کرتے ہیں ساتوں آسمان اور زمین اور جو کوئی اُن میں ہے اور وہی

مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَلَٰكِنْ لَا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ ۝۴۴

چیز نہیں جو نہیں بڑھتی خوبیاں اس کی لیکن تم نہیں سمجھتے اُن کا پڑھنا

إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا ۝۴۵

بے شک وہ ہے تحمل والا بخشنے والا -

خلاصہ تفسیر

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) یہ باتیں (یعنی احکام مذکورہ) اس نکتہ میں کی ہیں جو خدا تعالیٰ

سے آپ پر وہی سکڑا دیتے ہیں اور اسے مخالفین کے ساتھ کوئی اور جو دوجیز نہ کرنا ورنہ تو الزام خود وہ اور رائدہ ہو کر ختم ہیں پھینک دیا جائے گا اور احکام مذکورہ کو شروع کی توحید کے مضمون سے کیا گیا تھا ختم بھی اس پر کیا گیا اور آگے بھی اس مضمون توحید کا بیان ہے کہ جب اوپر شریک کا نتیجہ اور باطل پرہاس یا تو کیا دیکھو یہی ایسی باتوں کے قائل ہوئے جو توحید کے خلاف ہیں مثلاً یہ کہ ہمارے رب نے تم کو تو بیٹوں کے ساتھ خاص کیا ہے اور خود فرشتوں کو اپنی بیٹیاں بنائی ہیں (جیسا کہ عرب کے جاہل فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہا کرتے تھے جو دوجہ سے باطل ہے اول تو اللہ کے لئے اولاد قرار دینا پھر اولاد بھی لڑکیاں جن کو لوگ اپنے لئے پسند نہیں کرتے ناکارہ سمجھتے ہیں اس سے اللہ تعالیٰ کی طاعت ایک اور نقص کی نسبت ہوتی ہے، بیشک تم بڑی بات کہتے ہو اور دانوس تو یہ ہے کہ اس مضمون توحید اور شرک کے ابطال کی ہم نے اس قرآن میں طرہ طرہ سے بیان کر دیا ہے تاکہ اچھی طرح سمجھیں اور مختلف طاقتوں سے بار بار توحید کے اثبات اور شرک کے ابطال کے باوجود توحید سے، ان کو نفرت ہی بڑھتی جاتی ہے آپ کا ابطال شرک کے لئے ان سے فرمایا کہ اگر اس (مجموعہ برحق) کے ساتھ اور جمود بھی (شریک ہوئے جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں تو اس حالت میں عرش والے آجیتقی خدا تک اخلوئے زمین و آسمان کے جمودوں نے کبھی کوئی رائے نہ دھونڈ لیا ہو) ایسی جن کو تم اللہ کے ساتھ خدائی کا شریک قرار دیتے ہو اگر وہ ذاتی شریک ہوئے تو عرش والے خدا پر چڑھائی کر دیتے اور راستہ ڈھونڈ لیتے اور جب خداؤں میں جنگ ہو جاتی تو دنیا کا نظام کس طرح چلتا جس کا ایک خاص نظام حکم کے ساتھ چلتا ہے شخص شاہد کہ رہا ہے اس سے نظام عالم کا صحیح طور پر سمجھنا خود اسکی دلیل ہے کہ ایک خدا کے ہو کوئی دوسرا اسکا شریک نہیں ہے اس سے ثابت ہوا کہ یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ اس سے پاک اور اس سے بہت زیادہ بالا و برتر ہے وہ ایسا پاک ہے کہ تمام ساتوں آسمان اور زمین اور جتنے فرشتے آدنی اور حق ان میں باوجود جیسے سب کے سب قالایا حال اس کی پاکی بیان کر رہے ہیں اور یہ تسبیح صرف عقل والے انسان اور جن کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ زمین و آسمان کی کوئی چیز ایسی نہیں جو تعریف کے ساتھ اس کی پاکی بیان نہ کرتی ہو لیکن تم لوگ ان کی تسبیح (پاکی بیان کرنا) سمجھتے نہیں ہو بیشک وہ بڑا عظیم بڑا مغفور ہے۔

معارف و مسائل

توحید کا جو دلیل آیت اذ لا یلقوا میں بیان فرمائی ہے کہ اگر تم مکانات عالم کا خالق مانتے اور نفوس صرحت ایک ذات اللہ کی ہو بلکہ اس خدائی میں اور بھی شریک ہیں تو ضرور ہے کہ انہیں کبھی اختلاف بھی ہوگا اور اختلاف کی صورت میں سارا نظام عالم برباد ہو جائے گا کیونکہ ان سب میں دینی

صلیٰ ہونا اور ہمیشہ باقی رہنا عادتہ منتزع ہے یہ دلیل بیاں اگرچہ امتناعی انداز میں بیان کی گئی ہے مگر علم کلام کی کتابوں میں اس دلیل کا برہانی اور منطقی ہونا بھی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے اہل علم و ہاں دیکھ سکتے ہیں۔

زمین و آسمان اور ان میں موجود تمام چیزوں کے تسبیح کرنے کا مطلب | ان چیزوں میں فرشتے سب کے سب اور انسان و جن و جوہرین ہیں ان کا اللہ کی تسبیح کرنا تو بدیہی ہے جس جانتے ہیں کافر انسان اور جن جو بظاہر تسبیح نہیں کرتے اسی طرح عالم کی دوسری چیزیں جنکو کہا جاتا ہے کہ ان میں عقل و شعور نہیں ہے ان کے تسبیح پڑھنے کا مطلب کیا ہے بعض علماء نے فرمایا کہ ان کی تسبیح سے مراد تسبیح حال یعنی ان کے حالات کی شہادت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز کا مجموعی حال بتلا رہا ہے کہ وہ نہ اپنے وجود میں مستقل ہے نہ اپنے باقی رہنے میں اور کسی بڑی قدرت کے تابع چل رہا ہے یہی شہادت حال اس کی تسبیح ہے۔

مگر دوسرے اہل تحقیق کا قول یہ ہے کہ تسبیح اختیاری تو معبود فرشتے اور مومن جن و انس کے لئے مخصوص ہے مگر تنکوینی طور پر اللہ تعالیٰ نے کائنات کے ذرہ ذرہ کو اپنا تسبیح خواں بنا رکھا ہے کافر بھی اول تو عموماً خدا تعالیٰ کو مانتے اور اس کی عظمت کے قائل ہیں اور جو مادہ پرست دہریہ یا آجکل کے کمیونسٹ خدا کے وجود کے بظاہر قائل نہیں مگر ان کے وجود کا ہر جزو جزو بجزی طور پر اللہ کی تسبیح کر رہا ہے جیسے درخت اور پتھر وغیرہ سب چیزیں تسبیح حق میں مشغول ہیں مگر ان کی تسبیح جو جبری اور تنکوینی ہے یہ عام لوگ سنتے نہیں قرآن کریم کا ارشاد دَلِكُنَّ لَا تَقْضِيْنَ تَسْبِيْحَهُمْ اِمْ دِلَالَتِ كَرْتَابِهِ كِهْ يَرْذَرُ ذَرَّهُ كِي تَسْبِيْحُ كُوْنِي كُوْنِي اِيسِي چيز ہے جسكو عام انسان سمجھ نہیں سكتے تسبیح حال كو تو اہل عقل و فہم جان سكتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ یہ تسبیح صرف عالی نہیں تحقیقی ہے مگر ہمارے فہم و ادراک سے بالاتر ہے۔ (ذکرہ القزلبی)

حدیث میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مجزہ مذکور ہے کہ آپ کی مٹھی میں کنکروں کا تسبیح کرنا صحابہ کرام نے کانوں سے سنا اس کا معجزہ ہونا تو ظاہر ہے مگر خصائص کبریٰ میں شیخ جلال الدین سیوطی رح نے فرمایا کہ کنکروں کا تسبیح پڑھنا حضورؐ کا معجزہ نہیں وہ تو جہاں کہیں بھی تسبیح پڑھتی ہیں بلکہ مجزہ آپ کا یہ ہے کہ آپ کے دست مبارک میں آنے کے بعد ان کی وہ تسبیح کانوں سے سنی جانے لگی۔

امام قزلبی نے اسی تحقیق کو راجع قرار دیا ہے اور اس پر قرآن و سنت کے بہت دلائل پیش کئے ہیں مثلاً سورہ ہود میں حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے اِنَّا مَكَّنَّا اِلَیْہِا سُلٰتٰنًا بَآرِئًا وَاَوْثَرًا (یعنی ہم نے پہاڑوں کو مستحضر کر دیا کہ وہ داؤد علیہ السلام کے ساتھ تسبیح و شام تسبیح کر رہے ہیں اور

سورہ بنی اسرائیل کے پہاڑوں کے پتھروں کے متعلق ارشاد ہے اِنَّ فِيْهَا لَمَّا يَحِيطُ مِنْ خَشِيْعَةِ اللّٰهِ دِيْنِيْ بِهَارِ كَيْفِ تَقِيْرُ اللّٰهَ كَيْفَ خُوفَ سَمِيْعِيْ لَرَجَا سَمِيْعِيْ اِهْبَسَ سَمِيْعِيْ فِيْ شَعْوَرٍ وَاَدْرَاكٍ اَوْ رَحْمَةً كَا خُوفٍ هُوَ اَنْتَا بَاتِ
 ہوا اور سورہ مہم میں نصاریٰ کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہنے کی تردید میں فرمایا وَقَوْلُ الْيَٰحْيٰ
 هٰذَا اَنْتَ ذُوْ الْقُرْسِيِّ وَكَلِمَا اَيْعْنِيْ يٰ لَوْ كَيْفَ بِيْطَا تَجُوْزُ كَرْتَقِيْ اَنْتَ اِسْمُ كَلِمَةٍ كَفَرْتَقِيْ بِهَارِ وَفِيْ خُوفِ
 طاری ہو جاتا ہے اور وہ گرنے لگتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ یہ خوف ان کے شعور و ادراک کا پتہ دیتا ہے اور
 شعور و ادراک کے بعد تسبیح کرنا کوئی امر مستبعد نہیں رہتا۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا کہ ایک پہاڑ دوسرے پہاڑ سے کہتا ہے کہ اے فلاں کیا
 تیرے اوپر کوئی ایسا آدمی گناہ ہے جو اللہ کو یاد کرنے والا ہو اگر وہ کہتا ہے کہ ہاں تو یہ پہاڑ اس سے
 خوش ہوتا ہے اس پر استدلال کے لئے حضرت عبداللہ بن مسعود نے یہ آیت پڑھی وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا
 اور کچھ فرمایا کہ سب اس آیت سے یہ ثابت ہو کہ پہاڑ کلمات کفر سننے سے متاثر ہوتے ہیں ان پر خوف طاری
 ہو جاتا ہے تو کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ وہ باطل کلمات کو سنتے ہیں حق بات اور ذکر اللہ نہیں سنتے اور
 اس سے متاثر نہیں ہوتے قرطبی جو والد ثاقب ابن مبارک، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
 فرمایا کہ کوئی جن اور انسان اور درخت اور پتھر اور ڈھیلہ ایسا نہیں جو موزن کی آواز سنتا ہے اور
 قیامت کے روز اس کے ایمان اور نیک ہونے کی شہادت نہ دے، موطا امام مالک و سنن ابن ماجہ
 بروایت ابی سعید خدری رضی

امام بخاری نے بروایت حضرت عبداللہ بن مسعود نقل کیا ہے کہ ہم کھانے کی تسبیح کی آواز سنا
 کرتے تھے جبکہ وہ کھایا جا رہا ہو اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 کے ساتھ کھانا کھاتے تو کھانے کی تسبیح کی آواز نہ کرتے تھے اور صحیح مسلم میں بروایت حضرت جابر بن عبد
 اللہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں مکہ مکرمہ کے اس پتھر کو پہچانتا ہوں جو بخت
 و نبوت سے پہلے مجھے سلام کیا کرتا تھا اور میں اب بھی اس کو پہچانتا ہوں بعض حضرات نے کہا کہ اس سے
 مراد حجر اسود ہے واللہ اعلم۔

امام قرطبی نے فرمایا کہ روایات حدیث اس طرح کے معاملات میں بہت ہیں اور اسطوارہ خانہ
 کی حکایت تو عام مسلمانوں کی زبان زد ہے جس کے رونے کی آواز صحابہ کرام نے سنی جبکہ رسول اکرم
 صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ کے وقت اسکو چھو کر منبر پر غلبہ دینا شروع کیا۔

ان روایات کے بعد اس میں کیا بعد رہتا ہے کہ زمین و آسمان کی ہر چیز میں شعور و ادراک
 ہے اور یہ حقیقتی طور پر اللہ کی تسبیح کرتی ہے اور ہر چیز کو اللہ کی تسبیح عام ہے ذی و
 چیزوں میں بھی اور غیر ذی رون چیزوں میں بھی یہاں تک کہ دروازے کے کواڑوں کی آوازیں بھی تسبیح

چند عام قریشی نے فرمایا کہ اگر تیس دن سے مراد تیس سال چالی ہوتی تو مذکورہ آیت میں حضرت داؤد کی کیا تخصیص رہتی تیس سال تو ہر انسان کی عمر ہے اور تیس روز سے معلوم کر سکتے ہیں کہ اس سے کچھ بڑھ کر ہے کہ یہ تیس سال تو لی تھی اور اور یہ کیا کہ وہ انہیں کہہ کر اور نقش کیا ہے کہ انکروں کا تیس سال چھنا سبزو نہیں وہ ہر طبقہ پر حال اور ہر وقت میں ہے مہربان حضرت مسی اللہ علیہ وسلم کا عجزو یہ تھا کہ آپ کے دست مبارک میں آنے کے بعد ان کی تیس سال اس طرح ہو گئی کہ عام لوگوں نے کانوں سے سنا اس طرح پہاڑوں کی تیس سال بھی حضرت داؤد علیہ السلام کا عجزو اسی حیثیت سے ہے کہ ان کے عجزو سے وہ تیس سال کانوں سے سنے کے قابل ہو گئی واللہ اعلم

وَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِينَ لَا

اور جب تو پڑھتا ہے قرآن کر دیتے ہیں پہنچ میں تیرے اور ان لوگوں کے جو نہیں

يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُورًا ۝۵۱ وَجَعَلْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ

مانتے آخرت کو ایک پردہ چھپا ہوا اور ہم رکھتے ہیں ان کے دلوں پر

اَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ۝ وَإِذَا ذُكِّرْتْ

پردہ کر اس کو نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں بوجھ اور جب ذکر کرتا ہے تو

رَبَّكَ فِي الْقُرْآنِ وَحْدَهُ وَلَوْ أَنَّهُمْ نَفُورًا ۝۵۲

قرآن میں اپنے رب کا اکیلا کر کے بھاگتے ہیں اپنی پیٹھ پر بیک کر

فَعَنْ أَعْلَمَ مَا يَسْمَعُونَ ۚ إِذْ يَسْمَعُونَ إِلَيْكَ وَإِذْ هُمْ مُخَوِّ

ہم خوب جانتے ہیں اس واسطے وہ سنتے ہیں جس وقت کہ ان رکھتے ہیں تیری طرف اور جب وہ شہوت کرتے

إِذْ يَقُولُ الظَّالِمُونَ إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلًا مَسْهُورًا ۝۵۳ أَنْظِرْ

ہیں جبکہ کہتے ہیں اے افسانہ جس کے کہے پر تم چلتے ہو وہ نہیں ہے مگر ایک مود جادو کا مارا دیکھ لے

كَيْفَ ضَرَبُوا لَكَ الْأَمْثَالَ فَضَلُّوا فَلَا يَسْتَطِيعُونَ سَبِيلًا ۝۵۴

کیسے جاتے ہیں تم پر مثالیں اور بھٹکتے پھرتے ہیں سو راہ نہیں پاسکتے

خلاصہ تفسیر

سابقہ آیات میں یہ ذکر تھا کہ توحید کا مضمون قرآن مجید میں مختلف عنوان سے مختلف دلائل کے

سختابار بار ذکر ہونے کے باوجود یہ بدغیب شریکین اسکو نہیں جانتے، ان آیات میں ان کے نہ ماننے کی وجہ بتلائی گئی ہے کہ یہ ان آیات میں فوراً فکری نہیں کرتے بلکہ ان سے نفرت اور متنفر کرتے ہیں اس لئے ان کو علم حقیقت سے اندھا کر دیا گیا ہے۔ خلاصہ تفسیر یہ ہے۔

اور جب آپ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) قرآن پڑھتے ہیں تو ہم آپ کے اور ان لوگوں کے درمیان ایک پردہ حائل کر دیتے ہیں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور وہ پردہ یہ ہے کہ ہم ان کے دلوں پر حجاب ڈال دیتے ہیں اس سے کہ وہ اس قرآن کے مقصود کو سمجھیں اور ان کے کانوں میں بوجھ ڈال دیتے ہیں اس سے کہ وہ ان کو ہدایت حاصل کرنے کے لئے ہمیں مطلب یہ ہے کہ وہ پردہ ان کی ناہمی کا اور اس کا ہے کہ وہ سمجھنے کا ارادہ ہی نہیں کرتے جس سے وہ آپ کی شان نبوت کو پہچان سکیں اور جب آپ قرآن میں صریح اپنے رب (کے اوصاف و کمالات) کا ذکر کرتے ہیں اور یہ لوگ جن معبودوں کی عبادت کرتے ہیں انہیں وہ اوصاف ہی نہیں (تو وہ لوگ) اپنی ناہمی بلکہ ناہمی کے سبب اس سے نفرت کرتے ہوئے پشت پھیر کر چلے جاتے ہیں (آگے ان کے اس عمل باطل پر وعید ہے کہ جس وقت یہ لوگ آپ کی طرف کان لگائے ہیں تو ہم خوب جانتے ہیں جس غرض سے یہ (قرآن کو) سنتے ہیں (کہ وہ غرض محض اعتراض اور طعن و نکتہ چینی کی ہے) اور جس وقت یہ لوگ (قرآن سننے کے بعد) آپ سے ہر گوشیاں کرتے ہیں ہم اسکو بھی خوب جانتے ہیں، جبکہ یہ ظالم یوں کہتے ہیں کہ تم لوگ یعنی ان کی برادری میں سے جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لگے ہیں، محض ایسے شخص کا ساتھ دے رہے ہو جس پر جادو کا (خاص اثر یعنی جنوں کا) ہو گیا ہے یعنی یہ جو عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں یہ سب بالیہو لیا ہے۔ اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ذرا آپ دیکھئے تو یہ لوگ آپ کے لئے کیسے کیت القاب تجویز کرتے ہیں سو یہ لوگ بالکل ہی گمراہ ہو گئے تو اب حق کا راستہ نہیں پاسکتے کیونکہ ایسی بات دھرمی اور فساد اور کفر اللہ کے رسول کے ساتھ ایسا معاملہ اس سے انسان کی استعداد و فہم و ہدایت سلب ہو جاتی ہے۔

معارف و مسائل

بغیب یہ جادو کا اثر ہو سکتا ہے | کسی نبی اور پیغمبر پر جادو کا اثر ہو جانا ایسا ہی ممکن ہے جیسا بیماری کا اثر ہو جانا اس لیے کہ انبیاء علیہم السلام بشری خواص سے الگ نہیں ہوتے جیسے ان کو زخم لگ سکتا ہے، بخار اور درد ہو سکتا ہے ایسے ہی جادو کا اثر بھی ہو سکتا ہے کیونکہ وہ بھی خواص اسباب طبیعیہ سے متصف ہوتا ہے اور حدیث میں ثابت بھی ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کا اثر ہوا تھا آخری آیت میں جو کفار نے آپ کو سحر کہا اور قرآن نے اسکی تردید کی اسکا حاصل

وہ بہت جس کی طرف فلاحیہ تفسیر میں اشارہ کر دیا گیا ہے کہ ان کی مراد درحقیقت مسکو رکھنے سے مجنون کہنا تھا اسی کی تردید قرآن نے فرمائی ہے اس لئے حدیث سحر اسکے خلاف اور متعارض نہیں۔

آیات مذکورہ میں سے پہلی دوسری آیت میں جو مضمون آیا ہے اسکا ایک خاص شان نزول ہے جو قریش نے عید بن عبیدہ کے قتل کیا ہے کہ جب قرآن میں سورہ تبت یٰ اہل البیاء نازل ہوئی تھی تو ابولہب کی بیوی کی بھی مذمت مذکور ہے تو اس کی بیوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں تھی اس وقت حدیث کہ ابولہب میں موجود تھا اس کو دور سے دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کیا کہ آپ یہاں سے تم شہجائیں تو بہت ہے کیونکہ یہ عورت بڑی بد زبان ہے یہ ایسی باتیں کہے گی جس سے آپ کو تکلیف پہونچے گی آپ نے فرمایا نہیں اس کے اور میں سے در بیان اللہ تعالیٰ پر وہ عامل کر دیں گے چنانچہ وہ ابولہب میں پہونچی مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھ سکی تو صدیق اکبر سے مخاطب ہو کر کہنے لگی کہ آپ کے ساتھی نے ہماری بیوی کی ہے صدیق اکبر نے فرمایا کہ واللہ وہ تو کوئی شاعر ہی نہیں کہتے جس میں مادۂ بیوی کی بات ہے تو وہ کہتی ہوئی چلی گئی کہ تم بھی ان کی تصدیق کرنے والوں میں سے ہو اس کے چلے جانے کے بعد صدیق اکبر نے عرض کیا کہ کیا اس نے

آپ کو نہیں دیکھا آپ نے فرمایا کہ جب تک وہ یہاں رہی ایک فرشتہ میرے اور اسکے درمیان پردہ کرتا رہا دشمنوں کی نظر سے مستور | حضرت کعب فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مشرکین سے ملے گا ایک عمل کی آنکھوں سے مستور ہونا چاہتے تو قرآن کی تین آیتیں پڑھ لیتے تھے

اس کے اثر سے کفار آپ کو نہ دیکھ سکتے تھے وہ تین آیتیں یہ ہیں ایک آیت سورہ کہف میں ہے اِنَّا جَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَفْقَهُوْهُ وَفِیْ اَٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۝ دوسری آیت سورہ نمل میں ہے اُولَٰئِكَ الَّذِیْنَ صَبَّحَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوبِهِمْ وَاسْمَعَتْهُمْ وَاَنْصَبَ رِجْلًا ۝ تیسری آیت سورہ جاثیہ میں ہے اَفَرَأٰیئْتُمْ مَنِ اخَذَ الْمَالَ هَوٰیۃً وَاَضَلَّہُ اللّٰهُ عَلٰی عَمَلِہٖ وَخَدَّہٗ عَلٰی سَبْحِہٖ وَفَلَبَّ وَجَعَلْ عَلٰی بَصَرِہٖ عَشْوًا ۝

حضرت کعب فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معاملہ میں نے ملک شام کے ایک شخص سے بیان کیا اسکو کسی ضرورت سے رومیوں کے ملک میں جانا تھا وہاں گیا اور ایک زمانہ تک وہاں مقیم رہا پھر رومی کفار نے اسکو تباہ و ہاں سے جاگ نکالا ان لوگوں نے اسکا تعاقب کیا اس شخص کو وہ روایت یاد آئی اور مذکورہ تین آیتیں پڑھیں قدرت نے ان کی آنکھوں پر ایسا پردہ ڈالا کہ جس راستہ پر پہل رہے تھے اسی راستہ پر دشمن گذر رہے تھے مگر وہ ان کو نہ دیکھ سکتے تھے امام شعبی کہتے ہیں کہ حضرت کعب سے جو روایت نقل کی گئی ہے میں نے اسے کے دہنے والے ایک شخص کو بتلایا اتفاق سے دہلیم کے کفار نے اسکو گرفتار کر لیا کچھ عرصہ ان کی قید میں رہا پھر

ایک روز موقع پا کر سجاگ کھڑا ہوا۔ یہ لوگ اس کے تعاقب میں نکلے مگر اس شخص نے بھی یہ تین آیتیں پڑھ لیں اس کا یہ اثر ہوا کہ اللہ نے ان کی آنکھوں پر ایسا پردہ ڈال دیا کہ وہ اس کو نہ دیکھ سکے حالانکہ ساتھ ساتھ پہل رہتے تھے۔ اور ان کے پیچھے ان کے پیروں سے چھو جاتے تھے۔

اما قرطبی کہتے ہیں کہ ان تینوں کے ساتھ وہ آیات سورہ یسین کی بھی ملالی جائیں جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے وقت پڑھا تھا جبکہ مشرکین مکہ نے آپ کے مکان کا محاصرہ کر رکھا تھا آپ نے یہ آیات پڑھیں۔ اور ان کے درمیان سے نکلتے ہوئے چلے گئے بلکہ ان کے سروں پر مٹی ڈالتے ہوئے گئے انہیں سے کسی خبر نہیں ہوئی وہ آیات سورہ یسین کی یہ ہیں۔

وَالشَّانِ الْمَخِيمِ ۝ إِنَّكَ يَا أُنَاسُ تَسِيدُونَ عَلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝ تَنْزِيلُ الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ۝ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ۝ لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۝ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ۝ لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۝

ام قرطبی فرماتے ہیں کہ مجھے خود اپنے ملک اندلس میں قرطبہ کے قریب قلعہ غنور میں یہ واقعہ پیش آیا کہ میں دشمن کے سامنے بھاگا اور ایک گوشہ میں بیٹھ گیا دشمن نے دو گھوڑے سوار میرے تعاقب میں بھیجے اور میں بالکل کھلے میدان میں تھا کوئی چیز پر وہ کرنے والی نہ تھی مگر میں سورہ یسین کی یہ آیتیں پڑھی۔ ہاتھ یہ دو نوں سوار میری برابر سے گزرے پھر وہاں سے آئے تھے یہ کہتے ہوئے لوٹ گئے کہ یہ شخص کوئی شیطان ہے کیونکہ وہ مجھے دیکھ نہ سکے اللہ تعالیٰ نے ان کو مجھ سے اندھا کر دیا تنہا۔ (قرطبی)

وَقَالُوا ۖ إِذَا كُنَّا عِظَامًا وَرُفَاتًا ۖ إِنْ أَلْبَعُوثُونَ خَلْقًا جَدِيدًا ۝

اور کہتے ہیں کہ جب ہم ہڈیاں اور چورا چورا پھر اٹھیں گے نئے بن کر

قُلْ كُونُوا حِجَارًا أَوْ حديدًا ۝ أَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِي صُدُورِكُمْ ۝

تو کہہ دو کہ تم ہو جاؤ چٹھر یا لوہا یا کوئی خلقت جس کو مشکل سمجھو اپنے جی میں

فَسَيَقُولُونَ مَنْ يَعِيدُ نَا ۖ قُلِ الَّذِي فَطَرَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ ۖ

پھر وہ کہیں گے کون ڈرا کرے کہ ہم کو کہ جس نے پیدا کیا تم کو پہلی بار

فَسَيُبَخِّصُونَ إِلَيْكَ مِرَّةً وَهُمْ يَقُولُونَ ۖ مَثًى هُوَ ۖ قُلْ عَسَىٰ

بمیرا اب تمہاری طرف سے تیری طرف اپنے سر اور کہیں گے کب ہو گا یہ تو کہہ شاید

أَنْ يَكُونُ قَرِيبًا ۝ يَوْمَ يَدْعُوكُمْ فَتَسْتَجِيبُونَ بِحَمُولَةٍ

نزدیک ہی ہوگا جس دن تم کو پکارے گا پھر یہ آؤ گے اس کی تعظیم کرتے ہوئے

وَتَظُنُّونَ إِنْ لَّبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا ۝

اور اکل گز گے کہ دیر نہیں لگی تم کو مگر تھوڑی

خلاصہ تفسیر

یہ لوگ کہتے ہیں کہ جب ہم (مرکر) ہڈیاں اور ہڈیوں کا بھی پورا یعنی ریزہ ریزہ ہو جاویں گے تو کیا اس کے بعد قیامت میں ہم از سر نو پیدا اور زندہ کئے جاویں گے یعنی اول تو مر کر زندہ ہونا ہی مشکل ہے کہ جسم میں زندگی کی صلاحیت نہیں رہی پھر جبکہ وہ جسم ہی ریزہ ریزہ ہو کر اس کے اجزاء منتشر ہو جاویں تو اس کے زندہ ہونے کو کون مان سکتا ہے آپ (ان کے جواب میں) فرمادیں گے کہ تم تو ہڈیوں ہی کی حیات کو بعید سمجھتے ہو اور ہم کہتے ہیں کہ تم پتھر یا لوہا یا اور کوئی ایسی مخلوق ہو کر دیکھو جو تمہارے ذہن میں زندگی کی صلاحیت سے بہت ہی بعید ہو پھر دیکھو کہ زندہ کئے جاؤ گے یا نہیں اور پھر اور لوہے کو بعید از حیات قرار دینا اس سے ظاہر ہے کہ انہیں کسی وقت بھی حیات حیوانی نہیں آتی بخلاف ہڈیوں کے کہ ان میں پہلے اس وقت تک حیات رہ چکی ہے تو جب پتھر لوہے کا زندہ کرنا اللہ کے لئے مشکل نہیں تو اعضاء کے انسانی کو دوبارہ زندگی بخش دینا کیا مشکل ہوگا اور آیت میں لفظ کوذا جو معنیٰ امر ہے اس سے مراد یہاں امر نہیں بلکہ ایک تعلیق اور شرط ہے کہ اگر تم بالضرر تمہارا لوہا بھی ہو جاؤ تو اللہ تعالیٰ بھی تمہیں دوبارہ زندہ کر دینے پر قادر تھا اس کو وہ لوہے کے کہ وہ کون سے جو دوبارہ ہم کو زندہ کرے گا آپ فرمادیں گے کہ وہ وہ ہے جس نے تم کو اول بار میں پیدا کیا تھا اصل بات یہ ہے کہ کسی چیز کے وجود میں آنے کے لئے دو چیزیں درکار ہیں ایک مادہ اور عمل میں وجود کی قابلیت دوسرے اس کو وجود میں لانے کے لئے قوت فاعل پہلا سوال عمل کی قابلیت کے متعلق تھا کہ وہ مرنے کے بعد زندگی کے قابل نہیں رہا اس کا جواب دیکر عمل کی قابلیت ثابت کر دی گئی تو یہ دوسرا سوال فاعلیت کے متعلق کیا گیا کہ آیا کوئی قوت و قدرت والا ہے جو اپنی قوت فاعلیت سے یہ عجیب کام کر سکے اس کے جواب میں فرمادیا گیا کہ جس نے پہلے تمہیں ایسے مادے سے پیدا کیا تھا جس میں قابلیت حیات کا کسی کو گمان بھی نہ تھا تو اس کو دوبارہ پیدا کر دینا کیا مشکل ہے اور جب قابل و فاعل دونوں کا سوال حل ہو گیا تو اب یہ لوگ زمانہ وقوع کی تحقیق کے لئے، آپ کے آگے سر ہلا کر کہیں گے کہ (اچھا یہ بتلائیے کہ) یہ زندہ ہونا

کب ہوگا آپ زیادہ دیکھیں کہ عجب نہیں کہ یہ قریب ہی آ پہنچا ہو آگے ان حالات کا بیان ہے جو اس نئی زندگی کے وقت پیش آویں گے، یہ اس روز ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تم کو زندہ کرنے اور میدانِ حشر میں جمع کرنے کے لئے فرشتہ کے ذریعہ، پکارے گا اور تم ربا غلط رو، اس کی تہہ کرتے ہوئے حکم کی تعمیل کرو گے (یعنی زندہ بھی ہو جاؤ گے اور میدانِ حشر میں جمع بھی ہو جائیں گے) اور اس روز کی ہول اور عیبیت دیکھ کر تمہارا یہ حال ہو جائیگا کہ دنیا کی ساری عمر اور قبر میں رہنے کی ساری مدت کی نسبت، تم یہ خیال کرو گے کہ تم بہت ہی کم مدت دنیا میں رہے تھے (کیونکہ دنیا اور قبر میں آج کی ہولناکی کے متبادل میں کچھ کچھ نہ کچھ راحت تھی اور راحت کا زمانہ انسان کو مصیبت پڑنے کے وقت بہت مختصر معلوم ہوا کرتا ہے)

معارف و مسائل

يَوْمَ يَدْعُوكُمْ تَسْتَجِيبُونَ بِحَمْدِ اللَّهِ الَّذِي كُنْتُمْ تُشْرِكُونَ اذْهَبْ لَكَ عَارُكَ عَنْ شَيْءٍ بَعْدَ مَا كُنْتَ تَعْبُدُ اذْهَبْ لَكَ عَارُكَ عَنْ شَيْءٍ بَعْدَ مَا كُنْتَ تَعْبُدُ
دیکر بلانے کے ہیں اور معنے یہ ہیں کہ جس روز اللہ تعالیٰ تم سب کو حشر کی طرف بلائے گا اور یہ بلانا بواسطہ فرشتہ اسماعیل کے ہوگا کہ جب وہ دوسرا صویر پھونکیں گے تو سب مردے زندہ ہو کر میدانِ حشر میں جمع ہو جائیں گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زندہ ہونے کے بعد سب کو میدانِ حشر میں جمع کرنے کے لئے آواز دی جائے (قرطبی)

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "قیامت کے روز کو تمہارے اپنے اور باپ کے نام سے پکارا جائے گا اس لئے اپنے نام اچھے رکھا کرو ورنہ یہ وہ ناموں سے پرہیز کرو، (قرطبی)

مشرکین کفار بھی اللہ کی حمد و ثناء کرتے اٹھیں گے
فَتَسْتَجِيبُونَ بِحَمْدِ اللَّهِ الَّذِي كُنْتُمْ تُشْرِكُونَ
استجابات کے معنے کسی کے بلانے پر حکم کی تعمیل کرنے اور حاضر ہو جانے کے ہیں معنے یہ ہیں کہ میدانِ حشر میں جب تم کو بلایا جاوے گا تو تم سب اس آواز کی اطاعت کرو گے اور جمع ہو جاؤ گے۔ یہ تصحیدوں کی ضمیر فاعل کا حال ہے یعنی مائدین مراد یہ ہے کہ اس میدان میں آنے کے وقت تم سب کے سب اللہ کی حمد و ثناء کرتے ہوئے حاضر ہو گے۔

اس آیت کے ظاہر سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مومن و کافر سب کا یہی حال ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے ہوئے اٹھیں گے کیونکہ اس آیت میں اصل خطاب کفار ہی کو ہے انھیں کے متعلق یہ بیان ہو رہا ہے کہ سب حمد کرتے ہوئے اٹھیں گے ائمہ تفسیر میں حضرت عبید بن جریہؓ نے فرمایا کہ کفار بھی اپنی قبروں سے نکلنے وقت تَسْبِيْحًا لَكَ وَحَمْدًا لَكَ کے الفاظ کہتے ہوئے نکلیں گے مگر اس وقت کا حمد و ثناء

وَالْأَرْضِ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّنَ عَلَى بَعْضٍ وَاتَيْنَا دَاوُدَ زَبُورًا ۝

اور زمین میں اور ہم نے افضل کیا ہے بعض پیغمبروں کو بعضوں سے اور دی ہم نے داؤد کو زبور۔

خلاصہ تفسیر

اور آپ میرے (مسلمان) بندوں سے کلمہ بھیجئے کہ (اگر کفار کو جواب دیں تو) ایسی بات کہا کریں جو اخلاق کے اعتبار سے بہتر ہو (یعنی انہیں سب دشتم اور تشدد اور اشتعال انگیزی نہ ہو کیونکہ شیطان سخت بات کہلو کر، لوگوں میں فساد ڈلوادیتا ہے۔ واقعی شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے اور وجہ اس تعلیم کی یہ ہے کہ سختی سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور ہدایت و گمراہی تو شیت ازلیہ کے تابع ہے) تم سب کا حال تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے (کہ کون کس قابل ہے بس) اگر وہ چاہے تو تم میں سے جس پر چاہے رحمت فرمادے (یعنی ہدایت کر دے) یا اگر وہ چاہے تو تم میں سے جس کو (چاہے) عذاب دینے لگے (یعنی اس کو توفیق اور ہدایت نہ دے) اور ہم نے آپ (تک) کو ان کی ہدایت کا ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا (اور جب باوجود نبی ہونے کے آپ ذمہ دار نہیں بنائے گئے تو دوسروں کی کیا مجال ہے اس لئے کسی کے درپے ہونا اور سختی کرنا بے فائدہ ہے)

اور آپ کا رب خوب جانتا ہے ان کو (بھی) جو کہ آسمانوں میں ہیں اور ان کو بھی جو کہ زمین میں ہیں (آسمان والوں سے مراد فرشتے اور زمین والوں سے مراد انسان اور جنات ہیں مطلب یہ تو کہ ہم خوب واقف ہیں کہ ان میں سے کس کو نبی اور رسول بنانا مناسب ہے کس کو نہیں اس لئے اگر ہم نے آپ کو نبی بنا دیا تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے) اور را سبط رح اگر ہم نے آپ کو دوسروں پر فضیلت دیدی تو تعجب کیا ہے کیونکہ ہم نے پہلے بھی (بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت دی ہے اور اسی طرح اگر ہم نے آپ کو قرآن دیا تو تعجب کی کیا بات ہے کیونکہ آپ سے پہلے ہم داؤد کو زبور دے چکے ہیں۔

معارف و مسائل

بدزبانی اور سخت کلامی | پہلی آیت میں جو مسلمانوں کو کافروں کے ساتھ سخت کلامی سے منع کفار کی انتہا بھی درست نہیں کیا گیا ہے اسکی مراد یہ ہے کہ بے ضرورت سختی نہ کی جاوے اور ضرورت ہو تو قتل تک کرنے کی اجازت ہے۔

کہ بے حکم شرع آب خوردن خطاست و اگر خون بختوی بریزی رواست

تس قتل ہوتا ہے ذریعہ کفر کی شوکت اور اسلام کی مخالفت کو دبایا جاسکتا ہے اس لئے اس کی اجازت ہے۔ گالی گلوٹی اور سخت کلامی سے نہ کوئی قلعہ فتح ہوتا ہے نہ کسی کو ہدایت ہوتی ہے اس لئے اس سے منع کیا گیا ہے۔ امام قرطبی نے فرمایا کہ یہ آیت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ایک واقعہ میں نازل ہوئی جسکی صورت یہ تھی کہ کسی شخص نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو گالی دی اسکے جواب میں انہوں نے بھی اسکو سخت جواب دیا اور اس کے قتل کا ارادہ کیا اس کے نتیجہ میں خطرہ پیدا ہو گیا کہ دو قبیلوں میں جنگ چھڑ جائے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اور قرطبی کی تفسیر یہ ہے کہ اس آیت میں مسلمانوں کو آپس میں خطاب کرنے کے متعلق ہدایت ہے کہ باہم اختلاف کے وقت سخت کلامی نہ کیا کریں کہ اس کے ذریعہ شیطان ان کے آپس میں جنگ و فساد پیدا کر دیتا ہے۔

وَأَتَيْنَا دَاوُدَ زَبُورًا - یہاں خاص طور پر زبور کا ذکر شاید اس لئے کیا گیا ہے کہ زبور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ خبر دی گئی ہے کہ آپ رسول ہو پھر ہونے کے ساتھ صاحب ملک و سلطنت بھی ہوں گے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْمُسْلِمِينَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ اور موزورہ زبور میں بھی بعض حضرات نے اس کا ذکر ہونا ثابت کیا ہے۔ (تفسیر حقانی)

امام ابوہریرہ نے اپنی تفسیر میں اس جگہ لکھا ہے کہ زبور اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی اس میں ایک سو پچاس سورتیں ہیں اور تمام سورتیں صحت دعاء اور حمد و ثناء پر مشتمل ہیں ان میں حلال و حرام اور فرائض و حدود و کا بیان نہیں ہے۔

قُلْ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ مِنْ دُونِهِ فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفَ الضُّرِّ

کہہ پکارو جن کو تم سمجھتے ہو سوائے اُس کے سو وہ اختیار نہیں رکھتے کہ کھول دیں تکلیف کو

عَنْكُمْ وَلَا تَحْيُولًا ۝ اُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ

تم سے اور نہ بدل دیں وہ لوگ جن کو یہ پکارتے ہیں وہ خود ڈھونڈتے ہیں اپنے

رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ إِلَيْهِمْ أَقْرَبُ وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ

رب تک وسیلہ کو خواہ بندہ بہت نزدیک ہے اور امید رکھتے ہیں اسکی مہربانی کی اور ڈرتے ہیں

عَذَابَهُ ۚ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُورًا ۝ وَإِنْ مِنْ

اسکے عذاب کے بے شک تیرے رب کا عذاب ڈرنے کی چیز ہے اور کوئی بستی نہیں

قَرِيبَةً إِلَّا نَحْنُ مُمْلِكُوهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ أَوْ مُعَذِّبُوهَا عَذَابًا

جس کو ہم خراب نہ کریں گے قیامت سے پہلے یا آفت ڈالیں گے اس پر سخت

مُشَدِّدًا إِنْ كَانَ ذَلِكَ فِي الْكِتَابِ مَسْطُورًا ۝۵۸

آفت۔ یہ ہے کتاب میں لکھا گیا

خلاصہ تفسیر

آپ ان لوگوں سے (فرمادیجئے کہ جن کو تم خدا کے سوا (معبود) قرار دے رہے ہو رجب فرشتے اور جنات) ذرا ان کو (اپنی تکلیف دور کرنے کے لئے) پکارو تو وہی سودہ نہ تم سے تکلیف کو دور کرنے کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ اس کے بدل ڈالنے کا (مثلاً تکلیف کو بالکل دور نہ کر سکیں کچھ ہلکا ہی کر دیں) یہ لوگ کہ جن کو مشرکین (اپنی حاجت روائی یا مشکل کشائی کے لئے) پکار رہے ہیں وہ خود ہی اپنے رب کی طرف (پہنچنے کا) ذریعہ ڈھونڈ رہے ہیں کہ ان میں کون زیادہ مقرب بنتا ہے (یعنی وہ خود ہی اطاعت و عبادت میں مشغول ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ کا قرب میسر ہو جائے اور چاہتے ہیں کہ اقرب کا درجہ اور بڑھ جائے) اور وہ اسکی رحمت کے امیدوار ہیں اور اس کے عذاب سے (نا فرمانی کی صورت میں) ڈرتے ہیں واقعی آپ کے رب کا عذاب بے سببی ڈرنے کی چیز (طلب یہ ہے کہ جب وہ خود عابد ہیں تو معبود کیسے ہو سکتے ہیں اور جب وہ خود ہی اپنی غمخواریات اپنی تکلیف کے دور کرنے میں اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں تو وہ دوسروں کی حاجت روائی اور مشکل کشائی کیا کر سکتے ہیں) اور کفار کی (ایسی کوئی بستی نہیں جسکو ہم قیامت سے پہلے ہلاک نہ کریں یا قیامت کے روز) اسکے رہنے والوں کو (دوزخ کا) سزا عذاب نہ دیں یہ بات کتاب (یعنی لوح محفوظ) میں لکھی ہوئی ہے پس اگر کوئی کافر یہاں ہلاک ہونے سے بچ گیا تو قیامت کے روز کی بڑی آفت سے ڈیچکا اور بھی موت سے ہلاک ہونا تو کفار کے ساتھ مخصوص نہیں سمجھتے ہیں اسلئے بتیوں کے ہلاک ہو نیسے اس جگہ مراد یہ ہے کہ کسی عذاب اور آفت کے ذریعہ ہلاک کیا جائے تو خلاصہ یہ ہوا کہ کفار پر بھی تو دنیا میں عذاب پیچھا یا جاتا ہے اور آخرت کا عذاب اسکے علاوہ ہو گا اور بھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دنیا میں کوئی عذاب نہ آیا تو آخرت کے عذاب سے بہر حال نجات نہیں۔

معارف و مسائل

يَسْتَعِزُّونَ إِلَى رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ لَفْظِ وَسِيلَةٍ کے معنی ہر وہ چیز جسکو کسی دوسرے تک پہنچنے

کا ذریعہ بنایا جائے اور اللہ کے لئے وسیلہ یہ ہے کہ علمِ رحمان میں اللہ تعالیٰ کی مرضی کی ہر وقت رعایت رکھو اور احکامِ شرعیہ کی پابندی کر کے مغلوب یہ ہے کہ یہ سب حضرات اپنے عملِ صالح کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے تقرب کی طلب میں لگے ہوئے ہیں۔

يَرْجُونَ رَحْمَةً وَيَعْلَمُونَ أَنَّ كَذِبُكَ لَهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ
اللہ تعالیٰ کی رحمت کا امیدوار بھی رہنا اور دوسرے بھی رہنا یہ انسان کے دو مختلف حال ہیں جب یہ دونوں برابر رہتے ہیں تو انسان مسکرتہ پر چلتا رہتا ہے اور اگر نہیں ہے تو ایک مغلوب ہو جائے تو اسی مقدار سے انسان کے احوال میں خرابی آجاتی ہے۔ (قرطبی)

وَمَا مَنَعَنَا أَنْ نُرْسِلَ بِالْآيَاتِ كَذِبَ كِبَارٍ كَذِبَ كَبِيرٍ

اور ہم نے اس لئے موقوف نہیں کیا ان کے گمراہی کے لئے ان کو جھٹلایا اور

أَتَيْنَا ثَمُودَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوا بِهَا وَمَا نُرْسِلُ بِالْآيَاتِ كَذِبَ كَبِيرٍ

ہم نے دی ثمود کو اونٹنی ان کے بھانے کو پہرہ ظلم کیا اس پر اور نشانیاں جو ہم بھیجتے ہیں سو

تَخَوُّبًا ۚ وَإِذْ قُلْنَا لَكَ إِنَّ رَبَّكَ أَحَاطَ بِالنَّاسِ وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا

ڈرانے کو اور جب کہ دیا ہم نے تجھ سے کہ تیرے رب نے گیم یہاں ہے تو ان کو اور وہ دکھلا دیا جو تجھ کو

الَّتِي أَمْرُكَ الْإِفْتِنَاءَ لِلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُونَةَ فِي الْقُرْآنِ

دکھلایا ہم نے سو جائیے کو لوگوں کے اور ایسے ہی وہ درخت جس پر جھکا ہے قرآن میں

وَنَحْوُفُهُمْ فَمَا يَزِيدُهُمْ إِلَّا طُغْيَانًا كَبِيرًا ۝

اور ہم ان کو ڈراتے ہیں تو ان کو زیادہ ہوتی ہے بڑی شرارت۔

خلاصہ تفسیر

اور ہم کو خاص (فرمائش) معجزات کے جیسے سے صرف یہی بات مانع ہے کہ پہلے لوگ

ان کے ہم جنس فرمائش معجزات کی تکذیب کر چکے ہیں اور مزاج و طبائع سب کافروں کے ملے

جلتے ہیں تو ظاہر یہ ہے کہ یہ بھی تکذیب کرینگے اور انہوں نے کے طور پر ایک فتنہ بھی سن لو کہ ہم نے

قوم ثمود کو انکی فرمائش کے مطابق حضرت ہارون علیہ السلام کے معجزہ کے طور پر اونٹنی دی تھی (جو

عجیب طور پر پیدا ہوتی اور) جو کہ معجزہ ہونے کے سبب فی نفسہ بصیرت کا ذریعہ تھی سو ان لوگوں

نے اس سے جہیت حاصل نہ کی بلکہ، اسکے ساتھ ظلم کیا کہ اسکو قتل کر ڈالا تو ظاہر یہ ہے کہ اگر موجودہ لوگوں کے فرمائشی معجزے دکھلائے گئے تو یہ بھی ایسا ہی کریں گے، اور ہم ایسے معجزات کو صرف اس بات سے، ڈرانے کے لئے بھیجا کرتے ہیں کہ اگر یہ فرمائشی معجزہ دیکھ کر بھی ایمان نہ لاؤ گے تو فوراً ہلاک کر دئے جاؤ گے اور ہوتا ہی رہا ہے کہ جن لوگوں کے فرمائشی معجزات دکھلائے گئے وہ ایمان تو لائے نہیں مگر معاملہ ان کی ہلاکت اور عذاب عام کا سبب بن گیا اور حکمت الہیہ کا تقاضہ یہ ہے کہ یہ لوگ ابھی ہلاک نہ کئے جاویں اس لئے ان کے فرمائشی معجزات نہیں دکھلائے جاتے اس کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے جو ان لوگوں کو پہلے پیش آچکا ہے جسکا ذکر یہ ہے کہ، آپ وہ وقت یاد کر لیجئے جبکہ ہم نے آپ سے کہا تھا کہ آپ کا رب (اپنے علم سے) تمام لوگوں کے احوال ظاہر و باطنہ موجودہ و مستقبلہ کو محیط ہے (اور احوال مستقبلہ میں ان کا ایمان نہ لانا بھی اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے جسکی ایک دلیل نہیں کا یہ واقعہ ہے کہ) ہم نے (واقعہ معراج میں) جو تماشا (بحالت بیداری) آپکو دکھلایا تھا اور جس درخت کی قرآن میں مذمت کی گئی ہے (یعنی زقوم ہو طعام کفار ہے) ہم نے ان دونوں چیزوں کو ان لوگوں کے لئے موجب گمراہی کر دیا یعنی ان لوگوں نے ان دونوں امر کو شکر تکذیب کی معراج کی تکذیب تو اس بنا پر کی کہ ایک رات کی قلیل مدت میں ملک شام جانا اور پھر آسمان پر جانا ان کے نزدیک ممکن نہ تھا اور شجرہ زقوم کی تکذیب اس بنا پر کی کہ اسکو دوزخ کے اندر تباہ یا جانا آگ میں کوئی ذلت کیسے روکتا ہے اگر ہو بھی تو جہل جائے گا حالانکہ نہ ایک رات میں اتنا طویل سفر طے کرنا عقل و محال ہے نہ آسمان پر جانا ناممکن ہے اور آگ کے اندر درخت کا وجود ان کی سمجھ میں نہ آیا حالانکہ کوئی محال بات نہیں کہ کسی درخت کا مزاج ہی اللہ تعالیٰ ایسا بنادیں کہ وہ پانی کے بجائے آگ سے پرورش پائے پھر فرمایا، اور ہم ان لوگوں کو ڈراتے رہتے ہیں لیکن ان کی بڑی سرکشی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے (شجرہ زقوم کے انکار کے ساتھ یہ لوگ استہزاء بھی کرتے تھے جسکا بیان مع زائد تحقیق کے سورۃ طہ میں آئے گا)

معارف و مسائل

وَمَا جَعَلْنَا الزُّرْعِيَّاءَ الَّتِي أَسْرَيْنَاكَ إِلَّا فِتْنَةً لِّنَّبِّئِیْ ۚ رَیْعَنی شَبَّ مَعْرَاجِ

میں جو تماشا ہم نے آپکو دکھلایا تھا وہ لوگوں کے لئے ایک فتنہ تھا، لفظ فتنہ عربی زبان میں بہت سے معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے اسکے ایک معنی وہ ہیں جو فلاح و تفسیر میں لئے گئے یعنی گمراہی، ایک معنی آزمائش کے بھی آئے ہیں ایک معنی کسی سنگام و نباد کے برپا ہونے کے بھی آتے ہیں یہاں ان سب معانی کا احتمال ہے حضرت عائشہؓ اور معاویہؓ اور حسنؓ اور مجاہدؓ وغیرہ ائمہ تفسیر نے

اس جگہ فتنہ سے مراد ہیں آخری معنی سے ہیں اور فرمایا کہ یہ فتنہ ارتداد کا تھا کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج میں بیت المقدس اور وہاں سے آسمانوں پر جانے اور صبح سے پہلے واپس آنے کا ذکر کیا تو بہت سے نو مسلم لوگ جنہیں ایمان حاصل نہ ہوا تھا اس کلام کی تکذیب کر کے مرتد ہو گئے، قرطبی، اسی واقعہ سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ لفظ رُغْیاء عربی زبان میں اگرچہ خواب کے معنی میں بھی آتا ہے لیکن اس جگہ مراد خواب کا فتنہ نہیں کیونکہ ایسا ہوتا تو لوگوں کے مرتد ہو جانے کی کوئی وجہ نہیں تھی خواب تو ہر شخص ایسے دیکھ سکتا ہے بلکہ اس جگہ مراد رُغْیاء سے ایک واقعہ عجیبہ کائنات بیداری دکھانا ہے آیت مذکورہ کی تفسیر میں بعض حضرات نے اسکو واقعہ معراج کے سوا دوسرے واقعات پر بھی محمول کیا ہے مگر مجموعی اعتبار سے یہاں منطبق نہیں ہوتے اس لئے جمہور نے واقعہ معراج ہی کو اس آیت کا مناسبت قرار دیا ہے۔ اگما فضلہ القرطبی

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ ۖ

اور جب ہم نے کہا فرشتوں کو سجدہ کرو آدم کو تو سجدہ میں گر پڑے مگر ابلیس

قَالَ أَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِينًا ۖ قَالَ أَرَأَيْتَكَ هَذَا

بولا کیا میں سجدہ کروں ایک شخص کو جسکو تو نے بنایا مٹی کا کہنے لگا بھلا دیکھ لو یہ شخص

الَّذِي كَرَّمْتَ عَلَىٰ زَلَلٍ أَخَّرْتَنِي إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لِأَحْتَنِكَ ۖ

جس کو تو نے مجھ سے بڑھا دیا اگر تو مجھ کو ڈھیل دیے قیامت کے دن تک تو میں اُس کی اولاد

ذُرِّيَّتِهِ إِلَّا قَلِيلًا ۖ قَالَ أَذْهَبُ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَإِنَّ

کو ڈھانسی دے لوں مگر تھوڑے سے فرمایا جا پھر جو کوئی تیرے ساتھ ہوا اُن میں سے سو

جَهَنَّمَ جَزَاءُ وَكُمُ جَزَاءُ مَوْفُورًا ۖ ۝۱۵۱ وَاسْتَفِزُّ مِنْهُمْ

دوزخ ہے تم سب کی سزا بدلہ پورا اور گھبراتے اُن ہیں جس کو تو

مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَأَجْلِبُ عَلَيْهِمْ بِخَبْلِكَ وَرَجُلِكَ وَشَارِكُهُمْ

تجرا کے اپنی آواز سے اور لے اُن پر اپنے سوار اور پیادے اور سا جہا کر

فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ وَعِدُّهُمْ وَمَا يَعِدُهُمْ

اُن سے مال اور اولاد میں اور وعدہ دے اُن کو اور کچھ نہیں وعدہ دیتا اُن کو

الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا ۝۱۳ إِنَّ عِبَادِي لَإِنَّ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا

شیطان مگر دغا بازی وہ جو میرے بندے ہیں اُن پر نہیں ہے تیری حکومت

وَكَفَى بِرَبِّكَ وَكِيلًا ۝۱۴

اور تیرا رب کافی ہے کام بنانے والا ۔

خلاصہ تفسیر

اور وہ وقت یاد رکھنے کے قابل ہے، جبکہ تم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو بچدہ کر دو تو اُن سب نے بچدہ کیا مگر ابلیس نے نہ کیا اور کہا کہ کیا میں ایسے شخص کو سجدہ کروں جس کو آپ نے مٹی سے بنایا ہے اس پر مردود ہو گیا اُس وقت، کہنے لگا کہ اس شخص کو جو آپ نے مجھے فوقیت دی ہے اور اسی بنا پر اس کو سجدہ کرنے کا حکم دیا ہے، تو بھلا بتلائیے تو اس میں کیا فضیلت ہے جسکی وجہ سے میں مردود ہوا، اگر آپ میری درخواست کو مطابق نہ سمجھو تو قیامت کے زمانے تک موت سے بھلت دیدی تو میں ابھی بجز قدر قلیل لوگوں کے جو مخلصین ہونگے باقی سبکی تمام اولاد کو اپنے قابو میں کر لوں گا (یعنی گمراہ کر دوں گا) ارشاد ہوا جاتا تو تجھ سے ہو سکے کرتے تو شخص انہیں سے تیرے ساتھ ہوا لگا تو تم سب کی سزا تمہیں دی ہو گی اور ان میں سے جسے تیرا قابو چلے اپنی پیچ پکار سے یعنی اغوار اور دوسو سے، اس کا قدم (راہ راست سے) الٹاڑ دینا اور ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھانا تاکہ تیرا سارا لشکر لگے گمراہ کرنے میں خوب زور لگاوے اور ان کے مال اور اولاد میں پناہ نہ ملے (یعنی ماں و اولاد کو گمراہی کا ذریعہ بنا دینا جیسا کہ اس کا مشاہدہ ہوا) اور ان سے (جھوٹے جھوٹے وعدے کرنا کہ قیامت میں گناہ پر مواخزہ نہ ہوگا، اور یہ سب باتیں شیطان کو بطور زبردستی کہہ گئی ہیں، اور شیطان ان لوگوں سے بالکل جھوٹے وعدے کرتا ہے) یہ بطور علامتِ مذکر کے تھا آگے پھر شیطان کو خطاب ہے، میرے خاص بندوں پر تیرا حق بوند چلے گا اور اسے میری علی التہ علیہ وسلم اس کا حق بوند نہیں رکھتا بلکہ چلے گا کہ آپ کا رب (ان کا) کارساز کافی ہے۔

معارف و مسائل

لَا تُحْصِي كُنَّ احتناک کے معنی میں کسی چیز کا استیصال اور فنا کر دینا یا پوری طرح اس پر غالب آنا (فعلی) وَاسْتَفْزِزُ اسْتَفْزَا کے معنی تلخ کر دینے ہیں مراد اس جگہ حق سے قطع کر دینا ہے یہ کوہِ ثبوتِ عدوت یعنی آرزوِ معرفت ہے اور شیطان کی آواز کیا ہے اس کے متعلق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے

فرمایا کہ گناہ اور منہاج اور نہج واجب کی آوازیں یہی شیطاں کی آواز ہے جس سے وہ لوگوں کو حق سے قطع کرتا ہے (قرطبی) اس سے معلوم ہوا کہ منہاج و نہج یعنی اورنگناہ و سبناہ حرام ہے (قرطبی)

اہل بیت نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کرنے کے وقت دو باتیں کہی تھیں اول یہ
 کہ آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا کئے گئے اور میں آگ کی مخلوق ہوں آپ نے مٹی کو آگ پر کیوں
 فوقیت و رتبت دیدی یہ سوال ام المہدی کے مقابلہ میں حکم کی حکمت معلوم کرنے سے متعلق تھا
 جس کا کسی مامور کو حق نہیں اللہ جل شانہ کی طرف سے مامور کو تو غلب حکمت کا حق کیا ہوتا دنیا میں خود
 انسان اپنے نوکر کو اس کا حق نہیں دیتا کہ وہ کسی کام دے، تو خادم وہ کام کرنے کے بجائے آقا
 سے پوچھے کہ اس کام میں کیا حکمت ہے اس لئے اس کا یہ سوال ناقابل جواب قرار دیکر یہاں اس کا
 جواب نہیں دیا گیا، اس کے علاوہ جواب ظاہر ہے کہ کسی چیز کو کسی دوسری چیز پر فوقیت دینے
 کا حق اسی ذات کو ہے جس نے ان کو پیدا کیا اور پالا ہے، وہ جس وقت جس چیز کو دوسری چیز پر رتبت

دوسری بات یہی تھی کہ اگر تاقیامت زندگی ملنے کی میری درخواست منظور کر لی گئی تو میں آدم کی ساری اولاد کو بجز قلیل کے گمراہ کر ڈالوں گا۔ آیات مذکورہ میں حق تعالیٰ نے اسکا جواب دیدیا کہ میرے خاص بندے جو مخلص ہیں ان پر تو تیرا قابو نہ چلے گا چاہے تو اپنا سارا اولاد لکر لے آوے اور پورا زور خرچ کرے باقی غیر مخلص اگر وہ تیرے قابو میں آگئے تو ان کا بھی وہی حال ہوگا جو تیرے ہیں کہ جہنم کے عذاب میں تم سب گرفتار ہو گے اِمْحِیْ اَجْلِبْ یَحْیٰ یَحْیٰ یَحْیٰ وَ اَجْلِبْ یَحْیٰ یَحْیٰ یَحْیٰ جہنم کے عذاب میں سوار اور پیادوں کا ذکر ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ واقع میں بھی شیطان کے کچھ افراد سوار ہوں کچھ پیادے بلکہ یہ محاورہ پورے شکر اور پوری طاقت استعمال کرنے کے لئے بولا جاتا ہے اور اگر واقع میں ایسا ہو کہ کچھ شیطان سوار ہوتے ہوں کچھ پیادہ تو اس میں بھی کوئی وجہ انکار نہیں اور نسبت ابن عباس رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جتنے افراد بھی کفر و معصیت کی حمایت کے لئے لڑتے کو چلتے ہیں وہ سوار اور پیادے سب شیطان ہی کا سوار اور پیادہ لشکر ہے۔ رہا یہ معاملہ کہ شیطان کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ اولاد آدم کو ہٹا کر گمراہ کرے یہ قدر ہو جائے گا جسکی بناء پر اس نے یہ دعویٰ کیا تو ممکن ہے کہ انسان کے اجزاء ترکیبی کو دیکھ کر اس نے یہ سمجھ لیا ہو کہ اس کے اندر نفسانی خواہشات کا غلبہ ہو گا اسلئے ہٹا کے میں آجانا دشوار نہیں اور اس میں بھی کچھ بعد نہیں کہ یہ دعویٰ بھی مخلص جہنم میں ہو۔

[illegible]

حاصل کیا جائے یا حرام کاموں میں خرچ کیا جائے یہی شیطان کی اس میں شرکت ہے اور اولاد میں شیطان کی شرکت اولاد حرام ہونے سے بھی ہوتی ہے اور اس سے بھی کہ اولاد کے نام مشرکانہ رکھے یا انکی حفاظت کے لئے مشرکانہ رسوم ادا کرے یا ان کی پرورش کے لئے حرام ذرائع آمدنی اختیار کرے (قرطبی)

رَبُّكُمُ الَّذِي يُرْجِي لَكُمُ الْفَلَكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ إِنَّهُ

تبار رب وہ ہے جو پہلا تا ہے تمہارے واسطے کشتی دریا میں تاکر تلاش کرو اس کا فضل وہی

كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ۝ وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُونَ

سے تم پر مہربان اور جب آتی ہے تم پر آفت دریا میں گھول جاتے ہو جنکو تم پکارا کرتے تھے

إِلَّا رَأْيَاكَ ۚ فَلَمَّا خَسَّكُمْ إِلَى الْبَرِّ أَعْرَضْتُمْ ۚ وَكَانَ الْإِنْسَانُ

اللہ کے سوائے یہم جب بچا لایا تم کو خشکی میں پھر جاتے ہو اور ہے انسان

كَفُورًا ۝ أَفَأَمِنْتُمْ أَنْ يَخْشِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ أَوْ يُرْسِلَ

بڑا ناشکر سو کیا تم بے ڈر ہو گئے اس سے کہ دھندلے تم کو جنگل کے کنارے یا بھیج دے

عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُ وَالَكُمْ وَكِيلًا ۝ أَمْ أَمِنْتُمْ أَنْ يُعِيدَكُمْ

تم پر آندھی جھمکے برسانے والی پھر نہ پاؤ ایسا کوئی نگہبان یا بے ڈر ہو گئے ہو اس سے کہ پھیل جائے

فِيهِ تَارَةً أُخْرَى فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِنَ الرِّيحِ فَيُغْرِقَكُمْ

تھکودریا میں دوسری بار پھر بھیجے تم پر ایک سخت جھونکا ہوا کا پھر ڈبا دے تم کو

بِمَا كَفَرْتُمْ ثُمَّ لَا تَجِدُ وَالَكُمْ عَلَيْهِ تَبِيعًا ۝ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا

برلے میں اس ناشکی کے پھر نہ پاؤ اپنی طرف سے ہم پر اس کا کوئی باز پرس کرنا والا اور ہم نے عزت دی ہے

بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ

آدم کی اولاد کو اور سوا ہی دی ان کو جنگل اور دریا میں اور روزی دی ہم نے ان کو ستمی چیزوں سے

وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا ۝

اور بڑھا دیا ان کو بہتوں سے جن کو پیدا کیا ہم نے بڑائی دے کر

خلاصہ تفسیر

سابقہ آیات میں توحید کا اثبات اور شرک کا ابطال مختار آیات مذکورہ میں بھی بشمول ایک خاص انداز سے بیان کیا گیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی بیشمار عظیم الشان نعمتیں جو انسانوں پر ہر وقت مہذول ہیں ان کو بیان کر کے یہ بتانا مستطیر ہے کہ ان تمام نعمتوں کا بشتہ والا بجز ایک حق تعالیٰ کے کوئی نہیں ہو سکتا اور سب نعمتیں اسکی ہیں تو اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک ٹھہرانا بڑی گمراہی ہے ارشاد فرمایا کہ تمہارا رب ایسا (منعم) ہے کہ تمہارے (نفع کے) لئے کشتی کو دریا میں لے چلتا ہے تاکہ تم اسکے ذریعہ رزق کی تلاش کرو اور اس میں اٹار رہے کہ بحری سفر تمہارت کے لئے عموماً بڑے نفع کا سبب ہوتا ہے، بیشک وہ تمہارے حال پر بڑا مہربان ہے اور جب تم کو دریائیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے (مثلاً دریا کی موت اور ہوا کے طوفان سے غرق ہونے کا خطرہ) تو بجز خدا کے اور جس جس کی تم عبادت کرتے تھے سب غائب ہو جاتے ہیں کہ نہ تمہیں خود ہی اس وقت انکا خیال آتا ہے نہ ان کو پکارتے ہو اور پکارو بھی تو ان سے کسی امداد کی ذرہ برابر توقع نہیں یہ خود عمل شوری تمہاری طرف سے توحید کا اقرار اور شرک کا ابطال ہے، پھر جب تم کو خشکی کی طرف چالائے تو تم پھر اس سے رخ پھیر لیتے ہو اور انسان ہے بڑا ناشکر کہ اتنی جلدی اللہ کے انعام اور اپنی امانت و ذاری کو بھول جاتا ہے اور تم جو خشکی میں پھیکو اس سے اپنا رخ پھیر لیتے ہو تو کیا تم اس بات سے نہ فکر ہو جیسے ہو کہ تم کو خشکی میں لا کر ہی زمین میں دھنسا دے مطلب یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک دریا اور خشکی میں کوئی فرق نہیں وہ جیسے دریا میں غرق کر سکتا ہے ایسا ہی خشکی میں بھی زمین میں دھنسا کر غرق کر سکتا ہے، یا تم پر کوئی ایسی سخت ہوا بھیجے جو کھر پھر برسانے لگے (جیسا کہ قوم عاد ایسے ہی ہوا کے طوفان سے ہلاک کی گئی تھی) پھر تم کسی کو اپنا کارساز خدا کے ہوا پاؤ یا تم اس سے بے فکر ہو گئے کہ خدا تعالیٰ پھر تمکو دریا ہی میں دوبارہ ایجاد سے پھر تم پر ہوا کا طوفان بھیج دے پھر تمکو تمہارے کفر کے سبب غرق کر دے پھر اس بات پر اپنی غرق کر دینے پر کوئی ہمارا پیچھا کرنے والا بھی تمکو نہ ملے جو ہم سے تمہارا بدلہ لے سکے اور ہم نے اولاد آدم کو (مخصوص صفات و یکر) عزت دی اور ہم نے ان کو خشکی اور دریا میں (جانوروں اور کشتیوں پر) مولا کیا اور پاکیزہ نفیس چیزیں ان کو عطا فرمائیں اور ہم نے ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فوقیت دی

معارف و مسائل

بنی آدم کی فضیلت اکثر مخلوقات پر کس وجہ سے ہے | آخری آیت میں اولاد آدم کی اکثر مخلوقات پر فوقیت

اور انسانیات کا ذکر ہے۔ اس میں دو باتیں قابل غور ہیں۔ اولیٰ یہ کہ یہ انشعابیت کن صفات اور کن وجوہ کی بنا پر ہے۔ دوسرے یہ کہ اسمیں انشعابیت اکثر مخلوقات پر دینا بیان فرمایا ہے اس سے کیا مراد ہے؟ پہلی بات کی تفصیل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے بنی آدم کو مختلف حیثیات سے ایسی خصوصیات عطا فرمائی ہیں جو دوسری مخلوقات میں نہیں۔ مثلاً حسن صورت، اعتدال جسم، اعتدال مزاج، اعتدال قد و قامت جو انسان کو عطا ہوا ہے کسی دوسرے حیوان میں نہیں اس کے علاوہ عقل و شعور میں سکو خاص امتیاز بخشا گیا ہے جس کے ذریعہ وہ تمام کائنات علویہ اور مصلیہ اپنے کام کما کا ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے اتنی قدرت بخشی ہے کہ مخلوقات الہیہ سے ایسے مرکبات اور منوعات تیار کرے جو اسکے بننے اور نقل و حرکت اور طعام و لباس میں اسکے تمام کام آئیں۔

نطق و گویائی اور افہام و تفہیم کا جو کام اس کو عطا ہوا ہے وہ کسی دوسرے حیوان میں نہیں۔ اشارت کے ذریعہ اپنے دل کی بات دوسروں کو بتلانا اور خط کے ذریعہ دل کی بات دوسروں تک پہنچانا یہ سب انسان ہی کی امتیازات ہیں بعض علماء نے فرمایا کہ بانگ کی انگلیوں سے کھانا بھی انسان ہی کی صفت مخصوص ہے اسکے سوا تمام جانور اپنے منہ سے کھاتے ہیں اپنے کھانے کی چیزوں کو مختلف اشیاء سے مرکب کر کے لذیذ اور مفید بنانے کا کام بھی انسان ہی کرتا ہے باقی سب جانور مفرد چیزیں کھاتے ہیں کوئی کپا گوشت کھاتا ہے کوئی گھاس کوئی پھل وغیرہ ہر حال سب مغذات کھاتے ہیں انسان ہی اپنی غذا کے لئے ان سب چیزوں کے مرکبات تیار کرتا ہے اور سب سے بڑی فضیلت عقل و شعور کی ہے جس سے وہ اپنے خالق اور مالک کو پہچانے اور اس کی مرضی اور نامرضی کو معلوم کر کے مرضیات کا اتباع کرتا مرضیات سے پرہیز کرے اور عقل و شعور کے اعتبار سے مخلوقات کی تقسیم اس طرح ہے کہ عام جانوروں میں شعوبات اور خواہشات میں عقل و شعور نہیں۔ فرشتوں میں عقل و شعور ہے شعوبات و خواہشات نہیں۔ انسان میں یہ دونوں چیزیں جتن ہیں عقل و شعور بھی ہے شعوبات و خواہشات بھی ہیں۔ وہ شعوبات و خواہشات کو عقل و شعور کے ذریعہ مغلوب کر لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ چیزوں سے اپنے آپ کو بچا لیتا ہے تو اس کا مقام بہت سے فرشتوں کو بھی اونچا ہو جاتا ہے۔

دوسری بات کہ اولاد آدم کو اکثر مخلوقات پر فضیلت دینے کا کیا مطلب ہے اسمیں تو کسی کو اختلاف کی گنجائش نہیں کہ دنیا کی تمام مخلوقات سویہ اور مصلیہ اور تمام جانوروں پر اولاد آدم کو فضیلت حاصل ہے۔ اس کی طرح جنات جو عقل و شعور میں انسان ہی کی طرح ہیں ان پر بھی انسان کا انفس ہونا سب سے بڑی فضیلت ہے۔ سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ انسان اور فرشتے میں کوئی انفس ہے اس میں جبر و کدر ہے۔ انسان کے لئے جبر و کدر نہیں ہے۔ انسان ہی کے لئے اولاد آدم اور فرشتوں کے انفس

ہیں مگر خواہیں ملائکہ جیسے جبرائیل میکائیل وغیرہ ان عام صالحین سے افضل ہیں اور خواہیں مومنین جیسے انبیاء علیہم السلام وہ خواہیں ملائکہ سے بھی افضل ہیں باقی رب کفار و فجار انسان و وہ ظالم سب کہ فرشتوں سے تو کیا افضل ہوتے وہ تو جانوروں سے بھی افضل و متعدد فلزات و نباتات ہیں افضل نہیں ان کے متعلق تو قرآن کا فیصلہ یہ ہے - اُولَئِكَ كَانُوا لَنَا عَامًا بَلْ هُمْ أَضَلُّ أَعْمٰی یعنی یہ تو چوپایہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ (تفسیر ظہری) واللہ اعلم۔

يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ اُنَاسٍ بِمَا مِمْرُهُ فَمَنْ اُوْتِيَ كِتٰبًا بِمِمْرِهِ

ہیں دن ہر بلا ہوں گے ہر فرقہ کو ان کے سرداروں کے ساتھ سوچیں کہ ملا اس کا اعمال ان کے واسطے ہوتے ہیں

فَاُولٰٓئِكَ يَفْرٰوُنَ كِتٰبَهُمْ وَلَا يَظْلَمُوْنَ فِتْيٰلًا ۝۷۰ وَمَنْ كَانَ

سو وہ لوگ پڑھیں گے اپنا لکھا اور ظلم نہ ہوگا ان پر ایک کتاب کا اور جو کوئی رہا

فِيْ هٰذِهِ اَعْمٰی فَمَوْفٰی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ۝۷۱

اس جہان میں اندھا سو وہ پچھلے جہان میں بھی اندھا ہے اور بہت دور پڑا ہوا راستہ۔

خلاصہ تفسیر

(اس دن کو یاد کرنا چاہیے) جس روز ہم تمام آدمیوں کو ان کے نامہ اعمال سمیت میدانِ شہیں، بلا دیں گے اور بنامہ اعمال ارادیتہ جاویں گے پھر کسی کے دہنہ ہاتھ اور کسی کے بائیں ہاتھ میں آبادیں گے پھر بنامہ اعمال ان کے دہنہ ہاتھ میں دیا جاوے گا اور یہ اہل ایمان ہوں گے، تو ایسے لوگ اپنا نامہ اعمال (خوش ہو کر) پڑھیں گے اور ان کا ذکر انحصارِ نیکیا جاوے گا یعنی ان کے ایمان اور اعمال کا ثواب پورا پورا ملے گا ذرا کم نہ ہوگا خواہ زیادہ مل جائے اور عذاب سے نجات بھی ہوگی خواہ اول ہی یا گناہوں کی بناء پر تھکنے کے بعد، اور جو شخص دنیا میں راہِ نجات دیکھنے سے اندھا رہا تو وہ آخرت میں بھی منزلِ نجات تک پہنچنے سے اندھا رہے گا اور بلکہ وہاں دنیا سے بھی زیادہ کم کر دیا ہوگا کیونکہ دنیا میں تو گمراہی کا علاج ممکن تھا وہاں یہی نہ ہو سکے گا یہ وہ لوگ ہوں گے جن کا نامہ اعمال ان کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔

معارف و مسائل

يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ اُنَاسٍ بِمَا مِمْرُهُ اس آیت میں غلط فہم کیا کتاب ہے جیسا کہ

سورہ یسین میں ہے وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُّبِينٍ اسمین امام مبین سے مراد واضح کتاب ہے اور کتاب کو امام اس لئے کہا جاتا ہے کہ بھول چوک اور اختلاف کے وقت کتاب ہی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے جیسے کسی امام مقتدا کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ (قرطبی)

اور ترمذی کی حدیث بردایت ابو ہریرہ رض (جو ترمذی نے حسن غریب کہا ہے) اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ امام سے مراد اس آیت میں کتاب ہے۔ الفاظ حدیث کے یہ ہیں۔

يَوْمَ نَسُفُ عَوَاكِلَ اُنَاسٍ
بِاِمَامِهِمْ قَالِ يٰۤاَيُّهَا
اَحَدُهُمْ فَيُعْطٰى كِتَابًا
بِمِثْلِهِ (الحديث بطوله)

آیت یَوْمَ نَسُفُ عَوَاكِلَ اُنَاسٍ بِاِمَامِهِمْ کی تفسیر میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ایک شخص کو بلایا جائے گا اور اس کا نامہ اعمال داہنے ہاتھ میں دیدیا جائے گا۔

اس حدیث سے یہ بھی متعین ہو گیا کہ امام بمعنی کتاب ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کتاب سے مراد نامہ اعمال ہے اسی لئے خلاصہ تفسیر از بیان القرآن میں اس کا ترجمہ نامہ اعمال سے کر دیا گیا ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ثناء وغیرہ مفسرین سے یہاں لفظ امام کے معنی مقتدا اور پیشوا کے بھی منقول ہیں کہ ہر شخص کو اس کے مقتدا و پیشوا کا نام لیکر پکارا جائے خواہ وہ مقتدا و پیشوا انبیاء علیہم السلام اور ان کے نائب مشائخ و علماء ہوں یا گمراہی اور معصیت کی طرف دعوت دینے والے پیشوا۔ (قرطبی)

اس معنی کے لحاظ سے مطلب آیت کا یہ ہو گا کہ میدان مشہ میں ہر شخص کو اس کے مقتدا اور پیشوا کے نام سے پکارا جائے گا۔ اور سب کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے گا مثلاً تابعین ابراہیم علیہ السلام تابعین موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام و تابعین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پھر ان کے ذیل میں ممکن ہے کہ ان تابعین کے بلا واسطہ مقتداؤں کا نام بھی لیا جائے۔

نامہ اعمال | قرآن مجید کی متعدد آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ باتیں ہاتھ میں نامہ اعمال صرف کفار کو دیا جائیگا جبکہ ایک آیت میں ہے اِنَّ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ اور ایک دوسری آیت میں ہے اِنَّ كَانَ لَیْسَ بِمُؤْمِنًا پہلی آیت میں صراحتہ ایمان کی نفی کی گئی ہے اور دوسری میں انکار آخرت مذکور ہے وہ بھی کفر ہی ہے اس تقابل سے معلوم ہوا کہ داہنے ہاتھ میں نامہ اعمال اہل ایمان کو دیا جائیگا اور بائیں ہاتھ میں نامہ اعمال کو فحش کے ساتھ پڑھے گا بلکہ دوسروں کو بھی پڑھوائے گا یہ فحش ایات کی اور عذاب ابدی سے نجات کی ہوگی گو بعض اعمال پر سزا رکھی ہوگی۔

قرآن مجید میں نامہ اعمال داہنے یا بائیں ہاتھ میں دیئے جانے کی کیفیت مذکور نہیں لیکن بعض احادیث میں انصاری الکتب کا لفظ آیا ہے در رواہ احمد عن عائشہ رضی اللہ عنہا اور بعض

روایات حدیث میں ہے کہ سب نامہ اعمال عرش کے نیچے جمع ہوں گے پھر ایک ہوا چلے گی جو سب کو اڑا کر لوگوں کے ہاتھ میں پہنچا دے گی کیسے داہنے ہاتھ میں کسی کے بائیں ہاتھ میں (آخر جہ العقیلی عن انس مرفوعاً) (بیان القرآن از روح المعانی)

وَإِنْ كَادُوا لَيَفْتِنُونَكَ عَنِ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ

اور وہ لوگ تو چاہتے تھے کہ تجھ کو بھلا دیں اُس چیز سے کہ جو وحی بھیجی ہم نے تیری طرف۔

لِنَفْتَرِيَ عَلَيْكَ غِيْرَةً ۖ وَإِذَا لَا تَأْخُذُوكَ خَلِيْلًا ۝۴۳

تاکہ جھوٹ بنالائے تو ہم پر وحی کے سوا اور تب تو بنا لیتے تجھ کو دوست اور آریہ

لَا أَنْ تَبْتَئِكَ لَقَدْ كِدْتَ تَرْكُنُ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيْلًا ۝۴۴

نہ ہوتا کہ ہم نے تجھ کو سنبھالے رکھا تو تو لگ جاتا جھکنے اُن کی طرف تھوڑا سا

إِذَا لَا ذَقْنَكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمٰتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ

تب تو ضرور پکھلتے ہم تجھ کو دونا مزد زندگی میں اور دونا دے میں پھر نہ پاتا تو اپنے

لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ۝۴۵ وَإِنْ كَادُوا لَيَسْتَفِزُّوكَ مِنَ

واستے ہم پر مدد کرنے والا اور وہ تو چاہتے تھے کہ گھبرا دیں تجھ کو اس

الْأَرْضِ لِيُخْرِجُوكَ مِنْهَا ۖ وَإِذَا لَا يَلْبَثُونَ خَلْفَكَ إِلَّا قَلِيْلًا ۝۴۶

زمین سے تار نکال دیں تجھ کو یہاں سے اور اس وقت نہ ٹھہریں گے وہ بھی تیرے پیچھے مگر تھوڑا سا

سُنَّةٍ مِّنْ قَدْ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ۝۴۷

دستور پہلا آتا ہے اُن رسولوں کا جو تجھ سے پہلے بھیجے ہم نے اپنے پیغمبر اور نہ پایگا تو ہمارے دستور میں تغاوت۔

خلاصہ تفسیر

اور یہ کافر لوگ (اپنی قوی تدبیروں کے ذریعہ) آپ کو اس چیز سے بھلانے (اور بھانے) ہی لگے تھے جو ہم نے آپ پر بذریعہ وحی بھیجی ہے (یعنی اس کوشش میں لگے تھے کہ آپ سے حکم خداوندی کے خلاف عمل کرا دیں اور تاکہ آپ اس حکم الہی کے سوا ہماری طرف (عملاً) غلط بات کی نسبت کر دیں کیونکہ نبی کا فعل خلاف شرع ہوتا نہیں اسلئے اگر نعوذ باللہ آپ سے کوئی عمل خلاف شرع ہو جاتا تو یہ لازم آتا کہ اس خلاف شرع عمل کو گویا اللہ کی طرف منسوب کر رہے ہیں) اور ایسی حالت میں آپ کو

خالص دوست بنائیتے اور ان کی یہ شرارت ایسی سخت تھی کہ اگر ہم نے آپ کو ثابت قدم نہ بنایا ہوتا (یعنی معصوم نہ کیا ہوتا) تو آپ ان کی طرف کچھ بچھڑنے کے قریب جا پھرتے (اور) اگر ایسا ہو جاتا کہ آپ کا کچھ میلان ان کی بات کی طرف ہوتا، تو ہم آپ کو راسخ و مستحکم نہ کرتے کہ قریبان بارگاہ کا مقام بہت بلند ہے، حالت حیات میں بھی اور بعد موت کے بھی دوسرا عذاب چکھاتے پھر آپ ہمارے مقابلے میں کوئی مددگار بھی نہ پاتے نہ جگر چونکہ آپ کو ہم نے معصوم اور ثابت قدم بنایا، اس لئے ان کی طرف ذرا بھی میلان نہ ہوا اور اس عذاب سے بچ گئے،

اور یہ (کافر) لوگ اس سرزمین (مکہ یا مدینہ) سے آپ کے قدم ہی اکھاڑنے لگے تھے تاکہ آپ کو اس سے نکال دیں اور اگر ایسا ہو جاتا تو آپ کے بعد یہ بھی بہت کم دیہاں، ٹھہرنے پاتے جیسا ان انبیاء کے بارے میں (ہمارا) قاعدہ رہا ہے جبکہ آپ سے پہلے رسول بنا کر بھیجا تھا کہ جب ان کی قوم نے ان کو وطن نکالا تو پھر اس قوم کو بھی یہاں رہنا نصیب نہیں ہوا) اور آپ ہمارے قاعدے میں تغیر تبیل نہ پائیں گے۔

معارف و مسائل

مذکورہ آیات میں سے پہلی تین آیتیں ایک خاص واقعہ سے متعلق ہیں تفسیر منظمہ کی میں اس واقعہ کی تعیین کے متعلق چند روایتیں نقل کی ہیں جنہیں سے اقرب اور وید یا ثبات ائمہان یہ واقعہ ہے جو تفسیر ابن ابی حاتم بروایت جبیر ابن نفیر نقل کیا ہے کہ قریش مکہ کے چند سردار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اگر آپ واقعی ہماری طرف بھیجے گئے ہیں تو پھر اپنی مجلس سے ان غریب شکستہ حال لوگوں کو ہٹا دیجئے جسکے ساتھ بیٹھنا ہمارے لئے توہین ہے تو پھر ہم بھی آپ کے اصحاب اور دوست ہو جائیں گے۔ ان کی اس بات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ خیال پیدا ہوا کہ ان کی بات پوری کر دیں شاید یہ مسلمان ہو جائیں جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو باخبر کر دیا گیا کہ ان کی بات فتنہ ہے ان کی دوستی بھی فتنہ ہے آپ کو ان کی بات نہیں ماننی چاہئے۔ اور پھر ارشاد فرمایا کہ اگر ہماری طرف سے آپ کی تربیت اور ثابت قدم رکھنے کا اہتمام نہ ہوتا تو کچھ بعید نہیں تھا کہ آپ ان کی بات کی طرف میلان کے مقوڑے سے قریب ہو جاتے۔

تفسیر منظمہ کی میں ہے کہ اس آیت سے یہ بات واضح طور پر بھی جاتی ہے کہ کفار قریش کی لغویات کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے میلان کا تو کوئی احتمال ہی نہ تھا ہاں میلان کے

کا مصداق آیت ہونا راجح قرار دیا ہے اور پھر بتلایا کہ قرآن کریم کی یہ وعید بھی کفار کے لئے کھلی آگئیں
دیجی کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ سے ہجرت فرمائی تو مکہ والے ایک دن بھی مکہ
میں چین سے نہیں بیٹھ سکے صرف ڈیڑھ سال کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو میدان بدر میں جمع کر دیا جہاں
ان کے ستر ہزار مارے گئے اور ان کی قوت ٹوٹ گئی پھر غزوہ اُحُد کے آخر کی نتیجہ میں ان پر مذہبیت
طاری ہوئی اور غزوہ احزاب کے آخر میں ان کی کہہ ہی توڑ دی اور ہجرت کے اکتالیس سال
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورا مکہ مکرمہ فتح کر لیا۔

مَسْتَفِذِينَ قَدْ آمَرْنَا اس آیت میں بتلایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی عام سنت اور قاعدہ پہلے
سے ہی چلا آیا ہے کہ جب کوئی قوم اپنے نبی کو اسکے وطن سے نکالتی یا نکالنے پر مجبور کرتی ہے تو پھر وہ
قوم بھی وہاں باقی نہیں رکھی جاتی اس پر خدا تعالیٰ کا عذاب آتا ہے۔

أَقِمِ الصَّلَاةَ لَدُلُوكَ الشَّمْسِ إِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ

یٰ اے تم رکھ نماز کو سورج ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک اور قرآن پڑھنا فجر کا

إِنْ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا ۝

بے شک قرآن پڑھنا فجر کا ہوتا ہے روبرو اور کچھ رات جاگتا رہ قرآن کے ساتھ

نَافِلَةً لَّكَ ۚ عَلَىٰ أَنْ يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُودًا ۝

یزایدی ہے تیرے لئے قریب ہے کہ کھڑا کر دے تجھ کو تیرا رب مقام محمود میں اور

قُلْ رَبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِي مَخْرَجَ

کہا اے رب داخل کر مجھ کو سچا دروازے اور نکال مجھ کو سچے

صِدْقٍ وَاجْعَلْ لِي مِنْ لَدُنْكَ سُلْطَانًا نَصِيرًا ۝

نیکانہ اور عطا کر دے مجھ کو اپنے پاس سے حکومت کی مدد اور

قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَّتِ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا ۝

کہہ آیا سچ اور بھل بھاکا جھوٹ بے شک جھوٹ ہے نکل سجا گئے وہ

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ وَلَا

اور ہم اتارتے ہیں قرآن میں سے جس سے روگ دفع ہوں اور رحمت ایمان والوں کے واسطے اور

يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلَّا خَسَارًا ۝

گنہگاروں کو تو اس سے نقصان ہی بڑھتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

آفتاب ڈھلنے کے بعد رات کے اندھیرے تک نمازیں ادا کیا کیجئے، راہیں ظہر، عصر، مغرب، عشاء چار نمازیں آگئیں جیسا کہ حدیث میں اس اجمال کی تفصیل بیان کر دی گئی ہے، اور صبح کی نماز بھی (ادا کریں) بیشک صبح کی نماز فرشتوں کے، وآخر ہونے کا وقت ہے (صبح کا وقت چونکہ نیند سے بیدار ہونے کا وقت ہے جس میں سستی کا خطرہ تھا اسلئے اسکو الگ کر کے اہتمام کے ساتھ بیان فرمایا اور اسکی ایک مزید تفصیلات بھی یہ بیان کر دی کہ اس وقت میں فرشتے جمع ہوتے ہیں اسکی تفصیل حدیث سے یہ معلوم ہوتی کہ انسان کی حفاظت اور اسکے اعمال کو دیکھنے والے فرشتے دن کے الگ اور رات کے الگ ہیں صبح کی نمازیں دونوں جماعتیں فرشتوں کی جمع ہوتی ہیں رات کے فرشتے اپنا کام ختم کر کے اور دن کے فرشتے اپنا کام بخٹانے کے لئے مجتمع ہو جاتے ہیں اسی طرح شام کو عصر کی نماز میں دونوں جماعتیں جمع ہوتی ہیں اور ظاہر ہے کہ فرشتوں کا اجتماع باعث برکات ہے، اور کیقدر رات کے حقے میں بھی (نماز ادا کریں) یعنی آپس میں نماز تہجد پڑھا کریں جو کہ آپ کے لئے (پانچ نمازوں کے علاوہ) ایک زائد چیز ہے۔ (اس زائد سے مراد بعض کے نزدیک ایک زائد فرض ہے جو خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر فرض کیا گیا اور بعض نے مراد زائد سے نفل لی ہے) امید (یعنی وعدہ) ہے کہ آپ کا رب آپکو مقام محمود میں جگہ دے گا (مقام محمود سے مراد شفاعت گہری کا مقام ہے جو نشر میں تمام بنی آدم کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہو گا) اور آپ یہ دعا کیجئے کہ میرے رب! مکہ بچانے کے بعد (جھکو) (جہاں لیجانا ہو) (نبوی) (یعنی راحت) کے ساتھ پہنچاؤ اور جب مکہ سے لیجانا ہو تو (جھکو) نبوی (یعنی راحت) کے ساتھ لیجاؤ اور جھکو! اپنا پاس سے (ان کفار میں) ایسا غلبہ دیکھو جسکے ساتھ (آپ کی) نصرت (اور مدد) ہو (جس سے وہ غلبہ پاؤں اور ترقی پذیر ہو ورنہ عارضی غلبہ تو کبھی کفار کو بھی ہو جاتا ہے مگر اس کے ساتھ اللہ کی نصرت نہیں ہوتی اسلئے پایدار نہیں ہوتا) اور کہہ دیجئے کہ (بس اب دین) حق (غالب ہونے کو) آیا اور باطل گیا گذرا ہوا واقعی باطل چیز تو یوں ہی آتی جاتی رہتی ہے (ہجرت کے بعد مکہ فتح ہوا تو یہ سب وعدے پورے ہو گئے) اور ہم ایسی چیز یعنی قرآن نازل کر گئے ہیں کہ وہ ایمان والوں کے حق میں تو شفا اور موت ہے (کیونکہ وہ اسکو مانتے اور اسپر عمل کرتے ہیں جس سے ان پر رحمت ہوتی اور عقائد باطلہ اور خیالات فاسدہ سے شفا ہوتی ہے) اور ظالموں کو اس سے اور الٹا نقصان بڑھتا ہے۔ (کہ جب وہ اسکو نہیں مانتے تو اللہ تعالیٰ کے قہر و عذاب کے مستحق ہو جاتے ہیں)

معارف و مسائل

دشمنوں کے مکر و کید سے بچنے کا بہترین علاج نماز ہے

سابقہ آیات میں اعداء اسلام کی مخالفت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مختلف قسم کی تکلیفوں میں مبتلا کرنے کی تدبیریں اور اس کا جواب

مذکور تھا اس کے بعد آیات صدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اقامت صلوٰۃ کا حکم دینے میں اس طرف اشارہ ہے کہ دشمنوں کے مکر و کید اور ایذاؤں سے بچنے کا بہترین علاج نماز کی اقامت ہے جیسا کہ سورہ حجر کی آیت میں اس سے زیادہ واضح الفاظ میں یہ ارشاد ہے وَ لَقَدْ نَعَلِمُ أَنَّكَ يَخِيتُّ صَدْرَكَ بِمَا يَقُولُونَ فَسَيَتِمُ كَيْدُكَ وَ كُنْ مِنَ الشَّٰجِدِينَ

یعنی ہم جانتے ہیں کہ کفار کے دل آزار اقوال سے آپ دلنگاہ ہوتے ہیں تو آپ اللہ کی حمد کے ساتھ تسبیح کیا کریں اور سجدہ کرنے والوں میں سے ہو جائیں۔ (قرطبی)

اس آیت میں دشمنوں کی ایذاؤں کا علاج اللہ کے ذکر و حمد و تسبیح اور نماز میں مشغول ہو جانے کو قرار دیا ہے ذکر اللہ اور نماز بالخاصہ ان سے بچنے کا علاج ہے اور یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ دشمنوں کی ایذاؤں سے بچنا اللہ تعالیٰ کی مدد پر موقوف ہے اور اللہ کی مدد حاصل کرنے کا سب سے افضل ذریعہ نماز ہے جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے وَ اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ (یعنی مدد حاصل کرو صبر اور نماز کے ذریعہ)

نماز بیگانہ کا حکم | جمہور ائمہ تفسیر نے اس آیت کو پانچوں نمازوں کے لئے جامع حکم قرار دیا ہے کیونکہ دُلُوك کا لفظ اگرچہ اصل میں میلان کے معنی میں آتا ہے اور میلان آفتاب زوال کے وقت شروع ہوتا ہے اور غروب کو بھی کہہ سکتے ہیں لیکن جمہور صحابہ و تابعین نے اس جگہ لفظ دُلُوك کے معنی زوال آفتاب ہی کے لئے ہیں۔ دکنائے القربی و انظر ہی و ابن کثیر،

إِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ لفظ غسق کے معنی رات کی تاریکی مکمل ہو جانے کے ہیں امام مالک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے غسق کی یہی تفسیر نقل فرمائی ہے۔

اس طرح دُلُوكِ الشَّمْسِ إِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ میں چار نمازیں آگئیں ظہر عصر مغرب عشاء اور انہیں سے دو نمازوں کا ابتدائی وقت بھی بتا دیا گیا کہ ظہر کا وقت زوال آفتاب سے شروع ہوتا ہے اور عشاء کا وقت غسق لیل سے یعنی جس وقت رات کی تاریکی مکمل ہو جائے اسی لئے امام اعظم ابو حنیفہ نے وقت عشاء کی ابتدا اس وقت سے قرار دی ہے جبکہ شفق احمد کے بعد شفق ابھین بھی غروب ہو جائے یہ سب جانتے ہیں کہ غروب آفتاب کے منقلب اتق مغرب پر ایک سرخی نمودار ہوتی ہے اور اس سرخی کے بعد ایک قسم کی سفیدی اتق پڑھیلی ہوئی نظر آتی ہے پھر وہ سفیدی

بھی غروب ہو جاتی ہے یہ ظاہر ہے کہ رات کی تاریکی مکمل اس وقت ہوگی جبکہ افق کی سفیدی بھی ختم ہو جائے اس لئے اس لفظ میں امام اعظم ابوحنیفہ کے مسلک کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ دوسرے ائمہ نے شفقِ احمر کے غروب ہونے پر وقتِ عشاء کی ابتداء قرار دی ہے اور اسی کو غَسَقُ اللَّیْلِ کی تفسیر قرار دیا ہے۔

وَقَرَأَانَ الْفَجْرِ اس جگہ لفظ قرآن ہو لکن نماز مراد لی گئی ہے کیونکہ قرآن نماز کا جزا ہے اکثر ائمہ تفسیر ابن کثیر قرطبی منظرہ نے یہی معنی لکھے ہیں اس لئے مطلب آیت کا یہ ہو گیا کہ ذَٰلِكَ الْمَشَقِّ إِلَى غَسَقِ اللَّیْلِ کے الفاظ میں چار نمازوں کا بیان تھا یہ پانچویں نماز فجر کا بیان ہے اسکو الگ کر کے بیان کرنے میں اس نماز کی خاص اہمیت اور فضیلت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

كَانَ مَشَقُّوْذًا یہ لفظ شہادت سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں حاشہ ہونا اس وقت میں جب تشریح احادیثِ صحیحہ رات اور دن کے دونوں فرشتوں کی جماعتیں حاضر نماز ہوتی ہیں اس لئے اسکو مشہور کہا گیا ہے اس آیت میں پانچ نمازوں کا حکم اجمال کے ساتھ آیا ہے جسکی مکمل تفسیر و تشریح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و فعل سے بتلائی ہیں اور جب تک اس تشریح پر عمل نہ کیا جائے کوئی شخص نماز ادا ہی نہیں کر سکتا معلوم نہیں کہ جو لوگ قرآن کو بغیر حدیث اور بیان رسول کے سمجھنے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ نماز کیسے پڑھتے ہیں اس طرح اس آیت میں نماز کے اندر قرأت قرآن کا ذکر بھی اجمالاً آیا ہے اسکی تفصیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل سے یہ ثابت ہوئی کہ نمازِ فجر میں قرأت طویل کی جائے بقدر استطاعت اور طہ و جمعہ میں اس سے کم اور عصر و عشاء میں متوسط اور مغرب میں بہت مختصر مغرب میں طویل قرأت اور فجر میں اختصار جو بعض روایات میں آیا ہے وہ عملاً متروک ہے امام قرطبی نے صحیح مسلم کی وہ روایت جس میں مغرب کی نماز میں سورۃ اعراف اور مرسلہ وغیرہ طویل سورتوں کا پڑھنا یا صبح کی نماز میں صرحت معوذتین پر اکتفا کرنا منقول ہے اسکو نقل کر کے فرمایا ہے فَمُتْرُوكٌ بِالْعَمَلِ وَلَا نِكَارَ عَلَى مَعَاذِ الطَّوِيلِ وَبِامْرَاةِ الْاُئِمَّةِ بِالْخَفِيفِ یعنی یہ اتفاقی واقعات مغرب میں طویل قرأت اور فجر میں اختصار کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دائمی عمل سے نیز زبانی ارشادات کی وجہ سے متروک ہیں۔ (قرطبی)

نماز تہجد کا وقت اور | وَمِنَ اللَّیْلِ فَتَهَجَّدْ بِہ لفظ تہجد مجہود سے مشتق ہے اور یہ اس کے احکام و مسائل | لفظ دو متضاد معنی کیلئے استعمال ہوتا ہے اس کے معنی سونے کے بھی آتے ہیں اور جاگنے بیدار ہونے کے بھی اس جگہ وَمِنَ اللَّیْلِ فَتَهَجَّدْ بِہ کے معنی یہ ہیں کہ رات کے کچھ حصہ میں قرآن کے ساتھ بیدار رہا کرو کیونکہ بِہ کی تفسیر قرآن کی طرف راجع ہے (منظرہ) قرآن کے ساتھ بیدار رہنے کا مطلب نماز ادا کرنا ہے اسی رات کی نماز کو اصطلاح شرع میں نماز تہجد

کہا جاتا ہے اور عموماً اسکا یہ مفہوم لیا گیا ہے کہ کچھ دیر سو کر اٹھنے کے بعد جو نماز پڑھی جائے وہ نماز تہجد ہے لیکن تفسیر منظر ہی میں ہے کہ مفہوم اس آیت کا اتنا ہے کہ رات کے کچھ حصے میں نماز کے لئے سونے کو ترک کر دو اور یہ مفہوم جس طرح کچھ دیر سونے کے بعد جاگ کر نماز پڑھنے پر صادق آتا ہے اسی طرح شروع ہی میں نماز کے لئے نیند کو موخر کر کے نماز پڑھنے پر بھی صادق ہے اس لئے نماز تہجد کے لئے پہلے نیند مٹانے کی شرط قرآن کا مدلول نہیں پھر بعض روایات حدیث سے بھی تہجد کے اسی عام معنی پر استدلال کیا ہے۔

اور امام ابن کثیر نے حضرت حسن بصریؒ سے نماز تہجد کی جو تعریف نقل کی ہے وہ بھی اسی عموم پر شاہد ہے اسکے الفاظ یہ ہیں۔

قال الحسن البصري هو ما كان
بعد العشاء ويحتمل على ما كان
بعد النوم (ابن کثیر)

حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ نماز تہجد ہر اس نماز پر صادق ہے جو عشاء کے بعد پڑھی جائے البتہ تعادل کی وجہ سے اسکو کچھ نیند کے بعد پر محمول کیا جائے گا۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ نماز تہجد کے اصل مفہوم میں بعد النوم ہونا شرط نہیں اور الفاظ قرآن میں بھی یہ شرط موجود نہیں لیکن عموماً تعادل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کا یہی رہا ہے کہ نماز آخر رات میں بیدار ہو کر پڑھتے تھے اسلئے اسکی افضل صورت یہی ہوگی۔

نماز تہجد فرض ہے یا نفل | نَافِلَةٌ لَّكَ - لفظ نفل اور نافلہ کے لغوی معنی زائد کے ہیں

اسی لئے اس نماز اور صدقہ خیرات وغیرہ کو نفل کہتے ہیں جو شرعاً واجب اور ضروری نہ ہو جسکے کرنے میں ثواب ہے اور نہ کرنے میں نہ کوئی گناہ ہے اور نہ کسی قسم کی برائی، اس آیت میں نماز تہجد کے ساتھ نَافِلَةٌ لَّكَ کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ نماز تہجد خصوصیت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نفل ہے حالانکہ اس کے نفل ہونے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور پوری امت سب ہی شریک ہیں اسی لئے بعض حضرات مفسرین نے اس جگہ نافلہ کو فریضہ کی صفت قرار دیکر یہ قرار دیتے ہیں کہ عام امت پر تو صرف پانچ وقت کی نماز فرض ہو مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تہجد بھی ایک زائد فرض ہے تو یہاں لفظ نافلہ سمجھنے فرض زائد کے ہے نفل کے عام معنی میں نہیں۔

اور تحقیق صحیح اس معاملہ کی یہ ہے کہ ابتداء اسلام میں جب سورہ منزل نازل ہوئی تو اس وقت پانچ نمازیں تو فرض ہوئی نہ تھیں صرف تہجد کی نماز سب پر فرض تھی اسی فرض کا ذکر سورہ منزل میں ہے پھر شب متراج میں پانچ نمازیں فرض کر دی گئیں تو تہجد کی فرضیت عام امت سے تو بالفاق منسوخ ہو گئی اور اس میں اختلاف رہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اسکی فرضیت منسوخ ہوئی یا یہ خصوصی طور پر آپ کے ذمہ فرض رہا اور اس آیت میں نَافِلَةٌ لَّكَ کے یہی معنی ہیں کہ نماز تہجد

آپ کے ذمہ ایک زائد فرض ہے مگر تفسیر قرطبی میں ہے کہ یہ کسی وجہ سے صحیح نہیں اول یہ کہ فرض کو نفل سے تعبیر کرنے کی کوئی وجہ نہیں اگر کہا جائے کہ مجاز ہے تو یہ ایک ایسا مجاز ہوگا جسکی کوئی حقیقت نہیں دوسرے احادیث صحیحہ میں صرف پانچ نمازوں کی تعیین کے ساتھ فرض ہونے کا ذکر ہے اور ایک حدیث میں اس کے آخر میں یہ بھی مذکور ہے کہ شب عراج میں جو اول پچاس نمازیں فرض کی گئی تھیں پھر تخفیف کر کے پانچ کر دی گئیں تو اگرچہ عد د گھٹا دیا گیا مگر ثواب پچاس ہی کا ملے گا اور پھر فرمایا لَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ یعنی میرا قول بدلا نہیں کرتا جب پچاس کا حکم دیا تھا تو ثواب پچاس ہی کا دیا جائے گا اگرچہ عمل میں کمی کر دی گئی۔

ان روایات کا حاصل یہی ہے کہ عام امت اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پانچ نمازوں کے سوا کوئی اور نماز فرض نہیں ہے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نافلة کا لفظ اگر اس جگہ فرضیہ زائد کے معنی میں ہوتا تو اس کے بعد لفظ لَكَ کے بجائے عَلَيْكَ ہونا چاہیے تھا جو وجوب پر دلالت کرتا ہے لفظ لَكَ تو صرف جواز اور اجازت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

اسی طرح تفسیر مظہری میں صحیح اسکو قرار دیا ہے کہ جب تہجد کی فرضیت امت سے منسوخ ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی منسوخ ہو گئی اور سب کے لئے نفل رہ گیا مگر اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت کیا ہے نفل ہونا تو سب ہی کے لئے ثابت ہے پھر نَافِلَةٌ لَكَ فرمانے کا کیا حاصل ہوگا جواب یہ ہے کہ حسب تصریح احادیث تمام امت کی نوافل اور تمام نفل عبادات ان کے گناہوں کا کفارہ اور فرض نمازوں میں جو کوتاہی کی رہ جائے اسکی تکمیل کا کام دیتی ہیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گناہوں سے بھی معصوم ہیں اور نماز کے آداب میں کوتاہی سے بھی اس کو آپ کے حق میں نفل عبادت بالکل زائد ہی ہے جو کسی کوتاہی کا تدارک نہیں بلکہ محض زیادت تقرب کا ذریعہ ہے۔ (قرطبی و مظہری نماز تہجد نفل ہے)

سنت مؤکدہ کے لئے جو عام ضابطہ فقہاء رکات ہے کہ جس کام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل فرمایا وہ امت فرمائی ہو اور بلا مجبوری کے نہ چھوڑا ہو وہ سنت مؤکدہ ہے بجز اس کے کہ کسی دلیل شرعی سے یہ ثابت ہو جائے کہ یہ کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص تھا عام امت کے لئے نہیں تھا اس ضابطہ کا تقاضا بظاہر یہی ہے کہ نماز تہجد بھی سب کیلئے سنت مؤکدہ قرار پائے نہ کہ صرف نفل کیونکہ اس نماز پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مداومت سنت متواترہ سے ثابت ہو اور خصوصیت کی کوئی دلیل نہیں اسلئے عام امت کے لئے بھی سنت مؤکدہ ہونا چاہئے۔ تفسیر مظہری میں اسکو مختار اور رائج قرار دیا ہے اور اسکے مؤکد ہونے پر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے اس شخص کے بارے میں جو پہلے تہجد پڑھا کرتا تھا پھر چھوڑ دیا یہ ارشاد فرمایا کہ "اسکے مکان میں شیطان نے پیشاب کر دیا ہے" اس طرح کی وعید اور تنبیہ صرف نفل میں نہیں ہو سکتی اس سے معلوم ہوا کہ یہ سنت نوکروہ ہے۔

اور جن حضرات نے تہجد کو صرف نفل قرار دیا ہے وہ اس موافقت اور مداومت کو آٹھ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت قرار دیتے ہیں اور تہجد پڑھنے والے کے ترک تہجد پر جو زجر کے الفاظ ارشاد فرمائے وہ دراصل مطلقاً ترک پر نہیں بلکہ اول عادت ڈالنے کے بعد ترک کرنے پر ہیں کیونکہ آدمی جس نفل کی عادت ڈال لے باتفاق امت اس کو چاہے کہ اسپر مداومت کرے اگر عادت ڈالنے کے بعد چھوڑ دے یا تو قابل ملامت ہوگا کیونکہ عادت کے بعد بلا عذر ترک ایک قسم کے اعراض کی علامت ہے اور جو شروع سے عادی نہ ہو تو اسپر کوئی ملامت نہیں۔ واللہ اعلم۔ تہجد کی تعداد رکعات صحیح بخاری و مسلم میں حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان یا غیر رمضان میں کبھی گیارہ رکعات سے زیادہ نہ پڑھتے تھے ان گیارہ رکعات میں حنفیہ کے نزدیک تین رکعتیں و ترک ہوئی تھیں باقی آٹھ تہجد کی۔

اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے یہ الفاظ منقول ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات میں تیرہ رکعتیں پڑھتے تھے جن میں دو رکعتیں شامل ہیں اور دو رکعتیں سنت فجر کی بھی (منظہری) سنت فجر کو رات کی نماز میں بوجہ رمضان کے شمار کر لیا ہے۔ ان روایات سے معلوم ہوا کہ عام عادت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تھی کہ تہجد کی نماز میں آٹھ رکعات ادا فرماتے تھے۔

لیکن صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت سے یہ بھی ثابت ہے کہ کبھی کبھی اس تعداد سے کم چار یا چھ رکعات پر بھی اکتفا فرمایا ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں آپ سے یہ منقول ہے کہ حضرت مسروق نے صدیقہ رضی اللہ عنہا سے تہجد کی نماز کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا کہ سات، نو، اور گیارہ رکعات ہوتی تھیں علاوہ سنت فجر کے (منظہری عن البخاری) حنفیہ کے قاعدہ کے مطابق تین رکعت و ترک ہوئی نو سات میں سے چار نو میں سے چھ، گیارہ میں سے آٹھ تہجد کی رکعتیں رہ جاتی ہیں۔ نماز تہجد کی کیفیت جو عام روایات حدیث سے ثابت ہے وہ یہ ہے کہ ابتدا میں دو رکعت ہلکی مختصر قرات کے ساتھ پھر باقی رکعات میں قرات بھی طویل اور رکوع سجدہ بھی طویل ہوتا اور یہ طویل اوقات بہت زیادہ ہو جاتا تھا کبھی کبھار کم (یہ خلاصہ ان روایات حدیث کا ہے جو اس جگہ تفسیر منظہری میں نقل کی گئی ہیں)۔

مقام محمود | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت میں مقام محمود کا وعدہ کیا گیا ہے اور یہ مقام

تمام انبیاء میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص ہے اس کی تفسیر میں اقوال مختلف ہیں مگر صحیح وہ ہے جو احادیث صحیحہ میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے یہ مقام شفاعت کہہ لی کا ہے کہ میدانِ مشرب جس وقت تمام بنی آدم جمع ہوں گے اور ہر نبی و پیغمبر شفاعت کی درخواست کریں گے تو تمام انبیاء علیہم السلام عذر کر دیں گے صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ شرف عطا ہوگا کہ تمام بنی آدم کی شفاعت فرمائیے تفصیل اس کی روایات حدیث میں طویل ہے جو اس جگہ ابن کثیر اور تفسیر منطہری میں لکھی ہے۔

انبیاء اور صلحاء امت کی شفاعت مقبول ہوگی | اسلامی فرقوں میں سے خوارج اور معتزلہ شفاعت انبیاء کے منکر ہیں وہ کہتے ہیں کہ گناہ کبیرہ کسی کی شفاعت سے معاف نہیں ہوگا مگر احادیث متواترہ اس پر شاہد ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی بلکہ صلحاء امت کی بھی شفاعت گناہگاروں کے حق میں مقبول ہوگی بہت سے لوگوں کے آقا و شفاعت سے معاف کر دیئے جاویں گے۔

ابن ماجہ اور ترمذی میں بروایت عثمان رضی عنہ منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز اول انبیاء علیہم السلام گناہگاروں کی شفاعت کریں گے پھر علماء پھر شہداء اور ولی نے بروایت ابن عمر رضی عنہ نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عالم سے کہا جائے گا کہ آپ اپنے شاگردوں کی شفاعت کر سکتے ہیں اگرچہ ان کی تعداد آسمان کے ستاروں کی برابر ہے۔ اور ابو داؤد اور ابن حبان نے بروایت ابی الدرداء رضی عنہ مرفوعاً نقل کیا ہے کہ شہید کی شفاعت اس کے خاندان کے ستر آدمیوں کے متعلق قبول کی جائے گی۔

مسند احمد۔ طبرانی اور بیہقی نے ابن مسیح حضرت ابوامامہ رضی عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کے ایک آدمی کی شفاعت پر قبیلہ ربیعہ اور منفر کے تمام لوگوں سے زیادہ آدمی جنت میں داخل کئے جا دیں گے۔

ایک سوال و جواب | یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شفاعت فرمادیں گے اور آپ کی شفاعت سے کوئی مؤمن دوزخ میں نہ رہ جاوے گا تو پھر امت کے علماء و صلحاء کی شفاعت کس لئے اور کیونکر ہوگی۔ تفسیر منطہری میں ہے کہ غالباً صورت یہ ہوگی کہ علماء اور صلحاء امت جن لوگوں کی شفاعت کرنا چاہیں گے وہ اپنی شفاعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کریں گے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ کی بارگاہ میں شفاعت فرمادیں گے۔

فائدہ | ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شَفَاعَتِي لَا تُهْلُ الْكَبَائِرُ مِنْ أُمَّتِي یعنی میری شفاعت میری امت کے ان لوگوں کے لئے ہوگی جنہوں نے کبیرہ گناہ

کئے تھے اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل کبار کی شفاعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہوگی کوئی فرشتہ یا امت کا فرد اہل کبار کی شفاعت نہ کر سکے گا بلکہ مسلمان امت کی شفاعت صغیرہ گناہ والوں کے لئے ہوگی۔

نماز تہجد کو مقام شفاعت حاصل | حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس آیت میں آنحضرت
ہونے میں خاص دخل ہے | صلی اللہ علیہ وسلم کو اول نماز تہجد کا حکم دیا گیا پھر مقام محمود یعنی
شفاعت کبریٰ کا وعدہ کیا گیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز تہجد کو مقام شفاعت حاصل ہونے میں
خاص دخل ہے۔

وَقُلْ رَبِّ اَدْخِلْنِيْ ۝۱۰ سابقہ آیات میں اول کفار مکہ کی ایذاؤں اور ان
تدبیروں کا ذکر تھا جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچانے کے لئے کرتے تھے اسکے ساتھ
یہ بھی مذکور ہوا کہ ان کی یہ تدبیریں کامیاب نہیں ہوں گی اور ان کے مقابلہ میں رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کو اصل تدبیر کے درجہ میں تو صرف نیکانہ نماز قائم کرنے اور تہجد گزاری کی تلقین فرمائی
اسکے بعد آخرت میں آپ کو سب انبیاء سے اعلیٰ مقام یعنی مقام محمود عطا فرمانے کا وعدہ فرمایا جو
آخرت میں پورا ہو گا مذکورہ آیت وَقُلْ رَبِّ میں حق تعالیٰ نے اسی دنیا میں اول آپ کو کفار کے مکائد
اور ایذاؤں سے نجات دینے کی تدبیر بصورت ہجرت مدینہ ارشاد فرمائی اور اسکے بعد فتح مکہ کی بشارت
وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ میں ارشاد فرمائی گئی۔

جامع ترمذی میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
مکہ معظمہ میں تھے پھر آپ مدینہ کا حکم دیا گیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی وَقُلْ رَبِّ اَدْخِلْنِيْ
مِنْ خَلٍّ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مِنْ خَلٍّ صِدْقٍ اس میں لفظ مُدْ خَل اور مُخْرِج وَاَخْل ہونے
اور خارج ہونے کی جگہ میں ہمنون ہے اور ان کے ساتھ صفت صدق بڑھانے سے مراد یہ ہے کہ یہ نیکانا
اور داخل ہونا سب اللہ کی مرضی کے مطابق خیر و خوبی کے ساتھ ہو کیونکہ لفظ صدق عربی زبان
میں ہر ایسے فعل کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جو ظاہراً اور باطناً درست اور بہتر ہو قرآن کریم میں
قدم صدق اور اسان صدق اور مقعد صدق کے الفاظ اتنی ہی میں استعمال ہوئے ہیں۔

داخل ہونے کی جگہ سے مراد مدینہ اور خارج ہونے کی جگہ سے مراد مکہ ہے مطلب یہ ہے کہ
یا اللہ مدینہ میں میرا داخلہ خیر و خوبی کے ساتھ ہو جائے وہاں کوئی خلاف طبع اور ناگوار صورت پیش نہ
آئے اور مکہ مکرّمہ سے میرا نکلنا خیر و خوبی کے ساتھ ہو جائے کہ وطن اور گھر بار کی محبت میں دل الجھانہ
رہے اس آیت کی تفسیر میں کچھ اور اقوال بھی آئے ہیں مگر یہ تفسیر حضرت حسن بصری اور قتادہ سے منقول ہے
ابن کثیر نے اسی کو اصح الاقوال کہا ہے ابن جریر نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ ترتیب کا تقاضا یہ تھا

کہ پہلے مخرج پھر مدخل کا ذکر ہوتا مگر یہاں مدخل کو مقدم اور مخرج کو مؤخر کرنے میں شاید اس طرف اشارہ ہو کہ مکہ مکرمہ سے نکلنا خود کوئی مقصد نہ تھا بلکہ بیت اللہ کو چھوڑنا انتہائی صدمہ کی چیز تھی البتہ اسلام اور مسلمانوں کیلئے مامن تلاش کرنا مقصد تھا جو داخلہ مدینہ کو ذریعہ حاصل ہوئی امید تھی اسلئے جو مقصد تھا اسکو مقدم رکھا گیا۔

فائدہ | ہم مقاصد کے لئے مقبول دعا | ہجرت مدینہ کے وقت حق تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دعا کی تلقین فرمائی کہ مکہ سے نکلنا اور پھر مدینہ پہنچنا دونوں خیر و خوبی اور عافیت کے ساتھ ہوں اسی دعا کا اثر تھا کہ ہجرت کے وقت تعاقب کرنے والے کفار کی زد سے اللہ تعالیٰ نے ہر قدم پر بچایا اور مدینہ طیبہ کو ظاہر و باطن آپ کے اور سب مسلمانوں کے لئے سازگار بنایا اسی لئے بعض علماء نے فرمایا کہ یہ دعا ہر مسلمان کو اپنے تمام مقاصد کے شروع میں یاد رکھنا چاہئے اور ہر مقصد کے لئے یہ دعا مفید ہے اسی دعا کا نکلے بعد کا جملہ ہے **وَاجْعَلْ لِّي فِتْنًا لِّكَ مُلْكًا نَّجِيًّا** حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم تھا کہ منصب رسالت کے فرائض کی ادائیگی اور دشمنوں کے نزغے میں کام کرنا اپنے بس کا نہیں اس لئے حق تعالیٰ سے غالبہ و نصرت کی دعا فرمائی جو قبول ہوئی اور اس کے آثار سب کے سامنے آگئے۔

وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ - یہ آیت ہجرت کے بعد فتح مکہ کے بارے میں نازل ہوئی حضرت ابن مسعود رضی فرماتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہوئے تو اس وقت بیت اللہ کے گرد تین سو ساٹھ بتوں کے بھسے کھڑے ہوئے تھے بعض علماء نے اس خاص تعداد کی وجہ یہ بتلائی ہے کہ مشرکین مکہ سال بھر کے دنوں میں ہر دن کا بت الگ رکھتے تھے اس دن میں اسکی پرستش کرتے تھے۔ (قرطبی) آپ حبیب و ہاں پہنچے تو یہ آیت آپ کی زبان مبارک پر نھنی **جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ** اور اپنی لکڑی ایک ایک بت کے سینے میں مارے جاتے تھے (بخاری و مسلم) بعض روایات میں ہے کہ اس چھڑی کے نیچے رنگ یا لوسے کی شام لگی ہوئی تھی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی بت کے سینے میں اس کو مارے تو وہ الٹا گر جاتا تھا یہاں تک کہ یہ سب بت گر گئے اور پھر آپ نے ان کے توڑنے کا حکم دیدیا (قرطبی بحوالہ قاضی عیاض و شیری) مشرک و کفر اور باطل کی رسوم | امام قرطبی نے فرمایا کہ اس آیت میں اس کی دلیل ہے کہ مشرکین و نشانات کا مٹانا واجب ہے | کے بت اور دوسرے مشرکانہ نشانات کو مٹانا واجب ہے اور تمام

وہ آلات بالحد جنکا مصروف صرف معصیت ہوا نکالنا بھی اسی حکم میں ہے ابن منذر نے فرمایا کہ تصویریں اور مجسمے جو لکڑی پتیل وغیرہ سے بنائے جاتے ہیں وہ بھی بتوں ہی کے حکم میں ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پردے کو چھڑا ڈالا جس پر تصویریں نقش و رنگ سے بنائی گئی تھیں اس سے عام تعداد پر کا حکم معلوم ہو گیا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں تشریف لادینگے تو مسجد حدیث کے مطابق

سیلوں کو توڑیں گے خنزیر کو قتل کریں گے یہ سب امور اسکی دلیل ہیں کہ شرک و کفر اور باطل کے آلات کو توڑنا اور ضائع کر دینا واجب ہے۔

وَنَزَّلْنَا مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ - قرآن کریم کا قلوب کے لئے شفا ہونا، شرک و کفر اور اخلاقِ رذیلہ اور امراضِ باطنہ سے نفوس کی نجات کا ذریعہ ہونا تو کھلا ہوا معاملہ ہے اور تمام اُمت اس پر متفق ہے اور بعض علماء کے نزدیک قرآن جس طرح امراضِ باطنہ کی شفا ہے امراضِ ظاہرہ کی بھی شفا ہے کہ آیات قرآن پڑھ کر مریض پر دم کرنا اور تعویذ لکھ کر گلے میں ڈالنا امراضِ ظاہرہ کے لئے بھی شفا ہوتا ہے روایات حدیث اس پر شاہد ہیں تمام کتب حدیث میں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث موجود ہے کہ صحابہ کرام کی ایک جماعت سفر میں تھی کسی گاؤں کے رئیس کو بچہ نے کاٹ لیا تھا لوگوں نے حضرت احمادؓ سے پوچھا کہ آپ کچھ اسکا علاج کر سکتے ہیں انہوں نے سات مرتبہ سورۃ فاتحہ پڑھ کر اس پر دم کیا مریض اچھا ہو گیا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اسکا تذکرہ آیا تو آپؐ نے صحابہ کرام کے اس عمل کو جائز قرار دیا۔

اسی طرح دوسری متعدد روایات حدیث سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معوذات پڑھ کر دم کرنا ثابت ہے اور صحابہ و تابعین سے معوذات اور دوسری آیات قرآن کے ذریعہ مریضوں کا علاج کرنا لکھ کر گلے میں ڈالنا ثابت ہے لہذا اس آیت کے تحت قرطبی نے تفصیل سے لکھا ہے۔

وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلَّا خَسَارًا اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کو جب اعتقاد و احترام کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کا شفا ہونا جس طرح ظاہر اور ثابت ہے اسی طرح قرآن کا انکاریانے ادبی خسارہ اور کافات کا ذریعہ بھی ہے۔

وَإِذَا أَنْعَمْنَا عَلَى الْإِنْسَانِ أَعْرَضَ وَنَأِجَانِبَهُ ۚ وَإِذَا

اور جب ہم آرام بھیجیں انسان پر تو مال جائے اور بھجائے اپنا پہلو اور جب

مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يُؤْسَا ۝۸۳ قُلْ كُلُّ يَعْمَلُ عَلَى شَاكِلَتِهِ

پہنچے اس کو بُرائی تو رہ جائے مایوس ہو کر تو کہہ ہر ایک کام کرتا ہے اپنے ڈھنگ پر

فَرَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ أَهْدَىٰ سَبِيلًا ۝۸۴

سو تیرا رب خوب جانتا ہے کس نے خوب پایا راستہ۔

خلاصہ تفسیر

اور (بعض) آدمی (یعنی کافر ایسا ہوتا ہے کہ اس) کو جب ہم نعمت عطا کرتے ہیں تو رہم سے

اور ہمارے احکام سے، منہ موڑ لیتا ہے اور گرد و ٹپ پھیر لیتا ہے اور جب اسکو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو بالکل رست سے، ناامید ہو جاتا ہے اور یہ دونوں حالتیں دلیل ہیں اللہ تعالیٰ سے بے تعلقی کی اور وہی بنیاد ہے ہر کفر و گمراہی کی، آپ فرمادیجئے کہ (نومنین اور کفار اور اخیار و امثرا میں سے) ہر شخص اپنے طریقہ پر کام کر رہا ہے یعنی اپنی اپنی عقل و عین پر عقیم اور علم یا جہل کی بنیاد پر مختلف طرح کے کام کر رہے ہیں، تو آپ کا رب خوب جانتا ہے اسکو جو زیادہ ٹھیک اور درست راستہ پر ہو و اسی طرح جو ٹھیک راستہ پر ہو اسکو بھی جانتا ہے اور ہر ایک کو اسکے عمل کے موافق جزا یا سزا دینگا۔ یہ نہیں کہ جسکا دل چاہے بلا کسی دلیل کے اپنے کو ٹھیک راستہ پر سمجھنے لگے۔

معارف و مسائل

كُلٌّ يَعْمَلُ عَلَىٰ شَاكِلَتِهِ - لفظ شاکلۃ کی تفسیر میں ائمہ سلف سے مختلف اقوال منقول ہیں

طبیعت۔ عادات۔ جبلت۔ نیت۔ طریقہ وغیرہ اور حاصل یہ کہ ہر انسان کی اپنے ماحول اور عادات اور رسم و رواج کے اعتبار سے ایک عادت اور طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے اسکا عمل اسی کے تابع رہتا ہے (فطری) اس میں انسان کو اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ بڑے ماحول بڑی صحبت اور بڑی عادتوں سے پرہیز کرے نیک لوگوں کی صحبت اور اچھی عادات کا خوگر بنے، جصاص) کیونکہ اپنے ماحول اور صحبت اور رسم و رواج سے انسان کی ایک طبیعت بن جاتی ہے اسکا ہر عمل اسی کے تابع چلتا ہے امام جصاص نے اس جگہ شاکلہ کے ایک معنی ہم شکل کے بھی لکھے ہیں اس معنی کے لحاظ سے مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ ہر شخص اپنے مزاج کے مطابق آدمی سے مانوس ہوتا ہے نیک آدمی نیک سے اور شریر شریر سے مانوس ہوتا ہے اسی کے طریقہ پر چلتا ہے اور اسکی تطبیق تعالیٰ کا یہ قول ہے:

الْحَبِیْثَاتُ الْخَبِیْثَاتِ وَالْحَبِیْثَاتُ الْخَبِیْثَاتِ یعنی خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لئے اور پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لئے یہ مراد یہ ہے کہ ہر ایک اپنے مزاج کے مطابق مرد و عورت سے مانوس ہوتا ہے اور حاصل مطلب اسکا بھی اس بات پر تنبیہ ہے کہ انسان کو چاہئے کہ خراب صحبت اور خراب عادت سے پرہیز کا اہتمام کرے۔

وَيَسْأَلُكَ عَنِ الرُّوحِ قُلُوبُ الرُّوحِ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا

اور تجھ سے پوچھتے ہیں روح کو کہہ دے روح ہے میرے رب کے حکم سے اور تو

أَوْ تَتِمَّرُ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا ۝ وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ

کو جمع دیا ہے تمھوڑا سا اور اگر ہم چاہیں تو لے جائیں

بِالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ تَحَرَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهِ عَلَيْنَا وَكِيلًا ﴿۸۶﴾

اُس چیز کو جو ہم نے تجھ کو وحی بھیجی پھر تو نہ پائے اپنے واسطے اُس کے لائے کو ہم پر کوئی ذمہ دار

إِلَّا رَحْمَةً مِن رَّبِّكَ ۚ إِنَّ فَضْلَهُ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيرًا ﴿۸۷﴾

مگر مہربانی سے تیرے رب کی اُس کی بخشش تجھ پر بڑی ہے

قُلْ لِّمَنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَىٰ أَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ

کہہ اگر جمع ہوں آدمی اور جن اس پر کہ لائیں ایسا

هَذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ

قرآن ہرگز نہ لائیں گے ایسا قرآن اور پڑے مدد کیا کریں ایک دوسرے

ظَهِيرًا ﴿۸۸﴾ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِي هَذَا الْقُرْآنِ مِنْ

کئی اور ہم نے پیچھے پیچھے کر سمجھائی لوگوں کو اس مشرآن میں ہر

كُلِّ مَثَلٍ ۚ فَأَبَىٰ أَكْثَرُ النَّاسِ إِلَّا كُفُورًا ﴿۸۹﴾

مثال سو نہیں رہتے بہت لوگ بن ناشکری کئے ۔

خلاصہ تفسیر

اور یہ لوگ آپ سے (امتحاناً) روح کی حقیقت کو پوچھتے ہیں آپ (جواب میں) فرمادیجئے

کہ روح کے متعلق بس اتنا اجمالاً سمجھ لو کہ وہ ایک چیز ہے جو میرے رب کے حکم سے بنی ہے اور ربانی اس کی مفصل حقیقت سو تم کو بہت تھوڑا علم بقدر تمہاری فہم اور ضرورت کے، دیا گیا ہے اور روح کی حقیقت کا معلوم کرنا کوئی ضرورت کی چیز نہیں اور نہ اسکی حقیقت عام طور پر سمجھ میں آسکتی ہے اسلئے قرآن اسکی حقیقت کو بیان نہیں کرتا،

اور اگر ہم چاہیں تو جس قدر آپ پر ہم نے وحی بھیجی ہے اور اسکے ذریعہ آپ کو علم دیا ہے، سب سلب کر لیں پھر اس (وحی) کے (واپس لانے کے لئے) آپ کو ہمارے مقابلہ میں کوئی حجت بھی نہ ملے گا مگر (یہ) آپ کے رب ہی کی رحمت ہے کہ ایسا نہیں کیا، بیشک آپ پر اسکا بڑا فضل ہے مطلب یہ ہے کہ انسان کو روح وغیرہ ہر چیز کی حقیقت کا تو کیا علم ہوتا اسکو جو تھوڑا سا علم بذریعہ وحی اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا گیا ہے وہ بھی اس کی کوئی جاگیر نہیں اللہ تعالیٰ

چاہئے تو دینے کے بعد بھی سلب کر سکتا ہے مگر وہ اپنی رحمت سے ایسا کرتا نہیں وجہ یہ ہے کہ آپ پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے، آپ فرمادیجئے کہ اگر تمام انسان اور جنات سب اس بات کے لئے جمع ہو جائیں کہ ایسا قرآن بنا لادیں تب بھی وہ ایسا نہ کر سکیں گے اگرچہ ایک دوسرے کا مددگار بن جائے یعنی ان میں سے ہر ایک الگ الگ کوشش کر کے لو کیا کامیاب ہوتا سب کے سب ایک دوسرے کی مدد سے کام کر کے بھی قرآن کا مثل نہیں بنا سکتے، اور ہم نے لوگوں کے سمجھانے کے لئے اس قرآن میں ہر قسم کے عمدہ مضمون طرح طرح سے بیان کیا ہے پھر بھی اکثر لوگ بے انکار کئے نہ رہتے

معارف و مسائل

آیات عدد میں پہلی آیت میں کفار کی طرف سے روح کے متعلق ایک سوال اور حق تعالیٰ کی طرف سے اسکا جواب مذکور ہے لفظ روح لغات و محاورات میں نیز قرآن کریم میں متعدد معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے: بحروف و مشہور معنی تو وہی ہیں جو عام طور پر اس لفظ سے سمجھے جاتے ہیں یعنی جان جس سے حیات اور زندگی قائم ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ جبریل امین کے لئے بھی استعمال ہوا ہے **نَزَّلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَى قَلْبِكَ** اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے بھی کئی آیات میں استعمال ہوا ہے اور خود قرآن کریم اور وحی کو بھی روح کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے **أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَهْرَآنا**۔

روح سے مراد کیا ہے؟ اس لئے یہاں پہلی بات غور طلب یہ ہے کہ سوال کرنے والوں نے روح کا سوال کس معنی کے لحاظ سے کیا تھا بعض حضرات مفسرین نے بیاق و سباق کی رعایت سے یہ سوال وحی اور قرآن یا وحی لانے والے فرشتے جبریل کے متعلق قرار دیا ہے کیونکہ اس سے پہلے بھی **نُزِّلَ مِنَ الْفُرْقَانِ** میں قرآن کا ذکر تھا اور بعد کی آیات میں پھر قرآن ہی کا ذکر ہے اس کے مناسب اسکو سمجھا کہ اس سوال میں بھی روح سے مراد وحی و قرآن یا جبریل ہی ہیں، اور مطلب سوال کا یہ ہو گا کہ آپ پر وحی کس طرح آتی ہے کون لاتا ہے قرآن کریم نے اس کے جواب میں اس پر اکتفا کیا کہ اللہ کے حکم سے وحی آتی ہے تفصیلات اور کیفیات جنکا سوال تھا وہ نہیں بتلائیں۔

لیکن احادیث صحیحہ مرفوعہ میں جو اس آیت کا شان نزول بتلایا گیا ہے وہ تقریباً ایسی صریح ہے کہ سوال کرنے والوں نے روح حیوانی کا سوال کیا تھا اور مقصد سوال کا روح کی حقیقت معلوم کرنا تھا کہ وہ کیا چیز ہے بدن انسانی میں کس طرح آتی جاتی ہے اور کس طرح اس سے حیوان اور انسان زندہ ہو جاتا ہے صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی عنہ سے روایت

ہے کہ میں ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ کے غیر آباد حصے میں چل رہا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں ایک چھڑی کھجور کی شاخ کی تھی آپکا گدڑ چند یہودیوں پر ہوا۔ یہ لوگ آپس میں کہنے لگے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، آرہے ہیں ان سے روح کے متعلق سوال کر دوسروں نے منع کیا مگر سوال کرنے والوں نے سوال کر ہی ڈالا یہ سوال سکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لکڑی پر ٹیک لگا کر خاموش کھڑے ہو گئے جس سے مجھے انداز ہوا کہ آپ پر وحی نازل ہونے والی ہے کچھ وقفہ کے بعد وحی نازل ہوئی تو آپ نے یہ آیت پڑھ کر سنائی وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُخْبِرُكُمْ بِهِ إِلَّا الْغَيْبُ اسطلاح تھی ان لوگوں کے سوال کو اس پر محمول کرنا بہت بعید ہے البتہ روح حیوانی والہی کا معاملہ ایسا ہے کہ اسکا سوال ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتا ہی ہے اسی لئے جمہور مفسرین ابن کثیر ابن جریر قرطبی و بحر محیط روح المعانی بھی نے اسی کو صحیح قرار دیا ہے کہ سوال روح حیوانی کی حقیقت سے تقارہا یہ معاملہ کہ سیاق و سباق میں ذکر قرآن کا چلا آیا ہے درمیان میں روح کا سوال جواب بے جوڑ ہے تو اسکا جواب واضح ہے کہ اس سے پہلی آیات میں کفار و مشرکین کی مخالفت اور معاذر انہ سوالات کا ذکر آیا ہے جن سے منظور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دوبارہ رسالت امتحان کرنا تھا یہ سوال بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اس لئے بے جوڑ نہیں خصوصاً شان نزول کے متعلق ایک دوسری حدیث صحیح منقول ہے اس میں یہ بات زیادہ وضاحت سے آگئی ہے کہ سوال کرنے والوں کا مطلب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا امتحان لینا تھا چنانچہ سند احمد میں حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ رقریش مکہ جو جادو بے جا سوالات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کرتے رہتے تھے انکو خیال پیدا ہوا کہ یہود و علم و اسے ہیں انکو پچھلی کتابوں کا بھی علم ہے ان سے کچھ سوالات حاصل کئے جادوئیں جنکے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امتحان لیا جائے اسلئے قریش نے یہود سے دریافت کرنے کے لئے اپنے آدمی بھیجے انہوں نے کہا کہ تم ان سے روح کے متعلق سوال کرو (ابن کثیر، اور حضرت ابن عباس وغیرہ) اس آیت کی تفسیر میں یہ بھی نقل کیا ہے کہ یہود نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے سوال میں یہ بھی کہا تھا کہ آپ ہمیں یہ بتلائیں کہ روح پر عذاب کس طرح ہوتا ہے اسوقت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس بارے میں کوئی بات نازل نہ ہوئی تھی اسلئے اسوقت آپ نے فوری جواب نہیں دیا پھر جب نازل آئیں یہ آیت لیکر نازل ہوئے قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي (ابن کثیر خلاصہ) واقعہ سوال مکہ میں پیش آیا یا مدینہ میں اس سے پہلے یہاں ایک بات اور قابل نظر ہے کہ شان نزول کے متعلق جو دو حدیثیں ابن مسعود و ابن عباس کی اور نقل کی گئیں ہیں انہیں جو ابن مسعود

کی روایت کے مطابق یہ واقعہ سوال مدینہ میں پیش آیا اور اسی لئے بعض مفسرین نے اس آیت کو مدنی قرار دیا ہے اگرچہ اکثر حصہ سورۃ بنی اسرائیل کا منکح ہے اور ابن عباس رضی کی روایت کا تعلق مکہ مکرمہ کے واقعہ سے ہے اسکے مطابق یہ آیت بھی پوری سورت کی طرح مکی باقی رہتی ہے اسی لئے ابن کثیر نے اسی احتمال کو رائج قرار دیا ہے اور ابن مسعود رضی کی روایت کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ ممکن ہے کہ اس آیت کا نزول مدینہ میں دوسری مرتبہ ہوا ہو جیسا کہ بہت سی آیات قرآن کا نزول مکہ و مدینہ کے نزدیک مسلم ہے اور تفسیر مظہری نے ابن مسعود رضی کی روایت کو رائج قرار دیکر واقعہ مدینہ کا اور آیت کو مدنی قرار دیا ہے جس کی دو وجہ تباہی ایک یہ کہ یہ روایت صحیحین میں ہے اور سند اس کی روایت ابن عباس رضی سے زیادہ قوی ہے دوسرے یہ کہ اس میں خود صاحب واقعہ ابن مسعود رضی اپنا واقعہ بیان کر رہے بخلاف روایت ابن عباس رضی کے کہ اس میں ظاہر ہی ہے کہ ابن عباس رضی نے یہ بات کسی سے سنی ہوگی۔

سوال مذکور کا جواب | قرآن کریم نے یہ دیا ہے قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي اس جواب کی تشریح

میں حضرات مفسرین کے کلمات اور تعبیرات مختلف ہیں ان میں سب سے زیادہ اقرب اور واضح وہ ہے جو تفسیر مظہری میں حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ نے اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس جواب میں بتنی بات کا بتلانا ضروری تھا اور جو عام لوگوں کی سمجھ میں آنے کے قابل ہے صرف وہ بتلا دیجئی اور روح کی مکمل حقیقت جس کا سوال تھا اس کو اس لئے نہیں بتلایا کہ وہ عوام کی سمجھ سے باہر بھی تھی اور ان کی کوئی ضرورت اس کے سمجھنے پر موقوف بھی نہ تھی یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم ہوا کہ آپ ان کے جواب میں یہ فرمادیں کہ ”روح میرے پروردگار کے حکم سے ہے“ یعنی وہ عام مخلوقات کی طرح نہیں جو مادہ کے تقیڑات اور تولید و تناسل کے ذریعہ وجود میں آتی ہیں بلکہ وہ بلا واسطہ حق تعالیٰ کے حکم کن سے پیدا ہونے والی چیز ہے اس جواب نے یہ نو واضح کر دیا کہ روح کو عام مادیات پر قیاس نہیں کیا جاسکتا جس سے وہ تمام شبہات رفع ہو گئے جو روح کو عام مادیات پر قیاس کرنے کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں اور انسان کے لئے اتنا ہی علم روح کے متعلق کافی ہے اس سے زائد علم کے ساتھ اس کا کوئی دینی یا دنیوی کام آکا ہوا نہیں اس لئے وہ حصہ سوال فضول اور لایعنی قرار دیکر اس کا جواب نہیں دیا گیا خصوصاً جبکہ اس کی حقیقت کا سمجھنا عوام کے لئے تو کیا بڑے بڑے حکماء و عقلاء کے لئے بھی آسان نہیں۔

ہر سوال کا جواب دینا ضروری نہیں | امام جنساص نے اس جواب سے یہ مسئلہ نکالا کہ مفتی اور عالم کے ذمہ یہ ضروری نہیں کہ مسائل کے ہر سوال اور اس کی ہر شق کا جواب ضرور دے بلکہ دینی مصالح پر نظر رکھ کر جواب دینا چاہئے جو جواب

مخاطب کے فہم سے بالاتر ہو یا اسکے غلط فہمی میں پڑ جانے کا خطرہ ہو تو اس کا جواب نہیں دینا چاہئے
 اسی طرح بے ضرورت یا لائق سوالات کا جواب بھی نہیں دینا چاہئے البتہ جس شخص کو کوئی ایسا
 واقعہ پیش آیا جسے متعلق اسکو کچھ عمل کرنا لازم ہے اور خود وہ عالم نہیں تو سختی اور عالم کو اپنے علم کے
 مطابق اسکا جواب دینا ضروری ہے (بصاف) امام بخاری نے کتاب العلم میں اس مسئلے کا ایک متعلق
 ترجمۃ الباب رکھ کر بتلایا ہے کہ جس سوال کے جواب سے مغالطہ میں پڑنے کا خطرہ ہو اسکا جواب نہیں دینا چاہئے۔
 روح کی حقیقت کا علم کسی کو ہو سکتا ہے یا نہیں | قرآن کریم نے اس سوال کا جواب مخاطب کی ضرورت اور فہم
 کے مطابق دیا حقیقت روح کو بیان نہیں فرمایا مگر اس سے

یہ لازم نہیں آتا کہ روح کی حقیقت کو کوئی انسان سمجھ ہی نہیں سکتا اور یہ کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 کو بھی اس کی حقیقت معلوم نہیں تھی صحیح بات یہ ہے کہ یہ آیت نہ اسکی نفی کرتی ہے نہ اثبات اگر
 کسی نبی و رسول کو وحی کے ذریعہ یا کسی ولی کو کشف و الہام کے ذریعہ اس کی حقیقت معلوم ہو جائے
 تو اس آیت کے خلاف نہیں بلکہ عقل و فلسفہ کی رو سے بھی اس پر کوئی بحث و تحقیق کی جائے تو
 اسکو فضول اور لایعنی تو کہا جائے گا مگر ناجائز نہیں کہا جاسکتا اسی لئے بہت سے علماء متقدمین
 و متاخرین نے روح کے متعلق مستقل کتابیں لکھی ہیں آخری دور میں ہمارے استاد محترم شیخ الاسلام
 حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے ایک مختصر سے رسالے میں اس مسئلے کو بہترین انداز سے
 لکھا ہے اور ہمیں جس قدر حقیقت سمجھنا عام انسان کے لئے ممکن ہے وہ سمجھا دی ہے جبکہ ایک
 تعلیم یافتہ انسان قناعت کر سکتا ہے اور شبہات و اشکالات سے بچ سکتا ہے۔

فتاویٰ امام بنوری رحمہ اللہ نے اس جگہ حضرت عبداللہ ابن عباس سے ایک متصل روایت
 اس طرح نقل فرمائی ہے کہ یہ آیت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی جبکہ مکہ کے قریشی سرداروں نے جمع ہو کر
 مشورہ کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے اندر پیدا ہوئے اور جو ان سے ان کی امانت و
 دیانت اور سچائی میں کبھی کسی کو شبہ نہیں ہوا اور کبھی ان کے متعلق جھوٹ بولنے کی تہمت بھی کسی نے نہیں
 لگائی اور اس کے باوجود اب جو دعویٰ نبوت کا وہ کر رہے ہیں ہماری سمجھ میں نہیں آتا اس لئے
 ایسا کرو کہ اپنا ایک وفد مدینہ طیبہ کے علماء یہود کے پاس بھیج کر ان سے ان کے بارے میں تحقیقات
 کرو چنانچہ قریش کا ایک وفد علماء یہود کے پاس مدینہ پہنچا علماء یہود نے ان کو مشورہ دیا کہ ہم تمہیں
 تین چیزیں بتلاتے ہیں تم ان سے ان تینوں کا سوال کرو اگر انہوں نے تینوں کا جواب دیا تو وہ نبی
 نہیں اس طرح تینوں میں سے کسی کا جواب نہ دیا تو بھی نبی نہیں اور اگر دو کا جواب دیا تیسری چیز کا جواب
 نہ دیا تو سمجھ لو کہ وہ نبی ہیں وہ تین سوال یہ بتلائے کہ ایک تو ان سے ان لوگوں کا حال پوچھو جو مستدیم

لے یہ تفصیل عالم النبی ص ۱۳۲ ج ۴ کے مطابق ہے۔ محدث عثمانی

زمانے میں شرک سے بچنے کے لئے کسی غار میں چھپ گئے تھے کیونکہ اسکا واقعہ عجیب ہے
دوسرے اس شخص کا حال پوچھو جسے زمین کے مشرق و مغرب کا سفر طے کیا کہ اس کا کیا واقعہ
ہے تیسرے روح کے متعلق دریافت کرو۔

یہ وفد واپس آیا اور تینوں سوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کر دیئے
آپ نے فرمایا کہ میں اسکا جواب نہیں کل دوں گا۔ مگر اس پر انشاء اللہ نہیں کہا اس کا نتیجہ یہ ہوا
کہ چند روز تک وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا بارہ پندرہ سے لیکر چالیس دن تک کی مختلف روایات
میں جنہیں سلسلہ وحی بند رہا قریش مکہ کو یمن، یثرب کا موتہ ملا کہ کل جواب دینے کو کہا تھا آج
استغاث ہو گئے جواب نہیں ملا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی پریشانی ہوئی پھر حضرت جبریل
امین یہ آیت لیکر نازل ہوئے وَلَا تَقُولُ لَنْ يَنْشَأَ اِنْتِ فَاَعْلَمُ ذَلِكَ شَيْءًا اِلَّا اَنْ يَشَاءَ اللّٰهُ
جیسے آپ کو یہ یقین کی گئی کہ آئندہ کسی کام کے کرنے کا وعدہ کیا جائے تو انشاء اللہ کہہ کر کیا جائے اور اسکے بعد
روح کے متعلق یہ آیت سنائی جو اوپر مذکور ہوئی اور غار میں چھپنے والوں کے متعلق اصحاب کہف کا
واقعہ اور مشرق سے مغرب تک سفر کرنے والے ذوالقرنین کا واقعہ جو سورہ کہف میں آئے والا ہے
اس کی آیات نازل ہوئیں جنہیں اصحاب کہف اور ذوالقرنین کا واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ جواب
میں بیان فرمایا گیا اور روح کے متعلق جس حقیقت کا سوال تھا اس کا جواب نہیں دیا گیا جس سے یہود
کی بھلائی ہوئی علامت صدق نبوت کی ظاہر ہو گئی۔ اس واقعہ کو ترمذی نے بھی مختصر بیان کیا ہے منظر ہی
سورہ حجر کی آیت ۲۹ نَفْثَتْنِي فَنُفِثْتُ وَرُفِثْتُ وَرُفِثْتُ وَرُفِثْتُ وَرُفِثْتُ وَرُفِثْتُ وَرُفِثْتُ وَرُفِثْتُ وَرُفِثْتُ
کے متعلق ایک تحقیق جو انفسیہ نظم ہی پہلے گزر چکی ہے ہمیں روح کی اقسام اور ایک حقیقت کو کافی حد تک متاثر کر دیا کہ
وَلَيْتُمْ شَيْئًا لَّكُنَّا لَكُنَّا كَبَبًا بِكَبَلٍ آیت میں روح کے سوال پر بتدریج و درست جواب دیکر روح
کی حقیقت دریافت کرنے کی کوشش سے یہ کہہ کر روک دیا گیا تھا کہ انسان کا علم کتنا ہی زیادہ ہو جائے
مگر حقائق الاشیاء کی ہمہ گیری کے اعتبار سے کم ہی رہتا ہے اس لئے غیر ضروری مباحث اور تحقیقات
میں الجھنا اپنے وقت کو ضائع کرنا ہے۔ آیت وَلَيْتُمْ شَيْئًا لَّكُنَّا لَكُنَّا كَبَبًا بِكَبَلٍ کو بتقدیر
بھی علم ملا ہے وہ بھی اسکی ذاتی جاگیر نہیں اللہ تعالیٰ چاہیں تو اسکو بھی سلب کر سکتے ہیں اس لئے اسکو چاہئے
کہ موجودہ علم پر اللہ کا شکر ادا کرے اور فضول دلائل یعنی تحقیقات میں وقت ضائع نہ کرے خصوصاً جبکہ
مقصود تحقیق کرنا بھی نہ ہو بلکہ دوسرے کا امتحان لینا یا اسکو خفیہ کرنا مقصود ہو اگر اس نے ایسا کیا
تو کچھ عجیب نہیں کہ اس کی روی کے نتیجہ میں جتنا علم حاصل ہے وہ سب سلب ہو جائے اس آیت
میں خطاب اگرچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے مگر اصل سنانا اُمت کو مقصود ہے کہ جب رسول کا
علم بھی انکے اختیار میں نہیں تو دوسروں کا کیا کہنا ہے۔

تُنَزَّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَقْرُؤُهُ ۚ قُلْ سُبْحَنَ رَبِّيَ هَلْ كُنْتُ

نہ اتار لائے ہم پر ایک کتاب جو ہم پڑھیں تو کہہ سبحان اللہ میں کون ہوں

إِلَّا بَشَرًا مِّثْرَ سُلَٰلَةٍ ۚ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُوَفُّوا آدَ جَاءَهُمْ

مگر ایک آدمی ہوں بیجا ہوا اور لوگوں کو روکا نہیں ایمان لانے سے جب پہنچی

الْهُدَىٰ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا مِّثْرَ سُلَٰلَةٍ ۚ قُلْ لَوْ

اُن کو ہدایت مگر اسی بات نے کہ کہنے لگے کیا اللہ نے بیجا آدمی کو پیغام دے کر کہہ اگر

كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يُّمَشِّقُونَ مَطْمَئِنِّينَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمُ

ہوتے زمین میں فرشتے پھرتے جلتے تو ہم اتارتے اُن پر

مِّنَ السَّمَاءِ مَلَكَائِ سُلَٰلَةٍ ۚ

آسمان سے کوئی فرشتہ پیغام دے کر ۔

خلاصہ تفسیر

سابقہ آیات میں کفار کے چند سوالات اور ان کے جوابات ذکر کئے گئے ہیں مذکور الصدر آیات میں ان کے چند معاندانہ سوالات اور بے سرو پا فرمائشوں کا ذکر اور ان کا جواب ہے اور ابن جریر عن ابن عباس، اور یہ لوگ (باوجود اسکے کہ اعجاز قرآنی کے ذریعہ آپ کی نبوت درسان کا کافی اور واضح ثبوت ان کو مل چکا پھر بھی ازراہ عناد ایمان نہیں لاتے اور یہ بہانے کرتے ہیں کہ کہتے ہیں کہ ہم آپ پر سرگز ایمان نہ لاؤینگے جب تک آپ ہمارے لئے رکھ کی زمین سے کوئی پتھر جاری نہ کر دیں یا خاص آپ کے لئے کھجور اور انگور کا کوئی باغ نہ ہو پھر اس باغ کے بیج بیج میں جا کر جگہ بہت سی نہیں آپ جاری کر دیں یا جیسا آپ کہا کرتے ہیں آپ آسمان کے ٹکڑے ہم پر نہ گرا دیں جیسا کہ اس آیت قرآن میں ارشاد ہے اِنْ تَشَاءُ نَحْنُ مُرْسِلُوهُمُ الْأَرْضِ اَوْ نَقُطُّ عَلَيْهِمْ كِسْفًا مِّنَ السَّمَاءِ (یعنی ہم چاہیں تو ان کو زمین کے اندر دھنسا دیں یا ان پر آسمان کے ٹکڑے گرا دیں) یا آپ اللہ کو اور فرشتوں کو (ہمارے) سامنے نہ لا کھڑا کر دیں (کہ ہم کھلم کھلا دیکھ لیں) یا آپ کے پاس کوئی سونے کا بنا ہوا گھر نہ ہو یا آپ آسمان پر (ہمارے سامنے) نہ چڑھ جاویں اور ہم تو آپ کے (آسمان پر) چڑھنے کا کبھی بھی یقین نہ کریں گے جب تک کہ وہاں سے) آپ ہمارے پاس ایک کتاب نہ لاویں جس کو ہم پڑھ سکیں (اور اس میں آپ کے آسمان پر پہنچنے کی تصدیق بطور رسد لکھی ہوئی ہو) آپ

ان سب خرافات کے جواب میں، فرمادیکھئے کہ سبحان اللہ میں بجز اس کے کہ آدمی ہوں (مگر) پیغمبر ہوں اور کیا ہوں کہ ان فرمائشوں کو پورا کرنا میری قدرت میں ہو یہ قدرت مطلقہ تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کی صفت ہے بشریت اپنی ذات میں خود بخود بے اختیاری کو مقتضی ہے یہاں رسالت کا معاملہ تو وہ بھی اسکو مقتضی نہیں ہے کہ اللہ کے رسول کو ہر چیز کا مکمل اختیار ہو بلکہ نبوت و رسالت کے لئے تو اتنی بات کافی ہے کہ رسالت کی کوئی صاف واضح دلیل آجاد سے جس پر اہل عقل کو اعتراض نہ ہو سکے اور وہ دلیل اعجاز قرآنی اور دوسرے معجزات کی صورت میں بارہا پیش کی جا چکی ہے اس لئے نبوت رسالت کے لئے ان فرمائشوں کا مطالبہ محض لغو ہے ہاں اللہ تعالیٰ کو سب قدرت ہے وہ سب کچھ کر سکتے ہیں مگر اس سے کسی کو مطالبہ کا حق نہیں جس چیز کو وہ حکمت کے مطابق دیکھتے ہیں ظاہر بھی کر دیتے ہیں مگر یہ ضروری نہیں کہ تمہاری سب فرمائشیں پوری کریں اور جس وقت ان لوگوں کے پاس ہدایت (یعنی رسالت کی صحیح دلیل مثل اعجاز قرآن کے) پہنچ چکی اس وقت ان کو ایمان لانے سے بجز اس کے اور کوئی قابل التفات بات مانع نہیں ہوتی کہ انہوں نے بشریت کو رسالت کے منافی سمجھا اس لئے کہا کیا اللہ تعالیٰ نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے (یعنی ایسا نہیں ہو سکتا آپ (جو آپ) میں ہماری طرف سے) فرمادیکھئے کہ اگر زمین پر فرشتے (رہتے) ہوتے کہ اس پر چلتے بستے تو ہم اللہ ان پر آسمان سے فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتے۔

معارف و مسائل

بے سرو پا معاندانہ سوالات کا پیغمبرانہ جواب آیات مذکورہ میں جو سوالات اور فرمائشیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے ایمان لانے کی شرط قرار دیکر کی گئیں وہ سب ایسی ہیں کہ ہر انسان ان کو سن کر ایک قسم کا تمسخر اور ایمان نہ لانے کا یہودہ بہانے کے سوا کچھ نہیں سمجھ سکتا ایسے سوالات کے جواب میں انسان کو فطرۃ غصہ آتا ہے اور جو اب بھی اسی انداز کا دیتا ہے۔ مگر ان آیات میں ان کے یہودہ سوالات کا جو جواب حق تعالیٰ نے اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقین فرمایا وہ قابل نظر اور صاحب امت کی لئے ہمیشہ یاد رکھنے اور لائحہ عمل بنانے کی چیز ہے کہ ان سب کے جواب میں نہ ان کی بے وقوفی کا اظہار کیا گیا نہ ان کی معاندانہ شرارت کا، نہ ان پر کوئی فقرہ کہا گیا بلکہ نہایت سادہ الفاظ میں اصل حقیقت کو واضح کر دیا گیا کہ تم لوگ شاید یہ سمجھتے ہو کہ جو شخص خدا کا رسول ہو کر آئے اسے سارے حشر انی اختیارات کا مالک اور ہر چیز پر قادر ہونا چاہئے یہ تخیل غلط ہے رسول کا کام صرف اللہ کا پیغام پہنچانا ہے اللہ تعالیٰ ان کی رسالت کو ثابت کرنے کے لئے بہت سے معجزات بھی بھیجتے ہیں مگر وہ سب کچھ محض اللہ تعالیٰ کی قدرت

واختیار سے ہوتا ہے رسول کو خدائی کے اختیارات نہیں ملتے وہ ایک انسان ہوتا ہے اور انسانی قوت و قدرت سے باہر نہیں ہوتا بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ ہی اسکی امداد کے لئے اپنی قوت ظاہر کو ظاہر فرمادیں۔

اللہ کا رسول انسان ہی ہو سکتا ہے | عام کفار و مشرکین کا خیال تھا کہ بشر یعنی آدمی اللہ کا رسول نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ تو ہماری طرح تمام حوائج انسانی

کا عادی ہوتا ہے پھر اس کو ہم پر کیا فوقیت حاصل ہے کہ ہم اسکو اللہ کا رسول سمجھیں اور اپنا مقتدا بنالیں۔ ان کے اس خیال کا جواب قرآن کریم میں کئی جگہ مختلف عنوانات سے دیا گیا ہے یہاں آیت مَا مَنَعَ النَّاسَ میں جو جواب دیا گیا ہے اسکا حاصل یہ ہے کہ اللہ کا رسول جن لوگوں کی طرف بھیجا جائے وہ انہیں کی جنس میں سے ہونا ضروری ہے اگر یہ آدمی ہیں تو رسول بھی آدمی ہونا چاہئے کیونکہ غیر جنس کے ساتھ باہم مناسبت نہیں ہوتی اور بلا مناسبت کے رشد و ہدایت کا فائدہ حاصل نہیں ہوتا اگر آدمیوں کی طرف کسی فرشتے کو رسول بنا کر بھیج دیں جو نہ بھوک کو جانتا ہے نہ پیاس کو نہ جنسی خواہشات کو نہ سردی گرمی کے احساس کو نہ اس کو کبھی محنت سے تکان لاحق ہوتا ہے تو وہ انسانوں سے بھی ایسے ہی عمل کی توقع رکھتا انکی کمزوری و مجبوری کا احساس نہ کرتا۔ اسی طرح انسان جب یہ سمجھتے کہ یہ تو فرشتہ ہے ہم انکی کاموں کی نقل کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے تو اس کا اتباع خاک کرتے یہ فائدہ اصلاح اور رشد و ہدایت کا صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ اللہ کا رسول ہو تو جنس بشر سے جو تمام انسانی جذبات اور طبعی خواہشات کا خود بھی حامل ہو مگر ساتھ ہی اسکو ایک شان ملکیت کی بھی حاصل ہو کہ عام انسانوں اور فرشتوں کے درمیان واسطہ اور رابطہ کا کام کر سکے، وحی لانے والے فرشتوں سے وحی حاصل کرے اور اپنے ہم جنس انسانوں کو پہنچائے۔

اس تقریر سے یہ شبہ بھی دور ہو گیا کہ جب انسان فرشتہ سے فیض حاصل نہیں کر سکتا تو پھر رسول باوجود انسان ہونے کے کس طرح ان سے فیض وحی حاصل کر سکے گا۔

رہا یہ شبہ کہ جب رسول اور امت میں مجاہدت شرط ہے تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جنات کا رسول کس طرح بنایا گیا جنات تو انسان کے ہم جنس نہیں تو جواب یہ ہے کہ رسول صرف انسان نہیں بلکہ اسمیں ایک شان ملکیت کی بھی ہوتی ہے اس کی وجہ سے جنات کو بھی مناسبت ان سے ہو سکتی ہے۔

آخر آیت میں یہ ارشاد فرمایا کہ تم انسان ہونے کے باوجود جو یہ مطالبہ کرتے ہو کہ ہمارا رسول فرشتہ ہونا چاہیے یہ مطالبہ تو نامعقول ہے البتہ اگر اس زمین پر فرشتے آباد ہوتے اور ان کی طرف

رسول بھیجنے کی ضرورت ہوتی تو فرشتہ ہی کو رسول بنایا جاتا اس میں جو زمین پر بسنے والے فرشتوں کا یہ وصف ذکر کیا گیا ہے کہ یُسُوْنُ مَطٰیْنِیْنِ یعنی وہ فرشتے زمین پر ملحق ہو کر چلتے پھرتے، اس سے معلوم ہوا کہ فرشتوں کی طرف فرشتوں کو رسول بنا کر بھیجنے کی ضرورت اسی وقت ہو سکتی تھی جبکہ زمین کے فرشتے خود آسمان پر نہ جاسکتے بلکہ زمین ہی پر چلتے پھرتے رہتے ورنہ اگر وہ خود آسمان پر جانے کی قدرت رکھتے تو زمین پر رسول بھیجنے کی ضرورت ہی نہ رہتی۔

قُلْ كَفَىٰ بِاللّٰهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهِۦ

کہہ اللہ کافی ہے حق ثابت کرنے والا میرے اور تمہارے بیچ میں وہ ہے اپنے بندوں سے

خَبِيْرًاۙ۱۰۱۱ وَ مَن يُّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَمْ يُضِلَّۙ۱۰۱۲ وَ مَن يُّضِلَّ

خبردار دیکھنے والا اور جس کو راہ دکھلائے اللہ وہی ہے راہ پانے والا اور جس کو بھٹکائے

فَلَن تَجِدَ لَهُم اَوْلِيَاءَ مِّنْ دُوْنِهٖۙ۱۰۱۳ وَ نَحْشُرْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

پھر تو نہ پائے ان کے واسطے کوئی رفیق اللہ کے سوا کے اور اٹھائیں گے ہم ان کو دن قیامت کے

عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًاۙ۱۰۱۴ وَ بَكْمًاۙ۱۰۱۵ وَ صُمًّاۙ۱۰۱۶ مَاۤ اُولٰٓئِكَ جَحَدُوْۤاۙ۱۰۱۷ كَلِمًا

چلیں گے منہ کے بل اندھے اور گونگے اور بہرے ٹھکانا ان کا دوزخ ہے جب لگے گی

خَبِيْرًاۙ۱۰۱۸ نَحْمُۡ سَعِيْرًاۙ۱۰۱۹ ذٰلِكَ جَزَاۤؤُهُمْۙ۱۰۲۰ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْۤاۙ۱۰۲۱

بگھنے اور بھڑکا دینا گئے ان پر یہ ان کی سزا ہے اس واسطے کہ مشرک ہوئے

بِاٰیٰتِنَاۙ۱۰۲۲ وَ قَالُوْۤاۙ۱۰۲۳ اِذَا كُنَّا عِظَامًاۙ۱۰۲۴ وَ رُفَاتًاۙ۱۰۲۵ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَۙ۱۰۲۶ خَلْقًاۙ۱۰۲۷

ہماری آیتوں سے اور بولے کیا جب ہم ہو گئے ہڈیاں اور چورا چور کیا ہم کو اٹھائیں گے

جَدِيْدًاۙ۱۰۲۸ اَوَلَمْ يَرَوْۤاۙ۱۰۲۹ اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌۙ۱۰۳۰

نئے بنا کر کیا نہیں دیکھ چکے کہ جس اللہ نے بنائے آسمان اور زمین وہ بنا

عَلٰیۙ۱۰۳۱ اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَهُمْۙ۱۰۳۲ وَ جَعَلَ لَهُمُۙ۱۰۳۳ اَجَلًاۙ۱۰۳۴ لَّا رَیْبَ فِیْہِۙ۱۰۳۵ فَاٰیِ الظّٰلِمُوْنَۙ۱۰۳۶

کتاب ہے ایوں کو اور قدر کیا ہے ان کے واسطے ایک وقت بے شبہ سو نہیں رہا جاتا انصافوں

اِلَّا کُفُوْرًاۙ۱۰۳۷ قُلْ لَّوْۤاۤ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَۙ۱۰۳۸ خَزَاۤئِنَ رَحْمَةِ رَبِّیْۙ۱۰۳۹ اِذَا

سے بے ناشکری کئے کہہ اگر تمہارے ہاتھ میں ہوتے یہ سب رحمت کے خزانے تو ضرور

لَا مَسَکُمْ خَشِیَّةَ إِلَّا نِفَاقٌ وَكَانَ الْإِنْسَانُ قَتُورًا ۝

بند کر رکھتے اس ڈر سے کہ نریج نہ ہو جائیں اور ہے انسان دل کا تنگ ۔

خلاصہ تفسیر

جب یہ لوگ رسالت و نبوت کی دلائل واضح آجائے اور تمام شہادت دور ہو جانے کے بعد بھی نہیں ماننے تو آپ (آخری بات) کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ میرے تمہارے درمیان کے اختلاف (میں) کافی گواہ ہے یعنی خدا جانتا ہے کہ میں واقع میں اللہ کا رسول ہوں کیونکہ وہ اپنے بندوں (کے احوال) کو خوب جانتا خوب دیکھتا ہے (تمہارے عباد کو بھی دیکھتا ہے) اور اللہ سبکو راہ پر لادو وہ ہی راہ پر آتا ہے اور جسکو بے راہ کر دے تو خدا کے عوا آپ کیلئے بھی ایسوں کا مددگار نہ پاویں گے اور ابو جہر کے یہ خدا کی مدد سے محروم رہے مطلب یہ ہے کہ جب تک فی الواقع کی طرف سے دشگیری نہ ہو نہ ہدایت ہو سکتی ہے نہ عذاب سے نجات) اور ہم قیامت کے روز انکو اندھا گونگا بہرہ کر کے منہ کے بل چلائیں گے انکا حکمانا دوزخ ہے جسکی یہ کیفیت ہوگی کہ (وہ یعنی دوزخ کی آگ) جب ذرا دھیمی ہونے لگے گی اسوقت ہم ان کے لئے اور زیادہ بھڑکادیں گے یہ ہے آگى سزا، اس سبب سے کہ انھوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا تھا اور یوں کہا تھا کہ کیا ہم بڑیاں اور (وہ بھی) بالکل ریزہ ریزہ ہو جاویں گے تو کیا ہم از سر نو پیدا کر کے (قبروں سے) اٹھائے جاویں گے کیا ان لوگوں کو اتنا معلوم نہیں کہ جس اللہ نے آسمان اور زمین پیدا کئے وہ اس بات پر بدرجہ اولیٰ قادر ہے کہ وہ ان جیسے آدمی دوبارہ پیدا کر دے اور (شکرین کو شاید یہ دوسو سو ہو کہ ہزاروں لاکھوں مرگئے مگر اب تک تو یہ وعدہ دوبارہ زندہ ہو کر اٹھے گا پورا ہوا نہیں تو اسکی وجہ یہ ہے کہ ان کے دوبارہ پیدا کرنے کے لئے ایک معاد معین کر رکھی ہے کہ اس معاد (معین کے آئے ہیں ذرا بھی شک نہیں۔ اسے بھی ظالم لوگ بے انکار کئے نہ رہے آپ فرمادیجئے کہ اگر تم لوگ میرے رب کی رحمت (یعنی نبوت) کے خزانوں (یعنی کمالات) کے مختار ہوئے کہ جسکو چاہتے دیتے جسکو چاہتے نہ دیتے) تو اس صورت میں تم اس کے (خرچ ہو جانے کے اندیشے سے محروم ہاتھ روک لیتے) کبھی کیونہ دیتے حالانکہ یہ چیز کسیکو دینے سے گھشتی بھی نہیں) اور آدمی ہے بڑا تنگدل اگر نہ گھٹنے والی چیز کو بھی عطا کرنے سے دریغ کرتا ہے جس کی وجہ سے رسولوں سے عداوت اور بغل کے علاوہ شاید یہ بھی ہو کہ اگر کسی کو نبی اور رسول بنالیا تو پھر اس کے احکام کی پابندی کرنا پڑے گی جیسے کوئی قوم باہم اتفاق کر کے کسیکو اپنا بادشاہ بنائے تو گویا انھوں نے یہ نگرہ جب

وہ بادشاہ بن گیا تو اسکی اطاعت کرنی پڑتی ہے)

معارف و مسائل

آخری آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ اگر تم لوگ اللہ کی رحمت کے خزانوں کے مالک ہو جاؤ تو تم بخل کرو گے کیونکہ وہ دو گے اس خطرہ سے کہ اگر لوگوں کو دیتے رہتے تو یہ خزانہ ختم ہو جائے گا اگرچہ رحمت رب کا خزانہ ختم ہونے والا نہیں مگر انسان اپنی طبیعت سے تنگدل کم حوصلہ ہوتا ہے اسکو فراخی کے ساتھ لوگوں کے دینے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔

اسمیں خزانہ رحمت رب کے لفظ سے عام مفسرین نے مال و دولت کے خزانے مراد لئے ہیں اور اسکا ربط سابق سے یہ ہے کہ کفار مکہ نے اسکی فرمائش کی تھی کہ اگر آپ واقعی نبی حق ہیں تو آپ اس مکہ کے خشک ریگستان میں نہریں جاری کر کے اسکو سرسبز باغات میں منتقل کر دیں جیسا ملک شام کا خطرہ ہے جسکا جواب پہلے آچکا ہے کہ تم نے تو گویا مجھے خدا ہی سمجھ لیا کہ خدائی کے اختیارات کا مجھے مطالبہ کر رہے ہو میں تو صرف ایک رسول ہوں خدا نہیں کہ جو چاہوں کر دوں یہ آیت بھی اگر اسی کے متعلق قرار دی جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ سرزمین مکہ کو نہری زمین اور سبزہ زار بنانے کی فرمائش اگر مسیری نبوت و رسالت کے امتحان کے لئے ہے تو اسکے لئے اعجاز قرآن کا معجزہ کافی ہے دوسری فرمائشوں کی ضرورت نہیں اور اگر اپنی قومی اور ملکی ضرورت رفع کرنے کے لئے ہے تو یاد رکھو کہ اگر تمہاری فرمائش کے مطابق تمہیں زمین مکہ میں سب کچھ دے بھی دیا جائے اور خزانہ کا مالک تمہیں بنا دیا جائے تو اسکا انجام بھی قومی اور ملک کے عوام کی خوشحالی نہیں ہوگی بلکہ انسانی عادت کے مطابق جسکے قبضہ میں یہ خزانہ آجاوے گا وہ ان پر سانپ بچر بیٹھ جاوے گا عوام پر خرچ کرتے ہوئے افلاس کا خوف ان کو مانع ہو گا۔ ایسی صورت میں بجز اسکے کہ مکہ کے چند رئیس اور زیادہ امیر اور خوشحال ہو جائیں عوام کا کیا فائدہ ہو گا۔ اکثر مفسرین نے اس آیت کا یہی مفہوم قرار دیا ہے۔

سیدہ حضرت حکیم الامتہ تھانوی نے بیان القرآن میں اس جگہ رحمت رب سے مراد نبوت و رسالت اور خزانہ رحمت سے مراد کمالات نبوت لئے ہیں اس تفسیر کے مطابق اسکا ربط آیات سابقہ سے یہ ہو گا کہ تم جو نبوت و رسالت کے لئے بے سرو پا اور یہودہ مطالبات کر رہے ہو اسکا حاصل یہ ہے کہ میری نبوت کو ماننا نہیں چاہتے تو کیا پھر تمہاری خواہش یہ ہے کہ نبوت کا نظام تمہارے ہاتھوں میں دیدیا جائے جسکو تم چاہو نہیں بناو۔ اگر ایسا کر لیا جائے تو اسکا نتیجہ یہ ہو گا کہ تم کیونکہ بھی نبوت و رسالت نہ دو گے بخل کر کے بیچہ جاؤ گے حضرت نے اس تفسیر کو نقل کر کے فرمایا ہے کہ یہ تفسیر موافق الہیہ میں سے ہے کہ مقام کے ساتھ نہایت چسپاں ہے اسمیں نبوت کو رحمت کے ساتھ تعبیر کرنا ایسا ہی ہو گا

جیسا آیت اُھم یُفِیضُونَ رَحْمَةً رَبِّكَ میں بالا جہاں رحمت سے مراد نبوت ہی ہے واللہ بشارہ و تعالیٰ اعلم

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى تِسْعَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ فَعُكِّلَ بَنِي إِسْرَءِيلَ إِذْ

اور ہم نے دیں موسیٰ کو نو نشانیاں صاف پھر پوچھ بنی اسرائیل سے جب

جَاءَهُمْ فَقَالَ لَهُ فِرْعَوْنُ إِنِّي لَأَظُنُّكَ يَمُوسَىٰ مَسْحُورًا ﴿١١﴾ قَالَ لَقَدْ

آیا وہ اُن کے پاس تو کہا اُس کو فرعون نے میری اہل میں تو موسیٰ تجھ پر جادو ہوا ہوا تو جان

عَلِمْتَ مَا أَنْزَلَ هَؤُلَاءِ إِلَّا رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ بِصَافِرٍ وَ

چکا ہے کہ یہ چیزیں کسی نے نہیں اتاریں مگر آسمان اور زمین کے مالک نے سمجھانے کو اور

إِنِّي لَأَظُنُّكَ يَمُوسَىٰ مَثْبُورًا ﴿١٢﴾ فَأَرَادَ أَنْ يَنْتَفِيزَ مِنْهُمُ مِنَ الْأَرْضِ

میری اہل میں فرعون تو غارت ہوا جانتا ہے پھر چاہا کہ بنی اسرائیل کو چین نہ لے اُس زمین میں

فَاغْرَقْنَاهُ وَمَنْ مَّعَهُ جَمِيعًا ﴿١٣﴾ وَ قُلْنَا مِنْ بَعْدِهِ لِبَنِي

پھر ڈبایا ہم نے اُس کو اور اسکے ساتھ والوں کو سب کو اور کہا ہم نے اس کے پیچھے بنی

إِسْرَءِيلَ أَسْكُنُوا الْأَرْضَ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ

اسرائیل کو آباد رہو تم زمین میں پھر جب آئے گا وعدہ آخرت کا لے آئیں گے ہم تم کو

لَقِيفًا ﴿١٤﴾ وَ بِالْحَقِّ أَنْزَلْنَاهُ وَ بِالْحَقِّ نَزَّلُ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا

سمیٹ کر اور سچ کے ساتھ اتارا ہم نے یہ قرآن اور سچ کے ساتھ اتارا اور تجھ کو جو بھیجا ہم نے سو

مُبَشِّرًا وَ نَذِيرًا ﴿١٥﴾ وَ قُرْآنًا فَرَقْنَاهُ لِنَقُرَّكَ بِهِ عَلَى النَّاسِ عَلَى

خوشی اور ڈر سنانے کو اور پڑھنے کا وظیفہ کیا ہم نے قرآن کو جدا جدا کر کے کہ پڑھے تو اُس کو لوگوں پر

مُكِّثٌ وَ نَزَلْنَاهُ تَنْزِيلًا ﴿١٦﴾ قُلْ أَصْنَوِيبَهُ أُولَئِكَ مِنْكُمْ

ٹھہر ٹھہر کر اور ہم نے اس کو اتارتے اتارتے اتارا کہہ تم اس کو مانو یا نہ مانو

إِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهِ إِذَا يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ

جن کو علم ملا ہے اس کے پہنچنے سے جب اُن کے پاس اس کو پڑھتے

يَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ سُجَّدًا ﴿١٧﴾ وَ يَقُولُونَ سُبْحَانَ رَبِّنَا

گرتے ہیں ٹھوڑیوں پر سجدہ میں اور کہتے ہیں پاک ہے ہمارا رب

اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُولًا ۝ وَخِشْرُونَ لِلْآذِقَانِ

بے شک ہمارے رب کا وعدہ ہو کر رہے گا اور گرتے ہیں ٹھوڑیوں پر

يَبْكُونَ وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعًا ۝

روتے ہوئے اور زیادہ ہوتی ہے اُن کو عاجزی -

السنجیدۃ

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کھلے ہوئے نو معجزے دیئے (جنا ذکر پارہ ہنم کے رکوع ششم آیت اول میں ہے) جبکہ وہ بنی اسرائیل کے پاس آئے تھے سو آپ بنی اسرائیل سے (بھی چاہئے) پوچھ دیکھئے اور چونکہ آپ فرعون کی طرف بھی بھیجے گئے تھے اور فرعون و آل فرعون کے ایمان نہ لانے کو وہ عجائبات معجزات ظاہر ہوئے تھے اس لئے موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو دوبارہ ایمان لانے کے لئے یاد دہانی کی اور ان آیات بہت سے ڈرایا، تو فرعون نے ان سے کہا کہ اے موسیٰ میرے خیال میں تو نہ درہم پر کسی نے جادو کر دیا ہے (جس سے تمہاری عقل مضبوط ہو گئی کہ ایسی ہلکی باتیں کرتے ہو) موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا تو (دل میں) خوب جانتا ہے (گو عار کی وجہ سے زبان سے اقرار نہیں کرتا) کہ یہ عجائبات خاص آسمان اور زمین کے پروردگار ہی نے بھیجے ہیں جو کہ بصیرت کے لئے (کافی) ذرائع ہیں اور میرے خیال میں ضرورتیری کبھتی کے دن آگئے ہیں (اور یا تو فرعون کی یہ حالت سختی کہ موسیٰ علیہ السلام کی درخواست پر بھی بنی اسرائیل کو منہ سے جانیکی اجازت نہ دیتا تھا اور) پھر یہ ہوا کہ اس نے اس احتمال سے کہ نہیں بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام کے اثر سے قوت نہ پکڑ جاویں خود ہی چاہا کہ بنی اسرائیل کا اس سرزمین سے قدم اکھاڑ دے (یعنی ان کو شہر بدر کر دے) سو ہم نے (قبل اسکے) کوہ کامیاب ہو خود اس (میں) کو اور جو اس کے ساتھ تھے سب کو غرق کر دیا اور اس (کے غرق ہونے) کے بعد ہم نے بنی اسرائیل کو کہہ دیا کہ (اب) تم اس سرزمین (کے جہاں سے تم کو نکالنا چاہتا تھا) الگ ہو تم ہی اس (میں) رہو سو (خواہ بالقوہ یا بالفعل) مگر یہ مالکیت حیوۃ دنیا تک (بجہ) پھر حسب آخرت کا وعدہ آجیا و یگانا تو ہم سب کو جمع کر کے (قیامت کے میدان میں) ملائے گا محکومان اگر حاضر کریگے (یہ ابتداء میں ہوگا پھر مومن و کافر اور نیک و بد کو الگ الگ کر دیا جاوے گا) اور (جس طرح ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو معجزے دیئے اسی طرح آپ کو بھی بہت سے معجزات دیئے جن میں عظیم الشان معجزہ قرآن ہے کہ) ہم نے اس قرآن کو راستی ہی کے ساتھ تو نازل کیا اور وہ راستی ہی کے ساتھ (آپ پر) نازل ہو گیا (یعنی حبیب کاتب کے پاس سے چلا تھا اسی طرح مکتوب الین تک پہنچ گیا اور درمیان میں کوئی تغیر و تبدل و تصرف

نہیں ہوا پس سزا سزا سنی ہی راستی ہے، اور جس طرح ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو پیغمبر بنایا تھا اور ہدایت ان کے اختیار میں نہ تھی اسی طرح ہم نے آپ کو بھی، صرف ایمان پر ثواب کی، خوشی سنانے والا اور کفر پر عذاب سے، ڈرا بیوالا بنا کر بھیجا ہے (اگر کوئی ایمان نہ لائے کچھ غم نہ کیجئے) اور قرآن میں صفت راستی کے ساتھ بمقتضائی رحمت اور بھی ایسے صفات کی رعایت کی گئی ہے کہ اس سے ہدایت زیادہ آسان ہو چنانچہ ایک تو یہ کہ اس میں ہم نے آیات وغیرہ کا، جا بجا فصل رکھا تاکہ آپ اسکو لوگوں کے سامنے ٹھہر کر پڑھیں جس میں وہ اچھی طرح سمجھ سکیں کیونکہ تقریر طویل مسلسل بعض اوقات ضبط میں نہیں آتی، اور دوسرے یہ کہ ہم نے اسکو اتارنے میں بھی حسب واقعات، تدریجاً اتارا (تاکہ معانی کا خوب انکشاف ہو اب ان سب امور کا مقتضایہ تھا کہ یہ لوگ ایمان لے آتے لیکن اس پر بھی ایمان نہ لادیں تو آپ کچھ پروا نہ کیجئے بلکہ صاف کہہ دیجئے کہ تم اس قرآن پر خواہ ایمان لاؤ یا ایمان نہ لاؤ، تمکو کوئی پروا نہیں دو وہ سے اول تو یہ کہ میرا کیا ضرر کیا۔ دوسرے یہ کہ تم ایمان نہ لائے تو کیا ہوا دوسرے لوگ ایمان لے آئے چنانچہ جن لوگوں کو قرآن (کے نزول) سے پہلے دین کا علم دیا گیا تھا یعنی منصف علماء اہل کتاب، یہ قرآن جب ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو ٹھوڑیوں کے بل سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں ہمارا رب ا وعدہ خلافی سے، پاک ہے بیشک ہمارے رب کا وعدہ ضرور پورا ہی ہوتا ہے (سو جس کتاب کا جس نبی پر نازل کرنے کا وعدہ کتب سابقہ میں کیا تھا اسکو پورا فرمادیا، اور ٹھوڑیوں کے بل (جو) گرتے ہیں (تو) روتے ہوئے (گرتے ہیں) اور یہ قرآن ایسی اسکا ستارہ ان کا ادنیٰ شمع اور بڑھا دیتا ہے (کیونکہ ظاہر و باطن کا تو افاق کیفیت کو قوی کر دیتا ہے)۔

معارف و مسائل

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ تِسْعَ آيَاتٍ اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نو آیات بینات عطا فرمانے کا ذکر ہے۔ آیت کا لفظ معجزے کے معنی میں بھی آتا ہے اور آیات قرآن یعنی احکام الہیہ کے معنی میں بھی اس جگہ دونوں معنی کا احتمال ہے اسی لئے ایک جماعت مفسرین نے اس جگہ آیات سے مراد معجزات لئے ہیں اور نو کے عدد سے یہ ضرور نہیں کہ نو سے زائد نہ ہوں مگر اس جگہ نو کا ذکر کسی خاص اہمیت کی بنا پر کیا گیا ہے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ نو معجزات اس طرح شمار فرمائے ہیں (۱) عصائی موسیٰ جو اژدہا بخانی تھی (۲) بدجنیا جسکو گریبان میں ڈال کر نکالنے سے چمکنے لگتا تھا (۳) زبان میں لکنت تھی وہ دور کر دی گئی (۴) بنی اسرائیل کے دریا پار کرنے کے لئے دریا کو بھاڑ کر اسکے دو حصے الگ کر دیئے اور ازودیدیا (۵) لٹی دل کا غذا غیر معمولی صورت میں سجید یا گیا۔ (۶) طوفان سجید یا گیا۔ (۷) بدن کے پٹروں میں سجید جو میں پیدا کر دی گئیں جن سے بچنے کا کوئی راستہ نہ رہا (۸) مینڈکوں کا ایک عذاب مسلط کر دیا گیا کہ ہر کھانے پینے کی

چیزیں پسینہ لگ آجاتے تھے (۹) خون کا عذاب بھیجا گیا کہ ہر برتن اور کھانے پینے میں خون مل جاتا تھا۔

اور ایک صحیح حدیث کے مضمون سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں آیات سے مراد احکام الہیہ ہیں

یہ حدیث ابو داؤد نسائی، ترمذی، ابن ماجہ میں بند صحیح حضرت معن بن عدال رحمہ سے منقول ہے

وہ فرماتے ہیں کہ ایک یہودی نے اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ مجھ اس نبی کے پاس بھلا بھلائی سے کہا

کہ نبی نہ کہو اگر ان کو خبر ہوگی کہ ہم بھی انکو نبی کہتے ہیں تو ان کی چار آنکھیں ہو جاویں گی یعنی انکو فخر و

مست کا موقع مل جاوے گا پھر یہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے

اور دریافت کیا کہ نبی علیہ السلام کو جو نو آیات بینات دی گئی تھیں وہ کیا ہیں رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا: (۱) اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو (۲) چوری نہ کرو (۳) زنا نہ کرو (۴)

جس جان کو اللہ نے حرام کیا ہے اسکو ناحق قتل نہ کرو (۵) کسی بے گناہ پر جھوٹا الزام لگا کر قتل و سزا

کے لئے پیش نہ کرو (۶) جادو نہ کرو (۷) سود نہ کھاؤ (۸) پاکدامن عورت پر بدکاری کا بہتان

نہ بانڈھو (۹) میدان جہاد سے جان بچا کر نہ بھاگو۔ اور اسے یہود و خاسکے تمہارے لئے یہ بھی حکم ہے

کہ یوم السبت (سینچر) کے جو خاص احکام تھے دینے لگے انکی خلاف ورزی نہ کرو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات سکر دونوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ

اور پاؤں کو پوس دیا اور کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے نبی ہیں آپ نے فرمایا کہ پھر تمہیں میرا اتباع

کرنے سے کیا چیز روکتی ہے کہنے لگے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے رب سے یہ دعا کی تھی کہ ان کی

ذرت میں ہمیشہ نبی ہوتے رہیں اور ہمیں غم نہ ہو کہ اگر ہم آپکا اتباع کرنے لگیں تو یہود ہمیں قتل کر دیں گے۔

چونکہ یہ تفسیر صحیح حدیث سے ثابت ہے اس لئے بہت سے مفسرین نے اسی کو ترجیح دی ہے۔

يَبْكُونَ وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعًا تفسیر منبری میں ہے کہ تلاوت قرآن کے وقت رونا مستحب ہے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جہنم میں نہ جاوے گا وہ

شخص جو اللہ کے خوف سے رویا جب تک کہ دو بارہ دودھ دوبارہ کھنوں میں واپس نہ لوٹ جائے

(یعنی جیسے یہ نہیں ہو سکتا کہ تھنوں سے نکالا ہوا دودھ پھر تھنوں میں واپس ڈال دیا جائے اسی طرح یہ بھی

نہیں ہو سکتا کہ اللہ کے خوف سے رونے والا جہنم میں چلا جائے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ

نے دو آنکھوں پر جہنم کی آگ حرام کر دی ایک وہ جو اللہ کے خوف سے رونے دوسرے جو اسلامی

سرحد کی حفاظت کے لئے رات کو بیدار رہے انتہائی دھاکم و سحر، اور حضرت نصر بن سعد فرماتے ہیں

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس قوم میں کوئی اللہ کے خوف سے رونے والا ہو تو اللہ تعالیٰ

اس قوم کو اس کی وجہ سے آگ سے نجات عطا فرما دیں گے (روح عن الحکیم الترمذی)

آج سب سے بڑی مصیبت جو مسلمانوں پر پڑی ہے اسکا سبب یہی ہے کہ انہیں خدا کے خوف

سے رونے والے بہت کم رہ گئے صاحب روح المعانی اس موقع پر خدا کے خوف سے رونے کے فضائل کی احادیث نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔ ویبغی ان یكون ذلك حال العلماء یعنی علماء دین کا یہی حال ہونا چاہئے کیونکہ ابن جریر ابن منذر وغیرہ نے عبد اللہ علیہ السلام کی روایت کا یہ مقولہ نقل کیا ہے۔ ”جس شخص کو صرف ایسا علم ملا ہو جو اس کو رلاتا نہیں تو سمجھ لو کہ اس کو علم نافع نہیں ملا“

قُلْ ادْعُوا اللَّهَ أَوَادْعُوا الرَّحْمَنَ ۖ أَيَّ مَآ تَدْعُوا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ

کہہ اللہ پکارو یا رحمن کہہ کر جو کہہ کر پکارو گے سو اسی کے ہیں سب

الْحُسْنَى ۚ وَلَا تَجْمُرْ بِضَلَاتِكْ وَلَا تُخَافُ بِمَا وَابْتَغِ بَيْنَ

نام خائے اور پکار مت پڑھ اپنی نماز اور نہ چلے پڑھ اور ڈھونڈ لے اس کے بیچ

ذَلِكَ سَبِيلًا ۝۱۱۰ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَلَهُ يَكُنْ

میں راہ اور کہہ سب تعریفیں اللہ کو جو نہیں رکھتا اولاد اور نہ کوئی اس

لَهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَهُ يَكُنْ لَهُ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ

کا ساتھی سلطنت میں اور نہ کوئی اس کا مددگار ذلت کے وقت پر

وَكَبِيرٌ ۚ تَكْبِيرًا ۝۱۱۱

اور اُس کی بڑائی کر بڑا جان کر۔

خلاصہ تفسیر

آپ فرمادیجئے کہ خواہ الٹ کہہ کر پکارو یا رحمن کہہ کر پکارو جس نام سے بھی پکارو گے (تو بہتر ہے کیونکہ) اس کے بہت سے اچھے نام ہیں (اور اس کا شرک سے کوئی واسطہ نہیں کیونکہ ایک ہی ذات کے کئی نام ہونے سے اسکی توحید میں کوئی فرق نہیں آتا) اور اپنی بہری نماز میں نہ تو بہت پکار کر پڑھیے کہ مشرکین سنیں اور خرافات بگھیں اور نماز میں قلب مشوش ہو، اور نہ بالکل ہی آہستہ پڑھیے کہ مقتدی نمازیوں کو بھی سنائی نہ دے۔ کیونکہ اس سے انکی تعلیم و تربیت میں کمی آتی ہے، اور دونوں کے درمیان ایک (متوسط) طریقہ اختیار کر لیجئے (تا کہ مصلحت فوت نہ ہو اور مضرت پیش نہ آئے) اور کفار پر رد کرنے کے لئے علی الاعلان کہہ دیجئے کہ تمام خوبیاں اسی اللہ کے لئے (خاص) ہیں جو نہ اولاد رکھتا ہے نہ اس کا کوئی شریک سلطنت ہے اور نہ کمزوری کی وجہ سے کوئی اس کا

مددگار ہے اور اسکی خوب بڑائی بیان کیا کیجئے۔

معارف و مسائل

یہ سورہ بنی اسرائیل کی آخری آیات ہیں اس سورت کے شروع میں بھی حق تعالیٰ کی تعظیم اور توحید کا بیان تھا ان آخری آیات میں بھی اسی پر ختم کیا جا رہا ہے ان آیتوں کا نزول چند واقعات کی بناء پر ہوا، اول یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز دعا میں یا اللہ اور یا ربن کہہ کر پکارا تو مشرکین نے بھوکا کہ یہ دو خداؤں کو پکارتے ہیں اور کہنے لگے کہ ہیں تو ایک کے ہوا کسی اور کو پکارتے سے منع کرتے ہیں اور خود دو معبودوں کو پکارتے ہیں اسکا جواب آیت کے پہلے حصہ میں دیا گیا ہے کہ اللہ جل شانہ کے دو ہی نہیں اور بھی بہت سے اچھے نام ہیں کسی نام سے بھی پکاریں مراد ایک ہی ذات ہے تمہارا وہم غلط ہے۔

دوسرا قصہ یہ ہے کہ جب مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں بلند آواز سے تلاوت قرآن فرماتے تو مشرکین تمسخر و استہزاء کرتے اور قرآن اور جبریل امین او خود حق تعالیٰ کی شان میں گستاخانہ باتیں کہتے تھے اس کے جواب میں اسی آیت کا آخری حصہ نازل ہوا جس میں آپکو جہر و انخاف میں میانہ روی اختیار کرنے کی تلقین فرمائی کہ ضرورت تو اس درمیانہ آواز سے پوری ہو جاتی ہے اور زیادہ بلند آواز سے جو مشرکین کو موقع ایذا رسانی کا ملتا تھا اس سے نجات ہو۔

تیسرا قصہ یہ ہے کہ یہود و انصاری اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد قرار دیتے تھے اور عرب بنوں کو اللہ کا شریک کہتے تھے اور صابئی اور مجوسی کہا کرتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے مخصوص مغرب ہوں تو اسکی قدر و عزت میں کمی آجاوے ان تینوں فرقوں کے جواب میں احسری آیت نازل ہوئی جس میں تینوں چیزوں کی نفی ذکر کی گئی ہے۔

دنیا میں جس سے مخلوق کو کس قدر قوت پہنچا کرتی ہے وہ بھی تو اپنے سے چھوٹا ہوتا ہے جیسے اولاد اور بھی اپنی برابر ہوتا ہے جیسے شریک اور بھی اپنے سے بڑا ہوتا ہے جیسے حامی مددگار حق تعالیٰ نے اس آیت میں یہ ترتیب تینوں کی نفی فرمادی۔

مسئلہ: آیت مذکورہ میں نماز کے اندر تلاوت کرنے کا یہ ادب بتلایا گیا ہے کہ بہت بلند آواز سے ہونہ بہت آہستہ جسکو مقتدی نہ سن سکیں۔ یہ حکم ظاہر ہے کہ جہری نمازوں کے ساتھ مخصوص ہے نہ ہر اور حصہ کی نمازوں میں تو بالکل انخاف ہونا سنت متواترہ سے ثابت ہے۔

جہری نماز میں مغرب، عشاء اور فجر کے فرض بھی داخل ہیں اور نماز تہجد بھی جیسا کہ ایک حدیث میں

کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز تہجد کے وقت صدیق اور فاروق اعظم کے پاس سے گزرے تو صدیق اکبر تلاوت آہستہ کر رہے تھے اور فاروق اعظم خوب بلند آواز سے تلاوت کر رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیق سے فرمایا کہ آپ ایسا آہستہ کیوں پڑھتے ہیں صدیق نے عرض کیا کہ مجھے جسکو سنانا تھا اسکو نہ دیا کیونکہ اللہ تعالیٰ تو ہر غنی سے غنی آواز کو بھی سنتے ہیں آپ نے فرمایا کہ کسی قدر جہر سے پڑھا کرو پھر عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ آپ اتنی بلند آواز سے کیوں پڑھتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ میں نیند اور شیطان کو دفع کرنے کے لئے بلند آواز سے پڑھتا ہوں آپ نے ان کو بھی حکم دیا کہ کچھ سہت آواز سے پڑھا کرو۔ (ترمذی، از منہری)

نماز اور غیر نماز میں تلاوت قرآن کو جہر سے اور اخفا سے ادا کرنے کے متعلق مسائل سورہ اعراف میں بیان ہو چکے ہیں آخری آیت قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ کے متعلق حدیث میں ہے کہ آیت عزت یہ آیت ہے الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي الْخَزَاوَادُ اَحْمَدُ وَالطُّبَرَانِي عَنْ مُعَاذِ الْيَمَنِيِّ كَذَا فِي الْمَنْظُومَةِ (اس آیت میں یہ ہدایت بھی ہے کہ کوئی انسان کتنی ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت اور تسبیح و تحمید کرے اپنے عمل کو اس کے حق کے مقابلہ میں کم سمجھنا اور قصور کا اعتراف کرنا اس کے لئے لازم ہے) (منہری)

اور جنہ تانس نہ فرماتے ہیں کہ بنی عبد المطلب میں جب کوئی بچہ زبان کھولنے کے قابل ہو جاتا تو اسکو آپ یہ آیت سکھا دیتے تھے قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي لَمْ يَخْلُقْ وَلَدًا وَلَمْ يَكُنْ لَهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الدِّنِّ وَلَمْ يَكُنْ لَهٗ تَكْبِيرًا (منہری)

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک روز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ باہر نکلا اس طرح کہ میرا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں تھا آپ کا گدرا ایک ایسے شخص پر ہوا جو بہت سنگستہ حال اور پریشان تھا آپ نے پوچھا کہ تمہارا یہ حال کیسے ہو گیا اس شخص نے عرض کیا کہ بیماری اور سنگدستی نے یہ حال کر دیا آپ نے فرمایا کہ میں تمہیں چند کلمات بتلاتا ہوں وہ پڑھو گے تو تمہاری بیماری اور سنگدستی جاتی رہے گی وہ کلمات یہ تھے تَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي لَمْ يَخْلُقْ وَلَدًا (آیت اس کے کچھ عرصہ کے بعد پھر آپ اس طرف تشریف لے گئے تو اس کو اپنے حال میں پایا آپ نے خوشی کا اظہار فرمایا اس نے عرض کیا کہ جب سے آپ نے مجھے یہ کلمات بتلائے تھے میں پابندی سے ان کو پڑھتا ہوں (ابو یعلیٰ وابن سنی، از منہری)

تہ تفسیر سورۃ بنی اسرائیل بتون اللہ وحده بعد العشاء لعاش

جمادی الاولیٰ سنہ ۳۹ھ فالحمد لله اولہ و آخرہ -

عرض حال | آج ۲۹ شعبان ۱۴۰۹ھ یوم السبت میں بحمد اللہ معارف القرآن کے مسودہ پر نظر ثانی از مولف | بھی مکمل ہو گئی ہے اب یہ نصف قرآن کریم کی تفسیر حق تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے پوری کرادی جس کی بظاہر اسباب کوئی امید نہیں تھی کیونکہ رمضان ۱۴۰۸ھ کے آخر میں یہ ناکارہ ایسے مختلف

امراض میں مبتلا ہو کہ تقریباً ایک سال تو بستر ہی پر موت و حیات کی کشمکش میں گزرا، اس وقت مجبوری و معذرت کے عالم میں بار بار یہ حسرت ہوتی تھی کہ بعض تصانیف کے مسودات جو قریب تکمیل تھے کاش ان کی تکمیل ہو جاتی معارف القرآن کے نام سے جو درس قرآن عرصہ دراز تک ریڈیو پاکستان سے نشر ہو رہا بہت سے دوستوں کے تقاضے سے اس پر نظر ثانی اور درمیان سے باقی رہی ہوئی آیات کی تفسیر کی تکمیل کا جو سلسلہ پیل رہا تھا کسی طرح اس کی تکمیل ہو جاتی اسی طرح سیدی حسرت حکیم الامتہ تھانوی قدس سرہ نے قرآن کریم کی دو منزلیں یا پنجویں اور چھٹی کے احکام القرآن بزبان عربی لکھنے کے لئے انفرکو ما مور فرمایا تھا اس کا بھی آخری حصہ بیٹھنے سے باقی رہ گیا تھا موت و حیات کی کشمکش اٹھنے بیٹھنے سے معذوری ہی کے عالم میں شاید اس حسرت نایافت کی نشو وانی بارگاہ رب العزت میں ہو گئی اور یہ خیال غالب آیا کہ جو کچھ جتنابن پرٹ وہ کام کر لیا جائے یہ فکر چھوڑ دی جائے کہ جو رہ جائے گا اس کا کیا ہو گا اس خیال نے ایک عزم کی صورت اختیار کر لی بستر پر لیٹے ہوئے ہی تفسیر پر نظر ثانی اور احکام القرآن کی تکمیل کا کام شروع کر دیا بجانب قدرت سے ہے کہ اس بیماری کے زمانے میں کام اتنی سرعت سے چلا کہ تندرستی میں بھی یہ رفتار نہ تھی اور پھر شاید اسی کی برکت سے حق تعالیٰ نے ان معذور و مجبور کر دینے والے امراض سے شفا رکھی فرمادی اور ایک حد تک تندرستی کی صورت حاصل ہو گئی، تو اب وقت کی قریمانی اور ان کا مول پر بقدر استطاعت وقت صرف کیا یہ محض حق تعالیٰ کا فضل و انعام ہی تھا کہ احکام القرآن کی دونوں منزلیں کی تکمیل بھی ہو گئی اور اسی عرصہ میں یہ دونوں جلدیں چھپ کر شائع بھی ہو گئی اور تفسیر معارف القرآن کی دو جلدیں سورہ نسا تک چھپ کر شائع ہو گئی ہیں تیسری جلد سورہ اعراف تک زیر طباعت ہے اور آج نصف قرآن کے مسودہ تفسیر پر نظر ثانی کی بھی تکمیل ہو گئی۔ (فلنہ الحمد اولہ و آخرہ)

اس وقت جبکہ یہ سطور زیر تحریر ہیں احقر نا کارہ کی عمر کے ۵۰ سال پورے ہو کر ۵۱ شعبان ۱۳۹۰ھ کو عمر کی چھتہ وین منزل شروع ہو گئی، مختلف امراض میں مبتلا منعطف طبعی اس پر مشاغل و افکار کا ہیجوم ہے اب آگے کسی تصنیف و تالیف کی توقع رکھنا امید و ہوم سے زائد کچھ نہیں ہو سکتا لیکن خیر قرآن کے نام پر خام فرسائی کتنی ہی ناقص در ناقص خدمت ہو لکھنے والے کیلئے سعادت ہی سعادت ہو اس خیال نے اس پر آمادہ کر دیا کہ سورہ کہف کی تفسیر بھی بنام خدا تعالیٰ شروع کر دیجائے اور باقیہ عمر میں جو کچھ ہو سکے اس کو غنیمت سمجھا جائے کیونکہ مقصد قرآن ختم کرنا نہیں قرآن میں اپنی عمر و توانائی ختم کرنا ہے واللہ الموفق والمعين۔

سورۃ بنی اسرائیل ختم شد

سُورَةُ الْكَهْفِ

سُورَةُ الْكَهْفِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ مِائَةٌ وَعِشْرُونَ آيَاتٍ اِثْنَا عَشَرَ رُكُوعًا

سورۃ کہف مکہ میں اتری اور اس کی ایک سو دس آیتیں ہیں اور بارہ رکوع

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بحد ہر بان نہایت رحم والا ہے ۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَى عَبْدِهِ الْكِتَابَ وَلَمْ يَجْعَلْ

سب تعریف اللہ کو جس نے اتاری اپنے بندے پر کتاب اور نہ رکھی

لَهُ عِوَجًا ۝ قَيِّمًا لِيُنْذِرَ بَأْسًا شَدِيدًا لِّمَنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ

اس میں کچھ کجی ، ٹھیک اتاری تاکہ ڈر سنائے ایک آفت کا اللہ کی طرف سے اور خوش خبری دے

الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا حَسَنًا ۝

ایمان لانے والوں کو جو کرتے ہیں نیکیاں کہ ان کے لئے اچھا بدلہ ہے ،

مَّا كَثُرْنَ فِيهِ أَبَدًا ۝ وَيُنْذِرُ الَّذِينَ قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا ۝

جس میں رہا کریں ہمیشہ ، اور ڈر سنائے ان کو جو کہتے ہیں اللہ رکھتا ہے اولاد

مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ وَلَا لِآبَائِهِمْ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ

کچھ خبر نہیں ان کو اس بات کی اور نہ ان کے باپ دادوں کو ، کیا بڑی بات نکلتی ہے

أَفْوَاهِهِمْ إِن يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا ۝ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسًا

ان کے منہ سے سب جھوٹ ہے جو کہتے ہیں ، سو کہیں تو گھونٹ ڈالے گا اپنی جان کو

عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يَرَوْا مِنْهُ إِلَّا خَرُوبًا ۚ وَأَنَّا جَعَلْنَا

ان کے پیچھے اگر وہ نہ مانیں گے اس بات کو بچھتا بچھتا کر ، ہم نے بنایا ہو

مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لِّهَا لَنَبْلُوَهُمْ آيَاتِهِمْ أَحْسَنَ ۚ وَأَنَّا

جو کچھ زمین پر ہے اس کی رونق تاکہ چنچیں لوگوں کو کون ان میں اچھا کرتا ہو کام ، اور ہو

لَجَعَلُونَ مَا عَلَيْهَا صَعِيدًا جُرُزًا ۝۸

کرنا ہے جو کچھ اس پر ہے میدان چھانٹ کر۔

سورہ کہف کی خصوصیات اور فضائل

مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، مسند احمد میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے کہ جس شخص نے سورہ کہف کی پہلی دس آیتیں حفظ کر لیں وہ دجال کے فتنہ سے محفوظ رہے گا، اور کتب مذکورہ میں حضرت ابوالدرداء

ہی سے ایک دوسری روایت میں یہی مضمون سورہ کہف کی آخری دس آیتیں یاد کرنے کے متعلق منقول ہے اور مسند احمد میں بروایت حضرت سہل بن معاذ رضی اللہ عنہ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص سورہ کہف کی پہلی اور آخری آیتیں پڑھ لے اس کے لئے اس کے قدم سے سر تک ایک نور ہو جاتا ہے، اور جو پوری سورت پڑھ لے تو اس کے لئے زمین سے آسمان تک نور ہو جاتا ہے۔ اور بعض روایات میں ہے کہ جو شخص جمعہ کے دن سورہ کہف کی تلاوت کر لے، اس کے قدم لے کر آسمان کی بلندی تک نور ہو جائے گا، جو قیامت کے دن روشنی دے گا، اور پچھلے جمعہ سے اس جمعہ تک کے اس کے سب گناہ معاف ہو جائیں گے، (امام ابن کثیر نے اس روایت کو موقوف قرار دیا ہے) اور حافظ ضیاء مقدسی نے اپنی کتاب مختارہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص جمعہ کے دن سورہ کہف پڑھ لے وہ آٹھ روز تک ہر فتنہ سے معصوم رہے گا، اور اگر دجال نکل آئے تو یہ اس کے فتنہ سے بھی معصوم رہے گا۔ (یہ سب روایات تفسیر ابن کثیر سے لی گئی ہیں)۔

روح المعانی میں ذیلی سے بروایت حضرت انس رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورہ کہف پوری کی پوری ایک وقت میں نازل ہوئی، اور ستر ہزار فرشتے اس کے ساتھ آئے، جس سے اس کی عظمت شان ظاہر ہوتی ہے۔

امام ابن جریر طبری نے بروایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نقل کیا ہے کہ رجب مکہ مکرمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا چرچا ہوا اور قریش مکہ اس

پریشان ہوتے تو انہوں نے اپنے دو آدمی نصر بن حارث اور عقبہ ابن ابی معیط کو مدینہ طیبہ کے علماء یہود کے پاس بھیجا کہ وہ لوگ کتب سابقہ تورات و انجیل کے عالم ہیں وہ آپ کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ علماء یہود نے ان کو بتلایا کہ تم لوگ ان سے تین سوالات کرو، اگر انہوں نے ان کا جواب صحیح دے دیا تو سمجھ لو کہ وہ اللہ کے نبی و رسول ہیں اور یہ نہ کر سکتے تو یہ سمجھ لو کہ یہ بات بنانے والے ہیں رسول نہیں۔ ایک تو ان سے ان نوجوانوں کا حال دریافت کرو جو قدیم زمانے میں اپنے شہر سے نکل گئے تھے، ان کا کیا واقعہ ہے، کیونکہ یہ واقعہ عجیب ہے، دوسرے ان سے اس شخص کا حال پوچھو جس نے دنیا کی مشرق و مغرب اور تمام زمین کا سفر کیا اس کا کیا واقعہ ہے، تیسرے ان سے روح کے متعلق سوال کرو کہ وہ کیا چیز ہے؟

یہ دونوں قریشی مکہ مکرمہ واپس آئے اور اپنی برادری کے لوگوں سے کہا کہ ہم ایک فیصلہ کن صورت حال لے کر آئے ہیں، اور علماء یہود کا پورا قصہ سنایا، پھر یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ سوالات لے کر حاضر ہوئے، آپ نے سن کر فرمایا کہ میں اس کا جواب کل دوں گا، مگر آپ اس وقت انشاء اللہ کہنا بسول گئے، یہ لوگ لوٹ گئے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وحی الہی کے انتظار میں رہے کہ ان سوالات کا جواب وحی سے بتلا دیا جائے گا، مگر وعدے کے مطابق اگلے دن تک کوئی وحی نہ آئی، بلکہ پندرہ دن اس حال پر گزر گئے، کہ نہ جبرئیل امین آئے نہ کوئی وحی نازل ہوئی، قریش مکہ نے مذاق اڑانا شروع کیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے سخت بچ و غم پہونچا۔

پندرہ دن کے بعد جبرئیل امین سورہ کہف لے کر نازل ہوئے جس میں تاخیر وحی کا سبب بھی بیان کر دیا گیا ہے کہ آئندہ زمانے میں کسی کام کے کرنے کا وعدہ کیا جائے تو انشاء اللہ کہنا چاہئے، اس واقعہ میں چونکہ ایسا نہ ہوا اس پر تنبیہ کرنے کے لئے وحی میں تاخیر ہوئی، اس سورہ میں اس معاملہ کے متعلق یہ آیتیں آگے آئیں گی وَلَا تَقُولَنَّ لِشَئٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِکَ عَدْوٌ اِلَّا اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ اور اس سورہ میں نوجوانوں کا واقعہ بھی پورا بتلا دیا گیا، جن کو اصحاب کہف کہا جاتا ہے، اور مشرق و مغرب کے سفر کرنے والے ذی القرنین کے واقعہ کا بھی مفصل بیان آگیا، اور روح کے سوال کا جواب بھی، (قرطبی و منہلی ہی بحوالہ ابن جریر) مگر روح کے سوال کا جواب اجمال کے ساتھ دینا مقتضائے حکمت تھا، اس کو سورہ بنی اسرائیل کے آخر میں علیحدہ کر کے بیان کر دیا گیا، اور اسی سبب سورہ کہف کو سورہ بنی اسرائیل کے بعد رکھا گیا ہے، کذا ذکرہ السیوطی

یعنی جو جواب انہیں دینا چاہئے، وہ دیدیا اور روح کے بارے میں ان کا صحیح جواب یہ ہوا کہ اسلی حقیقت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے (لہذا یہ روایت جو تفسیر طبری ص ۱۹۱ ج ۱۵ میں منقول ہے اس روایت کے منافی نہیں جو صحیحہ اسی جلد کے صفحہ ۵۲۸ پر سورہ بنی اسرائیل آیت نمبر ۸۵ کے تحت گذری ہے۔ محمد تقی عثمانی

خلاصہ تفسیر

تمام خوبیاں اس اللہ کے لئے ثابت ہیں جس نے اپنے (خاص) بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر یہ کتاب نازل فرمائی، اور اس (کتاب) میں (کسی قسم کی) ذرا بھی کمی نہیں رکھی (نہ لفظی نہ فصاحت و بلاغت کے خلاف ہو، اور نہ معنوی کہ اس کا کوئی حکم حکمت کے خلاف ہو بلکہ اس کو) بالکل استقامت کے ساتھ موصوف بنایا (اور نازل اس لئے کیا کہ) تاکہ وہ (کتاب کافروں کو عموماً) ایک سخت عذاب جو منجانب اللہ (ان کو آخرت میں ہوگا) ڈرائے اور اہل ایمان کو جو نیک کام کرتے ہیں یہ خوشخبری دے کہ ان کو (آخرت میں) اچھا اجر ملے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور تاکہ (کفار میں سے بالخصوص) ان لوگوں کو (عذاب سے) ڈرائے جو یوں کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ اولاد رکھتا ہے (اور اولاد کا عقیدہ رکھنے والے کافروں کا عام کافروں سے الگ کر کے اس لئے بیان کیا گیا کہ اس باطل عقیدہ میں عرب کے عام لوگ مشرکین، یہود، نصاریٰ سب ہی مبتلا تھے) نہ تو اس کی کوئی دلیل ان کے پاس ہے، اور نہ ان کے باپ دادوں کے پاس تھی، بڑی بھاری بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے، (اور) وہ لوگ بالکل (ہی) جھوٹ بکتے ہیں (جو عقلاً بھی ناممکن ہے، کوئی ادنیٰ عقل والا بھی اس کا قائل نہیں ہو سکتا، اور آپ جو ان لوگوں کے کفر و انکار پر اتنا غم کرتے ہیں کہ) ہوشیار آپ انکے پیچھے اگر یہ لوگ اس مضمین (قرآنی) پر ایمان نہ لائے تو غم سے اپنی جان دیدیں گے (یعنی اتنا غم نہ کیجئے کہ ہلاکت کے قریب کر دے، وجہ یہ ہے کہ دنیا عالم امتحان ہے، اس میں ایمان و کفر اور خیر و شر دونوں کا مجموعہ ہی رہے گا، بسبھی مومن ہو جائیں گے ایسا نہ ہوگا، اسی امتحان کے لئے) ہم نے زمین پر کی چیزوں کو اس (زمین) کے لئے باعث رونق بنایا، تاکہ ہم (اس کے ذریعہ) لوگوں کی آزمائش کریں کہ ان میں سے زیادہ اچھا عمل کون کرتا ہے (یہ امتحان کرنا ہے کہ کون اس دنیا کی زینت اور رونق پر مفتون ہو کر اللہ سے اور آخرت سے غافل ہو جاتا ہے اور کون نہیں، غرض یہ کہ یہ عالم ابتلا رہے، مگر دنیا اس میں کوئی مومن ہوگا کوئی کافر رہے گا، پھر غم بیکار ہو آپ اپنا کام کئے جائیے، اور ان کے کفر کا نتیجہ دنیا ہی میں ظاہر ہو جانے کا انتظار نہ کیجئے، کیونکہ وہ ہمارا کام ہے، ایک مقرر وقت پر ہوگا، چنانچہ ایک روز وہ آئے گا کہ) ہم زمین پر کی تمام چیزوں کو ایک صاف میدان کر دیں گے، (نہ اس پر کوئی بسنے والا رہے گا نہ کوئی درخت اور پہاڑ اور نہ کوئی مکان و تعمیر، خلاصہ یہ ہے کہ آپ اپنا کام تبلیغ کا کرتے رہئے، منکرین کے انجام بد کا اتنا غم نہ کیجئے)۔

معارف و مسائل

وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهُ عِوَجًا قَيِّمًا، لفظ عِوَج کے معنی کسی قسم کی کجی اور ایک طرف جھکاؤ کے ہیں، قرآن کریم اپنے لفظی اور معنوی کمال میں اس سے پاک ہے، نہ فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے کسی جگہ ذرہ برابر کجی یا کجی ہو سکتی ہے نہ علم و حکمت کے لحاظ سے، جو مفہوم لفظ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهُ عِوَجًا سے ایک منفی صورت میں بتلایا گیا ہے، پھر تاکید کے لئے اسی مضمون کو مثبت طور پر لفظ قَيِّمًا سے واضح کر دیا ہے، کیونکہ قَيِّمًا کے معنی ہیں مُسْتَقِيمًا، اور مستقیم وہی ہے جس میں کوئی ادنیٰ کجی اور میلان کسی جانب نہ ہو، اور یہاں قیّم کے ایک دوسرے معنی بھی ہو سکتے ہیں، یعنی نگراں اور محافظ، اس معنی کے لحاظ سے اس لفظ کا مفہوم یہ ہوگا کہ قرآن کریم جیسا اپنی ذات میں کامل مکمل ہر قسم کی کجی اور افراط و تفریط سے پاک ہے، اسی طرح یہ دوسروں کو بھی استقامت پر رکھنے والا اور بندوں کی تمام مصالح کی حفاظت کرنے والا ہے، اب خلاصہ ان دونوں لفظوں کا یہ ہو جائے گا کہ قرآن کریم خود بھی کامل و مکمل ہے اور مخلوق خدا کو بھی کامل و مکمل بنانے والا ہے (منظری)

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا، یعنی زمین پر جو مخلوقات حیوانات، نباتات، جمادات اور زمین کے اندر مختلف چیزوں کی کانیں موجود ہیں وہ سب زمین کے لئے زینت اور رونق بنائی گئی ہیں، اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ مخلوقاتِ ارضیہ میں تو سانپ، بچھو، درندے جانور اور بہت سی مضر اور مہلک چیزیں بھی ہیں ان کو زمین کی زینت اور رونق کیسے کہا جاسکتا ہے؟ کیونکہ جتنی چیزیں دنیا میں مضر اور مہلک اور خراب سمجھی جاتی ہیں وہ ایک اعتبار سے بیشک خراب ہیں مگر مجموعہ عالم کے لحاظ سے کوئی چیز خراب نہیں، کیونکہ ہر بُری سے بُری چیز میں دوسری حیثیات سے بہت سے فوائد بھی اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمائے ہیں، کیا زہریلے جانوروں اور درندوں سے ہزاروں انسانی ضروریات معالجات وغیرہ میں پوری نہیں کی جاتیں، اس لئے جو چیزیں کسی ایک حیثیت سے بُری بھی ہیں، لیکن مجموعہ عالم کے کارخانے کے لحاظ سے وہ بھی بُری نہیں، کسی نے خوب کہا ہے ۷

نہیں ہے چیز نیکی کوئی زمانے میں ۷ کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں

أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحَابَ الْكَهْفِ وَالرَّقِیْمِ كَانُوا مِنَّا

کیا تو خیال کرتا ہے کہ غار اور کھوہ کے رہنے والے ہماری قدرتوں میں

عَجَبًا ۹ اِذَا وَاى الْفُضْيَةِ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوا رَبَّنَا اِنَّا مِن لَّدُنكَ

عجباً چنہاتھے، جب جا بیٹھے وہ جوان پہاڑ کی کھوہ میں پھر بولے اے رب ہم کوئی اپنے پاس

رَحْمَةً وَهَيَّ لَنَا مِنْ اَمْرِ نَارِ شَدًّا ۱۰ فَضَرَبْنَا عَلَى اِذَانِهِمْ

سے بخشش اور پوری کر دے ہمارے کام کی درستی، پھر تھپک دیتے ہم نے ان کے کان

فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَدًا ۱۱ ثُمَّ بَعَثْنَاهُمْ لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ

اس کھوہ میں چند برس گنتی کے، پھر ہم نے ان کو اٹھایا کہ معلوم کریں دو فرقوں میں

اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوا اَمَدًا ۱۲

کس نے یاد رکھی ہر جتنی مدت وہ رہی۔

۱۲

تشریح اللغات

کہف، پہاڑی غار جو وسیع ہو اس کو کہف کہتے ہیں، جو وسیع نہ ہو اس کو

غار کہا جاتا ہے، رَقِیم، لفظی اعتبار سے بمعنی المرقوم ہے، یعنی لکھی ہوئی چیز،

اس مقام پر اس کی مراد، اس میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں، ضحاک اور سدی اور ابن جریر بروایت

ابن عباسؓ اس کے معنی ایک لکھی ہوئی تختی کے قرار دیتے ہیں جس پر بادشاہ وقت نے اصحاب

کہف کے نام کندہ کر کے غار کے دروازہ پر لگا دیا تھا، اسی وجہ سے اصحاب کہف کو اصحاب الرقیم

بھی کہا جاتا ہے، قتادہ، عطیہ، عوفی، مجاہد کا قول یہ ہے کہ رقیم اس پہاڑ کے نیچے کی وادی کا نام ہے

جس میں اصحاب کہف کا غار تھا، بعض نے خود اس پہاڑ کو رقیم کہا ہے، حضرت عکرمہؓ فرماتے ہیں

کہ میں نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ مجھے معلوم نہیں کہ رقیم کسی لکھی ہوئی تختی

کا نام ہے یا کسی بستی کا، کعب احبار و ہب بن منبہ حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت کرتے ہیں

کہ رقیم، آنیلہ یعنی عقبہ کے قریب ایک شہر کا نام ہے جو بلاد روم میں واقع ہے۔

فُتِحَتْ، فتی کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں نوجوان

فَضَرَبْنَا عَلَى اِذَانِهِمْ کے لفظی معنی کانوں کو بند کر دینے کے ہیں، غفلت کی نیند کو

ان الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، کیونکہ نیند کے وقت سب سے پہلے آنکھ بند ہوتی ہے، مگر کان

اپنا کام کرتے رہتے ہیں، آواز سنائی دیتی ہے، جب نیند مکمل اور غالب ہو جاتی ہے تو کان بھی

اپنا کام چھوڑ دیتے ہیں، اور پھر بیاری میں سب سے پہلے کان اپنا کام شروع کرتے ہیں کہ آواز

سونے والا چونکتا ہے پھر بیدار ہوتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

کیا آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ غار والے اور پہاڑ والے (یہ دونوں ایک ہی جماعت کے لقب ہیں) ہماری عجائبات (قدرت) میں سے کچھ تعجب کی چیز تھے (جیسا کہ یہود نے کہا تھا کہ ان کا واقعہ عجیب ہی یا خود ہی سوال کرنے والے کفار قریش نے اس کو عجیب سمجھ کر سوال کیا تھا، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب بنا کر دوسروں کو سنانا مقصود ہے کہ یہ واقعہ بھی اگرچہ عجیب ضرور ہے مگر اللہ تعالیٰ کی دوسری عجائبات قدرت کے مقابلہ میں ایسا قابل تعجب نہیں جیسا ان لوگوں نے سمجھا ہے، کیونکہ زمین و آسمان اور چاند و سورج اور تمام کائنات زمین و آسمان کو عام سے وجود میں لانا اصل عجائب میں سے ہے، چند نوجوانوں کا زمانہ دراز تک سوتے رہنا پھر بیدار ہونا اس کے مقابلہ میں کچھ عجیب نہیں، اس تمہید کے بعد اصحاب کہف کا قصہ اس طرح بیان فرمایا اور وہ وقت قابل ذکر ہے جبکہ ان نوجوانوں نے (ایک بے دین بادشاہ کی گرفت سے بھاگ کر) اس غار میں (جس کا قصہ آگے آتا ہے) جا کر پناہ لی پھر اللہ تعالیٰ سے اس طرح دعا مانگی کہ،

کما کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو اپنے پاس سے رحمت کا سامان عطا فرمائیے اور ہمارے (اس کام) میں درستی کا سامان مہیا کر دیجئے (غالباً رحمت سے مراد حصول مقصود ہے، اور درستی کے سامان سے مراد وہ اسباب و مقدمات ہیں جو حصول مقصد کے لئے عادتاً ضروری ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبول فرمایا، اور ان کی حفاظت اور تمام پریشانیوں سے نجات دینے کی صورت اس طرح بیان فرمائی کہ) سو ہم نے اس غار میں ان کے کانوں پر ساہا سال تک نیند کا پردہ ڈال دیا پھر ہم نے ان کو (نیند سے) اٹھایا تاکہ ہم (ظاہری طور پر بھی) معلوم کر لیں کہ (غار میں رہنے کی مدت میں بحث و اختلاف کرنے والوں میں سے) کونسا گروہ ان کے رہنے کی مدت سے زیادہ واقف تھا، (نیند سے بیدار ہونے کے بعد ان میں ایک گروہ کا قول تو یہ تھا کہ ہم پورا دن یا کچھ حصہ ایک دن کا سوئے ہیں، دوسرے گروہ نے کہا کہ اللہ ہی جانتا ہے کہ تم کتنے دن سوتے رہے، آیت میں اشارہ اسی طرف ہے کہ یہ دوسرا گروہ ہی زیادہ حقیقت شناس تھا جس نے مدت کی تعین کو اللہ کے حوالہ کیا، کیونکہ اس کی کوئی دلیل نہ تھی) ۛ

معارف و مسائل

قصہ اصحاب کہف و رقیم | اس قصہ میں چند مباحث ہیں، اول یہ کہ اصحاب کہف و اصحاب رقیم ایک ہی جماعت کے دو نام ہیں، یا یہ الگ الگ دو جماعتیں ہیں، اگرچہ کسی صحیح حدیث میں اسکی

کوئی تصریح نہیں، مگر امام بخاری نے اپنی کتاب صحیح میں اصحاب الکہف اور اصحاب الرقیم دو عنوان الگ الگ دیئے، پھر اصحاب الرقیم کے تحت وہ مشہور قصہ تین شخصوں کے غار میں بند ہو جانے پھر دعاؤں کے ذریعہ راستہ کھل جانے کا ذکر کیا ہے، جو تمام کتب حدیث میں مفصل موجود ہے، امام بخاری کی اس صنیع سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کے نزدیک اصحاب کہف ایک جماعت ہے، اور اصحاب الرقیم ان تین شخصوں کو کہا گیا ہے جو کسی زمانے میں غار میں پھنسے تھے، پھر پہاڑ سے ایک بڑا پتھر اس غار کے دھانچے پر آگرا جس سے غار بالکل بند ہو گیا، ان کے بچنے کا راستہ نہ رہا، ان تینوں نے اپنے اپنے خاص نیک اعمال کا واسطہ دے کر اللہ سے دعا کی کہ یہ کام اگر ہم نے خالص آپ کی رضا کے لئے کیا تھا تو اپنے فضل سے ہمارا راستہ کھول دے، پہلے شخص کی دعا سے پتھر کچھ ہل گیا، روشنی آنے لگی، دوسرے کی دعا سے اور زیادہ ہل گیا، پھر تیسرے کی دعا سے راستہ بالکل کھل گیا۔

لیکن حافظ ابن حجر نے شرح بخاری میں یہ واضح کیا ہے کہ از روئے روایت حدیث اس کی کوئی صریح دلیل نہیں ہے کہ اصحاب الرقیم مذکورہ تین شخصوں کا نام ہے، بات صرف اتنی ہے کہ واقعہ غار کے ایک راوی حضرت نعمان بن بشیرؓ کی روایت میں بعض راویوں نے یہ اضافہ نقل کیا ہے کہ حضرت نعمان بن بشیرؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رقیم کا ذکر کرتے ہوئے سنا، آپ غار میں بند رہ جانے والے تین آدمیوں کا واقعہ سنا ہے تھے، یہ اضافہ فتح الباری میں بزار اور طبرانی کی روایت سے نقل کیا ہے، مگر اول تو اس حدیث کے عام راویوں کی روایات جو صحاح ستہ اور حدیث کی دوسری کتابوں میں مفصل موجود ہیں، ان میں کسی نے حضرت نعمان بن بشیرؓ کا یہ جملہ نقل نہیں کیا، خود بخاری کی روایت بھی اس جملے سے خالی ہے، پھر اس جملے میں بھی اس کی تصریح نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غار میں بند ہونے والے ان تین شخصوں کو

اصحاب الرقیم فرمایا تھا، بلکہ الفاظ یہ ہیں کہ آپ رقیم کا ذکر فرما رہے تھے، اس ضمن میں ان تین شخصوں کا ذکر فرمایا، لفظ رقیم کی مراد کے متعلق صحابہ و تابعین اور عام مفسرین میں جو اختلاف اقوال اور نقل کیا گیا ہے وہ خود اس کی دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رقیم کی کوئی مراد متعین کرنے کے بارے میں کوئی روایت حدیث نہیں تھی، ورنہ کیسے ممکن تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک لفظ کی مراد خود متعین فرمادیں، پھر صحابہ و تابعین اور دوسرے مفسرین اس کے خلاف کوئی قول اختیار کریں، اسی لئے حافظ ابن حجر شارح بخاری نے اصحاب کہف و رقیم کے دو الگ الگ جماعتیں ہونے سے انکار فرمایا، اور صحیح یہ قرار دیا کہ یہ دونوں ایک ہی جماعت کے نام ہیں، غار میں بند ہو جانے والے تین شخصوں کا ذکر رقیم کے ذکر کے ساتھ آگیا ہو، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہی تین شخص اصحاب الرقیم تھے۔

حافظ ابن جریر نے اس جگہ یہ بھی واضح کر دیا کہ قرآن نے جو قصہ اصحاب کہف کا بیان کیا ہے اس کا سیاق خود یہ بتلا رہا ہے کہ اصحاب کہف درقیم ایک ہی جماعت ہے، یہی وجہ ہے کہ جمہور مفسرین اور محدثین ان دونوں کے ایک ہی ہونے پر متفق ہیں۔

دوسرا مسئلہ اس جگہ خود اس قصے کی تفصیلات کا ہے جس کے ڈھسے میں ایک وہ جو اس قصہ کی روح اور اصل مقصود ہے، جس سے یہود کے سوال کا جواب بھی ہو جاتا ہے اور مسلمانوں کے لئے ہدایات و نصائح بھی، دوسرا حصہ وہ ہے جس کا تعلق اس قصہ کی صرف تاریخی اور جغرافیائی حیثیت سے ہے، بیان مقصود میں اس کا کوئی خاص دخل نہیں، مثلاً یہ قصہ کس زمانے میں اور کس شہر اور بستی میں پیش آیا، جس کا قریب بادشاہ سے بھاگ گئے ان لوگوں نے غار میں پناہ لی تھی وہ کون تھا، اس کے کیا عقائد و خیالات تھے، اور اس نے ان لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جس سے یہ بھاگنے اور غار میں چھپنے پر مجبور ہو گئے، پھر یہ کہ ان لوگوں کی تعداد کیا تھی، اور زمانہ دراز تک سوتے رہنے کا کمال زمانہ کتنا تھا، اور پھر یہ لوگ اب تک زندہ ہیں یا مر گئے۔

قرآن حکیم نے اپنے حکیمانہ اصول اور اسلوب خاص کے تحت سارے قرآن میں ایک قصہ یوسف علیہ السلام کے سوا کسی قصے کو پوری تفصیل اور ترتیب سے بیان نہیں کیا، جو عام تاریخی کتابوں کا طریقہ ہے، بلکہ ہر قصے کے صرف وہ اجزاء موقع بموقع بیان فرمائے ہیں جن سے انسانی ہدایات اور تعلیمات کا تعلق تھا۔ (قصہ یوسف علیہ السلام کو اس اسلوب سے مستثنیٰ کرنے کی وجہ سورۃ یوسف کی تفسیر میں گزر چکی ہے)۔

قصہ اصحاب کہف میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ قرآن میں اس کے صرف وہ اجزاء بیان کئے گئے جو مقصود اصلی سے متعلق تھے، باقی اجزاء جو خالص تاریخی یا جغرافیائی تھے ان کا کوئی ذکر نہیں فرمایا، اصحاب کہف کی تعداد اور سونے کے زمانے کی مدت کے سوالات کا ذکر تو فرمایا اور جواب کی طرف اشارہ بھی فرمایا مگر ساتھ ہی یہ بھی ہدایت کر دی کہ ایسے مسائل میں زیادہ غور و فکر اور بحث و تکرار مناسب نہیں ان کو حوالہ بخدا تعالیٰ کرنا چاہئے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن کا فرض منصبی معانی قرآن کو بیان کرنا اور آپ نے بھی کسی حدیث میں ان اجزاء قصہ کو بیان نہیں فرمایا، اور اکابر صحابہ و تابعین نے اسی قرآنی اسلوب کی بناء پر ایسے معاملات میں ضابطہ کا یہ قرار دیا کہ:

أَجْهَلُوا مَا أَجْهَلَهُ اللَّهُ،

(اتقان، سیوطی)

”یعنی جس غیر ضروری چیز کو اللہ تعالیٰ

نے مبہم رکھا تم بھی اسے مبہم رہنے دو

رکہ اس میں بحث و تحقیق کچھ مفید نہیں“

اکابر صحابہ و تابعین کے اس طرزِ عمل کا مقتضی یہ تھا کہ اس تفسیر میں بھی ان اجزاء پر قصہ کو نظر انداز کر دیا جائے جن کو قرآن اور حدیث نے نظر انداز کیا ہے، لیکن یہ زمانہ وہ ہے جس میں تاریخی اور جغرافیائی انکشافات ہی کو سب بڑا کمال سمجھ لیا گیا ہے، اور متاخرین علماء نے تفسیر نے اس لحاظ کم و بیش ان اجزاء کو بھی بیان فرما دیا ہے، اس لئے زیرِ نظر تفسیر میں قصے کے وہ اجزاء جو خود قرآن میں مذکور ہیں ان کا بیان تو آیاتِ قرآن کی تفسیر کے تحت آجائے گا، باقی تاریخی اور جغرافیائی اجزاء سے قصہ کو یہاں بقدر ضرورت بیان کیا جاتا ہے، اور بیان کرنے کے بعد بھی آخری نتیجہ وہی رہے گا کہ ان معاملات میں کوئی قطعی فیصلہ ناممکن ہے، کیونکہ اسلامی اور پھر عیسائی تاریخوں میں اس کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ خود اس قدر مختلف اور متضاد ہے کہ ایک مصنف اپنی تحقیق و رائے کے پیش نظر مقدمات و قرائن کی مدد سے کسی ایک چیز کو مستعین کرتا ہے تو دوسرا اسی طرح دوسری صورت کو ترجیح دیتا ہے۔

دین کی حفاظت کے لئے غاروں میں پناہ لینے والوں کے واقعات مختلف شہروں اور خطوں میں متضاد ہوتے ہیں۔	مؤرخین کے اختلافات کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ دینِ مسیح علیہ السلام میں چونکہ رہبانیت کو دین کا سب بڑا کام سمجھ لیا گیا تھا تو ہر خطے اور ہر ملک میں ایسے واقعات متعدد پیش آئے ہیں کہ کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے غاروں میں پناہ گزین ہوئے ہیں۔
--	--

ہو گئے وہیں عمریں گزار دیں، اب جہاں جہاں ایسا کوئی واقعہ پیش آیا ہے اس پر مؤرخ کو اصحابِ کہف کا گمان ہو جانا کچھ بعید نہیں تھا۔

اصحابِ کہف کی جگہ اور ان کا زمانہ	امام تفسیر قرطبی اندلس نے اپنی تفسیر میں اس جگہ چند واقعات کچھ سماعی کچھ حتمیہ نقل کئے ہیں، جو مختلف شہروں سے متعلق ہیں، قرطبی نے سب سے پہلے توفحاک
-----------------------------------	---

کی روایت سے یہ نقل کیا ہے کہ رقیہ روم کے ایک شہر کا نام ہے، جس کے ایک غار میں اکیس آدمی لیتے ہوئے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سورہ ہے، پھر امام تفسیر ابن عطیہ سے نقل کیا ہے کہ میں نے بہت سے لوگوں سے سنا ہے کہ شام میں ایک غار ہے جس میں کچھ مُردہ لاشیں ہیں، وہاں کے مجاورین یہ کہتے ہیں کہ یہی لوگ اصحابِ کہف ہیں، اور اس غار کے پاس ایک مسجد اور مکان کی تعمیر ہے جس کو رقیہ کہا جاتا ہے، اور ان مُردہ لاشوں کے ساتھ ایک مُردہ کتے کا ڈھانچہ بھی موجود ہے۔

اور دوسرا واقعہ اندلس غرناطہ کا نقل کیا ہے، ابن عطیہ کہتے ہیں کہ غرناطہ میں ایک نوشہ نامی گھاٹوں کے قریب ایک غار ہے، جس میں کچھ مُردہ لاشیں ہیں اور ان کے ساتھ ایک مُردہ کتے کا ڈھانچہ بھی موجود ہے، ان میں سے اکثر لاشوں پر گوشت باقی نہیں رہا، ضررِ بڑیوں کے ڈھانچے ہیں اور بعض پر اب تک گوشت پوسٹ بھی موجود ہے اس پر صدیا گزر گئیں مگر صحیح سدا کا کچھ حال معلوم نہیں کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہی اصحابِ کہف ہیں،

ابن عطیہ کہتے ہیں کہ یہ شہر سکر میں دس سو سال پہلے تھا تو قحطی لاشیں اچلت پڑیں اور ان کے قریب ہی ایک مسجد بھی ہے، اور ایک رومی زمانے کی تعمیر بھی ہے جسکو رقیم کہا جاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں کوئی عالیشان محل ہوگا اس وقت تک بھی اس کی بعض دیواریں موجود ہیں، اور یہ ایک غیر آباد جنگل میں ہے، اور فرمایا کہ غرناطہ کے بالائی حصہ میں ایک قدیم شہر کے آثار و نشانات پائے جاتے ہیں، جو رومیوں کے طرز کے ہیں، اس شہر کا نام دَقِیُّوُسْ بتلایا جاتا ہے، ہم نے اس کے کھنڈروں میں بہت سے عجائبات اور قبریں دیکھی ہیں، قرطبی جو اندلس ہی کے رہنے والے ہیں ان تمام واقعات کو نقل کرنے کے بعد بھی کسی کو متعین طور پر اصحاب کہف کہنے سے گریز کرتے ہیں، اور خود ابن عطیہ نے بھی اپنے مشاہدے کے باوجود یہ جزم نہیں کیا کہ یہی لوگ اصحاب کہف ہیں، محض عام شہرت نقل کی ہو، مگر دوسرے اندلسی مفسر ابو حیان جو ساتویں صدی مسلمانہ میں خاص غرناطہ میں پیدا ہوئے وہیں رہے، اسے ہیں وہ بھی اپنی تفسیر بحر محیط میں غرناطہ کے اس غار کا اسی طرح ذکر کرتے ہیں جس طرح قرطبی نے کیا ہے اور ابن عطیہ کے اپنے مشاہدہ کا ذکر لکھنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ہم جب اندلس میں تھے (یعنی قاہرہ منتقل ہونے سے پہلے) تو بہت لوگ اس غار کی زیارت کے لئے جایا کرتے تھے، اور یہ کہتے تھے کہ اگرچہ وہ لاشیں اب تک وہاں موجود ہیں، اور زیارت کرنے والے ان کو شمار بھی کرتے ہیں مگر ہمیشہ ان کی تعداد بتانے میں غلطی کرتے ہیں، پھر فرمایا کہ ابن عطیہ نے جس شہر رقیوس کا ذکر کیا ہے جو غرناطہ کی جانب قبلہ میں واقع ہے تو اس شہر سے میں خود بے شمار مرتبہ گزرا ہوں، اور اس میں بڑے بڑے غیر معمولی پتھر دیکھے ہیں، اس کے بعد کہتے ہیں ویتوجم کون اهل الکہف بالاندلس لکثرة دین النصرانی، ہما حتیٰ ہی بلاد مملکتہم العظمیٰ (تفسیر بحر محیط ص ۱۰۲ ج ۶) ”یعنی اصحاب کہف کے اندلس میں ہونے کی ترجیح کے لئے یہ بھی قرینہ ہے کہ وہاں نصرانیت کا غلبہ ہے، یہاں تک کہ یہی غلطی ان کی سب سے بڑی مذہبی ملکیت ہے“ اس میں یہ بات واضح ہے کہ ابو حیان کے نزدیک اصحاب کہف کا اندلس میں ہونا راجح ہے۔ (تفسیر قرطبی، ص ۵۶۷ ج ۳ ص ۹)

امام تفسیر ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے بروایت عوفی حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ رقیم ایک وادی کا نام ہے جو فلسطین سے نیچے آئیلہ (عقبہ) کے قریب ہے، اور ابن جریر اور ابن ابی حاتم اور چند دوسرے محدثین نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ ”میں نہیں جانتا کہ رقیم کیا ہے، لیکن میں نے کعب احبار سے پوچھا تو انھوں نے بتلایا کہ رقیم اس بستی کا نام ہے، جس میں اصحاب کہف غار میں جانے سے پہلے مقیم تھے (روح المعانی)

ابن ابی شیبہ، ابن المنذر، ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت معاویہؓ کے ساتھ رومیوں کے مقابلے میں ایک جہاد کیا جس غزوہ اُضَیْق

کہتے ہیں، اس موقع پر ہمارا گزرا اس غار پر ہوا جس میں اصحاب کہف ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہو حضرت معاویہؓ نے ارادہ کیا کہ غار کے اندر جائیں اور اصحاب کہف کی لاشوں کا مشاہدہ کریں، مگر ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ایسا نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کا مشاہدہ کرنے سے اس ہستی کو بھی منع کر دیا، جو آپ سے بہتر تھی، یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، کیونکہ حق تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا **لَوْ كُنْتُمْ مِنْهُمْ فِرَارًا لَّكُنْتُمْ مِنْهُمْ رُجْعًا** (یعنی اگر آپ ان کو دیکھیں تو آپ ان سے بھاگیں گے اور رعب و ہیبت سے مغلوب ہو جائیں گے) مگر حضرت معاویہؓ نے ابن عباسؓ کی اس بات کو شاید اس لئے قبول نہیں کیا کہ قرآن کریم نے ان کی جو حالت بیان کی ہو یہ وہ جو ان کی زندگی کے وقت تھی یہ کیا ضروری ہے کہ اب بھی وہی حالت ہو، اس لئے کچھ آدمیوں کو دیکھنے کے لئے بھیجا، وہ غار پر پہنچے، مگر جب غار میں داخل ہونا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک سخت ہوا بھیج دی جس نے ان سب کو غار سے نکال دیا (روح المعانی، ص ۲۲۷ ج ۱۵)

مذکورہ روایات و حکایات سے اتنی بات ثابت ہوئی کہ حضرات مفسرین میں سے جن حضرات نے اصحاب کہف کے غار کی جگہ کا پتہ دیا ہے ان کے اقوال تین مقامات کا پتہ دیتے ہیں، ایک خلیج فارس کے ساحل عقبہ (آئیلہ) کے قریب، حضرت ابن عباسؓ کی بیشتر روایات اسی کی تائید میں ہیں، جیسا کہ مذکورہ روایات میں گذر چکا ہے۔

ابن عطیہ کے مشاہدے اور ابو حیان کی تائید سے یہ راجح معلوم ہوتا ہے کہ یہ غار غرناطہ اندلس میں ہے، ان دونوں جگہوں میں سے عقبہ میں ایک شہر یا کسی خاص عمارت کا نام رقیم ہونا بھی بتلایا گیا ہے، اسی طرح غرناطہ میں غار کے متصل عظیم الشان شکستہ عمارت کا نام رقیم بتلایا گیا ہے، اور دونوں قسم کی روایات میں کسی نے بھی اس کا قطعی فیصلہ اور جزم نہیں کیا، کہ یہی غار اصحاب کہف کا غار ہے، بلکہ دونوں قسم کی روایات کا مدار مقامی شہرت اور سماعتی روایات پر ہی، اور تقریباً تمام تفاسیر قرطبی، ابو حیان، ابن جریر وغیرہ کی روایات میں اصحاب کہف جس شہر میں رہتے تھے اس کا قدیم نام افسوس اور اسلامی نام طرسوس بتلایا گیا ہے، اس شہر کا ایشیا کوچک کے مغربی ساحل پر ہونا اہل تاریخ کے نزدیک مسلم ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غار بھی ایشیائے کوچک میں ہے، اس لئے کسی ایک کو قطعی طور پر صحیح اور باقی کو غلط کہنے کی کوئی دلیل نہیں، احتمال تینوں جگہ کا ہو سکتا ہے، بلکہ اس احتمال کی بھی کوئی نفی نہیں کر سکتا کہ ان غاروں کے واقعات صحیح ہونیکے باوجود بھی یہ اُن اصحاب کہف کے غار نہ ہوں جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے، وہ اور کسی جگہ ہو، اور یہ بھی ضروری نہیں کہ رقیم اس جگہ کسی شہر یا عمارت ہی کا نام ہو بلکہ اس احتمال کی بھی نفی نہیں کی جاسکتی کہ رقیم سے مراد وہ کتبہ ہو جس پر اصحاب کہف کے نام کندہ کر کے غار کے دہانے پر

کسی بادشاہ نے لگا دیا تھا۔

جدید مورخین کی تحقیق | عصر حاضر کے بعض مورخین اور علماء نے مسیحی تاریخوں اور اہل یورپ کی تاریخ کی مدد سے غار اصحاب کی جگہ اور زمانہ متعین کرنے کے لئے کافی بحث و تحقیق کی ہے۔ ابوالکلام صاحب آزاد نے ایلہ (عقبہ) کے قریب موجودہ شہر طبراجس کو عرب مورخین بطرا لکھتے ہیں، اس کو قدیم شہر رقیم قرار دیا ہے، اور موجودہ تاریخوں سے اس کے قریب پہاڑ میں ایک غار کے آثار بھی بتلائے ہیں، جس کے ساتھ کسی مسجد کی تعمیر کے آثار بھی بتلائے جاتے ہیں، اس کی شہادت میں لکھا ہے کہ بائبل کی کتاب یسوع (باب ۱۸، آیت ۱۲) میں جس جگہ کو رقیم یا راقم کہا ہے یہ وہی مقام ہے جس کو اب پیرا کہا جاتا ہے، مگر اس پر یہ شبہ کیا گیا ہے کہ کتاب یسوع میں جو رقیم یا راقم کا ذکر بنی بن سین کی میراث کے سلسلے میں آیا ہے، اور یہ علاقہ دریائے اردن سے اور بحر قنطار کے مغرب میں واقع تھا جس میں شہر ٹبرا کے ہونے کا کوئی امکان نہیں، اس لئے اس زمانے کے محققین آثار قدیمہ نے اس بات کے ملنے میں سخت تامل کیا ہے کہ پیرا اور راقم ایک چیز ہیں۔
انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، طبع ۱۹۴۷ء جلد ۱، ص ۱۶۵۸

اور عام مفسرین نے اصحاب کہف کی جگہ شہر افسوس کو قرار دیا ہے جو ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل پر رومیوں کا سب سے بڑا شہر تھا، جس کے کھنڈراب بھی موجودہ ترکی کے شہر ازمیر (سمرنا) سے ۲۰، ۲۵ میل بچانے جنوب پائے جاتے ہیں۔

حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے بھی ارض ہترآن میں شہر ٹبرا کا ذکر کرتے ہوئے بین القوسین (رقیم) لکھا ہے، مگر اس کی کوئی شہادت پیش نہیں کی کہ شہر ٹبرا کا پیرا نام رقیم تھا، مولانا حفظ الرحمن سہواروی نے اپنی کتاب قصص ہترآن میں اسی کو اختیار فرمایا اور اس کی شہادت میں تورات سفر عدد اور صحیفہ سحیاء کے حوالہ سے شہر ٹبرا کا نام راقم بیان کیا ہے (ماغوذ از دائرة المعارف عرب)

مملکت اردن میں عمان کے قریب ایک سنسان جنگل میں ایک غار کا پتہ لگا تو حکومت کے محکمہ آثار قدیمہ نے ۱۹۶۳ء میں اس جگہ کھدائی کا کام جاری کیا تو اس میں مٹی اور پتھروں کے ہٹانے کے بعد ہڈیوں اور پتھروں سے بھرے ہوئے چھ تابوت اور دو قبریں برآمد ہوئیں، غار کی جنوبی سمت میں پتھروں پر کندہ کچھ نقوش بھی دریافت ہوئے جو بزنطینی زبان میں ہیں، یہاں کے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہی جگہ رقیم ہے، جس کے پاس اصحاب کہف کا یہ غار ہے۔ واللہ اعلم

حضرت سیدی حکیم الامت تھانویؒ نے بیان ہترآن میں تفسیر حقانی کے حوالہ سے اصحاب کہف کی جگہ اور مقام کی تاریخی تحقیق یہ نقل کی ہے کہ ظالم بادشاہ جس کے خوف سے بھاگ کر اصحاب کہف

نے غار میں پناہ لی تھی، اس کا زمانہ ۲۵۰۰ھ تھا، پھر تین سو سال تک یہ لوگ سوتے رہے، تو مجموعہ ۲۷۵۰ھ ہو گیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ۶۰۰ھ میں ہوئی، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے بیس سال پہلے یہ واقعہ ان کے بیدار ہونے کا پیش آیا، اور تفسیر حقانی میں بھی ان کا مقام شہر افسوس یا طرسوس کو قرار دیا ہے، جو ایشیائے کوچک میں تھا، اب اس کے کھنڈرات موجود ہیں، واللہ اعلم بحقیقۃ الحال

یہ تمام تاریخی اور جغرافیائی تفصیلات ہیں جو قدمائے مفسرین کی روایات سے پھر جدید مؤرخین کے بیانات سے پیش کی گئی ہیں، احقر نے پہلے ہی یہ عرض کر دیا تھا کہ نہ قرآن کی کسی آیت کا سمجھنا ان پر موقوف ہے نہ اس مقصد کا کوئی ضروری حصہ ان سے متعلق ہے جس کے لئے قرآن کریم نے یہ قصہ بیان کیا ہے، پھر روایات و حکایات اور ان کے آثار و قرائن اس درجہ مختلف ہیں کہ ساری تحقیق و کاوش کے بعد بھی اس کا کوئی قطعی فیصلہ ممکن نہیں، صرف ترجیحات اور رجحانات ہی ہو سکتے ہیں، لیکن آجکل تعلیم یافتہ طبقہ میں تاریخی تحقیقات کا ذوق بہت بڑھا ہوا ہے، اس کی تسکین کے لئے یہ تفصیلات نقل کر دی گئی ہیں، جن سے تقریبی اور تخمینہ طور پر اتنا معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے قریب پیش آیا، اور بیشتر روایات اس کے شہر افسوس یا طرسوس کے قریب ہونے پر متفق نظر آتی ہیں، واللہ اعلم، اور حقیقت یہ ہے کہ ان تمام تحقیقات کے بعد بھی ہم وہیں کھڑے ہیں جہاں سے چلے گئے کہ مقام متعین کرنے کی نہ کوئی ضرورت ہے اور نہ اس کی تیسرین کسی یقینی ذریعہ سے کی جکتی ہے، امام تفسیر و حدیث ابن کثیرؒ نے اس کے متعلق یہی فرمایا ہے کہ:

”یعنی اللہ تعالیٰ نے ہمیں اصحاب کہف کے ان حالات کی خبر دی جن کا ذکر قرآن میں ہے تاکہ ہم ان کو سمجھیں اور ان میں تدبیر کریں اور اس کی خبر نہیں دی کہ یہ کہف کس زمین اور کس شہر میں ہے، کیونکہ اس میں ہمارا کوئی فائدہ نہیں اور نہ کوئی شرعی

قَدْ أَخْبَرَنَا اللَّهُ تَعَالَى بِذَلِكَ
وَأَرَادَ مِنَّا فِهْمَهُ وَتَدَبُّرَهُ
لَمَّا يُخْبِرُنَا بِمَكَانِ هَذَا الْكَهْفِ
فِي آيِ الْبَلَادِ مِنَ الْأَرْضِ
إِذْ لَا فَايِدَةَ لَنَا فِيهِ وَلَا قَصْدَ
شَرْعِيٍّ

مقصد اس سے متعلق ہے۔“

(ابن کثیر، ج ۳ ص ۷۵)

اصحاب کہف کا واقعہ کس زمانے میں پیش آیا؟ اور غار میں پناہ لینے کے اسباب کیا تھے؟ قصہ کا یہ ٹکڑا بھی وہی ہے جس پر نہ کسی آیت قرآن کا سمجھنا موقوف ہے، نہ مقصد قصہ پر اس کا کوئی خاص اثر ہے، اور نہ قرآن و سنت میں اس کا بیان ہے، صرف تاریخی حکایات ہیں، اسی لئے ابوحیان نے تفسیر بحر المحیط میں فرمایا:۔

وَالرُّوَاةَ مُخْتَلِفُونَ فِي قِصَصِهِمْ
وَكَيْفَ كَانَ اجْتِمَاعُهُمْ وَ
خُرُوجُهُمْ وَلَحْرِيَّاتِ فِي الْحَيَّاتِ
الصَّيِّمِ كَيْفِيَّتَهُ ذَلِكَ وَلَا فِي
الْقُرْآنِ (بجس محیط ص ۶)

”ان حضرات کے قصہ میں راویوں کا سخت
اختلاف ہے، اور اس میں کہ یہ اپنا اس
پر دو گرام پر کس طرح متفق ہوتے، اور
کس طرح نکلے، نہ کسی صحیح حدیث
میں اس کی کیفیت مذکور ہو نہ قرآن میں“

تاہم موجودہ طبائع کی دلچسپی کے لئے جیسے اوپر اصحاب کہف کے مقام سے متعلق کچھ معلومات
لکھی گئی ہیں، اس واقعہ کے زمانہ وقوع اور اسباب وقوع کے متعلق بھی مختصر معلومات
تفسیری اور تاریخی روایات سے نقل کی جاتی ہیں، اس قصہ کو پوری تفصیل اور سہولت کے ساتھ
حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے تفسیر مظہری میں مختلف روایات سے نقل فرمایا ہے، مگر یہاں
صرف وہ مختصر واقعہ لکھا جاتا ہے جس کو ابن کثیر نے سلف و خلف کے بہت سے مفسرین کے حوالہ
سے پیش کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:-

”اصحاب کہف بادشاہوں کی اولاد اور اپنی قوم کے سردار تھے، قوم بت پرست تھی،
ایک روز ان کی قوم اپنے کسی مذہبی میلے کے لئے شہر سے باہر نکلی، جہاں ان کا سالانہ اجتماع ہوتا
تھا، وہاں جا کر یہ لوگ اپنے بتوں کی پوجا پاٹ کرتے، اور ان کے لئے جانوروں کی قربانی دیتے تھے،
ان کا بادشاہ ایک جبار ظالم دقیاؤس نامی تھا، جو قوم کو اس بت پرستی پر مجبور کرتا تھا، اس سال جبکہ
پوری قوم اس میلے میں جمع ہوئی، تو یہ اصحاب کہف نوجوان بھی پہنچے، اور وہاں اپنی قوم کی یہ حرکتیں
دیکھیں کہ اپنے ہاتھوں کے تراشے ہوئے پتھروں کو خدا سمجھتے، اور ان کی عبادت کرتے اور ان کے لئے
قربانی کرتے ہیں، اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ عقل سلیم عطا فرمادی کہ قوم کی اس احمقانہ حرکت
سے ان کو نفرت ہوئی، اور عقل سے کام لیا تو ان کی سمجھ میں آگیا کہ یہ عبادت تو صرف اس ذات
کی ہونی چاہئے جس نے زمین و آسمان اور ساری مخلوقات پیدا فرمائی ہیں، یہ خیال بیک وقت
ان چند نوجوانوں کے دل میں آیا، اور ان میں سے ہر ایک نے قوم کی اس احمقانہ عبادت سے بچنے
کے لئے اس جگہ سے ہٹنا شروع کیا، ان میں سب سے پہلے ایک نوجوان مجمع سے دور ایک درخت
کے نیچے جا کر بیٹھ گیا، اس کے بعد ایک دوسرا شخص آیا اور وہ بھی اسی درخت کے نیچے بیٹھ گیا، اسی
طرح پھر تیسرا اور چوتھا آدمی آتا گیا، اور درخت کے نیچے بیٹھتا رہا، مگر ان میں کوئی دوسرے کو پہچانتا
تھا اور نہ یہ کہ یہاں کیوں آیا ہے، مگر ان کو درحقیقت اس قدرت نے یہاں جمع کیا تھا
جس نے ان کے دلوں میں ایمان پیدا فرمایا“

قیمت اور اجتماعیت کی اصل بنیاد ابن کثیر نے اس کو نقل کر کے فرمایا کہ لوگ تو باہمی اجتماع کا سبب

قومیت اور جنسیت کو سمجھتے ہیں، مگر حقیقت وہ ہے جو صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ درحقیقت اتفاق و افتراقِ ادل ارواح میں پیدا ہوتا ہے، اس کا اثر اس عالم کے ابدان میں پڑتا ہے، جن ردحوں کے درمیان ازل میں مناسبت اور اتفاق پیدا ہوا وہ یہاں بھی باہم مربوط اور ایک جماعت کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور جن میں یہ مناسبت اور باہمی توافق نہ ہوا بلکہ وہاں علیحدگی رہی ان میں یہاں بھی علیحدگی رہے گی، اسی واقعہ کی مثال کو دیکھو کہ کس طرح الگ الگ ہر شخص کے دل میں ایک ہی خیال پیدا ہوا اس خیال نے ان سب کو غیر شعوری طور پر ایک جگہ جمع کر دیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ لوگ ایک جگہ جمع تو ہو گئے، مگر ہر ایک اپنے عقیدہ کو دوسرے سے اس لڑ چھپاتا تھا کہ یہ کہیں جا کر بادشاہ کے پاس بخبری نہ کر دے، اور میں گرفتار ہو جاؤں، کچھ دیر کوت کے عالم میں جمع رہنے کے بعد ان میں سے ایک شخص بولا کہ بھائی ہم سب کے سب قوم سے علیحدہ ہو کر یہاں پہنچنے کا کوئی سبب تو ضرور ہے، مناسب یہ ہے کہ ہم سب باہم ایک دوسرے کے خیال سے واقف ہو جائیں، اس پر ایک شخص بول اٹھا، کہ حقیقت یہ ہے کہ میں نے اپنی قوم کو جس دین و مذہب اور جس عبادت میں مستلایا یا مجھے یقین ہو گیا کہ یہ باطل ہے، عبادت تو صرف اللہ جل شانہ کی ہونی چاہئے، جس کا تخلیق کائنات میں کوئی شریک اور ساتھی نہیں، اب تو دوسروں کو بھی موقع مل گیا، اور ان میں سے ہر ایک نے اقرار کیا کہ یہی عقیدہ اور خیال ہے جس نے مجھے قوم سے علیحدہ کر کے یہاں پہنچایا۔

ابے ایک متحد الخیال جماعت ایک دوسرے کی رفیق اور دست ہو گئی، اور انھوں نے الگ اپنی ایک عبادت گاہ بنالی، جس میں جمع ہو کر یہ لوگ اللہ وحدہ لا شریک لہ کی عبادت کرنے لگو۔ مگر شدہ شدہ ان کی خبر شہر میں پھیل گئی، اور چغل خوروں نے بادشاہ تک ان کی خبر پہنچادی، بادشاہ نے ان سب کو حاضر ہونے کا حکم دیا، یہ لوگ دربار میں حاضر ہوئے تو بادشاہ نے ان کے عقیدے اور طریقے کے متعلق سوال کیا، اللہ نے ان کو ہمت بخشی، انھوں نے بغیر کسی خوف و خطر کے اپنا عقیدہ توحید بیان کر دیا، اور خود بادشاہ کو بھی اس کی طرف دعوت دی، اسی کا بیان قرآن کریم کی آیات میں اس طرح آیا ہے :- وَرَبَطْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ إِذْ قَامُوا فَقَالُوا رَبُّنَا رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لَنْ نَدْعُو مِنْ دُونِهِ إِلَهًا لَقَدْ قُلْنَا إِذْ أَشْطَطْنَا رَالِي قَوْلِهِ كُنَّا بَاہ

جب ان لوگوں نے بادشاہ کو بیباک ہو کر دعوتِ ایمان دی تو بادشاہ نے اس سے انکار کیا اور ان کو ڈرایا دھمکایا، اور ان کے بدن سے وہ عمدہ پوشاک جو ان شہزادوں کے بدن پر تھی اتر وادی، تاکہ یہ لوگ اپنے معاملہ میں غور کریں، اور غور کرنے کے لئے چند روز کی مہلت یہ کہہ کر دیدی کہ تم نو جوان ہو میں تمھارے قتل میں اس لئے جلدی نہیں کرتا کہ تم کو غور کرنے کا موقع مل جائے

اب بھی اگر تم اپنی قوم کے دین و مذہب پر آجاتے ہو تو تم اپنے حال پر رہو گے در نہ قتل کر دینا جاؤ گے۔
یہ اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم اپنے مؤمن بندوں پر تھا، کہ اس مہلت نے ان لوگوں کے لئے راہ
فراہم کر دی، اور یہ لوگ یہاں سے بھاگ کر ایک غار میں رد پوش ہو گئے۔

عام روایات مفسرین اس پر متفق ہیں کہ یہ لوگ دین مسیح علیہ السلام پر تھے، ابن کثیر اور دیگر
تمام مفسرین نے یہ ذکر کیا ہے اگرچہ ابن کثیر نے اس کو قبول اس لئے نہیں کیا کہ اگر یہ لوگ مسیحی دین پر
ہوتے تو یہودیہ میں ان سے عداوت کی بناء پر ان کے واقعہ کا سوال نہ کراتے اور ان کو اہمیت نہ دیتے
مگر یہ کوئی ایسی بنیاد نہیں جسکی وجہ سے تمام روایات کو رد کر دیا جائے، یہودیہ میں نے تو محض ایک
واقعہ عجیبہ ہونے کی حیثیت سے اس کا سوال کرایا، جیسے ذیل تفسیر میں اس سوال بھی اسی بناء پر ہے،
اس طرح کے سوالات میں یہودیہ اور نصاریت کا تعصب درمیان میں نہ آنا ہی ظاہر ہے۔

تفسیر مظہری میں بروایت ابن اسحق ان لوگوں کو ان موحدین میں شمار کیا ہے جو مسیحی دین
کے مٹ جانے کے بعد ان کے حق پرست لوگ خال خال رہ گئے تھے، جو مسیح دین مسیح اور توحید
پر قائم تھے، ابن اسحق کی روایت میں بھی اس ظالم بادشاہ کا نام دقیانوس بتلایا ہے، اور جس
شہر میں یہ نوجوان غار میں چھپنے سے پہلے رہتے تھے اس کا نام افسوس بتلایا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں بھی واقعہ اسی طرح بیان کیا ہے، اور بادشاہ
کا نام دقیانوس بتلایا ہے، ابن اسحق کی روایت میں یہ بھی ہے کہ اصحاب کہف کے بیدار ہونے
کے وقت ملک پر دین مسیح علیہ السلام کے پابند جن لوگوں کا قبضہ ہو گیا تھا ان کے بادشاہ کا نام
بیدوسیئس تھا۔

مجموعہ روایات سے یہ بات تو بظن غالب ثابت ہو جاتی ہے کہ اصحاب کہف مسیح دین مسیح
علیہ السلام پر تھے اور ان کا زمانہ بعد مسیح ہے، اور جس بادشاہ مشرک سے بھاگے تھے اس کا نام
دقیانوس تھا، تین سو نو سال کے بعد بیدار ہونے کے وقت جس نیک مؤمن بادشاہ کی حکومت
تھی ابن اسحق کی روایت میں اس کا نام بیدوسیئس بتلایا ہے، اس کے ساتھ موجودہ زمانے کی
تاریخوں کو ملا کر دیکھا جائے تو تخمیناً اور تقریبی طور پر ان کا زمانہ متعین ہو سکتا ہے، اس سے
زیادہ تعین کی نہ ضرورت ہو اور نہ اس کے علم کے اسباب موجود ہیں۔

کیا اصحاب کہف اب بھی زندہ ہیں | اس معاملے میں صحیح اور ظاہر یہی ہے کہ انکی وفات ہو چکی ہے، تفسیر مظہری
میں ابن اسحق کی مفصل روایت میں ہے کہ اصحاب کہف کی بیداری اور شہر میں ان کے واقعہ
عجیبہ کی شہرت ہو جانے اور اس وقت کے بادشاہ بیدوسیئس کے پاس پہنچ کر ملاقات کرنے
کے بعد اصحاب کہف نے ملک بیدوسیئس سے رخصت چاہی، اور رخصتی سلام کے ساتھ اس کے

لئے دعا کی، اور ابھی بادشاہ اسی جگہ موجود تھا کہ یہ لوگ اپنے لیٹنے کی جگہوں پر جا کر لیٹ گئے، اور اسی وقت اللہ تعالیٰ نے ان کو موت دیدی۔

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی یہ روایت ابن جریر، ابن کثیر وغیرہ سبھی مفتخرین نے نقل کی ہو کر:

قَالَ قَتَادَةُ غَزَا ابْنُ عَبَّاسٍ مَعَ حَبِيبِ بْنِ مُسْلَمَةَ فَهَرَّوْا بِكُهُفٍ فِي بِلَادِ الرُّومِ فَرَأَوْا فِيهِ عِظَامًا فَقَالَ قَاتِلُ هَذِهِ عِظَامُ أَهْلِ نَكْهَفٍ فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ لَقَدْ بَلَّيْتُ عَنْكَ مُهْمٌ مِّنْ أَكْثَرِ مِثْلِ ثَلَاثِينَ سَنَةٍ (ابن کثیر)	”قتادہ کہتے ہیں کہ ابن عباسؓ نے حبیب ابن مسلمہ کے ساتھ ایک جہاد کیا، تو بلادِ روم میں ان کا گزرا ایک غار پر ہوا جس میں مردہ لاشوں کی ہڈیاں تھیں، کسی نے کہا کہ یہ اصحابِ کہف کی ہڈیاں ہیں، تو ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ان کی ہڈیاں تو اب تین سو برس پہلے خاک ہو چکی ہیں“
---	--

یہ سب اس تاریخی قصے کے وہ اجزاء تھے جن کو نہ قرآن نے بیان کیا نہ حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اور نہ اس واقعہ کا کوئی خاص مقصد یا قرآن کی کسی آیت کا سمجھنا اس پر موقوف ہے، اور نہ تاریخی روایات سے ان چیزوں کا کوئی قطعی فیصلہ کیا جاسکتا ہے، باقی رہے قصے کے وہ اجزاء جن کا خود قرآن کریم نے ذکر فرمایا ہے ان کی تفصیل انہی آیات کے تحت آتی ہے۔

یہاں تک قرآن کریم نے اس قصے کا اجمالی ذکر فرمایا تھا، آگے تفصیلی ذکر آتا ہے۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَأَهُم بِالْحَقِّ إِنَّهُمْ فِتْنَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ

ہم تم کو ان کا حال تحقیق ، وہ کئی جوان ہیں کہ یقین لائے اپنے رب پر

وَزِدْنَاهُمْ هُدًى ۱۳ وَرَبُّنَا عَلٰی قُلُوبِكُمْ اِذْ قَامُوا فَقَالُوا رَبُّنَا

اور زیادہ دی ہم نے ان کو سوجھ، اور گروہ دی اُن کے دل پر جب کھڑے ہوئے پھر بولے ہمارا رب

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِهٖ اِلٰهًا لَّقَدْ

رب آسمان کا اور زمین کا، نہ پکاریں گے ہم اس کے سوائے کسی کو معبود، نہیں تو

قُلْنَا اِذَا شِطَطًا ۱۴ هٰؤُلَاءِ قَوْمٌ اتَّخَذُوا مِنْ دُوْنِ الْاِلٰهَةِ

کہیں ہم نے بات عقل سے دور، یہ ہماری قوم ہے ٹھہرائے انھوں نے اللہ کے سوائے اور معبود

لَوْلَا يَأْتُونَ عَلَيْهِم بِسُلْطٰنٍ بَيِّنٍ فَمِنْ أَظْلَمٍ مِّمَّنْ افْتَرٰى عَلَى اللَّهِ

کیوں نہیں لاتے ان پر کوئی سند کھلی پھر اس سے بڑا گنہگار کون جس نے باندھا اللہ پر

كَذِبًا ۝۱۵ وَإِذَا عَزَلْتَ لَهُمْ وَمَا يُعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ

جھوٹ، اور جب تم نے کنارہ کر لیا ان سے اور جنکو وہ پوجتے ہیں اللہ کے سوائے تو اب باقی

الْكٰفِرُ يَنْشُرُ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهِ وَيُخَيِّرُ لَكُمْ مِّنْ

اس کفر میں پھیلائے تم پر تمھارا رب کچھ اپنی رحمت سے اور بنا دیوے تمھارے واسطے

أَمْرٍ كُمْ مَّرْفَقًا ۝۱۶

کام میں آرام۔

خلاصہ تفسیر

ہم ان کا واقعہ آپ سے ٹھیک ٹھیک بیان کرتے ہیں اس میں اشارہ کر دیا کہ اس کے خلاف جو کچھ دنیا میں مشہور ہے وہ درست نہیں، وہ لوگ (اصحاب کہف) چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر اس زمانے کے دین عیسوی کے مطابق ایمان لائے تھے، اور ہم نے ان کی ہدایت میں اور ترقی کر دی کہ صفات ایمان، ثابت قدمی اور بلاؤں پر صبر دنیا سے اعراض، آخرت کی فکر وغیرہ بھی عطا کر دیں، انہی صفات ایمان و ہدایت میں ایک بات یہ تھی کہ ہم نے ان کے دل مضبوط کر دیے جبکہ وہ چننے ہو کر آپس میں یا مخالفت یا دشمنی کے رد و رد کرنے لگے کہ ہمارا رب تو وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے ہم تو اس کو چھوڑ کر کسی معبود کی عبادت نہ کریں گے (کیونکہ اگر خدا بخوہستہ ہم نے ایسا کیا) تو اس صورت میں ہم نے یقیناً بڑی بے جا بات کہی، اور یہ جو ہماری قوم ہے انھوں نے خدا کو چھوڑ کر اور معبود قرار دے رکھے ہیں، (کیونکہ ان کی قوم اور بادشاہ وقت سب بت پرست تھے، سو یہ لوگ اپنے معبودوں کے معبود ہونے پر کوئی کھلی دلیل کیوں نہیں لاتے) جیسا کہ موحّدین توحید پر واضح اور یقینی دلیل رکھتے ہیں تو اس سے زیادہ کون غضب ڈھانے والا ہو گا جو اللہ پر جھوٹ بہت لگائے کہ اس کے کچھ سا جھسی اور شریک بھی ہیں، اور پھر (آپس میں کہا کہ) جب تم ان لوگوں سے عقیدہ ہی میں الگ ہو گئے اور ان کے معبودوں کی عبادت سے بھی الگ ہو گئے ہو، مگر اللہ سے الگ نہیں ہوئے، بلکہ اسی کی وجہ سے سب کو چھوڑا ہے، تو اب (مصلحت یہ

ہے کہ تم (فلاں) غار میں جو مشورے سے ملے ہوا ہو گا، چل کر پناہ لو (تاکہ امن اور بے فکری کے تحت اللہ کی عبادت کر سکو) تم پر تمہارا رب اپنی رحمت پھیلادے گا اور تمہارے لئے تمہارے اس کام میں کامیابی کے سامان درست کر دے گا (اللہ تعالیٰ سے اسی امید اور توقع پر غار میں جانے کے وقت انہوں نے سب سے پہلے یہ دعا کی کہ رَبَّنَا آتِنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا)

معارف و مسائل

اَتَّخَذْتُمْ فِتْنَةً، فتنی کی جمع ہے، نوجوان کے معنی میں آتا ہے، علماء تفسیر نے فرمایا کہ اس لفظ میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ اصلاح اعمال و اخلاق اور رشد و ہدایت کا زمانہ جوانی ہی کی عمر ہی بڑھاپے میں پچھلے اعمال و اخلاق ایسے پختہ ہو جاتے ہیں کہ کتنا ہی اس کے خلاف حق واضح ہو جائے ان سے نکلنا مشکل ہوتا ہے، صحابہ کرام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر ایمان لانیوالے بیشتر نوجوان ہی لوگ تھے (ابن کثیر، البو حیان)

وَرَبَّنَا عَلَيْنَا مَلِئَةٌ غَدَاةٌ، ابن کثیر کے حوالے سے جو واقعہ کی صورت اور بیان کی گئی ہے اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی طرف ان کے دلوں کو مضبوط کر دینے کا واقعہ اس وقت ہوا جب کہ بت پرست نظام بادشاہ نے ان نوجوانوں کو اپنے دربار میں حاضر کر کے سوالات کئے، اس موت حیات کی کش مکش اور قتل کے خوف کے باوجود اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر اپنی محبت اور ہدایت غفلت ایسی مسلط کر دی کہ اس کے مقابلے میں قتل و موت اور ہر مصیبت کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہو کر اپنے عقیدے کا صاف صاف انہار کر دیا، کہ وہ اللہ کے سوا کسی معبود کی عبادت نہیں کرتے، اور آئندہ بھی نہ کریں گے، جو لوگ اللہ کے لئے کسی کام کا عزم پختہ کر لیتے ہیں تو حق تعالیٰ کی طرف سے ان کی ایسی ہی امداد ہوا کرتی ہے۔

فَأَوَّاهٍ إِلَى الْكُهَنَةِ، ابن کثیر نے فرمایا کہ اصحاب کہف نے جو صورت اختیار کی کہ جس شہر میں رہ کر اللہ کی عبادت نہ ہو سکتی تھی اس کو چھوڑ کر غار میں پناہ لی، یہی سنت ہو تمام انبیاء کی کہ ایسے مقامات سے ہجرت کر کے وہ جگہ اختیار کرتے ہیں جہاں عبادت کی جائے۔

وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ تَزْوُرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِينِ

اور تو دیکھے دھوپ جب نکلتی ہے بچ کر جاتی ہے اُن کی کھوہ سے دائیں کو

وَإِذَا غَرَبَتِ تَقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِي فَجْوَةٍ مِّنْهَا

اور جب ڈوبتی ہے کتر جاتی ہے اُن سے بائیں کو اور وہ میدان میں ہیں اس کے،

ذٰلِكَ مِنْ اٰيَاتِ اللّٰهِ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَمْ يُضِلَّ

یہ ہے اللہ کی قدرتوں سے جسکو راہ دیوے اللہ وہی آئے راہ پر اور جسکو وہ بھلائے

فَلَنْ تَجِدَ لَهُ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ۝۱۷ وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاطًا وَهَمًّا

پھر تو نہ پائے اس کا کوئی رفیق راہ پر لانے والا، اور تو سمجھے وہ جاگتے ہیں اور وہ

رُقُودٌ وَنَقْلَهُمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۝۱۸ وَكَبُرُھُمْ

سوہر نہیں اور کر دہیں دلاتے ہیں ہم ان کو داہنے اور بائیں اور گنتا ان کا

بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيدِ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ

پسار رہا ہے اپنی بائیں چوکھٹ پر اگر تو جھانک کر دیکھے ان کو تو پیٹھ دے کر بھاگے

فِرَارًا وَلَمْلَمْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ۝۱۸

ان سے اور بھرجائے تجھ میں ان کی دہشت۔

خلاصہ تفسیر

اور اے مخاطب (وہ غار ایسی دھچ پر واقع ہوا ہے کہ) جب دھوپ نکلتی ہے تو تو اس کو دیکھے گا کہ وہ غار سے داہنی جانب کو بھیجی رہتی ہے (یعنی غار کے دروازے سے داہنی طرف الگ کو رہتی ہے) اور جب وہ چھپتی ہے تو (غار کے) بائیں طرف ہٹی رہتی ہے (یعنی اُس وقت بھی غار کے اندر دھوپ نہیں جاتی، تاکہ ان کو دھوپ کی تپش سے تکلیف نہ پہونچے) اور وہ لوگ اس غار کے ایک فراخ موقع میں تھے (یعنی ایسے غاروں میں جو عادتاً کہیں تنگ کہیں کشادہ ہوتے ہیں، تو وہ اس غار کے لیے موقع پر تھے جو کشادہ تھا تاکہ ہوا بھی پہونچے اور جگہ کی تنگی سے جی بھی نہ گھبرائے) یہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے کہ اسباب ظاہری کے خلاف ان کے لئے آرام کا سامان مہیا کر دیا پس معلوم ہوا کہ جس کو اللہ ہدایت دے وہی ہدایت پاتا ہے اور جس کو وہ گمراہ کر دیں تو آپ اس کے لئے کوئی مددگار راہ بتانے والا نہ پائے گا غار کی جو ہیئت بتلائی گئی ہے کہ اس میں نہ طلوع کے وقت صبح کو دھوپ اندر جاتی نہ شام کو غروب کے وقت، یہ اس صورت میں ہو سکتا ہے جبکہ غار شمال رو یا جنوب رو ہو، کیونکہ داہنی بائیں جانب غار میں داخل ہونے والے کی مراد ہو تو غار شمال رو ہو گا، اور داہنی بائیں

جانب غار سے نکلنے والے کی مراد ہوں تو غار جنوب رو یہ ہوگا)

اور اے مخاطب (تو اگر اس وقت جبکہ وہ غار میں گئے اور ہم نے ان پر نیند مسلط کر دی
 اُن کو دیکھتا تو) ان کو جاگتا ہوا خیال کرتا حالانکہ وہ سوتے تھے (کیونکہ اللہ کی قدرت نے ان کو نیند
 کے آثار و علامات سے محفوظ رکھا تھا، جیسے سانس کا تغیر، بدن کا ڈھیلنا، آنکھیں اگر بند بھی ہوں
 تو سونے کی یقینی علامت نہیں) اور (اس نیند کے زمانہ دراز میں) ہم ان کو (کبھی) داہنی طرف اور
 (کبھی) بائیں طرف کر دیتے تھے اور (اس حالت میں) ان کا کٹار جو کسی وجہ سے ان کے
 ساتھ آگیا تھا غار کی (دہلیز پر اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے) بیٹھا تھا (اور ان کے رعب و
 جلال خداداد کی یہ حالت تھی کہ) اگر (اے مخاطب) تو ان کو سجانک کر دیکھتا تو ان سے پیچھے پیچھے
 بھاگ کھڑا ہوتا، اور تیرے اندر ان کی دہشت، ساجاتی (اس آیت میں خطاب عام مخاطبین
 کو ہے، اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مرعوب ہونا لازم نہیں آتا، اور یہ تمام سامان
 حق تعالیٰ نے ان لوگوں کی حفاظت کے لئے جمع کر دیئے تھے، کیونکہ جاگتے ہوئے آدمی پر حملہ
 کرنا آسان نہیں ہوتا، اور نیند کے طویل زمانے میں کر دہلیز نہ بدلی جاتیں تو مٹی ایک کر دٹ کو
 کھالیتی، اور غار کے دروازے پر کتے کا بیٹھا بھی سامان حفاظت ہونا ظاہر ہے)۔

معارف و مسائل

ان آیتوں میں حق تعالیٰ نے اصحاب کہف کے تین حال بتائے ہیں، اور تینوں عجیب
 ہیں جو ان حضرات کی کرامت سے بطور خرق عادت ظاہر ہوئے۔

اول زمانہ دراز تک مسلسل نیند کا مسلط ہونا اور اس میں بغیر کسی غذا وغیرہ کے زندہ
 رہنا سب سے بڑی کرامت اور خرق عادت ہے، اس کی تفصیل تو اگلی آیات میں آئے گی، یہاں
 اس طویل نیند کی حالت میں ان کا ایک حال تو یہ بتلایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو غار کے اندر
 اس طرح محفوظ رکھا تھا کہ صبح شام دھوپ ان کے قریب سے گذرتی مگر غار کے اندر ان کے
 جسموں پر نہ پڑتی تھی، قریب سے گذرنے کے فوائد زندگی کے آثار کا قیام، ہوا اور سردی گرمی
 کا اعتدال وغیرہ تھے، اور ان کے جسموں پر دھوپ نہ پڑنے سے جسموں کی اور ان کے لباس کی
 حفاظت بھی تھی۔

دھوپ کے ان کے اوپر نہ پڑنے کی یہ صورت غار کی کسی خاص وضع کی بناء پر بھی ہو سکتی
 ہے کہ اس کا دروازہ جنوب یا شمال میں ایسی وضع پر ہو کہ دھوپ طبعی اور سادی طور پر اس کے
 اندر نہ پہنچے، ابن قتیبہ نے اس کی وضع خاص متعین کرنے کیلئے تکلف کیا کہ ریاضی کے اصول

قواعد کی رو سے اس جگہ کا طویل بلد عرض بلد اور غار کا رخ متعین کیا، (منظری) اور اس کے بالمقابل زجاج نے کہا کہ دھوپ کا ان سے الگ رہنا کسی وضع اور ہیئت کی بنا پر نہیں بلکہ ان کی کرامت بطور خرق عادت تھا، اور اس آیت کے آخر میں جو یہ ارشاد ہے ذلک من آیت اللہ، یہ بھی بظاہر اسی پر دلالت کرتا ہے کہ دھوپ کے حفاظت کا یہ سامان غار کی کسی خاص وضع و ہیئت کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی ایک نشانی تھی (قرطبی)

اور صاف بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ایسا سامان مہیا فرمادیا تھا کہ دھوپ ان کے جسموں پر نہ پڑے، خواہ یہ سامان غار کی خاص ہیئت اور وضع کے ذریعے ہو یا کوئی بادیغیر دھوپ کے وقت حائل کر دیا جاتا ہو، یا براہ راست آفتاب کی شعاعوں کو ان سے بطور خرق عادت کے ہٹا دیا جاتا ہو، آیت میں یہ سب احتمالات ہیں، کسی ایک کو متعین کرنے پر زور دینے کی ضرورت نہیں۔

اصحاب کہف طویل عینہ	دوسرا حال یہ بتلایا ہے کہ اصحاب کہف پر اتنے زمانہ دراز تک نیند مسلط
کے زمانے میں اس حالت	کر دینے کے باوجود ان کے اجسام پر نیند کے آثار نہ تھے، بلکہ ایسی حالت
تھی کہ دیکھنے والا انکو	تھی کہ ان کو دیکھنے والا یہ محسوس کرے کہ وہ جاگ رہے ہیں، عام مفسرین
بیدار سمجھے	نے فرمایا کہ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، بدن میں ڈھیلا پن جو نیند

سے ہوتا ہے وہ نہیں تھا، سانس میں تغیر جو سونے والوں کے ہو جاتا ہے وہ نہیں تھا، ظاہر یہ ہے کہ یہ حالت بھی غیر معمولی اور ایک قسم کی کرامت ہی تھی، جس میں بظاہر حکمت ان کی حفاظت تھی، کہ کوئی ان کو سوتا ہوا سمجھ کر ان پر حملہ نہ کرے، یا جو سامان ان کے ساتھ تھا وہ نہ چھالے، اور مختلف کروٹیں بدلنے سے بھی دیکھنے والے کو بیداری کا خیال ہو سکتا ہے، اور کروٹیں بدلنے میں یہ مصلحت بھی تھی کہ مٹی ایک کروٹ کو نہ کھالے۔

اصحاب کہف کا کتنا یہاں ایک سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ حدیث صحیح میں آیا ہے کہ جس گھر میں گستا یا تصویر ہو اس میں فرشتے داخل نہیں ہوتے، اور صحیح بخاری کی ایک حدیث میں بروایت ابن عمر مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص شکاری گتے یا جانوروں کے محافظ گتے کے علاوہ گستا یا تو ہر روز اس کے اجر میں سے دو قیراط گھٹ جاتے ہیں، (قیراط ایک چھوٹے سے وزن کا نام ہے) اور حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں ایک تیسری قسم کے گتے کا بھی ہتھنار آیا ہے، یعنی جو کھیتی کی حفاظت کے لئے پالا گیا ہو۔

ان روایات حدیث کی بنا پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان بزرگ اللہ والوں نے گستا کیوں ساتھ لیا، اس کا ایک جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ یہ حکم گستا پالنے کی ممانعت شریعت محمدیہ

کا حکم ہی ممکن ہے کہ دینِ مسیح علیہ السلام میں ممنوع نہ ہو، دوسرے بھی قرین قیاس ہے کہ یہ لوگ خدا کا جانا د صاحبِ مولیٰ تھے اُن کی حفاظت کے لئے کُتاپا لائے، اور جیسے کتے کی وفا شعار سی مشہور ہے، یہ جب شہر سے چلے تو وہ بھی ساتھ لگ لیا۔

نیک صحبت کے برکات کہ اس نے | ابنِ عطیہؒ فرماتے ہیں کہ میرے والد ماجد نے بتلایا کہ میں ابو الفضل کتے کا بھی اعزاز بڑھا دیا جو ہری کا ایک وعظۃً بھری میں جامع مصر کے اندر سنا وہ برسرِ منبر یہ فرما رہے تھے کہ جو شخص نیک لوگوں سے محبت کرتا ہے ان کی نیکی کا حصہ اس کو بھی ملتا ہے، دیکھو اصحابِ کہف کے کتے نے ان سے محبت کی اور ساتھ لگ لیا تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس کا ذکر فرمایا۔

قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں ابنِ عطیہؒ کی روایت نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ جب ایک کُتّا صلحاء اور اولیاء کی صحبت سے یہ مقام پاسکتا ہے تو آپ قیاس کر لیں کہ مؤمنین موحّدین جو اولیاء اللہ اور صالحین سے محبت رکھیں ان کا مقام کتنا بلند ہوگا، بلکہ اس واقعہ میں ان مسلمانوں کے لئے تسلی اور بشارت ہے جو اپنے اعمال میں کوتاہ ہیں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت پوری رکھتے ہیں۔

صحیح بخاری میں بروایت انسؓ مذکور ہے کہ میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز مسجد سے نکل رہے تھے مسجد کے دروازے پر ایک شخص ملا، اور یہ سوال کیا کہ یا رسول اللہ قیامت کب آئے گی؟ آپؐ فرمایا کہ تم نے قیامت کے لئے کیا تیاری کر رکھی ہے (جو اس کے آنے کی جلدی کر رہے ہو) یہ بات سن کر یہ شخص دل میں کچھ شرمندہ ہوا اور پھر عرض کیا کہ میں نے قیامت کے لئے بہت نماز، روزے اور صدقات تو جمع نہیں کئے، مگر میں اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت رکھتا ہوں، آپؐ نے فرمایا کہ اگر ایسا ہے تو رسن لو کہ تم قیامت میں اسی کے ساتھ ہو گے جس سے محبت رکھتے ہو، حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ہم یہ جملہ مبارکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر اتنے خوش ہوئے کہ اسلام لانے کے بعد اس سے زیادہ خوشی کبھی نہ ہوئی تھی، اور اس کے بعد حضرت انسؓ نے فرمایا کہ (الحمد للہ) میں اللہ سے اس کے رسولؐ سے، ابو بکر و عمر سے محبت رکھتا ہوں، اس لئے اس کا امیدوار ہوں کہ ان کے ساتھ ہوں گا (قرطبی)

اصحابِ کہف کو اللہ تعالیٰ نے ایسا رعب و جلال عطا فرمایا تھا جو دیکھے ہیبت کھا کر بھاگ جاتا تھا | تو اُطْلَعْتَ عَلَيْهِمْ، ظاہر یہ ہے کہ اس میں خطاب عام لوگوں کو ہو اس لئے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اصحابِ کہف کا رعب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی چھا سکتا تھا، عام مخاطبین کو

فرمایا گیا ہے، اگر تم ان کو جھانک کر دیکھو تو ہیبت کھا کر بھاگ جاؤ اور ان کا رعب و ہیبت تم پر طاری ہو جائے۔

یہ رعب و ہیبت کس بنا اور کن اسباب کی وجہ سے تھا، اس میں بحث فضول ہے، اور اسی لہٰذا قرآن و حدیث نے اس کو بیان نہیں کیا، حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت کے لئے ایسے حالات پیدا فرمادیئے تھے کہ ان کے بدن پر دھوپ نہ پڑے اور دیکھنے والا ان کو بیدار سمجھے اور دیکھنے والے پر ان کی ہیبت طاری ہو جائے کہ پوری طرح دیکھ نہ سکے، یہ حالات خاص اسباب طبعیہ کے راستہ سے ہونا بھی ممکن ہے، اور بطور کرامت خرقِ عادت کے طریق سے بھی جب قرآن و حدیث نے اس کی کوئی خاص وجہ متعین نہیں فرمائی، تو خالی قیاسات اور تخمینوں سے اس میں بحث کرنا بے کار ہے، تفسیر مظہری میں اسی کو ترجیح دی ہے، اور تائید میں ابن ابی شیبہ، ابن المنذر، ابن ابی حاتم کی سند سے حضرت ابن عباسؓ کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں ہم نے روم کے مقابلہ میں حضرت معاویہؓ کے ساتھ جہاد کیا، جو غزوۃ المضیق کے نام سے معروف ہے، اس سفر میں ہمارا گزر اس غار پہ ہوا، جس میں اصحابِ کفٹ ہیں حضرت معاویہؓ نے ارادہ کیا کہ اصحابِ کفٹ کی تحقیق اور مشاہدہ کے لئے غار میں جائیں، ابن عباسؓ نے منع کیا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ سے بڑی اور بہتر ہستی یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے مشاہدہ سے منع کر دیا ہے، اور یہی آیت پڑھی **لَوْ اَطْلَعْتَ عَلَيْهِمْ** اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک **لَوْ اَطْلَعْتَ** کا خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تھا، مگر حضرت معاویہؓ نے ابن عباسؓ کی رائے کو قبول نہیں کیا (غالباً وجہ یہ ہوگی کہ انھوں نے آیت کا مخاطب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے عام مخاطبین کو قرار دیا ہوگا، یا یہ کہ یہ حالت قرآن نے اس وقت کی بیان کی ہے جس وقت اصحابِ کفٹ زندہ تھے اور سو رہے تھے، اب ان کی وفات کو غرض ہو چکا ہے، ضروری نہیں کہ اب بھی وہی رعب و ہیبت کی کیفیت موجود ہو بہر حال حضرت معاویہؓ نے ابن عباسؓ کی بات قبول کی اور چند آدمی تحقیق و مشاہدہ کے لئے بھیج دیئے، جب یہ لوگ غار میں داخل ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے اُن پر ایک سخت گرم ہوا بھیج دی جس کی وجہ سے یہ کچھ نہ دیکھ سکے (مظہری)

وَكَذَلِكَ بَعَثْنَاهُمْ لِيَتَسَاءَلُوا بَيْنَهُمْ قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ

اور اسی طرح ان کو جگا دیا ہم نے کہ آپس میں پوچھنے لگے، ایک بولا ان میں کتنی دیر ٹھہرے تم

قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالُوا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ

بولے ہم ٹھہرے ایک دن یا دن سے کم، بولے تمہارا رب ہی خوب جانتے جتنی دیر تم رہے ہو

فَابْعَثُوا أَحَدَكُمْ بِرِقْلٍ مُّهِذَةٍ إِلَى الْمَدِينَةِ فَلْيَنْظُرْ أَيُّهَا

اب بھیجو اپنے میں سے ایک کو یہ روپیہ دے کر اپنا اس شہر میں پھر دیکھے کونسا کھانا

أَزْكَى طَعَامًا فَلْيَأْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِنْهُ وَلْيَسَلِّطْ وَلَا يُشْعِرَنَّ

تھرا ہے سولائے تمھارے پاس اس میں سے کھانا اور نرمی سے جاتے اور بھانہ دے

بِكُمْ أَحَدًا ۝۱۹۱ اِنْهُمْ اِنْ يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوكُمْ اَوْ يُعِيدُوْكُمْ

تمھاری خبر کسی کو ، وہ لگ اگر خبر پائیں تمھاری پتھروں سے مار ڈالیں تم کو یا وٹالیں تم کو

فِي مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوا اِذَا ابَدًا ۝۲۰

اپنے دین میں اور تب تو بھلا نہ ہوگا تمھارا کہیں ۔

خلاصہ تفسیر

اور جس طرح ہم اپنی قدرت کاملہ سے ان کو اتنے زمانہ دراز تک سُلا یا ، اسی طرح اس طویل نیند کے بعد ہم نے ان کو جگا دیا تاکہ وہ آپس میں پوچھ پچھ کریں (تاکہ باہمی سوال و جواب کے بعد ان کو حق تعالیٰ کی قدرت اور حکمت منکشف ہو چنانچہ) ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ (اس نیند کی حالت میں) تم کس قدر رہے ہو گے (جواب میں) بعض نے کہا کہ (غالباً) ایک دن یا ایک دن سے بھی کچھ کم رہے ہوں گے ، دوسرے بعض نے کہا کہ (اس کی تفتیش کی کیا ضرورت ہے) یہ تو (ٹھیک ٹھیک) تمھارے رب ہی کو خبر ہے کہ تم کس قدر (سوتے) رہے اب (اس فضول بحث کو چھوڑ کر ضروری کام کرنا چاہئے وہ یہ کہ) اپنے میں سے کسی کو یہ روپیہ (جو کہنے والے کے پاس ہوگا ، کیونکہ یہ لوگ کچھ خرچ کے لئے رقم بھی لے کر چلے تھے ، غرض کہ کسی کو یہ روپیہ) دے کر شہر کی طرف بھیجو پھر (وہ وہاں پہنچ کر) تحقیق کرے کہ کونسا کھانا حلال ہے (اس جگہ لفظ اَزْكَی کی تفسیر بروایت ابن جریر حضرت سعید بن جبیر سے یہی منقول ہے کہ مراد اس سے حلال کھانا ہے ، اور اس کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ ان کی قوم بُت پرست بکثرت اپنے بتوں کے نام ذبح کیا کرتی تھی اور بازار بکثرت ہی حرام گوشت بکتا تھا) تو وہ اس میں سے تمھارے پاس کچھ کھانے آدو اور کام خوش تدبیری سے کرے (کہ ایسی وضع ہیست سے جاوے کہ کوئی اس کو پہچانے نہیں اور کھانے کی تحقیق کرنے میں بھی یہ ظاہر نہ ہونے دے کہ بُت کے نام کے ذبیحہ کو حرام سمجھتا ہے) اور کسی کو تمھاری خبر نہ ہونے دے (کیونکہ) اگر وہ لوگ (یعنی اہل شہر جن کو اپنے خیال میں اپنے زمانے

کے مشرکین سمجھے ہوئے تھے، کہیں تمھاری خبر پا جائیں گے تو تم کو یا پتھر اڑا کر کے مار ڈالیں گے یا (جبراً) تم کو اپنے مذہب میں پھر داخل کر لیں گے اور ایسا ہوا تو تم کو کبھی فلاح نہ ہو گی۔

معارف و مسائل

گَدَّ لَيْلًا یہ لفظ تشبیہ و تمثیل کے لئے ہے، مراد اس جگہ دو واقعوں کی باہم تشبیہ بیان کرنا کہ ایک واقعہ اصحاب کہف کی نوم طویل اور زمانہ دراز تک سوتے رہنے کا ہے، جس کا ذکر شروع قصے میں آیا ہے فَضَرَبْنَا عَلَىٰ آذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَدًا، دوسرا واقعہ اس زمانہ دراز کی نیند کے بعد صبح سالم اور بادر جو غذا نہ پہنچنے کے قوی اور تندرست لگنے اور بیدار ہونے کا ہے، یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی آیاتِ قدرت ہونے میں متماثل ہیں، اسی لئے اس آیت میں جو ان کے بیدار کرنے کا ذکر فرمایا تو لفظ گَدَّ لَيْلًا سے اشارہ کر دیا کہ جس طرح ان کی نیند عام انسانوں کی عادی نیند کی طرح نہیں تھی، اسی طرح ان کی بیداری بھی عام عادت طبعی سے ممتاز تھی، اور اس کے بعد جَوَ لَيْسَاءَ لُؤَا فرمایا جس کے معنی ہیں تاکہ یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھیں کہ نیند کتنے زمانے رہی، یہ ان کے بیدار کرنے کی علت نہیں، بلکہ عادی طور پر پیش آنے والے ایک واقعہ کا ذکر ہے، اسی لئے اس کے لام کو حضرات مفسرین نے لام عاقبت یا لام صیرورت کا نام دیا ہے (ابو حیان، قرطبی) خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح ان کی نوم طویل ایک نشانی قدرت کی تھی، اسی طرح سینکڑوں سال کے بعد بغیر کسی غذا کے قوی، تندرست بیدار ہو کر بیٹھ جانا بھی قدرت کاملہ کی نشانی تھی، اور چونکہ قدرت کو یہ بھی منظور تھا کہ خود ان لوگوں پر بھی یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ سینکڑوں برس سوتے رہو تو اس کی ابتداء باہمی سوالات سے ہوئی، اور انتہا اس واقعہ سے ہوئی جس کا ذکر اگلی آیت میں وَ گَدَّ لَيْلًا اَعْتَرَفْنَا میں آیا ہے کہ شہر کے لوگوں پر ان کا راز کھل گیا، اور تعینِ مدت میں اختلاف کے باوجود زمانہ دراز تک غار میں سوتے رہنے کا سب کو یقین ہو گیا۔

قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ، شروع قصہ میں جو بات اجمالاً کہی گئی تھی کہ غار میں رہنے کی مدت کے متعلق باہم اختلاف رہا، ان میں سے ایک جماعت کا قول صیح تھا، یہ اس کی تفصیل ہے کہ اصحاب کہف میں سے ایک شخص نے سوال اٹھایا کہ تم کتنا سوتے ہو، تو بعض نے جواب دیا کہ ایک دن یا دن کا ایک حصہ، کیونکہ یہ لوگ صبح کے وقت غار میں داخل ہوئے تھے، اور بیدار ہونے کا وقت شام کا وقت تھا، اس لئے خیال یہ ہوا کہ یہ وہی دن ہے جس میں ہم غار میں داخل ہوئے تھے، اور سونے کی مدت تقریباً ایک دن ہے، مگر انہی میں سے دوسرے لوگوں کو کچھ یہ احساس ہوا کہ شاید یہ وہ دن نہیں جس میں داخل ہوئے تھے، پھر معلوم نہیں کتنے دن ہو گئے، اس لئے اس کے علم کو

حوالہ بخدا کیا، قَالُوا رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا كَيْدُكُمْ، اور اس بحث کو غیر ضروری سمجھ کر اصل کام کی طرف توجہ دلائی کہ شہر سے کچھ کھانا لانے کے لئے ایک آدمی کو بھیج دیا جائے۔

إِلَى الْمَدِينَةِ، اس لفظ سے اتنا تو ثابت ہوا کہ غار کے قریب بڑا شہر تھا، جہاں یہ لوگ رہتے تھے، اس شہر کے نام کے متعلق ابو حیان نے تفسیر بحر محیط میں فرمایا کہ جس زمانے میں اصحاب کعبہ یہاں سے نکلے تھے، اس وقت اس شہر کا نام افسوس تھا، اور اب اس کا نام طرسوس ہے، قرطبی نے اپنی تفسیر میں فرمایا کہ بت پرستوں کے اس شہر پر غلبہ اور جاہلیت کے زمانے میں اس کا نام افسوس تھا، جب اس زمانے کے مسلمان یعنی مسیحی اس پر غالب آئے تو اس کا نام طرسوس رکھ دیا۔

يَوْمَ رَفَعْنَا سَعَدًا، اس سے معلوم ہوا کہ یہ حضرات غار میں آنے کے وقت اپنے ساتھ کچھ رقم روپیہ پیسہ بھی ساتھ لائے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ ضروری نفقہ کا اہتمام کرنا زہد و توکل کے خلاف نہیں (بحر محیط)

أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَقَدْ آتَيْنَا لَكُمْ آيَةً فِي هَذِهِ السُّرَّةِ، اور اس کی ضرورت اس لئے محسوس کی کہ جس زمانے میں یہ لوگ شہر سے نکلے تھے وہاں بتوں کے نام کا ذبیحہ ہوتا، اور وہی بازاروں میں فروخت ہوتا تھا، اس لئے جانے والے کو یہ تاکید کی کہ اس کی تحقیق کر کے کھانا لاتے کہ یہ کھانا حلال بھی ہے یا نہیں۔

مَسْئَلَةٌ:۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس شہر یا جس بازار، ہوٹل میں اکثریت حرام کھانے کی ہو وہاں کا کھانا بغیر تحقیق کے کھانا جائز نہیں۔

أَذْيَرُ جَمُوعًا، رجم کے معنی سنگسار کرنے کے ہیں، بادشاہ نے غار میں جانے سے پہلے ان کو دھکی دی تھی کہ اگر اپنا یہ دین نہ چھوڑ دے تو قتل کر دیے جاؤ گے، اس آیت سے معلوم ہوا کہ ان کے یہاں ان کے دین سے پھر جانے والے کی منراے قتل بصورت سنگساری دی جاتی تھی تاکہ سب لوگ اس میں شریک ہوں، اور ساری قوم اپنے غیظ و غضب کا اظہار کر کے قتل کریں۔ شاید شریعت اسلام میں شادی شدہ مرد و عورت کے زنا کی منرا بھی جو سنگسار کر کے قتل کرنا تجویز کیا گیا ہے اس کا بھی منشا یہ ہو کہ جس شخص نے حیا کے سائے پر دوں کو توڑ کر اس فعلِ قبیح کا ارتکاب کیا ہے اس کا قتل منظر عام پر سب لوگوں کی شرکت کے ساتھ ہونا چاہئے تاکہ اس کی رسوائی بھی پوری ہو، اور سب مسلمان عملاً اپنے غیظ و غضب کا اظہار کریں، تاکہ آئندہ قوم میں اس حرکت کا اعادہ نہ ہو سکے۔

فَابْعَثُوا أَحَدَكُمْ، اس واقعہ میں جماعت اصحاب کہف نے اپنے میں سے ایک آدمی کو شہر بھیجنے کے لئے منتخب کیا، اور رقم اس کے حوالہ کی کہ وہ کھانا خرید کر لائے، قرطبی نے

جو انہ ابن خوزندر فرمایا کہ اس سے چند فقہی مسائل حاصل ہوئے۔

چند مسائل | اوّل یہ کہ مال میں شرکت جائز ہے، کیونکہ یہ رقم سب کی مشترک تھی، دوسرے یہ کہ مال میں وکالت جائز ہے، کہ مشترک مال میں کوئی ایک شخص بحیثیت وکیل دوسروں کی اجازت سے تصرفات کرے، تیسرے یہ کہ چند رفیق اگر کھانے میں شرکت رکھیں یہ جائز ہے، اگرچہ کھانے کی مقداریں عادتاً مختلف ہوتی ہیں، کوئی کم کھاتا ہے کوئی زیادہ۔

وَكَذَلِكَ أَثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوا أَنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَأَنَّ السَّاعَةَ

اور اسی طرح خبر ظاہر کر دی ہم نے ان کی تاکہ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ ٹھیک ہے اور قیامت

لَا رَيْبَ فِيهَا إِذْ يَتَنَازَعُونَ بَيْنَهُمْ أَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوا عَلَيْهِمُ

کے آنے میں دھوکہ نہیں، جب جھگڑ رہے تھے آپس میں اپنی بات پر پھر کہنے لگے بناؤ ان پر

بُنْيَانًا رَبُّهُمْ أَعْلَمُ بِهِمْ ط قَالَ الَّذِينَ غَلَبُوا عَلَىٰ أَمْرِهِمْ

ایک عمارت، اُن کا رب خوب جانتا ہے اُن کا حال، بولے وہ لوگ جن کا کام غالب تھا ہم بنائیں گے

لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمُ مَسْجِدًا ﴿۲۱﴾

اُن کی جگہ پر عبادت خانہ۔

خلاصہ تفسیر

اور رہم نے جس طرح اپنی قدرت سے ان کو مسلایا اور جگایا، اسی طرح ہم نے (اپنی قدرت و حکمت سے اس زمانے کے) لوگوں کو ان (کے حال) پر مطلع کر دیا تاکہ (منجملہ اور فوائد کے ایک فائدہ یہ بھی ہو کہ) وہ لوگ (اس واقعہ سے استدلال کر کے) اس بات کا یقین (یا زیادہ یقین) کر لیں کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے، اور وہ یہ کہ قیامت میں کوئی شک نہیں رہے لوگ اگر پہلے سے قیامت میں زندہ ہونے پر ایمان رکھتے تھے تو زیادہ یقین اس واقعہ سے ہو گیا، اور اگر قیامت کے منکر تھے تو اب یقین حاصل ہو گیا، یہ واقعہ تو اصحابِ کہف کی زندگی میں پیش آیا، پھر اُن صاحبوں نے وہیں غار میں وفات پائی، تو ان کے متعلق اہل عصر میں اختلاف ہوا جسکو آگے بیان فرمایا ہے کہ وہ وقت بھی قابلِ ذکر ہے جب کہ اس زمانے کے لوگ ان کے معاملے میں باہم جھگڑ رہے تھے،

اور وہ معاملہ اس غار کا منہ بند کرنا تھا، تاکہ اُن کی لاشیں محفوظ رہیں، یا ان کی یادگار قائم کرنا مقصود تھا، سو ان لوگوں نے کہا کہ ان کے (غار کے) پاس کوئی عمارت بنو اور پھر اختلاف ہوا کہ وہ عمارت کیا ہو، اس میں رائیں مختلف ہوتی ہیں، تو اختلاف کے وقت ان کا رب ان کے احوال مختلفہ کو خوب جانتا تھا (بالآخر) جو لوگ اپنے کام پر غالب تھے (یعنی اہل حکومت جو اس وقت دین حق پر قائم تھے) انہوں نے کہا کہ ہم تو ان کے پاس ایک مسجد بنادیں گے (تاکہ مسجد اس بات کی بھی علامت رہے کہ یہ لوگ خود عابد تھے معبود نہ تھے اور دوسری عمارتوں میں یہ احتمال تھا کہ آگے آنے والے انہی کو معبود بنالیں) :

معارف و مسائل

وَكَذَلِكَ أَعْرَضْنَا عَنْهُمْ، اس آیت میں اصحابِ کہف کا اہلِ شہر پر منکشف ہو جانا اور اس کی حکمت عقیدۂ آخرت و قیامت کہ سب مُردے دوبارہ زندہ ہوں گے اس پر ایمان ^{لغین} حاصل ہونا بیان فرمایا ہے، تفسیر قرطبی میں اس کا مختصر قصہ اس طرح مذکور ہے کہ :-

اصحابِ کہف کا حال | اصحابِ کہف کے نکلنے کے وقت جو ظالم اور مشرک بادشاہ و قیادوس اس شہر پر
اہل شہر پر کھل جانا | مسلط تھا وہ مر گیا، اور اس پر مددیاں گزر گئیں، یہاں تک اس مملکت پر قبضہ

اہل حق کا ہو گیا جو توحید پر یقین رکھتے تھے ان کا بادشاہ ایک ایک صالح آدمی تھا جس کا نام تفسیر منظری میں تاریخی روایات سے بید و سیس لکھا ہے، اس کے زمانے میں اتفاقاً قیامت اور اس میں سب مردوں کے دوبارہ زندہ ہونے کے مسئلے میں کچھ اختلافات پھیل گئے، ایک فرقہ اس کا منکر ہو گیا کہ یہ بدن گلنے مٹنے، پھر ریزہ ریزہ ہو کر ساری دنیا میں پھیل جانے کے بعد پھر زندہ ہو جائیں گے، بادشاہ وقت بید و سیس کو اس کی فکر ہوتی کہ کس طرح ان کے شکوک و شبہات دور کئے جاتیں جب کوئی تدبیر نہ بنی تو اس نے ٹاٹ کے کپڑے پہنے اور راہ کے ڈھیر پر بیٹھ کر اللہ سے دعا کی اور الحاج و زاری شروع کی، کہ یا اللہ آپ ہی کوئی ایسی صورت پیدا فرمادیں کہ ان لوگوں کا عقیدہ صحیح ہو جائے اور یہ راہ پر آجائیں، اس طرف یہ بادشاہ گریہ و زاری اور دعا میں مصروف تھا، دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا کی قبولیت کا یہ سامان کر دیا کہ اصحاب کہف بیدار ہوئے اور انھوں نے اپنے ایک آدمی کو جس کا نام تملیخا بتلایا جاتا ہے ان کے بازار میں بھیج دیا وہ کھانا خریدنے کے لئے دکان پر پہنچا اور تین سو برس پہلے بادشاہ دقیانوس کے زمانے کا سکہ کھانے کی قیمت میں پیش کیا تو دکاندار حیران رہ گیا، کہ یہ سکہ کہاں سے آیا، کس زمانے کا ہے، بازار کے دوسرے دکان داروں کو دکھلایا، سب نے یہ کہا کہ اس شخص کو کہیں پرانا

خزانہ ہاتھ آ گیا ہے اس میں سے یہ سکہ نکال کر لایا ہے، اس نے انکار کیا کہ نہ مجھے کوئی خزانہ ملا، نہ کہیں سے لایا یہ میرا پیار دہیہ ہے۔

بازار دانوں نے اس کو گرفتار کر کے بادشاہ کے سامنے پیش کر دیا، یہ بادشاہ جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے، ایک صالح اللہ والا تھا، اور اس نے سلطنت کے پڑانے خزانے کے آثار قدیمہ میں کہیں وہ تختی بھی دیکھی تھی جس میں اصحاب کہف کے نام اور ان کے فرار ہو جانے کا واقعہ بھی لکھا ہوا تھا، بعض کے نزدیک خود ظالم بادشاہ دقیانوس نے یہ تختی لکھوائی تھی، کہ یہ ہشتہماری مجرم ہیں، ان کے نام اور پتے محفوظ رہیں، جب کہیں ملیں گرفتار کر لئے جائیں، اور بعض روایات میں ہے کہ شاہی دفتر میں بعض ایسے نو من بھی تھے جو دل سے بت پرستی کو برا سمجھتے اور اصحاب کہف کو سچی پرست سمجھتے تھے، مگر ظاہر کرنے کی ہمت نہیں تھی، انہوں نے یہ تختی بطور یادگار کے لکھ لی تھی، اسی تختی کا نام رقیم ہے جس کی وجہ سے اصحاب کہف کو اصحاب رقیم بھی کہا گیا۔

الغرض اس بادشاہ کو اس واقعہ کا کچھ علم تھا، اور اس وقت وہ اس دعا میں مشغول تھا کہ کسی طرح لوگوں کو اس بات کا یقین آجائے کہ مردہ اجسام کو دوبارہ زندہ کر دینا اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے سامنے کچھ بعید نہیں۔

اس لئے تمیلخا سے اس کے حالات کی تحقیق کی تو اس کو اطمینان ہو گیا کہ یہ انہی لوگوں میں سے ہے اور اس نے کہا کہ میں تو اللہ تعالیٰ سے دعا کر گیا کرتا تھا کہ مجھے ان لوگوں سے ملا دے جو دقیانوس کے زمانے میں اپنا ایمان بچا کر بھاگے تھے؟ بادشاہ اس پر مسرور ہوا اور کہا کہ شاید اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول فرمائی، اس میں لوگوں کے لئے شاید کوئی ایسی حجت ہو جس سے ان کو حشر اجساد کا یقین آجائے، یہ کہہ کر اس شخص سے کہا کہ مجھے اس غار پر لے چلو جہاں سے تم آئے ہو۔

بادشاہ بہت سے اہل شہر کے مجمع کے ساتھ غار پہنچا، جب غار قریب آیا تو تمیلخا نے کہا کہ آپ ذرا ٹھہریں میں جا کر اپنے ساتھیوں کو حقیقت معاملہ سے باخبر کر دوں کہ اب بادشاہ مسلمان ہو چکا ہے اور رقیم بھی مسلمان ہے، وہ ملنے کے لئے آئے ہیں، ایسا نہ ہو کہ اطلاق سے پہلے آپ پہنچیں تو وہ سمجھیں کہ ہمارا دشمن بادشاہ چڑھ آیا ہے، اس کے مطابق تمیلخا نے پہلے جا کر ساتھیوں کو تمام حالات سنا دیے تو وہ لوگ اس سے بہت خوش ہوئے، بادشاہ کا استقبال تعظیم کے ساتھ کیا، پھر وہ اپنے غار کی طرف لوٹ گئے، اور اکثر روایات میں یہ ہے کہ جس وقت تمیلخا نے ساتھیوں کو یہ سارا قصہ سنایا، اسی وقت سب کی وفات ہو گئی، بادشاہ سے ملاقات نہیں ہو سکی، بحر محیط میں ابوحیان نے اس جگہ یہ روایت نقل کی ہے کہ ملاقات

کے بعد اہل غار نے بادشاہ اور اہل شہر سے کہا کہ اب ہم آپ سے رحمت چاہتے ہیں اور غار کے اندر چلے گئے، اسی وقت اللہ تعالیٰ نے ان سب کو وفات دیدی، واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔
 بہر حال اب اہل شہر کے سامنے یہ واقعہ عجیبہ قدرت الہیہ کا واشگاف ہو کر آ گیا تو سب کو یقین ہو گیا کہ جس ذات کی قدرت میں یہ داخل ہے کہ تین سو برس تک زندہ انسانوں کو بغیر کسی غذا اور سامان زندگی کے زندہ رکھے اور اس طویل عرصہ تک ان کو میند میں رکھنے کے بعد پھر صحیح سالم، قوی، تندرست اٹھائے اس کے لئے یہ کیا مشکل ہے کہ مرنے کے بعد بھی پھر ان اجسام کو زندہ کرے، اس واقعہ سے ان کے انکار کا سبب دور ہو گیا کہ حشر اجساد کو مستبعد اور خارج از قدرت سمجھتے تھے، اب معلوم ہوا کہ مالک الملکوت کی قدرت کو انسانی قدرت پر قیاس کرنا خود جہالت ہے۔

اسی کی طرف اس آیت میں اشارہ فرمایا يَعْلَمُوا أَنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَأَنَّ السَّاعَةَ لَا تَأْتِي بَیْرًا، یعنی ہم نے اصحاب کہف کو زمانہ دراز تک سنانے کے بعد جگا کر بٹھا دیا تاکہ لوگ سمجھ لیں کہ اللہ کا وعدہ یعنی قیامت میں سب مردوں کے اجسام کو زندہ کرنے کا وعدہ سچا ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی مشبہ نہیں۔

اصحاب کہف کی وفات کے بعد | اصحاب کہف کی بزرگی اور تقدس کے تو سب ہی قائل ہو چکے تھے،
 لوگوں میں اختلاف رائے | ان کی وفات کے بعد سب کا خیال ہوا کہ غار کے پاس کوئی عمارت بطور یادگار کے بنائی جائے، عمارت کے بارے میں اختلاف رائے ہوا، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل شہر میں اب بھی کچھ بہت پرست لوگ موجود تھے وہ بھی اصحاب کہف کی زیارت کو آتے تھے، ان لوگوں نے عمارت بنانے میں یہ رائے دی کہ کوئی رفادہ عام کی عمارت بنادی جائے، مگر ارباب حکومت اور بادشاہ مسلمان تھے، اور انہی کا غلبہ تھا، ان کی رائے یہ ہوئی کہ یہاں مسجد بنادی جائے جو یادگار بھی ہے اور آئندہ بت پرستی سے بچانے کا سبب بھی بنے، یہاں اختلاف رائے کا ذکر کرتے ہوئے درمیان میں قرآن کا یہ جملہ ہے وَكُنْهُمْ أَعْلَمُ بِهِمْ، یعنی ان کا رب ان کے حالات کو پوری طرح جانتا ہے، تفسیر بحر محیط میں اس جملے کے معنی میں دو احتمال ذکر کئے ہیں، ایک یہ کہ یہ قول انہی حاضرین اہل شہر کا ہو، کیونکہ ان کی وفات کے بعد جب ان کی یادگار بنانے کی رائے ہوئی تو جیسا عمومی یادگاری تعمیرات میں ان لوگوں کے نام اور خاص حالات کا کتبہ لگایا جاتا ہے جن کی یادگاریں تعمیر کی گئی ہے تو ان کے نسب اور حالات کے بارے میں مختلف گفتگو میں ہونے لگیں، جب کسی حقیقت پر نہ پہنچے تو خود انہوں نے ہی آخر میں عاجز ہو کر کہہ دیا، وَكُنْهُمْ أَعْلَمُ بِهِمْ اور یہ کہہ کر اصل کام یعنی یادگار بنانے کی طرف متوجہ ہو گئے، جو لوگ غالب تھے ان کی رائے مسجد بنانے کی ہو گئی۔

دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ یہ کلام حق تعالیٰ کی طرف سے ہے، جس میں اس زمانے کے باہم جھگڑا اور اختلاف کرنے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ جب تمہیں حقیقت کا علم نہیں، اور اس کے علم کے ذرائع بھی تمہارے پاس نہیں تو کیوں اس بحث میں وقت ضائع کرتے ہو، اور ممکن ہے کہ زمانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں یہود وغیرہ جو اس واقعہ میں اسی طرح کی بے اصل باتیں اور بحثیں کیا کرتے تھے، ان کو تنبیہ مقصود ہو، واللہ سبحانہ، وتعالیٰ اعلم

مسئلہ: اس واقعہ سے اتنا معلوم ہوا کہ اولیاء صلیحاء کی قبور کے پاس نماز کے لئے مسجد بنادینا کوئی گناہ نہیں، اور جس حدیث میں قبور انبیاء کو مسجد بنانے والوں پر لعنت کے الفاظ آئے ہیں، اس سے مراد خود قبور کو مسجد گاہ بنادینا ہے، جو باتفاق شرک حرام ہے (مظہری)

سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةٌ رَّآئِهِمْ كَلْبُهُمْ وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ

اب بھی کہیں گے وہ تین ہیں چوتھا ان کا کتا اور یہ بھی کہیں گے وہ پانچ ہیں چھٹا ان کا

کلبہم رجماً بالغيب وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ وَثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ

کتا بدون نشانہ دیکھے پتھر چلانا، اور یہ بھی کہیں گے وہ سات ہیں اور آٹھواں ان کا کتا،

قُلْ رَبِّيَ أَعْلَمُ بِعَدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا قَلِيلٌ فَلَا تَسَارِفْ فِيهِمْ

تو کہہ میرا رب خوب جانتا ہے ان کی گنتی، ان کی خبر نہیں رکھتے مگر غلطی سے لوگ، سو مت جھگڑو ان کی باتیں

الْأَمْرَ الظَّاهِرَ أَمْ لَا تَتَفَقَتُ فِيهِمْ مِنْهُمْ أَحَدًا ۝

مگر سرسری جھگڑا، اور مت تحقیق کر ان کا حال ان میں کسی سے۔

خلاصہ تفسیر

(جس وقت اصفا کہتا کہ قصہ بیان کریں گے تو) بعضے لوگ تو کہیں گے وہ تین ہیں چوتھا

ان کا کتا ہے اور بعضے کہیں گے کہ وہ پانچ ہیں چھٹا ان کا کتا ہے (اور) یہ لوگ بے تحقیق بات کو

ہانک رہے ہیں اور بعضے کہیں گے کہ وہ سات ہیں آٹھواں ان کا کتا ہے، آپ (ان اختلاف

کرنے والوں سے) کہہ دیجئے کہ میرا رب ان کی تعداد خوب (صحیح صحیح) جانتا ہے (کہ ان مختلف

اقوال میں کوئی قول صحیح بھی ہے یا سب غلط ہیں) ان (کی تعداد) کو (صحیح صحیح) بہت کم لوگ

جانتے ہیں اور چونکہ تعداد متعین کرنے میں کوئی خاص فائدہ نہیں تھا، اس لئے آیت میں کوئی صریح فیصلہ نہیں فرمایا، لیکن روایات میں حضرت ابن عباسؓ اور ابن مسعودؓ سے یہ منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا انما من القلیل کا نوا سبوحۃ یعنی میں بھی ان قلیل لوگوں میں داخل ہوں جن کے بارے میں قرآن نے فرمایا کہ کم لوگ جانتے ہیں وہ سناٹے تھے، لہذا فی الدر المنثور عن ابی حاتم وغیرہ، اور آیت میں بھی اس قول کی صحت کا اشارہ پایا جاتا ہے، کیونکہ اس قول کو نقل کر کے اس کو رد نہیں فرمایا، بخلاف پہلے دونوں قول کے کہ ان کے تردید میں رجحان الغیب فرمایا گیا ہے، واللہ اعلم سو اس پر بھی اگر وہ لوگ اختلاف سے باز نہ آویں تو آپ اس معاملہ میں سب سے سرسری بحث کے زیادہ بحث نہ کیجئے (یعنی مختصر طور پر تو ان کے خیالات کا رد قرآن کی آیات میں آہی چکا ہے جو رجحان الغیب، قل ربی اعلم سے بیان کر دیا گیا ہے، پس سرسری بحث یہی ہے کہ آپ پر اکتفاء کریں، ان کے اعتراض کے جواب میں اس سے زیادہ مشغول ہونا اور اپنے دعوے کے اثبات میں زیادہ کاوش کرنا مناسب نہیں کہ یہ بحث ہی کوئی خاص فائدہ نہیں رکھتی) اور آپ ان راویوں کو کہنے کے بارے میں ان لوگوں میں سے کسی سے بھی کچھ نہ پوچھتے جس طرح آپ کو ان کے اعتراض و جواب میں زیادہ کاوش سے منع کیا گیا، اسی طرح اس کی بھی ممانعت فرمادی کہ اب اس معاملہ کے متعلق کسی سے سوال یا تحقیق کریں، کیونکہ جتنی بات ضروری تھی وہ وحی میں آگئی غیر ضروری سوالات اور تحقیقات شان انبیاء کے خلاف ہے)۔

معارف و مسائل

اختلافی جھڑوں میں سَیْقُوْثُوْنَ، یعنی وہ لوگ کہیں گے، وہ کہنے والے کون لوگ ہیں، اس میں دو گھٹنگو کے آداب احتمال ہیں، ایک یہ کہ مراد ان سے وہی لوگ ہوں جن کا باہم اختلاف صحابہؓ کے زمانے میں ان کے نام و نسب وغیرہ کے متعلق ہوا تھا جس کا ذکر اس سے پہلی آیت میں آیا ہے، انہی لوگوں میں سے بعض نے عدد کے متعلق پہلا بعض نے دوسرا بعض نے تیسرا قول اختیار کیا تھا۔
رذکرہ فی البحر عن الماوردی

اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ سَیْقُوْثُوْنَ کی ضمیر نصاریٰ خیران کی طرف عائد ہو، جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی تعداد کے بارے میں مناظرہ کیا تھا، ان کے تین فرقے تھے ایک فرقہ ملکانیہ کے نام سے موسوم تھا، اس نے تعداد کے متعلق پہلا قول کہا، یعنی تین کا عدد بتلایا، دوسرا فرقہ یعقوبیہ تھا، اس نے دوسرا قول یعنی پانچ ہونا اختیار کیا، تیسرا فرقہ نسطوریہ تھا اس نے تیسرا قول کہا کہ سات تھے، اور بعض نے کہا کہ یہ تیسرا قول مسلمانوں کا تھا، اور بالآخر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر اور قرآن کے اشارے سے تیسرے قول کا صحیح ہونا معلوم ہوا (جو ضبط) وَتَا مِّنْهُمْ، یہاں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ اس جگہ اصحاب کہف کی اعداد میں تین قول نقل کئے گئے ہیں، تین، پانچ، سات، اور ہر ایک کے بعد ان کے کتے کو شمار کیا گیا ہے، لیکن پہلے دو قول میں ان کی تعداد اور کتے کے شمار میں واؤ عاطفہ نہیں لایا گیا، ثَلَاثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ اور خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ بلا واؤ عاطفہ کے آیا، اور تیسرے قول میں سَبْعَةٌ کے بعد واؤ عاطفہ کے ساتھ وَتَا مِّنْهُمْ كَلْبُهُمْ فرمایا۔

اس کی وجہ حضرات مفسرین نے یہ لکھی ہے کہ عرب کے لوگوں میں عدد کی پہلی گزہ سات ہی ہوتی تھی، سات کے بعد جو عدد آتے وہ الگ سا شمار ہوتا تھا، جیسا کہ آجکل نو کا عدد اس کے قائم مقام ہے کہ نو تک اکائی ہے، دس سے وہائی شروع ہوتی ہے، ایک لگ سا عدد ہوتا ہے اسی لئے تین سے لے کر سات تک جو تعداد شمار کرتے تو اس میں واؤ عاطفہ نہیں لاتے تھے سات کے بعد کوئی عدد بتلانا ہوتا تو واؤ عاطفہ کے ساتھ الگ کر کے بتلاتے تھے، اور اسی لئے اس واؤ کو داؤ ثمان کا لقب دیا جاتا تھا (مظہری وغیرہ)

اصحاب کہف | اس بات کو یہ ہے کہ کسی صحیح حدیث سے اصحاب کہف کے نام صحیح صحیح ثابت نہیں، تفسیری اور تاریخی روایات میں نام مختلف بیان کئے گئے ہیں، ان میں اقرب وہ روایت ہے جس کو طبرانی نے مجمع اوسط میں بسند صحیح حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ اُن کے نام یہ تھے:-

مَكْسَلَمِينَا، تَمِيْلِيْحَا، مَرْطُوْنُس، سَدْرُس، سَارِيْنُوْس، ذُوْنُوْس،
كَعْسَطَطِيُوْس

فَلَا تُشَارِ فِيْهِمْ اِلَّا بِرَأْءِ ظَاهِرٍ اَمْسُوْلَا تَسْتَشِيْطُ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا یعنی آپ اصحاب کہف کی تعداد وغیرہ کے متعلق ان کے ساتھ بحث و مباحثہ میں کاوش نہ کریں، بلکہ سرسری بحث فرمادیں، اور ان لوگوں سے آپ خود بھی کوئی سوال اس کے متعلق نہ کریں۔

اختلافی معاملات میں طریق | ان دونوں جملوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تعالیم دی گئی بحثوں سے اجتناب کیا جائے، یہ وہ درحقیقت علماء اہل سنت کے لئے اہم رہنما اصول ہیں، کہ جب کسی مسئلہ میں اختلاف پیش آئے تو جس قدر ضروری بات ہے اس کو واضح کر کے بیان کر دیا جائے اس کے بعد بھی لوگ غیر ضروری بحث میں اُلجھیں تو ان کے ساتھ سرسری گفتگو کر کے بحث ختم کر دی جائے، اپنے دعوے کے اثبات میں کاوش اور ان کی بات کی تردید میں بہت زور لگانے سے گریز کیا جائے کہ اس کا کوئی خاص فائدہ تو ہے نہیں، مزید بحث و تکرار میں وقت

کی اصناعت بھی ہے اور باہم تلخی پیدا ہونے کا خطرہ بھی۔

دوسری ہدایت دوسرے جملے میں یہ دی گئی ہے کہ وحی الہی کے ذریعہ سے قصہ اصحاب کہف کی جتنی معلومات آپ کو دیدی گئی ہیں ان پر قناعت فرمادیں کہ وہ بالکل کافی ہیں، زائد کی تحقیقات اور لوگوں سے سوال وغیرہ میں نہ پڑیں، اور دوسروں سے سوالات کا ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی چہالت یا ناواقفیت ظاہر کرنے اور ان کو رسوا کرنے کے لئے سوال کیا جا رہا ہے یہ بھی اخلاق انبیاء کے خلاف ہے، اس لئے دوسرے لوگوں سے دونوں طرح کے سوال کرنا ممنوع کر دیا گیا، یعنی تحقیق مزید کے لئے ہو یا مخاطب کی تہلیل و رسوائی کے لئے ہو۔

وَلَا تَقُولَنَّ لِشَايٍ اِنِّي فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۝۲۳ اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ

اور نہ کہنا کسی کام کو کہ میں کروں گا کل ، مگر یہ کہ اللہ چاہے

وَ اِذْ كُرِّرَتْ بَكَ اِذَا نَسِيتَ وَقُلْ عَسٰى اَنْ يَّهْدِيَنِي رَّبِّيْ لَا قَرْبَ

اور یاد کر لے اپنے رب کو جب بھول جاتے اور کہہ امید ہو کہ میرا رب مجھ کو دکھائے اس سے زیادہ

مِنْ هٰذَا اَرْشٰدًا ۝۲۴ وَ لِيَتَّوَفٰى كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِاٰتٍ سِنِيْنَ

نزدیک راہ نیکی کی ، اور مدت گذری ان پر اپنی کھوہ میں تین سو برس

وَ اِنْ رَّادَّا دُوَابَّ السَّعٰۤاءِ ۝۲۵ قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لِيَسْتَوٰۤا جَلَدُ غِيَبِ السَّمٰوٰتِ

اور ان کے اوپر نو ۔ تو کہہ اللہ خوب جانتا ہے جتنی مدت ان پر گذری اسی کے پاس ہیں چھپے

وَالْاَرْضِ مِنْ اَبْصَارِهِمْ ۝۲۶ مَا لَهُمْ مِنْ دُوْنِهِ مِنْ وَّلِيٍّ ۝۲۷

بھید آسمان اور زمین کے ، کیا عجیب دیکھتا ہے اور سنتا ہے، کوئی نہیں بندوں پر اس کے سوائے مختار ،

وَلَا يَشْرِكُ فِيْ حُكْمِهِ اَحَدًا ۝۲۸

اور نہیں شریک کرتا اپنے حکم میں کسی کو۔

خلاصہ تفسیر

راہ را اگر لوگ آپ سے کوئی بات قابل جواب دریافت کریں اور آپ جواب کا وعدہ کریں تو اس کے ساتھ انشاء اللہ تعالیٰ یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ ضرور ملا لیا کریں، بلکہ وعدہ کی بھی تخصیص نہیں، ہر ہر کام میں اس کا لحاظ رکھئے کہ آپ کسی کام کی نسبت یوں نہ کہا کیجئے کہ میں

اس کو (مثلاً) کل کردوں گا مگر خدا کے چاہنے کو اس کے ساتھ ملا دیا کیجئے (یعنی انشاء اللہ وغیرہ بھی ساتھ کہہ دیا کیجئے) اور آئندہ ایسا نہ ہو جیسا اس واقعہ میں پیش آیا کہ آپ سے لوگوں نے ردح اور اصحاب کہف اور ذوالعترین کے متعلق سوالات کئے، آپ نے بغیر انشاء اللہ کہے ان سے کس جواب دینے کا وعدہ کر لیا، پھر پندرہ روز تک وحی نازل نہ ہوئی، اور آپ کو بڑا غم ہوا، اس ہدایت کے ساتھ ان لوگوں کے سوال کا جواب بھی نازل ہوا (کذا فی اللباب عن ابن عباسؓ) اور جب آپ (اتفاقاً انشاء اللہ کہنا) بھول جاویں (اور پھر کبھی یاد آوے) تو اسی وقت انشاء اللہ کہہ کر اپنے رب کا ذکر کر لیا کیجئے اور ان لوگوں سے یہ بھی (کہہ دیجئے) کہ مجھ کو امید ہے کہ میرا رب مجھ کو نبوت کی دلیل بننے کے اعتبار سے) اس (قصہ) سے بھی نزدیک تر بات بتلائے (مطلب یہ ہے کہ تم نے میری نبوت کا امتحان لینے کے لئے اصحاب کہف وغیرہ کے قصے دریافت کئے، جو اللہ تعالیٰ نے بندہ رحیم وحی مجھے بتلا کر تمہارا اطمینان کر دیا، مگر اصل بات یہ ہے کہ ان قصوں کے سوال و جواب اثبات نبوت کے لئے کوئی بہت بڑی دلیل نہیں ہو سکتی، یہ کام تو کوئی غیر نبی بھی جو تاریخ عالم سے زیادہ واقف ہودہ بھی کر سکتا ہے، مگر مجھے تو اللہ تعالیٰ نے میری نبوت کے اثبات کے لئے اس سے بھی بڑے قطعی دلائل اور تجزات عطا فرمائے ہیں، جن میں سب بڑی دلیل تو خود قرآن ہے، جس کی ایک آیت کی بھی ساری دنیا مل کر نقل نہیں اتار سکی۔

اس کے علاوہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک کے وہ واقعات بذریعہ وحی مجھے بتلا دیئے گئے ہیں جو زمانے کے اعتبار سے بھی بہ نسبت واقعہ اصحاب کہف و ذوالعترین کے زیادہ بعید ہیں، اور ان کا علم بھی کسی کے لئے بجز وحی کے ممکن نہیں ہو سکتا، خلاصہ یہ ہو کہ تم نے تو اصحاب کہف اور ذوالعترین کے واقعات کو سب سے زیادہ عجیب سمجھ کر اسی کو امتحان نبوت کے سوال میں پیش کیا، مگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے بھی زیادہ عجیب عجیب چیزوں کے علوم عطا فرمائے ہیں) اور جیسا اختلاف ان لوگوں کا اصحاب کہف کے عدد میں ہے، ایسا ہی ان کے سوتے رہنے کی مدت میں بھی بہت اختلاف ہے، ہم اس میں صحیح بات بتلاتے ہیں کہ وہ لوگ اپنے غار میں زندگی کی حالت میں (تین سو برس تک رہے اور نو برس اوپر اور رہے) اور اگر اس صحیح بات کو سن کر بھی وہ اختلاف کرتے رہیں تو آپ کہہ دیجئے کہ خدا تعالیٰ انکے (سو قہم) نبی کی مدت کو (تو تم سے) زیادہ جانتا ہو اس لئے جو اس نے بتلا دیا وہی صحیح ہو اور اس واقعہ کی کیا تخصیص اس کی شان تو یہ ہو کہ تمام آسمانوں اور زمین کا علم غیب اسی کو ہو وہ کیسا کچھ دیکھنے والا کیسا کچھ سننے والا ہو، ان کا خدا کے سوا کوئی بھی مددگار نہیں اور نہ اللہ کسی کو اپنے حکم میں شریک رکھتا ہو (خلاصہ یہ ہو کہ نہ اس کا کوئی مزاہم ہو نہ شریک، ایسی ذات عظیم کی مخالفت سے بہت ڈرنا چاہئے)۔

معارف و مسائل

مذکورہ قصہ پر چار آیتوں پر قصہ اصحاب کہف ختم ہو رہا ہے، ان میں سے پہلی دو آیتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ آئندہ زمانے میں کسی کام کے کرنے کا وعدہ یا اقرار کرنا ہو تو اس کے ساتھ انشاء اللہ تعالیٰ کا کلمہ ملا لیا کرو، کیونکہ آئندہ کا حال کس کو معلوم ہے کہ زندہ بھی رہے گا یا نہیں، اور زندہ بھی رہا تو یہ کام کر کے گا یا نہیں، اس لئے مومن کو چاہئے کہ اللہ پر بھروسہ دل میں بھی کرے اور زبان سے اس کا اقرار کرے کہ اگلے دن میں کسی کام کے کرنے کو کہے تو یوں کہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو میں یہ کام کر دوں گا، یہی حقیقتیں کلمہ انشاء اللہ کے۔

تیسری آیت میں اس اختلافی بحث کا فیصلہ کیا گیا ہے جس میں زمانہ اصحاب کہف کے لوگوں کی رائیں بھی مختلف تھیں، اور موجودہ زمانے کے یہود و نصاریٰ کے اقوال بھی مختلف تھے یعنی غار میں سوتے رہنے کی مدت، اس آیت میں بتلادیا گیا کہ وہ تین سو نو سال تھے، گویا یہ اس حال کا بیان جو شروع قصہ میں بیان ہوا تھا، فَضَرَبْنَا عَلَىٰ اِذْنِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَدًا۔ اس کے بعد چوتھی آیت میں پھر اس سے اختلاف کرنے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ حقیقت حال کی تم کو خبر نہیں، اس کا جاننے والا وہی اللہ تعالیٰ ہے جو آسمانوں اور زمین کے سب غائبات کو جاننے والا وسیع و بصیر ہے، اس نے جو مدت تین سو نو سال کی بتلادی اس پر مطمئن ہو جانا چاہئے۔ آئندہ کام کرنے پر | باب میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے پہلی دو آیتوں کے شان نزول کے متعلق انشاء اللہ کہنا | یہ نقل کیا ہے کہ جب اہل مکہ نے یہود کی تعلیم کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قصہ اصحاب کہف وغیرہ کے متعلق سوال کیا تو آپ نے ان سے کھل جواب دینے کا وعدہ بغیر انشاء اللہ کہے ہوئے کر لیا تھا، معتربین بارگاہ کی ادنیٰ سی کوتاہی پر تنبیہ ہو ا کرتی ہے، اس لئے پندرہ روز تک وحی نہ آئی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو برا غم ہوا، اور مشرکین مکہ کو ہنسنے اور مذاق اڑانے کا موقع ملا، پندرہ روز کے اس وقفہ کے بعد جب اس سورۃ میں سوالات کا جواب نازل ہوا تو اس کے ساتھ ہی یہ دو آیتیں ہر ایت دینے کے لئے نازل ہوئیں کہ آئندہ کسی کام کے کرنے کو کہنا ہو تو انشاء اللہ کہہ کر اس کا اقرار کر لیا کریں کہ ہر کام اللہ تعالیٰ کے ارادے اور مشیت پر موقوف ہے، ان دونوں آیتوں کو قصہ اصحاب کہف کے ختم پر لایا گیا ہے۔

مسئلہ: اس آیت سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ ایسی صورت میں انشاء اللہ کہنا مستحب ہے، دوسرے یہ معلوم ہوا کہ اگر بھولے سے یہ کلمہ کہنے سے رہ جائے تو جب یاد آئے اسی وقت کہہ لے

یہ حکم اس شخص سے معاملہ کے لئے ہے جس کے متعلق یہ آیات نازل ہوئی ہیں، یعنی بعض نبر کے۔ اور اقرار عہدیت کے لئے یہ کلمہ کہنا مقصود ہوتا ہے، کوئی تعلیق اور شرط لگانا مقصود نہیں ہوتا اس لئے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ معاملات بیع و شراء اور معاہدات میں جہاں شرطیں لگائی جاتی ہیں، اور شرط لگانا طرفین کے لئے معاہدہ کا مدار ہوتا ہے وہاں بھی اگر معاہدہ کے وقت کوئی شرط لگانا بھول جائے تو پھر کبھی جب یاد آجائے جو چاہے شرط لگائے، اس مسئلے میں بعض فقہاء اختلاف بھی ہے جس کی تفصیل کتب فقہ میں ہے۔

تیسری آیت میں جو غار میں سونے کی مدت تین سو نو سال بتلائے ہیں، ظاہر نسق قرآن سے یہی ہے کہ یہ بیان مدت حق تعالیٰ کی طرف سے ہے، ابن کثیر نے اسی کو جمہور مفسرین سلف و خلف کا قول قرار دیا ہے، ابو حیان اور قرطبی وغیرہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے، مگر حضرت قتادہ وغیرہ سے اس میں ایک دوسرا قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ یہ تین سو نو سال کا قول بھی انہی اختلاف کرنے والوں میں سے بعض کا قول ہے، اور اللہ تعالیٰ کا قول صرف وہ ہے جو بعد میں فرمایا یعنی اللَّهُ أَكْلَمُ بِمَا لَبِثُوا، کیونکہ پہلا قول تین سو نو کے متعین کرنے کا اگر اللہ کا کلام ہوتا تو اس کے بعد اللَّهُ أَكْلَمُ بِمَا لَبِثُوا کہنے کا موقع نہ تھا، مگر جمہور مفسرین نے فرمایا کہ یہ دونوں جملے حق تعالیٰ کا کلام ہیں، پہلے میں حقیقت واقعہ کا بیان ہے اور دوسرے میں اس سے اختلاف کرنے والوں کو تنبیہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدت کا بیان آگیا تو اب اس کو تسلیم کرنا لازم ہے، وہی جاننے والا ہے، محض تخمینوں اور رایوں سے اس کی مخالفت بے عقلی ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے بیان مدت میں پہلے تین سو سال بیان کئے اس کے بعد فرمایا کہ ان تین سو پر نو اور زیادہ ہو گئے، پہلے ہی تین سو نو نہیں فرمایا اس کا سبب حضرات مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ یہود و نصاریٰ میں چونکہ شمسی سال کا رواج تھا اس کے حساب سے تین سو سال ہی ہوتے ہیں، اور اسلام میں رواج قمری سال کا ہے اور قمری حساب میں ہر سال پر تین سال بڑھ جاتے ہیں، اس لئے تین سو سال شمسی پر قمری حساب سے نو سال مزید ہو گئے، ان دونوں سالوں کا مستیاز بتانے کے لئے عنوان تعبیر یہ اختیار کیا گیا۔ ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اصحاب کہف کے معاملے میں خود ان کے زمانے میں، پھر عہد نبوی کے اندر یہود و نصاریٰ میں نہایتیں زیر اختلاف تھیں ایک اصحاب کہف کی تعداد دوسری غار میں ان کے سوتے رہنے کی مدت، قرآن نے ان دونوں کو بیان تو کر دیا، مگر اس فرق کے ساتھ کہ تعداد کا بیان صریح الفاظ میں نہیں آیا، اشارے کے طور پر آیا، کہ جو قول صحیح تھا اس کی تردید نہیں کی، اور مدت کی تعین کو صاف و صریح الفاظ میں بتلایا لَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ مِائَةٍ

سِنِينَ وَانْدَادًا وَاتَّخَذَ دَجْرِيہُ کہ قرآن نے اپنے اس اسلوب سے اس طرف اشارہ فرمایا کہ تعداد کی بحث تو بالکل ہی فضول ہے، اس سے کسی دینیوی دینی مسئلہ کا تعلق نہیں، البتہ موت و راز تک خلافت عادت انسانی سوتے رہنا اور بغیر غلام کے بیچ تندرست رہنا پھر اتنے عرصہ کے بعد صحت مند اور قوی اٹھ کر بیٹھ جانا ایک نظیر خیر و شر کی ہے، اس سے مسئلہ قیامت و آخرت پر استدلال ہو سکتا ہے، اس لئے اس کو بصراحت بیان کر دیا۔

یہ لوگ ہجرات اور خواری عادات کے یا منکر ہیں یا کم از کم آجکل کے مستشرقین یہودی نصاریٰ کے اعتراضات سے مرعوب ہو کر ان میں تاویلیں کر رہے ہو گئے ہیں انہوں نے اس آیت میں بھی حضرت قتادہ کی تفسیر کو سہارا لے کر تین سو نو سال کی مدت اپنی لوگوں کا قول قرار دے کر رد کرنا چاہا ہے، مگر اس پر غور نہیں کیا کہ قرآن کے ابتدائی جملے میں جو لفظ سِنِينَ عَدَدًا کا آیا ہے اس کو تو سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی قول نہیں کہا جکتا، خرق عادت اور کرامت کے ثبوت کے لئے اتنا بھی کافی ہے کہ ساہا سال کوئی سوتا رہے اور پھر صبح تندرست زندہ اٹھ کر بیٹھ جائے، واللہ اعلم

وَاتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ قَدْ

اور پڑھ جو وحی ہوئی تجھ کو تیرے رب کی کتاب سے کوئی بدلنے والا نہیں اس کی باتیں

وَلَكِنْ تَجِدَ مَنْ مِّلَتْ حِدَا ۝۲۵ وَأَصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِينَ

اور کہیں نہ پائے گا تو اس کے سوائے چھپنے کو جگہ اور دے دے اپنے آپ کو ان کے ساتھ

يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغُلُوقِ وَالْعِشِيِّ يَرْجُونَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ

جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح اور شام طالب ہیں اس کے منہ کے اور نہ دور ہیں

عَيْنِكَ عَنْهُمْ ۝ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تَطْعَمُ مَنْ

تیری آنکھیں انکو چھوڑ کر تلاش میں رونق زندگانی دنیا کی اور نہ کہا مان اس کا

أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِ نَاوَاتَّبَعُ حَوْبَهُ وَكَانَ أَمْرًا فُرْطًا ۝۲۶

جس کا دل غافل کیا ہم نے اپنی یاد سے اور پھر پڑا ہوا اپنی خواہش کے اور اس کا نام جو حدیر نہ رہنا

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّکُمْ فَسَنُشَاءُ فَسَيُؤْمِنُ مَنْ شَاءَ وَمَنْ شَاءَ

اور کہہ سچی بات کہ تمہارے رب کی طرف سے پھر جو کوئی چاہے مانے اور جو کوئی چاہے

فَذِيْكَ كُفْرًا وَاِنَّا اَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِيْنَ نَارًا وَاَحَاطَ بِهٖمُ سَرَادِقُهَا وَاِنَّا

نے دھانے ہم نے تیار کر رکھی ہر گنہگاروں کے واسطے آگ کہ گھیر رہی ہیں ان کو اس کی قفاتیں ، اور اگر

لَا يَسْتَغِيْثُوْا اِيْغَاثًا وَاَبْسَاءً كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ طَبَسَ الشَّرَابُ

فریاد کریں گے تو نلے گا پانی جیسے پیپ بھون ڈالے لہٰذا کو ، کیا بُرا پینا ہے ،

وَسَاءَتْ مُرْتَفَقًا وَاِنَّا اِلَیْهِمْ اَوْعٰیوْا وَاَعْمَلُوْا الصَّٰلِحٰتِ اِنَّا

اور کیا بُرا آرام ، بیشک جو لوگ یقین لاتے اور کریں نیکیاں ، ہم

لَا نُضِیْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنَّتٌ عَدْنٌ

نہیں کھرتے بدلہ اس کا جس نے بھلا کیا ہم ، ایسوں کے واسطے باغ ہیں بننے کے

تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِہٖمُ الْاَنْهَارُ یَعْلَوْنَ فِیْہَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَّہَبٍ

بہتی ہیں ان کے نیچے نہریں پہناتے جائیں گے ان کو دہاں کشتیں سونے کے ،

وَيَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خَضْرًا مِنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِیْنَ

اور پہنیں گے کپڑے سبز باریک اور گاڑھے ریشم کے تکیہ لگاتے ہوئے

فِیْ رَسَاوٰی اِلَیْہِمْ نَعْمَ الثَّوَابُ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا (۳۱)

ان میں تختوں پر ، کیا خوب بدلہ ہے اور کیا خوب آرام ۔

خلاصہ تفسیر

اور آپ کا کام صرف اس قدر ہے کہ آپ کے پاس جو آپ کے رب کی کتاب وحی کے ذریعہ
آئی ہے وہ لوگوں کے سامنے پڑھ دیا کیجئے اس سے زیادہ اس کی فکر میں نہ پڑیں کہ دنیا کے
بڑے لوگ اگر اسلام کی مخالفت کرتے رہے تو دین کو ترقی کس طرح ہوگی ، کیونکہ اس کا اللہ تعالیٰ
نے خود وعدہ فرمایا ہے اور اس کی باتوں کو اپنی وعدوں کو کوئی نہیں بدل سکتا یعنی ساری دنیا
کے مخالفت بھی مل کر اللہ کو وعدہ پورا کرنے سے نہیں روک سکتے اور اللہ تعالیٰ خود اگرچہ تبدیلی پر
قدرت رکھتے ہیں مگر وہ تبدیل نہیں کریں گے ، اور اگر آپ نے ان بڑے لوگوں کی دل جوئی اس
طرح کی جس سے احکام الہیہ ترک ہو جاویں تو پھر آپ خدا کے سوا کوئی پناہ نہ پاویں گے اگرچہ
احکام الہیہ کا ترک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بدلائل شرعیہ محال ہے ، یہاں وبالغہ اور تاکید

کے لئے بے فائدہ مال یہ کہا گیا ہے اور جیسا کہ کفار کے امیروں اور رئیسوں سے آپ کو مستثنیٰ رہنے کا حکم دیا گیا ہے اسی طرح فقراء و سلبین کے حال پر نیز یہ توجہ کا آپ کو حکم ہے پس آپ اپنے کو ان لوگوں کے ساتھ رہنے میں، مقید رکھا کیجئے جو صبح و شام (یعنی علی الدوام) اپنے رب کی عبادت و محض اس کی رضا جوئی کے لئے کرتے ہیں (کوئی شرف و نیویں نہیں) اور دنیوی زندگی کی رونق کے خیال سے آپ کی آنکھیں (یعنی توجہات) ان سے ہٹنے نہ پاویں (رونی دنیا کے خیال سے مراد یہ ہے کہ رئیس لوگ مسلمان ہو جاویں تو اسلام کی رونق بڑھے گی، اس آیت میں بتلادیا گیا کہ اسلام کی رونق مال و متاع سے نہیں بلکہ حسن اخلاق و اطاعت سے ہے وہ غریب فقیر لوگوں میں ہو تو بھی رونق اسلام کی بڑھے گی) اور ایسے شخص کا کہنا (غریبوں کو مجلس سے ہٹا دینے کے متعلق) نہ مانئے جس کے قلب کو ہم نے (اس کے عباد کی سزا میں) اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے اور وہ اپنی نفسانی خواہش پر چلتا ہو اور اس کا یہ حال (یعنی اتباعِ ہوا سے) حد سے گزر گیا ہے اور آپ (ان رؤساء کفار سے صاف) کہہ دیجئے کہ (یہ دین) حق تمھارے رب کی طرف سے (آیا) ہے، سو جس کا جی چاہے ایمان لاوے اور جس کا جی چاہے کافر رہے ہمارا کوئی نفع نقصان نہیں، بلکہ نفع نقصان خود اس کا ہے جس کا بیان یہ ہے کہ) بیشک ہم نے ایسے ظالموں کے لئے (دوزخ کی) آگ تیار کر رکھی ہے کہ اس آگ کی قناتیں ان کو گھیرے ہوں گی (یعنی وہ قناتیں بھی آگ ہی کی ہیں، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ یہ لوگ اس گھر سے نہ نکل سکیں گے) اور اگر (پاس سے) فریاد کریں گے تو ایسے پانی سے ان کی فریاد رسی کی جاوے گی جو (مکرہ صورت ہونے میں تو) تیل کی پمپ کی طرح ہوگا (اور تیز گرم ایسا ہوگا کہ پاس لاتے ہی) مونہوں کو بجھون ڈالے گا (یہاں تک کہ چہرے کی کھال اتر کر گر پڑے گی جیسا کہ حدیث میں ہے) کیا ہی بُرا پانی ہوگا اور وہ دوزخ بھی کیا ہی بُری جگہ ہوگی (یہ تو ایمان نہ لانے کا ضرر ہوا، اور ایمان لانے کا نفع یہ ہے کہ) بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کئے تو ہم ایسوں کا اجر ضائع نہ کریں گے جو اچھی طرح کام کو کرے، ایسے لوگوں کے لئے ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں ان کے (مساکن کے نیچے) نہریں بہتی ہوں گی ان کو وہاں سونے کے کنگن پہنا دیے جائیں گے اور سبز رنگ کے کپڑے باریک اور دبیز ریشم کے پہنائیں گے (اور) وہاں مہربوں پر مٹکے لگائے بیٹھے ہوں گے، کیا ہی اچھا صلہ ہے اور (جنت) کیا ہی اچھی جگہ ہے :

معارف و مسائل

دعوت و تبلیغ کے | وَاصْبِرْ نَفْسَکَ، اس آیت کے شان نزول میں چند واقعات مذکور ہیں جو بحثِ خاصِ آداب | ہے کہ وہ سب ہی اس ارشاد کا سبب بنے ہوں، بغویؒ نے نقل کیا ہے کہ

عِیْسٰی بن مریم مسزاری ملک کا رئیس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ کے پاس حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے جو فقرا و صحابہ میں سے تھے، ان کا لباس خستہ اور صیبت فقیرانہ تھی اور بھی اسی طرح کے کچھ فقرا و غریب باطنج میں تھے، عِیْسٰی نے کہا کہ میں آپ کے پاس آنے اور آپ کی بات سننے سے ہیں لوگ مانع ہیں، ایسے خستہ حال لوگوں کے پاس ہم نہیں بیٹھ سکتے، آپ ان کو اپنی مجلس سے ہٹا دیں، یا کم از کم ہمارے لئے علیحدہ مجلس بنادیں اور ان کے لئے الگ۔

ابن مردودہ نے بروایت ابن عباسؓ نقل کیا ہے کہ امیر بن خلف بھی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مشورہ دیا کہ غریب فقیر شکستہ حال مسلمانوں کو آپ اپنے قریب نہ رکھیں بلکہ مکہ اور قریش کے سرداروں کے ساتھ لگائیں، یہ لوگ آپ کا دین قبول کر لیں گے تو دین کو ترقی ہوگی۔ اس طرح کے واقعات پر یہ ارشادِ ربانی نازل ہوا، جس میں ان کا مشورہ قبول کرنے سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا، اور نصرت یہی نہیں کہ ان کو اپنی مجلس سے ہٹائیں نہیں، بلکہ حکم یہ دیا گیا کہ **وَاصْبِرْ لِنَفْسِكَ**، یعنی آپ اپنے نفس کو ان لوگوں کے ساتھ باندھ کر رکھیں، اس کا یہ غم و غم نہیں کہ کسی وقت جدا نہ ہوں، بلکہ مراد یہ ہے کہ تعلقات اور توجہات سب ان لوگوں کے ساتھ وابستہ رہیں، معاملات میں اپنی سے مشورہ لیں، اپنی کی امداد و اعانت سے کام کریں، اور اس کی وجہ اور نکتہ ان الفاظ سے بتلا دی گئی کہ یہ لوگ صبح شام یعنی ہر حال میں اللہ کو پجارتے اور اسی کا ذکر کرتے ہیں، ان کا جو عمل ہے وہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے ہے، اور یہ سب حالات وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نصرت و امداد کو کھینچتے ہیں، اللہ کی مدد ایسے ہی لوگوں کے لئے آیا کرتی ہے، چند روز کی کس پیرسی سے گھبراتیں نہیں، انجام کار فتح و نصرت اپنی کو حاصل ہوگی۔

اور رؤساءِ مشریش کا مشورہ قبول کرنے کی ممانعت کتنی بھی آخر آیات میں یہ بتلائی کہ ان کے دل اللہ کی یاد سے غافل ہیں اور ان کے سب کام اپنی نفسانی خواہشات کے تابع ہیں، اور یہ حالات اللہ تعالیٰ کی رحمت و نصرت سے ان کو دور کرنے والے ہیں۔

یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ ان کا یہ مشورہ تو قابلِ عمل تھا کہ ان کے لئے ایک مجلس علیحدہ کر دی جاتی، تاکہ ان کو اسلام کی دعوت پہنچانے میں اور ان لوگوں کو قبول کرنے میں سہولت ہوتی، مگر اس طرح کی تقسیم میں سرکش مالداروں کا ایک خاص اعزاز تھا، جس سے غریب مسلمانوں کی دشمنی یا حوصلہ شکنی ہو سکتی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس کو گوارا نہ فرمایا، اور اصول دعوت و تبلیغ یہی مترادف رہا کہ اس میں کسی کا کوئی امتیاز نہ ہونا چاہئے، واللہ اعلم اہل جنت کے لئے زیور **يُحَلِّوْنَ فِيهَا**، اس آیت میں اہل جنت مردوں کو بھی سونے کے کنگن پہنانے کا ذکر ہے، اس پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ زیور پہننا تو مردوں کے لئے نہ لایا ہے، نہ کوئی

جمال اور زینت، جنت میں اگر ان کو کنگن پہنائے گئے تو وہ ان کو بدہیئت کر دیں گے۔
جواب یہ ہے کہ زینت و جمال عرف و رواج کے تابع ہے، ایک ملک اور خطے میں جو چیز زینت و جمال سمجھی جاتی ہے دوسرے ملکوں اور خطوں میں بسا اوقات وہ قابل نفرت قرار دی جاتی ہے، اور ایسا ہی اس کے برعکس بھی ہے، اسی طرح ایک زمانہ میں ایک خاص چیز زینت ہوتی ہے دوسرے زمانے میں وہ عیب ہو جاتا ہے، جنت میں مردوں کے لئے بھی زیور اور ریشمی کپڑے زینت جمال قرار دیئے جائیں گے تو وہاں اس سے کسی کو اجنبیت کا احساس نہ ہوگا، یہ صرف دنیا کا قانون ہے، کہ یہاں مردوں کو سونے کا کوئی زیور یہاں تک کہ انگوٹھی اور گھڑی کی چین بھی سونے کی استعمال کرنا جائز نہیں، اسی طرح ریشمی کپڑے مردوں کے لئے جائز نہیں، جنت کا یہ قانون ہوگا وہ اس سارے جہان سے الگ ایک عالم ہے اس کو اس بناء پر کسی چیز میں بھی قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

وَاضْرِبْ لَهُم مِّثْلًا مِّنْ أَشْجَلٍ جَعَلْنَا لَاحِدٍ هُمَا جَنَّتَيْنِ مِّنْ أَعْنَابٍ

اور بتلا ان کو مثل دو مردوں کی کر دو گرجم نے ان میں سے ایک کیلئے درباغ انگور کے
وَخَفَقْنَا لَهُم مِّنْ ثَمَرِهِمَا نَخْلًا مِّثْلًا مِّنْ أَشْجَلٍ جَعَلْنَا بَيْنَهُمَا سَرَرًا ۝۳۲

اور گردان کے کھجوریں اور رکھی دونوں کے بیچ میں کھیتی، دونوں باغ لاتے ہیں اپنا
أَكْلَهُمَا وَلَمْ نَظْلِمْ مِنْهُ شَيْئًا وَفَجَّرْنَا خِلَافَهُمَا نَهْرًا ۝۳۳ وَكَانَ

میوہ اور نہیں کھاتے اس میں سے کچھ اور بہادی ہم نے ان دونوں کے بیچ نہر، اور ملا
لَهُ شَرَجٌ فَقَالَ لِصَاحِبِهِ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَنَا أَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَ

اس کو پھل بہر بولا اپنے ساتھی سے جب باتیں کرنے لگا اس سے میرے پاس زیادہ ہو تجھ سے مال اور
أَعَزُّ نَفَرًا ۝۳۴ وَدَخَلَ جَنَّتَهُ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ قَالَ مَا أَظُنُّ

آبرو کے لوگ، اور گیا اپنے باغ میں اور وہ بڑا کر رہا تھا اپنی جان پر بولا نہیں آتا مجھ کو دنیا
أَنْ تَبِيدَ هَذِهِ أَبَدًا ۝۳۵ وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً وَلَئِنْ

کو خراب ہوئے یہ باغ کبھی، اور نہیں خیال کرتا ہوں کہ قیامت ہونی والی ہے، اور اگر کبھی
رُدِّدْتُ إِلَىٰ رَبِّي لَأَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ۝۳۶ قَالَ لَهُ صَاحِبُهُ

پہنچا دیا گیا میں اپنے رب کے پاس پاؤں گا بہتر اس سے وہاں پہنچ کر، کہا اس کو دوسرے نے

وَهُوَ يَخْأُوذُكَ أَكْثَرْتَ بِالَّذِي خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ

جب بات کرنے لگا تو منکر ہو گیا اس سے جس نے پیدا کیا تجھ کو مٹی سے پھر قطرہ سے

ثُمَّ سَوَّاهُ رَجُلًا ۝ لَكِنَّا هُوَ اللَّهُ رَبِّيُّ وَلَا أَشْرِكُ بِرَبِّي أَحَدًا ۝

پھر پورا کر دیا تجھ کو مرد ، پھر میں تو یہی کہتا ہوں وہی اللہ میرا رب ، اور نہیں مانتا شریک پروردگار کا کسی کو

وَلَوْلَا إِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَاءَ اللَّهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ

اور جب تو آیا تھا اپنے باغ میں کیوں نہ کہا تو نے جو چاہو اللہ سو ہو ، طاقت نہیں مگر جودے اللہ

إِنْ تَرَنِ أَنَا أَقَلُّ مِنْكَ مَالًا وَوَلَدًا ۝ فَعَسَىٰ رَبِّي أَن يُؤْتِيَنِي

اگر تو دیکھتا ہوں مجھ کو کہ میں کم ہوں تجھ سے مال اور اولاد میں ، تو امید ہے کہ میرا رب دیوے تجھ کو

خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَاءِ فَتُصْبِحَ

تیرے باغ سے بہتر اور بھیج دے اس پر ٹوکا ایک تھوڑا آسمان سے پھر صبح کو رہ جائے

صَعِيدًا زَلَقًا ۝ أَوْ يُصْبِحَ مَاؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيعَ لَهُ طَلَبًا ۝

میدان صاف ، یا صبح کو ہو رہو اس کا پانی خشک پھر نہ لائے تو اس کو ڈھونڈا کر

وَأُحِيطَ بِثَمَرِهِ فَأَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلَىٰ مَا أَنْفَقَ فِيهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ

اور سمیٹ لیا گیا اس کا سارا پھل پھر صبح کو رہ گیا ہاتھ پچانا اس مال پر جو اس میں لگایا تھا اور وہ گرا پڑا تھا

عَلَىٰ عُرْوَةٍ وَشِرَاءُ لِّقَوْلٍ يَلْتَمِثُنِي لَهُ أَشْرِكُ بِرَبِّي أَحَدًا ۝ وَلَمْ

اپنی جھڑیوں پر اور کہنے لگا کیا خوب ہوتا اگر میں شریک بناتا اپنوں کا کسی کو ، اور نہ ہوتی

تَكُنْ لَهُ فِئَةٌ يَنْصُرُونَهُ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَمَا كَانَ مُنتَصِرًا ۝

اس کی جماعت کہ مدد کریں اس کی اللہ کے سوائے اور نہ ہوا وہ کہ خود بدلے لے سکے

هَٰذَا لِكِ الْوَلَايَةِ لِلَّهِ الْحَقِّ ۖ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَخَيْرٌ عُقْبًا ۝

یہاں سب اختیار ہی اللہ کے ہے ، اسی کا انعام بہتر ہے اور اچھا ہی اسی کا دیا ہوا بدلہ

خلاصہ تفسیر

اور آپ (دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی پائیداری ظاہر کرنے کے لئے) دو شخصوں کا حال (جن میں باہم دوستی یا قرابت کا تعلق تھا) بیان کیجئے (تاکہ کفار کا خیال باطل ہو جائے اور مسلمانوں کو تسلی ہو) ان دو شخصوں میں سے ایک کو (جو کہ بد دین تھا) ہم نے دو باغ انگور کے درے رکھے تھے اور دونوں (باغوں) کا بھور کے درختوں سے احاطہ بنا رکھا تھا اور ان دونوں (باغوں) کے درمیان میں کھیتی بھی لگا رکھی تھی (اور دونوں باغ اپنا پورا پھل دیتے تھے) اور کسی کے پھل میں ذرا بھی کمی نہ رہتی تھی (بجلائے) باغوں کے کہ کبھی کسی درخت میں اور کسی سال پر سے باغ میں پھل کم آتا ہے) اور ان دونوں (باغوں) کے درمیان نہر چلا رکھی تھی اور اس شخص کے پاس بھی مال داری کا سامان تھا سو (ایک دن) اپنے اس (دوست) سے ملنے گئے اور اصرار کیا کہ میں تجھ سے مال میں بھی زیادہ ہوں اور بیع بھی میرا زبردست ہے (مطلب یہ تھا کہ تو میرے طریقے کو باطل اور اللہ کے نزدیک ناپسند کہتا ہے تو اب تو دیکھ لے کہ کون اچھا ہے) اگر تیرا دعویٰ صحیح ہوتا تو معاملہ برعکس ہوتا، کیونکہ دشمن کو کوئی فائدہ نہیں کرتا اور دوست کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا) اور وہ (اپنے اس ساتھی کو ساتھ لے کر) اپنے اوپر جسم (کفر) قائم کرتا ہوا اپنے باغ میں بیو پچا، (اور) کہنے لگا کہ یہ تو خیال نہیں ہو کہ یہ باغ (میری زندگی میں) کبھی بھی برباد ہوگا (اس سے معلوم ہوا کہ وہ خدا کے وجود اور ہر چیز پر اس کی قدرت کا قائل نہ تھا، بس ظاہری سامان حفاظت کو دیکھ کر اس نے یہ گفتگو کی) اور (اسی طرح) میں قیامت کو نہیں خیال کرتا کہ آدے گی اور اگر (بغرض محال قیامت آج بھی گئی اور) میں اپنے رب کے پاس بیو پچا یا گیا (جیسا تیرا عقیدہ ہے) تو ضرور اس باغ سے بھی بہت زیادہ اچھی جگہ کو ملے گی (کیونکہ جنت کی جگہوں کا دنیا سے اچھا اور بہتر ہونے کا تو تجھے بھی اقرار ہے) اور یہ بھی تجھے تسلیم ہو کہ جنت اللہ کے مقبول بندوں کو ملے گی، میری مقبولیت کے آثار و علامات تو تو دنیا ہی میں رہا ہے اگر میں اللہ کے نزدیک مقبول نہ ہوتا تو باغات کیوں ملتے، اس لئے تمہارے اقرار و تسلیم کے مطابق بھی مجھے وہاں یہاں سے اچھے باغ ملیں گے) اس (کی یہ باتیں سن کر اس) سے اس کے ملاقاتی نے (جو کہ دیندار مگر غریب آدمی تھا) جواب کے طور پر کہا کیا تو (توحید اور قیامت سے انکار کر کے) اس ذات (پاک) کے ساتھ کفر کرتا ہے جس نے تجھ کو (دل) منیٰ سے (جو کہ تیرا مادہ بعید ہے) بواسطہ آدم علیہ السلام کے پیدا کیا پھر (تجھ کو) لطفہ سے (جو کہ تیرا مادہ قریبہ ہر جسم بادریں بنایا) پھر تجھ کو صحیح سالم آدمی بنایا (اس کے باوجود تو توحید اور قیامت سے انکار اور کفر کرتا ہے تو کیا کر) لیکن میں تو یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ وہ (یعنی) اللہ تعالیٰ میرا رب

(حقیقی) ہے اور میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا اور جب اللہ تعالیٰ کی توحید اور قدرت مطلقہ ہر چیز پر ثابت ہو، اور اس کے نتیجہ میں یہ کچھ عجیب نہیں کہ باغ کی ترقی اور حفاظت کے تیرے سارے اسباب و سامان کسی وقت بھی بیگارا اور محسل ہو جائیں اور باغ برباد ہو جائے، اس لئے تجھے لازم تھا کہ سبب الاسباب پر نظر کرنا، تو تو جس وقت اپنے باغ میں پہنچا تھا تو تو نے یوں کیوں نہ کہا کہ جو اللہ کو منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے (اور) بدون خدا کی مدد کے (کسی میں) کوئی قدرت نہیں (جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا یہ باغ قائم رہے گا اور جب چاہے گا دیران ہو جائے گا، اگر تو مجھ کو مال و اولاد میں کمتر دیکھتا ہے (اس سے تجھ کو اپنے مقبول ہونے کا شبہ بڑ گیا ہے) تو مجھ کو وہ وقت نزدیک معلوم ہوتا ہے کہ میرا رب مجھ کو تیرے باغ سے اچھا باغ دیدے (خواہ دنیا ہی میں یا آخرت میں) اور اس (تیرے باغ) پر کوئی تفت پیری آفت آسمان سے (یعنی بلا واسطہ اسباب طبعیہ کے) بھیج دے جس سے وہ باغ دفعۃً ایک صاف رشتیل (میدان ہو کر رہ جائے یا اس سے اس کا پانی (جو نہر میں جاری ہے) بالکل اندر (زمین میں) اتر کر خشک ہو) جائے یہ تو اس (کے دوبارہ لانے اور نکالنے) کی کوشش بھی نہ کر سکے (یہاں اس دیندار سائنسی اس بے دین کے باغ کا جواب دیدیا، مگر اولاد کے متعلق کچھ جواب نہیں دیا، شاید وجہ یہ ہے کہ اولاد کی کثرت جیسی جہلی معلوم ہوتی ہے جب اس کی پرورش کے لئے مال موجود ہو ورنہ وہ آٹا و بال جابجائی ہے، فصل اس حکام کا یہ ہوا کہ تیرے بد عقیدہ ہونے کا سبب تھا کہ تجھ دنیا میں اللہ نے دولت دیدی اسکو تو نے اپنی مقبولیت کی علامت سمجھ لیا، اور میرے پاس دولت نہ ہونے سے تجھ کو غیر مقبول سمجھ لیا، تو دنیا کی دولت و ثروت کو مقبولیت عند اللہ کا مدار سمجھ لینا ہی بڑا دھوکا اور غلطی ہے، دنیا کی نعمتیں تو رب العالمین سانچوں، بچوں اور بھتیروں اور بدکاروں بھی کو دیتے ہیں، اصل مدار مقبولیت کا آخرت کی نعمتوں پر ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہیں اور دنیا کی نعمتیں سب زوال پذیر ہیں) اور اس گفتگو کے بعد واقعہ یہ پیش آیا کہ اس شخص کے سامان کو تو آفت نے آگھیرا، پس اس نے جو کچھ باغ پر خرچ کیا تھا اس پر ہاتھ ملتا رہ گیا اور وہ باغ اپنی ٹٹیوں پر گر رہا ہوا بڑا تھا، اور کہنے لگا کیا خوب ہوتا کہ میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا اس سے معلوم ہوا کہ باغ پر آفت آنے سے وہ یہ سمجھ گیا کہ یہ بال کفر و شرک کے سبب سے آیا ہے، اگر کفر نہ کرتا تو اول تو یہ آفت ہی شاید نہ آتی، اور آج بھی جاتا تو اس کا بدلہ آخرت میں ملتا، اب دنیا و آخرت دونوں میں خسارہ ہی خسارہ ہے، مگر صرف اتنی حسرت و افسوس سے اس کا ایمان ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ یہ حسرت مندرامت تو دنیا کے نقصان کے وجہ سے ہوئی، آگے اللہ کی توحید اور قیامت کا اقرار جب تک ثابت نہ ہو اس کو تو من نہیں کہہ سکتے) اور اس کے پاس ایسا کوئی جمع نہ ہوا جو خدا کے سوا اسکی

مرد کرتا اس کو اپنے بیٹے اور اولاد پر ناز تھا وہ بھی ختم ہوا، اور نہ وہ خود ہم سے بدلہ لے سکا، ایسے موقع پر مدد کرنا تو اللہ برحق ہی کا کام ہے (اور آخرت میں بھی) اسی کا ثواب سب سے اچھا ہے اور دنیا میں بھی، اسی کا نتیجہ سب سے اچھا ہے (یعنی مقبولین کا کوئی نقصان ہو جاتا ہے تو دونوں جہان میں اس کا ثمرہ نیک ملتا ہے بخلاف کافر کے کہ بالکل خسارہ میں رہ گیا)۔

معارف و مسائل

وَكَانَ كَذٰلِكَ نَفْثَ الشَّيْطٰنِ فِيْ رِجْلِكَ ۚ وَكَانَ مَقْلُوْبًا ۚ وَكَانَ مَقْلُوْبًا ۚ وَكَانَ مَقْلُوْبًا ۚ

جگہ حضرت ابن عباسؓ، مجاہد، قتادہ سے یہی دو سکر معنی منقول ہیں (ابن کثیر) قاموس میں ہے کہ لفظ نثرہ درخت کے پھل اور انواع مال و زر سب کو کہا جاتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اس کے پاس صرف باغات اور کھیت ہی نہیں بلکہ سونا چاندی اور تمام اسباب عیش و دوسرے بھی موجود تھے، خود اس کے الفاظ میں جو قرآن نے نقل کئے اس میں اَنَا كُتُوْمُكَ مَا لَا يَفِيْهِ اِسْمُكَ اِسْمُكَ اِسْمُكَ کو ادا کرتے ہیں (ابن کثیر)

مَا شَاءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ، شعب الایمان میں حضرت انسؓ کی روایت سے مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کوئی چیز دیکھے اور وہ اس کو پسند آئے تو اگر اس نے یہ کلمہ کہ لیا مَا شَاءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ تو اس کو کوئی چیز نقصان نہ پہونچائے گی (یعنی وہ پسندیدہ محبوب چیز محفوظ رہے گی) اور بعض روایات میں ہے کہ جس نے کسی محبوب و پسندیدہ چیز کو دیکھ کر یہ کلمہ پڑھ لیا تو اس کو نظر بد نہ لگے گی۔

حَسْبَانَا ۚ اس لفظ کی تفسیر حضرت قتادہؓ نے مطلق عذاب سے کی ہے، اور ابن عباسؓ نے آگ سے اور بعض نے پتھر آؤ سے، اس کے بعد جو قرآن میں آیا ہے اُحِيطَ بِشَرِّهِ ۚ اس میں ظاہر یہ ہے کہ اس کے باغ اور تمام مال و زر اور سامان عیش پر کوئی بڑی آفت آپڑی، جس نے سب کو برباد کر دیا، قرآن نے صراحتہً کسی خاص آفت کا ذکر نہیں کیا، ظاہر یہ ہے کہ کوئی آسمانی آگ آئی، جس نے سب کو جلا دیا، جیسا کہ لفظ حَسْبَانَا کی تفسیر حضرت ابن عباسؓ سے بھی آگ منقول ہے، واللہ اعلم

وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلًا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ

اور بتلا دے ان کو مثل دنیا کی زندگی کی جیسے پانی اتارا ہم نے آسمان سے

وَأَخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ فَأَصْبَحَ هَشِيمًا تَذْرُوهُ الرِّيحُ ۚ وَكَانَ

پھر زمین کا سبزہ پھرک کر ہڈیاں پھرا پھرا ہوا میں اڑتا ہوا، اور اللہ

اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرٌ ۝۴۸ الْمَالُ وَالْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيَاةِ

کو ہے ہر چیز پر قدرت، مال اور بیٹے روتق ہیں دنیا کی زندگی میں

الدُّنْيَا ۚ وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَيْرٌ

اور باقی رہنے والی نیکیوں کا بہتر ہے تیرے رب کے یہاں بدلہ اور بہتر ہے

أَمَلًا ۝۴۹ وَيَوْمَ نُسِيرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْأَرْضَ بَارِزَةً وَحَشَرْنَاهُمْ

تو قیامت اور جس دن ہم چلائیں پہاڑ اور تو دیکھے زمین کو نکلی ہوئی اور کھیر بلائیں ہم انکو

فَلَمُ نَخَادِرْ مِنْهُمْ أَحَدًا ۝۵۰ وَعَرَضُوا عَلَىٰ رَبِّكَ صَفًّا لَقَدْ

پھر نہ چھوڑیں ان میں سے ایک کو، اور سامنے آئیں تیرے رب کے صف باندھ کر، آہینے

جِئْتُمُونَا لَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ بَلْ زَعَمْتُمْ أَلَّنْ نَجْعَلَ لَكُمْ

تم ہمارے پاس جیسا کہ ہم نے بنایا تھا تم کو پہلی بار، نہیں، تم تو کہتے تھے کہ نہ مقرر کریں گے ہم

مَوْعِدًا ۝۵۱ وَوَضِعَ الْكِتَابُ فَتَرَى الْمُجْرِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا

تھما لے لڑ کوئی وعدہ، اور رکھا جائے گا حساب کا کاغذ پھر تو دیکھے گنہگاروں کو ڈرتے ہیں اس سے

فِيهِ وَيَقُولُونَ يَوْلَيْنَا مَا لِ هَذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَ

جو اس میں لکھا ہے، اور کہتے ہیں ہمارے خیالی کیا ہے یہ کاغذ نہیں چھوٹی اس سے چھوٹی بات اور

لَا كِبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهُ وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا ۚ وَلَا يَظُنُّ

نہ بڑی بات جو اس میں نہیں آگئی، اور پائیں گے جو کچھ کیا ہے سامنے، اور تیرا

رَبُّكَ أَحَدًا ۝۵۲

ظلم نہ کرے گا کسی پر۔

خلاصہ تفسیر

راس سے پہلے دنیوی زندگی اور اس کے سامان کی ناپائیداری ایک شخصی اور جزوی مثال سے بیان فرمائی تھی، اب یہی مضمون عام اور کلی مثال سے واضح کیا جاتا ہے، اور آپ ان لوگوں سے دنیوی زندگی کی حالت بیان فرمائیے کہ وہ ایسی ہے جیسے ہم نے آسمان سے پانی برسایا ہو پھر اس (پانی سے) زمین کی نباتات خوب گنجان ہو گئی ہوں پھر وہ (بعد اس کے) سرسبز دتر و تازہ تھو خشک ہو کر ریزہ ریزہ ہو جائے کہ اس کو ہوا اڑائے لئے پھرتی ہو (یہی حال دنیا کا ہے کہ آج ہری بھری نظر آتی ہے کل اس کا نام و نشان بھی نہ رہے گا) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتے ہیں (جب چاہیں ایجاد کریں ترقی دیں اور جب چاہیں فنا کر دیں اور جب اس حیات دنیا کا یہ حال ہے اور مال و اولاد حیات دنیا کی ایک رونق (اور اس کے تواجیح میں سے) ہے (تو خود مال و اولاد تو اور بھی زیادہ سریع الزوال ہے) اور جو اعمال صالحہ ہمیشہ ہمیشہ کو باقی رہند والے ہیں وہ آپ کے رب کے نزدیک (یعنی آخرت میں اس دنیا سے) ثواب کے اعتبار سے بھی (ہزار درجہ) بہتر ہے اور امید کے اعتبار سے بھی (ہزار درجہ) بہتر ہے (یعنی اعمال صالحہ سے جو امیدیں وابستہ ہوتی ہیں وہ آخرت میں ضرور پوری ہوں گی، اور اس کی امید سے بھی زیادہ ثواب ملے گا، بخلاف متاع دنیا کے کہ اس سے دنیا میں بھی انسانی امیدیں پوری نہیں ہوتیں، اور آخرت میں تو کوئی احتمال ہی نہیں) اور اس دن کو یاد کرنا چاہئے جس دن ہم پہاڑوں کو (ان کی جگہ سے) ہٹا دیں گے (یہ ابتداء میں ہو گا پھر وہ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے) اور آپ زمین کو دیکھیں گے کہ ایک کھلا میدان پڑا ہے (کیونکہ پہاڑ ڈرخت، مکان کچھ باقی نہ رہے گا) اور ہم ان سب کو (قبروں سے اٹھا کر میدان حساب میں) جمع کر دیں گے اور ان میں سے کسی کو بھی نہ چھوڑیں گے (کہ وہاں نہ لایا جائے اور سب کے سب آپ کے رب کے روبرو (یعنی موقف حساب میں) برابر کھڑے کر کے پیش کئے جائیں گے (یہ احتمال نہ رہے گا کہ کوئی کسی کی آڑ میں چھپ جائے اور ان میں جو قیامت کا انکار کرتے تھے ان سے کہا جائے گا کہ) دیکھو آخر تم پہاڑ پاس (دو بارہ پیدا ہو کر) آئے بھی جیسا ہم نے تم کو پہلی بار (یعنی دنیا میں) پیدا کیا تھا (مگر تم پہلی پیدائش کا مشاہدہ کر لینے کے باوجود اس دوسری پیدائش کے قائل نہ ہوئے) بلکہ تم یہی سمجھتے رہے کہ ہم تمہارے (دو بارہ پیدا کرنے کے لئے کوئی وقت موعود نہ لائیں گے اور نامہ عمل (خواہ داسنے ہاتھ میں یا بائیں ہاتھ میں دیکر اس کے سامنے کھلا ہوا) رکھ دیا جائے گا جیسا کہ دوسری آیت میں ہے وَنُخْرِجُكَ يَوْمَ الْقِيَمَةِ كِتَابًا يَتْلُقُاهُ مَنْشُورًا) تو آپ مجرموں کو دیکھیں گے کہ اس میں جو کچھ (لکھا) ہو گا (اسکو دیکھ کر)

اس سے (یعنی اس کی سزا سے) ڈرتے ہوں گے اور کہتے ہوں گے کہ ہائے ہماری کم بختی اس ناکہ اعمال کی عجیب حالت ہو کہ بے قلمبند کئے ہوئے نہ کوئی چھوٹا گناہ چھوڑا نہ بڑا اور جو کچھ انھوں نے (دنیا میں) کیا تھا وہ سب (لکھا ہوا) موجود پائیں گے اور آپ کا رب کسی پر ظلم نہ کرے گا رکہ نہ کیا ہو آگناہ لکھ لے یا کی ہوئی نیکی جو شرائط کے ساتھ کی جائے اس کو نہ لکھے۔

معارف و مسائل

وَالْبَقِيَّةُ الصَّالِحَاتُ، منذ احمد، ابن حبان اور حاکم نے بروایت حضرت ابو سعید خدری نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ باقیات صالحات کو زیادہ سے زیادہ حبس کیا کرو، عرض کیا گیا کہ وہ کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا سُبْحَانَ اللَّهِ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَالْحَمْدُ لِلَّهِ أَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ کہنا، حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے، اور عقیلی نے حضرت نعمان بن بشیرؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سُبْحَانَ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ أَكْبَرُ یہی باقیات صالحات ہیں، یہی مضمون طبرانی نے بروایت حضرت سعد بن عبادہ بھی روایت کیا ہے، اور صحیح مسلم و ترمذی نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ کلمہ یعنی سُبْحَانَ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ أَكْبَرُ میرے نزدیک ان تمام چیزوں میں سب سے محبوب ہے جن پر آفتاب کی روشنی پڑتی ہے، یعنی سارے جہان سے۔

اور حضرت جابرؓ نے فرمایا کہ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ بکثرت پڑھا کرو کہ یہ نثار ہے آپؐ بیماری اور تکلیف کے دور کر دیتا ہے، جن میں سب سے کم درجہ کی تکلیف ہم یعنی فکر و غم ہے۔ اسی لئے اس آیت میں لفظ باقیات صالحات کی تفسیر حضرت ابن عباسؓ، عمرہؓ، مجاہدؓ نے یہی کی ہے کہ مراد اس سے یہی کلمات پڑھنا ہے، اور سعید بن جبیرؓ، مسروقؓ اور ابراہیمؓ نے فرمایا کہ باقیات صالحات سے پانچ نمازیں مراد ہیں۔

اور حضرت ابن عباسؓ سے ایک دوسری روایت میں یہ ہے کہ آیت میں باقیات صالحات سے مراد مطلق اعمال صالحہ ہیں جن میں یہ کلمات مذکورہ بھی داخل ہیں پانچوں نمازیں بھی اور دوسرے تمام نیک اعمال بھی، حضرت قتادہؓ سے بھی یہی تفسیر منقول ہے (منظہری)۔

الفاظِ فسران کے مطابق بھی یہی ہے کیونکہ ان الفاظ کا لغوی مفہوم وہ اعمال صالحہ ہیں جو باقی رہنے والے ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ اعمال صالحہ سب ہی اللہ کے نزدیک باقی اور قائم ہیں ابن جریر طبری اور قرطبی نے اسی تفسیر کو ترجیح دی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ کھیتی دو قسم کی ہوتی ہے، دنیا کی کھیتی تو مال و اولاد ہی اور آخرت کی کھیتی باقیات صالحات ہیں، حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ باقیات صالحات انسان کی نیت اور ارادہ ہیں کہ اعمال صالحہ کی قبولیت اس پر موقوف ہے۔

اور عبید بن عمرؓ نے فرمایا کہ باقیات صالحات نیک لڑکیاں ہیں کہ وہ اپنے والدین کے لئے سب سے بڑا ذخیرہ ثواب ہیں، اس پر حضرت صدیقہ عائشہؓ کی ایک روایت دلالت کرتی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے، کہ آپؐ نے فرمایا کہ میں نے اپنی امت کے ایک آدمی کو دیکھا کہ اس کو جہنم میں لے جانے کا حکم دیدیا گیا، تو اس کی نیک لڑکیاں اس کو چٹ گئیں اور رونے اور شور کرنے لگیں، اور اللہ تعالیٰ سے فریاد کی کہ یا اللہ انھوں نے دنیا میں ہم پر بڑا احسان کیا، اور ہماری تربیت میں محنت اٹھائی ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس پر رحم فرما کر بخش دیا (قرطبی)۔

لَقَدْ جَعَلْنَاكُمْ آوَّلَ مَا خَلَقْنَاكُمْ آَوَّلَ مَرَّةٍ، قیامت کے دن سب کو خطاب ہوگا کہ آج تم اسی طرح خالی ہاتھ بغیر کسی ساز و سامان کے ہمارے سامنے آئے ہو، جیسا تمہیں آوّل پیدائش کے وقت پیدا کیا تھا، بخاری، مسلم، ترمذی میں بروایت ابن عباسؓ منقول ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ اے لوگو! تم قیامت میں اپنے رب کے سامنے ننگے پاؤں ننگے بدن پیدل چلتے ہوئے آؤ گے، اور سب پہلے جس کو لباس پہنایا جائیگا وہ ابراہیم علیہ السلام ہوں گے، یہ سن کر حضرت صدیقہ عائشہؓ نے سوال کیا یا رسول اللہ کیا سب مرد و عورت ننگے ہونگے اور ایک دوسرے کو دیکھتے ہوں گے؟ آپؐ نے فرمایا کہ اس روز ہر ایک کو ایسا شغل اور ایسی فکر گھیرے رہو گی کہ کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کا موقع ہی نہ ملے گا، سب کی نظریں اوپر اٹھی ہوئی ہوں گی۔

قرطبی نے فرمایا کہ ایک حدیث میں جو آیا ہے کہ مردے برزخ میں ایک دوسرے سے اپنے کفنوں میں ملبوس ہو کر ملا کر رہیں گے، وہ اس حدیث کے منافی نہیں، کیونکہ وہ حاملہ قبر اور برزخ کا ہے یہ میدان حشر کا، اور بعض روایات حدیث میں جو یہ منقول ہے کہ میت اپنے اسی لباس میں میدان حشر میں اٹھے گا جس میں اس کو دفن کیا گیا تھا، حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا کہ اپنی مردوں کے کفن اچھے بنایا کرو کیونکہ وہ قیامت کے روز اسی کفن میں اٹھیں گے، اس کو بعض حضرات نے شہیدوں پر معمول کیا ہے، اور بعض نے کہا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ حشر میں بعض لوگ بلبوس اٹھیں اور بعض ننگے، اس طرح دونوں قسم کی روایات جمع ہو جاتی ہیں (منظہری)۔

جزاء میں عمل ہے | وَ جَزَاءُ مَا عَمِلُوا خَيْرًا، یعنی سب اہل حشر اپنے کئے ہوئے اعمال کو حاضر پا رہیں گے، اس کا مفہوم عام طور پر حضرات مفسرین نے یہ بیان کیا ہے کہ اپنی

کئے ہوئے اعمال کی جزاء کو حاضر و موجود پائیں گے، ہمارے استاد حضرت مولانا سید محمد انور کشمیری فرماتے تھے کہ اس تاویل کی ضرورت نہیں، روایات حدیث بے شمار اس پر شاہد ہیں، کہ یہی اعمال دنیا و آخرت کی جزاء و سزا بن جائیں گے، ان کی شکلیں وہاں بدل جائیں گی، نیک اعمال جنت کی نعمتوں کی شکل اختیار کر لیں گے اور بُرے اعمال جہنم کی آگ اور سانپ و بھجور بن جائیں گے۔ احادیث میں ہے کہ زکوٰۃ نہ دینے والوں کا مال قبر میں ایک بڑے سانپ کی شکل میں آ کر اس کو ڈسے گا اور کہے گا اَنَا مَالُكَ (میں تیرا مال ہوں)، نیک عمل ایک حسین انسان کی شکل میں انسان کو قبر کی تنہائی میں کچھ وحشت دور کرنے کے لئے اس کو دلانے آئے گا، قربانی کے جانور کی طرح صراط کی سواری بنیں گے، انسان کے گناہ شر میں بوجھ کی شکل میں ہر ایک کے سر پر لا دی جائیں گے۔ قرآن میں یتیموں کے مال کو ناحق کھانے کے بارے میں ہے اِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ ثَمَرًا دَائِيًّا لَوْ كَانُوا يَفْقَهُوْنَ (ان تمام آیات و روایات کو عموماً مجاز پر محمول کیا جاتا ہے، اور اگر اس تحقیق کو لیا جائے تو ان میں کسی جگہ مجاز کی ضرورت نہیں رہتی، سب اپنی حقیقت پر رہتی ہیں۔

نثر آن نے یتیم کے ناجائز مال کو آگ فرمایا، تو حقیقت یہ ہے کہ وہ اس وقت بھی آگ ہی ہے، مگر اس کے آثار محسوس کرنے کے لئے اس دنیا سے گذر جانا شرط ہے، جیسے کوئی دیاسالی کے کبس کو آگ کہے تو صحیح ہے مگر اس کے آگ ہونے کے لئے رگڑ کی شرط ہے، اسی طرح کوئی پیڑوں کو آگ کہے تو صحیح سمجھا جائے گا اگرچہ اس کے لئے ذرا سی آگ سے اتصال شرط ہے۔ اس کا حاصل یہ ہوا کہ انسان جو کچھ نیک یا بد عمل دنیا میں کرتا ہے یہ عمل ہی آخرت میں جزاء و سزا کی شکل اختیار کرے گا، اس وقت اس کے آثار و علامات اس دنیا سے الگ و دیر ہو جائیں گے واللہ اعلم

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ طَغَانٍ مِّنَ

اور جب کہا ہم نے فرشتوں کو سجدہ کرو آدم کو تو سجدے میں گر پڑے مگر ابلیس، عجب جن کی

الْجِنَّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ أَفَتَتَّخِذُونَهُ وَذُرِّيَّتَهُ أَوْلِيَاءَ

قسم سے سو نکل جھٹکا اپنے رب کے حکم سے، سو کیا اب تم ٹھہراتے ہو اس کو اور اس کی اولاد کو رفیق

مِن دُونِي وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ط بَشَرٌ لِّلظَّالِمِينَ بَدَلًا ۝ مَا أَشْمَدُ لَكُمْ

میرے سوائے اور وہ تمہارے دشمن ہیں بڑا ہتھ لگا بے انصافوں کے بدلہ، دکھلا نہیں لیا تمہارا

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۚ وَمَا كُنْتُمْ مُتَّخِذِيْنَ

ان کو بنانا آسمان اور زمین کا اور نہ بنانا خود ان کا ، اور میں وہ نہیں کہ بناؤں

الْمُضِلِّيْنَ عَصٰدًا ۝۵۱ وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا اَشْرَکَآءَیَ الَّذِیْنَ

بھکانے والوں کو اپنا مددگار ، اور جس دن فرمائے گا پکارو میرے شریکوں کو جن کو تم

زَعَمْتُمْ فَاَدْعُوْهُمْ فَلَمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَهُمْ ۚ وَجَعَلْنَا بَیْنَهُمْ مَّوْبِقًا ۝۵۲

ماتے تھے پھر پکاریں گے سو وہ جواب نہ دیں گے اُن کو اور کر دیں گے ہم انکے اور انکے بیچ مرنے کی جگہ

وَرَا الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْا اَنَّهُمْ مُوَاقِعُوهَا وَلَمْ یَجِدْ وَاَعْرَبٰ

اور دیکھیں گے گنہگار آگ کو پھر سمجھ لیں گے کہ ان کو پڑنا ہو اس میں اور نہ بدل سکیں گے اس سے

مَصْرَفًا ۝۵۳ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۚ

رستہ ، اور بیشک پھر پھر کر سمجھائی ہم نے اس قرآن میں لوگوں کو ہر ایک مثل ،

وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا ۝۵۴ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا

اور ہو انسان سب چیز سے زیادہ جھگڑالو ، اور لوگوں کو جو روکا اس بات سے کہ یقین لے آئیں

اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰی وَیَسْتَغْفِرُوْا رُبَّهْمُ اِلَّا اَنْ تَاْتِیَهُمْ سُنَّةٌ

جب پہنچی ان کو ہدایت اور گناہ بخشو آئیں اپنے رب سے سو اسی انتظار نے کہ پہنچے ان پر رسم پہلوں

الْاَوَّلِیْنَ اَوْ یَاْتِیَهُمُ الْعَذَابُ اَبْقٰیًا ۝۵۵ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِیْنَ

کی یا آکھڑا ہو اُن پر عذاب سامنے کا ، اور ہم جو رسول بھیجتے ہیں سو

اِلَّا مُبَشِّرِیْنَ وَنَذِیْرِیْنَ ۚ وَیَجَادِلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ

خوش خبری اور ڈر سنانے کو ، اور جھگڑا کرتے ہیں کافر سمجھوٹا جھگڑا ،

لِیَدْحِضُوْا بِهٖ الْحَقَّ وَاتَّخِذُوْا اٰیٰتِیْ وَمَا اُنْذِرُوْا هُزُوًا ۝۵۶

کہ ٹلاویں اس سے سچی بات کو اور ٹھہرا لیا انھوں نے میرے کلام کو اور جو ڈر سنا دیئے گئے ٹھٹھا ،

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِآیٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِیَ مَا

اور اس سے زیادہ ظالم کون جو سمجھایا گیا اس کے رب کے کلام سے پھوٹنے پھیر لیا اس کی طرف اور بھول گیا جو

قَدْ مَتَّ يَدَاهُ إِنَّا جَعَلْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي

کچھ آگے بھیچے ہیں اس کے ہاتھ، ہم نے ڈال دی ہیں ان کے دلوں پر پردہ کہ اس کو نہ سمجھیں اور ان کے

اَذَانِهِمْ وَقَرَّأُوا وَإِنْ تَدْعُهُمْ إِلَى الْهُدَى فَلَنْ يَهْتَدُوا إِذًا

کانوں میں ہے بوجھ، اور اگر تو ان کو بلاتے راہ پر تو ہرگز نہ آئیں راہ پر اس وقت

أَبَدًا ۝ وَرَبُّكَ الْغَفُورُ ذُو الرَّحْمَةِ الْوَيْحَانُ هُمُ رِيبًا

کبھی، اور تیرا رب بڑا بخشنے والا ہے رحمت والا اگر ان کو پکڑے ان کے کئے

كَسَبُوا الْعَجَلَ لَهُمُ الْعَذَابُ أَبَاطِلٌ لَهُم مَّوْعِدٌ لَّنْ يَجِدُوا مِنْ

پر تو جلد ڈالے ان پر عذاب، پر ان کے لئے ایک وعدہ ہے کہیں نہ پائیں گے

دُونِهِ مَوْعِدًا ۝ وَتِلْكَ الْقُرَى أَهْلَكْنَاهُمْ لَمَّا ظَلَمُوا وَ

اس کوڑے سرک جانے کی جگہ، اور یہ سب بستیاں ہیں جن کو ہم نے غارت کیا جب وہ ظالم ہو گئے اور

جَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ۝

مقرر کیا تھا ہم نے ان کی ہلاکت کا ایک وعدہ۔

خلاصہ تفسیر

اور (وہ وقت بھی قابل ذکر ہے) جبکہ ہم نے ملائکہ کو حکم دیا کہ آدم (علیہ السلام) کے سامنے سجدہ کر دو تو سب نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے کہ وہ جنات میں سے تھا اس نے اپنے رب کے حکم سے عدول کیا، (کیونکہ جنات کا عنصر غالب جس سے وہ پیدا کئے گئے ہیں آگ ہے، اور عنصر نار کا مقتضی پابند نہ رہنا ہے، مگر اس اقتضائے عنصری کی وجہ سے ابلیس معذور نہ سمجھا جائیگا کیونکہ اس تقاضائے عنصری کو خدا کے خوف سے مغلوب کیا جاسکتا تھا) تو کیا پھر بھی تم اس کو اور اس کی ذریت (اولاد اور توابع) کو دوست بناتے ہو مجھ کو چھوڑ کر (یعنی میری اطاعت چھوڑ کر اس کے کہنے پر چلتے ہو) حالانکہ وہ (ابلیس اور اس کی جماعت) تمھارے دشمن ہیں (کہ ہر وقت تمھیں ضرر پہنچانے کی فکر میں رہتے ہیں) یہ (ابلیس اور اس کی ذریت کی دوستی) ظالموں کے لئے بہت بُرا بدل ہے (بدل اس لئے کہا کہ دوست تو بنانا چاہتے تھے مجھے، لیکن انھوں نے میرے برے شیطان کو دوست بنالیا، بلکہ دوست ہی نہیں اس کو خدائی کا شریک

جی مان لیا حال نہ، پس ان کو نہ تو آسمان و زمین کے پیدا کرنے کے وقت واپسی مدد یا مشورے کے لئے بلایا، اور نہ خود ان کے پیدا کرنے کے وقت (بلایا یعنی ایک کے پیدا کرنے کے وقت دوسرے کو نہیں بلایا) اور میں ایسا (عاجز) نہ تھا کہ کسی کو بالخصوص، مگر ادا کرنے والوں کو (یعنی شیاطین کو) اپنا درست و اباز و ہناتار یعنی مدد کی ضرورت تو اس کو ہوتی ہے جو خود قادر نہ ہو) اور (تم یہاں ان کو شریکِ خدائی سمجھتے ہو قیامت میں حقیقت معلوم ہوگی) اس دن کو یاد کرو کہ حق تعالیٰ (مشکین سے) فرمائے گا کہ جن کو تم ہمارا شریک سمجھا کرتے تھے ان کو (اپنی امداد کے لئے) پکارو تو وہ پکارینگے تو وہ ان کو جواب ہی نہ دیں گے اور ہم ان کے درمیان میں ایک آڑ کر دیں گے (جس سے بالکل ہی مایوس ہو جائے ورنہ بغیر آڑ کے بھی ان کا مدد کرنا ممکن نہ تھا) اور مجرم لوگ دوزخ کو دیکھیں گے پھر یقین کریں گے کہ وہ اس میں گرنے والے ہیں اور اس سے بچنے کی کوئی راہ نہ پائیں گے اور ہم اس قرآن میں لوگوں کی ہدایت کے واسطے ہر قسم کے عمدہ مضامین طرح طرح سے بیان فرماتے ہیں، اور اس پر بھی منکر، آدمی جھگڑنے میں سب سے بڑھ کر ہے (جنت اور حیوانات میں اگرچہ شہورد اور اک ہے مگر وہ ایسا جہال اور جھگڑا نہیں کرتے) اور لوگوں کو بعد اس کے کہ ہدایت پہنچ چکی، جس کا تعاقب تھا کہ ایمان لے آتے، ایمان لانے سے اور اپنے پروردگار سے رکھ و محبت سے، منفریت مانگنے سے اور کوئی امر مانع نہیں جہیز اس کے کہ ان کو اس کا انتظار ہو کہ اگلے لوگوں کا سا معاملہ (بلاکت اور عذاب کا) ان کو بھی پیش آجائے یا یہ کہ عذاب ان کے رو برو آکر ڈاٹھو، (مطلب یہ ہو کہ ان کے حالات سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ عذاب ہی کا انتظار ہے ورنہ اور سب جہتیں تو تمام ہو چکیں) اور رسولوں کو تو صرف بشارت دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجا کرتے ہیں (جس کے لئے معجزات وغیرہ کے ذریعہ کافی دلائل ان کے ساتھ کر دیئے جاتے ہیں) اس سے زائد ان سے کوئی فریض کرنا جہالت ہے، اور کافر لوگ ناحق کی باتیں پکڑ پکڑ کر جھگڑتے نکالتے ہیں تاکہ اس کے ذریعہ حق بات کو بچلا دیں اور انھوں نے میری آیتوں کو اور جس (عذاب) سے ان کو ڈرایا گیا تھا اس کو دل لگی بنا رکھا ہے، اور اس سے زیادہ کون ظالم ہوگا جس کو اس کے رب کی آیتوں سے نصیحت کی جاوے پھر وہ اس سے روگردانی کرے اور جو کچھ اپنے ہاتھوں (گناہ) سمیٹ رہا ہے اس کے نتیجے کو بھول جائے، ہم نے اس (حق بات) کے سمجھنے سے ان کے دلوں پر پردے ڈال رکھے ہیں (اور اس کے سننے سے) ان کے کانوں میں ڈاٹ دے رکھی ہے اور اس وجہ سے ان کا حال یہ ہے کہ اگر آپ ان کو راہِ راست کی طرف بلائیں تو ہرگز بھی راہ پر نہ آئیں، کیونکہ کانوں سے دعوتِ حق سننے نہیں، دلوں سے سمجھتے نہیں، اس لئے آپ غم نہ کریں، اور (تاخیر عذاب کی وجہ سے جو ان کو یہ خیال ہو رہا ہے کہ عذاب آئے گا ہی نہیں تو

اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کا رب بڑا مغفرت کرنے والا بڑا رحمت والا ہے (اس لئے مہلت دے رکھی ہے کہ اب ان کو ہوش آجائے اور ایمان لے آئیں تو ان کی مغفرت کر دی جائے ورنہ ان کے اعمال تو ایسے ہیں کہ) اگر ان سے ان کے اعمال پر دار و گیر کرنے لگتا تو ان پر فوراً ہی عذاب واقع کر دیتا (مگر ایسا نہیں کرتا) ان کے (عذاب کے) واسطے ایک معین وقت (ٹھہرا رکھا) ہے (یعنی روز قیامت) کہ اس سے اس طرف (یعنی پہلے) کوئی پناہ کی جگہ نہیں پاسکتے (یعنی اس وقت کے آنے سے پہلے کسی پناہ کی جگہ میں جا چسپیں اور اس سے محفوظ رہیں) اور یہی قاعدہ پہلے کفار کے ساتھ برتا گیا (چنانچہ) یہ بستیوں (جن کے قصے مشہور و مذکور ہیں) جب انھوں نے (یعنی ان کے بسنے والوں نے) شرارت کی تو ہم نے ان کو ہلاک کر دیا اور ہم نے ان کے ہلاک ہونے کے لئے وقت معین کیا تھا (اسی طرح ان موجودہ لوگوں کے لئے بھی وقت معین ہے)۔

معارف و مسائل

ابلیس کے اولاد اور ذریت سے سمجھا جاتا ہے کہ شیطان کے اولاد ذریت ہے ذریت بھی ہے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس جگہ ذریت سے مراد معین و مددگار ہیں، یہ ضروری نہیں کہ شیطان کی صلبی اولاد بھی ہو، مگر ایک صحیح حدیث جسکو حمیدی نے کتاب الجمع بین الصحیحین میں حضرت سلمان فارسیؓ سے روایت کیا ہے، اس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ نصیحت فرمائی کہ تم ان لوگوں میں سے نہ بنو جو سب سے پہلے بازار میں داخل ہو جاتے ہیں، یا وہ لوگ جو سب سے آخر میں بازار سے نکلتے ہیں، کیونکہ بازار ایسی جگہ ہے جہاں شیطان نے انڈے بچے دے رکھے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کی ذریت اس کے انڈوں سے پھیلی ہے، قرطبی نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ شیطان کے مددگار اور لشکر ہونا تو قطعی دلائل سے ثابت ہے اولاد صلبی ہونے کے متعلق بھی ایک صحیح حدیث اور پر گزر چکی ہے، واللہ اعلم

وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدًّا ساری مخلوقات میں سب سے زیادہ جھگڑالو انسان واقع ہوا ہے، اس کی شہادت میں ایک حدیث حضرت انسؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز ایک شخص کفار میں سے پیش کیا جائے گا اس کے سوال ہوگا کہ ہم نے جو رسول بھیجا تھا ان کے متعلق تمہارا کیا عمل رہا؟ وہ کہے گا کہ اے میرے پروردگار! میں تو آپ پر بھی ایمان لایا آپ کے رسول پر بھی، اور عمل میں ان کی اطاعت کی، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ یہ تیرا اعمال نامہ سامنے رکھا ہے اس میں تو یہ کچھ بھی نہیں، یہ شخص کہے گا

کہ میں تو اس اعمال نامہ کو نہیں مانتا، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ یہ ہمارے فرشتے تو تمہاری نگرانی کرتے تھے وہ تیرے خلاف گواہی دیتے ہیں، یہ کہے گا کہ میں ان کی شہادت کو بھی نہیں مانتا، اور نہ ان کو پہچانتا ہوں، نہ میں نے ان کو اپنے عمل کے وقت دیکھا ہے، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے تو یہ لوح محفوظ سامنے ہے، اس میں بھی تیرا یہی حال لکھا ہے، وہ کہے گا کہ میرے پروردگار! آپ نے مجھے ظلم سے پناہ دی ہے یا نہیں، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے بیشک ظلم سے تو ہماری پناہ میں ہے، تو اب وہ کہے گا کہ میرے پروردگار میں ایسی غیبی شہادتوں کو کیسے مانوں جو میری دیکھی بھالی نہیں، میں تو ایسی شہادت کو مان سکتا ہوں جو میرے نفس کی طرف سے ہو، اس وقت اس کے منہ پر چہر لگا دی جائے گی، اور اس کے ہاتھ پاؤں اس کے کفر و شرک پر گواہی دیں گے، اس کے بعد اس کو آزاد کر دیا جائے گا، اور جہنم میں ڈال دیا جائے گا اس دایت کا مضمون صحیح مسلم میں حضرت انسؓ سے منقول ہے، قرطبی،

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِفَتَاهُ لَا أَبْرَحُ حَتَّىٰ أَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ أَوْ

اور جب کہا موسیٰ نے اپنے جوان کو میں نہ ہٹوں گا جب تک پہنچ جاؤں جہاں ملتے ہیں دو دریا یا

أَمْضَىٰ حَقْبًا ۖ ۙ فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حَوْصَمًا فَاتَّخَذَ

چلا جاؤں فترتوں، پھر جب پہنچے دونوں دریا کے ملاپ تک بھول گئے اپنی مچلی پھر اس نے اپنی

سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ۖ ۙ فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتَاهُ إِنِّي خِذْ زَادَكَ

راہ کر لی دریا میں سترنگ بنا کر، پھر جب آگے چلے کہا موسیٰ نے اپنے جوان کو لا ہمارا پاس ہمارا کھانا

لَقَدْ لَقِينَا مِنْ سَفَرِنَا هَذَا نَصَبًا ۖ ۙ قَالَ أَرَأَيْتَ إِذْ أَوَيْنَا

ہم نے پائی اپنے اس سفر میں تکلیف، بولا وہ دیکھا تو نے جب ہم نے جگہ پکڑی

إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِنِّي نَسِيتُ الْخُبْرَةَ الَّتِي كُنَّا فِيهَا وَاللَّهُ غَافِلٌ أَعْمَىٰ ۖ ۙ

اس پتھر کے پاس سو میں بھول گیا مچلی، اور یہ مجھ کو بھلا دیا شیطان ہی نے کہ

أَنَّا أَكْرَهْنَا ۖ ۙ وَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ عَجَبًا ۖ ۙ قَالَ ذَلِكَ مَا

اسکا ذکر کروں، اور اس نے کر لیا اپنا رستہ دریا میں عجیب طرح، کہا یہی ہے جو ہم

كُنَّا نَبْغِي ۖ ۙ فَأَرْتَدَّا عَلَىٰ آثَارِهِمَا قَصَصًا ۖ ۙ فَوَجَدَا عَبْدًا مِنْ

چاہتے تھے، پھر اٹے پھرے اپنے پیر پہناتے، پھر پایا ایک بندہ

عِبَادِنَا أَتَيْنَهُ رَحْمَةً مِّنْ عِندِنَا وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ۝۶۵

ہمارے بندوں میں کچا جس کو دی تھی ہم نے رحمت اپنے پاس سے اور سکھایا تھا اپنی پاس سے ایک علم،

قَالَ لَهُ مُوسَىٰ هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَىٰ أَن تُعَلِّمَ مِن مِّمَّا عَلَّمْتَ ارْشَادًا ۝۶۶

کہا اس کو موسیٰ نے کہ تو میرے ساتھ رہوں اس بات پر کہ مجھ کو سکھادے کچھ جو تجھ کو سکھائی ہے بھلی راہ

قَالَ إِنَّكَ لَن تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝۶۷ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَىٰ مَا لَمْ

بولا تو نہ ٹھہر سکے گا میرے ساتھ، اور کیونکر ٹھہریگا دیکھ کر ایسی چیز کو کہ تیرے قابو

يَحْتَسِبُ بِهِ خَبْرًا ۝۶۸ قَالَ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ صَابِرًا وَلَا أَعْصِي

میں نہیں اس کا سمجھنا، کہا تو پاسے گا اگر اللہ نے چاہا مجھ کو ٹھہرنے والا اور نہ ٹالوں گا تیرا

لَكَ أَمْرًا ۝۶۹ قَالَ فَإِنِ اتَّبَعْتَنِي فَلَا تَسْأَلْنِي عَنْ شَيْءٍ حَتَّىٰ أُحْدِثَ

کوئی حکم، بولا پھر اگر میرے ساتھ رہنا ہی تو مت پوچھو مجھ سے کوئی چیز جب تک میں شروع نہ

لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ۝۷۰

کردوں تیرے آگے اس کا ذکر۔

خلاصہ تفسیر

اور وہ وقت یاد کر دیجو کہ موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے خادم سے (جن کا نام پوشع تھا رداہ البخاری) فرمایا کہ میں (اس سفر میں) برابر چلا جاؤں گا یہاں تک کہ اُس موقع پر پہنچ جاؤں جہاں دودریا آپس میں ملے ہیں یا یوں ہی زمانہ دراز تک چلتا رہوں گا رادرجہ اس سفر کی یہ ہوتی تھی کہ ایک بار حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل میں وعظ فرمایا، تو کسی نے پوچھا کہ اس وقت آدمیوں میں سب سے بڑا عالم کون شخص ہے؟ آپ نے فرمایا ”میں“ مطلب یہ تھا کہ ان میں کہ جن کو قرب الی اللہ کی تحصیل میں دخل ہے میرے برابر کوئی نہیں، اور یہ فرمانا صحیح تھا، اس لئے کہ آپ نبی اولوالعزم تھے، آپ کے برابر دوسرے کو یہ علم نہیں تھا، لیکن ظاہر اللفظ مطلق تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا کہ آپ کو استیاض فی الکلام کی تعلیم دی جائے، غرض ارشاد ہوا کہ ایک ہمارا بندہ مجمع البحرین میں تم سے زیادہ علم رکھتا ہے، مطلب یہ تھا کہ بعض علوم میں وہ زیادہ ہے گو ان علوم کو قرب الہی میں دخل نہ ہو جیسا عنقریب واضح ہو گا، لیکن اس بناء

پر جواب میں مطلقاً تو اپنے کو اعلم کہنا نہ چاہئے تھا، غرض موسیٰ علیہ السلام ان کے ملنے کے مشتاق ہوئے اور پوچھا کہ ان تک پہنچنے کی کیا صورت ہے؟ ارشاد ہوا کہ ایک بے جان مچھلی اپنے ساتھ لے کر سفر کرو، جہاں وہ مچھلی گم ہو جائے وہ شخص وہیں ہے۔

اس وقت موسیٰ علیہ السلام نے یوشع کو ساتھ لیا، اور یہ بات فرمائی، پس جب (چلتے چلتے) دونوں دریاؤں کے جمع ہونے کے موقع پر پہنچے (وہاں کسی پتھر سے لگ کر سو رہے اور وہ مچھلی باذنہ تعالیٰ زندہ ہو کر دریا میں جا پڑی، یوشع علیہ السلام نے بیدار ہو کر مچھلی کو نہ پایا، ارادہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام جاگیں گے تو اس کا ذکر کر دوں گا، مگر ان کو مطلق یاد نہ رہا، شاید اہل و عیال اور وطن وغیرہ کے خیالات کا ہجوم ہوا، مگر جو ذکر کرنا بھول گئے، درنہ ایسی عجیب بات کا بھول جانا کم ہوتا ہے، لیکن جو شخص ہر وقت تجزات دیکھتا ہو اس کے ذہن سے کسی ادنیٰ درجہ کی عجیب بات کا نکل جانا کسی خیال کے غلبہ سے عجیب نہیں، اور موسیٰ علیہ السلام کو بھی پوچھنے کا خیال نہ رہا، اس طرح سے) اس اپنی مچھلی کو دونوں بھول گئے اور مچھلی نے (اس کے قبل زندہ ہو کر) دریا میں اپنی راہ لی اور چل دی، پھر جب دونوں (وہاں سے) آگے بڑھ گئے (اور دور نکل گئے) تو موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے خادم سے فرمایا کہ ہمارا ناشتہ تو لاؤ ہم کو تو اس سفر (یعنی آج کی منزل) میں بڑی تکلیف پہنچی (اور اس کے قبل کی منزلوں میں نہیں تنھکے تھے، جس کی وجہ ظاہراً موقع مقصود سے آگے بڑھ آنا تھا، خادم نے کہا کہ لیجئے دیکھئے عجیب بات ہوئی) جب ہم اس پتھر کے قریب ٹھہرے تھے (اور سو گئے تھے) اس وقت اس مچھلی کا ایک قصہ ہوا اور میرا ارادہ آپ سے ذکر کرنے کا ہوا لیکن میں کسی دوسرے دھیان میں لگ گیا) سو میں اس مچھلی (کے تذکرہ) کو بھول گیا اور مجھ کو شیطان ہی نے بھلا دیا کہ میں اس کو ذکر کرتا، اور (وہ قصہ یہ ہوا کہ) اس مچھلی نے (زندہ ہونے کے بعد) دریا میں عجیب طور پر اپنی راہ لی (ایک عجیب طور پر تو خود زندہ ہو جانا ہے دوسرا عجیب طور یہ کہ وہ مچھلی دریا میں جہاں کو گزری تھی وہاں کا پانی بطور خرق عادت کے اسی طرح سرنگ کے طور پر ہو گیا تھا غالباً پھر مل گیا ہو گا) موسیٰ (علیہ السلام) نے (یہ حکایت سُن کر) فرمایا کہ یہ ہی وہ موقع ہے جس کی ہم کو تلاش تھی (وہاں ہی ٹوٹنا چاہئے) سو دونوں اپنے قدموں کے نشان دیکھتے ہوئے اُلٹے پلٹے (غالباً وہ رستہ سڑک کا نہ ہو گا) اس لئے نشان دیکھنے پڑے) سو وہاں پہنچ کر انھوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے (یعنی خضر) کو پایا جن کو ہم نے اپنے خاص رحمت (یعنی مقبولیت) دی تھی (مقبولیت کے معنی میں ولایت اور نبوت دونوں کا احتمال ہے) اور ہم نے ان کو اپنے پاس سے (یعنی بلا واسطہ اسباب اکتساب) ایک خاص طور کا علم سکھایا تھا (مراد اس سے علم اسرار کو یہ ہے جیسا واقعات آئندہ

سے معلوم ہوگا، اور اس علم کو حصولِ قرب الہی میں کچھ دخل نہیں، جس علم کو قرب میں دخل ہے وہ علم اسرارِ الہیہ ہے، جس میں موسیٰ علیہ السلام بڑھے ہوئے تھے، غرض (موسیٰ علیہ السلام) نے (ان کو سلام) کیا اور ان سے (فرمایا کہ میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں) یعنی آپ مجھے اپنی ساتھ رہنے کی اجازت دیجیے اس شرط سے کہ جو علم مذہبِ آپ کو (من جانب اللہ) سکھایا گیا ہے اس میں سے آپ مجھ کو بھی سکھلا دیں، ان بزرگ نے جواب دیا آپ میرے ساتھ رہ کر (میرے افعال پر) صبر نہ ہو سکتے گا (یعنی آپ مجھ پر روک ٹوک کریں گے اور معلم پر تعلیم کے متعلق متعلم کی روک ٹوک کرنے سے مصاحبت مشکل ہے) اور (بھلا) ایسے امور پر (روک ٹوک کرنے سے) آپ کیسے صبر کریں گے جو آپ کے احاطہ واقفیت سے باہر ہیں (یعنی ظاہر میں وہ امور بوجہ منشاء معلوم نہ ہونے کے خلاف شرع نظر آئیں گے اور آپ خلاف شرع امور پر سکوت نہ کر سکیں گے) موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ (نہیں) اللہ! آپ مجھ کو صابر (یعنی مضابط) پائیں گے اور میں کسی بات میں آپ کے خلاف حکم نہ کروں گا (یعنی مشرأ اگر روک ٹوک سے منع کر دیں گے میں روک ٹوک نہ کروں گا، اسی طرح اور کسی بات میں بھی خلاف نہ کروں گا) ان بزرگ نے فرمایا کہ (چھا) تو اگر آپ میرے ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو اتنا خیال رہو کہ مجھ سے کسی بات کی نسبت کچھ بڑھنا نہیں جب تک کہ اس کے متعلق میں خود ہی ابتداء نہ کر نہ کر دوں۔

معارف و مسائل

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَلْبِهِ اسْمِعْ لِيَ مِنْ شَرِّ هَٰذَا النَّارِ، اس واقعہ میں موسیٰ سے مراد مشہور پیغمبر موسیٰ بن عمران علیہ السلام ہیں، نوف بکالی نے جو دوسرے کسی موسیٰ کی طرف اس واقعہ کو منسوب کیا ہے صحیح بخاری میں حضرت ابن عباسؓ کی طرف سے اس پر سخت رد منقول ہے۔

اور فتنی کے لفظی معنی نوجوان کے ہیں، جب یہ لفظ کسی خاص شخص کی طرف منسوب کر کے استعمال کیا جاتا ہے تو اس کا خادم مراد ہوتا ہے، کیونکہ خدمت گار اکبر قوی جوان دیکھ کر رکھا جاتا ہے جو ہر کام انجام دے سکے، اور نوکر خادم کو جوان کے نام سے پکارنا اسلام کا حسن ادب ہے کہ نوکروں کو بھی غلام یا نوکر کہہ کر خطاب نہ کر دبلکہ اچھے لقب سے پکارو، اس جگہ فتنی کی نسبت موسیٰ علیہ السلام کی طرف ہے، اس لئے مراد ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خادم، اور روایات حدیث میں ہے کہ یہ خادم یوشع بن نون ابن افراتیم بن یوسف علیہ السلام تھے، بعض روایات میں ہر کہ یہ موسیٰ علیہ السلام کے بھانجے تھے، مگر اس میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا، صحیح روایات سے ان کا نام یوشع بن نون ہونا تو ثابت ہے، باقی اوصاف و حالات کا ثبوت نہیں۔ (قرطبی)

جمع البحرین کے لفظی معنی ہر وہ جگہ ہے جہاں دو دریا ملتے ہوں، اور یہ ظاہر ہے کہ ایسے مواقع دنیا میں بے شمار ہیں، اس جگہ جمع البحرین سے کوئی جگہ مراد ہے، چونکہ قرآن و حدیث میں اس کو معین طور پر نہیں بتلایا، اس لئے آثار و قرائن کے اعتبار سے مفسرین کے اقوال اس میں مختلف ہیں، قتادہؒ نے فرمایا کہ بحر فارس و روم کے ملنے کی جگہ مراد ہے، ابن عطیہؒ نے آذربائیجان کے قریب ایک جگہ کو کہا ہے، بعض نے بحر اردن اور بحر قزقم کے ملنے کی جگہ بتلائی ہے، بعض نے کہا یہ مقام ملجہ میں واقع ہے، ابی بن کعبؓ سے منقول ہے کہ یہ افریقہ میں ہے، سدی نے آرمینیا میں بتلایا ہے، بعض نے بحر اندلس جہاں بحر محیط سے ملتا ہے وہ موقع بتلایا ہے، واللہ اعلم بہر حال اتنی بات ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ مقام معین کر کے بتلادیا تھا جس کی طرف ان کا سفر واقع ہوا ہے۔ (قرطبی)

قصہ حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام | اس واقعہ کی تفصیل صحیح بخاری و مسلم میں بروایت حضرت ابی بن کعبؓ اس طرح آتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل میں خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے، تو لوگوں نے آپ سے یہ سوال کیا کہ تمام انسانوں میں سب سے زیادہ علم والا کون ہے (حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علم میں اپنے سے زیادہ علم والا کوئی تھا نہیں اس لئے) فرمایا کہ ”میں سب سے زیادہ علم والا ہوں“ اللہ تعالیٰ اپنے مقرب بارگاہ انبیاء کو خاص تربیت دیتے ہیں اس لئے یہ بات پسند نہ آئی بلکہ ادب کا مقتضی یہ تھا کہ اس کو اللہ کے علم کے حوالے کرتے، یعنی یہ کہہ دیتے کہ اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ ساری مخلوق میں علم کون ہے (حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس جواب پر اللہ تعالیٰ کا عتاب ہوا، موسیٰ علیہ السلام پر وحی آئی کہ ہمارا ایک بندہ مجمع البحرین پر ہے، وہ آپ سے زیادہ اعلم ہے، موسیٰ علیہ السلام کو جب یہ معلوم ہوا تو اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ جب وہ مجھ سے زیادہ اعلم ہیں تو مجھے ان سے استفادہ کے لئے سفر کرنا چاہئے) اس لئے عرض کیا یا اللہ مجھے ان پتہ نشان بتلایا جائے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایک مچھلی اپنی زنبیل میں رکھ لو، اور مجمع البحرین کی طرف سفر کرو، جس جگہ پہنچ کر یہ مچھلی گم ہو جائے بس وہی جگہ ہمارے اس بندے کے ملنے کی ہے، موسیٰ علیہ السلام نے حکم کے مطابق ایک مچھلی زنبیل میں رکھ لی اور چل دیئے، ان کے ساتھ ان کے خادم یوشع بن نون بھی تھے، دوران سفر ایک پتھر کے پاس پہنچ کر اس پر سر رکھ کر لیٹ گئے، یہاں اچانک یہ مچھلی حرکت میں آگئی، اور زنبیل سے نکل کر دریا میں چلی گئی، اور مچھلی کے زندہ ہو کر دریا میں چلے جانے کے ساتھ ایک دوسرا تجڑہ یہ ہوا کہ جس رستہ سے مچھلی دریا میں گئی اللہ تعالیٰ نے وہاں پانی کا حسیریان روک دیا اور اس جگہ

پانی کے اندر ایک سرنگ جیسی ہو گئی، دیوش بن فون اس عجیب واقعہ کو دیکھ رہے تھے، موسیٰ علیہ السلام سو گئے تھے، جب بیدار ہوئے تو دیوش بن فون مچھلی کا یہ عجیب معاملہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بتلانا بھول گئے، اور اس جگہ سے پھر روانہ ہو گئے، پورے ایک دن ایک رات کا مزید سفر کیا، جب دوسرے روز کی صبح ہو گئی تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رفیق سے کہا کہ ہمارا ناشتہ لاؤ، کیونکہ اس سفر سے کافی تھکان ہو چکا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (بقضائے الہی) موسیٰ علیہ السلام کو اس سے پہلے تھکان بھی محسوس نہیں ہوا، یہاں تک کہ جس جگہ پہنچنا تھا اس سے آگے نکل آئے، جب موسیٰ علیہ السلام نے ناشتہ طلب کیا تو دیوش بن فون کو مچھلی کا واقعہ یاد آیا اور اپنے بھول جانے کا عذر کیا، کہ شیطان نے مجھے بھلا دیا تھا، کہ اس وقت آپ کو اس واقعہ کی اطلاع نہ کی، اور پھر بتلایا کہ وہ مردہ مچھلی تو زندہ ہو کر دریا میں ایک عجیب طریقہ سے چلی گئی، اس پر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ وہی تو ہمارا مقصد تھا (یعنی منزل مقصود وہی تھی جہاں مچھلی زندہ ہو کر گم ہو جائے)۔ چنانچہ اسی وقت واپس روانہ ہو گئے، اور تھیک اسی رستہ سے لوٹے جس پر پہلے چلے تھے تاکہ وہ جگہ مل جائے، اب جو یہاں اس پتھر کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ اس پتھر کے پاس ایک شخص سر سے پاؤں تک چادر تانے ہوئے لیٹا ہے، موسیٰ علیہ السلام نے (اسی حال میں) سلام کیا تو خضر علیہ السلام نے کہا کہ اس (غیر آباد) جنگل میں سلام کہاں سے آگیا، اس پر موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میں موسیٰ ہوں، تو حضرت خضر نے سوال کیا کہ موسیٰ بنی اسرائیل؟ آپ نے جواب دیا کہ ہاں میں موسیٰ بنی اسرائیل ہوں، اس لئے آیا ہوں کہ آپ مجھے وہ خاص علم سکھلا دیں جو اللہ نے آپ کو دیا ہے۔

خضر علیہ السلام نے کہا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکیں گے، اے موسیٰ! میرے پاس ایک علم ہے جو اللہ نے مجھے دیا ہے، وہ آپ کے پاس نہیں، اور ایک علم آپ کو دیا ہے جو میں نہیں جانتا، موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ انشاء اللہ تعالیٰ آپ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے، اور میں کسی کام میں آپ کی مخالفت نہیں کروں گا۔

حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر آپ میرے ساتھ چلنے ہی کو تیار ہیں تو کسی معاملہ کے متعلق مجھ سے کچھ پوچھنا نہیں جب تک کہ میں خود آپ کو اس کی حقیقت نہ بتلاؤں۔

یہ کہہ کر دونوں حضرات دریا کے کنارے کنارے چلنے لگے، اتفاقاً ایک کشتی آگئی تو کشتی والوں سے کشتی پر سوار ہونے کی بات چیت کی، ان لوگوں نے حضرت خضر علیہ السلام کو پہچان لیا اور ان سب لوگوں کو بغیر کسی کرایہ اور اجرت کے کشتی میں سوار کر لیا، کشتی میں سوار ہوتے ہی خضر علیہ السلام نے ایک کھٹاڑی کے ذریعہ کشتی کا ایک تختہ نکال ڈالا، حضرت موسیٰ

علیہ السلام دست نہ رہا گیا، کہنے لگے کہ ان لوگوں نے بغیر کسی معاوضہ کے آپ کی کشتی میں سوار کر لیا، آپ نے اس کا یہ بدلہ دیا کہ ان کی کشتی توڑ ڈالی، کہ یہ سب غرق ہو جائیں، یہ تو آپ نے بہت بُرا کام کیا، حضرت علیہ السلام نے کہا کہ میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہ کر سکیں گے، اس پر موسیٰ علیہ السلام نے عذر کیا کہ میں اپنا وعدہ بھول گیا تھا، اس بھول پر آپ سخت گیری نہ کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ واقعہ نقل کر کے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کا پہلا اعتراض حضرت علیہ السلام پر بھول سے ہوا تھا اور دوسرا بطور شرط کے اور تیسرا قصداً اسی اثنا میں ایک چڑیا آئی اور کشتی کے کنارے پر بیٹھ کر اس نے دریا میں سے ایک چوہا بھر پانی لیا، حضرت علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے کہا کہ میرا علم اور آپ کا علم دونوں میں کون سا اللہ کے علم کے مقابلہ میں اتنی حیثیت بھی نہیں رکھتے جتنی اس چڑیا کی چوہا کے پانی کو اس شخص کے ساتھ ہے۔

پھر کشتی سے اتر کر دریا کے ساحل پر چلنے لگے، اچانک حضرت علیہ السلام نے ایک لڑکے کو دیکھا کہ دست لڑکوں میں کھیل رہا ہے، حضرت علیہ السلام نے اپنے ہاتھ سے اس لڑکے کا سر اس کے بدن سے الگ کر دیا، لڑکا مار گیا، موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ آپ نے ایک معصوم بچہ کو بغیر کسی جرم کے قتل کر دیا، یہ تو آپ نے بڑا ہی گناہ کیا، حضرت علیہ السلام نے کہا کہ کیا میں نے پہلے ہی نہیں کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہ کر سکیں گے، موسیٰ نے دیکھا کہ یہ معاملہ پہلے معاملہ سے زیادہ سخت ہے، اس لئے کہا کہ اگر اس کے بعد میں نے آپ سے کوئی بات پوچھی تو آپ مجھے اپنی طرف سے الگ کر دیجئے، آپ میری طرف سے عذر کی حد پر پہنچ چکے ہیں۔

اس کے بعد کچھ چلنا شروع کیا، یہاں تک کہ ایک گاؤں پر گزر ہوا، انھوں نے گاؤں والوں سے درخواست کی کہ ہمیں اپنے یہاں مہمان رکھ لیجئے، انھوں نے انکار کر دیا، اس بستی میں ان لوگوں نے ایک دیوار کو دیکھا کہ گرا چاہتی ہے، حضرت علیہ السلام نے اس کو اپنے ہاتھ سے سیدھا کھڑا کر دیا، موسیٰ علیہ السلام نے تعجب سے کہا کہ ہم نے ان لوگوں سے مہمانی چاہی تو انھوں نے انکار کر دیا، آپ نے اتنا بڑا کام کر دیا، اگر آپ چاہتے تو اس کام کی اجرت ان سے لے سکتے تھے، حضرت علیہ السلام نے کہا کہ هَذَا اِفْرَاقٌ بَيْنِي وَبَيْنِكَ یعنی اب شرط پوری ہو چکی، اس لئے ہماری اور آپ کی مفارقت کا وقت آ گیا ہے۔

اس کے بعد حضرت علیہ السلام نے تینوں واقعات کی حقیقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بتا کر کہا اذِ لِكَ تَاوِيلٌ مَا لَمْ تَسْطِمْ عَلَيْهِ صَبْرًا، یعنی یہ حقیقت ان واقعات کی جن پر آپ سے صبر نہیں ہو سکا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پورا واقعہ ذکر کرنے کے بعد

فرمایا کہ جی چاہتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اور کچھ صبر کر لیتے تو ان دونوں کی اور کچھ خبریں معلوم ہو جاتیں (انتہی)

صحیح بخاری و مسلم میں یہ طویل حدیث اس طرح آئی ہے جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا موسیٰ بنی اسرائیل اور نوحوان ساتھی کا نام یوشع بن نون ہونا اور جس بندے کی طرف موسیٰ علیہ السلام کو مجمع البحرین کی طرف بھیجا گیا تھا ان کا نام خضر ہونا تصریحاً مذکور ہے، آگے آیات قرآن کے ساتھ ان کے مفہوم اور تفسیر کو دیکھئے۔

سفر کے بعض آداب اور | لَا أَبْرَحُ حَتَّىٰ أَبْلُغَ الْمَحْدَرَيْنِ أَوْ أَمْضِيَ حُقُبًا یہ جملہ حضرت پیغمبرانہ عزم کا ایک نمونہ | موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رفیق سفر یوشع بن نون سے کہا جس کا مطلب اپنے سفر کا رخ اور منزل مقصود رفیق کو بتانا تھا، اس میں بھی حسن ادب ہے کہ سفر کی ضروری باتوں سے اپنے رفیق اور خادم کو بھی باخبر کر دینا چاہئے، متکبر لوگ اپنے خادموں اور نوکرانوں کو نہ قابل خطاب سمجھتے ہیں نہ اپنے سفر کے متعلق ان کو کچھ بتاتے ہیں۔

حُقُبًا، حُقُبَہ کی جمع ہے، اہل لغت نے کہا کہ عقبہ انہی سال کی مدت ہے، بعض نے اس سے زیادہ کو عقبہ قرار دیا، صحیح یہ ہے کہ زمانہ دراز کو کہا جاتا ہے، تحدید و تعیین کچھ نہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رفیق کو یہ بتلادیا کہ مجھے مجمع البحرین کی اس جگہ پر پہنچنا ہے جہاں کے لئے اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا ہے، اور عزم یہ ہے کہ کتنا ہی زمانہ سفر میں گزر جائے، جب تک اس منزل مقصود پر نہ پہنچوں سفر جاری رہے گا، اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں پیغمبرانہ عزم ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔

فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا قُرْآن و سنت کی تصریحات سے واضح ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو انبیاء علیہم السلام کی جماعت میں بھی ایک خاص امتیاز حاصل ہے، اللہ تعالیٰ کی ہم کلامی کا خاص شرف اور ان کے معجزے

ان کی مخصوص فضیلت ہے، اور حضرت خضر علیہ السلام کی تو نبوت میں بھی اختلاف ہے، اور نبوت کو تسلیم بھی کیا جائے تو مقام رسالت حاصل نہیں، نہ ان کی کوئی کتاب ہے نہ کوئی خاص امت، اس لئے بہر حال موسیٰ علیہ السلام خضر علیہ السلام سے بدرجہا افضل ہیں لیکن حق تعالیٰ اپنے مہتر بن کی ادنیٰ سی کمی اور کوتاہی کی اصلاح فرماتے ہیں، ان کی تربیت کے لئے ادنیٰ سی کوتاہی پر بھی سخت عتاب ہوتا ہے، اس کا تدارک بھی ان سے اسی پیمانے پر کرایا جاتا ہے، یہ سارا قصہ اسی خاص انداز تربیت کا مظہر ہے، ان کی زبان سے یہ کلمہ نکل گیا

کہ میں سب سے زیادہ علم والا ہوں، حق تعالیٰ کو یہ پسند نہ آیا تو ان کی تنبیہ کے لئے اپنے ایک ایسے بندے کا ان کو پتہ دیا گیا جن کے پاس اللہ کا دیا ہوا ایک خاص علم تھا، جو موسیٰ علیہ السلام کے پاس نہیں تھا۔ اگرچہ موسیٰ علیہ السلام کا علم ان کے علم سے درجہ میں بہت بڑھا ہوا تھا، مگر بہر حال وہ موسیٰ علیہ السلام کو حاصل نہ تھا، ادھر موسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے طلب علم کا ایسا جذبہ عطا فرمایا تھا کہ جب یہ معلوم ہوا کہ کہیں اور بھی علم ہے، جو مجھے حاصل نہیں تو اس کے حاصل کرنے کے لئے طالب علمانہ سفر کے لئے تیار ہو گئے اور حق تعالیٰ ہی سے اس بندے (خضر علیہ السلام) کا پتہ پوچھا، اب یہاں یہ بات قابل نظر ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو خضر علیہ السلام سے موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات یہیں آسانی سے کر دیتے، یا موسیٰ علیہ السلام ہی کو طالب علم بنا کر سفر کرانا تھا تو پتہ صاف بتا دیا جاتا جہاں پہونچنے میں پریشانی نہ ہوتی، مگر ہوا یہ کہ پتہ ایسا مبہم بتلایا گیا کہ جس جگہ پہونچ کر مری ہوئی پھلی زندہ ہو کر کرم ہو جائے اس جگہ وہ ہمارا بندہ ملے گا۔

صحیح بخاری کی حدیث سے اس پھلی کے متعلق اتنا ثابت ہوا کہ حق تعالیٰ ہی کی طرف سے یہ حکم ہوا تھا کہ ایک پھلی اپنی زنبیل میں رکھ لیں، اس سے زائد یہ کچھ معلوم نہیں کہ یہ پھلی کھانے کے لئے ساتھ رکھنے کا حکم ہوا تھا یا کھانے سے علاوہ دونوں احتمال ہیں، اسی لئے مفسرین میں سے بعض نے کہا کہ یہ بھوئی ہوئی پھلی کھانے کے لئے رکھی گئی تھی، اور اس سفر کے دونوں ساتھی دوران سفر اس میں سے کھاتے بھی رہے، اس کا نصف حصہ کھایا جا چکا تھا، اس کے بعد بطور معجزہ یہ بھوئی ہوئی اور آدمی کھاتی ہوئی پھلی زندہ ہو کر دریا میں چلی گئی۔

ابن عطیہ اور بعض دوسرے لوگوں نے یہ بھی بیان کیا کہ یہ پھلی بطور معجزہ کے پھر دنیا میں باقی بھی رہی اور بہت دیکھنے والوں نے دیکھا بھی کہ اس کی صرف ایک کروٹ ہے اور دوسری کھاتی ہوئی ہے، ابن عطیہ نے خود بھی اپنا دیکھنا بیان کیا ہے (قرطبی) اور بعض مفسرین نے کہا کہ ناشتہ کھانے کے علاوہ ایک علاوہ زنبیل میں پھلی رکھنے کا حکم ہوا تھا، اس کے مطابق رکھی گئی تھی، اس میں بھی اتنی بات تو متعین ہو کہ پھلی مردہ تھی، زندہ ہو کر دریا میں چلا جانا ایک معجزہ ہی تھا۔

بہر حال حضرت خضر علیہ السلام کا پتہ ایسا مبہم دیا گیا کہ آسانی سے جگہ متعین نہ ہو سکتا ہے یہ ہے کہ یہ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ابتلا و امتحان ہی تھا، اس پر مزید امتحان کی صورت یہ پیدا کی گئی کہ جب عین موقع پر یہ لوگ پہونچ گئے تو پھلی کو قبول گئے، آیت قرآنی میں یہ بھول حضرت موسیٰ اور ان کے رفیق دونوں کی طرف منسوب کی گئی ہے، شکیا

بہر حال، لیکن حدیث بخاری سے جو قصہ ثابت ہوا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت پھلی

کے زندہ ہو کر دریا میں جانے کا وقت آیا تو موسیٰ علیہ السلام سو سے سو سے تھے، صرف یوشع بن نون نے یہ واقعہ عجیبہ دیکھا اور ارادہ کیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام بیدار ہو جائیں تو ان کو بتلاؤں گا، مگر بیداری کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان پر نسیان مسلط کر دیا اور بھول گئے، تو یہاں دونوں کی طرف بھولنے کی نسبت ایسی ہو گی جیسے شرآن میں یَحْجُجُ مِنْهُمْ الْغَوِيُّ وَالْمَرْجَانُ میں دریا سے شیریں اور دریا شور دونوں سے موتی اور مرجان نکلنے کا بیان آیا ہے، حالانکہ موتی مرجان صرف دریا سے شور سے نکلتے ہیں مگر محاورات میں تغلیباً ایسا لکھنا ایک عادت ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس جگہ سے آگے سفر کرنے کے وقت تو پھلی کو ساتھ لینا دونوں ہی بزرگ بھولے ہوئے تھے، اس لئے دونوں کی طرف نسیان منسوب کیا گیا۔

بہر حال یہ ایک دوسری آزمائش تھی کہ منزل مقصود پر پہنچ کر مچھلی کے زندہ ہو کر پانی میں گم ہو جانے سے حقیقت کھل جاتی ہے اور مقام متعین ہو جاتا ہے، مگر ابھی اس طالب حق کا کچھ اور بھی امتحان لینا تھا، اس لئے دونوں پر بھول مسلط ہو گئی، اور پورے ایک دن اور ایک رات کا مزید سفر طے کرنے کے بعد بھوک اور تھکان کا احساس ہوا، یہ تیسرا امتحان تھا، کیونکہ عادت تھکان اور بھوک کا احساس اس سے پہلے ہو جانا چاہئے تھا، وہیں پھلی یاد آجاتی تو اتنی طویل سفر کی مزید تکلیف نہ ہوتی، مگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہی تھا کہ کچھ اور مشقت اٹھائے اتنا طویل سفر کرنے کے بعد بھوک پیاس کا احساس ہوا اور پھلی یاد آئی اور یہ معلوم ہوا کہ ہم منزل مقصود بہت آگے آگئے، اس لئے پھر اس نشان قدم پر واپس لوٹے۔

پھلی کے دریا میں چلے جانے کا ذکر پہلی مرتبہ فوسر بابا کے لفظ سے آیا ہے، سرب کے معنی سرنگ کے ہیں، جو پہاڑوں میں رستہ بنانے کے لئے کھودی جاتی ہے، یا شہروں میں زمین دوز رستہ بنانے کے لئے کھودی جاتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ پھلی جب دریا میں گئی تو جس طرف کو جاتی پانی میں ایک سرنگ سی بنتی چلی گئی، کہ اس کے جانے کا رستہ پانی سے کھلا رہا، جیسا کہ صحیح بخاری کی روایت سے واضح ہوا، دوسری مرتبہ جب یوشع ابن نون نے موسیٰ علیہ السلام سے اس واقعہ کا ذکر سفر طویل کے بعد کیا وہاں دَاثَخْنَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ عَجَباً الفاظ سے اس واقعہ کو بیان کیا، ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں، کیونکہ پانی کے اندر سرنگ بننے چلے جانا خود ایک واقعہ عجیبہ حشری عادت تھا۔

حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات	قرآن کریم میں اگرچہ اس صاحب واقعہ کا نام مذکور نہیں، بلکہ
اور ان کی نبوت کا مسئلہ	عَبْدَ آتَمٍ عِبَادِنا کہا گیا، مگر صحیح بخاری کی حدیث میں ان کا

نام خضر بتلایا گیا ہے، خضر کے لفظی معنی ہرے بھرے کے ہیں، ان کا نام خضر ہونے کی وجہ عامہ مفسرین نے یہ بتلائی ہے کہ یہ جس جگہ بیٹھ جاتے تو کیسی ہی زمین ہو وہاں گھاس اُگ جاتی، اور

زمین سرسبز ہو جاتی تھی، مگر قرآن کریم نے یہ بھی واضح نہیں کیا کہ خضر علیہ السلام کوئی پیغمبر تھے یا اولیاء اللہ میں سے کوئی فرد تھے، لیکن جمہور علماء کے نزدیک ان کا نبی ہونا خود قرآن کریم میں ذکر کئے ہوئے واقعات سے ثابت ہے، کیونکہ خضر علیہ السلام سے اس سفر میں جتنے واقعات ثابت ہیں، ان میں سے بعض تو قطعی طور پر خلاف شرع ہیں اور حکم شریعت سے کوئی استثناء بجز وحی الہی کے ہو نہیں سکتا، جو نبی اور پیغمبر ہی کے ساتھ مخصوص ہے، دلی کو بھی کشف یا الہام سے کچھ چیزیں معلوم ہو سکتی ہیں، مگر وہ کوئی حجت نہیں ہوتی، ان کی بناء پر ظاہر شریعت کے کسی حکم کو بدلانا نہیں جاسکتا، اس لئے یہ متعین ہو جاتا ہے کہ خضر علیہ السلام اللہ کے نبی اور پیغمبر تھے، ان کو بذریعہ وحی الہی بعض خلاص احکام وہ دیئے گئے تھے جو ظاہر شریعت کے خلاف تھے، انہوں نے جو کچھ کیا اس استثنائی حکم کے ماتحت کیا، خود ان کی طرف سے اس کا اعتبار بھی قرآن کے اس جملے میں ہو گیا وَمَا فَعَلْتُمْ عَنْ أَمْرِی (یعنی میں نے جو کچھ کیا اپنی طرف سے نہیں کیا، بلکہ امر الہی سے کیا) خلاصہ یہ ہے کہ جمہور امت کے نزدیک حضرت خضر علیہ السلام بھی ایک نبی اور پیغمبر ہیں، مگر ان کے کچھ کمزوری خدشہ بنائے اللہ سپرد کی گئی تھیں اپنی کا علم دیا گیا تھا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس کی اطلاع نہ تھی، اسی لئے اس پر اعتراض کیا، تفسیر قرطبی، بحر محیط، البوہیان اور اکثر تفاسیر میں یہ مضمون بعنوانات مختلفہ مذکور ہے۔

کسی دلی کو ظاہر شریعت کے حکم میں سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ بہت سے جاہل غلط کار تصوف کے خلاف ورزی حلال نہیں | کو بدنام کرنے والے صوفی جو کہنے لگے کہ شریعت اور چیز ہے اور طریقت اور ہے، بہت سی چیزیں شریعت میں حرام ہوتی ہیں مگر طریقت میں جائز ہیں اس لئے کسی دلی کو صریح گناہ کبیرہ میں مبتلا دیکھ کر بھی اس پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا، یہ کھلا ہوا زندہ اور باطل ہے، حضرت خضر علیہ السلام پر کسی دنیا کے دلی کو قیاس نہیں کیا جاسکتا، اور نہ ظاہر شریعت کے خلاف اس کے کسی فعل کو جائز کہا جاسکتا ہے۔

شاگرد پر استاد کا | هَلْ أَتَيْتُكَ عَلَىٰ أَنْ تُعَلِّمَنِي مِمَّا عَلَّمْتُكَ؟ اس میں حضرت اتباع لازم ہے | موسیٰ علیہ السلام نے باوجود نبی و رسول اور اولوالعزم پیغمبر ہونے کے حضرت خضر سے تعظیم و تکریم کے ساتھ درخواست کی کہ میں آپ کا علم سیکھنے کے لئے ساتھ چلنا چاہتا ہوں، اس سے معلوم ہوا کہ تحصیل علم کا ادب یہی ہے کہ شاگرد اپنے استاد کی تعظیم و تکریم اور اتباع کرے، اگرچہ شاگرد اپنے استاد سے افضل و اعلیٰ بھی ہو (قرطبی، مظہری)۔

ہام شریعت کیلئے جائز نہیں کہ خلاف شرع امر پر صبر کرے | إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا وَكَيْفَ تَصْبِرُ

عَلَى مَا لَمْ يَحِطُ بِهِ مُخْبَرًا ۚ حضرت خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکیں گے اور کیسے صبر کریں گے جب کہ آپ کو حقیقت امر کی اطلاع نہ ہو، مطلب یہ تھا کہ مجھے جو علم عطا ہوا ہے اس کی نوعیت آپ کے علم سے مختلف ہے، اس لئے آپ کو میرے معاملات قابل اعتراض نظر آئیں گے جب تک کہ میں ان کی حقیقت سے آپ کو مطلع نہ کر دوں، آپ اپنے فرض منصبی کی بناء پر اس پر اعتراض کریں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چونکہ خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے پاس جانے اور ان سے علم سیکھنے کا حکم ہوا تھا، اس لئے یہ اطمینان تھا کہ ان کا کوئی فعل درحقیقت خلاف شرع نہیں ہوگا، گو ظاہر میں سمجھ میں نہ آئے، اس لئے صبر کرنے کا وعدہ کر لیا، ورنہ ایسا وعدہ کرنا بھی کسی عالم دین کے لئے جائز نہیں، لیکن پھر شراعت کے بارے میں دینی غیرت کے جذبہ سے مغلوب ہو کر اس وعدہ کو بھول گئے۔

پہلا واقعہ تو زیادہ سنگین بھی نہیں تھا، صرف کشتی والوں کا مالی نقصان یا غرق ہونے کا صرف خطرہ ہی تھا جو بعد میں رفع ہو گیا، لیکن بعد کے واقعات میں موسیٰ علیہ السلام نے یہ وعدہ بھی نہیں کیا کہ میں اعتراض نہیں کروں گا، اور جب لڑکے کے قتل کا واقعہ دیکھا تو شدت کے ساتھ اعتراض کیا اور اپنے اعتراض پر کوئی عذر بھی پیش نہیں کیا، صرف اتنا کہا کہ اگر آئندہ اعتراض کروں تو آپ کو حق ہو گا کہ مجھے ساتھ نہ رکھیں، کیونکہ کسی نبی اور پیغمبر سے یہ برداشت نہیں ہو سکتا کہ خلاف شرع کام ہوتا دیکھ کر صبر کرے، البتہ چونکہ دوسری طرف بھی پیغمبر ہی تھے اس لئے بالآخر حقیقت کا انکشاف اس طرح ہوا کہ یہ واقعات جزئیہ خضر علیہ السلام کے لئے عام قواعد شرعیہ سے مستثنیٰ کر دیئے گئے تھے، انھوں نے جو کچھ کیا وہی الہی کے مطابق کیا (مظہری) علم موسوی اور علم خضریٰ یہاں طبعی طور پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ خضر علیہ السلام کی تصریح کے میں ایک بنیادی فرق اور مطابق ان کو جو علم عطا ہوا تھا اس کی نوعیت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علم سے مختلف تھی، مگر جب کہ یہ دونوں علم حق تعالیٰ ہی کی طرف سے عطا ہوئے تھے، تو ان دونوں کے احکام میں تضاد و اختلاف کیوں ہوا، اس کی تحقیق تفسیر مظہری میں حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے جو لکھی ہے وہ اقرب الی الصواب اور دل کو لگنے والی ہے، ان کی تقریر کا مطلب جو میں سمجھا ہوں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ :-

حق تعالیٰ جن حضرات کو اپنی وحی اور نبوت سے سرفراز فرماتے ہیں وہ عموماً تو وہی حضرات ہوتے ہیں جن کے سپرد اصلاح خلق کی خدمت ہوتی ہے، ان پر کتاب اور شریعت نازل کی جاتی ہے جن میں خلق خدا کی ہدایت اور اصلاح کے اصول و قواعد ہوتے ہیں، جتنے انبیاء علیہم السلام کا ذکر

تشریح کریم میں بتصریح نبوت و رسالت آیا ہے وہ سب کے سب ایسے ہی تھے جن کے سپرد تشریحی اور اصلاحی خدمات تھیں، ان پر جو وحی آتی تھی وہ بھی سب اسی سے متعلق تھی، مگر دوسری طرف کچھ تکوینی خدمات بھی ہیں جن کے لئے عام طور سے ملائکہ اللہ مقرر ہیں، مگر زمرہ انبیاء میں بھی حق تعالیٰ نے بعض کو اسی قسم کی تکوینی خدمات کے لئے مخصوص کر لیا ہے، حضرت خضر علیہ السلام اسی زمرہ میں سے ہیں، تکوینی خدمات واقعات جزئیہ سے متعلق ہوتی ہیں، کہ فلاں شخص ڈوبنے والے کو، بچا لیا جائے یا فلاں کو ہلاک کر دیا جائے، فلاں کو ترقی دی جائے فلاں کو زبر کیا جائے ان معاملات کا نہ عام لوگوں سے کوئی تعلق ہوتا ہے نہ ان کے احکام عوام سے متعلق ہوتے ہیں ایسے واقعات جزئیہ میں بعض وہ صورتیں بھی پیش آتی ہیں کہ ایک شخص کو ہلاک کرنا تشریحی قانون کے خلاف ہے مگر تکوینی قانون میں اس خاص واقعہ کو عام تشریحی قانون سے مستثنیٰ کر کے اس شخص کے لئے جائز کر دیا گیا ہے جس کو اس تکوینی خدمت پر مامور فرمایا گیا ہے، ایسے حالات میں شرعی قوانین کے علمبرار اس استثنائی حکم سے واقف نہیں ہوتے اور وہ اس کو حرام کہنے پر مجبور ہوتے ہیں، اور جو شخص تکوینی طور پر اس قانون سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے وہ اپنی جگہ حق پر ہوتا ہے خلاصہ یہ ہے کہ جہاں یہ تضاد نظر آتا ہے وہ درحقیقت تضاد نہیں ہوتا، بعض واقعات جزئیہ کا عام قانون شریعت سے استثناء ہوتا ہے، ابو حیان نے بحر محیط میں فرمایا: **الجمہور علی ان الخضر نبی وکان علیہ مصافحۃ لبواطن قد اوحیت الیہ وعلیہ موسیٰ** (احکام والفتا بالظاہر بحر محیط ص ۱۳۷ ج ۶) اس لئے یہ بھی ضروری ہے کہ یہ استثناء بذریعہ وحی نبوت ہو، کسی ولی کا کشف و البہام ایسا استثناء کرنے کے لئے ہرگز کافی نہیں، اسی لئے حضرت خضرؑ کا لڑکے کو بظاہر ناحق قتل کرنا ظاہر شریعت میں حرام تھا لیکن حضرت خضرؑ تکوینی طور پر اس قانون سے مستثنیٰ کر کے مامور کئے گئے تھے، ان پر کسی غیر نبی کے کشف و البہام کو قیاس کر کے کسی حرام کو حلال سمجھنا جیسے بعض جاہل صوفیوں میں مشہور ہے بالکل بے دینی اور اسلام سے بغاوت ہے۔

ابن ابی شیبہ نے حضرت ابن عباسؓ کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ نجدہ حروری (خارجی) نے ابن عباسؓ کو خط لکھا کہ خضر علیہ السلام نے لڑکے کو نابالغ کو کیسے قتل کر دیا جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نابالغ کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے، حضرت ابن عباسؓ نے جواب میں لکھا کہ اگر کسی بچے کے متعلق تمہیں وہ علم حاصل ہو جائے، جو موسیٰ علیہ السلام کے علم (یعنی خضر علیہ السلام) کو حاصل ہوا تھا تو تمہارے لئے بھی نابالغ کا قتل جائز ہو جائے گا مطلب یہ تھا کہ خضر علیہ السلام کو تو بذریعہ وحی نبوت اس کا علم ہوا تھا، وہ اب کسی کو نہیں دیتا

کیونکہ نبوت ختم ہو چکی ہے، آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا جسکو بذریعہ وحی اس قسم کے واقعات کے متعلق کسی حکم خداوندی سے کسی خاص شخص کو مستثنیٰ کرنے کا علم ہو سکے (منظری) اس واقعہ سے بھی یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ کسی شخص کو کسی حکم شرعی سے مستثنیٰ قرار دینے کا نبی صاحب وحی کے سوا کسی کو حق نہیں۔

فَانْطَلَقَا حَتَّىٰ اِذَا رَكِبَا فِي السَّفِينَةِ خَرَقَهَا ۚ قَالَ اٰخَرُ قَوْمِهَا

پھر دونوں چلے یہاں تک کہ جب چڑھے کشتی میں اس کی بھاڑ ڈالا موسیٰ بولا کیا تو نے اس کو بھاڑ ڈالا

لِيُخْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا اِمْرًا ۝۱۸ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ

کہڑا ہے اس کے لوگوں کو البتہ تو نے کی ایک چیز بھاری، بولایں نے نہ کہا تھا تو نہ

لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝۱۹ قَالَ لَا تَخُذْنِي بِمَا نَسِيتُ وَلَا

ٹھہر کے گا میرے ساتھ، کہا مجھ کو نہ پکڑ میری بھول پر اور مت

تُرْهِقْنِي مِنْ اَمْرِى عَسْرًا ۝۲۰ فَاَنْطَلَقَا حَتَّىٰ اِذَا الْقِيَامَةُ فُتِلَتْهُ

ڈال مجھ پر میرا کام مشکل، پھر دونوں چلے یہاں تک کہ جب ایک لڑکے سے تو اس کو مار ڈالا،

قَالَ اَقْتَلْتَ نَفْسًا شَرًّا كَيِّتَ ۚ بِغَيْرِ نَفْسٍ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُّكْرًا ۝۲۱

موسیٰ بولا کیا تو نے مار ڈالی ایک جان ستھری بغیر عوض کسی جان کے بیشک تو نے کی ایک چیز نامعقول

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝۲۲

بولایں نے تجھ کو نہ کہا تھا کہ تو نہ ٹھہر کے گا میرے ساتھ،

قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍ بَعْدَ هٰذَا فَلَا تُصَحِّبْنِي ۚ قَدْ بَلَغْتَ

کہا اگر تجھ سے پوچھوں کوئی چیز اس کے بعد تو مجھ کو ساتھ نہ رکھیں، تو اتنا چکا

مِنْ لَّدُنِّي عَذْرًا ۝۲۳ فَاَنْطَلَقَا حَتَّىٰ اِذَا آتٰی اَهْلَ قَرْيَةٍ

میری طرف سے الزام، یہاں تک کہ جب پہنچے ایک گاؤں کے لوگوں تک

وَاِسْتَطَعْنَا اَهْلُهَا فَاَبْوَا اَنْ يُضَيَّفُوهُمْ فَرَجَدَا فَاِذَا جَدَّ اسْرًا

کھانا چاہا وہاں کے لوگوں سے انھوں نے نہ مانا کہ ان کو یہاں رکھیں پھر پانی وہاں ایک دیوار

يُرِيدُ أَنْ يَنْقُضَ فَاقَامَهُ ۖ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ أَجْرًا ۝

جو گرا چاہتی تھی اس کو سیدھا کر دیا، بولا (موسیٰ) اگر تو چاہتا تو لے لیتا اس پر مزدوری

قَالَ هَذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنَكَ ۚ سَأُنَبِّئُكَ بِتَأْوِيلِ مَا لَمْ تَسْطِمْ

کہا اب جدائی ہے میرے اور تیرے بیچ اب جتلائے دیتا ہوں تجھ کو پھیران باتوں کا جس پر

عَلَيْهِ صَبْرًا ۝

تو صبر نہ کر سکا۔

خلاصہ تفسیر

(مغرض باہم قول و قرار ہو گیا) پھر دونوں (کسی طرف) چلے (غالباً ان کے ساتھ یوشع علیہ السلام بھی ہوں گے، مگر وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تابع تھے اس لئے ذکر ڈاکا کیا گیا) یہاں تک کہ (چلتے چلتے کسی ایسے مقام پر پہنچے جہاں کشتی پر سوار ہونے کی ضرورت ہوئی) جب دونوں کشتی میں سوار ہوئے تو ان بزرگ نے اس کشتی (کا ایک تختہ نکال کر اس) میں چھید کر دیا، موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کیا آپ نے اس کشتی میں اس لئے چھید کیا ہے کہ اس کے بیٹھے والوں کو غرق کر دیں آپ نے بڑی بھاری (خطرہ کی) بات کی، ان بزرگ نے کہا کیا میں نے کہا نہیں تھا کہ آپ سے میرے ساتھ صبر نہ ہو سکے گا (آخر وہی ہوا، آپ اپنے قول پر نہ رہے) موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ (میں بھول گیا تھا) آپ میری بھول چوک پر گرفت نہ کیجئے اور میرے اس معاملہ (متابعت) میں مجھ پر زیادہ تنگی نہ ڈالئے (کہ بھول چوک بھی معاف نہ ہو، بات گئی گزری ہو گئی) پھر دونوں (کشتی سے اتر کر آگے) چلے یہاں تک کہ جب ایک (کم سن) لڑکے سے ملے تو ان بزرگ نے اس کو مار ڈالا (موسیٰ علیہ السلام گھبرا کر) کہنے لگے آپ نے ایک بے گنا جان کو ہلاک کر دیا (اور وہ بھی) بغیر بدلے کسی جان کے بیشک آپ نے بڑی بے جا حرکت کی (کہ اڈل تو یہ نابالغ کا قتل ہے جس کو قصاص میں بھی قتل کرنا جائز نہیں پھر اس نے تو کسی کو قتل بھی نہیں کیا، یہ فعل پہلے فعل سے بھی زیادہ سخت ہے۔ کیونکہ اس میں یقینی نقصان تو صرف مال کا تھا، بیٹھنے والوں کے غرق کا اگرچہ خطرہ تھا، مگر اس کا انسداد کر دیا گیا، پھر لڑکا نابالغ ہر گناہ سے بری) ان بزرگ نے فرمایا کہ کیا میں نے آپ سے نہیں کہا تھا کہ آپ سے میرے ساتھ صبر نہ ہو سکے گا، موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا (کہ خیر اس مرتبہ اور درگزر کیجئے لیکن) اگر اس مرتبہ کے بعد میں آپ سے کسی امر کے متعلق پوچھوں تو آپ مجھ کو اپنے ساتھ نہ رکھئے، بیشک آپ میری طرف سے عذر

رک انہما کو پہنچ چکے ہیں (اس مرتبہ موسیٰ علیہ السلام نے نسیان کا عذر پیش نہیں کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال انہوں نے قصداً اپنی پیغمبرانہ حیثیت کے مطابق کیا تھا، پھر دونوں آگے چلے یہاں تک کہ جب ایک گاؤں والوں پر گزر ہوا تو گاؤں والوں سے کھانے کو مانگا (کہ ہم مہمان ہیں) تو انہوں نے ان کی مہمانی کرنے سے انکار کر دیا اتنے میں ان کو وہاں ایک دیوار ملی جو گرہی چاہتی تھی تو ان بزرگ نے اس کو رہا تھ کے اشارے سے بطور خرقِ عادت کے سیدھا کر دیا، موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ اگر آپ چاہتے تو اس (کام) پر اجرت ہی لیتے (کہ اس وقت کام بھی چلتا اور ان کی بد خلقی کی اصلاح بھی ہوتی) ان بزرگ نے کہا یہ وقت ہماری اور آپ کی علیحدگی کا ہے (جیسا کہ آپ نے خود شرط کی تھی) اب میں ان چیزوں کی حقیقت بتلائے دیتا ہوں جن پر آپ سے صبر نہ ہو سکا (جیسا کہ آیات آئندہ میں اس کا بیان آتا ہے)۔

معارف و مسائل

اَخْرَقَتْهَا لَتُغْرِقَ اَهْلُهَا، صحیحین کی حدیث میں ہے کہ خضر علیہ السلام نے کہا ہاڑی کے ذریعہ کشتی کا ایک تختہ نکال دیا تھا جس کی وجہ سے کشتی میں پانی بھر کر غرق ہونے کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا، اسی لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پر اعتراض کیا، مگر تاریخی روایت میں ہے کہ پانی اس کشتی میں داخل نہیں ہوا، خواہ اس لئے کہ خضر علیہ السلام نے ہی پھر اس کی کچھ مرمت کر دی، جیسے بغوی نے ایک روایت نقل کی ہے کہ اس تختہ کی جگہ خضر علیہ السلام نے ایک شیشہ لگا دیا تھا یا بطور مجرہ پانی کشتی میں نہ آیا، اتنی بات خود قرآن کریم کے سیاق سے معلوم ہو رہی ہے، کہ اس کشتی کو غرقابی کا کوئی حادثہ پیش نہیں آیا، جس سے ان روایات کی تائید ہوتی ہے۔

حَتَّىٰ اِذَا الْفَيَآءُ غَلَا مًا، لفظ غلام عربی زبان کے اعتبار سے نابالغ لڑکے کو کہا جاتا ہے، یہ لڑکا جس کو خضر علیہ السلام نے قتل کیا، اس کے متعلق حضرت ابن عباسؓ اور اکثر مفسرین نے یہی کہا ہے کہ وہ نابالغ تھا، اور آگے جو اس کے متعلق آیا نَفْسًا زَكِيَّةً اس سے بھی اس کے نابالغ ہونے کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ زکیۃ کے معنی ہیں گناہوں سے پاک اور یہ صفت یا پیغمبر کی ہو سکتی ہے یا نابالغ بچے کی جس کے افعال و اعمال پر مواخذہ نہیں، اس کے نامہ اعمال میں کوئی گناہ نہیں لکھا جاتا۔

اَهْلُ قَرْيَةٍ، یہ بستی جس میں حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کا گزر ہوا اور اس کے

لوگوں نے ان کی مہمانی سے انکار کیا، حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں الطائفہ اور ابن سیرین کی روایت میں ایک تھی، اور حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول ہے کہ وہ اندلس کی کوئی بستی تھی (مظہری) والشدائم

أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسْكِينٍ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ فَأَسَدَتْ أَنْ

وہ جو کشتی تھی سو چند غنایوں کی جو محنت کرتے تھے دوزیا میں سو میں نے چاہا کہ

أَعْيَبَهَا وَكَانَ وَرَاءَهُمْ مَلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا ٤٩

اس میں عیب ڈال دوں اور ان کے پرے تھا ایک بادشاہ جو لیلیتا تھا ہر کشتی کو جبین کر

وَأَمَّا الْغُلَامُ فَكَانَ أَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِينَا أَنْ يُرْهِقَهُمَا

اور وہ جو لڑکا تھا سو اس کے ماں باپ تھے ایمان والے پھر ہم کو اندیشہ ہوا کہ ان کو عاجز

طغیاناً وَكُفْرًا ٥٠ فَأَرَدْنَا أَنْ يُبْدِلَهُمَا رَبُّنَا خَيْرًا مِمَّنْ

کردے زبردستی اور کفر کر کر، پھر ہم نے چاہا کہ بدل دے اُن کو ان بخارب بہتر اس سے

زَكَاةٍ وَأَقْرَبَ رَحْمًا ٥١ وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ

پاکیزگی میں اور نزدیک تر شفقت میں، اور وہ جو دیوار تھی سو دو یتیم لڑکوں

يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ كَنْزٌ لَهُمَا وَكَانَ أَبُوهُمَا

کی تھی اس شہر میں اور اس کے نیچے مال گڑا تھا ان کا اور ان کا باپ تھا

صَالِحًا فَآسَأَ رَبُّكَ أَنْ يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَيُخْرِجَ صَا

نیک پھر چاہا تیرے رب نے کہ وہ پہنچ جائیں اپنی جوانی کو اور نکالیں اپنا مال

كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِن رَّبِّكَ وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي ط

گڑا ہوا مہمانی سے تیرے رب کی اور میں نے یہ نہیں کیا اپنے حکم سے

ذَلِكَ تَأْوِيلُ مَا تَسْطِعُ عَلَيْهِ صَبْرًا ٥٢

یہ ہی پھر ان چیزوں کا جن پر تو صبر نہ کر سکا۔

خلاصہ تفسیر

اور وہ جو کشتی تھی سو چند غریب آدمیوں کی تھی (جو اس کے ذریعہ) دریا میں محنت مزدوری کرتے تھے (اسی پران کی گزراوقات تھی) سر میں نے چاہا کہ اس میں عیب ڈال دوں اور روجہ اس کی یہ تھی کہ ان لوگوں سے آگے کی طرف ایک (ظالم) بادشاہ تھا جو ہر (اچھی) کشتی کو زبردستی چھین لیتا تھا (اگر میں کشتی میں عیب ڈال کر بظاہر بیکار نہ کر دیتا تو یہ کشتی بھی چھین لی جاتی اور ان غریبوں کی مزدوری کا ہمارا بھی ختم ہو جاتا، اس لئے توڑنے میں یہ مصلحت تھی) اور رباوہ لڑکا تھا سو اس کے ماں باپ ایمان دار تھے (اور اگر وہ بڑا ہوتا تو کافر ظالم ہوتا اور ماں کو اس سے محبت بہت تھی) سو ہم کو اندیشہ ہوا کہ یہ ان دونوں پر سرکشی اور کفر کا اثر نہ ڈال دے (یعنی بیٹے کی محبت کے سبب وہ بھی بے دینی میں اس کا ساتھ نہ دینے لگیں) پس ہم کو یہ منظور ہوا کہ (اس کا تو قصہ تمام کر دیا جائے پھر) اس کے بدلے ان کا پروردگار ان کو ایسی اولاد دے (خواہ لڑکا ہو یا لڑکی) جو کہ پاکیزگی (یعنی دین میں اس سے بہتر ہو) اور (ماں باپ کے ساتھ) محبت کرنے میں اس سے بڑھ کر ہو، اور رہی دیوار سو وہ دو یتیم لڑکوں کی تھی جو اس شہر میں (رہتے) ہیں اور اس دیوار کے نیچے ان کا کچھ مال مدفون تھا (جو ان کے باپ سے میراث میں پہنچا ہے) اور ان کا باپ (جو مر گیا) وہ (ایک نیک آدمی تھا) اس کے نیک ہونے کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے اس کی اولاد کے مال کو محفوظ کرنا چاہا، اگر دیوار ابھی گر جاتی تو لوگ یہ مال ٹوٹ لے جاتے اور غالباً جو شخص ان یتیم لڑکوں کا سر پرست تھا اس کو اس خزانے کا علم ہو گا وہ یہاں موجود نہ ہو گا جو انتظام کر لیتا، اس لئے آپ کے رب نے اپنی ہر بانی سے چاہا کہ وہ دونوں اپنی جوانی (کی عمر) کو پہنچ جائیں اور اپنا دینیہ نکال لیں اور (یہ سارے کام میں نے اللہ کے حکم سے کئے ہیں ان میں سے) کوئی کام میں نے اپنی رائے سے نہیں کیا، یہ ہے حقیقت ان باتوں کی جن پر آپ صبر نہ ہو سکا، (جس کو میں حسب وعدہ بتلا چکا ہوں، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت علیہ السلام سے رخصت ہو گئے) :

معارف و مسائل

أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسْكِينٍ، یہ کشتی جن مسکینوں کی تھی ان کے متعلق کوئی چیز سے منقول ہے کہ وہ دن بھائی تھے جن میں پانچ ایسا ہی معذور تھے، پانچ محنت مزدوری کر کے سب کے لئے معاش کا انتظام کرتے تھے، اور مزدوری ان کی یہ تھی کہ دریا میں ایک کشتی

چلاتے اور اس کا کرایہ حاصل کرتے تھے۔

مسکین کی تعریف | بعض لوگوں نے یہ کہی ہے کہ جس کے پاس کچھ نہ ہو، مگر اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسکین کی صحیح تعریف یہ ہے کہ جس کے پاس اتنا مال نہ ہو کہ اس کی حاجاتِ اصلیہ ضروریہ سے زائد بقدر نصاب ہو جائے، اس سے کم مال ہو تو وہ بھی مسکین کی تعریف میں داخل ہے، کیونکہ جن لوگوں کو اس آیت میں مساکین کہا گیا ہے ان کے پاس کم از کم ایک کشتی تو تھی جس کی قیمت مقدارِ نصاب سے کم نہیں ہوتی، مگر چونکہ وہ حاجاتِ اصلیہ ضروریہ میں مشغول تھے، اس لئے ان کو مساکین ہی کہا گیا (منظری)

مِمَّا يَأْخُذُ كُلَّ سَفِيْلَةٍ غَصْبًا، بخوبی نے بروایت ابن عباس نقل کیا ہے کہ یہ کشتی جس طرف جارہی تھی وہاں ایک ظالم بادشاہ تھا جو ادھر سے گزرنے والوں کی کشتیاں زبردستی چھین لیتا تھا، حضرت خضر نے اس مصلحت سے کشتی کا ایک ٹخنہ اکھاڑ دیا کہ وہ ظالم بادشاہ اس کشتی کو شکستہ دیکھ کر چھوڑ دے، اور یہ مساکین اس مصیبت سے بچ جائیں، دانک روم نے خوب فرمایا یہ

گر خضر در بحر کشتی را شکست ؛ صد درستی در شکستِ خضر بہت
وَأَمَّا الْغُلَامُ، یہ لڑکا جس کو حضرت خضر علیہ السلام نے قتل کیا، اس کی حقیقت یہ بیان فرمائی کہ اس لڑکے کی طبیعت میں کفر اور والدین کے خلاف سرکشی تھی، والدین اس کے نیک صالح تھے، حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ ہمیں خطرہ تھا کہ یہ لڑکا بڑا ہو کر ان صالح ماں باپ کو ستائے گا، اور تکلیف پہنچائے گا، اور کفر میں مبتلا ہو کر ماں باپ کے لئے بھی ایک فتنہ بنے گا، اس کی محبت میں ماں باپ کا ایمان بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔

فَأَرَادْنَا أَنْ يُتِمِّدَ لَهُمَا خَيْرًا مِنْهُ زَكَاةً وَأَقْرَبَ رَحْمًا، یعنی اس لڑکے ہم نے ارادہ کیا کہ اللہ تعالیٰ ان صالح ماں باپ کو اس لڑکے کے بدلے میں اس سے بہتر اولاد دیدے جو اعمال و اخلاق میں پاکیزہ بھی ہو اور ماں باپ کے حقوق کو بھی پورا کرے۔

اس واقعہ میں خیرینا اور آرزوئیاں ہیں جن میں شکم کا صیغہ استعمال فرمایا، اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ ارادہ اور خیریت خضر علیہ السلام نے اپنی اور اللہ تعالیٰ دونوں کی طرف منسوب کیا، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود اپنی ہی طرف منسوب کیا ہو تو پھر آرزوئیاں کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے اللہ سے دعا کی، کیونکہ کسی لڑکے کے بدلے میں اس سے بہتر اولاد دینے کا معاملہ اللہ ہی حق تعالیٰ کا فعل ہے، اس میں خضر یا کوئی دوسرا انسان شریک نہیں ہو سکتا۔

اور یہاں یہ شبہ کرنا درست نہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات تھی کہ یہ لڑکا

کافر ہوگا، اور ماں باپ کو بھی گمراہ کرے گا، تو پھر واقعہ علم الہی کے مطابق ایسا ہی واقعہ ہونا ضروری تھا، کیونکہ علم الہی کے خلاف کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔

جواب یہ ہے کہ علم الہی میں اس تعلیق و شرط کے ساتھ تھا کہ یہ بالغ ہوگا تو کافر ہوگا اور دوسرے مسلمانوں کے لئے بھی خطرہ بنے گا، پھر چونکہ وہ عمر بلوغ سے پہلے ہی قتل کر دیا گیا تو جو واقعہ پیش آیا وہ اس علم الہی کے منافی نہیں (منظہری)

ابن ابی شیبہ، ابن المنذر، ابن ابی حاتم نے بروایت عطیہ نقل کیا ہے کہ مقتول لڑکے کے والدین کو اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلے میں ایک لڑکی عطا فرمائی جس کے بطن سے ایک نبی پیدا ہوا، اور ابن عباسؓ کی ایک روایت میں ہے کہ اس کے بطن سے دو نبی پیدا ہوئے، بعض روایات میں ہے کہ اس کے بطن سے پیدا ہونے والے نبی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ایک بڑی اُمت کو ہدایت فرمائی۔

وَتَحْتَهُ كَنْزٌ لَّهُمْ، یہ خزانہ جو یتیم بچوں کے لئے زبردیوار دفن تھا اس کے متعلق حضرت ابوالدرداءؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت کیا ہے کہ وہ سونے اور چاندی کا ذخیرہ تھا (رواہ الترمذی والحاکم وصحیحہ ازمنظہری)

ابن عباسؓ نے فرمایا کہ وہ سونے کی ایک تختی تھی جس پر نصیحت کے مندرجہ ذیل کلمات لکھے ہوئے تھے، یہ روایت حضرت عثمان بن عفانؓ نے مرفوعاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی نقل فرمائی (قرطبی)

- ۱۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔
- ۲۔ تعجب ہے اس شخص پر جو تقدیر پر ایمان رکھتا ہے پھر غمگین کیونکہ ہوتا ہے۔
- ۳۔ تعجب ہے اس شخص پر جو اس پر ایمان رکھتا ہے کہ رزق کا ذمہ دار اللہ تعالیٰ ہے پھر ضرورت سے زیادہ مشقت اور فصول قسم کی کوشش میں کیوں لگتا ہے۔
- ۴۔ تعجب ہے اس شخص پر جو موت پر ایمان رکھتا ہے پھر خوش و خرم کیسے رہتا ہے۔
- ۵۔ تعجب ہے اس شخص پر جو حساب آخرت پر ایمان رکھتا ہے پھر غفلت کیسے برتا ہے۔
- ۶۔ تعجب ہے اس شخص پر جو دنیا کو اور اس کے انقلابات کو جانتا ہے پھر کیسے اس پر مطمئن ہو کر بیٹھتا ہے۔

۷۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔

والدین کی نیکی کا فائدہ | وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا، اس میں اشارہ ہے کہ یتیم بچوں کے لئے مرفوع خزانے اولاد و اولاد کو بھی نبی ہا ہے | کی حفاظت کا سامان بذریعہ خضر علیہ السلام اس لئے کرایا گیا تھا کہ ان یتیم

بچوں کا باپ کوئی مرد صالح اللہ کے نزدیک مقبول تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی مراد پوری کرنے اور اس کی اولاد کو فائدہ پہنچانے کا یہ انتظام فرمایا، محمد بن منکدر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک بندے کی نیکی اور صلاحیت کی وجہ سے اس کی اولاد اور اولاد کی اولاد اور اس کے خاندان کی اور اس کے آس پاس کے مکانات کی حفاظت فرماتے ہیں (مظہری)

قرطبی میں ہے کہ حضرت شبلیؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں اس شہر اور پورے علاقہ کے لئے امان ہوں، جب ان کی وفات ہو گئی تو ان کے دفن ہوتے ہی کفار و عیلم نے دریائے دجلہ کو عبور کر کے بغداد پر قبضہ کر لیا، اس وقت لوگوں کی زبان پر یہ تھا کہ ہم پر دوہری مصیبت ہے یعنی شبلی کی وفات اور دہلیم کا قبضہ (قرطبی، ص ۲۹ ج ۱۱)

تفسیر مظہری میں ہے کہ اس آیت میں اس کی طرف بھی اشارہ ہے کہ لوگوں کو بھی علماء و صلحاء کی اولاد کی رعایت اور ان پر شفقت کرنی چاہئے، جب تک کہ وہ بالکل ہی کفر و فسق و فجور میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

أَنْ يَسْلَخَ أَشَدُّ هُمًا، لَفْظًا أَشَدُّ شِدَّةً کی جمع ہے، مراد قوت ہے، اور وہ عمر جس میں انسان اپنی پوری قوت اور بھلے برے کی پہچان پر قادر ہو جاتا ہے، ابو حنیفہؒ کے نزدیک پچیس سال کی عمر ہے، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ چالیس سال عمر ہے، کیونکہ قرآن کریم میں ہے کہ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَابْلَغَ آدَبَهُنَّ سَنَةً (مظہری)

پیغمبرانہ بلاغت اور رعایت اس مثال کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ بات سمجھ لینی ضروری ہے کہ دنیا ادب کی ایک مثال میں کوئی اچھا یا بُرا کام اللہ تعالیٰ کی مشیت و ارادے کے بغیر نہیں ہو سکتا، خیر و شر سب اس کی مخلوق اور اس کے ارادے اور مشیت کے تابع ہیں، جن امور کو شر یا بُرا سمجھا اور کہا جاتا ہے وہ خاص افراد اور خاص حالات کے اعتبار سے ضرور شر اور بُرا کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں، مگر مجموعہ عالم اور عالم دنیا کے مزاج کے لئے سب ضروری اور تخلیق الہی کے اعتبار سے خیر ہی ہوتے ہیں، اور سب حکمت پر مبنی ہوتے ہیں کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں

خلاصہ یہ ہے کہ جو آفت یا حادثہ دنیا میں پیش آتا ہے، خدا تعالیٰ کی مشیت و ارادے کے بغیر نہیں ہو سکتا، اس لحاظ سے ہر خیر و شر کی نسبت بھی حق تعالیٰ کی طرف ہو سکتی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی تخلیق کے اعتبار سے کوئی شر نہیں ہوتا، اس لئے ادب کا تقاضا یہ ہے کہ شر کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف نہ کی جائے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کلمات جو قرآن کریم میں مذکور ہیں وَالَّذِي هُوَ يُطْعِمُنِي وَيَسْقِينِي وَإِذَا امْرَأَتِي هُوَ يَشْفِينِي

اسی تعلیم و ادب کا سبق دیتے ہیں کہ کھلانے پلانے کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف فرمائی، پھر بیماری کے وقت شفا دینے کی نسبت بھی اسی کی طرف کی، درمیان میں بیمار ہونے کو اپنی طرف منسوب کر کے کہا **وَإِذَا أَقْرَبْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ**، یعنی جب میں بیمار ہو جاتا ہوں تو اللہ تعالیٰ مجھے شفا عطا فرمادیتے ہیں۔ یوں نہیں کہا کہ جب وہ مجھے بیمار کرتے ہیں تو شفا بھی دیتے ہیں۔

اب حضرت خضر علیہ السلام کے کلام پر غور کیجئے، انھوں نے جب کشتی توڑنے کا ارادہ کیا تو وہ چونکہ ظاہر میں ایک عیب اور بُرائی ہے اس کے ارادہ کی نسبت اپنی طرف کر کے منسب فرمایا **أَسَدْتُ**، پھر لڑکے کو قتل کرنے اور اس کے بدلے میں اس سے بہتر اولاد دینے کا ذکر کیا تو اس میں قتل تو بُرائی تھی، اور بدلے میں بہتر اولاد دینا ایک بھلائی تھی، امر مشترک ہونے کی وجہ سے یہاں بصیغہ جمع منکلم فرمایا **أَسَدْنَا** یعنی ہم نے ارادہ کیا تاکہ اس میں جتنا ظاہری شر ہو وہ اپنی طرف اور جو خیر ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو، تیسرے واقعہ میں دیوار کھڑی کر کے یتیموں کا مال محفوظ کر دینا سراسر خیر ہی خیر ہے، اس کی نسبت پوری حق تعالیٰ کی طرف کر کے فرمایا **فَأَرَادَ رَبُّكَ** یعنی آپ کے رب نے ارادہ کیا۔

خضر علیہ السلام زندہ ہیں | ستر آن کریم میں جو واقعہ حضرت خضر علیہ السلام کا مذکور ہے اس کا اس یا ان کی وفات ہو چکی معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ خضر علیہ السلام اس واقعہ کے بعد وفات پا گئے یا زندہ رہے، اسی لئے قرآن و سنت میں اس کے متعلق کوئی صریح بات مذکور نہیں بعض روایات و آثار سے ان کا اب تک زندہ ہونا معلوم ہوتا ہے، بعض روایات سے اس کے خلاف مستفاد ہوتا ہے، اسی لئے اس معاملے میں ہمیشہ سے علماء کی رائیں مختلف رہی ہیں، جو حضرات ان کی حیات کے قائل ہیں ان کا استدلال ایک تو اس روایت سے ہے جس کو حاکم نے مستدرک میں حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو ایک شخص سیاہ سفید داڑھی والے داخل ہوئے، اور لوگوں کے منہ کو چیرتے پھاڑتے اندر پہنچے اور رونے لگے، پھر صحابہ کرام کی طرف متوجہ ہو کر یہ کلمات کہے :-

إِنِّي فِي اللَّهِ عَزَاءٌ مِّنْ كُلِّ مُصِيبَةٍ
وَعِوَضًا مِّنْ كُلِّ فَايَةٍ وَخَلْفًا
مِّنْ كُلِّ هَالِكٍ فَإِلَى اللَّهِ
فَانْتَبِئُوا وَإِلَيْهِ فَاغْبُوا وَنَظَرُوا إِلَيْكُمْ
فِي الْبَلَاءِ فَاَنْظُرُوا فَإِنَّمَا الِْمُصَابُ
مَنْ لَّمْ يُجَبَّرْ۔

”اللہ کی بارگاہ میں صبر ہے ہر مصیبت سے اور بدلہ ہے ہر فوت ہونے والی چیز کا اور وہی قائم مقام ہے ہر ہالک ہونے والے کا اس لئے اسی کی طرف رجوع کرو اسی کی طرف رغبت کرو اور اس بات کو دیکھو کہ وہ ہمیں مصیبت میں مبتلا کر کے تم کو آزماتا ہے اصل مصیبت زدہ وہ ہے جس کی مصیبت کی تلافی نہ ہو۔“

یہ آنے والے کلمات مذکورہ کہہ کر رخصت ہو گئے تو حضرت ابو بکر اور علی رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ حضرت علیہ السلام تھے، اس روایت کو جس زری نے حسن حصین میں بھی نقل کیا ہے جن کی شرط یہ ہے کہ صرف صحیح السند روایات اس میں درج کرتے ہیں۔

اور صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ وہ جال مدینہ طیبہ کے قریب ایک جگہ تک پہنچے گا تو مدینہ سے ایک شخص اس کے مقابلہ کے لئے نکلے گا، جو اس زمانے کے سب انسانوں میں بہتر ہوگا، یا بہتر لوگوں میں سے ہوگا، ابو اسحق نے فرمایا کہ یہ شخص حضرت خضر علیہ السلام ہوں گے (قرطبی) اور ابن ابی الدنیا نے کتاب البیواتف میں سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کی تو حضرت علیہ السلام نے ان کو ایک دعا بتلائی کہ جو اس کو ہر نماز کے بعد پڑھا کرے اس کے لئے ثواب عظیم اور مغفرت و رحمت ہر وہ دعا یہ ہے :-

يَا مَنْ لَا يُشْغَلُ نَمَمٌ عَنْ سَمْعٍ
وَيَا مَنْ لَا تُغْلِبُهُ الْمَسَائِلُ
وَيَا مَنْ لَا يَبْرُمُ مِنَ الْحَاجِ
الْمُحْلِحِينَ إِذْ قُبِيَ بَرْدُ عَفْوِكَ
وَحَلَاوَةُ مَغْفِرَتِكَ

(قرطبی)

”اے وہ ذات جس کو ایک کلام کا سننا دوسرے کلام کے سنتے سے مانع نہیں ہوتا اور اے وہ ذات جس کو بیگت ہونے والے (لاکھوں کروڑوں) سوالات میں کوئی مغالطہ نہیں لگتا، اور وہ ذات جو دعا میں الحاج و اصرار کرنے اور بابا

کہنے سے ملول نہیں ہوتا، مجھے اپنے عفو و کرم کا ذائقہ چکھا دیجئے، اور اپنی مغفرت کی حلاوت نصیب فرمائیے“

اور پھر اسی کتاب میں بعینہ یہی واقعہ اور یہی دعا اور حضرت علیہ السلام سے ملاقات کا واقعہ حضرت فاروق اعظمؓ سے بھی نقل کیا ہے (قرطبی)

اسی طرح ادبیاء اُمت میں حضرت خضر علیہ السلام کے بے شمار واقعات منقول ہیں۔ اور جو حضرات خضر علیہ السلام کی حیات کو تسلیم نہیں کرتے ان کا بڑا استدلال اس حدیث سے ہے جو صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں عشاء کی نماز اپنی آخر حیات میں پڑھائی، سلام پھیرنے کے بعد آپ کھڑے ہو گئے اور یہ کلمات ارشاد فرمائے :

أَرَأَيْتُمْ لَيْسَتْ كُمْ هَذِهِ فَإِنَّ عَلَى
رَأْسِ مِائَةِ سَنَةٍ مِّنْهَا لَا يَبْقَى
مِمَّنْ هُوَ عَلَى ظَهْرِ الْأَرْضِ أَحَدٌ

”کیا تم اپنی آج کی رات کو دیکھ رہے ہو اس رات سو سال گزرنے پر کوئی شخص ان میں زندہ نہ رہے گا جو آج زمین کے اوپر ہے“

حضرت ابن عمرؓ نے یہ روایت نقل کر کے فرمایا کہ اس روایت کے بارے میں لوگ مختلف باتیں کرتے ہیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ تھی کہ سو سال پر یہ قرن ختم ہو جائے گا۔

یہ روایت مسلم میں حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے بھی تقریباً انہی الفاظ کے ساتھ منقول ہے، لیکن علامہ قرطبیؒ نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ اس میں ان لوگوں کے لئے کوئی حجت نہیں جو حیات خضرہ کو باطل کہتے ہیں، کیونکہ اس روایت میں اگرچہ تمام بنی آدم کے لئے عموم کے الفاظ ہیں اور عموم بھی مؤکد کر کے لایا گیا ہے، مگر پھر بھی اس میں نص نہیں کہ یہ عموم تمام اولادِ آدم علیہ السلام کو شامل ہی ہو، کیونکہ اولادِ آدم میں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ہیں جن کی نہ وفات ہوئی اور نہ قتل کئے گئے، اس لئے ظاہر یہ ہے کہ حدیث کے الفاظ اَلْاَرْضُ عَلٰی الْاَرْضِ میں الف لام عہد کا ہے، اور مراد ارض سے ارضِ عرب ہے، پوری زمین جس میں ارض یا جوج و ما جوج اور بلادِ مشرق اور جزائرِ جن کا نام بھی عربوں نے نہیں سنا اس میں شامل نہیں، یہ علامہ قسطلانی کی تحقیق ہے۔

اسی طرح بعض حضرات نے مسئلہ ختمِ نبوت کو حیاتِ خضرہ کے منافی سمجھا ہے، اس کا جواب بھی ظاہر ہے کہ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات ختمِ نبوت کے منافی نہیں حضرت خضرہ کی حیات بھی ایسی ہی ہو سکتی ہے۔

بعض حضرات نے حیاتِ خضرہ پر یہ شبہ کیا ہے کہ اگر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں موجود ہوتے تو ان پر لازم تھا کہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آپ کے تابع ہو کر اسلامی خدمات میں مشغول ہوتے، کیونکہ حدیث میں ارشاد ہے: لَا تَكُنْ مَوْسٰی حَيًّا لَّمَّا وَبِعَهُ اِلَّا اِتِّبَاعِي۔ یعنی اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو ان کو بھی میرا ہی اتباع کرنا پڑتا (کیونکہ میرے آنے سے دین موسوی منسوخ ہو چکا ہے)۔ لیکن یہ کچھ بعید نہیں کہ حضرت خضر علیہ السلام کی زندگی اور ان کی نبوت عام انبیاءِ بشریت سے مختلف ہو، ان کو چونکہ تکوینی خدمات منجانب اللہ سپرد ہیں وہ ان کے لئے مخلوق سے الگ تھلگ اپنے کام پر مامور ہیں، رہا اتباعِ بشریت محمدیہ تو اس میں کوئی بُعد نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بعد سے انہوں نے اپنا عمل شریعتِ محمدیہ پر شروع کر دیا ہو، واللہ اعلم۔

ابو حیان نے تفسیر بحر محیط میں متعدد بزرگوں کے واقعات حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کے بھی نقل کئے ہیں، مگر ساتھ ہی یہ بھی فرمایا ہے کہ:-

وَالْجَنَّةُ وَرَّعَىٰ اَنْتَ مَاتَ | تجہوہ علماء اس پر ہیں کہ خضر علیہ السلام

(بحر محیط، ص ۱۴۷ ج ۶) | کی وفات ہو گئی۔

تفسیر مظہری میں حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے فرمایا کہ تمام اشکالات کا حل

اس میں ہے جو حضرت سید احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ نے اپنے مکاشفہ سے فرمایا وہ یہ کہ میں نے خود حضرت خضر علیہ السلام سے اس معاملہ کو عالم کشف میں دریافت کیا، انہوں نے فرمایا کہ میں اور ایسا علیہ السلام ہم دونوں زندہ نہیں ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ قدرت بخشی ہے کہ ہم زندہ آدمیوں کی شکل میں متشکل ہو کر لوگوں کی امداد مختلف صورتوں میں کرتے ہیں، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

یہ بات میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ حضرت خضر علیہ السلام کی موت و حیات سے ہمارا کوئی اعتقاد یا عملی مسئلہ متعلق نہیں، اسی لئے قرآن و سنت میں اس کے متعلق کوئی صراحت و وضاحت نہیں کی گئی، اس لئے اس میں زیادہ بحث و تحقیق کی بھی ضرورت نہیں، نہ کسی ایک جانب کا یقین رکھنا ہمارے لئے ضروری ہے، لیکن چونکہ مسئلہ عوام میں چلا ہوا ہے اس لئے مذکورہ صدر تفصیلات نقل کر دی گئی ہیں:

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْقَرْيَتَيْنِ قُلْ سَأَتْلُو عَلَيْكُمْ مِنْهُ ذِكْرًا ۝۱۳

اور تجھ سے پوچھتے ہیں ذوالقرنین کو کہ اب پڑھتا ہوں تمہارے آگے اس کا کچھ احوال

إِنَّا مَكْنَانَاهُ فِي الْأَرْضِ نَزَّلْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبْيًا ۝۱۴ فَاتَّبِعْ

ہم نے اس کو جمایا تھا ملک میں اور دیا تھا ہم نے اس کو ہر چیز کا سامان، پھر پیچھے پڑا

سَبْيًا ۝۱۵ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ

ایک سامان کے، یہاں تک کہ جب پہنچا سورج ڈوبنے کی جگہ پایا کہ وہ ڈوبتا ہے ایک دلدل کی

حِمِيَّةٍ وَوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا قُلْنَا يَذَّابُقُ الْفَرِيقَيْنِ إِمَّا أَنْ تُعَذِّبَ

ندی میں اور پایا اس کے پاس لوگوں کو ہم نے کہا اے ذوالقرنین یا تو تو لوگوں کو تکلیف دے

وَأِمَّا أَنْ تَتَّخِذَ فِيهِمْ حُسْنًا ۝۱۶ قَالَ أَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهُ

اور یا رکھ ان میں خوبی، بولا جو کوئی ہو گا بے انصاف سو ہم اس کو سزا دیں گے،

ثُمَّ يَرْدُّهُ إِلَىٰ رَبِّهِ فَيُعَذِّبُهُ عَذَابًا مُّكْرَرًا ۝۱۷ وَأَمَّا مَنْ آمَنَ وَعَمِلَ

پھر لوٹ جائے گا اپنے رب کے پاس وہ عذاب دینگا اس کو بُرا عذاب، اور جو کوئی یقین لایا اور کیا اس نے بھلا

صَالِحًا فَلَهُ جَزَاءٌ الْحُسْنَىٰ وَسَنُفْعِلُكَ مِنْ أَمْرِنَا يُسْرًا ۝۱۸

کام سوا اس کا بدلہ بھلائی ہے، اور ہم حکم دیں گے اس کو اپنے کام میں آسانی۔

خلاصہ تفسیر

ذوالقرنین کا پہلا سفر اور یہ لوگ آپ ذوالقرنین کا مال پوچھتے ہیں اس پوچھنے کی وجہ یہ تھی کہ ان کی تاریخ قریب قریب گم تھی، اور اسی لئے اس قصہ کے جو امور قرآن میں مذکور نہیں کہ وہ اصل قصہ سے زائد تھے، ان امور کے متعلق آج تک اصل تاریخ میں اختلافات شدید پائے جاتے ہیں، اسی وجہ سے قریش مکہ نے بمشورۃ یہود مدینہ اس قصہ کا سوال کے لئے انتخاب کیا تھا، اس لئے اس قصہ کی تفصیلات جو قرآن میں مذکور ہیں وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی واضح دلیل ہے (آپ فرمادیجئے کہ میں اس کا ذکر ابھی تمہارے سامنے بیان کرتا ہوں) آگے حق تعالیٰ کی طرف سے اس کی حکایت شروع ہوئی کہ ذوالقرنین ایک ایسے جلیل القدر بادشاہ ہو گزرے ہیں کہ، ہم نے ان کو روئے زمین پر حکومت دی تھی اور ہم نے ان کو ہر قسم کا سامان (کافی) دیا تھا (جس سے وہ اپنے شاہی منصوبوں کو پورا کر سکیں) چنانچہ وہ بار بار وہ فتوحات ملک مغرب (ایک راہ پر ہوئے) اور سفر کرنا شروع کیا، یہاں تک کہ جب سفر کرتے کرتے درمیانی شہروں کو فتح کرتے ہوئے، غروب آفتاب کے موقع (یعنی جانب مغرب میں انتہائی آبادی) پر پہنچے تو آفتاب ان کو ایک سیاہ پانی میں ڈوبتا ہوا دکھائی دیا (مراد اس سے غالباً سمندر ہے) کہ اس کا پانی اکثر جگہ سیاہ نظر آتا ہے، اور اگرچہ آفتاب حقیقتہً سمندر میں غروب نہیں ہوتا مگر سمندر سے آگے نکلا نہ جاتی ہو تو سمندر ہی میں ڈوبتا ہوا معلوم ہوگا، اور اس موقع پر انھوں نے ایک قوم دیکھی (جن کے کافر ہونے پر اگلی آیت اِنَّا مِنْ ظُلُمٍ دَلَالَتْ کرتی ہے) ہم نے (بصورتِ اہام یا اس زمانے کے پیغمبر کے واسطے سے) یہ کہا کہ اے ذوالقرنین (اس قوم کے بارے میں دو اختیار ہیں) خواہ (ان کو ابتداء ہی سے قتل وغیرہ کے ذریعہ) مراد داور خواہ ان کے بارے میں نرمی کا معاملہ اختیار کر دو (یعنی ان کو ایمان کی دعوت دو پھر نہ مانیں تو قتل کر دو) بغیر تبلیغ و دعوت کے (ابتداءً ہی قتل کرنا اختیار شاید اس لئے دیا گیا ہو کہ ان کو اس سے پہلے کسی ذریعہ سے دعوت ایمان پہنچنا چکی ہوگی، لیکن دوسری صورت یعنی پہلے دعوت پھر قتل کا بہتر ہونا اشارہ سے بیان کر دیا، کہ اس دوسری صورت کو اتخاذ حسن سے تعبیر فرمایا) ذوالقرنین نے عرض کیا کہ (میں دوسری ہی صورت اختیار کر کے پہلے ان کو دعوت ایمان دوں گا) لیکن (دعوت ایمان کے بعد) جو ظالم (یعنی کافر) رہے گا سو اس کو تو ہم لوگ (قتل وغیرہ کی) سزا دیں گے (اور یہ سزا تو دنیا میں ہوگی) پھر وہ (مرنے کے بعد) اپنے مالک حقیقی کے پاس پہنچا دیا جائے گا، پھر وہ اس کو (دوزخ کی) سخت سزا دیے گا، اور جو شخص (دعوت ایمان کے بعد) ایمان لے آئے گا

اور نیک عمل کرے گا تو اس کے لئے (آخرت میں بھی) بدلے میں بھلائی ملے گی اور تم بھی (دنیا میں) اپنے برتاؤ میں اس کو آسان (اور نرم) بات کہیں گے (یعنی ان پر کوئی عملی سختی تو کیا کی جاتی زبانى اور قولى بھی کوئی سختی نہیں کی جائے گی)

معارف و مسائل

يَسْأَلُونَكَ (یعنی وہ لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں) یہ لوگ سوال کرنے والے کون ہیں روایات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قریش مکہ تھے، جن کو یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور حقانیت کا امتحان کرنے کے لئے تین سوال بتلائے تھے، روح کے متعلق اور آصفا کہف اور ذوالعترین کے بارے میں، ان میں دو کا جواب آچکا ہے، اصحاب کہف کا قصہ ابھی گزرا ہے، اور روح کا سوال پچھلی سورۃ کے آخر میں گزر چکا ہے، یہ تیسرا سوال ہے کہ ذوالقرنین کون تھا اور اس کو کیا حالات پیش آئے (بحر محیط)

ذوالقرنین کون تھے؟ ذوالقرنین کا نام ذوالعترین کیوں ہوا، اس کی وجہ میں بے شمار کس زمانے اور کس ملک اقوال اور سخت اختلافات ہیں، بعض نے کہا کہ ان کی دو زلفیں تھیں میں تھے؟ اور ان کو ذوالقرنین اس لئے ذوالقرنین کہلائے، بعض نے کہا کہ مشرق و مغرب کے مالک کہنے کی وجہ پر حکمران ہوئے اس لئے ذوالقرنین نام رکھا گیا، کسی نے یہ بھی کہا کہ ان کے سر پر کچھ ایسے نشانات تھے جیسے سینک کے ہوتے ہیں، بعض روایات میں ہے کہ ان کے سر پر دونوں جانب چوٹ کے نشانات تھے اس لئے ذوالقرنین کہا گیا، واللہ اعلم، مگر اتنی بات متعین ہے کہ قرآن نے خود ان کا نام ذوالعترین نہیں رکھا، بلکہ یہ نام یہود نے بتلایا ان کے یہاں اس نام سے ان کی شہرت ہوگی، واقعہ ذوالقرنین کا جتنا حصہ قرآن کریم نے بتلایا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ:-

”وہ ایک صالح عادل بادشاہ تھے جو مشرق و مغرب میں پہنچے اور ان کے ممالک کو فتح کیا اور ان میں عدل و انصاف کی حکمرانی کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو ہر طرح کے سامان اپنے مقاصد پورا کرنے کے لئے عطا کر دیئے گئے تھے، انھوں نے فتوحات کرتے ہوئے تین اطراف میں سفر کئے، مغرب اقصیٰ تک اور مشرق اقصیٰ تک، پھر جانب شمال میں کوہستانی سلسلے تک اسی جگہ انھوں نے دو پہاڑوں کے درمیانی درے کو ایک عظیم الشان آہنی دیوار کے ذریعہ بند کر دیا جس سے یا جوج ماجوج کی تاخت و تاراج سے اس علاقہ کے لوگ محفوظ رہے۔“

یہ بڑے بڑے سوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت اور نبوت کا امتحان کرنے کے لئے پیش کیا تھا، وہ اس جواب کے مطابق ہو گئے، انہوں نے مزید یہ سوالات نہیں کئے، کہ ان کا نام ذوالقرنین کیوں تھا، یہ کس ملک میں اور کس زمانے میں تھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سوالات کو خود یہود نے بھی غرضوری اور فضول سمجھا، اور یہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم تاریخ و قصص کا صرف امتاح حصہ ذکر کرتا ہے جس سے کوئی فائدہ دین یا دنیا کا متعلق ہو، یا جس پر کسی غرضوری چیز کا سمجھنا موقوف ہو، اس لئے نہ قرآن کریم نے ان چیزوں کو بتلایا اور نہ کسی صحیح حدیث میں اس کی یہ تفصیلات بیان کی گئیں اور نہ قرآن مجید کی کسی آیت کا سمجھنا ان چیزوں کے علم پر موقوف ہے، اسی لئے سلف صالحین صحابہ و تابعین نے بھی اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

اب معاملہ صرف تاریخی روایات کا یا موجودہ تورات و انجیل کا رہ گیا، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ موجودہ تورات و انجیل کو بھی مسلسل تحریفات نے ایک آسمانی کتاب کی حیثیت میں نہیں چھوڑا، ان کا مقام بھی اب زیادہ سے زیادہ ایک تاریخ ہی کا ہو سکتا ہے، اور زمانہ قدیم کی تاریخی روایات زیادہ تر اسرائیلی قصوں کہانیوں سے ہی پُر ہیں، جن کی نہ کوئی سند ہو، نہ وہ کسی زمانے کے عقلاء و حکماء کے نزدیک قابل اعتماد پائی گئی ہیں، حضرات فہرستین نے بھی اس معاملہ میں جو کچھ لکھا وہ سب انہی تاریخی روایات کا مجموعہ ہے، اسی لئے ان میں اختلافات بے شمار ہیں، اہل یورپ نے اس زمانے میں تاریخ کو بڑی اہمیت دی، اس پر تحقیق و تفتیش میں بلاشبہ بڑی محنت و کاوش سے کام لیا آثار قدیمہ کی کھدائی اور وہاں کے کتبات وغیرہ کو جمع کر کے ان کے ذریعہ قدیم واقعات کی حقیقت تک پہنچنے میں وہ کام انجام دیئے جو اس سے پہلے زمانہ میں نظر نہیں آتے، لیکن آثار قدیمہ اور ان کے کتبات سے کسی واقعہ کی تائید میں مدد تو مل سکتی ہے مگر خود ان سے کوئی واقعہ پورا نہیں پڑھا جاسکتا، اس کے لئے تو تاریخی روایات ہی بنیاد بن گئی ہیں، اور ان معاملات میں زمانہ قدیم کی تاریخی روایات کا حال ابھی معلوم ہو چکا ہے، کہ ایک کہانی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں، قدیم و جدید علماء تفسیر نے بھی اپنی کتابوں میں یہ روایات ایک تاریخی حیثیت ہی سے نقل کی ہیں، جن کی صحت پر کوئی قرآنی مقصد موقوف نہیں، یہاں بھی اسی حیثیت سے بقدر ضرورت لکھا جاتا ہے، اس واقعہ کی پوری تفتیش و تحقیق مولانا حفیظ الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب قصص قرآن میں لکھی ہے، تاریخی ذوق رکھنے والے حضرات اس کو دیکھ سکتے ہیں۔

بعض روایات میں ہے کہ پوری دنیا پر سلطنت و حکومت کرنے والے چار بادشاہ ہوئے ہیں، دو مؤمن اور دو کافر، مؤمن بادشاہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور ذوالقرنین ہیں

اور کافر نمرود اور بخت نصر ہیں۔

ذوالقہنین کے حاملہ میں عجیب اتفاق ہے کہ اس نام سے دنیا میں متعدد آدمی مشہور ہوئے ہیں، اور یہ بھی عجیب بات ہے کہ ہر زمانے کے ذی القہنین کے ساتھ لقب سکندر بھی شامل ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام سے تقریباً تین سو سال پہلے ایک بادشاہ سکندر کے نام سے حروف مشہور ہے جس کو سکندر یونانی، مقدونی، رومی وغیرہ کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے، جس کا وزیر ارتطو تھا، اور جس کی جنگ دآرا سے ہوئی، اور اسے قتل کر کے اس کا ملک منسوخ کیا، سکندر کے نام سے دنیا میں معروف ہونے والا آخری شخص یہی تھا، اسی کے قصے دنیا میں زیادہ مشہور ہیں بعض لوگوں نے اس کو بھی قرآن میں مذکور ذوالقہنین کہہ دیا، یہ سراسر غلط ہے، کیونکہ یہ شخص آتش پرست مشرک تھا، قرآن کریم نے جس ذوالقہنین کا ذکر کیا ہے، ان کے نبی ہونے میں تو علماً کا اختلاف ہے، مگر مومن صالح ہونے پر سب کا اتفاق ہے، اور خود قرآن کی نصوص اس پر شاہد ہیں۔ حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں بحوالہ ابن عساکر اس کا پورا نسب نامہ لکھا ہے، جو اوپر جا کر حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام سے ملتا ہے، اور فرمایا کہ یہی وہ سکندر ہے جو یونانی مصری مقدونی کے ناموں سے معروف ہے، جس نے اپنے نام پر شہر اسکندریہ آباد کیا، اور روم کی تاریخ اسی کے زمانے سے چلتی ہے، اور یہ سکندر ذی القہنین اول سے ایک طویل زمانے کے بعد ہوا ہے، جو دو ہزار سال سے زائد بتلایا جاتا ہے، اسی نے دآرا کو قتل کیا اور شاہان فارس کو مغلوب کر کے ان کا ملک فتح کیا، مگر یہ شخص مشرک تھا، اس کو قرآن میں مذکور ذوالقہنین قرار دینا سراسر غلطی ہے، ابن کثیر کے اپنے الفاظ یہ ہیں:-

فاما ذوالقہنین الثانی فهو اسکندر بن فیلبس بن مصریم بن برس بن میطون بن روحی بن نعطی بن یونان بن یافث بن یونہ بن شرخون بن رومی بن شریح بن توفیل بن روحی بن الاصفی بن یقز بن العیم بن اسحق بن ابراہیم الخلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام مکن النسبہ العافظ ابن عساکر فی تاریخ المقدونی، الیونانی المصری بانی الاسکندریہ الذی یؤرخ بایامہ الروم وكان متأخراً عن الاول بدھر طویل وكان هذا قبل المسيح بنحو من ثلاثمائة سنة وكان ارطاطاليس الفيلسوف وزيرا وهو الذي قتل دارا واذل ملوك الفرس واطأ ارضهم وانما نبهنا عليه لان كثير من الناس يحتقن انما واحد وان المذکور فی القرآن هو الذي كان ارطاطاليس وزيرا فيقع بسبب ذلك خطأ كبير وفساد عظیم طویل فان الاول كان عبداً مؤمناً صالحاً وملكاً

عاد لا وکان وزیرہ الخضر وقد کان نبیاً علی ما قرناہ قبل ہذا واما الثانی فکان مشرکاً کان وزیرہ فیلسوفاً وقد کان بین زمانہما انزید من الفے سنتے فاین ہذا من ہذا لا یتویان ولا یشترک الا علی غبی لا یعرف حقائق الامور البدایۃ والہایۃ جلیلاً حدیث و تاریخ کے امام ابن کثیر کی اس تحقیق سے ایک تو یہ مغالطہ رفع ہو کہ یہ اسکندر جو حضرت مسیح علیہ السلام سے تین سو سال پہلے گذرا ہے، اور جس کی جنگ دارا اور ملوکہ فارس سے ہوئی، اور بانی اسکندریہ ہے، یہ وہ ذوالعترین نہیں جس کا قرآن کریم میں ذکر آیا ہے، یہ مغالطہ بعض اکابر مفسرین کو بھی لگا ہے، ابو حیان نے بحر خط میں اور علامہ آلوسی نے روح المعانی میں اسی کو ذوالعترین مذکور فی القرآن کہہ دیا ہے۔

دوسری بات ذالہ گان نبیاً کے جملے سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ابن کثیر کے نزدیک ان کا نبی ہونا راجح ہے، اگرچہ چھوڑ کے نزدیک راجح وہ قول ہے جو خود ابن کثیر نے بردایت ابی الطفیل حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے نقل کیا ہو کہ نہ وہ نبی تھے نہ فرشتہ بلکہ ایک نیک صالح مسلمان تھے اسی لئے بعض علماء نے یہ توجیہ کی کہ ذالہ گان کی ضمیر ذوالعترین کی طرف نہیں خضر علیہ السلام کی طرف راجح ہے، وہ والا قرب۔

اب مسئلہ یہ رہتا ہے کہ پھر وہ ذوالقرنین جن کا ذکر قرآن میں ہے کون ہیں اور کس زمانے میں ہوئے ہیں، اس کے متعلق بھی علماء کے اقوال بہت مختلف ہیں، ابن کثیر کے نزدیک ان کا زمانہ اسکندریہ تانی مقتدونی سے دو ہزار سال پہلے حضرت ابراہیم الخلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کا زمانہ ہے اور ان کے وزیر حضرت خضر علیہ السلام تھے، ابن کثیر نے البدایہ والہایۃ میں سلف صاۃ سے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ ذوالعترین پیادہ پاچہ کے لئے پہونچے، جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کے آنے کا علم ہوا تو مکہ سے باہر نکل کر استقبال کیا، اور حضرت خلیل علیہ السلام نے ان کے لئے دعا بھی کی اور کچھ وصیتیں اور نصیحتیں بھی ان کو فرمائیں (البدایہ ص ۱۲۸ ج ۱) اور تفسیر ابن کثیر میں بحوالہ ازرقی نقل کیا ہے کہ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ طواف کیا، پھر قربانی دی۔

اور ابو ریحان بیرونی نے اپنی کتاب الآثار الباقیۃ عن المتروک الخالیۃ میں کہا ہے کہ یہ ذوالعترین جن کا ذکر قرآن میں ہے ابوبکر بن سمی بن عمر بن افریقیس حمیری ہے، جس نے زمین کے مشارق و مغارب کو فتح کیا، اور گنج حمیری یعنی نے اپنے اشعار میں اس پر فخر کیا ہے کہ میرے دادا ذوالعترین مسلمان تھے، ان کے اشعار یہ ہیں ۵

قد کان ذوالقرنین جدی مسلماً و ملکاً علانی الارض غیر مبعث

بَلِّغِ الْمَشَارِقَ وَالْمَغَارِبَ يَسْتَعِثُّ ۖ أَسْبَابَ مُلْكٍ مِّنْ كَرِيمٍ سَيِّدِ

یہ روایت بحر محیط میں ابو حیان نے نقل کی ہے، ابن کثیر نے بھی البدایہ والنہایہ میں اس کا ذکر کرنے کے بعد کہا کہ یہ ذوالعترین ثبائعہ یمین میں سب سے پہلا شیخ ہے، اور یہی وہ شخص ہے جس نے بیرسج کے بارے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حق میں فیصلہ دیا تھا البدایہ ص ۱۰۵ ج ۲) ان تمام روایات میں ان کی شخصیت اور نام و نسب کے بارے میں اختلاف ہونے کے باوجود ان کا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ بتلایا گیا ہے۔

اور مولانا حفظ الرحمن صاحب نے اپنی کتاب قصص العترین میں جو ذوالعترین کے متعلق بڑی تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ذوالقرنین مذکور فی القرآن فارس کا وہ بادشاہ ہے جس کو یہودی خورس، یونانی سائرس، فارسی گورنش اور عرب کینجہ کہتے ہیں جس کا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بہت بعد انبیا ربی اسرائیل میں سے دانیالؑ کا زمانہ بتلایا جاتا ہے جو سکندر مقدونی قاتل دارا کے زمانے کے قریب ہو جاتا ہے، مگر مولانا موصوف نے بھی ابن کثیر وغیرہ کی طرح اس کا شدت سے انکار کیا ہے کہ ذوالعترین وہ سکندر مقدونی جس کا وزیر ارسطو تھا وہ نہیں ہو سکتا، وہ مشرک آتش پرست تھا، یہ مؤمن صالح تھے۔

مولانا موصوف کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ فترآن کریم کی سورہ ہی اسرائیل میں جو دو مرتبہ بنی اسرائیل کے شر و فساد میں مبتلا ہونے اور دونوں مرتبہ کی سزا کا ذکر تفصیل سے آیا ہے اس میں بنی اسرائیل کے پہلے فساد کے موقع پر جو قرآن کریم نے فرمایا ہے بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَا اُولٰٓئِیْ بَاۤسٍ شَدِیْدٍ فَجَاسُوا۟ لِجُلَلِ الَّذِیْ یَاۡرِیْهُمْ اَعْمَٰلُ فساد کی سزا میں ہم مسلط کر دیں گے تم پر اپنے کچھ ایسے بندے جو بڑی قوت و شوکت والے ہوں گے وہ تمہارے گھروں میں گھس پڑیں گے) اس میں یہ قوت و شوکت والے لوگ بخت نصر اور اس کے اعوان ہیں جنہوں نے بیت المقدس میں چالیس ہزار اور بعض روایات میں ستر ہزار بنی اسرائیل کو قتل کیا، اور ایک لاکھ سے زیادہ بنی اسرائیل کو قید کر کے بھیڑ بکریوں کی طرح ہٹکا کر بابل لے گیا، اور اس کے بعد جو قرآن کریم نے فرمایا اِنَّمَا رَدَّ دُنَاۤلَکُمْ اِلَیْکُمْ اَلْکُوۡرَۃَ عَلَیْہِمْ رَیۡحُنَا۟ لَنۡ یَّخۡشَکَ غَلَبَہٗ کُوۡلُنَا۟ پُر) یہ واقعہ اسی کینسر و خورس بادشاہ کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوا، یہ مؤمن صالح تھا، اس نے بخت نصر کا مقابلہ کر کے اس کے قیدی بنی اسرائیل کو اس کے قبضہ سے نکالا، اور دوبارہ فلسطین میں آباد کیا، بیت المقدس کو جو ویران کر دیا تھا اس کو بھی دوبارہ آباد کیا، اور بیت المقدس کے خزانے اور اہم سامان جو بخت نصر یہاں سے لے گیا تھا وہ سب

والہیں بنی اسرائیل کے قبضہ میں دیئے، اس لئے یہ شخص بنی اسرائیل (یہود) کا نجات دہندہ ثابت ہوا۔ یہ بات قرین قیاس ہے کہ یہود مدینہ نے جو امتحان نبوت کے لئے قریش مکہ کے واسطے سوالات متعین کئے ان میں ذوالعترین کے سوال کو یہ خصوصیت بھی حاصل تھی کہ یہود اس کو اپنا نجات دہندہ مان کر اس کی تعظیم و تکریم کرتے تھے۔

مولانا حفظ الرحمن صاحب نے اپنی اس تحقیق پر موجودہ تواریخ کے حوالہ سے انبیاء بنی اسرائیل کی پیشگوئیوں سے پھر تاریخی روایات سے اس پر کافی شواہد پیش کئے ہیں، جو صاحب مزید تحقیق کے درپے ہوں وہ اس کا مطالعہ کر سکتے ہیں، میرا مقصد ان تمام روایات کے نقل کرنے سے صرف اتنا تھا کہ ذوالعترین کی شخصیت اور ان کے زمانے کے بارے میں علماء امت اور ائمہ تاریخ و تفسیر کے اقوال سامنے آجائیں، ان میں سے راجح کس کا قول ہے یہ میرے مقصد کا جز نہیں، کیونکہ جن امور کا قرآن نے دعویٰ کیا نہ حدیث نے ان کو بیان کیا، ان کے محقق و مبین کرنے کی ذمہ داری بھی ہم پر نہیں، اور ان میں جو قول بھی راجح اور صحیح قرار پائے مقصد قرآنی ہر حال میں حاصل ہے، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم، آگے آیات کی تفسیر دیکھئے:

قُلْ سَأَتْلُو عَلَيْكُمْ مِنْهُ ذِكْرًا، اس میں یہ قابلِ نظر ہے کہ قرآن کریم نے اس جگہ ذِکْرٌ کا مختصر لفظ پھر ذکرِ مِّنْہُ ذِکْرًا کے دو کلمے کیوں اختیار کئے، غور کیجئے تو ان دو کلموں میں اشارہ اس طرف کیا گیا ہے کہ قرآن نے ذوالقرنین کا پورا قصہ اور اس کی تاریخ ذکر کرنے کا وعدہ نہیں کیا، بلکہ اس کے ذکر کا ایک حصہ بیان کرنے کے لئے فرمایا، جس پر حرف مِّن اور ذِکْرٌ کی تنوین بقواعد عربیت شاہد ہے، اور جو تاریخی بحث ذوالقرنین کے نام و نسب اور زمانے وغیرہ کی لکھی گئی ہے، فتران کریم نے اس کو غیر ضروری سمجھ کر چھوڑ دینے کا پہلے ہی اظہار فرما دیا ہے۔

وَأَتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا، لفظ سبب عربی لغت میں ہر اس چیز کے لئے بولا جاتا ہے جس سے اپنے مقصد حاصل کرنے میں مدد ملی جاتی ہے جس میں آلات و وسائل مادی بھی شامل ہیں اور علم و بصیرت و تجربہ وغیرہ بھی (بحر محیط) اور مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سے مراد وہ تمام امور ہیں جن کی ضرورت نظام سلطنت کے لئے ایک بادشاہ اور حکمران کو پیش آتی ہے، مراد یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ذوالقرنین کو اپنی عدل گستری اور امنِ عالم کے قیام اور فتوحات ممالک کے لئے جس جس سامان کی ضرورت اس زمانے میں تھی وہ سب کے سب اُن کو عطا کر دیئے گئے تھے۔ فَاتَّبَعَ سَبَبًا، مراد یہ ہو کہ سامان تو ہر قسم کے اور دنیا کے ہر خطہ میں پہنچنے کے ان کو دیر تھے گئے تھے، انھوں نے سب سے پہلے جانبِ غرب سفر کے سامان سے کام لیا۔

ثُمَّ اتَّبَعَ سَبَبًا ۝۹۱ حَتَّىٰ إِذَا ابْلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجِدَهَا تَلَحُّمًا

پھر ایک سامان کے پیچھے، یہاں تک کہ جب پہنچا سورج نکلنے کی جگہ پایا اس کو کہ نکتا ہے

عَلَىٰ قَوْمٍ لَّمْ يَجْعَلْ لَهُم مِّن دُونِنَا سِتْرًا ۝۹۲ كَذٰلِكَ وَ

ایک قوم پر کہ نہیں بنا دیا ہم نے اُن کے لئے آفتاب سے ورے کوئی حجاب، یوں ہی ہر اور

فَدَّ احْطَنَّا بِمَا لَدَيْهِ جُبْرًا ۝۹۱

ہمارے قابو میں آچکی ہو اس کے پاس کی خبر۔

خلاصہ تفسیر

پھر (مالک مغربہ فتح کر کے مشرقی مالک فتح کرنے کے ارادہ سے مشرق کی طرف) ایک راہ پر ہوتے یہاں تک کہ جب طلوع آفتاب کے موقع پر (یعنی جانب مشرق میں منہ تائی آبادی پر) پہنچے تو آفتاب کو ایک ایسی قوم پر طلوع ہوتے دیکھا جن کے لئے ہم نے آفتاب کے ادھر کوئی آڑ نہیں رکھی تھی (یعنی اس جگہ ایک ایسی قوم آباد تھی جو دھوپ سے بچنے کے لئے کوئی مکان یا خیمہ وغیرہ بنانے کے عادی نہ تھے، بلکہ شاید لباس بھی نہ پہنتے ہوں، جانوروں کی طرح کھلے میدان میں رہتے تھے) یہ قصہ اسی طرح ہے، اور ذوالقرنین کے پاس جو کچھ (سامان وغیرہ) تھا، ہم کو اس کی پوری خبر ہے (اس میں امتحان نبوت کے لئے ذوالقرنین کے متعلق سوال کرنے والوں کو اس پر تنبیہ ہے کہ ہم جو کچھ بتلا رہے ہیں وہ علمِ دُخبر کی بنیاد پر ہے، عام تاریخی کہانیوں کی طرح نہیں، تاکہ نبوتِ محمدیہ کی حقانیت واضح ہو جائے)

معارف و مسائل

ذوالقرنین نے مشرق کی جانب میں جو قوم آباد پائی، اس کا یہ حال تو قرآن کریم نے ذکر فرمایا کہ وہ دھوپ سے بچنے کے لئے کوئی سامان، مکان، خیمہ، لباس وغیرہ کے ذریعہ نہ کرتے تھے، لیکن ان کے مذہب و اجمال کا کوئی ذکر نہیں فرمایا، اور نہ یہ کہ ذوالقرنین نے ان لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا، اور ظاہر یہ ہے کہ یہ لوگ بھی کافر ہی تھے، اور ذوالقرنین نے ان کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا جو مغربی قوم کے ساتھ اوپر مذکور ہو چکا ہے، مگر اس کے بیان کرنے کی یہاں اس لئے ضرورت نہیں سمجھی کہ پچھلے واقعہ پر قیاس کر کے اس کا بھی علم ہو سکتا ہو (کذا فی بحر المحیط علیٰ ابن عطاء)

ثُمَّ رَأَيْتُم مَّسْبِيًّا ۙ (۹۲) حَتَّىٰ إِذَا أَبْلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُونِهِمَا

پھر لگا ایک سامان کے پیچھے، یہاں تک کہ جب پہنچا دو پہاڑوں کے بیچ، پائے اُن سے درے لیے

قَوْمًا لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ قَوْلًا ۙ (۹۳) قَالُوا لَئِذَا الْقَرْنَيْنِ إِنَّ

لوگ جو لگتے نہیں کہ سمجھیں ایک بات، بولے اے ذوالقترین ! یہ

يَأْجُوجُ وَمَأْجُوجُ مُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا

یا جوج و ما جوج دھوم اٹھاتے ہیں ملک میں سوتو کہے تو ہم مقرر کر دیں تیرے

عَلَىٰ أَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُم مَّسَدًا ۙ (۹۴) قَالَ مَا مَكْنِي فِيهِ رَبِّي

داسطے کچھ محصول اس شرط پر کہ بنادے تو ہم میں اور ان میں ایک آڑ، بولا جو مقدور دیا مجھ کو میرے

خَيْرٌ فَأَعِينُونِي بِقُوَّةٍ أَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم رَدْمًا ۙ (۹۵) أَتُونِي

بہتر سو بد کرد میری ننت میں بنادوں تمھارے اور ان کے بیچ ایک دیوار موٹی، لا دو مجھ کو

زُبْرًا حَدِيدًا ۙ حَتَّىٰ إِذَا سَاوَىٰ بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفِخُوا

تختے لوہے کے، یہاں تک کہ جب برابر کر دیا دونوں پھانکوں تک پہاڑ کی کہا دھونکو،

حَتَّىٰ إِذَا جَعَلَهُ نَارًا قَالَ أَتُونِي أُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ۙ (۹۶) فَمَا اسْطَاعُوا

یہاں تک کہ جب کر دیا اس کو آگ، کہا لاؤ میرے پاس کہ ڈالوں اس پر پھٹلا ہوا تانبا، پھر نہ چڑھ سکیں

أَنْ يَنْظُرُوا ۙ وَمَا اسْطَاعُوا لَهُ نَقْبًا ۙ (۹۷) قَالَ هَٰذَا أَرْضُ حَصَّةٍ

اس پر اور نہ کر سکیں اس میں سوراخ، بولا یہ ایک مہربانی ہے میرے

مِّنْ رَبِّي ۖ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ رَبِّي جَعَلَهُ دَكَّاءَ ۖ وَكَانَ وَعْدُ

رب کی پھر جب آئے وعدہ میرے رب کا مگر اے اس کو ڈھا کر ادر ہے وعدہ

رَبِّي حَقًّا ۙ (۹۸)

میرے رب کا سچا۔

بن بن بن بن بن بن بن بن بن بن

خلاصہ تفسیر

پھر (مغرب و مشرق فتح کر کے) ایک اور راہ پر ہولنے (قرآن میں اس سمت کا نام نہیں لیا مگر آبادی زیادہ جانب شمال میں ہے، اس لئے مفسرین نے اس سفر کو شمالی ممالک کا سفر قرار دیا تاریخی شہادتیں بھی اس کی مؤید ہیں) یہاں تک کہ جب ایسے مقام پر جو دو پہاڑوں کے درمیان تھا پہنچے تو ان پہاڑوں سے اس طرف ایک قوم کو دیکھا جو زبان اور لغت سے ناواقف و حشیاء زندگی کی وجہ سے کوئی بات سمجھنے کے قریب بھی نہیں پہنچتے تھے (ان الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف زبان سے ناواقفیت نہ تھی، کیونکہ سمجھ بوجھ ہو تو غیر زبان والے کی باتیں بھی کچھ اشارے کنائے سے سمجھ جاسکتی ہیں، بلکہ وحشیانہ زندگی نے سمجھ بوجھ سے بھی دور رکھا تھا مگر پھر شاید کسی ترجمان کے واسطے سے) انھوں نے عرض کیا اے ذوالعترین قوم یا جوج و ماجوج (جو اس گھاٹی کے اس طرف رہتے ہیں ہماری) اس سرزمین میں (کبھی کبھی آکر) بڑا فساد مچاتے ہیں (یعنی قتل و غارتگری کرتے ہیں اور ہم میں ان کے مقابلے کی طاقت نہیں) سو کیا ہم لوگ آپ کے لئے چندہ کر کے کچھ رقم جمع کر دیں اس شرط پر کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان کوئی روک بنادیں کہ وہ اس طرف نہ آنے پائیں) ذوالعترین نے جواب دیا کہ جس مال میں میرے رب نے مجھ کو (صرف کرنے کا) اختیار دیا ہے وہ بہت کچھ ہے (اس لئے چندہ جمع کرنے اور مال دینے کی تو ضرورت نہیں، البتہ) ہاتھ پاؤں کی طاقت (یعنی محنت مزدوری) سے میری مدد کرو تو میں تمھارے اور ان کے درمیان خوب مضبوط دیوار بنا دوں گا (اچھا تو) تم لوگ میرے پاس لوہے کی چادریں لاؤ (قیمت ہم دیں گے، ظاہر یہ ہے کہ اس آہنی دیوار بنانے کے لئے اور بھی ضرورت کی چیزیں منگوائی ہوں گی، مگر یہاں وحشی ملک میں سب سے زیادہ کم یا ب چیز لوہے کی چادریں تھیں، اس لئے ان کے ذکر کرنے پر اکتفا کیا گیا، سب سامان جمع ہو جانے پر دونوں پہاڑوں کے درمیان آہنی دیوار کی تعمیر کا کام شروع کیا گیا، یہاں تک کہ جب (اس دیوار کے رڈے ملائے ملائے) ان (دونوں پہاڑوں) کے دونوں سروں کے بیچ (کے خلا) کو (پہاڑوں کے) برابر کر دیا تو حکم دیا کہ دھونکو دھونکنا شروع ہو گیا) یہاں تک کہ جب (دھونکتے دھونکتے) اس کو لال انگارہ کر دیا تو حکم دیا کہ اب میرے پاس پگھلا ہوا تانبا لاؤ (جو پہلے سے تیار کرا لیا ہو گا) کہ اس پر ڈال دوں (چنانچہ یہ پگھلا ہوا تانبا لایا گیا اور آلات کے ذریعہ اوپر سے چھوڑ دیا گیا کہ دیوار کی تمام درزوں میں گھس کر پوری دیوار ایک ذات ہو جائے، اس کا طول و عرض خدا کو معلوم ہے) تو اس کی بلندی

اور چکناہٹ کے سبب) نہ تو یا جوج ماجوج اس پر چڑھ سکے اور نہ اس میں رغایت استحکام کے سبب کوئی) نقب لگا سکے تھے، ذوالقترنین نے رجب اس دیوار کو تیار دیکھا جس کا تیار ہونا کوئی آسان کام نہ تھا تو بطور شکر کے) کہا کہ یہ میرے رب کی ایک رحمت ہے (مجھ پر بھی کہ میرے ہاتھوں یہ کام ہو گیا اور اس قوم کے لئے بھی جن کو یا جوج ماجوج ستاتے تھے) پھر جس وقت رب کا وعدہ آئے گا (یعنی اس کی فنا کا وقت آئے گا) تو اس کو ڈھا کر (زمین کے) برابر کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ برحق ہے را در اپنے وقت پر ضرور واقع ہوتا ہے) :

معارف و مسائل

لغات مشککہ کا حل | بَيْنَ السَّيْنَيْنِ لفظ سَدَّ عربی زبان میں ہر اس چیز کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی چیز کے لئے رکاوٹ بن جائے خواہ دیوار ہو یا پہاڑ اور قدرتی ہو یا مصنوعی، یہاں سَدَّین سے دو پہاڑ مراد ہیں، جو یا جوج ماجوج کے راستہ میں رکاوٹ تھے، لیکن ان دونوں کے درمیانی درے سے وہ حملہ آور ہوتے تھے جس کو ذوالقترنین نے بند کیا۔

زُبَرَ الْحَدِيدِ، زبر ازبرہ کی جمع ہے، جس کے معنی تختی یا چادر کے ہیں، مراد لوہے کے ٹکڑے ہیں جن کو اس درے کو بند کرنے والی دیوار میں اینٹ پتھر کے بجائے استعمال کرنا تھا۔
الْحَدَّيْنِ، دو پہاڑوں کی دو جانبیں جو ایک دوسرے کے بالمقابل ہوں۔
قَطْرًا، قطر کے معنی اکثر مفسرین کے نزدیک پگھلے ہوئے تانبے کے ہیں، بعض نے پگھلے ہوئے لوہے یا رانگ کو بھی قطر کہا ہے (قرطبی)
دَحَاةً، یعنی ریزہ ریزہ ہو کر زمین کے برابر ہو جانے والی۔

یا جوج ماجوج کون ہیں اور کہاں ہیں؟ سَدَّ ذوالقرنین کس جگہ ہے؟

ان کے متعلق اسرائیلی روایات اور تاریخی کہانیوں میں بہت بے سرو پا عجیب غریب باتیں شہور ہیں، جن کو بعض حضرات مفسرین نے بھی تاریخی حیثیت سے نقل کر دیا ہے، مگر وہ خود ان کے نزدیک بھی قابل اعتماد نہیں، قرآن کریم نے ان کا مختصر سا حال اجمالاً بیان کیا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بقدر ضرورت تفصیلات سے بھی امت کو آگاہ کر دیا، ایسا لانے اور اعتقاد رکھنے کی چیز صرف اتنی ہی ہے جو قرآن اور احادیث صحیحہ میں آگئی ہے، اس سے زائد تاریخی اور جغرافیائی حالات جو مفسرین محدثین اور مورخین نے ذکر کئے ہیں وہ صحیح بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی، ان میں جو اہل تاریخ کے اقوال مختلف ہیں وہ قرائن اور قیاسات

اور تخمینوں پر مبنی ہیں ان کے صحیح یا غلط ہونے کا کوئی اثر قرآنی ارشادات پر نہیں پڑتا۔
میں اس جگہ پہلے وہ احادیث نقل کرتا ہوں جو اس معاملے میں محدثین کے نزدیک صحیح یا قابل
اعتماد ہیں اس کے بعد بقدر ضرورت تاریخی روایات بھی لکھی جا دیں گی۔

یا جوج ماجوج کے متعلق قرآن و سنت کی تصریحات سے اتنی بات تو بلاشبہ ثابت ہو کہ یا جوج ماجوج
روایت حدیث انسانوں ہی کی قومیں ہیں عام انسانوں کی طرح نوح علیہ السلام کی اولاد
میں سے ہیں، کیونکہ قرآن کریم کی نص صریح ہے وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمْ الْبَاقِينَ، یعنی طوفان
نوح علیہ السلام کے بعد جتنے انسان زمین پر باقی ہیں اور رہیں گے وہ سب حضرت نوح علیہ السلام
کی اولاد میں ہوں گے، تاریخی روایات اس پر متفق ہیں کہ وہ یافت کی اولاد میں ہیں، ایک ضعیف
حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، ان کے باقی حالات کے متعلق سب سے زیادہ تفصیلی اور صحیح
حدیث حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ کی ہے جس کو صحیح مسلم اور تمام مستند کتب حدیث ثبا
نقل کیا گیا، اور محدثین نے اس کو صحیح قرار دیا ہے، اس میں خروج دجال، نزول عیسیٰ علیہ السلام پھر
خروج یا جوج ماجوج وغیرہ کی پوری تفصیل مذکور ہے، اس پوری حدیث کا ترجمہ حسب ذیل ہے:-
حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے ایک دن صبح کے وقت دجال کا تذکرہ فرمایا، اور تذکرہ فرماتے ہوئے بعض باتیں اس کے
متعلق ایسی فرمائیں کہ جن سے اس کا حقیر و ذلیل ہونا معلوم ہوتا تھا (مثلاً یہ کہ وہ کانا ہے،
اور بعض باتیں اس کے متعلق ایسی فرمائیں کہ جن سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کا فتنہ سخت
اور عظیم ہے (مثلاً جنت و دوزخ کا اس کے ساتھ ہونا اور دوسرے خوارقِ عادات)۔
آپ کے بیان سے رہم پر ایسا خوف طاری ہوا کہ (گویا دجال کجوروں کے جھنڈ میں ہے (یعنی
قریب ہی موجود ہے) جب ہم شام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو
آپ نے ہمارے قبلی تاثرات کو بھانپ لیا اور پوچھا کہ تم نے کیا سمجھا؟ ہم نے عرض کیا کہ
آپ نے دجال کا تذکرہ فرمایا اور بعض باتیں اس کے متعلق ایسی فرمائیں جن سے اس کا معاملہ
حقیر اور آسان معلوم ہوتا تھا، اور بعض باتیں ایسی فرمائیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی
بڑی قوت ہوگی اس کا فتنہ بڑا عظیم ہے، ہمیں تو ایسا محسوس ہونے لگا کہ ہمارے قریب ہی
وہ کجوروں کے جھنڈ میں موجود ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے، تمہارے بارے
میں جن فتنوں کا مجھے خوف ہے ان میں دجال کی بہ نسبت دوسرے فتنے زیادہ قابلِ خوف ہیں،
(یعنی دجال کا فتنہ اتنا عظیم نہیں جتنا تم نے سمجھ لیا ہے) اگر میری موجودگی میں وہ نکلا تو میں
اس کا مقابلہ خود کروں گا، (تمہیں اس کے فکر کی ضرورت نہیں) اور اگر وہ میرے بعد آیا تو

ہر شخص اپنی ہمت کے موافق اس کو مغلوب کرنے کی کوشش کرے گا، حق تعالیٰ میری غیر موجودگی میں ہر مسلمان کا ناصر اور مددگار ہے، (اس کی علامت یہ ہے کہ وہ نوجوان سخت پچھرا بالوں والا ہے، اس کی ایک آنکھ اوپر کو ابھری ہوئی ہے، اور دوسری آنکھ سے کانابہ، جیسا کہ دوسری روایات میں ہے) اور اگر میں (اس کی قبیح صورت میں) اس کو کسی کے ساتھ تشبیہ دے سکتا ہوں تو وہ عبدالعزیزی بن قطن ہے (یہ زمانہ جاہلیت میں بنو خزاعہ قبیلہ کا ایک بڑے کل شخص تھا) اگر تم میں سے کسی مسلمان کا دجال کے ساتھ سامنا ہو جائے تو اس کو چاہئے کہ وہ سورہ کہف کی ابتدائی آیات پڑھ لے، (اس سے دجال کے فتنہ سے محفوظ ہو جائے گا) دجال شام اور عراق کے درمیان سے نکلے گا، اور ہر طرف فساد مچائے گا، اے اللہ کے بندو! اس کے مقابلہ میں ثابت قدم رہو۔ ہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ وہ زمین میں کس قدر مدت رہے گا، آپ نے فرمایا وہ چالیس دن رہے گا، لیکن پہلے دن ایک سال کے برابر ہوگا، اور دوسرا دن ایک ماہ کے برابر ہوگا، اور تیسرا دن ایک ہفتہ کے برابر ہوگا، اور باقی دن عام دنوں کے برابر ہوں گے، ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ جو دن ایک سال کے برابر ہوگا، کیا ہم اس میں صرف ایک دن کی (پانچ نمازیں) پڑھیں گے؟ آپ نے فرمایا نہیں، بلکہ وقت کا اندازہ کر کے پورے سال کی نمازیں ادا کرنا ہوں گی، پھر ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ زمین میں کس قدر سرعت کے ساتھ سفر کریگا فرمایا اس ابر کے مانند تیز چلے گا جس کے پیچھے موافق ہوا لگی ہوئی ہو، پس دجال کسی قوم کے پاس سے گزرے گا ان کو اپنے باطل عقائد کی دعوت دے گا، وہ اس پر ایمان لائیں گے تو وہ بادلوں کو حکم دے گا تو وہ برسے لگیں گے، اور زمین کو حکم دے گا تو وہ سرسبز و شاداب ہو جائیگی (اور ان کے مولیٰ اس میں چریں گے) اور شام کو جب واپس آئیں گے تو ان کے کوہان پہلے کی بہ نسبت بہت اونچے ہوں گے، اور تختن دو دھ سے بھرے ہوتے ہوں گے، اور ان کی کوکھیں پر ہوں گی، پھر دجال کسی دوسری قوم کے پاس سے گزرے گا اور ان کو بھی اپنے کفر و اضلال کی دعوت دے گا، لیکن وہ اس کی باتوں کو رد کر دیں گے، وہ ان سے مایوس ہو کر چلا جائے گا تو یہ مسلمان لوگ قحط سالی میں مبتلا ہو جائیں گے، اور ان کے پاس کچھ مال نہ رہے گا، اور ویران زمین کے پاس سے اس کا گزر ہوگا، تو وہ اس کو خطاب کرے گا کہ اپنے خزانوں کو باہر لے آ، چنانچہ زمین کے خزانے اس کے پیچھے پیچھے ہولیں گے، جیسا کہ شہد کی مکھیاں اپنے سردار کے پیچھے ہولتی ہیں، پھر دجال ایک آدمی کو بلائے گا، جس کا شباب پورے زوروں پر ہوگا، اس کو تلوار مار کر دو ٹکڑے کر دے گا، اور دونوں ٹکڑے اس قدر فاصلہ پر کر دیتے جائیں گے جس قدر تیر مار نیو لے اور نشانہ کے درمیان فاصلہ ہوتا ہے، پھر وہ اس کو بلائے گا، وہ (زندہ ہو کر) دجال کی طرف

اس کے اس محل پر پہنستا ہوا روشن چہرے کے ساتھ آجائے گا، دریں اثنا حق تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نازل فرمائیں گے، چنانچہ وہ دو رنگ دار چادریں پہنے ہوئے دمشق کی مشرقی جانب کے قید مینارہ پر اس طرح نازل فرمائیں گے کہ اپنے دونوں ہاتھوں کو فرشتوں کے پردوں پر رکھے ہوتے ہوں گے جب اپنے سر مبارک کو نیچے کریں گے تو اس سے پانی کے قطرات جھڑیں گے (جیسے کوئی ابھی غسل کر کے آیا ہو) اور جب سر کو اوپر کریں گے تو اس وقت بھی پانی کے متفرق قطرات جو مویلوں کی طرح صاف ہوں گے گریں گے، جس کافر کو آپ کے سانس کی ہوا پہنچے گی وہ وہیں مرجائے گا، اور آپ کا لہس اس قدر دور پہنچے گا جس قدر دور آپ کی نگاہ جائے گی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام دجال کو تلاش کریں گے، یہاں تک کہ آپ اُسے باب اللہ پر جا پکڑیں گے (یہ بستی اب بھی بیت المقدس کے قریب اسی نام سے موجود ہے) وہاں اس کو قتل کر دیں گے، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام دیگوں کے پاس تشریف لائیں گے، اور دبلو شفقت کے، ان کے چہروں پر ہاتھ پھیریں گے، اور جنت میں اعلیٰ درجات کی ان کو خوش خبری سنائیں گے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابھی اسی حال میں ہوں گے کہ حق تعالیٰ کا حکم ہو گا کہ میں اپنے بندوں میں ایسے لوگوں کو نکالوں گا جن کے ہاتھ بلہ کی کسی کو طاقت نہیں، آپ مسلمانوں کو جمع کر کے کوہ طور پر چلے جائیں (چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام ایسا ہی کریں گے) اور حق تعالیٰ یا جوج ماجوج کو کھول دیگا، تو وہ سرخستہ سیر کے سبب ہر بلندی سے پھسلتے ہوئے دکھائی دیں گے، ان میں سے پہلے لوگ بحیرہ طبریہ سے گزریں گے، اور اس کا سب پانی پی کر ایسا کر دیں گے کہ جب ان میں سے دوسرے لوگ اس بحیرہ سے گزریں گے تو دریا کی جگہ کو خشک دیکھ کر کہیں گے کہ کبھی یہاں پانی ہو گا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے رفقاء کوہ طور پر پہنچا لیں گے، اور دوسرے مسلمان اپنے قلعوں اور محفوظ جگہوں میں پناہ لیں گے، کھانے پینے کا سامان ساتھ ہو گا، مگر وہ کم چڑھا لیں گے تو ایک ہیں کے سر کو سو دینار سے بہتر سمجھا جائے گا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دوسرے مسلمان اپنی تکلیف دفع ہونے کے لئے حق تعالیٰ سے دعا کریں گے (حق تعالیٰ دعائے قبول فرمائیں گے) اور ان پر وہ بانی صورت میں ایک بیماری بھیجیں گے، اور یا جوج ماجوج تھوڑی دیر میں سب کے سب مرجائیں گے، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی کوہ طور سے نیچے آئیں گے تو دیکھیں گے کہ زمین میں ایک باشت جگہ بھی ان کی لاشوں سے خالی نہیں (اور لاشوں کے مڑنے کی وجہ سے) سخت تعفن پھیلا ہو گا، (اس کیفیت کو دیکھ کر دوبارہ) حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی حق تعالیٰ سے دعا کریں گے کہ یہ مصیبت بھی دفع ہو، حق تعالیٰ قبول فرمائیں گے، اور بہت بھاری بھر کم پرندوں کو بھیجیں گے، جن کی گردنیں اونٹ

کی گردن کے مانند ہوں گی، روہ ان کی لاشوں کو اٹھا کر جہاں اللہ کی مرضی ہوگی وہاں پھینک دیں گے بعض روایات میں ہے کہ دریائیں ڈالیں گے، پھر حق تعالیٰ بارش برسائیں گے، کوئی شہر اور جنگل ایسا نہ ہوگا جہاں بارش نہ ہوئی ہوگی، ساری زمین ڈھل جائے گی، اور شیشہ کے مانند صاف ہو جائیگی، پھر حق تعالیٰ زمین کو حکم فرمائیں گے کہ اپنے پیٹ سے پھلوں اور پھولوں کو اگادے، اور (از سر نو) اپنی برکات کو ظاہر کر دے، چنانچہ ایسا ہی ہوگا اور اس قدر برکت ظاہر ہوگی کہ ایک انار ایک جماعت کے کھانے کے لئے کفایت کرے گا، اور لوگ اس کے چھلکے کی پستری بنا کر سایہ حاصل کریں گے، اور دودھ میں اس قدر برکت ہوگی کہ ایک اونٹنی کا دودھ ایک بہت بڑی بیت کے لئے کافی ہوگا، اور ایک گائے کا دودھ ایک قبیلہ کے سب لوگوں کو کافی ہو جائے گا، اور ایک بکری کا دودھ پوری برادری کو کافی ہو جائے گا، (یہ غیر معمولی برکات اور امن و امان کا زمانہ چالیس سال رہنے کے بعد جب قیامت کا وقت آجائے گا تو) اس وقت حق تعالیٰ ایک خوشگوار ہوا چلائیں گے جس کی وجہ سے سب مسلمانوں کی بغلوں کے نیچے ایک خاص بیماری ظاہر ہو جائے گی، اور سب کے سب وفات پا جائیں گے، اور باقی صرف شریروں کا فرقہ جائیں گے، جو زمین پر گتھم گتھا حرام کاری جانوروں کی طرح کریں گے، ایسے ہی لوگوں پر قیامت آئے گی۔

اور حضرت عبدالرحمن بن یزید کی روایت میں یاجوج ماجوج کے قصہ کی زیادہ تفصیل آئی ہے، وہ یہ کہ بحیرہ طبریہ سے گزرنیکے بعد یاجوج ماجوج بیت المقدس کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ جسے النمر بن قریظہ جاتیں گے اور کہیں گے کہ ہم نے زمین والوں کو سب کو قتل کر دیا ہے، اب ہم آسمان والوں کا خاتمہ کریں، چنانچہ وہ اپنے تیر آسمان کی طرف پھینکیں گے، اور وہ تیر حق تعالیٰ کے حکم سے خون آلود ہو کر ان کی طرف واپس آئیں گے (تاکہ وہ اس حق پر سمجھ کر خوش ہوں کہ آسمان والوں کا بھی خاتمہ کر دیا)

اور دجال کے قصہ میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ دجال مدینہ منورہ سے دور رہے گا، اور مدینہ کے رستوں پر بھی اس کا آنا ممکن نہ ہوگا تو وہ مدینہ کے قریب ایک شور زمین کی طرف آئے گا، اس وقت ایک آدمی دجال کے پاس آئے گا، اور وہ آدمی اس وقت کے بہترین لوگوں میں سے ہوگا، اور اس کی خطاب کر کے کہوگا کہ میں یقین سے کہتا ہوں کہ تو وہی دجال ہے جس کی ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی تھی (یہ سن کر) دجال کہنے لگے گا، لوگو! مجھے یہ بتاؤ کہ اگر میں اس آدمی کو قتل کر دوں اور پھر اسے زندہ کر دوں تو میرے نہ اچھونے میں شک کرو گے، وہ جواب دے گا، نہیں

چنانچہ وہ اس آدمی کو قتل کرے گا اور پھر اس کو زندہ کر دے گا، تو وہ درجہ الٰہی کو کہیگا کہ اب مجھے تیرے درجہ ہونے کا پہلے سے زیادہ یقین ہو گیا ہے، درجہ الٰہی اس کو دوبارہ قتل کرنے کا ارادہ کرے گا، لیکن وہ اس پر قادر نہ ہو سکے گا۔ (صحیح مسلم)

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام سے فرمائیں گے کہ آپ اپنی ذریت میں سے بعث الناس (یعنی جہنمی لوگ) اٹھائیے، وہ عرض کریں گے، اے رب وہ کون ہیں تو حکم ہوگا کہ ہر ایک ہزار میں سے نو سو تانے جہنمی ہیں صرف ایک جنتی ہے، صحابہ کرام سہم گئے اور دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ہم میں سے وہ ایک جنتی کونسا ہوگا، تو آپ نے فرمایا غم نہ کرو، کیونکہ یہ نو سو تانے جہنمی تم میں سے ایک اور یا جوج ماجوج میں سے ایک ہزار کی نسبت سے ہوں گے اور مستدرک حاکم میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کے دل حصے حصے کئے، ان میں سے نو حصے یا جوج ماجوج کے ہیں اور باقی ایک حصہ میں باقی ساری دنیا کے انسان ہیں (روح المعانی)

ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں ان روایات کو ذکر کر کے لکھا ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ یا جوج ماجوج کی تعداد ساری انسانی آبادی سے بجز زائد ہے۔

مسند احمد اور ابوداؤد میں باسناد صحیح حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام نزول کے بعد چالیس سال زمین پر رہیں گے، مسلم کی ایک روایت میں جو سات سال کا عرصہ بتلایا ہے حافظ نے فتح الباری میں اس کو مؤثر یا مرجوح قرار دے کر چالیس سال ہی کا عرصہ صحیح قرار دیا ہے، اور حسب تصریح احادیث یہ پورا عرصہ امن و امان اور برکات کے ظہور کا ہوگا، بغض و عداوت آپس میں قطعاً نہ رہے گا، کبھی دو آدمیوں میں کوئی جھگڑا یا عداوت نہیں ہوگی (روایت مسلم و احمد)

بخاری نے حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیت اللہ کا حج و عمرہ شروع یا جوج ماجوج کے بعد بھی جاری رہے گا (تفسیر نظم می)۔ بخاری و مسلم نے حضرت زینب بنت جحش اُم المؤمنینؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ایک روز) نیند سے ایسی حالت میں بیدار ہوئے کہ چہرہ مبارک شرخ ہو رہا تھا، اور آپ کی زبان مبارک پر یہ جملے تھے،

”اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، خدائی ہو
عب کی اس شر سے جو قریب آچکا ہے،“

لا الہ الا اللہ ویل للعرب
من شر قد اختلف الیوم

آج کے دن یا جوج و ما جوج کی روم یعنی
سڈ میں اتنا سوراخ کھل گیا ہے، اور

من ردم یا جوج و ما جوج مثل
ہذہ وحلق تسعین

آپ نے عقد تسعین یعنی انگوٹھے اور انگشت شہادت کو ملا کر حلقہ بنا کر دکھلایا۔
ام المؤمنین منسراقی ہیں کہ اس ارشاد پر ہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا ہم ایسے
حال میں ہلاک ہو سکتے ہیں جبکہ ہمارے اندر صالحین موجود ہوں؟ آپ نے فرمایا ہاں ہلاک ہو سکتے
ہیں، جبکہ خبیث (یعنی شر) کی کثرت ہو جائے (مثلاً فی التبعین عن ابی ہریرۃ ز، کذا فی البدایۃ
والنہایۃ لابن کثیر) اور سڈ یا جوج میں بہت رحلقہ سوراخ ہو جانا اپنے حقیقی معنی میں ہو سکتا ہے،
اور مجازی طور پر سڈ ذوالہترین کے کمزور ہو جانے کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے (ابن کثیر، ابو حیان،
مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یا جوج و ما جوج ہر روز سڈ ذوالقرنین کو کھودتے رہتے ہیں، یہاں
تک کہ اس آہنی دیوار کے آخری حصہ تک لٹنے قریب پہنچ جاتے ہیں کہ دوسری طرف کی
روشنی نظر آنے لگے، مگر یہ کہہ کر ٹوٹ جاتے ہیں کہ باقی کو کھل کھود کر پار کر دیں گے، مگر اللہ تعالیٰ
اس کو پھر ویسا ہی مضبوط درست کر دیتے ہیں، اور اگلے روز پھر نئی محنت اس کے کھودنے
میں کرتے ہیں، یہ سلسلہ کھودنے میں محنت کا اور پھر منجانب اللہ اس کی درستی کا اس وقت تک
چلتا رہے گا جس وقت تک یا جوج و ما جوج کو بند رکھنے کا ارادہ ہے، اور جب اللہ تعالیٰ
ان کو کھولنے کا ارادہ فرمائیں گے تو اس روز جب محنت کر کے آخری حد میں پہنچا دیں گے
اس دن یوں کہیں گے کہ اگر اللہ نے چاہا تو ہم کھل اس کو پار کر لیں گے (اللہ کے نام اور
اس کی مشیت پر موقوف رکھنے سے آج توفیق ہو جائے گی) تو اگلے روز دیوار کا باقی ماندہ
حصہ اپنی حالت پر ملے گا اور وہ اس کو توڑ کر پار کر لیں گے۔

ترمذی نے اس روایت کو بسند ابی عوانہ عن قتادہ عن ابی رافع عن ابی ہریرۃ نقل
کر کے فرمایا: غریب لا یصح فیہ الا من ہذا الوجه، ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اس روایت
کو نقل کر کے فرمایا:-

اسنادہ جید قوی ولکن متنبہ | "اسناد اس کی جید اور قوی ہے، لیکن
فی رفعہ نکارۃ | حضرت ابو ہریرہؓ سے اس کو مرفوع کرنا

یا اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے میں ایک نکارت واجنبیت
معلوم ہوتی ہے۔"

اور ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں اس حدیث کے متعلق فرمایا کہ اگر یہ بات صحیح مان لی جائے

کہ یہ حدیث مرفوع نہیں بلکہ کعب احبار کی روایت ہے تب تو بات صاف ہو گئی کہ یہ کوئی قابل اعتماد چیز نہیں اور اگر اس روایت کو دہم راوی سے محفوظ قرار دے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ارشاد قرار دیا جائے تو پھر مطلب اس کا یہ ہو گا کہ یا جوج، جوج کا یہ عمل سد کو کھودنے کا اس وقت شروع ہو گا جبکہ ان کے خروج کا وقت قریب آجائے گا، اور قرآنی ارشاد کہ اس دیوار میں نقب نہیں لگائی جاسکتی، یہ اس وقت کا حال ہے جبکہ ذوالقصر میں نے اس کو تعمیر کیا تھا، اس کو کوئی تعارض نہ رہا، نیز یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ نقب سے مراد دیوار کا وہ رخہ اور سوراخ ہے جو آریار ہو جائے، اور اس روایت میں اس کی تصریح موجود ہے کہ یہ سوراخ آریار نہیں ہوتا (براہ ص ۱۲۱) حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس حدیث کو عبد بن حمید اور ابن حبان کے حوالے سے بھی نقل کر کے کہا ہے کہ ان سب کی روایت حضرت قتادہ سے ہے، اور ان میں سے بعض کی سند کے رجال صحیح بخاری کے رجال ہیں، اور حدیث کے مرفوع قرار دینے پر بھی کوئی شبہ نہیں کیا، اور بحوالہ ابن عربی بیان کیا کہ اس حدیث میں تین آیات الہیہ یعنی معجزات ہیں، اول یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذہنوں کو اس طرف متوجہ نہیں ہونے دیا، کہ سد کو کھودنے کا کام رات دن مسلسل جاری رکھیں، ورنہ اتنی بڑی قوم کے لئے کیا مشکل تھا کہ دن اور رات کی ڈیوٹیاں الگ الگ مقرر کر لیتے، دوسرے ان کے ذہنوں کو اس طرف سے بچھ دیا کہ اس سد کے اوپر چڑھنے کی کوشش کریں، اس کے لئے آلات سے مدد لیں حالانکہ وہب بن منبہ کی روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ صاحب زراعت و صنعت ہیں، ہر طرح کے آلات رکھتے ہیں، ان کی زمین میں درخت بھی مختلف قسم کے ہیں، کوئی مشکل کام نہ تھا کہ اوپر چڑھنے کے ذرائع وسائل پیدا کر لیتے، تیسرے یہ کہ ساری مدت میں ان کے قلوب میں یہ بات نہ آئے کہ انشاء کہہ لیں، صرف اس وقت یہ بکھر ان کی زبان پر جاری ہو گا، جب ان کے نکلنے کا وقت مقرر آجائے گا۔

ابن عربی نے فرمایا کہ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یا جوج، جوج میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے وجود اور اس کی مشیت و ارادے کو مانتے ہیں، اور یہ بھی ممکن ہو کہ بغیر کسی عقیدے کے ہی ان کی زبان پر اللہ تعالیٰ یہ کلمہ جاری کر دے، اور اس کی برکت سے ان کا کام بن جائے، (اشراط الساعۃ للسیّد محمد، ص ۱۵۴) مگر ظاہر یہی ہے کہ ان کے پاس بھی انبیاء علیہم السلام کی دعوت پہنچ چکی ہے، ورنہ نص قرآنی کے مطابق ان کو جہنم کا عذاب نہ ہونا چاہئے، وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا، معلوم ہوا کہ دعوت ایمان ان کو بھی پہنچی ہے، مگر یہ لوگ کفر پر جھکے رہے، ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو اللہ کے وجود

اور اس کے ارادہ و مشیت کے قائل ہوں گے، اگرچہ صرف اتنا عقیدہ ایمان کے لئے کافی نہیں جب تک رسالت اور آخرت پر ایمان نہ ہو، بہر حال اللہ کا کلمہ کہنا باوجود کفر کے بھی بعید نہیں۔

روایات حدیث سے مذکور الصدر احادیث میں یاجوج ماجوج کے متعلق جو باتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے ثابت ہوئیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) یاجوج ماجوج عام انسانوں کی طرح انسان حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں، چھوڑتے تھیں و مورخین ان کو یافت ابن نوح علیہ السلام کی اولاد قرار دیتے ہیں، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یافت ابن نوح کی اولاد نوح علیہ السلام کے زمانے سے ذوالقرنین کے زمانے تک دور دور تک مختلف قبائل اور مختلف قوموں اور مختلف آبادیوں میں پھیل چکی تھی، یاجوج ماجوج جن قوموں کا نام ہے یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ سب سب ذوالقرنین کے پیچھے ہی منحصر ہو گئے ہوں، ان کے کچھ قبائل اور قومیں سب ذوالقرنین کے اس طرف بھی ہوں گے، البتہ ان میں سے جو قتل و غارت گری کرنے والے وحشی لوگ تھے، وہ سب ذوالقرنین کے ذریعہ روک دیئے گئے مورخین نام طور سے ان کو ترک اور مغول یا منگولین کہتے ہیں، مگر ان میں سے یاجوج ماجوج نام صرف ان وحشی غیر متحضر و خوار ظالم لوگوں کا ہے جو تمدن سے آشنا نہیں ہوئے، انہی کی برادری کے مغول اور ترک یا منگولین جو تمدن ہو گئے وہ اس نام خارج ہیں۔

(۲) یاجوج ماجوج کی تعداد پوری دنیا کے انسانوں کی تعداد سے بدرجہا زائد کم از کم ایک اور دس کی نسبت سے ہے (حدیث نمبر ۲)

(۳) یاجوج ماجوج کی جو قومیں اور قبائل سب ذوالقرنین کے ذریعہ اس طرف آنے سے روک دیئے گئے ہیں وہ قیامت کے بالکل قریب تک اسی طرح محصور رہیں گے، ان کے نکلنے کا وقت مقرر ظہور مہدی علیہ السلام پھر خروج دجال کے بعد وہ ہوگا جبکہ عیسیٰ علیہ السلام نازل ہو کر دجال کو قتل کر چکیں گے۔ (حدیث نمبر ۱)

(۴) یاجوج ماجوج کے کھلنے کے وقت سب ذوالقرنین متہمم ہو کر زمین کے برابر ہو جائے گی، (آیت قرآن) اس وقت یہ یاجوج ماجوج کی بے پناہ قومیں بیک وقت پہاڑوں کی بلندیوں سے اترتی ہوئی سرعت رفتار کے سبب ایسی معلوم ہوں گی کہ گویا یہ پھسل پھسل کر گر رہے ہیں، اور یہ لا تعداد وحشی انسان عام انسانی آبادی اور پوری زمین پر ٹوٹ پڑیں گے، اور ان کے قتل و غارت گری کا کوئی مقابلہ نہ کر سکے گا، اللہ کے رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی بامراکبی اپنے ساتھی مسلمانوں کو لے کر کوہ طور پر پناہ لیں گے، اور عام دنیا کی آبادیوں میں جہاں کچھ قلعے محفوظ مقامات ہیں وہ ان میں بند ہو کر اپنی جانیں بچائیں گے، کھانے پینے کا سامان ختم ہونے کے بعد

نہ دریاۓ زندگی انتہائی گراں ہو جائے گی، باقی انسانی آبادی کو یہ وحشت قومیں ختم کر ڈالیں گی، ان کے دریاؤں کو چاٹ جائیں گی (حدیث نمبر ۱)

(۵) حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے رفقاء کی دُعا سے پھر یہ ٹلڈی دل قسم کی بے شمار قومیں بیک وقت ہلاک کر دی جائیں گی، ان کی لاشوں سے ساری زمین پٹ جائے گی، ان کی ہڈیوں کی وجہ سے زمین پر بسنا مشکل ہو جائے گا (حدیث نمبر ۱)

(۶) پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے رفقاء ہی کی دُعا سے ان کی لاشیں دریا بردیا غائب کر دی جائے گی اور عالمگیر بارش کے ذریعہ پوری زمین کو دھو کر پاک صاف کر دیا جائے گا (حدیث نمبر ۱)

(۷) اس کے بعد تقریباً چالیس سال امن و امان کا دور دورہ ہوگا، زمین اپنی برکات سے اٹھل دے گی، کوئی مجلس محتاج نہ رہے گا، کوئی کسی کو نہ ستائے گا، سکون و اطمینان آرام و راحت عام ہوگی (حدیث نمبر ۳)

(۸) اس امن و امان کے زمانے میں بیت اللہ کا حج و عمرہ جاری رہے گا (حدیث نمبر ۴)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات اور روضۃ اقدس میں دفن روایات حدیث سے ثابت ہے، اس کی بھی یہی صورت ہوگی کہ وہ حج یا عمرہ کے لئے حجاز کا سفر کریں گے رکما رواہ مسلم عن ابی ہریرۃ (صحیح) اس کے بعد مدینہ طیبہ میں وفات ہوگی، روضۃ اقدس میں دفن کیا جائے گا۔

(۹) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر زمانے میں بذریعہ وحی خواب آپ کو دکھلایا گیا کہ ستر ذوالقترین میں ایک سوراخ ہو گیا ہے جس کو آپ نے عرب کے لئے شہرِ فتنہ کی علامت قرار دی، اس دیوار میں سوراخ ہو جانے کو بعض محدثین نے اپنی حقیقت پر معمول کیا ہے، اور بعض نے اس کا مطلب بطور استعارہ اور مجاز کے یہ قرار دیا ہے کہ اب یہ ستر ذوالقترین کمزور ہو چکی ہے، خروج یا خروج کا وقت قریب آ گیا ہے اور اس کے آثار عرب قوم کا تنزل و انحطاط کے رنگ میں ظاہر ہوں گے۔ واللہ اعلم

(۱۰) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد ان کا قیام زمین پر چالیس سال ہوگا، (حدیث نمبر ۳) ان سے پہلے حضرت مہدی علیہ السلام کا زمانہ بھی چالیس سال رہے گا، جس میں کچھ حصہ دونوں کے اجتماع و اشتراک کا ہوگا، سید شریف برزنجی نے اپنی کتاب شرائط الساعۃ صفحہ ۱۴ میں لکھا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا قیام قتل و قتل و آجال اور امن و امان کے بعد چالیس سال ہوگا، اور نمونۂ قیام پینتالیس سال ہوگا، اور صفحہ ۱۲ میں ہے کہ مہدی علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تیس سال پہلے ظاہر ہوں گے، اور ان کا نمونہ زمانہ چالیس سال ہوگا، اس طرح پانچ یا سات سال تک دونوں حضرات کا اجتماع رہے گا، اور ان دونوں زمانوں

کی یہ خصوصیت ہوگی کہ پوری زمین پر عدل و انصاف کی حکومت ہوگی، زمین اپنی برکات اور خزانے اُگل دے گی، کوئی فقیر و محتاج نہ رہے گا، لوگوں کے آپس میں بغض و عداوت قطعاً نہ رہے گی، ہاں حضرت مہدی علیہ السلام کے آخری زمانے میں دجال اکبر کا فتنہ عظیم سوائے مکہ اور مدینہ اور بیت المقدس اور کوبہ طبر کے سارے عالم پر چھا جائے گا، اور یہ فتنہ دنیا کے تمام فتنوں سے عظیم تر ہوگا، دجال کا قیام اور فساد صرف چالیس دن رہے گا، مگر ان چالیس دنوں میں سے پہلا دن ایک سال کا، دوسرا دن ایک مہینہ کا، تیسرا دن ایک ہفتہ کا ہوگا، باقی دن عام دنوں کی طرح کے ہوں گے جس کی صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حقیقتاً یہ دن اتنے طویل کر دیئے جائیں، کیونکہ اس آخر زمانے میں تقریباً سارے واقعات ہی خرقِ عادت اور معجزہ کے ہوں گے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ دن رات تو اپنے معمول کے مطابق ہوتے رہیں مگر دجال کا بڑا ساحر ہونا حدیث سے ثابت ہے، ہو سکتا ہے کہ اس کے سحر کے اثر سے ہم مخلوق کی نظروں پر یہ دن رات کا تغیر و انقلاب ظاہر نہ ہو، وہ اس کو ایک ہی دن دیکھتے اور سمجھتے رہیں، حدیث میں جو اس کے اندر عام دنوں کے مطابق اندازہ لگا کر نمازیں پڑھنے کا حکم آیا ہے، اس سے بھی تائید اس کی ہوتی ہے کہ حقیقت کے اعتبار سے تو دن رات بدل رہے ہوں گے، مگر لوگوں کے احساس میں یہ بدلنا نہیں ہوگا، اس لئے اس ایک سال کے دن میں تین سو ساٹھ دنوں کی نمازیں ادا کرنے کا حکم دیا گیا، ورنہ اگر دن حقیقتاً ایک ہی دن ہوتا تو قواعدِ شریعہ کی زد سے اس میں صرف ایک ہی دن کی پانچ نمازیں منسوخ ہوتیں، خلاصہ یہ ہے کہ دجال کا اٹکل زمانہ اس طرح کے چالیس دن کا ہوگا۔

اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہو کر دجال کو قتل کر کے اس فتنہ کو ختم کر دیں گے، مگر اس کے متصل ہی یاجوج ماجوج کا خروج ہوگا جو پوری دنیا میں فساد اور قتل و غارتگری کریں گے، مگر ان کا زمانہ بھی چند ایام ہی ہوں گے، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعا سے یہ سب بیک وقت ہلاک ہو جائیں گے، غرض حضرت مہدی علیہ السلام کے زمانے کے آخر میں اور عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے شروع میں دو فتنے دجال اور یاجوج ماجوج کے ہوں گے جو تمام زمین کے لوگوں کو تہہ و بالا کر دیں گے، ان ایام محدودہ سے پہلے اور بعد میں پوری دنیا کے اندر عدل و انصاف اور امن و سکون اور برکات و ثمرات کا دور دورہ ہوگا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اسلام کے سوا کوئی کلمہ و مذہب زمین پر نہ رہے گا، زمین اپنے خزانے و فتنے اُگل دے گی، کوئی فقیر و محتاج نہ رہے گا، درندے اور زہریلے جانور بھی کسی کو تکلیف نہ پہنچائیں گے، یاجوج ماجوج اور سائر ذوالعثرین کے متعلق یہ معلومات تو وہ ہیں جو مسترآن اور احادیثِ نبویہ نے اُمت کو بتلا دیئے ہیں، اسی پر عقیدہ رکھنا ضروری اور مخالفت ناجائز ہے،

باقی رہی اس کی جغرافیائی بحث کہ سَد ذوالقترین کس جگہ واقع ہے، اور قوم یاجوج ماجوج کونسی قوم ہے، اور اس وقت کہاں کہاں بستی ہے، اگرچہ اس پر نہ کوئی اسلامی عقیدہ موقوف ہے، اور نہ قرآن کی کسی آیت کا مطلب سمجھنا اس پر موقوف ہے، لیکن مخالفین کی ہفتوات کے جواب اور مزید بصیرت کے لئے علماء امت نے اس سے بحث فرمائی ہے، اس کا کچھ حصہ نقل کیا جاتا ہے۔

قرطبی نے اپنی تفسیر میں بحوالہ سَدّی نقل کیا ہے کہ یاجوج ماجوج کے بائیس قبیلوں میں سے اکیس قبیلوں کو سَدّ ذوالقترین سے بند کر دیا گیا، ان کا ایک قبیلہ سَدّ ذوالقترین کے اندر اس طرف رہ گیا، وہ ترک ہیں، اس کے بعد قرطبی نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترک کے متعلق جو باتیں بتلائی ہیں وہ یاجوج ماجوج سے ملتی ہوئی ہیں، اور آخر زمانے میں مسلمانوں کی ان سے جنگ ہونا صحیح مسلم کی حدیث میں ہے، پھر فرمایا کہ اس زمانے میں ترک قوم کی بڑی بھاری تعداد مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے نکلی ہوئی ہے، جن کی صحیح تعداد اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے، وہی مسلمانوں کو ان کے شر سے بچا سکتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہی یاجوج ماجوج ہیں یا کم از کم ان کا مقدمہ ہیں (قرطبی، ص ۵۸ ج ۱۱) (قرطبی کا زمانہ چھٹی صدی ہجری ہے، جس میں فتنہ تاتار ظاہر ہوا، اور اسلامی خلافت کو تباہ و برباد کیا، ان کا عظیم فتنہ تاریخ اسلام میں معروف اور تاتاریوں کا مغول ترک میں سے ہونا مشہور ہے)۔ مگر قرطبی نے ان کو یاجوج ماجوج کے مشابہ اور ان کا مقدمہ قرار دیا ہے، ان کے فتنہ کو وہ خروج یاجوج ماجوج نہیں بتایا جو علامۂ قیامت میں سے ہے، کیونکہ صحیح مسلم کی حدیث مذکور میں اس کی تصریح ہے کہ وہ خروج حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد ان کے زمانے میں ہوگا۔

اسی لئے علامہ آلوسی نے اپنی تفسیر روح المعانی میں ان لوگوں پر رد کیا ہے جنہوں نے تاتاری کو یاجوج ماجوج قرار دیا، اور فرمایا کہ ایسا خیال کرنا کھلی ہوئی گمراہی ہے، اور نصوص حدیث کی مخالفت ہے، البتہ یہ انہوں نے بھی فرمایا کہ بلاشبہ یہ فتنہ یاجوج ماجوج کے فتنہ کے مشابہ ضرور ہے، (روح ص ۴۴ ج ۱۶) اس سے ثابت ہوا کہ اس زمانے میں جو بعض مؤرخین موجودہ روس یا چین یا دونوں کو یاجوج ماجوج قرار دیتے ہیں، اگر اس سے ان کی مراد وہی ہوتی جو قرطبی اور آلوسی نے فرمایا کہ ان کا فتنہ فتنہ یاجوج ماجوج کے مشابہ ہے تو یہ کہنا کچھ غلط نہ ہوتا، مگر اسی کو وہ خروج یاجوج ماجوج قرار دینا جس کی خبر قرآن و حدیث میں بطور علامات قیامت دی گئی، اور اس کا وقت نزول عیسیٰ علیہ السلام کے بعد بتلایا گیا یہ قطعاً غلط اور گمراہی اور نصوص حدیث کا انکار ہے۔

مشہور مؤرخ ابن خلدون نے اپنی تاریخ کے مقدمہ میں اقلیم سادس کی بحث میں یاجوج ماجوج

اور سد ذوالقرنین اور ان کے محل و مقام کے متعلق جغرافیائی تحقیق اس طرح فرمائی ہے :-
 ”ساتویں اقلیم کے نویں حصہ میں مغرب کی جانب ترکوں کے وہ قبائل آباد ہیں جو
 قنجاق اور چرکس کہلاتے ہیں، اور مشرق کی جانب یا جوج ماجوج کی آبادیاں ہیں اور
 ان دونوں کے درمیان کوہ قاف حد فاصل ہے جس کا ذکر گذشتہ سطور میں
 ہو چکا ہے، کہ وہ بحر محیط سے شروع ہوتا ہے، جو چوتھی اقلیم کے مشرق میں واقع ہے
 اور اس کے ساتھ شمال کی جانب اقلیم کے آخر تک چلا گیا ہے، اور پھر بحر محیط سے
 جدا ہو کر شمال مغرب میں ہوتا ہوا یعنی مغرب کی جانب جھکتا ہوا پانچویں اقلیم کے
 نویں حصہ میں داخل ہو جاتا ہے، یہاں سے وہ پھر اپنی پہلی سمت کو مڑتا ہے حتیٰ کہ
 ساتویں اقلیم کے نویں حصہ میں داخل ہو جاتا ہے، اور یہاں پہنچ کر جنوب کے
 شمال مغرب کو ہوتا ہوا گیا ہے، اور اسی سلسلہ کوہ کے درمیان سد سکندری
 واقع ہے، اور ساتویں اقلیم کے نویں حصہ کے وسط ہی میں وہ سد سکندری ہے،
 جس کا ہم ابھی ذکر کر آئے ہیں اور جس کی اطلاع قرآن نے بھی دی ہے۔

اور عبداللہ بن خرداذبہ نے اپنی جغرافیہ کی کتاب میں واثق باللہ خلیفہ عباسی
 کا وہ خواب نقل کیا ہے جس میں اس نے یہ دیکھا تھا کہ سد کھل گئی ہے، چنانچہ
 وہ گھبرا کر اٹھا اور دریافت حال کے لئے سلام تر جان کو روانہ کیا، اس نے
 واپس آ کر اسی سد کے حالات و اوصاف بیان کئے (مقدمہ ابن خلدون ص ۴۹)

واثق باللہ خلیفہ عباسی کا سد ذوالقرنین کی تحقیق کرنے کے لئے ایک جماعت کو بھیجا
 اور ان کا تحقیق کر کے آنا ابن کثیر نے بھی البدایہ والنہایہ میں ذکر کیا ہے، اور یہ کہ یہ دیوار پورے
 تعمیر کی گئی ہے، اس میں بڑے بڑے دروازے بھی ہیں جن پر قفل پڑا ہوا ہے، اور یہ شمال مشرق
 میں واقع ہے، اور تفسیر کبیر و طبری نے اس واقعہ کو بیان کر کے یہ بھی لکھا ہے کہ جو آدمی اس دیوار
 کا معائنہ کر کے واپس آنا چاہتا ہے تو رہ نما اس کو ایسے چٹیل میدانوں میں پہنچاتے ہیں جو ہر قند
 کے محاذات میں ہے۔ (تفسیر کبیر، ج ۵، ص ۵۱۳)

حضرت الاستاذ رحمۃ الاسلام سیدی حضرت مولانا انور شاہ کشمیری قدس سرہ نے
 اپنی کتاب عقیدۃ الاسلام فی حیاة عیسیٰ علیہ السلام میں یا جوج ماجوج اور سد ذوالقرنین
 کا حال اگرچہ ضمنی طور پر بیان فرمایا ہے مگر جو کچھ بیان کیا ہے وہ تحقیق و روایت کے اعلیٰ معیار
 پر ہے، آپ نے فرمایا کہ مفسد اور وحشی انسانوں کی تاخت و تاراج سے حفاظت کے لئے زمین
 پر ایک نہیں بہت سی جگہوں میں سدیں (دیواریں) بنائی گئی ہیں جو مختلف بادشاہوں نے

مختلف مقامات پر مختلف زمانوں میں بنائی ہیں، ان میں سے زیادہ بڑی اور مشہور دیوار چین ہے، جس کا طول ابوحیان اندلسی (در بار ایران کے شاہی مورخ) نے بارہ سو میل بتلایا ہے، اور یہ کہ اس کا بانی فقہور بادشاہ چین ہے، اور اس کی بنیاد کی تاریخ ہبوط آدم علیہ السلام سے تین ہزار چار سو ساٹھ سال بعد بتلائی، اور یہ کہ اس دیوار چین کو مغل لوگ آنکھوڑا اور ترک لوگ پور قورڈ کہتے ہیں، اور فرمایا کہ اسی طرح کی اور بھی متحد دیواریں ستریں مختلف مقامات پر پائی جاتی ہیں۔ ہمارے خواجہ تاس مولانا حفظ الرحمن سہواری نے اپنی کتاب قصص القرآن میں حضرت شیخ کے اس بیان کی تاریخی توضیح بڑی تفصیل و تحقیق سے لکھی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

یاجوج ماجوج کی تاخت و تاراج اور شر و فساد کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ ایک طرف کاکیشیا کے نیچے بسنے والے ان کے ظلم و ستم کا شکار تھے تو دوسری جانب بہت اور چین کے باشندے بھی ہر وقت ان کی زد میں تھے، انہی یاجوج ماجوج کے شر و فساد سے بچنے کے لئے مختلف زمانوں میں مختلف مقامات پر متحدہ دستہ تعمیر کی گئی، ان میں سب سے زیادہ بڑی اور مشہور دیوار چین ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

دوسری سد وسط ایشیا میں بخارا اور ترمذ کے قریب واقع ہے، اور اس کے فعل وقوع کا نام در بند ہے، یہ سد مشہور مغل بادشاہ تیمور لنگ کے زمانہ میں موجود تھی، اور شاہ روم کے خاص ہم نشین سیلا برجر جرمنی نے بھی اس کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے، اور اندلس کے بادشاہ کسٹیل کے قاصد کلاپو نے بھی اپنے سفر نامہ میں اس کا ذکر کیا ہے، یہ سنگہ میں اپنے بادشاہ کا سفیر ہو کر جب تیمور کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس جگہ سے گزرا ہے، وہ لکھتا ہے کہ باب الحديد کی سد موصیل کے اس راستہ پر ہے جو سمرقند اور ہندوستان کے درمیان ہے (از تفسیر جواہر القرآن لانسادی ص ۱۹۸) تیسری سد روسی علاقہ داغستان میں واقع ہے، یہ بھی در بند اور باب الالباب کے نام سے مشہور ہے، یا قوت حموی نے معجم البلدان میں ادرسی نے جغرافیہ میں اور بتانی نے دائرۃ المعارف میں اس کے حالات بڑی تفصیل سے لکھے ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

”داغستان میں در بند ایک روسی شہر ہے، یہ شہر بحر خزر (کاسپین) کے غریبی کنارہ پر واقع ہے، اس کا عرض البلد ۳۳-۳۴ شمالاً اور طول البلد ۴۵-۴۸ شرقاً ہے، اور اس کو در بند انوشیرواں بھی کہتے ہیں، اور باب الالباب کے نام سے بہت مشہور ہے۔“

چوتھی سد اسی باب الالباب سے مغرب کی جانب کاکیشیا کے بہت بلند جھٹوں میں ہے، جہاں دو پہاڑوں کے درمیان ایک درہ درہ داریال کے نام سے مشہور ہے، اس جگہ یہ چوتھی سد

جو قفقاز یا جبل قاف یا کوہ قاف کی سدا کہلاتی ہے، بستانی نے اس کے متعلق لکھا ہے:
 ”اور اسی کے (یعنی سد باب الابواب کے) قریب ایک اور سد ہے جو عربی جا۔
 بڑھتی چلی گئی ہے، غالباً اس کو اہل فارس نے شمالی بربروں سے حفاظت کی خاطر
 بنایا ہوگا، کیونکہ اس کے بانی کا صحیح حال معلوم نہیں ہو سکا، بعض نے اس کی
 نسبت سکندر کی جانب کر دی ہے، اور بعض نے کسری و نوشیرواں کی طرف
 اور یا قوت کہتا ہے کہ یہ تانبہ پگھلا کر اس سے تعمیر کی گئی ہے، (دائرة المعارف
 جلد ۷، ص ۶۵۱، معجم البلدان جلد ۱۸، ص ۲۹)“

چونکہ یہ سب دیواریں شمال ہی میں ہیں، اور تعسریبا ایک ہی ضرورت کے لئے بنائی
 گئی ہیں، اس لئے ان میں سے سد ذوالعترین کو نسی ہے، اس کے متعلق کرنے میں اشکالات
 پیش آتے ہیں، اور بڑا اختلاط ان آخری دوسدوں کے معاملہ میں پیش آیا، کیونکہ دونوں مقامات
 کا نام بھی در بند ہے اور دونوں جگہ سد بھی موجود ہے، مذکورہ صدر چار سدوں میں دیوار چین
 جو سب سے زیادہ بڑی اور سب سے زیادہ قدیم ہے، اس متعلق تو سد ذوالقرنین ہونے کا کوئی قائل
 نہیں اور وہ بجائے شمال کے مشرق اقصیٰ میں ہے، اور قرآن کریم کے اشارہ سے اس کا شمال
 میں ہونا ظاہر ہے۔

اب معاملہ باقی تین دیواروں کا رہ گیا جو شمال ہی میں ہیں، ان میں سے غم طور پر مورخین
 مستوردی، اقصیٰ، حموی وغیرہ اس دیوار کو سد ذوالعترین بتاتے ہیں جو داغستان یا
 کاکیشیا علاقہ باب الابواب کے در بند میں بحر خزر پر واقع ہے، بخارا و ترمذ کے در بند اور
 اس کی دیوار کو جن مورخین نے سد ذوالعترین کہا ہے وہ غالباً لفظ در بند کے اشتراک کی وجہ
 سے ان کو اختلاط ہوا ہے، اب تقریباً اس کا محل وقوع متعین ہو گیا کہ علاقہ داغستان کاکیشیا
 کے در بند باب الابواب میں یا اس سے بھی اوپر جبل قفقاز یا کوہ قاف کی بلندی پر ہے، اور
 ان دونوں جگہوں پر سد کا ہونا مورخین کے نزدیک ثابت ہے۔

ان دونوں میں سے حضرت الاستاذ مولانا سید انور شاہ قدس سرہ نے عقیدۃ الاسلام
 میں کوہ قاف قفقاز کی سد کو ترجیح دی ہے کہ یہ سد ذوالقرنین کی بنائی ہوئی ہے (عقیدۃ الاسلام ص ۲۹)
 سد ذوالقرنین اس وقت تک | آجکل تاریخ و جغرافیہ کے ماہرین اہل یورپ اس وقت ان شمالی
 موجودہ اور قیامت تک رہی گی | دیواروں میں سے کسی کا موجود ہونا تسلیم نہیں کرتے، اور نہ یہ
 یادہ ٹوٹ چکی ہے | تسلیم کرتے ہیں کہ اب بھی یا جوج ماجوج کا راستہ بند ہے،
 اس بناء پر بعض اہل اسلام مورخین نے بھی یہ کہنا اور لکھنا شروع کر دیا ہے کہ یا جوج ماجوج

جن کے خروج کا قرآن و حدیث میں ذکر ہوا ہو چکا ہے، بعض نے چھٹی صدی ہجری میں طوفان بن کراٹھنے والی قوم تاتاریوں کو اس کا مصداق قرار دیدیا ہے، بعض نے اس زمانے میں دنیا پر غالب آنے والی قوموں روس اور چین اور اہل یورپ کو یا جوج ماجوج کہہ کر اس معاملہ کو ختم کر دیا ہے، مگر جیسا کہ اوپر ہوالہ روح المعانی بیان ہو چکا ہے کہ یہ سراسر غلط ہے، احادیث صحیحہ کے انکار کے بغیر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ جس خروج یا جوج ماجوج کو قرآن کریم نے بطور علامت قیامت بیان کیا، اور جس کے متعلق صحیح مسلم کی حدیث نوآس بن سمعان وغیرہ میں اس کی تفسیر ہے کہ یہ واقعہ خروج دجال اور نزول عیسیٰ علیہ السلام اور قتل و قبال کے بعد پیش آئے گا وہ واقعہ ہو چکا، کیونکہ خروج دجال اور نزول عیسیٰ علیہ السلام بلاشبہ اب تک نہیں ہوا۔

البتہ یہ بات بھی قرآن و سنت کی کسی نص صریح کے خلاف نہیں ہے کہ ستر ذوالقرنین اس وقت ٹوٹ چکی ہو، اور یا جوج ماجوج کی بعض قومیں اس طرف آچکی ہوں، بشرطیکہ اس کو تسلیم کیا جائے کہ ان کا آخری اور بڑا ہتھ جو پوری انسانی آبادی کو تباہ کرنے والا ثابت ہو گا وہ ابھی نہیں ہوا، بلکہ قیامت کی ان بڑی علامات کے بعد ہو گا جن کا ذکر اوپر آچکا ہے یعنی خروج دجال اور نزول عیسیٰ علیہ السلام وغیرہ۔

حضرت الاستاذ حمید الاسلام علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق اس معاملہ میں یہ ہو کہ اہل یورپ کا یہ کہنا تو کوئی وزن نہیں رکھتا کہ ہم نے ساری دنیا چھان ماری ہے ہمیں اس دیوار کا پتہ نہیں لگا، کیونکہ اول تو خود انہی لوگوں کی یہ تصدیقات موجود ہیں کہ سیاحت اور تحقیق کے انتہائی معراج پر پہنچنے کے باوجود آج بھی بہت سے جنگل اور دریا اور جزیرے ایسے باقی ہیں جن کا ہمیں علم نہیں ہو سکا، دوسرے یہ بھی احتمال بعید نہیں کہ اب وہ دیوار موجود ہونے کے باوجود پہاڑوں کے گرنے اور باہم مل جانے کے سبب ایک پہاڑ ہی کی صورت اختیار کر چکی ہو، لیکن کوئی نص قطعی اس کے بھی منافی نہیں کہ قیامت سے پہلے یہ ستر ٹوٹ جائے، یا کسی دور دراز کے طویل راستہ سے یا جوج ماجوج کی کچھ قومیں اس طرف آسکیں۔

اس ستر ذوالقرنین کے تاقیامت باقی رہنے پر بڑا استدلال تو قرآن کریم کے اس لفظ سے کیا جاتا ہے کہ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ رَبِّي جَعَلَهُ دَكَّاءً، یعنی ذوالقرنین کا یہ قول کہ سب میرے رب کا وعدہ آپہونچے گا یعنی خروج یا جوج ماجوج کا وقت آجائے گا، تو اللہ تعالیٰ اس آہنی دیوار کو ریزہ ریزہ کر کے زمین کے برابر کر دیں گے، اس آیت میں وَعْدُ رَبِّي کا مفہوم ان حضرات نے قیامت کو قرار دیا ہے، حالانکہ الفاظ قرآن اس بارے میں قطعی نہیں، کیونکہ وَعْدُ رَبِّي کا صریح

مفہوم تو یہ ہے کہ یا جوج ماجوج کا راستہ روکنے کا جو انتظام ذوالعترین نے کیا ہے یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہمیشہ اسی طرح رہے، جب اللہ تعالیٰ چاہیں گے کہ ان کا راستہ کھل جائے تو یہ دیوار منہدم و مسمار ہو جائے گی، اس کے لئے ضروری نہیں کہ وہ بالکل قیامت کے متصل ہو، چنانچہ تمام حضرات مفسرین و محدثین کے مفہوم میں دونوں احتمال ذکر کئے ہیں، تفسیر بحر محیط میں ہے وَالْوَعْدُ یَحْتَمِلُ اَنْ یُّرَادَ بِهِ یَوْمُ الْقِیَمَةِ دَانَ یُرَادُ بِهِ وَقْتُ خُرُوجِ یَاجُوجَ مَاجُوجَ۔

اس کا تحقق یوں بھی ہو سکتا ہے کہ دیوار منہدم ہو کر راستہ ابھی کھل گیا ہو، اور یا جوج و ماجوج کے حملوں کی ابتداء ہو چکی ہو، خواہ اس کی ابتداء چھٹی صدی ہجری کے فتنہ تاتار سے قرار دی جائے، یا اہل یورپ اور روس و چین کے غلبہ سے، مگر یہ ظاہر ہے کہ ان متمدن قوموں کے خروج اور فساد کو جو آئینی اور قانونی رنگ میں ہو رہا ہے وہ فساد نہیں قرار دیا جاسکتا جس کا پتہ تشرآن و حدیث دے رہے ہیں کہ خالص قتل و غارت گری اور ایسی خوں ریزی کے ساتھ ہوگا کہ تمام انسانی آبادی کو تباہ و برباد کر دے گا، بلکہ اس کا حاصل پھر یہ ہوگا کہ انہی مفسد یا جوج ماجوج کی کچھ قویں اس طرف آ کر متمدن بن گئیں، اسلامی ممالک کے لئے بلاشبہ وہ فساد عظیم اور فتنہ عظیمہ ثابت ہوں گی، مگر ابھی ان کی وحشی قوتیں جو قتل و خون ریزی کے سوا کچھ نہیں جانتیں وہ تقدیری طور پر اس طرف نہیں آئیں اور بڑی تعداد ان کی ایسی ہی ہے، ان کا خروج قیامت کے بالکل قریب میں ہوگا۔

دوسرا استدلال ترمذی اور مسند احمد کی اس حدیث سے کیا جاتا ہے جس میں مذکور ہے کہ یا جوج ماجوج اس دیوار کو روزانہ کھودتے رہتے ہیں، مگر اوّل تو اس حدیث کو ابن کثیر نے معلول قرار دیا ہے، دوسرے اس میں بھی اس کی کوئی تصریح نہیں کہ جس روز یا جوج ماجوج انشاء اللہ کہنے کی برکت سے اس کو پار کر لیں گے وہ قیامت کے متصل ہی ہوگا، اور اس کی بھی اس حدیث میں کوئی دلیل نہیں کہ سائے یا جوج ماجوج اسی دیوار کے چھپے ہوئے رہیں گے، اگر ان کی کچھ ہمتیں یا قوتیں کسی در دراز کے رستہ سے اس طرف آجائیں، جیسا کہ آجکل کے طاقتور بحری جہازوں کے ذریعہ ایسا ہو جانا کچھ مستبعد نہیں، اور بعض مؤرخین نے لکھا بھی ہے کہ یا جوج ماجوج کو طویل بحری سفر کر کے اس طرف آنے کا راستہ مل گیا ہے، تو اس حدیث سے اس کی بھی نفی نہیں ہوتی۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن و سنت میں کوئی ایسی دلیل صریح اور قطعی نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ سدا ذوالقرنین قیامت باقی رہے گی، یا ان کے ابتدائی اور معمولی حملے قیامت سے پہلے اس طرف کے انسانوں پر نہیں ہو سکیں گے، البتہ وہ انتہائی خوفناک اور تباہ کن حملہ

جو پوری انسانی آبادی کو برباد کر دے گا، اس کا وقت بالکل قیامت کے متصل ہی ہو گا جس کا ذکر بار بار آچکا ہے، حاصل یہ ہے کہ قرآن و سنت کی نصوص کی بناء پر نہ یہ قطعی فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ ستر یا جوج ماجوج ٹوٹ چکی ہے اور رہتہ کھل گیا ہے، اور نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ از رو قرآن و سنت اس کا قیامت تک قائم رہنا ضروری ہے، احتمال دونوں ہی ہیں، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم بحقیقۃ الحال

وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُ فِي بَعْضٍ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ

اور چھوڑ دیں گے ہم خلق کو اس دن ایک دوسرے میں گھٹتے اور جھونک دیں گے صور میں

فَجَمَعْنَاهُمْ جَمْعًا ۝ وَعَرَضْنَا كَهَمَهُمْ يَوْمَئِذٍ لِلْكَافِرِينَ

پھر جمع کر لائیں گے ہم اُن سب کو، اور دکھلا دیں گے ہم روزِ قیامت اس دن کافروں کو

عَرَضْنَا ۝ يَا لَئِنْ تَبَيَّنَ كَانْتُمْ آعْيُنُهُمْ فِي غَطَاءٍ عَنْ ذِكْرِهِمْ وَكَانُوا

سامنے، جن کی آنکھوں پر پردہ پڑا تھا میری یاد سے اور نہ

لَا يَسْتَطِيعُونَ مَمَعًا ۝

میں سہنے تھے۔

خلاصہ تفسیر

اور ہم اس روز (یعنی جب اس دیوار کے انہدام کا یوم موعود آئے گا اور ماجوج ماجوج کا خروج ہو گا تو اس روز ہم) ان کی یہ حالت کریں گے کہ ایک میں ایک لٹڑا ہو جائیں گے، کیونکہ یہ کشت سے ہوں گے اور بیک وقت نکل پڑیں گے اور سب ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر میں ہوں گے) اور (یہ قیامت کے قریب زمانہ میں ہو گا، پھر بعد چند ہی قیامت کا سامان شروع ہو گا، ایک بار اول صور پھونکا جائے گا جس سے تمام عالم فزع ہو جائے گا، پھر سور (دوبارہ) پھونکا جائے گا (جس سے سب زلزلہ ہو جائیں گے) پھر ہم سب کو ایک ایک کر کے (میں) جمع کر لیں گے اور دوزخ کو اس روز کافروں کے سامنے پیش کر دیں گے جن کی آنکھوں پر پردہ پڑا تھا (یعنی دین حق کے دیکھنے سے) پردہ پڑا تھا اور (جس طرح یہ حق کو دیکھتے نہ تھے) وہ اس کو) وہ سن بھی نہ سکتے تھے (یعنی حق کو معلوم کرنے کے ذرائع دیکھنے اور سننے کے سب راستے بند کر رکھے تھے) ۝

معارف و مسائل

بَعْضُهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُّ فِيْ بَعْضٍ، بَعْضُهُمْ كِي ضَمِير میں ظاہر یہی ہے کہ یا جوج ماجوج کی طرف راجع ہے، اور ان کا حال اس میں بیان ہوا ہے کہ ایک دوسرے میں گڈ گڈ ہو جائیں گے، ظاہر یہ ہے کہ یہ اس وقت کا حال ہے جب کہ ان کا راستہ کھلے گا، اور وہ زمین پر پہاڑیوں کی بلندیوں سے جلد بازی کے ساتھ اتریں گے، مفسرین نے دوسرے احتمالات بھی لکھے ہیں۔
وَجَمَعْنَاهُمْ، ضمیر ہم مخلوق جن و انس کی طرف راجع ہے، مراد یہ ہے کہ میدانِ حشر میں تمام مکلف مخلوق جن و انس کو جمع کر دیا جائے گا۔

أَفَحَسِبَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنْ يَتَّخِذُوا عِبَادِي مِنْ دُونِي

اب کیا سمجھتے ہیں منکر کہ تمہاری میرے بندوں کو میرے سوا

أَوْلِيَاءَ إِنَّا أَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ نُزُلًا ۝۱۰۲ قُلْ هَلْ

حقیقی ہم نے تیار کیا ہے دوزخ کو کافروں کی مہمانی، تو کہہ ہم

نَسَبُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۝۱۰۳ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي

بتائیں تم کو کون کا کیا ہوا گیا بہت اکارت، وہ لوگ جن کی کوشش بھٹکتی رہی

الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۝۱۰۴

دنیا کی زندگی میں اور وہ سمجھتے رہے کہ خوب بناتے ہیں کام

أُولَئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِمْ فَبُطِئَتْ أَعْمَالُهُمْ

وہی ہیں جو منکر ہوئے اپنے رب کی نشانیوں سے اور اس کے ملنے سے سو برباد کیا انکا کیا ہوا

فَلَا تُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَزْنًا ۝۱۰۵ ذَلِكَ جَزَاءُ وَهُمْ جَهَنَّمُ

پھر نہ کھڑی کریں گے ہم ان کے واسطے قیامت کے دن تول، یہ بدلہ ان کا ہے دوزخ اس

بِمَا كَفَرُوا وَاتَّخَذُوا آيَاتِي وَرُسُلِي هُزُوًا ۝۱۰۶ إِنَّ الَّذِينَ

پر کہ منکر ہوئے اور تمہارا میری باتوں اور میرے رسولوں کو ٹھٹھا، جو لوگ

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَكُمْ جَنَّتُ الْفِرْدَوْسِ نَزْلًا

ایمان لائے ہیں اور کئے ہیں بھلے کام ان کے واسطے ہر ٹھنڈی چھاؤں کے باغ بہانی،

خَلِيْلِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حَوْلًا ۝۱۰۸

رہا کریں ان میں نہ چاہیں وہاں سے جگہ بدلنی۔

خلاصہ تفسیر

کیا پھر بھی ان کافروں کا خیال ہے کہ قبضہ کو چھوڑ کر میرے بندوں کو (یعنی جو میرے مملوکہ محکوم ہیں) ہتھیار آیا اضطراب ان کو، اپنا کارساز (یعنی مہبود اور حاجت روا) قرار دیں (جو شرک اور کفر کھلا ہوا ہے) ہم نے کافروں کی دعوت کے لئے دوزخ کو تیار کر رکھا ہے (دعوت بطور تحقیر و تہکم کے فرمایا) اور اگر ان کو اپنے ان اعمال پر ناز ہو جن کو وہ حسنہ اور نیکی سمجھتے ہوں اور اس کے سبب وہ اپنے آپ کو نجات یافتہ عذاب سے محفوظ سمجھتے ہوں تو آپ (ان سے) کہئے کہ کیا ہم تم کو ایسے لوگ بتائیں جو اعمال کے اعتبار سے بالکل خسارے میں ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کی دنیا میں کری کرانی محنت (جو اعمال حسنہ میں کی تھی) سب گئی گزری ہوئی اور وہ (بوجہ جہالت کے) اسی خیال میں ہیں کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں (آگے ان لوگوں کا مصداق ایسے عنوان سے بتلاتے ہیں جس سے ان کی محنت ضائع ہونے کی وجہ بھی معلوم ہوتی ہے، اور پھر اس جسطہ اعمال کی تصریح بھی بطور تفریح کے فرماتے ہیں) یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کی آیتوں کا اور اس سے ملنے کا (یعنی قیامت کا) انکار کر رہے ہیں (اس لئے) ان کے سارے (نیک) کام غارت گئے تو قیامت کے روز ہم ان (کے نیک اعمال) کا ذرا بھی وزن قائم نہ کریں گے (بلکہ) ان کی سزا دہی ہوگی (جو اوپر مذکور ہوئی) یعنی دوزخ، اس لئے کہ انھوں نے کفر کیا تھا اور (اس کفر کا ایک شعبہ یہ بھی تھا کہ) میری آیتوں اور پیغمبروں کا مذاق بنایا تھا، آگے ان کے مقابلے میں اہل ایمان کا حال بیان فرماتے ہیں کہ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے ان کی بہانی کے لئے فردوس (یعنی بہشت) کے باغ ہوں گے، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے (نہ ان کو کوئی نکالے گا) اور نہ وہ وہاں سے کہیں اور جانا چاہیں گے ۝

معارف و مسائل

أَفَحَسِبَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَن يَتَّخِذُوا عِبَادِي مِن دُونِي آلِيَاءَ، تفسیر بحر محیط میں ہے کہ اس جگہ عبارت میں خدمت ہے، یعنی فیجوز یسم نفعاً و ینتفعون بذاتک الاتخاذ، اور مطلب یہ ہے کہ کیا یہ کفر کرنے والے جنہوں نے میرے بجائے میرے بندوں کو اپنا معبود اور کارساز بنالیا ہے یہ سمجھتے ہیں کہ ان کو معبود و کارساز بنالینا ان کو کچھ نفع بخشنے کا، اور وہ اس سے کچھ فائدہ اٹھائیں گے، اور یہ ہستہام انکاری ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ایسا سمجھنا غلط اور حیرت انگیز عبادی سے مراد اس جگہ فرشتے اور وہ انبیاء ہیں جن کی دنیا میں لوگوں نے پرستش کی اور ان کو اللہ کا شریک ٹھہرایا، جیسے حضرت عزیر اور مسیح علیہ السلام، فرشتوں کی عبادت کرنے والے بعض عرب تھے، اور عزیر علیہ السلام کو یہود نے، عیسیٰ علیہ السلام کو نصاریٰ نے خدا کا شریک قرار دیا، اس لئے الَّذِينَ كَفَرُوا سے اس آیت میں کفار کے یہی فرقے مراد ہیں، اور جن بعض مفسرین نے اس جگہ عبادی سے مراد شیاطین کو الَّذِينَ كَفَرُوا سے کفار مراد ہوں گے جو جنات و شیاطین کی پرستش کرتے ہیں، بعض نے اس جگہ لفظ عبادی کو مخلوق و مملوک کے معنی میں لے کر عام قرار دیا، جس میں سب معبودات باطلہ ثبت، آگ، اور ستارے بھی داخل ہو گئے، خلا تفسیر میں لفظ محکوم و مملوک سے اسی کی طرف اشارہ ہے، بحر محیط وغیرہ میں پہلی ہی تفسیر کو رائج قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم

أَوْلِيَاءَ، ولی کی جمع ہے، یہ لفظ عربی زبان میں بہت سے معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس جگہ اس سے مراد کارساز، حاجت روا ہے، جو معبود برحق کی خاص صفت ہے، مقصود اس سے ان کو معبود قرار دینا ہے۔

أَلَا خَسِرْتُمُ يَا أَعْمَالًا، اس جگہ پہلی دو آیتیں اپنے مفہوم عام کے اعتبار سے ہر اس منسرد یا جماعت کو شامل ہیں جو کچھ اعمال کو نیک سمجھ کر اس میں جدوجہد اور محنت کرتے ہیں، مگر اللہ کے نزدیک ان کی محنت برباد اور عمل ضائع ہے، قرطبی نے فرمایا کہ یہ صورت دو چیزوں سے پیدا ہوتی ہے، ایک فساد اعتقاد، دوسرے ریاکاری، یعنی جس شخص کا عقیدہ اور ایمان درست نہ ہو وہ عمل کتنے ہی اچھے کرے اور کتنی ہی محنت اٹھائے وہ آخرت میں بیکار اور ضائع ہو۔ اسی طرح جس کا عمل مخلوق کو خوش کرنے کے لئے ریاکاری سے ہو وہ بھی عمل کے ثواب سے محروم ہے، اسی مفہوم عام کے اعتبار سے بعض حضرات صحابہ نے اس کا مصداق خوانب کو اور بعض مفسرین نے معتزہ اور دھن وغیرہ گمراہ منسردوں کو مترا دیا

مگر اگلی آیت میں یہ متعین کر دیا گیا ہے کہ اس جگہ مراد وہ کفار ہیں جو اللہ تعالیٰ کی آیات اور قیامت و آخرت کے منکر ہوں، اُولَٰئِكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِمْ، اس لئے قرطبی، ابو حیان، منطہری وغیرہ میں ترجیح اس کو دی گئی ہے کہ اصل مراد اس جگہ وہی کفار ہیں جو اللہ تعالیٰ اور قیامت اور حساب و کتاب کے منکر ہوں، مگر صورتہ وہ لوگ بھی اس کے منہوم عام سے بے تعلق نہیں ہو سکتے جن کے اعمال ان کے عقائد فاسدہ نے برباد کر دیئے، اور ان کی محنت رائیگاں ہو گئی بعض صحابہ کرام حضرت علیؓ اور سعدؓ سے جو ایسے اقوال منقول ہیں ان کا یہی مطلب ہے (قرطبی)

فَلَا نَقِيْلُهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَنَرٰنَا، یعنی ان کے اعمال جو ظاہر میں بڑے بڑے نظر آئیں گے مگر میزان حساب میں اُن کا کوئی وزن نہ ہوگا، کیونکہ یہ اعمال کفر و شرک کی وجہ سے بے کار اور بے وزن ہوں گے۔

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز ایک آدمی قدامت اور قربت آئے گا جو اللہ کے نزدیک ایک پتھر کے پر کے برابر بھی وزن دار نہ ہوگا، اور پھر فرمایا کہ اگر اس کی تصدیق کرنا چاہو تو قرآن کی یہ آیت پڑھو، فَلَا نَقِيْلُهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَنَرٰنَا

اور حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ (قیامت کے روز) ایسے ایسے اعمال لائے جائیں گے جو حساب کے اعتبار سے ہتھامہ کے پہاڑوں کے برابر ہوں گے، مگر میزانِ عدل میں ان کا کوئی وزن نہ ہوگا۔ (قرطبی)

جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ، فردوس کے معنی سرسبز باغ کے ہیں، اس میں اختلاف ہے کہ یہ عربی لفظ ہے یا عجمی، جن لوگوں نے عجمی کہا ہے اس میں بھی فارسی ہے یا رومی یا سریانی مختلف اقوال ہیں۔

صحیح بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم اللہ سے مانگو تو جنت الفردوس مانگو، کیونکہ وہ جنت کا سب سے اعلیٰ و افضل درجہ ہے اس کے اوپر عرشِ رحمن ہے، اور اس سے جنت کی سب سے نیچی نکلتی ہیں (قرطبی)

لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حَوْلًا، مقصد یہ بتلانا ہے کہ جنت کا یہ مقام ان کے لئے لازوال دائمی نعمت ہے، کیونکہ حق تعالیٰ نے یہ حکم جاری فرمادیا ہے کہ جو شخص جنت میں داخل ہو گیا وہ وہاں سے کبھی نکالا نہ جائے گا، مگر یہاں ایک خطہ کسی کے دل میں یہ گزر سکتا تھا کہ انسان کی فطری عادت یہ ہے کہ ایک جگہ رہتے رہتے اکتا جاتا ہے، وہاں سے باہر دوسرے مقامات پر جانے کی

خواہش ہوتی ہے، اگر جنت سے باہر کہیں جانے کی اجازت نہ ہوئی تو ایک قید محسوس ہونے لگے گی اس کا جواب اس آیت میں دیا گیا کہ جنت کو دوسرے مقامات پر قیاس کرنا بہالت ہے، جو شخص جنت میں چلا گیا پھر جو کچھ دنیا میں دیکھا اور برتا تھا جنت کی نعمتوں اور دلکش فضاؤں کے سامنے اس کو وہ سب چیزیں لغو معلوم ہوں گی، اور یہاں سے کہیں باہر جانے کا کہیں کسی کے دل میں خیال بھی نہ آئے گا۔

قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مَدًّا أَكَلْتُ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ

تَوَكُّهٖ أَرَدَیَا سِیَاسِی ہو کہ مجھے میرے رب کی باتیں بیشک دریا خراج ہو چکے ابھی نہ

تَنفَدَ کَلِمَتُ رَبِّیْ وَلَوْ جَعَلْنَا بِمِثْلِهِ مَدًّا ۝۱۰۹ قُلْ إِنَّمَا أَنَا

پوری ہوں میرے رب کی باتیں اور اگرچہ دوسرا بھی لائیں ہم دلیا ہی اس کی مدد کو، تو کہہ میں بھی

بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ یُوحِیْ اِلَیَّ اَنْشَاَ الْهَکْمَ الرَّالٰہُ وَاٰحِلُّ ۚ فَمَنْ

ایک آدمی ہوں جیسے تم، حکم آتا ہے مجھ کو کہ معبود تمھارا ایک معبود ہے، سو پھر

كَانَ یَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّہٖ فَلِیَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا یُشْرِكْ

جس کو امید ہو ملنے کی اپنے رب سے سو وہ کرے کچھ کام نیک اور شریک نہ کرے

لِعِبَادَةِ رَبِّہٖۤ اَحَدًا ۝۱۱۰

اپنے رب کی بندگی میں کسی کو۔

خلاصہ تفسیر

آپ لوگوں سے فرما دیجئے کہ اگر میرے رب کی باتیں (یعنی وہ کلمات و عبارات جو اللہ تعالیٰ کے اوصاف اور کمالات پر دلالت کرتے ہوں اور ان سے اللہ تعالیٰ کے کمالات و اوصاف کو کوئی بیان کرنے لگے تو ایسے کلمات کو) لکھنے کے لئے سمندر کا پانی، روشنائی (کی جگہ) ہو اور اس سے لکھنا شروع کرے تو میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے گا (اور سب باتیں احاطہ میں نہ آئیں گی) اگرچہ اس سمندر کے مثل ایک دوسرا سمندر (اس کی) مدد کے لئے ہم لے آئیں (تب بھی وہ باتیں ختم نہ ہوں اور دوسرا سمندر بھی ختم ہو جائے، معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے کلمات غیر متناہی ہیں، اس کے سوا جن چیزوں کو کافروں نے اللہ کا شریک مانا ہے ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں، اس لئے الوہیت و ربوبیت [خدا ہونا اور رب ہونا] اسی کی

ذات کے ساتھ مخصوص ہے، اس لئے ان لوگوں سے آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ میں تو تم سب کی طرح بشر ہوں (نہ خدائی کا دعوے دار ہوں نہ قرشتہ ہونے کا ہاں) میرے پاس (اللہ کی طرف سے) وحی آتی ہے (اور) تمہارا معبود برحق ایک ہی معبود ہے تو جو شخص اپنے رب سے ملنے کی آرزو رکھے (اور اس کا محبوب بننا چاہے) تو مجھ کو رسول مان کر میری شریعت کے موافق (نیک کام کرتا رہو) اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

معارف و مسائل

سورہ کہف کی آخری آیت میں ذَلَّا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا، کا شان نزول جو روایات حدیث میں مذکور ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں شرک سے مراد شرک خفی یعنی ریا ہے۔ امام حاکم نے مستدرک میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے، اور اس کو صحیح علی شرط الشیخین فرمایا ہے، روایت یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے ایک شخص اللہ کی راہ میں جہاد کرتا تھا، اس کے ساتھ اس کی یہ خواہش بھی تھی کہ لوگوں میں اس کی بہادری اور غازیانہ عمل پہچانا جائے، اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی جس سے معلوم ہوا کہ جہاد میں ایسی نیت کرنے سے جہاد کا ثواب نہیں ملتا۔

اور ابن ابی حاتم اور ابن ابی الدنیا نے کتاب الاخلاص میں طاؤسؓ سے نقل کیا ہے کہ ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا کہ میں بعض اوقات کسی نیک کام کے لئے عبادت کے لئے کھڑا ہوتا ہوں اور میرا قصد اس سے اللہ تعالیٰ ہی کی رضا ہوتی ہے، مگر اس کے ساتھ دل میں یہ خواہش بھی ہوتی ہے کہ لوگ میرے عمل کو دیکھیں، آپ نے یہ سن کر سکوت فرمایا، یہاں تک کہ یہ آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

اور ابو نعیم اور تاج ابن عساکر میں بروایت ابن عباسؓ لکھا ہے کہ جندب بن جہیرؓ صحابی جب نماز پڑھتے یا روزہ رکھتے یا صدقہ کرتے پھر دیکھتے کہ لوگ ان اعمال سے انکی تعریف و ثناء کر رہے ہیں تو اس سے ان کو خوشی ہوتی، اور اپنے اس عمل کو اور زیادہ کر دیتے تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

خلاصہ ان تمام روایات کا یہی ہے کہ اس آیت میں جس شرک سے منع کیا گیا ہے وہ ریا کاری کا شرک خفی ہے، اور یہ کہ عمل اگرچہ اللہ ہی کے لئے ہو مگر اس کے ساتھ کوئی نفسانی غرض شہرت و وجاہت کی بھی شامل ہو تو یہ بھی ایک قسم کا شرک خفی ہے، جو انسان کے عمل کو ضائع بلکہ مضرت رسان بنا دیتا ہے۔

لیکن بعض دوسری احادیث صحیحہ سے بظاہر اس کے خلاف معلوم ہوتا ہے، مثلاً ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں بعض اوقات اپنے گھر کے اندر اپنے جائے نماز پر (نماز میں مشغول) ہوتا ہوں، اچانک کوئی آدمی آجائے تو مجھے یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے مجھے اس حال میں دیکھا تو کیا یہ ریا ہوگئی؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابو ہریرہ خدا تعالیٰ تم پر رحمت فرمائے تمہیں اس وقت دواجر ملتے ہیں، ایک خفیہ عمل کا جو پہلے سے کر رہی تھے دوسرا اعلانیہ عمل کا جو اس آدمی کے آجانے کے بعد ہو گیا (یہ ریا نہیں)۔

اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ ایسے شخص کے بارے میں فرمائیے کہ جو کوئی نیک عمل کرتا ہے، پھر لوگوں کو سنے کہ وہ اس عمل کی تعریف و مدح کر رہے ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا يٰۤاَيُّهَا عَلِيُّ بْنُ اَبِي تَالِبٍ اِنَّكَ تَعْرِفُ النَّاسَ بِمَا هُمْ فِيْهِ يَتَّبِعُوْنَ اَمَّا اَنْتَ فَاَنْتَ تَعْرِفُ النَّاسَ بِمَا هُمْ فِيْهِ يَتَّبِعُوْنَ یعنی یہ تو مؤمن کے لئے نقد بشارت ہے کہ اس کا عمل اللہ کے نزدیک قبول ہوا، اس نے اپنے بندوں کی زبانوں سے (اس کی تعریف کرا دی)۔

تفسیر مظہری میں ان دونوں قسم کی روایتوں میں جو بظاہر اختلاف نظر آتا ہے اس کی تطبیق اس طرح فرمائی ہے کہ پہلی روایات جن کے بارے میں آیت نازل ہوئی اس صورت میں ہیں جب کہ انسان اپنے عمل سے اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے ساتھ مخلوق کی رضا جوئی یا اپنی شہرت و جاہت کی نیت کو بھی شریک کرے، یہاں تک کہ لوگوں کی تعریف کرنے پر اپنے اس عمل کو اور بڑھا دے یہ بلاشبہ ریا اور شرک خفی ہے۔

اور بعد کی روایات ترمذی اور مسلم کی اس صورت سے متعلق ہیں جبکہ اس نے عمل خالص اللہ کے لئے کیا ہو لوگوں میں اس کی شہرت یا ان کی مدح و ثناء کی طرف کوئی التفات نہ ہو، پھر اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس کو مشہور کر دیں اور لوگوں کی زبانوں پر اس کی تعریف جاری فرمادیں تو اس کا ریا سے کوئی تعلق نہیں، یہ مؤمن کے لئے نقد بشارت (قبول عمل کی) ہے۔

ریا کاری کے نتائج بد اور اس پر حضرت محمود بن لبیدؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث کی وعید شدید فرمائی کہ میں تمہارے بارے میں جس چیز پر سب سے زیادہ خوف رکھتا ہوں وہ شرک اصغر ہے، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ شرک اصغر کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ریا (رواہ احمد فی مسندہ)

اور بیہقی نے شعب الایمان میں اس حدیث کو نقل کر کے اس میں یہ زیادتی بھی نقل کی ہے کہ قیامت کے روز جب اللہ تعالیٰ بندوں کے اعمال کی جزاء عطا فرمائیں گے تو ریاکار لوگوں سے

فرمادیں گے کہ تم اپنے عمل کی جزا لینے کے لئے ان لوگوں کے پاس جاؤ جن کو دکھانے کے لئے تم نے یہ عمل کیا تھا، پھر دیکھو کہ ان کے پاس تمہارے لئے کوئی جزا ہے یا نہیں۔

اور حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں شریک ہونے سے غنی اور بالاتر ہوں جو شخص کوئی عمل نیک کرتا ہے پھر اس میں میرے ساتھ کسی اور کو بھی شریک کر دیتا ہے تو میں وہ سارا عمل اسی شریک کے لئے چھوڑ دیتا ہوں اور ایک روایت میں ہے کہ میں اس عمل سے بری ہوں اس کو تو خالص اسی شخص کا کر دیتا ہوں جس کو میرے ساتھ شریک کیا تھا (رواہ مسلم)

اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص اپنے نیک عمل کو لوگوں میں شہرت کے لئے کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کے ساتھ ایسا ہی معاملہ فرماتے ہیں کہ لوگوں میں وہ حقیر و ذلیل ہو جاتا ہے، (رواہ احمد و البیہقی فی شعب الایمان، از تفسیر مظہری)

تفسیر قرطبی میں ہے کہ حضرت حسن بصریؒ سے اخلاص اور ریاء کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اخلاص کا تقاضا یہ ہے کہ تمہیں اپنے نیک اور اچھے اعمال کا پوشیدہ رہنا محبوب ہو اور برے اعمال کا پوشیدہ رہنا محبوب نہ ہو، پھر اگر اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال لوگوں پر ظاہر فرمادیں تو تم یہ کہو کہ یا اللہ یہ سب آپ کا فضل ہے احسان ہے میرے عمل اور کوشش کا اثر نہیں اور حکیم ترمذی نے صدیق اکبرؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ شرک کا ذکر فرمایا کہ هُوَ فِیْكُمْ اَخْفٰی مِنْ دَبِیْبِ النَّمْلِ، یعنی شرک تمہارے اندر ایسے مخفی انداز سے آجاتا ہے جیسے چیونٹی کی رفتار بے آواز، اور فرمایا کہ میں تمہیں ایک ایسا کام بتلاتا ہوں کہ جب تم وہ کام کر لو تو شرک اکبر اور شرک اصغر (یعنی ریاء) سب سے محفوظ ہو جاؤ تم تین مرتبہ روزانہ یہ دعا کیا کرو، اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اُشْرِكَ بِكَ وَاَنَا اَعْلَمُ وَاَسْتَغْفِرُ لَیْسَ اَلَا اَعْلَمُ

سورہ کہف کے بعض فضائل اور خواص

حضرت ابوالدرداءؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے سورہ کہف کی پہلی دس آیتیں یاد رکھیں وہ دجال کے فتنہ سے محفوظ رہے گا (رواہ مسلم و احمد و ابوداؤد و النسائی)

اور امام احمد، مسلم، اور نسائی نے حضرت ابوالدرداءؓ سے ہی اس روایت میں یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ جس شخص نے سورہ کہف کی آخری دس آیتیں یاد رکھیں وہ فتنہ دجال سے محفوظ رہے گا۔

اور حضرت انسؓ کی روایت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے سورۃ کہف کی ابتدائی اور آخری آیتیں پڑھ لیں تو اس کے لئے ایک نور ہو جائے گا، اس کے قدم سے لیکر سرتک اور جس نے یہ سورۃ پوری پڑھی اس کے لئے نور ہوگا زمین سے آسمان تک (اخرجہ ابن السنی و احمد فی مسند) اور حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے جمعہ کے روز سورۃ کہف پوری پڑھ لی، تو دوسرے جمعہ تک اس کے لئے نور ہو جائے گا (رواہ الحاکم وصحیحہ والبیہقی فی الدعوات) از منظرہ

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک شخص نے کہا کہ میں دل میں ارادہ کرتا ہوں کہ آخرت میں بیدار ہو کر نماز پڑھوں، مگر نیند غالب آجاتی ہے، آپ نے فرمایا کہ جب تم سونے کے لئے بستر پر جاؤ تو سورۃ کہف کی آخری آیتیں قُلْ تَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَإِنْ كُنْتُمْ مِنْهُمْ سَاءَ فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَعْبُدُونَ؟ اور سورۃ کہف کی پہلی آیتیں قُلْ تَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَإِنْ كُنْتُمْ مِنْهُمْ سَاءَ فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَعْبُدُونَ؟ جس وقت بیدار ہونے کی نیت کرو گے اللہ تعالیٰ تمہیں اسی وقت بیدار کر دیں گے (رواہ شعبی) اور مسند دارمی میں ہے کہ زبیر بن حبیشؓ نے حضرت عبداللہ کو بتلایا کہ جو آدمی سورۃ کہف کی یہ آخری آیتیں پڑھ کر سوئے گا تو جس وقت بیدار ہونے کی نیت کرے گا اسی وقت بیدار ہو جائے گا، عبد کہتے ہیں کہ ہم نے بارہا اس کا تجربہ کیا بالکل ایسا ہی ہوتا ہے۔

ایک اہم نصیحت | ابن عربیؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے شیخ طبرطوسیؒ فرمایا کرتے تھے کہ تمہاری عمر عزیز کے اوقات اپنے ہم عصروں سے مقابلے اور دوستوں سے میل جول ہی میں نہ گزر جائیں، دیکھو اللہ تعالیٰ نے اپنے بیان کو اس آیت پر ختم فرمایا ہے: فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا، یعنی جو شخص اپنے رب کے ملنے کی آرزو رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ عمل نیک کرے اور اللہ کی عبادت میں کسی کو حصہ دار نہ بنائے (قرطبی)

الحمد للہ حمد اکثر اطیباً مبارکاً فیہ، آج ۸ ذیقعدہ ۱۳۹۹ھ بروز جمعرات بوقت ضحیٰ سورۃ کہف کی یہ تفسیر مکمل ہوئی، اور اللہ تعالیٰ کا فضل و انعام ہی ہے کہ اس وقت قرآن کریم کا نصف اول سے کچھ زائد پورا ہو گیا، جبکہ عمر کا چہتر واں سال چل رہا ہے، اور ضعف طبعی کے ساتھ دو سال سے مختلف امراض نے بھی گھیرا ہوا ہے، اور افکار کا ہجوم بھی غیر معمولی ہے، کچھ عجب نہیں کہ حق تعالیٰ اپنے فضل سے باقی قرآن کی بھی تکمیل فرمادیں، وما ذلک علی اللہ بعزیز:

جلد پنجم تمام شد